

قیوم :- قیوم نے اس سوال کا جواب دیا کہ اگر میں کھانے کا ڈبا گھر ہی بھول آیا تو اپنے دوست شاہد سے مانگ کر کھالوں گا۔

جاوید :- جاوید نے کہا کہ میں روزانہ اسکول پیسے لے کر جاتا ہوں میں ہوٹل میں جاکر کھالوں گا۔

عابد :- عابد نے کہا کہ میری ماں نوکر کے ہاتھ میرا کھانا بھیج دیں گی۔

ایوب :- ایوب نے کہا کہ ہوٹل والے سے جان پہچان ہے میں ہوٹل میں جاکر کھانا کھالوں گا۔

تحسین :- تحسین نے کہا کہ ہمارے والد اس اسکول میں استاد ہیں اس لیے میں اپنے پاپا کے ساتھ جاکر کھانا کھالوں گا۔

ریاض :- ریاض نے کہا کہ کھانے کا ڈبا چھوٹ جائے گا تو کیا ہوگا ایک دن بھوک برداشت کرلوں گا۔

اورنگ زیب :- اورنگ زیب نے کہا کہ اسکول میں پکوڑی بیچنے والا آتا ہے میں اس سے اُدھار لے کر کھالوں گا۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔

افروز - افروز نے کہا کہ میں اپنے دوست سے کچھ پیسے قرض لے لوں گا اور کھانا کھالوں گا۔

شہباز :- شہباز نے کہا کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میرا بھائی بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے وہ روزانہ کھانا لے کر آتا ہے۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ کھالوں گا۔

شمشیر :- شمشیر نے کہا کہ ہمارا گھر اسکول سے بہت قریب ہے میں سائکل سے گھر جاکر کھالوں گا۔

بلو :- بلو نے کہا کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے کیوں کہ ہمارے اسکول کے پاس ہمارے چچا کا ہوٹل ہے اس لیے میں ہوٹل میں جاکر کھانا کھالوں گا۔

ایس۔ ایم۔ شمشاد حیدر زعافی۔ (نالندہ)

یاد رکھیے — اگر آپ کی خریداری نمبر کے سامنے ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی



بچوں کے لیے
...ں اور دلچسپ کتابیں

...ترانے	۴/۵۰
...اول	۲/۰۰
...ہانیاں	۲/۵۰
...رانی	۲/۰۰
...ہزادی	۳/۰۰
...شیرا	۳/۰۰
...نی	۳/۰۰
...سفر	۳/۵۰
...گاندھی	۴/۵۰
...کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰
...نہرو	۲/۵۰
...کی چار ٹانگیں	۳/۰۰
...مارو	۴/۰۰
...راز	۳/۰۰
...	۲/۰۰
...فسر	۵/۰۰
...ی پر	۵/۰۰
...بستی	۳/۵۰
...تے	۳/۰۰
مصامہ	۴/۵۰
...	۲/۰۰
...کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰
...کی الف بے	۳/۰۰
...ھی جی دکھنی افریقہ میں	۲/۰۰
...سہیلیاں	۶/—
...س کی بیوی	۲/۵۰
...شتہ	۴/۵
...سرا	۴/۵۰
...	۲/۵۰
...ب علم کی کہانی	۲/—
...کار کا دربار	۴/۵۰
...کے جانور	۲/۵۰

آؤ دعا کریں	۲/۰۰
اس نے کیا کر نہ جانا	۱/۲۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
جوہر قابل	۳/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰
محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰
مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰
چار یار	۴/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۳/:
ہار کی تلاش	۶/—
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
تاک دنادن تا کے سے	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
ایک دیس ایک خون	۳/-
جیت کس کی ؟	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
جادو کا گھر	۱/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
ہیو جیو	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
شیر خاں	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵
اردو خوشخطی اول	۱/۵۰
اردو خوشخطی دوم	۲/۵۰
اردو خوشخطی سوم	۲/۵۰
اردو خوشخطی چہارم	۲/۵۰

ریڈیو نیچر	۲/۵۰
سرکس	۱/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی	۴/۰۰
ہمارے محاورے	۸/۵۰
کہاوت اور کہانیاں	۶/۰۰
ہمارا دین (دو حصے) فی حصہ	۶/۰۰
چوری کی عادت	۲/۰۰
چمپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
چنبیلی	۱/۲۰
چٹانوں کی کہانی	۲/۵۰
بچوں کے اقبال (نظمیں)	۴/۵۰
دھنک (")	۳/۰۰
کھیل سنسار (")	۴/۵۰
شہزادہ اور ٹھگ	۲/۰۰
سندر چنار	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور غبارے	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد	۲/۰۰
اچھی کہانیاں	۲/۵
میر انیس	۲/۰۰
دادا نہرو	۴/۰۰
جلوہ غالب	۲/۰۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	۱/۵
میاں ڈھینچوں کے بچے	۱/۵۰
ہرن کے بچے	۱/۵۰
بہادر	۲/۵
یک پھوری تیل میں	۱/۵۰
مابیل خاں	۱/۵۰
تین اناڑی	۳/۰۰
پہیلیاں	۰/۸۰
چھوٹا لڑکا	۱/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اول، دوم) فی حصہ	۲/۵۰
چڑیا ماں	۳/—
ہمارا دین اول	۷/-
تیار رہو	۱/۵۰
تاریخ ہند کی کہانیاں اول	۱/۵۰

پیام تعلیم

جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جنوری [illegible] جلد [illegible] شمارہ ۱

آپ سب کو نیا سال مبارک ہو

خدا کرے یہ سال آپ کے لیے [illegible]

ہماری [illegible] ہے کہ ہم [illegible] نئے سال میں [illegible]

سال [illegible] آپ کو [illegible]

[illegible] کرسکے۔

ہمیں تو نئے سال کا تحفہ مل گیا ہے۔ پیام تعلیم کو [illegible] ملک [illegible] پیسے کا اضافہ ہو چکا ہے [illegible] کی جگہ [illegible] پیسے [illegible] کو ایک حسین تحفہ پیش کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں [illegible] فروری کے پہلے ہفتے میں یہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔

آپ میں سے بہتوں نے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ) کا نام ضرور سنا ہوگا لیکن شاید کم ہی اس عظیم شخصیت کے کارناموں سے واقف ہوں گے [illegible] میں جب [illegible] جامعہ ملیہ اسلامیہ کے [illegible] پیام تعلیم کا [illegible] فروری میں [illegible] ۹۰ ویں یوم پیدائش کے [illegible] جامعہ میں جشن ذاکر حسین منایا جا رہا ہے [illegible] پیام تعلیم بھی [illegible] رسالے کا ذاکر حسین نمبر نکال کر اس عظیم رہنما کی [illegible] پیش کر رہا ہے [illegible]

اور دیگر مستقل کالم

قیمت فی پرچہ [illegible] سالانہ [illegible]

غیر ممالک سے [illegible]

[illegible]

[illegible] شاہد علی خاں

[illegible] ولی شاہجہاں پوری

[illegible] نسیم اختر خاں

[illegible]



سطوت رسول
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سالِ نو

گیا سال پچھلا، نیا سال آیا
مسرّت کے ہر سو، ترانے بکھیرے
نئے دن کا سورج، نئے ہیں سویرے
گیا سال پچھلا، نیا سال آیا
بہاروں کو پھولوں سے سرشار کردیں
لہو کو شفق رنگ گل نار کردیں
گیا سال پچھلا، نیا سال آیا
بہاروں سے پھولوں کی گلیاں سجادیں
ہواؤں میں خوشبو سے کلیاں بسادیں
گیا سال پچھلا، نیا سال آیا
بہ ہنگامِ عیش و طرب گنگنائیں
نئے ساز چھیڑیں نئے گیت گائیں
گیا سال پچھلا، نیا سال آیا

کلثوم بانو

شہزادی عنبریں

پرانے زمانے کی بات ہے۔ کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ جس کا نام عنبریں تھا۔ شہزادی بہت خوبصورت تھی۔ لیکن بادشاہ پھر بھی ہر وقت اداس اور پریشان رہتا۔ کیونکہ اس کی پیاری بیٹی ہر وقت بیمار رہنے کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکی تھی۔ بادشاہ نے شہزادی کا علاج کروانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر شہزادی کسی طور بھی صحت یاب نہ ہو سکی۔

ایک دن بادشاہ کے محل میں ایک پری آئی اس نے بادشاہ سے کہا۔

"اے بادشاہ! شہزادی صرف ایک صورت میں صحت یاب ہو سکتی ہے، وہ اس طرح کہ کوئی ایسا انسان جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور ایمان دار ہو۔ اپنے ہاتھ سے شہزادی کو سیب کھلائے۔

بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے پورے ملک میں منادی کرا دی کہ جو شخص شہزادی کو سیب کھلا کر صحت یاب کرے گا۔ اس کی شادی شہزادی سے کر دی جائے گی۔

یہ خبر سنتے ہی ملک کے کئی بوڑھے اور جوان آئے۔ شہزادی نے سب کے ہاتھوں سے سیب کھائے مگر وہ صحت یاب نہ ہو سکی۔

اسی ملک میں ایک چھوٹا سا فارم تھا۔ جہاں سیبوں کے چند درخت تھے۔ اس

مدیر معاون۔ بچوں کا باغ۔ لاہور۔

لطیفہ

باپ: کیا تمھارے سالانہ امتحان ختم ہو گئے؟

بیٹا: جی! نتیجہ بھی نکل چکا۔

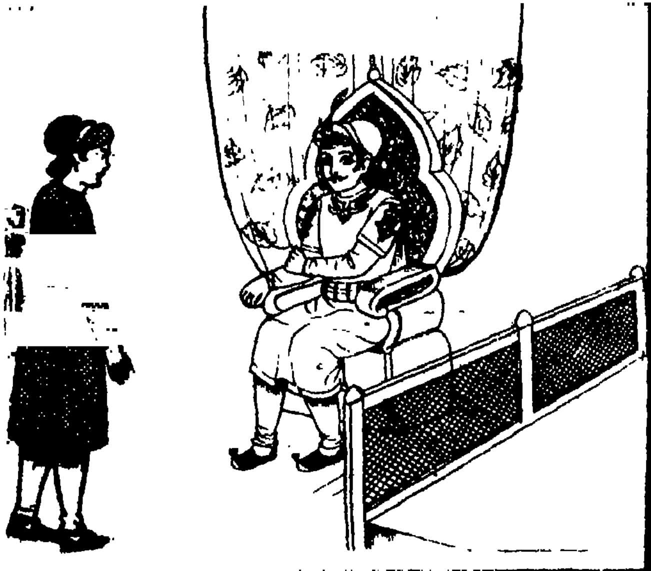
باپ: مجھے بتایا کیوں نہیں؟

بیٹا: اس لیے کہ کسی نئی کتاب کی ضرورت نہیں پڑی۔

فارم کا مالک ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جس کا نام احمد تھا۔ احمد ایک یتیم لڑکا تھا۔ وہ بڑی محنت اور ایمان داری سے فارم چلا رہا تھا۔

ایک دن احمد اپنے قصبے سے باہر ایک دکان پر کچھ خریدنے کے لیے گیا۔ اُس دکان میں دو عورتیں شہزادی کی بیماری اور بادشاہ کے اعلان کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ احمد خاموشی سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔

گھر واپس آکر احمد سوچنے لگا۔ میرے فارم میں بھی چند سیبوں کے اچھے درخت ہیں۔ مجھے وہ سیب شہزادی کو کھلانے چاہییں۔ ہوسکتا ہے میرے سیب کھانے سے شہزادی صحت یاب ہو جائے اور پھر اس نے کچھ اچھے اچھے سیب توڑے اور انھیں ٹوکری میں رکھ کر محل کی طرف روانہ ہو گیا۔



احمد ایک ندی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اُس نے دیکھا، ایک نہایت خوبصورت مچھلی پانی سے باہر گری تڑپ رہی ہے۔ احمد کو مچھلی پر بڑا ترس آیا۔ اس نے مچھلی کو اٹھا کر ندی میں پھینک دیا۔ اسی لمحے اس کے سامنے ایک بونا نمودار ہوا۔ اس نے احمد سے کہا۔ میں وہی مچھلی ہوں جسے تم نے ابھی ابھی پانی میں پھینکا ہے۔ تم ایک

بہادر اور ایمان دار انسان ہو۔ میں تمھارا امتحان لینے کے لیے مچھلی بنا تھا اور پھر اس نے احمد کو ایک تھیلا دیا اور کہا۔

"تمھیں جب بھی کبھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو اس تھیلے کو تین مرتبہ جھٹک کر مجھے پکارنا میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر بونا غائب ہو گیا۔

محل میں پہنچ کر احمد نے دربان کو اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ دربان اسے محل کے اندر لے گیا۔ احمد نے اپنے ہاتھ سے سیب شہزادی کو کھلائے۔ سیب کھلاتے ہی شہزادی بھلی چنگی ہو گئی۔

بادشاہ بہت خوش ہوا، مگر جب اُسے پتا چلا کہ احمد ایک غریب لڑکا ہے۔ تو اُس نے اپنے دل میں یہ بات طے کر لی کہ وہ شہزادی کی شادی احمد سے نہیں کرے گا۔ اُس نے اپنے وفادار وزیر سے مشورہ طلب کیا کہ وہ احمد سے کیسے چھٹکارا حاصل کرے۔ وزیر نے بادشاہ سے کہا۔

"حضور! احمد کو کوئی ایسا کام سونپا جائے جسے وہ کسی صورت نہ کر سکے۔ اس کے ساتھ یہ شرط رکھی جائے کہ جب تک وہ یہ کام مکمل نہ کرے گا، شہزادی کی شادی اس کے ساتھ نہیں ہو سکے گی۔"

بادشاہ یہ بات سُن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک سو سفید خرگوش منگوائے اور انھیں ایک گھنے جنگل میں چھوڑ دیا اور احمد سے کہا کہ سورج غروب ہونے تک سب خرگوش اکٹھے کر کے، میرے سامنے پیش کرو۔ تو تمھاری شادی شہزادی سے کر دی جائے گی۔ اگر نہیں تو تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔

احمد نے بڑی کوشش کی مگر وہ سب خرگوشوں کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ احمد بہت پریشان ہوا۔ اُسے شہزادی سے شادی کا لالچ نہیں تھا، اسے تو فکر اس بات کی تھی کہ خرگوش نہ پکڑنے کی صورت میں بادشاہ اسے قتل کروا دے گا۔

اچانک اُسے بونے کے تھیلے کا خیال آیا۔ اُس نے تھیلے کو تین بار جھٹک کر بونے کو پکارا۔ فوراً کہیں سے بونا نمودار ہو گیا۔ احمد نے اسے اپنی پریشانی بتائی۔ بونے نے کہا پریشانی کی

کوئی بات نہیں۔ بونے نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو تین بار دائرے کی شکل میں گھمایا۔ چند منٹوں میں سب خرگوش ایک جگہ جمع ہو گئے۔ احمد ان کو لے کر بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔

یہ دیکھ کر بادشاہ بہت حیران ہوا۔ اب بادشاہ نے احمد کے سامنے ایک اور شرط رکھ دی کہ چار دن کے اندر اندر مجھے ایک ایسی کشتی لا کر دو جو خشکی پر بھی آسانی سے چل سکے اور پانی پر بھی۔ احمد یہ سن کر بہت پریشان ہوا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر بونے کو مدد کے لیے پکارا۔ اور اپنی الجھن بیان کی۔

بونے نے منہ میں کچھ پڑھ کر ایک جانب پھونک ماری۔ احمد نے دیکھا کہ وہاں ایک خوبصورت کشتی کھڑی ہے۔ بونے نے احمد سے کہا اس میں بیٹھ جاؤ اور اسے خشکی پر چلاتے ہوئے بادشاہ کے پاس لے جاؤ۔

احمد محل کے باہر پہنچا تو بادشاہ کو بھی احمد کے کامیاب لوٹنے کی خبر مل گئی۔ وہ خود محل سے باہر آیا۔ اس نے جب احمد کو خشکی پر کشتی چلاتے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

اس نے احمد کے سامنے اپنی آخری شرط رکھی کہ اگر تم میری یہ شرط پوری کر دو تو نہ صرف میں شہزادی کی شادی تمہارے ساتھ کر دوں گا بلکہ تمہیں اس ملک کا بادشاہ بھی بنا دوں گا۔ وہ شرط یہ ہے کہ تم کوہ قاف کے سیاہ پہاڑ کی چوٹی سے جادو کے پرندے کے سنہری پَر لا کر دو۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ اس مرتبہ احمد کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ سیاہ پہاڑ ہزاروں میل دُور تھا اور اس پنجرے کی حفاظت جس میں وہ پرندہ تھا ایک خوفناک دیو کر رہا تھا۔

احمد سفر پر روانہ ہوا، کچھ دور جانے کے بعد اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ بونے دوست کو بُلا کر یہ معلوم کر لیا جائے کہ سیاہ پہاڑ کہاں واقع ہے۔ اس نے تھیلے کو تین بار جھٹک کر بونے کو پکارا، بونا فوراً حاضر ہو گیا۔

احمد نے بونے سے سیاہ پہاڑ کے بارے میں پوچھا۔ بونے نے کہا۔

احمد! سیاہ پہاڑ یہاں سے بہت دُور ہے جہاں پہنچنے میں تمہیں کئی ماہ لگ جائیں گے۔ اور پھر اس پنجرہ کی حفاظت سامری دیو کر رہا ہے۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دیتا ہوں۔

اس نے احمد کو ایک تلوار دی اور کہا کہ جیسے ہی دیو تمہارے سامنے آئے تم تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دینا اس ہاتھ میں دیو کی جان ہے۔ ہاتھ کٹتے ہی دیو مرجائے گا اور تم پرندے کے پَر حاصل کر لوگے۔ میری چھڑی کا ایک کونہ پکڑلو۔ اور اپنی آنکھیں بند کرلو۔ جب میں تم سے آنکھیں کھولنے کو کہوں تو آنکھیں کھول دینا"

احمد نے ایسے ہی کیا۔ اُسے محسوس ہوا، جیسے وہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اُس نے چھڑی کو مضبوطی سے پکڑلیا۔ چند لمحوں بعد بونے نے اسے آنکھیں کھولنے کو کہا۔

احمد نے جب آنکھیں کھولیں تو اُس کے سامنے سیاہ پہاڑ تھا۔ بونا احمد کو وہاں چھوڑ کر غائب ہوگیا۔

احمد نے بونے کی تلوار مضبوطی سے پکڑی اور پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو اُسے سامنے ایک سونے کا بنا ہوا پنجرہ دکھائی دیا۔ جس میں ایک خوبصورت پرندہ بند تھا۔ جس کے سنہری پَر دھوپ میں چمک رہے تھے۔

احمد جیسے ہی پنجرہ کی طرف بڑھا کہ اچانک اسے ایک خوفناک آواز سنائی دی۔ احمد نے اس طرف دیکھا۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا دیو کھڑا تھا۔ احمد نے فوراً تلوار سے پہلے ہی وار میں دیو کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا۔

احمد نے یہ سب کچھ اتنی پھرتی سے کیا کہ دیو کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ہاتھ کٹتے ہی دیو گر پڑا اور گرتے ہی مرگیا۔

احمد جلدی سے پنجرہ کی طرف بڑھا۔ پرندے نے احمد کو دیکھتے ہی خوشی سے خوش آمدید کہا اور بولا "تم بہت بہادر اور نیک دل انسان ہو جو یہاں تک پہنچے ہو۔ میں جانتا ہوں تم میرے پَر حاصل کرنے آئے ہو۔ میں تمہاری بہادری دیکھتے ہوئے تمہیں اپنے پَر دینے کو تیار ہوں۔ یہ کہہ کر پرندے نے اپنے پَر پھڑ پھڑائے تو بہت سے پَر زمین پر گرے جو احمد نے اٹھالیے۔ پَر لے کر جیسے ہی وہ پہاڑ سے نیچے اترا اس کے سامنے اس کا بونا دوست کھڑا تھا۔ اس نے احمد کو مبارک باد دی اور کہا۔ چلو میں تمہیں واپس محل میں پہنچا دوں احمد جب محل میں پہنچا تو اس نے پَر بادشاہ کے سامنے حاضر کیے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر احمد کی بہادری سے بہت خوش ہوا۔ اور پھر اس نے شہزادی کی شادی احمد سے کردی۔ اور احمد کو تخت پر بٹھا کر خود یادِ الٰہی میں مصروف ہوگیا۔ احمد نے اس ملک پر کئی سالوں تک بہت ایمان داری سے حکومت کی ●●

گوہر امروہوی

"میں پھول ہوں چمن کا"

اب مانتی ہے دنیا لوہا مرے وطن کا
ملکوں میں ہو رہا ہے چرچا مرے وطن کا
تعلیم کی بلندی یہ صاف کہہ رہی ہے
ہر بچّہ بن گیا ہے تارا مرے وطن کا
وہ میری سرزمیں کہ "امروہہ" اس کو کہیے
ہوتا ہے نام جس سے اونچا مرے وطن کا
آزادیِ وطن نے جادو سا کر دیا ہے
پربت بنا ہوا ہے ذرّہ مرے وطن کا
کتنے ہی دیش بچّو، آزاد ہو گئے ہیں
دنیا کو مل رہا ہے صدقہ مرے وطن کا

شفاعت پوتہ۔ اسٹریٹ امروہہ۔ مرادآباد۔ یوپی

مہدی پرتاب گڑھی

چیونٹی

دیکھو بچّو ننھی چیونٹی
دانش ور ہے اور محنتی
عزم ہے اُس کا جیسے ہمالہ
اس پہ نہیں چھاتی مایوسی
چڑھ کے بلندی سے گر جائے
بار بار پھر کوشش کرتی
منزل کو پانے کے لیے وہ
جدّوجہد کرتی ہی رہتی
قد سے زیادہ بار اٹھائے
اس کی لگن ہے کتنی سچی
ایک قطار میں چلتی ہے وہ
کرتی ڈسپلن کی پابندی
ہر اک کام لگن سے کریے
ہم کو سکھاتی ننھی چیونٹی

معرفت ایگزیکٹیو انجینئر ارگیشن ڈویژن۔ پرتاب گڑھ

اعجاز علی ارشاد

میں آپ کا دماغ ہوں

آپ نے دنیا کے سات عجائبات کا نام ضرور سنا ہوگا۔ میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ میرے مقابلے میں دنیا کے باقی ساتوں عجائبات کی اہمیت صفر کے برابر ہے۔ میں جیلی کی طرح لجلجے بھورے اور سفید بھٹوں سے بنا ہوا ایک اعشاریہ تین چھے کیلوگرام وزن کا چھوٹا سا حصّہ ہوں۔ میری بناوٹ دنیا کی جدید ترین مشینوں کی بناوٹ سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ میری تشکیل میں کروڑوں باریک رگوں اور ریشوں نے حصّہ لیا ہے۔ دنیا کا کوئی کمپیوٹر ایسا نہیں ہے جو میری طرح مختلف النوع کام کر سکے۔ کیا آپ نے اب تک مجھے نہیں پہچانا؟ میں آپ کے جسم کا ایک اہم عضو یعنی دماغ ہوں۔

شاید میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ میں آپ کے جسم کا صرف ایک حصّہ نہیں بلکہ میں ہی سب کچھ ہوں۔ میں ہی آپ کے ارادوں، آپ کے کاموں اور آپ کی ساری صلاحیتوں کا مالک ہوں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کانوں سے سنتے ہیں، زبان سے چکھتے ہیں اور انگلیوں سے کسی چیز کو چھوکر اس کا احساس کرتے ہیں۔ لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ یہ ساری باتیں میرے ہی اشارے پر عمل میں آتی ہیں۔ کان، زبان اور انگلیاں تو صرف واسطے اور وسیلے ہیں جن کا کام میرے حکم پر عمل کرنا ہے۔ اگر آپ انسانی جسم کو ایک سلطنت مان لیں تو میں اس سلطنت کا بادشاہ ہوں اور دوسرے عہدہ داروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہوں۔

میں کام کرنے سے کبھی نہیں گھبراتا اور نہ ہی میرا کام کبھی بند ہوتا ہے۔ اس وقت بھی جب آپ دن بھر کام کرنے کے بعد تھک ہار کر نیند کی آغوش میں آرام کرتے رہتے ہیں،

الاردکالج۔ باغ پاتو۔ پٹنہ ۔ ۸

میں ایک ایسے مشینی نظام کو کنٹرول کرتا رہتا ہوں جو دنیا کے سارے ٹیلی فون ایکسچینج کی لاکھوں سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ باہری دنیا سے اطلاعات اور خیالات کا جو سیلاب ہر لمحہ آپ کے ذہن کی طرف بڑھتا رہتا ہے وہ آپ کے ذہن کی دیواروں کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دیتا۔ میں اہم واقعات کا انتخاب کرتا ہوں۔ اور اس طرح آپ کو غیر ضروری باتوں کے بارے میں نہیں سوچنے دیتا۔

اگر آپ بیک وقت ریڈیو بھی سننا چاہیں اور کسی کتاب کا مطالعہ بھی جاری رکھنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔ ایک وقت میں انسان اپنی پوری توجہ کسی ایک ہی سمت مبذول کر سکتا ہے کسی دلچسپ ناول کا مطالعہ کرتے وقت آپ ریڈیو پر بجنے والی بہترین موسیقی پر دھیان نہیں دے پاتے اور پروگرام ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ میں ہی اس کا سبب ہوں۔ میں آپ کو ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ وہی کام جو زیادہ ضروری یا پھر زیادہ پسندیدہ ہو۔

اگر خدانخواستہ آپ کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو میں فوراً آپ کی حفاظت کے لیے آگے بڑھتا ہوں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کسی پہاڑی پر سے پھسل جائیں تو میں فوراً آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کسی ابھری ہوئی چٹان کا سہارا لے کر خود کو بچائیں۔ اس ہدایت کے باوجود اگر آپ پہاڑی سے نیچے گر پڑتے ہیں تو میں ہی آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ آپ کو کہاں کہاں چوٹ لگی ہے اور اس چوٹ کا علاج کس طرح ہونا چاہیے۔ لیکن میرا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ میں اس حادثے کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیتا ہوں تاکہ جب کبھی دوبارہ آپ کسی پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش یا ارادہ کریں تو میں آپ کو یہ حادثہ یاد دلا کر احتیاط برتنے کا مشورہ دے سکوں۔

انسانی زندگی کو خارجی خطرات سے محفوظ رکھنے کے علاوہ میں اس کی داخلی طور پر نگرانی کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر ایک نظامِ تنفس کو لیجیے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ؎

نفس کی آمد و شد پر ہے زندگی کا مدار

میں آپ کی سانس کی رفتار پر ہمیشہ گہری نگاہ رکھتا ہوں۔ جیوں ہی حسی قوتوں کے ذریعہ مجھے یہ خبر ملتی ہے کہ آپ کے خون میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار زیادہ ہو رہی ہے اور آپ کو مزید آکسیجن کی ضرورت ہے، میں تنفس کی رفتار کو تیز کر دیتا ہوں۔ اس طرح زیادہ آکسیجن آپ کے پھیپھڑوں میں جاتی ہے جس سے کھنچاؤ کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور سینے کے پٹھوں کو

رام ملتا ہے اسی طرح کے ہزاروں مواقع آتے ہیں۔ جب میں آپ کی حفاظت کرتا ہوں لیکن میری یہ خدمات مفت نہیں ہیں۔ سچ پوچھیے تو میں معاوضہ طلب کرنے کے معاملے میں بے حد لچی ہوں۔ یہی دیکھیے کہ میں آپ کے کل جسمانی وزن کا صرف دو فی صد ہوں۔ لیکن آپ جس قدر آکسیجن استعمال کرتے ہیں اس کا بیس فی صد صرف مجھ پر خرچ ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کا ل جس قدر خون صاف کرتا ہے اس کا پانچواں حصہ صرف میرے استعمال میں آتا ہے۔ مجھے آکسیجن ور خون کی مستقل ضرورت رہتی ہے۔ اگر ان چیزوں کی سپلائی میں ذرا سی کمی آجائے تو میرے م کرنے کی صلاحیت آدھی ہو جاتی ہے اور آپ فوراً بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اگر چند منٹوں کے لیے بھی مجھے میری غذا یعنی آکسیجن اور خون نہ ملے تو میں بری طرح زخمی ہو جاتا ہوں جس کا نتیجہ فالج بھی نکلتا ہے اور موت بھی۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور غذا کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو میں گلوکوز کی شکل ما حاصل کرتا ہوں۔

میں ایک وسیع برّاعظم سے مشابہ ہوں جس کے حالات آج تک صیغۂ راز میں ہیں۔ میرے متعلق تحقیق کرنے والے اب تک میری سطح پر پائی جانے والی باہری لکیروں میں ہی الجھے ہے ہیں۔ لیکن اسی چھان بین کے دوران لوگوں کو میرے بارے میں کچھ دل چسپ باتیں معلوم دی ہیں۔ انھیں میں سے ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ گرچہ ہر طرح کے درد اور تکلیف کا ساس میرے ہی ذریعے ہوتا ہے۔ لیکن خود مجھے کبھی درد کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس وقت ی نہیں جب میرا کوئی حصہ کٹ جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دماغ کا آپریشن مریض کے پوری رح ہوش میں رہتے ہوئے بھی کیا جا سکتا ہے۔

آپ مجھے "یادوں کا محل" بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ میرے مجھوٹے سے وجود میں آپ ساری زندگی اپنی تمام یادوں، نشانیوں اور دستوں کے ساتھ محفوظ رہتی ہے۔ آپ اسے مجھیں یا نہ سمجھیں، اس پر یقین کریں یا نہ کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ میں آپ کی زندگی میں پیش آنے والے ہر واقعہ اور آپ سے متعلق ہر یاد کو محفوظ کر لیتا ہوں۔ اگر آپ کو کبھی مجھے چیر کر دیکھنے موقع ملے تو آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ آپ کو یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوگا کہ میرے ایک س حصے پر بجلی کی رَو کے ذریعے ہلکی سی گدگدی پیدا کرتے ہی آپ کی نظر میں ایک ایسے ستاد کو دیکھنے لگیں گی جسے آپ کافی عرصہ پہلے فراموش کر چکے تھے۔ اسی طرح کسی دوسری ریک سے آپ کے کانوں میں برسوں کا بھولا ہوا کوئی گیت گونجنے لگے گا یا کسی ریلوے

جنوری ۲۰۰۸ء

پیام تعلیم

انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دینے لگے گی۔

میں ایک محفوظ ترین قلعے میں رہتا ہوں۔ کھوپڑی کے اوپری سرے پر تقریباً چھ ملی میٹر اور نیچے کی طرف اس سے بھی زیادہ موٹی ہڈی رہتی ہے۔ میں پانی کی طرح کے ایک سیّال مادّے میں ڈوبا رہتا ہوں جو مجھے ہر طرح کی ضرب اور جھٹکوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ خون اور گودے سے بنی ہوئی ایک حفاظتی دیوار دربان کے فرائض انجام دیتی ہے۔ یہ دیوار کچھ چیزوں کو اندر آنے دیتی ہے اور باقی کو روک دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ گلوکوز کو اندر جانے کی اجازت دے دیتی ہے چونکہ مجھے اس کی ضرورت رہتی ہے لیکن بیکٹیریا اور دوسری زہریلی اشیا کو اندر نہیں جانے دیتی۔ زیادہ تر درد کو زائل کرنے والی اور خواب آور اشیا آسانی کے ساتھ اس فصیل سے گزر جاتی ہے لیکن میری بدقسمتی یہ ہے کہ الکوحل اور اسی طرح کی دوسری نشہ آور چیزوں کو بھی یہ حفاظتی دیوار نہیں روک پاتی ہے۔ یہ چیزیں نہ صرف میری ساخت کو نقصان پہنچاتی ہیں بلکہ میرے فطری فعل پر بھی اثر ڈالتی ہیں جس سے آپ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

میری بناوٹ کے بارے میں بھی تھوڑا جانتے چلیے۔ آپ اپنے لان میں رکھا ہوا کوئی ایسا تختہ میدان سے اٹھایئے جسے چاروں طرف سے گھاس نے ڈھک لیا ہو۔ گھاس کی بے شمار جڑیں ایک دوسرے میں بُری طرح پیوست دیکھ کر آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ میں بھی اسی طرح کی ایک چیز ہوں۔ کروڑوں پتلی پتلی جڑوں اور ریشوں سے بنا ہوا۔ بنیادی طور پر میں تیس ہزار ملین عصبی سیلوں یعنی نیوروں (NEURON) ریشوں سے بنا ہوا ہوں جو اپنے سے ساٹھ ہزار گنا زیادہ تعداد میں موجود ریشوں سے مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ میرا ہر نیوران ایک ایسی مکڑی سے ملتا جلتا ہوتا ہے جو ایک تار میں جڑی ہوئی ہو۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کے دو گردے ہیں اور پھیپھڑے بھی دو ہیں۔ کان بھی دو ہیں اور آنکھیں بھی دو ہیں۔ البتہ میرے بارے میں آپ کو یقین ہے کہ میں کوئی "توأم عضو" نہیں ہوں۔ آپ کا خیال ایک طرح سے غلط ہے۔ سچ پوچھیے تو میں بھی ایک لمبے شگاف کے ذریعہ واضح طور پر دو حصّوں میں بٹا ہوا ہوں۔ ہر ایک آدھے حصے کو آپ دماغی نصف کرہ (CERERAL HEMISPHERE) کہہ سکتے ہیں۔ میرے بائیں حصّے سے آپ کے جسم کی داہنی سمت کے بیشتر کام انجام پاتے ہیں اور میرا داہنا حصہ آپ کے جسم کی بائیں سمت واقع تمام اعضا

وکنٹرول کرتا ہے۔ جدید ترین تحقیق کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ میرا بایاں حصّہ آپ کے بولنے، سننے، لکھنے پڑھنے اور دوسرے دماغی محنت کے کام کرنے میں خاص طور پر معاون ہوتا ہے۔ میرا دایاں حصّہ کسی اتفاقی، فوری اور ہیجانی مسئلے کا حل نکالنے میں مدد کرتا ہے۔

میں نے آپ کو ابتدا میں ہی بتایا تھا کہ میں ان باہری قوتوں کا بدترین دشمن ہوں جو آپ کے جسم یا ذہن کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا چاہتی ہیں۔ اب میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میرے بھی کچھ دشمن ہیں۔ نشہ آور چیزیں میری سب سے بڑی دشمن ہیں۔ اگر آپ نشہ آور چیزیں مستقل طور پر استعمال کرتے ہیں تو دھیرے دھیرے میرے تمام خلیے برباد ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ ں مردہ ہو جاؤں گا۔ اور شاید یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ میری موت آپ کی موت ہے۔ مجھے نقصان پہنچانے والی دوسری چیزوں میں ذہنی جھٹکے اہم ہیں۔ ان ذہنی جھٹکوں ے برے اثرات کا زائل کرنا بڑا مشکل ہے۔ ان مضر اثرات سے محفوظ رہنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ ذہنی جھٹکوں، الجھنوں اور پریشانیوں سے جہاں تک ہو سکے محفوظ رہنے کی شش کریں۔ میرے دشمنوں میں تیسرا مقام "دماغی چوٹ" کا ہے۔ مضبوط کھوپڑی اور جھلیوں کے ذریعہ محفوظ ہونے کے باوجود مختلف طرح کے حادثات اور صدمات کا مجھ پر اثر تا ہے۔ میں چوں کہ ایک طرح کے قلعے میں گھرا رہتا ہوں اس لیے چوٹ یا ضرب لگنے پر پھیل ا نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے خلیے برباد ہو جاتے ہیں اور میں مردہ ہو جاتا ہوں۔

میری کہانی بڑی طویل ہے۔ میرا قصّہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ نہ جانے کتنے پہلوؤں پر میں نی نہیں ڈال سکا۔ آپ نے سورج اور چاند کو ایک معین وقت پر طلوع اور غروب تے دیکھا ہوگا۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ مرغی کے ایک انڈے سے دو بچے پیدا ہوئے، نے کہیں نہ کہیں یہ ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک آدمی کا دل ہٹا کر اس کی جگہ بھیڑ کا دل لگا لیا۔ یہ ساری باتیں حیرت انگیز ہیں۔ لیکن میں پھر بھی کہوں گا ان سب سے زیادہ حیرت قدرت کا سب سے پیچیدہ نظام ہے۔ میں اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ جانے دیتا۔ میں اپنے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہوں کیونکہ آج مجھے بولنے قع ملا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کچھ تھکن محسوس کر رہے ہوں گے۔ میں کا ہمدرد، دوست اور محافظ ہوں اس لیے اب آپ کو آرام کرنے کا مشورہ تا ہوں ●●

مشکیل غلامی۔



برف کی لڑکی

بہت دنوں کی بات ہے کسی گاؤں میں ایک بوڑھا آدمی اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا، ایک گائے تھی۔ ایک بھیڑ تھی اور ایک پیاری سی بلی بھی تھی اگر کوئی کمی تھی تو وہ بچوں کی تھی وہ اس کمی کی وجہ سے بہت اداس رہتے تھے۔ اور اکثر رویا کرتے تھے۔

سردیاں آئیں تو گھٹنے گھٹنے سفید برف سے زمین ڈھک گئی۔ گاؤں کے سبھی بچے گھروں سے نکل پڑے اور سلیج پر گھومنے لگے ایک دوسرے پر برف پھینکنے لگے اور برف کی عورتیں بنانے لگے۔

بوڑھا دیر تک بچوں کو کھیلتے کودتے دیکھتا رہا پھر ایک دم سے اپنی بیوی سے بولا "تم اتنی اداس کیوں ہو؟ دوسروں کے بچوں کو بیٹھے تکنے سے کیا۔ چلو تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ بھول جائیں کہ ہم بوڑھے ہیں، اور باہر چل کر ہم بھی اپنے لیے برف کی عورت بنائیں"۔

بڑی بی نے بھی مزہ لینے کی بات سوچی "ٹھیک ہے چلو باہر چلتے ہیں مگر کیا واقعی ہمیں کسی عورت کی ضرورت ہے"

"تمہارے پاس تو ایک عورت ہے۔ میں جو ہوں، چلو ایک بیٹی بنائیں" دونوں بڑھیا بڈھے اپنے احاطے میں پہنچے اور اپنے لیے ایک لڑکی بنانے لگے۔ پہلے اس کا جسم بنایا پھر اس کا چہرہ بنانے لگے ــــ انھوں نے نیلے رنگ کے موتیوں سے اس لڑکی کی آنکھیں بنائیں۔ سرخ رنگ کے ربن سے اس کے خوبصورت چھوٹے چھوٹے

مسلم ہوٹل گلی متصل درگاہ، گاڑیوالی ہیگھا۔ گیا۔

ہونٹ بنائے، اس کے دونوں گالوں پر ہلکے سے گڑھے ڈال دیے۔ اب ان کی لڑکی ایسی گڑیا کتنی حسین تھی ان دو نئے بوڑھوں کو تو وہ اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ وہ نظریں ہیں ہٹا پا رہے تھے۔ دونوں نے مل کر اس لڑکی کا نام "نیرا" رکھا۔

اچانک نیرا، کے خوب صورت ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی اور اس کے ل گھونگھریالے ہوگئے۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں کو جنبش دی اور ہستہ آہستہ احاطے سے گھر کی طرف چل پڑی۔ دونوں حیرت میں پڑ گئے۔ وہ سوچنے لے کہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں ہم لوگ۔

"ارے دیکھو تو بڑے میاں" بیوی حیرت سے چلائی "ہماری "نیرا" میں جان گئی ہے۔ یہ تو ہماری جیتی جاگتی بیٹی بن گئی ہے"۔ دونوں اس لڑکی کے پیچھے پیچھے گھر کی طرف وڑ پڑے، وہ دونوں بہت ہی خوش تھے۔

اب نیرا دن رات بڑھ رہی تھی اور ہر روز خوب صورت سے خوب صورت تر ہوتی ی تھی۔ اس کے بوڑھے ماں باپ اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کی جلد بالکل برف طرح سفید تھی اس کی آنکھیں نیلے موتیوں کی طرح نیلی نیلی تھیں۔ اس کے کمر تک بے بال تھے۔ بس ایک ہی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس کے لال رنگ ے بنے ہوئے ہونٹ اور گال تھے مگر اس کمزوری کے بعد بھی وہ بے حد حسین تی۔

آخر کار گرمیوں کے خوشگوار موسم کی آمد آمد ہوئی۔ پیڑوں میں نئی نئی کونپلیں ٹنے لگیں۔ شہد کی مکھیاں اپنے چھتوں سے نکل نکل کر میدانوں میں بھن بھنانے یں۔

اسکائی لارک نے گانا شروع کر دیا۔ گاؤں کے سارے بچے خوش تھے اور ی چھوٹی لڑکیاں بہار کے گیت گانے میں مگن تھیں۔ مگر اکیلی نیرا غمگین تھی، وہ کی پر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

گرمیاں آگئیں۔ باغ پھولوں سے بھر گئے۔ کھیتوں میں گیہوں پکنے لگے نیرا ہی غم زدہ تھی وہ سورج کی کرنوں سے خود کو چھپاتی پھرتی۔ سایے دار جگہ ڈھونڈتی پھرتی ——— اور بارش کی تمنا کرتی رہتی۔

بوڑھے بوڑھیا بہت فکر مند تھے "بیٹی تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
لیکن وہ برابر کونوں کونوں میں چھپتی رہتی اور کبھی بھی گھر سے باہر نہیں گئی۔ ایک دفعہ گاؤں کی ساری لڑکیاں جنگل میں رس بھریاں اور سرخ جنگلی اسٹرابیریاں چننے جارہی تھیں انھوں نے نیرا سے بھی ساتھ چلنے کو کہا "نیرا تم بھی چلو نا! ارے چلو بھی" وہ جنگل میں جانے سے ڈرتی تھی اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ باہر گئی تو سورج کی گرمی سے پگھل جائے گی۔
لیکن بوڑھے اور بوڑھیا نے بہت اصرار کیا "کیوں؟ تم لڑکیوں کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں، بڑا اچھا وقت گزرے گا۔"
نیرا نے مجبوراً اپنی ٹوکری اٹھائی اور دوسری ننھی منی لڑکیوں کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی لڑکیاں جنگل میں چہل قدمی کرنے لگیں انھوں نے ہار بنائے، گانے گائے اور گھیرا بنا کر ناچنے لگیں۔
نیرا ایک ٹھنڈے چشمے کے پاس بیٹھ کر اسکی لہروں کو غور سے دیکھنے لگی برف جیسے ٹھنڈے پانی میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر موتی جیسے پانی کے قطروں سے کھیلنے لگی۔
شام آتے آتے لڑکیوں نے اپنے بالوں میں پھول سجائے اور آگ جلا کر اس پر سے چھلانگ لگانے کا کھیل کھیلنے لگیں۔ نیرا بہت خوفزدہ تھی۔ مگر ساری لڑکیاں اس سے اصرار کر رہی تھیں کہ وہ بھی آگ پر سے چھلانگ لگائے۔ بار بار اس کو آگ کے نزدیک ڈھکیل دیتی تھیں اور وہ آگ کے قریب کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی اس کے بال بکھر گئے تھے، اور اس کا چہرہ مردے کی طرح پیلا پڑ گیا تھا...... مگر لڑکیاں حوصلہ بڑھا رہی تھیں اور چیخ رہی تھیں "چلو بڑھو نیرا چلو چھلانگ لگاؤ!"
نیرا چند قدم آگ سے دور ہٹا اور پھر دوڑ کر اس نے چھلانگ لگا دی آگ کے اوپر کچھ سرسراہٹ کی آواز ہوئی اور ایک لمبی کراہ سنائی دی اور نیرا غائب ہو گئی آگ کے اوپر ایک سفید سی بھاپ چھوٹے سے بادل کے ٹکڑے کی شکل میں آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی

(روسی کہانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاگو جگاؤ

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے دین سے نوازا، اپنی کتاب عطا کی، اپنے پیغام بر بھیجے، تاکہ ہمیں سچا راستہ معلوم ہو، ہم گم راہ نہ ہوں اور ہم دین اور دنیا میں فلاح پائیں۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ آپؐ پر اللہ نے قرآن نازل کرکے اپنے دین کی تکمیل کر دی۔ ہم پر جس طرح اللہ کی اطاعت فرض ہے اسی طرح اللہ کے رسول کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو":

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

گویا اللہ کا حکم ماننا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی ضروری رسولؐ کا حکم ماننا بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولؐ سے بہت محبت ہے، اس لیے رسول اللہؐ کی محبت بھی مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی پہنچائے۔ جو شخص رسول اللہؐ کی پیروی کرے گا، اطاعت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہو گا، اس سے محبت کرے گا اور اس کے گناہ بخش دے گا۔

اللہ کے رسولؐ نے اللہ کے احکام پر خود عمل کرکے ہمیں زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ بتایا اور عملی نمونہ دکھا دیا۔ یہ آپؐ کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ ہم اس عملی نمونے کے مطابق عمل کرکے ہی اس احسان کو مان سکتے ہیں۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

بچّوں کی مذہبی کتابیں

پیارے رسولؐ	سُلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
اللہ کے صفی	خلیل احمد جامعی	۲/۰۰
حضرت نظام الدینؒ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۲/۰۰
سرکار کا دربار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
قاعدہ یسّرنا القرآن		۲/۲۵
ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم)	سیّد شہاب الدین دسنوی (فی حصّہ)	۷/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل، دوم)	عبد الواحد سندھی (فی حصّہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	" "	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اوّل، دوم)	" "	۱۳/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "	۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	" "	۶/۵۰
رسول پاکؐ	" "	۶/۰۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰۰
رسول پاکؐ کے اخلاق	" "	۳/۰
اللہ کے خلیل	" "	۳/۰۰
تحسین القرآن	تالیف: خدیجہ سیّدنا طاہر سیف	۴/۵۰
منہاج القرآن	" " " "	۴/۵۰
ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
عقائدِ اسلام	"	۳/
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
آں حضرتؐ	"	۳/۰۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبد الحیٔ فاروقی	۶/۰۰
نبیوں کے قصّے	" "	۵/-
ہمارے رسولؐ	" "	۴/۵۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۴/۰۰
ہمارے نبیؐ	سیّد نواب علی	۲/۰۰
سرکارِ دو عالمؐ	محمد حسین حسّان	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

منوّرہ نوری خلیق

حضرت ایّوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ حضرت اسحٰق بن ابراہیمؑ کی اولاد تھے۔ ان کا وطن ملکِ شام تھا جہاں ایک مخصوص علاقہ "عوض" کے سردار ہونے کی حیثیت سے ان کی بہت عزت تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کے معلم بھی تھے، انھیں بھلائی اور خیر کی ہدایت کرتے تھے۔ ان کی حیثیت اس وقت اتنی تھی کہ ملکِ شام کا کوئی خاندان ان کے خاندان کی برابری نہیں کرسکتا تھا۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے اولاد کی صورت میں سات بیٹے اور تین بیٹیاں عطا فرمائی تھیں۔ دولت کا بھی کچھ شمار نہ تھا۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل، دس ہزار بھینسیں اور گائیں تھیں۔ بار برداری کے جانوروں میں ایک ہزار سے زائد گدھے پانچ سو گھوڑے، دو سو ہاتھی اور متعدد گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ لونڈی اور غلاموں کی کوئی تعداد نہ تھی جو صرف حضرت ایوب علیہ السلام کی خدمت پر مامور تین جوان تھے۔ کشادہ گھر جہاں عیش کے تمام سامان میسر اور محبت کرنے والی چار بیویاں جن میں ایک بیوی رحمت بنتِ افرائیم بن یوسف تھیں۔ ان کے بال بہت دراز اور خوبصورت تھے۔

پیارے بچو! آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ہم نے حضرت ایوب علیہ السلام کی دولت کا اس قدر وضاحت سے ذکر کیوں کیا ہے جبکہ کسی اور نبی کے بارے میں ان باتوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اس خوشحالی، مرتبہ اور دولت سے شیطان جلتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور خدا کی نظروں سے اسے گرا دینا چاہتا ہے۔ جو بندہ بھی اپنے اعلیٰ اطوار کے سبب خدا کو عزیز ہو جاتا ہے، شیطان اسے نافرمانی پر اکسا کر خوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام بھی اپنی بے پناہ دولت سے لوگوں کو زندگی کی آسائش عطا کرتے اور ان سب کو ایک خدا کی عبادت کی تلقین کرتے تھے۔

ابھی تک آپ کو نبوت عطا نہ کی گئی تھی لیکن راست بازی، سخاوت اور انسانی ہمدردی کے تحت سب انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ صبح گھر سے نکل کر لوگوں میں جاتے، انھیں ہدایت کرتے: "لوگو! ہر کام اور ہر بات کی ابتدا کرنے سے پہلے خدا کی تعریف کیا کرو۔ اللہ ہی سب کا معبود، نگہبان، رزاق اور مالک و مختار ہے۔ اس کا اصول ہے کہ جو بندہ اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرتا رہتا ہے اسے زیادہ سے زیادہ نعمتیں عطا فرماتا ہے اور اللہ کی نعمتوں میں سب سے پہلی نعمت یہ ہے کہ اس نے تمھیں تمام مخلوقات میں افضل بنایا۔ عقلِ سلیم عطا فرمائی۔ بولنے کی قوت بخشی، ارادہ و عمل کی طاقت دی۔ سو اب تمھارا فرض ہے کہ اچھی بات اور اچھے کام سے تمام انسانوں کو فائدہ پہنچا کر اس کا شکر ادا کرو اور اسی کی عبادت کرو۔"

یہ نصیحت کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ جاتے اور جہاں جسے بھی دکھ اور غم میں محسوس کرتے اس کا غم دور کرنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح دن گزر جاتا۔ شام کو ملاقاتی جمع ہوتے۔ انھیں اپنے اپنے مسائل سناتے جنھیں وہ محبت سے سنتے۔ انھیں اپنے گھر سے کھانا کھلاتے اور رات ہوتی تو ان کے تین خاص غلام تمام علاقے کا حال انھیں بتاتے۔ جب انھیں یقین ہو جاتا کہ اس وقت ان کے علاقے کے سب لوگ چین سے سو گئے ہیں، سب نے کھانا کھا لیا ہے اور کسی کو کوئی غم نہیں تب وہ کھانا کھاتے اور اپنے خدا کی عبادت میں مصروف ہو جاتے۔

یہ ان کا ہر روز کا معمول تھا۔ شیطان سے ان کی اطاعت اور خدا کی عبادت برداشت نہ ہوتی۔ اس نے کئی مرتبہ انسان کا بھیس بدلا اور ان کے پاس آکر ذہن کو الجھانے والی باتیں کرنے لگا۔ کبھی ان کے دل میں خیال ڈال دیتا: "ایوب بن زارح! تم ایک اعلا انسان ہو۔ سب تمھاری عزت کرتے ہیں تمھیں خود پر فخر کرنا چاہیے۔"

اس خیال کے آتے ہی حضرت ایوب علیہ السلام اپنے رب کی تسبیح کرنے لگتے۔ لاحول پڑھتے تو شیطان بھاگ جاتا لیکن پھر آتا۔ کبھی دوسروں کے لیے بُرے خیالات اور کبھی ان کے لیے تعمیری سوچیں دل میں ڈالتا رہتا لیکن کامیاب نہ ہوتا۔ اس طرح کچھ وقت گزر گیا اور حضرت ایوب علیہ السلام کی عمر پچاس برس کی ہو گئی۔ ان دنوں وہ دینِ ابراہیمی پر کاربند تھے اور دوسروں سے بھی خدائے واحد کی عبادت کراتے تھے۔ تنہائی میں خدا کی عبادت کر کے سب کے لیے خیر طلب کرنا ان کی عادت تھی جس کے باعث خدا انھیں عزت اور خیر عطا کرتا جاتا تھا اور شیطان کو خدا کی اپنے بندے کی طرف توجہ سخت اذیتیں دے رہی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس نے خدا کے حضور شکوہ کیا: "اے خدا! دنیا بھر کی

سورۃ الانعام	٦

۱. سورۃ "الانعام" کا نزول مکہ شریف میں ہوا، یہ مکی سورۃ ہے
۲. نزول کے اعتبار سے سورۃ الانعام قرآن پاک کی ۵۵ ویں آیت ہے
۳. سورۃ "الانعام" قرآن مجید کے ساتویں پارے "اذا سمعوا" اور آٹھویں پارے "ولو اننا" میں موجود ہے۔
۴. موجودہ ترتیب کے لحاظ سے یہ قرآن کی چھٹی (۶) سورۃ ہے
۵. سورۃ "الانعام" میں کل بیس (۲۰) رکوع ہیں
۶. سورۃ "الانعام" قرآن مجید آٹھویں پارے "ولو اننا" کے ساتویں رکوع پر ختم ہوتی ہے۔
۷. سورۃ "الانعام" کل ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) آیات ہیں

(سید امیر الحسن)

نعمتوں کے حاصل کر لینے کے بعد بھی شکر اور عبادت نہ کرنا عجیب بات ہے۔ اتنا بہت کچھ عیش و آرام تو جسے بھی دیتا وہ اطمینان کے ساتھ تیری عبادت ضرور کرتا۔ بات تو جب ہے کہ دکھوں میں گھر کر تجھے یاد کیا جائے اور وہ کوئی بھی انسان نہیں کر سکتا۔"

شیطان کا خیال تھا کہ خدا اگر اپنے اس بندے سے تمام نعمتیں اور راحتیں چھین لے تو وہ نہ خود عبادت کرے گا نہ دوسروں کو اس کی ہدایت کر سکے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسانی عظمت کو آشکار کرنے کے لیے ان کی آزمائش کا فیصلہ کیا یا پھر نبوت عطا کرنے سے قبل ان میں صلاحیت پیدا کرنا ضروری تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا۔ اس وقت ملک شام کے ایک بڑے عالم، علاقہ عوض کے جلیل القدر سردار اور انسانوں سے محبت کرنے والے ایک عظیم انسان پر بہت سخت وقت آنے والا تھا۔ جس کے لیے پے در پے مصیبتوں کی ابتدا ہو گئی اور ایک رات باہر سے بلند ہونے والے شور کی آواز سے سب گھر والے بیدار ہو گئے۔ انہوں نے سنا باہر سے غلام اطلاع دے رہے تھے "علاقہ عوض کے معزز آقا! مال و اسباب کے گوداموں میں آگ لگ گئی ہے"

مال و اسباب کے گودام ایک بہت بڑی عمارت کی صورت میں تھے جہاں غلہ، کپڑے، ضرورت

کی ہزاروں اشیا محفوظ رہتی تھیں۔ اس کی مالیت اتنی تھی کہ اندازہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس نقصان نے سب گھر والوں کو حیران و پریشان کر دیا۔ علاقے بھر کے لوگ آگ بجھانے کے لیے دوڑ پڑے مگر جتنی کاوشیں کی جا رہی تھیں آگ اتنی ہی پھیل رہی تھی۔ اس طرح صبح ہو گئی اور ان کی تمام دولت جل کر خاک ہو گئی۔ انھوں نے راکھ کے اس ڈھیر کو دیکھا اور بولے: "ہر شے خدا کی جانب سے ہے اور خدا کی جانب لوٹنے والی ہے۔ اے خدا آج ایوب بن زارح تیرا شکر ادا کرتا ہے کہ جو مال و دولت آج تو نے واپس لیا ہے کبھی اسے عطا بھی کیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی صبح کی عبادت کے لیے چلے گئے۔ اس دن ان کے گھر چاروں بیویاں اور لونڈیاں بین کر کے روتی اور تباہی کا غم کرتی رہیں لیکن انھوں نے اپنے رواج کے مطابق وہ دن گزارا۔ ملاقاتیں بھی کیں۔ ضرورت مندوں کی حاجتیں سنیں اور پوری کیں اور رات کو عادت کے مطابق دس مسکینوں کو کھانا بھی کھلایا۔ سب حیران ہوتے رہے کہ اتنے تباہ کن نقصان پر غم کرنے کی بجائے وہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہ دستور عبادت کر رہے تھے۔ چند دن یونہی گزر گئے۔ ابھی یہ غم کم نہ ہوا تھا کہ ایک شام جب وہ اپنے تین خاص غلاموں کا انتظار کر رہے تھے جو انھیں دن بھر کے معمولات اور اہلِ علاقہ کے حالات کی خبر دیتے تھے، عین اس وقت ان میں سے ایک غلام حاضر ہوا اور عرض کیا: "علاقۂ عوض کے عظیم سردار! جو تجارتی قافلہ شام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اثنائے راہ میں لوٹ لیا گیا۔ مال و دولت لٹ گیا اور جو غلام اس کے ساتھ تھے قتل کر دیے گئے۔"

اس وقت گھر والوں کا بُرا حال تھا جو لوگ دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ روتے پیٹتے ہوئے اٹھنے لگے۔ بیویاں اور لونڈیاں دہائی دینے لگیں۔ اس لمحہ حضرت ایوب علیہ السلام نے ان سب کو بڑے ہی افسوس سے دیکھا اور بولے: "عجیب بات ہے، تم انسان کس قدر ناشکرے ہو کہ جب مالکِ حقیقی خوشیاں عطا فرماتا ہے، تجارتی قافلے کامیابی کے ساتھ واپس آتے ہیں تب شکر ادا کرنا بھول جاتے ہو لیکن نقصان کی خبر سن کر واویلا کرتے ہو۔ کبھی شدتِ غم میں اسے بھول جاتے ہو کبھی ہجومِ عیش میں۔ بھلا مجھے بتاؤ کہ پھر اس کا شکر ادا کرنے اور حمد کرنے کا کون سا وقت ہے؟"

ان کے اس سوال کا جواب کوئی نہ دے سکا سوائے ان کی ایک بیوی رحمت بنتِ افرائیم کے۔ اس پہلی مصیبت کے بعد تو جیسے مصائب کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابھی یہ نقصان پورا نہ ہوا تھا کہ بھیڑ بکریوں کا گلہ اپنے اپنے چرواہوں کے ساتھ سبزہ زاروں میں گیا تو خبر ملی کہ چرواہا ہوا

کو قتل کر کے کوئی بکریوں کو لوٹ کر لے گیا۔ کون لے گیا؟ کہاں لے گیا؟ کوئی نہ جان سکا۔ پھر بھینسوں میں بیماری عام ہوئی تو دس ہزار بھینسیں اور گائیں چٹ پٹ ہو گئیں۔ بارش کا شدید طوفان آیا۔ ژالہ باری ہوئی تو بار برداری کے جانور یعنی اونٹ، گھوڑے، گدھے بجلی گرنے سے خاک ہو گئے اور بہت کم وقت میں اس گھر کو بربادی اور مفلسی نے گھیر لیا۔ شروع شروع میں ساتھ رہنے والے ملاقاتی اور ہر دم کے مہمان حیران ہوئے۔ غلّہ اور سامانِ عیش ختم ہوا۔ غلام اور وفادار قتل ہو گئے۔ تب دوسرے لوگ ساتھ چھوڑنے لگے۔

سب سے پہلے ملاقاتی و مہمان کم ہوئے، پھر لونڈی غلاموں نے دوسرے گھر دیکھے جہاں خوشحالی و عیش کے دور چل رہے تھے۔ انجام یہ کہ جہاں ہر دم ہجوم رہتا تھا اب چار بیویوں، دس بچوں اور تین خاص شاگردوں کے سوا کوئی نظر نہ آتا لیکن وہ بھی ایسے کہ جب حضرت ایوب علیہ السلام اپنی عبادت سے لوٹتے تو تینوں بیویوں کو روتے اور خدا کا گلہ کرتے ہوئے دیکھتے۔ تب انھیں سخت رنج ہوتا۔ انھیں سمجھاتے۔ صبر کی تلقین کرتے اور معمول کے مطابق جو کچھ موجود ہوتا اسی پر خدا کا شکر ادا کرتے۔ اس بات کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دن جب ان کے سب بچے مکتب میں سبق لے رہے تھے کہ کسی نے انھیں عبادت خانے میں جا کر خبر دی کہ اے علاقہ عوض کے عظیم سردار! مکتب کی چھت گر جانے سے آپ کے سب بچے مر گئے۔

یہ خبر ایسی تھی کہ ان کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ سب بچے چاروں بیویوں کے ہی تھے۔ سب ہی اپنے بیٹوں کو یاد کر کے سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ کسی نے اپنا منہ پیٹ لیا، کوئی بال نوچنے لگی، کسی نے دہائی دی اور کوئی اللہ سے گلہ کرنے لگی۔

غم تو حضرت ایوب علیہ السلام کو بھی تھا لیکن ہر جذبے پر خدا کی رضا کا خیال تھا۔ لہٰذا ساری بیویاں چلانے اور دہائی دینے لگیں تو انھوں نے کہا "تم لوگ وہ بات مت کہو جو مالکِ حقیقی کو پسند نہ آئے اور خوب یاد رکھنا کہ مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ خدا کسی انسان کی زبان کو شکوہ کرنے کا عادی بنا دے۔ لہٰذا جب تک ایک سانس بھی باقی ہے، شکر ادا کرتے ہی رہنا چاہیے"

اس وقت ان کی بیویوں نے نے حیرانی سے دیکھا۔ ایک کے علاوہ سب کی آنکھوں میں شکایت اور ناگواری کے انداز تھے۔ شاید وہ سوچ رہی تھیں کہ اس انسان کو ہمارے دکھ کا احساس نہیں ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو یکے بعد دیگرے مصیبت نازل ہونے اور برباد ہو جانے کا احساس تو تھا لیکن وہ دولت رخصت ہونے، تمام اولاد کے مر جانے اور اپنے برباد ہونے کو خدا کی حکمت تصور کر کے صبر کر رہے تھے۔

اس زمانے میں وہ ہر دم تنہا بیٹھے خدا کی حمد کرتے رہتے۔ اب کوئی ان کے پاس نہ آتا اور جو صبح و شام آتے تھے وہ بھی آتے تو رسمی باتیں کر کے چلتے بنتے۔ تب وہ سوچتے کہ دُنیا کا ہر رشتہ ہر تعلق ناپائیدار ہے۔ دولت، عیش و آرام کی طرح دوستی اور دُنیا کے سب ناتے بھی ناقابلِ یقین ہیں۔ اگر ہر دم ساتھ دینے والی ہستی ہے تو صرف اللہ کی۔ یہ خیال انھیں اور بھی زیادہ عبادت کی طرف مائل کر دیتا۔

ایک دن وہ تنہا بیٹھے ہوئے خدا کی حمد کر رہے تھے کہ انھیں اپنے پہلو میں کھجلی محسوس ہوئی۔ انھوں نے کھجایا پھر ہاتھ سے تسکین نہ ہوئی تو ایک ٹھیکری سے اس جگہ کو رگڑنے لگے، لیکن انھیں محسوس ہوا کہ یہ ایک زخم ہے جو پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ علاقے کے طبیب کو ناسازیِ طبع کا علم ہوا تو عیادت و علاج کی غرض سے حاضر ہوا، لیکن ان کا پہلو دیکھ کر حیران ہوا اور بولا "جناب یہ معمولی زخم نہیں ہے بلکہ جلے ہوئے پھوڑے ہیں۔ اس سے جسم کا گوشت گل جاتا ہے اور حکمت میں اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔" اس خبر کو سُن کر چند لوگ آئے۔ لیکن ان کی بیماری کو مہلک تصور کرتے ہوئے دوبارہ نہ آئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے نہ کسی کا گلہ کیا نہ کسی دکھ کا اظہار بلکہ اپنے معمول کے مطابق برابر شکر ادا کرتے رہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی خیر و عافیت طلب کرتے۔ لیکن وقت نئے نئے واقعات کو جنم دیتے ہوئے گزرتا رہا۔ چھوٹا سا ایک زخم پھیل کر سر سے پیر تک کے گوشت کو گلاتا رہا۔ پھر ان زخموں میں کیڑے پڑ گئے۔ شروع شروع میں بیویوں نے ہمدردی کی لیکن ان کی گرتی ہوئی حالت کے سبب تھکنے لگیں۔ طبیب کے کہنے کے مطابق گوشت کا گل جانا اور زخموں میں کیڑے پڑ جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اوپر سے حالت یہ تھی کہ سب لونڈیاں بھاگ گئی تھیں۔ اب خدمت کا ہر کام بیویوں کو خود کرنا پڑتا تھا سو وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ کراہت کرنے اور بیزار ہونے لگیں اور جوں جوں حضرت ایوب علیہ السلام کی کمزوری اور ان کے جسم میں کیڑوں کی تعداد بڑھتی گئی، دوسرے تمام لوگوں کی طرح بیویاں بھی ان سے بچنے لگیں۔ شروع میں سب جمع رہتیں پھر انھوں نے صبح و شام کے اوقات مقرر کر لیے جو صبح کو ان کے پاس آتی شام کو نہ آتی اور شام والی صبح نہ آتی۔ ایک بیوی کے علاوہ سب کے

انداز عجیب تھے۔ جب وہ خدا کا شکر ادا کرتے تو وہ ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہتیں: "اتنی بربادی پر بھی خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں، کہیں ان کی عقل میں فتور تو نہیں آگیا؟"

"شاید کچھ محسوس کرنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ بھلا ایسی حالت میں انھیں کیسے سنبھالا جائے گا۔ یہ تو بہت ہی مشکل کام ہے۔"

ایسے میں حضرت ایوب علیہ السلام کو محسوس ہوتا کہ ہر ناتا ٹوٹ گیا ہے۔ تب وہ گہرا سانس لے کر کہتے: "خدا سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے میری زبان کو پاک صاف رکھا اور میرے دل کو اپنی یاد سے بھر دیا۔"

کچھ وقت اور گزرا تو حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم کے اندر سے بو پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ انھیں محسوس ہوا کہ گنی چنی چند ساتھی جو ساتھ تھیں کچھ اور سمٹ گئیں۔ ایسے میں انھوں نے ایک دن اپنی بیویوں اور تین شاگردوں کو بلا کر کہا: "سنو! بہترین ساتھی اور مددگار تو صرف خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہے لیکن تم لوگوں نے بھی میرا بہت ساتھ دیا ہے جبکہ اب برسوں ہو گئے ہیں تمھیں وہ عیش و آرام بھی نہ دے سکا جو کبھی دیا کرتا تھا اور اب آیندہ کے لیے شاید مصائب اور زیادہ گھیر لیں لہٰذا میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ کہیں جانا چاہو تو میرا ساتھ چھوڑ دو۔ مجھے کوئی گلہ نہ ہوگا۔"

اس وقت بیویاں کچھ دیر کے لیے افسردہ ہوئیں۔ تین بیویوں نے زیادہ دکھ کا اظہار کیا۔ لیکن رحمت بنت افرائیم بن یوسف (علیہ السلام) رو پڑیں اور بولیں: "علاقہ عوض کے عظیم سردار! میں نے آپ کی صحت مندی اور دولت مندی کے زمانے میں آپ کے ساتھ عیش کیے ہیں۔ قسم ہے خدائے بزرگ و عظیم کی کہ مفلسی اور دکھوں میں بھی آپ کا اسی طرح ساتھ دوں گی۔"

حضرت ایوب علیہ السلام نے انھیں خیر و عافیت اور ہمت و استقلال کی دعائیں دیں اور باقی تین بیویوں کو رخصت کر دیا۔ یہی زمانہ تھا جب ان کا مرض اور بڑھ گیا۔ زخموں سے شدید بو آنے لگی۔ اب جو لوگ نزدیک آتے ناک پر کپڑا رکھ لیتے اور بس رسم عیادت کرتے اور بھاگ جاتے۔ اکثر لوگ وہ تھے جنھوں نے اس کیفیت کو محسوس کیا اور دوبارہ نہ آئے اور جو آئے وہ ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "ایوب بن زارح! آپ اپنا معقول علاج کرائیے ورنہ علاقے میں بدبو ہی نہیں بلکہ یہ بیماری بھی عام ہو جائے گی۔"

اس وقت حضرت ایوب علیہ السلام نے محسوس کیا کہ انھیں لوگ عوض کا سردار سمجھنے کے بجائے حضرت ایوب بن زارح سمجھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا: "بے شک سب سرداری، عزت اور تعریف کے قابل ایک

ہی ذات ہے۔ باقی سب کی عزت تو بس وہی ہے جو وہ عطا فرما دے۔"

لوگ ان کے صبر و شکر کو ناپسندیدہ انداز سے دیکھتے اور کمزوری و لاچاری پر محمول کرتے ہوئے چلے جاتے۔ یہ انداز و دل آزاریاں غیروں سے ہی نہیں بلکہ اپنوں سے بھی نصیب ہوتیں۔ سب ان کے اچھے دور کی سخاوت و مہمان نوازی اور کشادہ دلی کو بھول گئے تھے۔ کبھی جو فیض حاصل کرنے کے لیے ان کے در پر آتے تھے اب ناگواری سے دیکھتے۔ اب ان کی زندگی بہت محدود ہو گئی تھی۔ گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ایک بیمار زخمی اور دوسری ان کی بیوی رحمت بنتِ افرائیم جو محنت مزدوری کرتیں اور جو کچھ حاصل ہوتا ان کی غذا اور دوا پر صرف کر دیتیں اور اس سے جو وقت ملتا ان کی خدمت کرتیں۔ ان کے ہاتھ پیر دھلاتیں، عبادت کے لیے سہارا دے کر بٹھاتیں، کپڑے میلے ہوتے تو دھوتیں اور جہاں وہ لیٹے رہتے اسے صاف کرتیں لیکن زخموں میں بو پیدا ہوئی تو طبیب نے صاف انکار کر دیا۔ اب آرام آنے کی ہر امید ختم ہو چکی تھی۔ زبان کے سوا ہر جگہ زخم پڑ گئے تھے اور ہر زخم کیڑوں کی غذا تھا۔ جب بھی پیٹ میں غذا پہنچتی سب کیڑے حرکت کرنے لگتے اور وہ بھوکے ہوتے تو یہی کیڑے ان کا گوشت نوچتے۔

الغرض کہ تندرستی و خوش حالی میں وہ سب انسانوں کو فیض پہنچانے والے حالتِ مرض و لاچاری میں کیڑوں کی غذا بن گئے تھے۔ طبیب نے ہر طرح سے مایوس کر دیا تو علاقے کے معززین اپنی بقا و سلامتی کے لیے انھیں علاقے سے نکال دینے کی سوچنے لگے۔ شروع میں مرض کے پھیل جانے اور جگہ کے تعفن سے بھر جانے کی گفتگو ہوتی۔ اس طرح انھیں ستایا جاتا۔ لیکن ایک دن معززین نے باقاعدہ پیغام بھیجا: "ایوب بن زارح! تم خود اس علاقے کو چھوڑ دو اور ہماری اولادوں پر رحم کرو۔ کیوں اپنی بیماری کو سوغات سمجھ کر تقسیم کرنا چاہتے ہو۔ عزت کے ساتھ چلے جاؤ تو اچھا ہے، ورنہ ہم خود نکال دیں گے۔"

حضرت ایوب علیہ السلام نے اس پیغام کو تحمل سے سنا اور بولے "میرے عزیزو! گھبراؤ نہیں میں خود اس علاقے سے کہیں دور جانے کی سوچ رہا ہوں۔"

(باقی آئندہ)



کالی بلا

صلابت نگر کے رہنے والے اس کالی بلا کے ہاتھوں تنگ آ چکے تھے جو اکثر رات کے وقت بستی پر حملہ کر دیتی۔ جس گھر میں کالی بلا داخل ہوتی اس کے رہنے والے تمام لوگ صبح کے وقت زخمی اور بے ہوش پائے جاتے۔ ان کے چہروں پر ایسے نشان ہوتے جیسے کسی جانور نے اپنے پنجوں سے انھیں کھروچ کر رکھ دیا ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رات کے وقت بستی میں باہر سے آنے والے مسافروں پر یہ بلا حملہ کر دیتی۔ یہ واقعہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں موٹریں اتنی عام نہیں تھیں۔ بہت زیادہ امیر لوگوں میں سے صرف چند کے پاس موٹر گاڑیاں ہوتی تھیں، لوگ عام طور پر گھوڑا گاڑیوں میں سفر کرتے تھے جنھیں بگھی کہا جاتا تھا۔ رات کے وقت اگر کوئی شخص اس طرح بگھی میں بیٹھ کر صلابت نگر کی طرف آتا تو کالی بلا ان پر حملہ کر دیتی۔ گھوڑوں کو بھی زخمی کر دیتی اور مسافروں کو بھی۔ جن لوگوں نے اس کالی بلا کو دیکھا تھا ان کا کہنا تھا کہ کالی بلا کی شکل عجیب ڈراؤنی سی تھی۔ چہرہ بھیڑیے اور شیر سے ملتا جلتا تھا، یعنی کان اور سر کا اوپری حصہ بھیڑیے جیسا تھا، لیکن منہ شیر کی طرح چوڑا تھا اس کی لمبی سی دم بھی تھی، لیکن پورا جسم آدمیوں جیسا تھا، البتہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں شیر کے پنجوں کی طرح تھیں۔ سر سے پیر تک اس کا رنگ کالا تھا۔ اسے دیکھ کر آدمی ڈر جاتے تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ یہ کالی بلا جس کسی پر حملہ کرتی وہ تو اسے دیکھتے ہی ڈر کے مارے بے ہوش ہو جاتا پھر جب اسے ہوش آتا تو اس کا سارا سامان بھی غائب ہوتا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ان کے قیمتی کپڑے غائب ہو جاتے۔ کالی بلا کے سلسلے میں دوسری عجیب بات یہ تھی کہ لوگوں نے اسے گھوڑے پر بیٹھے بھی دیکھا تھا۔ رات کے وقت صلابت نگر آنے والے مسافروں

سا کہنا تھا کہ ان کی آنکھوں پر جب کالی بلا نے حملہ کیا تھا اس وقت وہ گھوڑے پر سوار تھی۔ اس کے گھوڑے کا رنگ بھی بالکل کالا تھا۔

کالی بلا کے حملوں کے واقعات اتنے زیادہ بڑھ گئے تھے کہ صلابت نگر میں ہر وقت اور ہر جگہ اسی کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہاں کے رہنے والے کالی بلا کو جن یا بھوت سمجھنے لگے تھے۔ کوئی کہتا کہ اس نے تو کالی بلا پر گولی بھی چلائی تھی، لیکن اس پر گولی کا اثر نہیں ہوا۔ کوئی کہتا کہ اس نے بلا کو برچھے سے مارنے کی کوشش کی تھی، لیکن برچھا اس کے قریب پہنچ کر خود بخود دوسری طرف مڑ گیا۔ کوئی کہتا کہ اس نے کالی بلا کو حملہ کرنے سے پہلے عجیب سی آواز نکالتے بھی سنا ہے اور اس کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے دو بلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں یا کوئی چھوٹا بچہ ڈر کر چیخ رہا ہو۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بہر حال انہی باتوں کی وجہ سے لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ کالی بلا واقعی کوئی بھوت ہے۔ پہلے تو لوگوں نے ڈر کے مارے رات کے وقت گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا، لیکن اس طرح بھی کالی بلا سے جان نہیں بچی۔ وہ تو خود لوگوں کے گھروں میں گھس جاتی تھی۔ کوئی کہتا کہ کالی بلا سے نجات پانے کے لیے پولیس کو اطلاع دینی چاہیے، تو دوسرا شخص کہتا کہ "جن بھوتوں کا پولیس کیا بگاڑے گی۔ اس کے لیے تو کسی اچھے آدمی سے تعویذ گنڈے کرانے چاہییں۔ کوئی کہتا کہ اس بلا کو ٹالنے کے لیے صدقہ کرنا چاہیے، قربانی دینی چاہیے۔ غرض جس کی سمجھ میں جو بات آجاتی وہ اسی کو درست سمجھ کر کالی بلا سے نجات پانے کے سلسلے میں اپنا مشورہ دے دیتا۔

صلابت نگر میں کالی بلا کے متعلق ہونے والی باتیں نواب شجاعت جنگ کی حویلی تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ یہ چھوٹی سی بستی نواب شجاعت جنگ کے دادا نواب صلابت جنگ نے اپنے نام پر بسائی تھی۔ اس طرح اب یہ بستی نواب شجاعت جنگ کی ملکیت تھی۔ غریب آدمی یہ سمجھتے تھے کہ بستی کا مالک یا رئیس انھیں اس مصیبت سے ضرور نجات دلا دے گا۔ اس لیے ایک دن بستی کے کئی آدمی مل کر نواب شجاعت جنگ کے پاس آئے اور سارے واقعات انھیں سنا کر ان سے کہا:

"نواب صاحب! کسی طرح صلابت نگر کے رہنے والوں کو اس مصیبت سے بچائیے ورنہ آپ کے دادا کی بسائی ہوئی بستی ویران ہو جائے گی، کیوں کہ اب تو صلابت نگر کے رہنے والے اکثر لوگ بستی چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں آباد ہونے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔"

نواب شجاعت نے سب کی باتیں سنیں اور دل ہی دل میں کانپ کر رہ گئے، کیوں کہ یوں تو وہ بہت اچھے شکاری تھے۔ انھوں نے کئی شیر مارے تھے، لیکن جنوں اور بھوتوں سے وہ بھی بہت ڈرتے تھے۔ اصل میں ان کی دادی نے بچپن میں انھیں جنوں اور بھوتوں کی ایسی ایسی کہانیاں سنائی تھیں کہ نواب صاحب کے دل میں بھی جنوں کا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب شکار پر جاتے تو جانور کی طرف بندوق تان کر گولی چلانے سے پہلے تین بار چلا کر

"اگر تو کوئی جن بھوت ہے تو چلا جا ورنہ گولی چلاتا ہوں۔"

اگر جانور ان کی آواز سے بھاگ جاتا تو وہ یہ سمجھ لیتے کہ یہ ضرور کوئی جن تھا یا بھوت، جب ہی تو بھاگ گیا۔ اگر جانور کے کانوں تک آواز نہیں پہنچتی اور وہ اپنی جگہ کھڑا رہتا تو یہ گولی چلا دیتے۔ شیر کے شکار پر تو رات کے وقت جانا ہوتا ہے، چناں چہ وہ جب بھی شیر کے شکار پر جاتے تو دو چار آدمیوں کو اپنے ساتھ رکھتے "تاکہ کوئی جن یا بھوت حملہ کرے تو یہ لوگ انھیں بچا لیں۔ بہر حال وہ بستی کے آدمیوں پر اپنے دل کا حال تو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ آخر بستی کے نواب تھے، چناں چہ انھوں نے کہا:

"بھئی جن بھوت سے کیسے مقابلہ کیا جائے۔ بہر حال آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں کسی بزرگ سے مشورہ کر کے جلد ہی اس بلا کا خاتمہ کر دوں گا۔"

نواب صاحب کے اطمینان دلانے پر صلابت نگر کا وفد واپس چلا گیا۔ جب یہ وفد نواب صاحب سے باتیں کر رہا تھا اس وقت نواب صاحب کا لڑکا مرزا دانش بھی موجود تھا۔ مرزا دانش اپنے نام کی طرح بہت عقل مند تھا اور بہادر بھی۔ اس کی عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہیں تھی، لیکن دیکھنے میں وہ پورا جوان آدمی نظر آتا۔ اس زمانے کے لحاظ سے مرزا دانش بہترین تلوار بھی چلانا جانتا تھا، بندوق کے نشانے میں تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ وہ نہ جنوں سے ڈرتا تھا اور نہ بھوتوں سے۔ گھوڑے کی سواری میں دور دور تک کوئی آدمی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جب وفد کو یہ کہتے سنا کہ کالی بلا گھوڑے پر سوار ہو کر حملہ کرتی ہے اور اس حملے کے بعد لوگوں کا سامان غائب ہو جاتا ہے تو اسے یقین ہو گیا کہ کالی بلا ضرور کوئی آدمی ہے اور لوگوں کو ڈرا کر لوٹ لینے کے لیے اس نے بلا کا سوانگ بھرا ہے۔ مرزا دانش نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ کسی طرح بھی اس بلا کو پکڑنا چاہیے۔

وفد کے جانے کے بعد وہ اس بلا کو پکڑنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ اس نے اسی فکر میں رات کا کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا اور بڑی دیر تک جاگ کر کالی بلا کو پکڑنے کے مختلف منصوبے بناتا رہا۔ آخر اس نے ایک منصوبے کا نقشہ اپنے ذہن میں مکمل کر لیا۔ یہ منصوبہ خود اس کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا تھا، لیکن اسے اس خطرے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ منصوبے کا نقشہ ذہن میں مکمل کر کے وہ اطمینان سے سو گیا۔

صبح اس نے اپنے منصوبے کے مطابق کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے لیے ایک ایسی کالی نقاب بنائی جسے پہن کر اس کا پورا چہرہ، سر سے گردن تک چھپ جاتا۔ بس آنکھوں کی جگہ دو گول گول سوراخ تھے۔ ان سوراخوں پر اس نے سائیکلوں کے پیچھے لگنے والے سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے شیشے لگا دیئے۔ یہ شیشے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ روشنی پڑے تو یہ چمکنے لگتے ہیں۔ نقاب کے اوپر اس نے کالے کپڑے کے دو لمبے لمبے کان بنا کر لگا لیے۔ الماری

سے کالے رنگ کے لیے دستانے نکال لیے۔ کالا جوتا، کالے موزے، کالا پتلون، کالی قمیص نکال کر الگ رکھ دیئے۔ اس کے پاس چمڑے کا ایک لمبا سا کوڑا یا چابک تھی۔ اس کے چمڑے کا رنگ بھی کالا تھا۔ جب یہ سب چیزیں جمع ہو گئیں تو وہ حویلی سے باہر نکلا اور ملازم سے ایک بہت لمبا اور بہت موٹا ایسا بانس منگوایا جیسا بانس عام طور پر ٹین کی چھت کے نیچے لگایا جاتا ہے یا بعض لوگ چارپائی میں بھی لگا لیتے ہیں۔ جب بانس آ گیا تو لوہے کی ایک خاصی لمبی اور موٹی سی کیل لے کر اسے گرم کرنے کے لیے آگ میں رکھ دیا۔ جب یہ کیل خوب گرم ہو کر سرخ ہو گئی تو اسے ایک زنبور سے پکڑ کر بانس کے موٹے والے سرے پر رکھ کر ہتھوڑی سے جو چوٹ لگائی تو کیل بانس کے آر پار ہو گئی، کیل چونکہ بہت گرم تھی اس لیے بانس کا اندرونی حصہ جل گیا اور اس میں خاصا چوڑا سوراخ ہو گیا۔ اب دانش نے پانی ڈال کر اس کیل کو ٹھنڈا کر لیا۔ دانش یہ بانس لے کر اصطبل پہنچا۔ نواب شہامت کا اصطبل بہت بڑا تھا۔ اس میں کئی گھوڑے تھے۔ اصطبل کا احاطہ بھی بہت بڑا تھا۔ لکڑی کے شہتیروں سے اصطبل کے احاطے کی حد بندی کی گئی تھی۔ البتہ باہر نکلنے کے لیے خاصا چوڑا راستہ چھوڑ دیا تھا۔ اس راستے کے دونوں طرف موٹے موٹے لکڑی کے شہتیر گڑے ہوتے تھے جن سے گیٹ سا بن گیا تھا۔ دانش نے انہی شہتیروں میں سے ایک پر وہ بانس اس طرح ٹھونک دیا کہ بانس کیل پر گھوم سکے۔ بانس اتنا لمبا تھا کہ اس سے اصطبل کا گیٹ بند ہو گیا تھا۔ اب دانش نے بانس کے دوسرے سرے پر ایک مضبوط رسّی باندھ دی۔ رسّی خاصی لمبی تھی۔ اصطبل کے گیٹ کے قریب ہی دو تین درخت بھی تھے۔ دانش نے رسّی کو ایک درخت کی شاخ میں پھنسا کر کھینچا تو بانس اس طرح اوپر اٹھ گیا جیسے ریلوے گیٹ کھل جاتا ہے۔ اب اس نے رسّی کا آخری سرا ایک درخت کے تنے سے اس طرح باندھ دیا کہ ذرا سے اشارے پر کھولا جا سکے یا رسّی کو کاٹا جا سکے۔ ان تمام انتظامات سے فرصت پا کر وہ حویلی میں جا کر سو گیا۔ کیونکہ اسے اپنے منصوبے پر رات کے وقت عمل کرنا تھا۔ اس لیے وہ اس وقت کو بالکل تازہ دم رہنا چاہتا تھا۔

شام کے وقت دانش کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے انتظامات پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالی کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ پھر اس نے اصطبل میں جا کر رات کی سواری کے لیے گھوڑے کا انتخاب کیا۔ نواب شہامت کے گھوڑوں میں ایک گھوڑا ایسا بھی تھا جس کا رنگ بہت گہرا تھا۔ رات کے وقت تو وہ کالا ہی نظر آتا۔ دانش نے اسی گھوڑے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ پھر حویلی میں لوٹ آیا اور نہا دھو کر بالکل تازہ دم ہو گیا۔

رات کے کھانے پر گھر کے سارے ہی لوگ جمع تھے۔ کچھ مہمان بھی تھے۔ اس وقت بھی کالی بلا کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ نواب شہامت کا اس وقت بھی یہی خیال تھا کہ جن بھوت کا مقابلہ ممکن نہیں۔ دانش یہ سب باتیں سن رہا، لیکن اپنی طرف سے کچھ نہ بولا۔ کھانا ختم ہو گیا اور سب لوگ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو دانش بھی

اپنے کمرے میں آگیا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے دن میں نکالا ہوا لباس پہن لیا۔ کالا پتلون اور کالی قمیص پہننے کے بعد اس نے چابک اپنی پیٹھ کی طرف گردن سے اس طرح باندھ لیا کہ اس کا ایک سرا نیچے لٹکتا رہے۔ اس کے اوپر سے اس نے ایک بند گلے کا کوٹ پہن لیا۔ کوٹ پہننے کے بعد چابک کا دہ سرا جو نیچے لٹک رہا تھا اوپر اٹھا کر ایک کالی ڈوری سے گردن سے باندھ لیا۔ اب یہ چابک ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی جانور اپنی دم اٹھائے ہوئے ہو۔ اس کے بعد وہ چپ چاپ کمرے سے باہر آگیا۔ چلتے وقت وہ اپنی نقاب، ایک پستول اور تلوار ساتھ لانا نہیں بھولا تھا۔ اب وہ اصطبل میں پہنچا اور اپنی پسند کے گھوڑے پر زین کس کے اسے باہر نکال لایا۔ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اس نے اپنی نقاب پہن لی۔ اب تو وہ خود ہی کالی بلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں سڑک پر بجلی کا انتظام تو ہوتا نہیں تھا اس لیے کوئی اسے دیکھ نہیں سکا۔ اب دانش نے اس سڑک پر گھوڑا دوڑا دیا جس سے عام مسافر صلابت نگر آتے تھے۔ کچھ دور جا کر اسے درختوں کے ایسے جھنڈ نظر آئے جن کے پیچھے چھپ کر وہ کالی بلا کا انتظار کر سکتا تھا۔

دانش کو ایک جھنڈ کے پیچھے چھپے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سڑک کے دوسری طرف والے درختوں کے جھنڈ کی جھاڑیاں ہلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے وہاں اپنی ہی طرح کا ایک سیاہ پوش سوار نظر آیا۔ اسی وقت دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی سنائی دی۔ شاید کوئی مسافر گھوڑا گاڑی میں اسی طرف آرہا تھا پہلے تو دانش نے سوچا کہ اس کالی بلا کو اپنے پستول کا نشانہ بنا دے، لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اسے زندہ پکڑنا چاہیے تاکہ اسے پولیس کے حوالے کیا جاسکے۔ پھر اس نے گھر پر جو انتظامات کیے تھے وہ بھی کالی بلا کو پکڑنے کے لیے تھے۔ وہ ابھی اسے پکڑنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ گھوڑا گاڑی قریب آگئی۔ اسی وقت سڑک کے دوسری طرف والے جھنڈ سے کالی بلا باہر نکل کر ایک دم گھوڑا گاڑی کے سامنے پہنچ گئی۔ گھوڑا گاڑی چلانے والے اور اس کے مسافروں کی تو کالی بلا کو دیکھتے ہی گھگی بندھ گئی۔ دانش نے سوچا کہ اب دیر نہیں کرنی چاہیے، چناں چہ اس نے اپنے گھوڑے کو اشارہ کیا اور کالی بلا کے پیچھے وہ بھی سڑک پر پہنچ گیا۔ اب اس نے حلق سے ایسی ہی آواز نکالی جیسے کوئی بچہ ڈر کر مدد مانگ رہا ہو۔ اس آواز سے گھوڑا گاڑی والوں کی نظر بھی دانش پر پڑی اور کالی بلا نے بھی مڑ کر اسے دیکھا۔ آنے والے مسافر تو اپنے سامنے ایک کے بجائے دو بلائیں دیکھ کر ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئے، لیکن کالی بلا نے بھی مڑ کر اسے دیکھا اور ٹھٹھک کر رہ گئی کہ یہ دوسری بلا کہاں سے ٹپک پڑی۔ لیکن اسے فوراً ہی یہ خیال آیا کہ وہ خود تو کالی بلا کی حیثیت سے مشہور ہے ہی، سب اسی سے ڈرتے ہیں۔ شاید کسی شخص نے لوگوں کے اسی خوف سے فائدہ اٹھا کر خود بھی لوٹ مار کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے، اس لیے پہلے اسی کو ختم کر دینا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی کالی بلا نے دانش پر حملہ کرنے کے ارادے سے اپنے گھوڑے کو موڑا۔ دانش کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو موڑ کر ایڑ لگائی۔

ب دانش آگے آگے تھا اور کالی بلا پیچھے پیچھے۔

دانش نے اس بھاگ دوڑ میں اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اس کے گھوڑے کی رفتار ایسی رہے کہ وہ نہ تو کالی بلا کی نظروں سے اوجھل ہو نہ اس کے ہاتھ آسکے۔ تھوڑی دیر بعد وہ صلابت نگر کے قریب پہنچ گئے۔ اب دانش نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کرنی شروع کر دی یہاں تک کہ دونوں کے درمیان صرف بیس پچیس گز کا فاصلہ رہ گیا، لیکن اس وقت تک دانش اپنے اصطبل کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ پھر وہ گیٹ سے احاطے میں بھی داخل ہو گیا۔ اب دانش نے بڑی پھرتی سے تلوار نکالی اور ایک ہی وار میں وہ رسی کاٹ دی جو بانس کو اوپر اٹھانے کے لیے باندھی تھی۔ دانش کا خیال تھا کہ بانس گرتے ہی کالی بلا بانس سے ٹکرا کر گھوڑے سے گر پڑے گی، لیکن ہوا یہ کہ بانس اس وقت گرا جب کالی بلا ٹھیک اس کے نیچے تھی۔ اس طرح بانس بڑی زور سے کالی بلا کے سر سے ٹکرایا۔ بانس بہت وزنی تھا وہ جب پوری قوت سے کالی بلا کے سر پر پڑا تو کالی بلا کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر گھوڑے سے گر پڑی اتنی دیر میں دانش کا گھوڑا رک چکا تھا وہ پھرتی سے گھوڑے سے اترا۔ اپنا نقاب اتار کر پھینک دیا اور جلدی جلدی گردن سے وہ چابک بھی کھول کر الگ کر دیا جو کسی جانور کی دم معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ تلوار سنبھالے کالی بلا کے قریب پہنچا تاکہ اگر اب بھی وہ دانش پر حملہ کرے تو اسے تلوار سے زخمی کیا جاسکے، لیکن وہ تو بے ہوش پڑی تھی۔ دانش کی نظریں اس کے ہاتھوں پر پڑیں، اس نے دستانوں کی طرح شیر کے نقلی پنجے پہن رکھے تھے، جن سے وہ لوگوں کو زخمی کرتا تھا۔ دانش نے یہ پنجے اتار لیے اور چیخ کر اپنے ملازموں کو آواز دی۔ تھوڑی ہی دیر میں حویلی کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ نواب شجاعت بھی پہنچ گئے۔ صلابت نگر کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ کالی بلا کے چہرے سے جانور کی شکل کا نقلی چہرہ اتارا گیا تو اس کی شکل عام انسانوں جیسی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور صبح اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ کالی بلا نے لوٹ کا مال ایک غار میں جمع کر رکھا تھا۔ پولیس نے یہ سارا مال برآمد کر لیا۔

"ماں"

- بچّے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے خواہ بچّے کی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو۔
- ہمیشہ اس چیز سے ڈرو کہ ماں نفرت یا بد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔
- ماں ایک ایسا پھول ہے جو مرجھا کر بھی خوشبو دیتا ہے۔

ند جمال پاشا

بہادر کاری گر

ایک کاریگر کو کھانا کھاتے میں مکھیوں نے بہت پریشان کیا۔ کاری گر نے
ے سے انھیں انگوچھے سے مارنا شروع کیا ۔ اس کے بعد انھیں گن تو بہت خوش
ا۔ اس نے پوری تیس ۳۰ مکھیاں مار لی تھیں ۔ اپنے آپ کو تیس مار خاں قرار دے کر
ادری دکھانے کے لیے وہ کام کاج چھوڑ کر گھر سے چل دیا۔

راستے میں اسے جھاڑی میں پھنسی ہوئی ایک چڑیا ملی ۔ جسے نکال کر اس نے
ی جیب میں ڈال لیا۔

کاری گر نے جنگل میں سامنے سے ایک خوفناک دیو آتے دیکھا تو بہت گھبرایا۔ دیو
نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو۔؟"

کاری گر نے ایسا ظاہر کیا جیسے نہ اسے دیو کی کوئی پروا ہے نہ وہ اس کی
ت ہی سن رہا ہے ۔ دیو نے غصّے سے کہا۔

"بھاگ جا ورنہ میں تمھیں مار ڈالوں گا ۔"

کاری گر اسی طرح کھڑا مسکراتا رہا۔ اور بولا

" میں کیوں بھاگوں؟ کیا تم مجھ سے زیادہ بہادر ہو؟ کیا تم مجھ سے لڑ سکتے ہو۔؟"

کاری گر کی بات سُن کر دیو زور سے ہنسا اور بولا۔

"کیا تمھاری موت آئی ہے؟ جو مجھ سے لڑنا چاہتے ہو۔ اگر تم دیکھنا چاہتے ہو کہ کون
زیادہ بہادر ہے۔ تو پتھر پھینک کر دیکھ لو۔ جس کا پتھر زیادہ دور جائے وہ زیادہ
بہادر ہے ۔" یہ کہہ کر دیو نے ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر بہت دور پھینکا۔ کاری گر

نے کہا۔

"تمھارا پھینکا ہوا پتھر تو پھر زمین پر واپس آگیا۔ لیکن میرا پھینکا ہوا پتھر تو آسمان میں چلا جائے گا اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔" یہ کہہ کر کاری گر نے ایک پتھر اٹھایا اور بہت چالاکی سے پتھر جیب میں ڈال کر چڑیا نکالی اور بڑے زور سے اوپر کی طرف پھینک دی۔ چڑیا تیزی سے اڑ کر آسمان میں غائب ہوگئی۔

دیو بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے اپنی طاقت دکھانے کے لیے ایک درخت جڑ سے اکھاڑ کر کہا۔ کیا تم اس درخت کو اٹھا کر اس طرح چل سکتے ہو۔؟ کاری گر نے کہا۔

"ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ چلو! اسے تم آگے سے اٹھاؤ اور پیچھے سے میں۔ دیو نے درخت کا تنا اٹھا لیا اور کاری گر نے پیچھے سے شاخ پکڑ لی۔ درخت کا سارا بوجھ دیو پر پڑ رہا تھا۔ وہ بہت جلد تھک گیا اور ہانپنے لگا۔ اس نے درخت زمین پر گرا دیا۔ کاری گر زور سے ہنستا ہوا بولا۔

"ارے واہ! تم رک کیوں گئے۔؟ کیا تھک گئے ہو؟ مجھے دیکھو میں تو بالکل نہیں تھکا۔"

دیو کو کاری گر جیسے چھوٹے سے آدمی سے ہار جانے پر بہت غصہ آیا اور اسے سبق سکھانے کے لیے اس نے کہا۔

"چلو بھائی تم میرے ساتھ، آج تم میرے مہمان رہو گے۔" محل میں پہنچ کر دیو نے اسے سونے کے لیے ایک بستر دیا۔ کاری گر نے سوچا۔ ضرور اس میں دیو کی کوئی چال ہوگی۔ اس لیے اس نے سونے سے پہلے لمبے لمبے تکیے لٹا کر ان پر اس طرح چادر اڑھا دی جیسے سچ مچ کوئی آدمی سو رہا ہو۔ اور خود ایک کونے میں چھپ کر آرام کرنے لگا۔

رات کو دیو نے چپکے سے پلنگ میں آگ لگا دی اور یہ سوچ کر بہت خوش ہوا کہ کاری گر جل گیا۔ وہ اطمینان سے سو گیا۔

صبح جب دیو نے اپنے سامنے کاری گر کو مسکراتے دیکھا تو وہ ڈر گیا اور بھوت بھوت چلاتا ہوا بھاگ نکلا۔ کاری گر مزے سے دیو کے محل میں رہنے لگا۔ ایک دن جب کاری گر

نگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ اسے بادشاہ کے دو سپاہی ملے جو کسی ایسے بہادر آدمی
کی تلاش میں تھے جو دو آدم خور دیوؤں کو مار کر ختم کر سکے۔ ان دیوؤں نے
بادشاہ کے ملک میں دہشت اور تباہی مچا رکھی تھی۔ بادشاہ نے دیو مارنے والے
بہادر کو اپنی آدھی حکومت دینے اور اس کے ساتھ شہزادی کی شادی کرنے کا
وعدہ کیا تھا۔

اس نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ تیس مار خاں ہے۔ ایک دیو کو مار کر بھگا چکا
ہے اور اس کے محل میں مزے سے رہ رہا ہے۔

سپاہی تو ایسے ہی سورما کی تلاش ہی میں تھے وہ کاری گر کو بادشاہ کے پاس
لے گئے۔ کاری گر دونوں آدم خور دیوؤں کو مارنے کا وعدہ کر کے بادشاہ سے رخصت
ہوا اور جنگل کی جانب چل دیا۔ راستے میں اس نے بہت سے پتھر جیب میں رکھ لیے
اور سوچنا شروع کیا کہ کس حکمت سے دونوں دیوؤں کو مارے۔ آخر اس نے
ایک درخت کے نیچے دونوں دیو سوتے ہوئے دیکھ لیے اور درخت پر چڑھ گیا۔ ایک
پتھر ایک دیو کے مارا۔ دیو غصے میں اٹھا اور اپنے ساتھی دیو پر بگڑا کہ "کیوں تنگ
کر رہے ہو۔" اس پر دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں لڑ رہے تھے کہ
پہلے اس نے مارا۔

پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو اٹھا اٹھا کر پٹکا۔ اس کے بعد ایک دوسرے
پر بڑی بڑی چٹانیں اٹھا اٹھا کر ماریں آخر دونوں خون میں لت پت ہو کر گرے
اور مر گئے۔

کاری گر نے درخت سے اتر کر دونوں کے ناک اور کان کاٹ کر رومال میں
باندھے اور بادشاہ سلامت کے پاس جا کر کہا

"جہاں پناہ! میں نے دونوں دیو مار ڈالے۔ یہ رہے ان کے ناک، کان۔ میرے
لائق اور کوئی خدمت۔"

بادشاہ سلامت بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بڑی دھوم دھام سے
کاری گر کی شہزادی سے شادی کر دی اور آدھی سلطنت اسے دے دی۔ اس کے
بعد بہادر کاری گر نے شہزادی کے ساتھ بقیہ زندگی بہت ٹھاٹھ سے گزاری۔ ●

محمد برہان حسین

انسانی جسم کا مدافعتی نظام

HUMAN IMMUNE SYSTEM

آیئے، آج ہم آپ کو ایسی بات بتائیں جو دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ مگر غور سے سنیے گا اس لیے کہ یہ جدید سائنس اور میڈیکل سائنس کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

کیا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اگر آپ کے ہاتھ پیر یا جسم کے کسی بھی حصّے پہ زخم لگتا ہے یا ہاتھ بلیڈ یا چھری سے کٹ جاتا ہے تو وہ زخم کس طرح بھرتا ہے یا مندمل ہوتا ہے ... آپ کہیں گے کہ آیوڈین لگانے سے یا مرہم پوتنے سے . . . . . یہ درست ہے لیکن حقیقت میں آیوڈین یا مرہم کا کام صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ زخم پر کے بیکٹیریا یا جراثیم کو ہلاک کرتا ہے۔ مندمل کرنے کا کام تو جسم خود ہی انجام دیتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ اگر جسم میں ضروری مدافعتی قوت ہو تو زخم پر آیوڈین یا مرہم لگائے بغیر بھی زخم از خود مندمل ہو جاتا ہے۔

اگر ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو ڈاکٹر اس پر پلاسٹر چڑھا دیتا ہے۔ پلاسٹر کا کام صرف ہڈی کے ٹکڑوں کو اتنی مدت تک جوڑے رکھنا ہے کہ ہڈی جڑ جاتے لیکن ہڈی جوڑنے کا کام جسم خود کرتا ہے اس کو کسی بیرونی مدد کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

ہمارے جسم میں ایک مکمل میونسپلٹی ہے جس کے کارکن ایسا ہی کام کرتے ہیں جیسا بلدیہ (میونسپلٹی) کے ملازمین کرتے ہیں . . . . . اس طریقے کو مدافعتی نظام یا IMMUNE SYSTEM

ریجنل ریسرچ لیبارٹری۔ حیدرآباد ۹

تے ہیں۔ اگر سڑک پر گڑھا پڑتا ہے۔ بلدیہ کے انسپکٹر اپنے محکمہ کو اطلاع دیتے ہیں۔ یہ، مستری اور مزدوروں کو بھجواتے ہیں کہ درست کر دیں۔ اگر کہیں جھاڑ گر جاتا ہے یا لے کا پول ٹوٹ جاتا ہے تو بلدیہ، محکمہ برقی، آب رسانی اور پولیس کو مطلع کرتی ہے اور ن بورڈ لگا دیتی ہے کہ لوگ اُدھر نہ جائیں۔

بالکل ایسا ہی ایک نظام ہمارے جسم میں ہوتا ہے۔ ہمارے اطراف کی فضا میں ہم سانس لیتے ہیں۔ ہمارے اطراف پھیلی ہوئی چیزیں اور ہماری غذا اور جو ہم پیتے ہیں..... ننھے ننھے جانداروں — جراثیم یا بیکٹریا سے بھری ہوتی ہیں۔ س طرح چھونے، سانس لینے، غذا اور پانی کے استعمال کے دوران کروڑوں کی تعداد جراثیم ہر لمحہ ہمارے جسم میں داخل ہوتے رہتے ہیں... ان میں قسم قسم کی بیماریوں پھیلانے والے جراثیم بھی ہوتے ہیں جو معمولی نزلہ وزکام سے لے کر دق اور نمونیا جیسی ک بیماریاں بھی پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان بیکٹریا کے جسم میں داخل ہوتے ہی جسم کا مدافعتی نظام حرکت آجاتا ہے۔ ہمارے جسم میں ننھے خلیے ہوتے ہیں جنھیں میکروفاج MACROPHAGE کہتے جو جسم میں کسی بھی بیرونی شے یا اجنبی چیز کو برداشت نہیں کرسکتے۔ چنانچہ جیسے ہی کوئی رونی شے خون میں آتی ہے میکروفاج فوراً فوجی ہیڈکوارٹر کو مطلع کرتا ہے۔ اس کے تھ ہی ہیڈکوارٹر سے ایک قسم کے خلیے جنھیں مددگار T خلیہ (HELPER 'T' CELLS) کہتے کو موقع پر روانہ کیا جاتا ہے۔ مددگار خلیے۔ آنے والے اجنبی کی شناخت کرتے ہیں پھر پتے SPLEEN اور LYMPHNODE لمف نوڈ (غدود) کو پیام بھجواتے ہیں کہ آنے والے آوروں کے لیے کس قسم کے زہر یا ہتھیار مناسب رہیں گے۔ چنانچہ چند لمحوں میں خاص قسم خلیے جنھیں قاتل۔ T۔ خلیہ (KILLER-T-CELL) کہا جاتا ہے۔ حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑتے اور ان کو ختم کر دیتے ہیں۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ بعض وقت آپ کو تھوڑی دیر کے لیے حلق میں خراش ہوجاتی یا ناک بہنے لگتی ہے لیکن جلد ہی سب ٹھیک ہوجاتا ہے..... اس کی وجہ یہی ہوتی کہ جراثیم جو نزلہ یا حلق کی خراش پیدا کرتے ہیں وہ حلق اور ناک میں داخل ہوکر کام روع کر دیتے ہیں لیکن قاتل T۔ خلیے ان پر حملہ کر دیتے ہیں اور اگر نزلہ یا حلق کی خراش

کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مددگار T. خلیے، قاتل T۔ خلیوں کو اطلاع دینے اور ان کے آنے تک بیماری کے بیکٹریا کو طاقتور ہو جانے کا وقت مل جاتا ہے اور جب قاتل T خلیے آتے ہیں تو بیکٹریا عرصہ تک ان کا مقابلہ کرتے ہیں آخر جب T۔ خلیے ختم کر دیتے ہیں تو پھر ان بیکٹریا کی لاشوں کو کھانے کے لیے ACROPHAGE میکروفاج خلیے آجاتے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہوگا کہ قاتل T۔ خلیے بیماری کے بیکٹریا سے ہار جاتے ہوں گے ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ تب ڈاکٹر مریض کا خون، پیشاب یا لعاب حاصل کر کے تجربہ خانہ بھیج دیتا ہے جہاں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ جراثیم کون سے ہیں۔ تب ایسی دوا (کیمیائی مرکب جیسے گندک کے مرکبات) یا پنسلین یا کوئی اور انٹی بیوٹکس دوا کو ان جراثیم پر قابو کرنے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔

جسم کا حملہ آور نظام اس قدر طاقتور اور کام کرنے والا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ مددگار T۔ خلیوں سے اشارہ پاکر قاتل T خلیے بنانا شروع کرتا ہے تو بناتا ہی چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کو روکنے کے لیے SUPPRESSOR-T-CELLS آجاتے ہیں۔

اس پورے نظام کو جسم کا مدافعتی نظام کہتے ہیں۔ یہ اس قدر اہم ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری زندگی اور موت کا تعلق اسی نظام سے ہوتا ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو نزلہ جیسی معمولی بیماری بھی ہماری جان لے کر ہی جاتی۔

دو صدی قبل انگریز شخص ایڈورڈ جینر JENNER نے سب سے پہلے اس سسٹم سے کام لینے کی سوچی۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ جو لوگ گائے کی چیچک COW POX میں جو ایک ہلکی بیماری تھی، مبتلا ہوتے تھے ان کو چیچک SMALL POX کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سوچا اگر انسانوں کو گائے کی چیچک سے متاثر کیا جائے تو وہ مہلک چیچک سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ یہ اس نے مدافعتی نظام سے واقف ہوئے بغیر سوچا تھا۔ چنانچہ اس نے گائے کی چیچک کے پھوڑوں سے مواد حاصل کر کے چیچک کا ٹیکہ بنایا جو آج تک رائج ہے بلکہ اس ٹیکہ نے چیچک کو صفحۂ ہستی سے ہی مٹا ڈالا۔ (فقط ویکسن) اسی نے کہا تھا چونکہ لاطینی میں VAC گائے کو کہتے ہیں۔

جینر کے اسی سال بعد فرانسیسی سائنسداں لوئی پاسچر نے جینر کے ویکسن کی کارکردگی

سمجھا کہ اگر کسی بیماری کے مردہ جراثیم خون میں داخل کیے جائیں تو جسم کا مدافعتی
نام متحرک ہو جاتا ہے اور پھر عرصہ تک T خلیے خون میں موجود رہتے ہیں جو اس
اری کے جراثیم کو خون میں زندہ نہیں رہنے دیتے۔

آپ نے ایک نئی بیماری AIDS یعنی ACQUIRE IMMUNE DEFICIENCY کا نام
سنا ہوگا۔ اس بیماری میں دراصل ہوتا یہ ہے کہ اس بیماری کا وائرس (ایک قسم
جراثیم) T-خلیوں ہی کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہمارے جسم کا مدافعتی
م ہی نہ ہوگا تو پھر . . . . پھر کسی بھی بیماری کے جراثیم۔ ہوا، پانی یا غذا سے یا چھونے
ے ہمارے جسم میں داخل ہو کر بے خوف و خطر گھومنے لگیں گے اور جو بھی بیماری ہو گی وہ کبھی
نہیں ہو گی اور جسم ہلاک ہو جائے گا۔ گویا AIDS از خود کوئی بیماری نہیں ہے جس سے
، مر جاتا ہے بلکہ یہ صرف مدافعتی نظام کو برباد کر دیتی ہے اور پھر انسان کسی بھی بیماری
ئی کہ نزلے سے بھی مر سکتا ہے۔

اسی لیے اس وقت میڈیکل سائنس نے امینولوجی یعنی جسم کے مدافعتی نظام کو AIDS
بنسر کے خلاف استعمال کرنے پر اپنی توجہ صرف کر دی ہے۔

نماز

- نماز قائم کرو۔
- نماز جنت کی کنجی ہے۔
- نماز مومنوں کی معراج ہے۔
- نماز قبر کا چراغ ہے۔
- نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے
- نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

رحمٰن حمیدی

پرندہ اور شاعر

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ساری دنیا میں ہندستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ اس وقت ہندستان دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند ملک تھا دوسرے دیس کے لوگ یہاں تجارت کے لیے آیا کرتے تھے اور یہاں سے سونا چاندی اور جواہرات خرید کر لے جایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں سونے، چاندی او جواہرات کا ایک لٹیرا تھا۔ اس لٹیرے کا نام رتناکر تھا۔ یہ بہت دلیر، نڈر اور بہادر ڈاکو تھا جواہرات لے کر جانے والے تاجروں کو یہ دن دہاڑے لوٹ لیا کرتا تھا۔ اس نے کئی آدمیوں کا خون بھی کیا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگ خوف سے اپنے اپنے گھروں میں بھاگ جاتے تھے اس کا چہرہ بے حد ڈراونا اور خوفناک تھا۔

ایک دن وہ صبح سویرے اٹھا اور اپنا ہتھیار کمر میں چھپا کر رکھ لیا۔ اسے خبر ملی تھی کہ راج دربار کے پجاری کو مہاراج نے دکھشنا میں مہارانی کے زیورات دیے ہیں۔ وہ اسی کو لوٹنے کے لیے سڑک کے کنارے کان لگائے بیٹھا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سورج کی زردی مائل کرنیں مندر اور راج محل پر پڑ رہی تھیں۔ پجاری مہارانی کے زیورات تھیلی میں لیے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ موقع ملتے ہی رتناکر نے اسے گھیر لیا۔ پجاری نے رتناکر سے نہایت سادگی سے پوچھا۔

"تم یہ زیورات لوٹ کر کیا کروگے ——؟"

رتناکر نے جواب دیا۔

دبستان۔ محلہ جیسرا گودام۔ گومو۔ دھنباد (بہار)

"اس دھن سے میرے بیوی بچے کھائیں گے ——!!"

یہ سُن کر پجاری نے پوچھا۔

"اس ڈکیتی کی وجہ سے بھگوان کے یہاں تمھیں جو سزا ملے گی۔ کیا اس میں تمھارے بیوی بچے ہاتھ بٹائیں گے ——؟"

"ضرور کیوں نہیں کیوں نہیں —— میں یہ سب کچھ انھیں کے لیے تو کر رہا ہوں ——!"

رتناکر نے جواب دیا۔

"تم اپنے بیوی بچوں سے جا کر پوچھ لو —— کیا وہ سچ مچ عذاب میں تمھارا ساتھ دیں گے ——؟"

پجاری نے اصرار کیا۔

رتناکر نے سوچا۔ پجاری دھوکا دے کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے پجاری کو رسی سے درخت میں باندھ دیا اور دوڑ کر اپنے گھر گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ اس نے پجاری کی رسی کھول دی اور اس کے پانو پر گر پڑا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خیال صحیح ہے۔ پاپی کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا ——!"

اس دن سے رتناکر نے ڈکیتی اور رہزنی چھوڑ دی اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بھگوان کی پوجا کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ بھگوان کی پوجا میں اس قدر ڈوب جاتا کہ اس کا پورا جسم دیمکوں سے چھپ جاتا۔

ایک دن وہ اپنی پوجا میں مگن تھا۔ اچانک ایک پرندہ اس کے سامنے گرا۔ اس پرندے کا نام کرونچ ہے۔ وہ زخمی تھا۔ کسی شکاری نے اسے تیر سے شکار کیا تھا۔ پرندہ زخم سے اسی طرح تڑپ رہا تھا جس طرح مچھلی پانی سے باہر آکر تڑپتی ہے۔ اس کا جوڑا بری طرح چیخ رہا تھا۔ زخمی پرندے کو دیکھ کر رتناکر کا دل رحم سے بھر آیا۔ اس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ بے اختیار وہ چیخ اٹھا —— "کس ظالم نے اس بے زبان پرندے کو مار ڈالا ——؟"

اسی وقت سے انھوں نے شاعری شروع کی۔ اپنی شاعری کے ذریعے انھوں

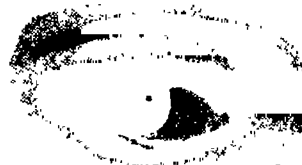
نے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیا اور انسانیت کے لیے اپنے قلم سے ایک شمع روشن کی۔ اس شمع کا نام "رامائن" ہے یہ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب ہے۔ کیا تم اس شاعر کا تخلص بتا سکتے ہو ـــــ؟

اس شاعر کا تخلص "بالمیکی" ہے ـــــ!

اور

یہ سنسکرت زبان کے پہلے شاعر ہیں ـــــ!!

آنکھ کیسے کام کرتی ہے؟



ڈاکٹر نذیر احمد ملک

بچو! ـــ آپ نے کیمرہ تو دیکھا ہو گا وہی کیمرہ، جس سے ہم خوبصورت تصاویر بناتے ہیں بر تھ ڈے کی مری کی سیر کی چڑیا گھر اور باقی ایسی جگہیں جو ہمیں بہت پسند ہیں۔

خدا کی ذات باری تعالیٰ نے بھی آنکھ کو ایک کیمرے کی مانند بنایا ہوا ہے اس میں بھی کیمرے کی طرح لنز ہوتے ہیں سوراخ ہوتا ہے اور فلم ہوتی ہے آپ ذرا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کو آنکھ کے مختلف اجزا نظر آنے لگیں گے۔

مثلاً سامنے کا مرکزی حصہ جسے ہم کارنیہ کہتے ہیں یہ ایک محدب شیشہ ہوتا ہے۔ جس کی پاور ۵۰ ڈائیپر ہوتی ہے یہ بے رنگ ہوتا ہے

اس کے پیچھے جو رنگ دار حصہ ہمیں نظر آتا ہے اور جس کی وجہ سے ہماری آنکھوں کا رنگ بنتا ہے اسے ہم آئرس کہتے ہیں اگر آئرس کا رنگ نیلا ہو تو آنکھ نیلی ہو جاتی ہے اگر براؤن ہو تو براؤن ہو جاتی ہے اس رنگ دار حصے کے درمیان میں ایک سوراخ ہوتا ہے جو کہ سیاہ کالا نظر آتا ہے یہ پتلی ہے جو کہ کیمرے کی طرح اپرچر کا کام دیتی ہے یہ چھوٹی بڑی ہوتی رہتی ہے جیسا کہ بچو آپ کو علم ہے جب روشنی تیز ہو تو کیمرے کا اپرچر کم کرتے ہیں اور اندھیرے میں فوٹو لینا ہو تو اپرچر بڑا کرتے ہیں بالکل اسی طرح قدرت نے بھی آنکھ میں یہ خوبی رکھی ہوئی ہے جب ہم تیز روشنی میں دیکھتے ہیں تو پتلی چھوٹی ہو جاتی ہے اور جب ہم اندھیرے میں دیکھتے ہیں تو پتلی بڑی ہو جاتی ہے۔

پتلی کے پیچھے آنکھ کا دوسرا لنز (عدسہ) ہوتا ہے جس کی طاقت (پاور) ۲۰-۱۷ تک ہوتی ہے

اسی لنز کے آخر میں پردہ ہوتا ہے جہاں پر ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی تصویر بنتی ہے۔

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

غلام رازق شیخ



یاد رکھو

اللہ تعالیٰ نے دو کان دیے ہیں اور ایک زبان — تاکہ انسان جتنا بولے اس سے دوگنا سنے۔

منوہرلال، شیلانگری نامی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے جہیز میں سونے کی چوڑیاں اور ایک ہار دینا چاہتے تھے۔ زیورات بنوانے کے لیے وہ قریب کے ایک قصبے میں گئے۔ اپنے جانے پہچانے جوہری کے یہاں پہنچے۔ زیورات کے کچھ نمونے دیکھے۔ جوہری کو چوڑیوں اور ہار کی تیاری کا آرڈر دے دیا۔

جوہری نے منوہرلال کو زیورات کی قیمت دو ہزار روپے بتائی۔ منوہرلال نے ایک ہزار روپے پیشگی دے دیے۔ چلتے وقت کہا۔ بقایا ایک ہزار روپے کسی آدمی کے ہاتھ بھیجوں گا۔ اُسی کو یہ زیورات دے دینا۔

جوہری اور منوہرلال میں مقررہ دن اور وقت طے ہوگیا۔

گوبند نامی ایک بدمعاش چھپ کر ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

دوسرے منگل کی دوپہر کو گوبند جوہری کی دکان پر پہنچا۔ اس نے جوہری کو ایک ہزار روپے دیتے ہوئے کہا، " میں منوہرلال کا رشتہ دار ہوں۔ انھوں نے مجھے زیورات لانے کے لیے بھیجا ہے۔ اور یہ ایک ہزار روپے آپ کے لیے بھجوائے

جوہری تعجب میں پڑ گیا۔ دراصل خلافِ توقع آج ہی صبح مقررہ وقت سے پہلے

سے سرآدم جی، میمن کالونی۔ دانی لیمڑہ (احمد آباد)

منوہر لال بذاتِ خود آئے تھے اور بقایا رقم دے کر زیورات لے جا چکے تھے۔

جوہری نے اس ٹھگ کو سبق سکھانے کی ٹھانی۔ وہ اندر گیا اور اس نے اپنے لڑکے رمیش سے مشورہ کیا۔ رمیش نہایت ذہین لڑکا تھا۔ وہ بولا، "ہمیں اسے ایسا سبق پڑھانا چاہیے کہ زندگی بھر یاد رکھے اور سارے گورکھ دھندے بھول جائے" رمیش نے اپنے باپ سے سرگوشی کی۔ جوہری اپنے بیٹے کی بات سُن کر مسکرا پڑا۔ باہر نکل کر گوبند سے لیے ہوئے روپے تجوری میں رکھے اور بڑے اطمینان سے ایک الماری سے چوڑیاں اور ہار نکال کر اسے دے دیے۔

گوبند زیورات پا کر بہت خوش ہوا کیونکہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب تھا۔

اپنے وطن پہنچتے ہی گوبند ایک جوہری کی دکان پر پہنچا اور اس سے کہا کہ میں کچھ زیور بیچنا چاہتا ہوں۔ جوہری نے کہا لاؤ دکھاؤ۔ گوبند نے جھٹ سے ہار اور چوڑیاں اس کے سامنے رکھ دیں۔ چند منٹوں میں ان زیورات کی جانچ کرنے کے بعد جوہری نے کہا: "معاف کیجیے گا۔ ہم نہیں خرید سکتے۔ آپ کو کسی نے ٹھگ لیا ہے۔ ان پر تو صرف سونے کا جھول ہے۔" جوہری کی بات سُن کر گوبند بہت گھبرا یا۔ اس نے جوہری سے زیور لیے اور سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ اسے پہلی مرتبہ دھوکا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر پورے واقعہ پر غور کرنے کے بعد اُس کی سمجھ میں آیا کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اُس میں گر پڑتا ہے۔ اس کے بعد اس نے تمام بُرے دھندوں سے توبہ کر لی اور محنت مزدوری کرکے حلال کی روزی کمانے لگا۔

(بقیہ صفحہ ۴۲)

فرق کیمرے اور آنکھ کا یہ ہے کہ آنکھ گول ہوتی ہے اور کیمرہ چوکور یا مستطیل کام دونوں کا ایک ہی ہے پردے پر جو تصویر بنتی ہے وہ الٹی ہوتی ہے اور بہت ہی چھوٹی ہوتی ہے وہ آنکھ کے پیچھے ایک تر کے ذریعے دماغ کو بھیج جاتی ہے اور یہاں پر سیدھی ہو جاتی ہے اور ہمیں نظر آجاتا ہے۔

دیکھا بچو قدرت نے آنکھ میں کیا کیا خوبیاں رکھی ہوئی ہیں اس کے علاوہ یہ رنگوں میں تمیز کرتی ہے اندھیرے میں اور روشنی دونوں میں دیکھتی ہے دور اور نزدیک میں صاف دکھاتی ہے ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ باقی اتنی نعمتوں کے علاوہ آنکھ کی اتنی بڑی نعمت ہمیں خدا نے دی ہے۔

ارفہ عرفی (جامعی)



ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا



کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں۔ زندگی میں جن کا نقش وقت کا مضبوط رواں دواں پہیا ی نہیں مٹا پاتا، وہ اکثر اُبھر آتے ہیں اور زندگی میں گرتے وقت سنبھال لیتے ہیں، سہارا دیتے ہیں، اسی لیے دل ہمیشہ ان کا شکرگزار رہتا ہے۔

کچھ ایسی ہی میری بچپن کی یادیں ہیں۔ جب میں آٹھ دس سال کی تھی اور امعہ کے مدرسۂ ابتدائی میں زیرِ تعلیم تھی، مگر آج بھی یہ تصویر میرے ذہن میں اضح ہے۔

میری طویل ضد کے بعد ایک دن میں بی جی (میری والدہ) اور آپی (میری بڑی بہن لیہ روحی) شیخ الجامعہ صاحب کے گھر جاتے ہیں۔ گھر بہت کشادہ اور صاف ستھرا ہے۔ میرا ننھا سا دل ایک لمحہ کے لیے مرعوب ہو جاتا ہے ہم لوگ ڈرائنگ روم میں ٹھا دیے گئے، چند لمحوں میں آپا جان آتی ہیں، بہت خوبصورت اور روشن چہرے کی خاتون جو بی جی کو گلے لگاتی ہیں، ہم دونوں بہنوں کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں اور بس ہی ایک چوکی جس پر سفید چادر بچھی ہوئی ہے پاندان اور جا نماز رکھی ہے، اس پر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہلکے رنگ کے غرارہ سفید جمپر اور اسی غرارہ سے ہم رنگ دوپٹہ۔ میں دل ہی دل میں ان کی نفاست و خوبصورتی سے متاثر ہوں۔ اتنے میں

ڈاکٹر عارفہ عرفی، عرفی کلینک، فیض آباد (یو پی)

وہ خادمہ سے کہتی ہیں۔ "بچیوں کو صاحبؒ کے پاس لے جاؤ۔" ہم لوگ اسی نشست گاہ سے ملحق کمرہ میں جاتے ہیں۔ ایک نازک سے قدو قامت کا آدمی بیٹھا ہے سفید کرتہ سفید پاجامہ اور گورے رنگ میں بس جیسے کوئی فرشتہ ہو۔ اپیؔ نے آہستہ سے بتایا کہ "یہی شیخ الجامعہ ہیں" میرا جو رعب وہیبت ان کا قدو قامت دیکھ کر غائب ہو چکا تھا وہ یہ منصب سن کر بھی واپس نہ آیا۔ ہم لوگوں نے سلام کیا تو انھوں نے بہت محبت سے پاس بلایا اور پوچھا ضیاء صاحب (میرے والد) نہیں آئے کہاں ہیں۔ مجھے بھی مجھ کو یہ افسوس بہت تھا کہ ان کے یہاں کوئی بچہ نہیں تھا۔ جس کے ساتھ میں وقت گزار سکتی۔ مگر مجیب صاحب سے ملاقات کے بعد یہ کمی محسوس نہ ہوئی۔ انھوں نے ہم دونوں بہنوں کے نام پوچھے نام کے معنی پوچھے ہم دونوں خاموش۔ پھر انھوں نے نام کے معنی بتائے ہم دونوں کی کلاسیں پوچھیں۔ پھر پوچھا کون کون کیا پڑھاتا ہے۔ کیسا پڑھاتے ہیں۔ نمبر کیسے کیسے دیتے ہیں۔ باغ بانی اور مرغی خانہ کے بارے میں باتیں کیں پھر ہم دونوں کی ذاتیات پر آگئے۔ فراکیں کون لایا، کس نے سی ہیں، کیا کھا کر آئے ہیں کیا کھا کر جائیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ غرض کہ جب تک بی جی آپا جان سے باتیں کرتی رہیں وہ ہم لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم لوگ اکثر جاتے رہے اور وہ ہمیشہ تعلیم و دیگر مشاغل کے بارے میں پوچھتے رہتے اکثر ہم لوگوں سے اشعار سنا کرتے تھے۔ جب ہم لوگ علی گڑھ میں تھے تو ان کی طبیعت بہت خراب ہوئی، دماغ کا آپریشن ہوا۔ ہم لوگ بہت پریشان رہے مگر سوائے دعا کے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ہم لوگوں کے مختصر سے خاندان کے بھی بزرگ تھے۔ مجھے یاد ہے شادی سے پہلے آخری بار بی جی آپا جان سے ملوانے لے گئیں تھیں انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا مگر مجیب صاحب بہت خاموش تھے۔ چلتے وقت دروازے تک آئے اور جس انداز سے خدا حافظ کہا وہ انداز آج بھی آنکھیں نم کر دیتا ہے۔

آج مجیب صاحب اور آپا جان دونوں ہی ہم لوگوں کے بیچ نہیں رہے مگر میرے

لہ پروفیسر محمد مجیب مرحوم سابق شیخ الجامعہ۔

والدین سے جو غیر معمولی لگاؤ ان دونوں کو تھا وہ آج بھی یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم ایک مشفق و مہربان ہستی سے محروم ہو گئے۔

مجیب صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ ہر ایک سے اس کے معیار کے مطابق بات کر لینا بھی کتنا اہم اور ضروری ہے۔ اکثر بڑے بچوں کے لیے اپنا قیمتی وقت نہیں ضائع کرتے تھا کہ بچوں کے ساتھ بچہ بن جائیں۔ میں نے نرسری سے لے کر گیارہویں جماعت تک جامعہ ہی میں تعلیم حاصل کی اور اس پورے دور میں مجیب صاحب ہی شیخ الجامعہ رہے۔ اکثر جلسوں کی صدارت وہی کرتے تھے اور اکثر وقت سے پہلے آتے اور کچھ وقت ہوسٹل کے بچوں کے ساتھ گزارتے۔ انھیں دنوں کی بات ہے ایک بار تفریح میں ابتدائی وثانوی کے زیادہ تر بچے ڈسپنسری میں جمع تھے اس وقت ڈسپنسری میں بچوں کی کتنی بھیڑ ہو جاتی تھی اس کا اندازہ جامعہ والے ہی لگا سکتے ہیں۔ ہاں تو ڈسپنسری میں ہر تک سب جمع تھے۔ مجیب صاحب غالباً آرٹ انسٹی ٹیوٹ سے واپس ہو رہے تھے۔ ار روک کر اتر گئے اور بچوں سے پوچھا کہ "کیا آپ سب لوگ بیمار ہیں؟" ایک صاحب نے جواب دیا نہیں "ماساب میں تو پٹی بندھوانے آیا ہوں"۔ چار پانچ نے بتایا کہ وہ زخمی صاحب کے ساتھ تھے۔ وہ مسکرائے اور یہ کہتے ہوئے واپس ہو گئے۔ میں سمجھا آپ سب لوگ بیمار ہیں اسی لیے فکر ہوئی"۔ مگر اس دن سے نسبتاً بھیڑ کم ہونے لگی۔ آج یہ یادیں ہی سرمایۂ حیات ہو کر رہ گئی ہیں۔ کاش کہ ہم ان کی سادہ زندگی سے اور ان زندگی کے نظم و ضبط سے اپنی زندگیاں سنوار سکیں۔

(بقیہ بچوں سے باتیں)

بڑھیے، اپنی معلومات میں اضافہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کیجیے اور ذاکر حسین نمبر کے لیے اپنے مضامین بھیجیے — پچھلے ماہ کرناٹک کے ایک ہمدرد عقیل احمد صاحب کا ذکر کیا تھا جنھوں نے پیام تعلیم کے خریدار فراہم کر کے رسالے کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اس مرتبہ بمبئی سے محمد فاروق رکن والدین صاحب نے بھی چار خریدار مرحمت فرمائے ہیں جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ذاکر حسین نمبر کی قیمت چار روپے ہے۔ یہ شمارہ مستقل خریداروں کو بلا قیمت بھیجا جائے گا۔ جنوری میں خریدار بننے والوں کو بھی یہ رعایت دی جائے گی۔

پروفیسر مشیر الحق کی لکھی ہوئی بچوں کی نئی مذہبی کتابیں

محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ	۳/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحؒ	۲/-
حضرت سلمان فارسی رضؓ	۲/-
حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ	۲/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۲/-
حضرت ابوذر غفاری رضؓ	۳/-
نیک بیٹیاں	۲/۵۰
حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	۶/-
حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ	۳/-
خواجہ معین الدین چشتی رحؒ	۲/-
حضرت طلحہ رضؓ	۳/-

بچوں کی پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن

عقائدِ اسلام	۲/-
تین اناڑی	۶/-
ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
نبیوں کے قصے	۵/-
اللہ کے خلیل	۲/-
خرگوش کی چال	۳/-
اسلام کیسے شروع ہوا	۶/۵۰
خرگوش کا سپنا	۳/-

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵



نام : ایم شاہنواز شمسی ۔
مشغلہ : قرآن پاک کی تلاوت کرنا پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا کہانی لکھنا بھائی بہنوں کے خطوط کا پابندی سے جواب دینا ۔
پتا : دریبہ پان رام پور (یوپی)

نام : محمد امتیاز احمد شاہین ۔ عمر ۲۰ سال
مشغلہ : کرکٹ وفٹ بال کھیلنا دینی و دیگر کتابوں کا مطالعہ کرنا قلمی دوستی کرنا ۔
پتا : مکان نمبر ۲۰۲/۷-۳-۲ پٹیل نگر عمبرپیٹ حیدرآباد ۱۳ ۔

نام : سید سرشار احمد سجادی
مشغلہ : نماز پڑھنا عظیم سائنسدانوں کی زندگی کا مطالعہ کرنا کرکٹ کھیلنا و پیام تعلیم پابندی سے پڑھنا ۔
پتا : گوندواڑی مکان نمبر ۸۰۹ کلیان ضلع (تھانہ) مہاراشٹر ۔

نام : فیروز خاں ۔ عمر ۱۷ سال
مشغلہ وشوق : ادبی رسائل پڑھنا ٹکٹ جمع کرنے سے دلچسپی لینا اخبارات کا مطالعہ کرنا دل لگا کر پڑھنا کرکٹ کھیلنا ۔
پتا : ولی چوک ملکاپور ۴۴۳۱۰۱ ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)



محمد خلیل

خالہ بلّی
ایک صفائی پسند گھریلو جانور

آپ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے بلّی کو نہ دیکھا ہو اور یہی وجہ ہے کہ آپ بلّی کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ آپ اب بھی بلّی کو اچھی طرح سے نہیں جانتے. بلّی کی دنیا میں پچیس سے زیادہ قسمیں ہیں. بلّی کو سب سے پہلے کہاں دیکھا گیا یہ بتانا تو مشکل ہے. ہاں یہ ضرور ہے کہ بہت زمانے سے لوگ اسے پالتے آرہے ہیں. ہمارے ملک میں بھی یہ کافی عرصے سے پالی جاتی ہیں. بلیاں کئی رنگوں کی ہوتی ہیں مثلاً کالی، سفید، بھوری، بادامی رنگوں. جنگلی بلّی کے جسم پر عام طور پر دھاریاں ہوتی ہیں. بلّی دن میں سوتی ہے اور رات میں بغیر آہٹ کے شکار کرتی ہے. کیونکہ اس کے پاؤں گدّی دار ہوتے ہیں جس سے ان کے آنے جانے کی آہٹ، شکار یا کسی شخص کو نہیں ہو پاتی. یہ شیر کی خالہ ہونے کے ناتے گوشت خور ہے لیکن دودھ بھی اس کی پسندیدہ غذا ہے. رات میں اس کی آنکھیں خوب چمکتی ہیں اور پتلیاں پھیل جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ دن کے مقابلے میں رات میں بڑی آسانی سے شکار کرتی ہے. بلّی اپنی دُم سے چھونے اور محسوس کرنے کا کام خوب لیتی ہے. اپنی انگلیوں کی مدد سے چلنا بدن کو چاٹ کر صاف کرنا بلّی کی قدرتی خصوصیات ہیں. اس کے اگلے پنجوں میں پانچ اور پچھلے پنجوں میں چار ناخن ہوتے ہیں. جب یہ چلتی ہے تو اپنی گدّی میں چھپا لیتی ہے. اس کی آنکھیں بڑی ہوتی ہیں. اس کی آنکھوں کے سوراخ گول کے بجائے سیدھی دھاری کی شکل میں ہوتے ہیں.

کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نئی دہلی

اب بلّی کے بارے میں ایک دلچسپ بات سن لیجیے، اور وہ یہ ہے کہ بلّی سب کچھ کھا سکتی ہے لیکن پانی کے قریب جانا پسند نہیں کرتی۔ اسے گھریلو جانور کہہ سکتے ہیں کیونکہ آپ اسے کہیں بھی چھوڑ دیں وہ اپنا گھر نہیں بھولتی اور گھوم پھر کر اپنے گھر واپس آجاتی ہے۔ بلّی ایک سال میں دو مرتبہ بچے دیتی ہے اور ایک مرتبے میں چار پانچ بچے دیتی ہے جس میں کم ازکم دو زندہ رہ جاتے ہیں۔ بلّی نہایت پھرتیلی ہوتی ہے سونگھنے اور دیکھنے میں بھی غضب کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اپنے شکار کو اچھل کر پھرتی سے پکڑنا، اس کی خاص خصوصیات میں شامل ہے۔ بلّی کا خاندان بڑا ہے۔ اسی خاندان میں شیر بھی آتا ہے جسے جنگل کا راجا کہتے ہیں۔ بلّی اپنی عادتوں سے انسان کے قریب ہے۔ اور وہ ہماری جلد دوست بن جاتی ہے۔ جس گھر میں وہ ہوتی ہے چوہوں کی خیریت نہیں رہتی چوہے گھر میں داخل ہوئے نہیں کہ بلّی خالہ کو ان کی خوشبو پہنچی اور انھوں نے ایک ہی جھپٹے میں صاف کر ڈالا۔ گھریلو بلّی انسان پر حملہ نہیں کرتی لیکن اگر اسے بہت پریشان کیا جائے تو ایسے واقعات موجود ہیں جس میں اپنے بچاؤ کے لیے بلّی انسان کی گردن کو پکڑ کر سانس کی نلی پر حملہ آور ہوتی ہے اور انسان کو جان کا خطرہ ہو جاتا ہے۔ بلّی کی انھیں خصوصیات سے ہی تو اسے ہم شیر کی خالہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں بلّی کی عادت شاہانہ ہے۔ اور اپنے مالک کا حکم ماننا اس کی مرضی پر ہے۔ یہ ایک صاف ستھرا جانور ہے ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کے جسم سے بدبو کبھی نہیں آتی۔ یہ جہاں ہوتی ہے وہاں چوہے کیڑے مکوڑے چھپکلی، جھینگر وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ پلک جھپکتے کھانے کی چیزوں کو صاف کر جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بلّی میں سونگھنے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلّی اپنے گھر سے کتنی ہی دور نکل جائے لیکن بہ آسانی واپس آجاتی ہے۔ اندھیرے میں یہ خوب دیکھ لیتی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ بلّی چونکہ چوہے اور پرندے کی دشمن ہے اس لیے بغیر بھوک کے بھی یہ ان پر حملہ آور ہو جاتی ہے۔ جس قدر اس میں پھرتیلا پن ہے اتنی ہی یہ کاہل اور آرام طلب بھی ہے۔ یہ گرم جگہ سونا پسند کرتی ہے۔ تھائی لینڈ کی بلّی دنیا میں سب سے زیادہ ذہین سمجھی جاتی ہے اور سب سے خوبصورت بلّی ایران کی ہوتی ہے۔ بلّی اپنی زبان کو جسم صاف کرنے، خشک کرنے اور بالوں کو سنوارنے اور کھانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ بلّی کو قدرت نے عجیب وغریب خصوصیات سے نوازا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے جسم میں بے حد لوچ ہے جس کی وجہ سے اس کی زبان، گردن، ریڑھ کی ہڈی اور سر کو چھوڑ کر جسم کے ہر حصے تک پہنچ جاتی ہے اور یہ بلّی اس کے ذریعے اپنے بدن کو صاف کر لیتی ہے۔ بلّی کو اپنے مالک کے ساتھ کھانا کھانا بھی بے حد پسند ہے اور یہ موقع اسے ملتا رہتا ہے۔ اس کی اوسط عمر دس سے پندرہ سال ہے۔ لیکن اچھی غذا ملنے پر یہ بیس برس سے زیادہ بھی زندہ رہتی ہے۔

! آپ جانتے ہیں

- دنیا کی سب سے بڑی لائبریری لینن گرڈ روس میں ہے۔
- دنیا کا سب سے چھوٹا اخبار میکسیکو ...لیہ سے نکلتا ہے جو صرف ۳/۴ انچ کاغذ پر ...بنا ہے۔
- ساؤتھ کا گٹن کے عجائب گھر میں ایک ...ہے جس کا وزن ڈھائی چھٹانک ہے۔
- دنیا کی سب سے بڑی میٹھے پانی کی ... لیک سپیرئیر ہے۔
- دنیا کا سب سے بڑا پل سین فرانسسکو ... ہے۔
- تبت کے لوگ جیبھ نکال کر ایک دوسرے ...ش آمدید کرتے ہیں۔
- انگلینڈ کے لوگ دوست سے ملنے پر ... چومتے ہیں۔
- ہمارے جسم میں اتنی شکر ہے کہ اس ...ین پیالے چائے بن سکتی ہے۔
- ہمارے جسم میں اتنا فاسفورس ہے کہ ...سے ماچس کی ۲۲۰۰ ڈبیاں بن سکتی ہیں۔
- ہمارے جسم میں اتنا کاربن ہے کہ اس ...رلفیائنڈ سے ۹۰۰ پنسلیں بن سکتی ہیں۔
- مارین بے شکی سب سے لمبی ۸ فٹ ۳ انچ کی عورت ہے۔

(مرسلہ) ایم وسیم انصاری



● شیکسپیئر: انگلستان کا مشہور شاعر لکڑی فروش کا بیٹا تھا۔

● نپولین بوناپارٹ: فرانس کا بہادر ترین شہنشاہ گزرا ہے فوج کا معمولی سپاہی تھا۔

● لارڈ کلائیو: بنگال کا گورنر انگلستان کے دفتر کا معمولی سپاہی تھا۔

● جوزیفائن: ملکۂ فرانس ایک تمباکو فروش کی لڑکی تھی۔

● کیتھرائین: ملکۂ روس فوج میں خادمہ تھی۔

● راجا بیربل: اکبر بادشاہ کے دربار کا ایک رتن۔ رسیاں بانٹنے والا تھا

● قطب الدین ایبک: نیشاپور کے بازار میں تین روپے کا فروخت شدہ غلام تھا۔

● ابن برقوق: سلطان مصر کا ایک معمولی غلام تھا۔

● ہنری فورڈ: موٹروں کے کارخانے کا مالک ایک معمولی دکان کا ادنیٰ غلام تھا۔

● راک فیلر: دنیا کا سب سے دولت مند ترین آدمی اور تیل کا مشہور سوداگر ایک دکان کا معمولی ملازم تھا۔

● مسولینی: اٹلی کا ڈکٹیٹر ایک معمولی لوہار کا لڑکا تھا۔

(مرسلہ) حاتم علی دہلوی

ادھر ادھر

بچوں کا ادبی ٹرسٹ

نتیجہ پہلا انعامی مقابلہ (کہانیاں)

بچوں کے لیے غیر مطبوعہ طبع زاد کہانیوں کے مقابلے میں شامل کہانیوں کو تین ایسے حضرات نے بڑے غور و خوض سے دیکھا جن کا تعلق عام طور پر اردو ادب سے اور خصوصاً بچوں کے ادب سے رہا ہے۔ آپ میں ایک خاتون طالب علم ایسی بھی شامل ہیں جو خود نوخیز ادیبہ ہیں۔ ان فاضل ججوں کے متعین کردہ معیار اور شائع شدہ شرائط کے مطابق انعام پانے والے ادیبوں کے نام نیچے درج ہیں۔ جو حضرات اپنی کہانیوں پر جج صاحبان کے تفصیلی نوٹ جاننے کے خواہشمند ہوں۔ وہ انھیں سیکریٹری سے خط کے ذریعے حاصل کرسکتے ہیں۔ درخواست ہے کہ ادیب حضرات انعام پانے والی کہانیوں کو شائع نہ کروائیں کیونکہ انھیں جلد ہی کسی ورکشاپ میں شامل کرکے ٹرسٹ کی طرف سے شائع کیے جانے کا پروگرام ہے۔

(۱) ۶ سے ۹ سال عمر کے لیے

ادیب کا نام:

غلام حیدر (دہلی) اول شکریے کے ساتھ انعام لے کے
سیّدہ فرحت (علی گڑھ) دوم بڑھا دیا۔
عبدالصمد خواجہ (دہلی) سوم
فرحت قمر (دہلی) چہارم

(۲) ۹ سے ۱۲ سال عمر کے لیے

غلام حیدر (دہلی) اول مطبوعہ (انعام نہیں دیا گیا)
سیّدہ تسنیمہ (دہلی) دوم
سلطانہ آزاد (پٹنہ) سوم مطبوعہ (انعام نہیں دیا گیا)
ڈاکٹر شفیع رحمان اکولوی (اکولہ) چہارم مطبوعہ (انعام نہیں دیا گیا)
محمد شاہد عظیم (حیدرآباد) پنجم
فرحت قمر (دہلی) ششم

(۳) ۱۲ سے ۱۵ سال عمر کے لیے

غلام حیدر (دہلی) اول شکریے کے ساتھ انعام لے کے بڑھا دیا۔
عطاء الرحمان طارق (بمبئی) دوم
تنویر اختر رومانی (جمشید پور) سوم
ساغر ملک (تھانہ) چہارم بنیادی خیال انگریزی سے (انعام نہیں دیا گیا)
ڈاکٹر رشید الوحیدی (دہلی) پنجم

(۴) نوخیز ادیبوں کے لیے

زیبا ظفر (کلکتہ) اوّل
فرخ ریحان (علی گڑھ) دوم مطبوعہ (انعام نہیں دیا گیا)
فرخ ریحان (" ") سوم
ایم۔ نعیم صدیقی (ایٹہ) چہارم
محمد فضل الرحمان (لکھنؤ) اچھی اور صحیح زبان کیلیے کنسولیشن انعام

سیکریٹری غلام حیدر اے/۴۶ ذاکر نگر بھامونگر
نئی دہلی ۲۵-۱۱

آٹھ سالہ لڑکا حافظ قرآن

گلاسکو (اسکاٹلینڈ)

۱۴ دسمبر۔ یہاں کے آٹھ سالہ لڑکا جمیل مغل نے قرآن کو مکمل طور پر حفظ کرکے کسی مغربی ملک میں ایسا کرنے والے سب سے کم عمر کا بچہ ہونے کا شرف حاصل کیا ہے جمیل کے اس کارنامہ پر یہاں کی بڑی مسجد میں اسے کل ایک جلسہ میں ایوارڈ دیا گیا۔



ایک صاحب گھوڑے پر بیٹھے اپنے کندھے
بہت سا سامان لادے چلے جا رہے تھے۔ کسی نے
ن سے کہا "بھائی اپنا سامان بھی گھوڑے کی پیٹھ
ہی رکھ لو۔ تھک گئے ہوگے" وہ صاحب بولے
واہ بھئی واہ۔ میں اتنا بے درد تھوڑی ہوں۔ بچارا
ھوڑا میرے وزن سے ہی تھکا جا رہا ہے۔ اس پر
ر سامان رکھ دوں، نہیں بھائی نہیں، مجھ سے
یسا ظلم نہیں ہو سکتا۔"

شمشیر احمد شمسی۔ رامپور

• • •

شبانہ : کیا تم بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتی ہو۔؟
سمہ : جی نہیں منہ سے۔

• • •

سپاہی : جب چوری ہوئی کیا وقت تھا؟
سیٹھ جی : وقت ہی تو برا تھا۔ تبھی تو میں لٹ گیا۔

ملا احمد، کیرآف محمد صدیق صاحب، مہراج گنج رفیع گنج
اورنگ آباد (بہار)

ایک عورت کو بڑے سندر کی کھانسی ہو رہی تھی۔
اس کے خاوند نے کہا "اب مجھے تمہارے گلے کے لیے
کچھ لانا پڑے گا۔"
عورت کھانسی کو روکتے ہوئے ذرا سنبھل کر
بولی "منے کے ابا! میرے گلے کے لیے وہی ہیروں والا
ہار لانا جو پچھلے ہفتے ہم نے جوہری کی دکان پر دیکھا تھا۔"

• • •

ایک شخص کے پاس ایک گائے تھی اس نے
بیچ دی۔ اس کے دوست نے پوچھا "تمہاری گائے
اتنی اچھی تھی تم نے کیوں بیچ ڈالی" اس نے جواب دیا۔
"اچھی تو وہ بے شک تھی لیکن میرے بیٹے کو مارتی تھی۔"
اس پر لڑکا جو پاس ہی کھڑا تھا۔
جھٹ سے بولا "ابا جی پھر بھائی جان کو کیوں
نہیں بیچ دیتے وہ بھی تو مجھے روزانہ مارتے ہیں۔"

عشرت جہاں اوگانواں۔

مریض ڈاکٹر سے : ڈاکٹر صاحب میرے جسم سے آگ
نکل رہی ہے۔
ڈاکٹر : تب آپ کو مجھے بلانے کے بجائے فائر بریگیڈ
کو بلانا چاہیے۔

• • •

ایک شخص دھوبی سے : آخر تم اتنے صاف کیوں نظر
آتے ہو۔
دھوبی : دن رات پانی اور صابن سے سابقہ جو پڑتا
ہے۔

سید سرشار احمد سجاوی گوئنوداڑی کلیان ضلع تھانہ



"پیام تعلیم" کے سرورق پر آپ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی تصویریں شائع کرتے ہیں. میری رائے یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی تصویریں سرورق ہمیشہ شائع نہ کیجیے. کیونکہ رسالہ دیکھنے والے پر پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ یہ تو چھوٹے بچوں کا رسالہ ہے. اسے ہم کیا پڑھیں. حالانکہ "پیام تعلیم" میں شائع ہونے والے مضامین سے بڑے لڑکے اور بالغ حضرات بھی مستفید ہو سکتے ہیں. اس کے مضامین معیاری بھی ہیں. اور معلومات افزا بھی. لہٰذا میری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ پیام تعلیم پر چھوٹے بچوں کی تصویریں چھاپنے کی بجائے پھولوں کی تصویریں. یادگار عمارتوں کی تصویریں جیسے تاج محل، قطب مینار وغیرہ اور دیگر دیدہ زیب قسم کا آرٹ پیام تعلیم کے سرورق پر ثبت کیا جائے اس طرح آپ کا رسالہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے لڑکوں اور طالب علموں کے لیے بھی پرکشش رہے گا.

شکیل احمد ابن فطرت،
شوکت علی روڈ، بھٹکل، کرناٹک (۵۸۱۳۲۰)

• دسمبر کے پیام تعلیم میں "عبدالسمیع ترین برنائی صاحب" نے صفحہ ۱۸ پر دلچسپ معلومات کا جو ذخیرہ ہم پیامیوں کو دیا ہے. اس میں ایک جگہ (پوائنٹ نمبر ۱۵) انھوں نے مینڈک کے دل کو غلطی سے پانچ خانوں میں بانٹ دیا ہے جبکہ مینڈک کے دل میں صرف تین خانے ہوتے ہیں اور یہ گہرے لال رنگ کا TRANGULAR STRUCTURE ہوتا ہے. خانے اس طرح ہیں:

A) Auricles - (Right and Left)
B) VERTICLES - 1
A) AURICLES -2 (Right and Left)

اس لیے ہمارے پیامی بھائیوں اور دوستوں کو چاہیے کہ کچھ بھی چھپوانے سے قبل پوری طرح تحقیق کرلیں.

میں عنبری خاتون (داوگانواں) کے مشورے سے متفق ہوں کہ قلمی دوستی کا کالم ہٹا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا مضمون شامل کردیں.

خالد ریحان —— محلہ. درگاپور. کیٹیہار



اردو اکادمی، دہلی کے روز و شب

دانشوروں کی عزت افزائی ——— سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں چار دانشوروں کی عزت افزائی کی گئی۔

تصنیفات پر انعامات ——— سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں پندرہ بہترین تصنیفات پر انعامات دیے۔

ادیبوں و فنکاروں کو وظائف ——— سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں دس افراد یا ان کے پسماندگان کو چار سو روپیا ماہوار کے حساب سے وظائف دیے گئے۔

طالب علموں کو انعامات وظائف ——— سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۴۷ طالب علموں کو انعامات اور وظائف دیے گئے۔

اسکولی سطح پر تعلیمی مقابلے ——— مڈل، سکنڈری و سینئر سکنڈری اسکولوں میں تعلیمی مقابلے منعقد کرائے گئے۔ ۱۰۲ کامیاب طالب علموں کو اکادمی کی سند و تمغات دیے گئے۔

ادبی سیمینار / ورکشاپ ——— داغ دہلوی سیمینار، مولانا ابوالکلام آزاد سیمینار، اردو افسانہ ورکشاپ، اردو صحافت سیمینار، اردو اساتذہ سیمینار، نصاب، دلی والے سیمینار، اردو غزل سیمینار، ورکشاپ منعقد کرائے گئے۔

مشاعرے ——— یوم جمہوریت اور یوم آزادی کے موقعوں پر کل ہند مشاعرہ منعقد کیے گئے خواتین کے مشاعرہ، مزاحیہ مشاعرہ اور اردو اساتذہ مشاعرے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ پروگرام ——— شام موسیقی، شام غزل شاعر کے ساتھ شام، بزم قوالی کی محفلوں کا ہر ماہ اہتمام کیا جاتا ہے۔

اشاعتی پروگرام ——— دہلی کی تہذیب پر پانچ کتابیں، رسوم دہلی، دہلی کی آخری شمع، بزم آخر قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں اور دہلی کا آخری دیدار شائع کی جا چکی ہیں۔ مولانا آزاد سیمینار اور دلی والے سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں و خاکوں پر مبنی دو کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات و استقبالیے ——— اب تک اس قسم کے چھ پروگرام منعقد کیے جا چکے ہیں جن میں غیر ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں سے ملاقات و استقبالیہ بھی شامل ہیں۔

المشتہر
سید شریف الحسن نقوی
سکریٹری اردو اکادمی دہلی

گھٹا مسجد روڈ
دریا گنج، نئی دہلی ۲

فون: ۲۶۲۶۹۳، ۲۷۶۲۱۱





عقلمند کسان

ایک دفعہ ایران کا بادشاہ کسریٰ اپنے وزیر اور
[illegible]نچی کے ساتھ ایک گاؤں کا دورہ کر رہا تھا۔ اس
[illegible]دیکھا کہ ایک بوڑھا کسان اپنے کھیت میں کھجور
[illegible]خت لگا رہا ہے۔ چونکہ کھجور کا درخت بہت
[illegible]میں پھل لاتا ہے۔ اس لیے بادشاہ کو بہت تعجب
[illegible]ہ یہ بوڑھا کسان کھجور کا درخت کیوں لگا رہا ہے۔
[illegible]نے بوڑھے سے دریافت کیا، بابا! تم کس امید پر
[illegible]خت لگا رہے ہو؟ کھجور کا درخت تو کئی سالوں
میں پھل لاتا ہے کیا تمھیں یقین ہے کہ اس درخت کا
پھل تم کھا سکوگے؟

بوڑھے کسان نے مسکرا کر جواب دیا عالی جاہ! ہمارے
باپ دادا نے درخت لگائے اس کے پھل میرے باپ نے
کھائے اب میں جو درخت لگا رہا ہوں اس کا پھل میری
اولاد کھا سکے گی!

بادشاہ کو بوڑھے کسان کا یہ جواب بہت پسند آیا
اس نے خزانچی کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کسان کو پانچ سو
دینار انعام دیدو۔

کسان نے خوش ہوتے ہوئے کہا دیکھا آپ نے
بادشاہ سلامت! میرا درخت اس سال پھل لے آیا
بادشاہ یہ برجستہ جواب سن کر بہت خوش ہوا۔ اور خزانچی
کو پانچ سو دینار مزید دینے کا حکم دیا۔

چنانچہ ایک ہزار دینار انعام لینے کے بعد کسان بولا۔
کتنے تعجب کی بات ہے بادشاہ سلامت! میرا درخت
سال میں دو بار پھل لایا۔

بادشاہ کسان کی دانائی پر حیرت زدہ رہ گیا اور مزید
پانچ سو دینار انعام عطا کرنے کے لیے اپنے خزانچی سے
کہا۔

چلو جلدی سے یہاں سے بھاگ چلو ورنہ یہ بڈھا
ہمیں لوٹ لے گا۔

نام: نثار احمد
پتا: مہراج گنج، رفیع گنج، اورنگ آباد (بہار)

آج کا کام کل پر مت چھوڑو!

● آج صبح سے ہی آسمان پر چاروں طرف بادل
چھائے ہوئے تھے۔ کچھ بچے ایک جگہ بیٹھے ہوئے
اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ اللہ پاک
جلدی سے بارش آجائے تو ہماری چھٹی ہو جائے گی
ننھی منی اپنی توتلی زبان سے کہے جا رہی تھی اللہ پاک
مینھ مت سے ...ک پہلا پات کلنے تو تہا تھا مجھے مس نے

کل پہاڑا یاد کرنے کو کہا تھا، لیکن میں تو ٹی وی دیکھنے میں لگ گئی (لیکن میں تو ٹی وی دیکھنے میں لگ گئی)

سب بچے آج کی چھٹی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے ابھی ننھی منی کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی کہ ہلکی ہلکی بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش بہت تیز ہو گئی ایسا معلوم ہوتا جیسے ان ننھے منے بچوں کی دعائیں اللہ میاں نے سن لیں ڈیڑھ گھنٹے تک برابر بارش ہوتی رہی جب بارش رکی تو جمال میاں بول اٹھے آج چھٹی تو ہو گئی۔ کل کا ہوم ورک رات کو کر لیں گے۔

اب پکنک کا پروگرام بنا لیا جائے جمال میاں کی بات پر سب بچوں نے خوشی میں تالیاں بجادیں جمال میاں نے کہا سب بچے اپنی اپنی ممی سے پیسے لے آؤ دن بھاگ کے پارک جانے کی تیاری ہونے لگی یہ پارک بچوں کے گھر سے قریب ہی ہے اس پارک میں بڑے سے خوبصورت رنگ برنگ پھول خوبصورت پرندے چہچہاتی ہوئی چڑیاں ناچتے ہوئے مور رنگا رنگ کی مچھلیاں قسم قسم کے سانپ اور بچوں کے کھیلنے کے لیے میدان ڈھل پھسلن جھولے وغیرہ وغیرہ تھے۔

سب بچے پارک کے لیے چل دیئے آگے آگے جمال چل رہے تھے ½ آدھے گھنٹہ بعد بچوں کا قافلہ پارک پر دھاوا بول چکا تھا کوئی جھولا جھول رہا تھا کوئی پانی سے کھیل رہا تھا تو کوئی پھولوں کا نظارہ کر رہا تھا کوئی یونہی میدان میں دوڑ لگا رہا تھا جمال میاں اور حامد پارک کے سامنے والے ہوٹل سے ناشتہ خرید رہے تھے جب کھانے کا سامان آ گیا تو سب بچے ایک جگہ جمع ہو گئے جمال بھائی نے سب کو بسکٹ سموسے بانٹ دیے ناشتہ کرنے کے بعد بچے پھر کھیل کود میں لگ گئے ڈیڑھ دو گھنٹہ خوب کھیل کود کرنے کے بعد سب نے کھانا کھایا تھوڑی دیر بعد نہانے کا دور شروع ہوا ۵ بجے سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹے دن بھر اتنا کھیلے کود ے تھے کہ تھک کر چور ہو گئے تھے ہوم ورک کرتے ہی دل نہیں لگا رات کو پھر دلچسپ ٹی وی پروگرام نظروں کے سامنے تھے جلد ہی بچے نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ صبح اٹھے تو پھر وہی دن تھا اور وہی ہوم ورک نہ ہونے کی فکر تھی۔ میرے پیارے پیارے بھائی بہنوں ہمیں اس کہانی سے یہ سبق لینا چاہیے کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑیں۔

ایم۔ شاہنواز شمسی، دریبہ پان، رام پور۔



دُم کٹا بھالو

● ایک لومڑی تھی وہ بہت چالاک تھی ایک بار وہ بیٹھی تھی اس نے دیکھا کہ ایک بیل گاڑی پر بہت ساری مچھلیاں رکھی ہیں۔ اس نے کود کر بیل گاڑی پر سے چپکے سات مچھلیاں لے لیں اور آرام سے کھانے لگی وہاں سے بھالو آیا اس نے پوچھا لومڑی بہن تم یہ مزے دار مچھلیاں کہاں سے لائی ہو ذرا مجھے بھی بتاؤ میں بھی انھیں کھا سکوں۔ لومڑی جھوٹ بولتے ہوئے بولی بھالو بھائی وہ ندی جو ہے، برف کے لوگوں والی، بس وہیں سے لائی ہوں" بھالو نے پوچھا کس طرح پکڑا تم نے لومڑی بولی "میں نے اپنی دم ڈال دی ندی میں بس دم میں آ کے پھنس گئی۔ آؤ میرے ساتھ تم کو لے چلوں پھر جتنی چاہو پکڑنا۔" لومڑی بھالو کو ندی کے

س نے گئی اور یوں بس بھالو بھاگ اس میں اپنی دُم
ال دو مچھلیاں پھنستی جائیں گی۔ بیوقوف بھالو نے
ی دُم اس میں ڈال دی اس کی دُم پر برف جمتا
اور بڑا سا گولا بن گیا برف میں سے ان کی دم نکل
ا نہ پائی۔ تب تک کچھ جنگلی کتوں کی آوازیں آنے
ی لومڑی تو دم دبا کر بھاگی لیکن بھالو کیسے دم دبا کر
اگتا۔ اس کی دم تو اب تک نہیں سکتی تھی بس دم کو
ڑ کر بھاگا یعنی یہ کہ وہ تو بھاگ گیا لیکن اسکی دُم
ں پھنسی رہ گئی

سن سلیم
رفت ڈاکٹر ایم، معظم جیراج پوری محلہ تکیہ اعظم گڑھ

ہمالہ کی معروف چوٹیاں اور انکی بلندی

چوٹی کا نام	بلندی (میٹر میں)
ماؤنٹ ایورسٹ	۸،۸۴۸
کنچن جنگا	۸،۵۹۸
دھول گیری	۸،۱۶۷
گوسائی تھان	۸-۱۸
ان پورنا	۸۰۵۰
نندا دیوی	۷۸۱۸
بدری ناتھ	۷۰۴۰
کیدار ناتھ	۶۸۳۱
گنگوتری	۶۵۰۸
جمنوتری	۶۵۲۷

سعیدہ بانو غلام رازق شیخ۔ احمد آباد

(اقو)ال زرّیں

جو اللہ سے ڈرتا ہے اس سے سب ڈرتے ہیں۔
جس کا غصہ زیادہ ہوگا۔ اس کے دوست کم ہوں گے۔
نیک بخت وہ ہے جو نیکی کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے نیکیاں گناہوں کو زائل کر دیتی ہیں۔

۴۔ عالم جاہل کو اس لیے پہچانتا ہے وہ جاہل رہ چکا ہے لیکن جاہل عالم کو نہیں پہچانتا اس لیے کہ وہ خود عالم نہیں ہے۔

۵۔ ایمان کی افضل ترین علامت یہ ہے کہ انسان ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ سمجھے۔

۶۔ ایک بچّے کے لیے اس کے والدین سے بڑھکر کوئی استاد نہیں ہے۔

۷۔ کسی انسان کا دل دُکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔

عالیہ پروین، شبنم اوگالوی، اوگالواں۔

قدرت کا انصاف

• شہر کانپور کے قریب حمیر پور کے ایک گاؤں رحیم پور میں اکبر نام کا ایک لڑکا تھا جو اپنے ماں باپ کا بہت چہیتا اور لاڈلا تھا۔ چونکہ اکبر بہت لاڈلا تھا اسی لیے وہ بہت شرارتی بن گیا تھا۔ اکبر کی شرارتوں سے اکبر کے ماں باپ اور محلّے والے بہت پریشان تھے۔ اکبر کسی سوتے آدمی کے قریب پٹاخہ داغ دیتا تو کبھی کسی بلی کی دُم میں پھلجھڑیاں باندھ دیتا۔ تو کبھی کسی نابینا فقیر کے کٹورے سے پیسے چرا لیتا تو کبھی کسی لنگڑے لولے پر ہنستا اور انھیں چڑھایا کرتا۔ ایک مرتبہ اکبر شہر سے پلاسٹک کا ایک سانپ خرید لایا۔ اس سانپ سے اکبر صرف اپنے بھائی بہنوں کو ہی نہیں۔ بلکہ محلّے اور اسکول کے بچّوں کو بھی ڈرایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اکبر نے اس سانپ کو P.T. کے ٹیچر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ پہلے تو P.T. کے ٹیچر ڈرے اور پھر بچّوں سے دریافت کیا۔ چونکہ تمام بچے اکبر سے ڈرتے تھے اسی لیے کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اور خاموش کھڑے رہے۔ ٹیچر نے غصے میں سانپ کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ چھٹی ہونے کے بعد اکبر اپنا سانپ ڈھونڈنے اسکول کے

پچھواڑے گیا۔ کچھ دیر ڈھونڈنے کے بعد اسے اسی شکل کا سانپ ایک جھاڑی میں پڑا دکھائی دیا۔ اکبر نے سانپ کی دم پکڑلی۔ سانپ نے پلٹ کر اکبر کے دائیں ہاتھ پر کاٹ لیا۔ کیونکہ وہ اصلی سانپ تھا۔ اکبر کی چیخ سے اسکول کے کچھ بچے وہاں آگئے۔ اور انھوں نے اکبر کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ گاؤں کا معاملہ تھا فوری طبی امداد نہ پہنچنے کی وجہ سے اکبر کے دائیں ہاتھ میں زہر پھیلنے لگا اور اسپتال پہنچنے تک اکبر کے دائیں ہاتھ میں کافی زہر پھیل چکا تھا نتیجتاً اکبر کا دایاں ہاتھ کاٹنا پڑا۔ اس حادثہ کے بعد اکبر نے شرارت سے توبہ کرلی۔

سید سرشار احمد سجادی
گوندواڑی کلیان ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

عذر کی تلاش

• ایک آدمی: (بچے سے) اگر ہمارے پاس مکئی کی دو ٹوکریاں ہوں ایک میں سترہ بالی اور دوسرے میں تیرہ بالی تو اس میں سے تم کس کو لوگے؟

بچے نے کہا میں اس کو لوں گا جس میں تیرہ بالیاں ہیں۔

چنانچہ اس نے تمام بچوں سے کہا کہ یہ صحیح کہتا ہے یا غلط تو ایک لڑکے نے کہا کہ یہ صحیح کہتا ہے۔

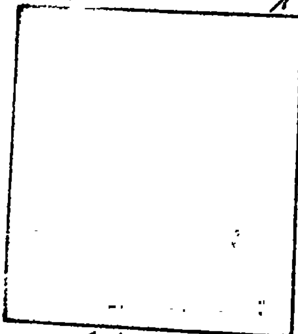
پھر اس نے کہا کیوں؟ تو اس بچے نے کہا اس وجہ سے کہ اسے مکئی پسند ہی نہیں ہے۔

انیس الرحمن بن محمد سہیل اموآدی
مدرسہ انوار العلوم املو مبارک پور اعظم گڑھ (یوپی)

انمول موتی

• سچے دوست کی قدر کرو۔
• وعدہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرو۔
• وعدہ ہمیشہ پورا کرو۔
• اپنی تعریف کبھی نہ کرو۔
• بری صحبت سے تنہا بیٹھنا اچھا ہے۔

محمد مظہر نعمانی (مستقیم) اورنگ آباد (بہار)



تین اندھے لڑکوں کی کہانی

• ایک جوہری اپنے گاؤں میں کافی خوش حال تھا البتہ اس کو ایک غم تھا اور وہ اولاد کے نہ ہونے کا وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا کہ مجھے اولاد کی نعمت سے مالا مال کر۔ کچھ عرصے کے بعد اللہ تعالےٰ نے اس کی دعا سن لی اور اس کے یہاں ایک لڑکا ہوا لیکن اندھا تھا۔ جوہری کو تھوڑا افسوس بھی ہوا لیکن اولاد ہونے کی وجہ سے خوش بھی ہوا اس کے بعد دوسرا لڑکا ہوا وہ بھی اندھا ہی پیدا ہوا پھر اس کے دو سال بعد تیسرا لڑکا ہوا وہ بھی اندھا ہی پیدا ہوا۔ بچارا جوہری خدا کی مرضی کے آگے کیا کرتا۔ وہ لڑکوں کی پرورش میں لگ گیا۔ لڑکوں میں اور کچھ نہ سہی۔ لیکن باپ کی طرح ہر چیز کو پرکھنے کی عادت ضرور تھی۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ اندھوں کی چھٹی حس بیدار ہوتی ہے۔ جب تک لڑکے جوان ہوں۔ جوہری کی دولت ختم ہو گئی تھی، اندھے لڑکے بوڑھے باپ کا سہارا بننے کے بجائے ایک بوجھ بن گئے تھے۔ سوداگر کافی پریشان تھا وہ اپنی بیوی سے ہمیشہ اپنی پریشانی ظاہر کرتا رہتا

ا۔ ایک دن لڑکوں نے اپنے باپ کی پریشانی دیکھ کر
بابا جان آپ کیوں فکر کرتے ہیں ہمیں کسی کو بھی فروخت
دیں ملا اس زمانے میں غلاموں کو فروخت کرنے کا
اج تھا) بیٹوں کی بات سن کر باپ کے آنکھوں سے
نسو نکل آئے۔ لیکن وہ مجبور تھا ایک دن اس نے اپنے
ینوں بچوں کو بازار میں لے جا کر کھڑا کر دیا اچانک
ں طرف سے شاہی وزیر کا گزر ہوا یہ تینوں بچے کافی
بصورت تھے۔ شاہی وزیر انھیں دیکھتے ہی ٹھہر
۔ شاہی وزیر نے بڈھے سے پوچھا کیا یہ لڑکے فروخت
نے کے لیے ہیں۔ جوہری جو اپنے منہ پر کپڑا ڈالا ہوا
آہستہ سے بولا جی ہاں" شاہی وزیر نے کافی رقم
ے کر ان تینوں لڑکوں کو خرید لیا۔ اور شاہی لنگر
نے میں رکھ کر ان کی پرورش شروع کر دی۔ شاہی
یر کے کچھ مخالفین نے بادشاہ کو بھڑکانا شروع
یا کر شاہی وزیر نے تین اندھے لڑکوں کو لا کر
خانے میں رکھ دیا ہے۔ آپ جانیے حضور یہ تینوں
م کے نہ کاج کے، بس ڈھما من اناج کے حضور
نا نہ خالی کرنے کا ارادہ ہے اس کا۔ بس پھر کیا
راجا کو غصہ آگیا۔ اس نے حکم دیا کہ شاہی وزیر
تینوں اندھے لڑکوں کو دربار میں حاضر کرو۔ وہ
ر ہوگئے۔ بادشاہ نے شاہی وزیر سے پوچھا کہ
ضرورت تھی ان تین اندھے لڑکوں کو خرید کر لنگر
میں رکھنے کی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ بالکل اندھے
اور ناکارہ ہیں۔ لڑکوں نے فوراً بادشاہ کو جواب
جہاں پناہ ہم اندھے ضرور ہیں لیکن ناکارہ
ں ہیں؟ بادشاہ نے فوراً سوال کیا بتاؤ تم میں کیا
یاں ہیں" بڑا لڑکا بولا" حضور مجھے کسی قسم کا
ہیرا دیجیے میں اس کی خاصیت اور خوبی بتا سکتا
ں" دوسرے لڑکے نے کہا" جہاں پناہ مجھے
قسم کا بھی گھوڑا بتا دیجیے میں بتا دوں گا کہ وہ کونسی
ل کا ہے۔ تیسرے لڑکے نے کہا میرے سامنے کسی کو
بھی کھڑا کر دیجیے میں اس کی گفتگو سے اس کے حسب
نسب کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ بادشاہ اور
درباری ان تین لڑکوں کے بیان پر ہنسنے لگے اور
پھر بادشاہ نے کچھ سوچ کر انھیں لنگر خانے واپس
بھجوا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک جوہری بادشاہ کے
دربار میں ایک ہیرا لایا تو بادشاہ نے فوراً اندھے
لڑکے کو بلوایا اور پوچھا بتاؤ اس کی خاصیت کیا
ہے اگر نہ بتلاؤ گے تو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔
لڑکے نے ہیرا لے کر کہا" جہاں پناہ ہیرا بہت شاندار
ہے لیکن اس میں ایک خرابی ہے بادشاہ لڑکے کے جواب
حیرت میں پڑ گیا اور بولا: بتاؤ کیا خرابی ہے لڑکے نے
جواب دیا اس ہیرے میں ایک باریک لکیر آگئی ہے یہ
کسی جوہری کے ہاتھ سے گر گیا تھا اب اس کی وہ تاثیر
نہیں رہی جس کے لیے یہ مشہور ہے۔ بادشاہ فوراً جوہری
سے ڈانٹ کر پوچھا "سچ بتاؤ یہ اندھا لڑکا جو کچھ
کہہ رہا ہے سچ ہے یا جھوٹ — جوہری نے معافی
مانگتے ہوئے کہا۔ یہ سچ ہے۔ لیکن یہ لکیر اتنی باریک ہے
جس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا، بس محسوس کر سکتا ہے بادشاہ
لڑکے سے بہت خوش ہوا اور لنگر خانے کو ہمیشہ کے
لیے رکھوا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک عربی نسل کے گھوڑے
کو بادشاہ کے دربار میں فروخت کرنے کے لیے لایا گیا۔
اور بادشاہ کو پھر خیال آیا اور اس نے دوسرے لڑکے
کو بھی آزمانے کے لیے بلایا۔ لڑکا گھوڑے کے قریب
گیا ہاتھ لگا کر اس کی بُو کو محسوس کیا اور کہنے لگا حضور
یہ شاہی نسل کا گھوڑا ہے اور یہ بہت اچھا گھوڑا ہے
لیکن اس میں ایک خرابی ہے وہ یہ کہ پانی دیکھتے ہی
بیٹھ جاتا ہے بادشاہ نے گھوڑا لانے والے کو
طلب کیا اور پوچھا کیا یہ بات سچ ہے کہ یہ گھوڑا پانی
دیکھتے ہی بیٹھ جاتا ہے؟ گھوڑے والے نے جواب
دیا حضور یہ گھوڑا دن میں دو بار نہاتا ہے۔ اس لیے پانی
دیکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اندھے نے جواب دیا" نہیں حضور

بچپن میں اس گھوڑے کی ماں مرگئی تھی اس لیے اس کی پرورش بھینس کے دودھ سے ہوئی جس کی وجہ سے اس میں بھینس کی خاصیت آگئی ہے لڑکے کی بات سن کر گھوڑے والا بادشاہ کے قدموں میں گرگیا اور بولا حضور لڑکا سچ کہتا ہے۔ اس لڑکے سے بھی بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور پھر چند دنوں کے بعد بادشاہ کو تیسرے لڑکے کو آزمانے کا خیال آیا اس نے تیسرے لڑکے کو بلوایا۔ بادشاہ نے لڑکے سے پوچھا "تم نے کہا تھا کہ میں انسان کی گفتگو سے اس کی شخصیت اور اس کی نسل تک جان جاتا ہوں۔ لڑکے نے کہا:" جی حضور "اچھا تو میرے بارے میں بتاؤ حضور میں آپ کے قریب آنا چاہتا ہوں اجازت دی جائے بادشاہ نے لڑکے کو اجازت دی لڑکا بادشاہ کے قریب آکر کہنے لگا حضور جسارت معاف کیجئے گا آپ شاہی خاندان سے نہیں ہیں آپ ایک باورچی کی اولاد ہیں جیسے ہی لڑکے نے یہ جملہ کہا بادشاہ کو ایک دم غصہ آگیا اور وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس گیا اور اس نے اپنی ماں سے پوچھا کیا میں باورچی کی اولاد ہوں" ماں نے کہا ہاں بیٹا تو باورچی کی اولاد ہے"۔ بادشاہ واپس آکر لڑکے سے پوچھا "بتاؤ تم نے میری گفتگو سے یہ کیسے جانا کہ میں باورچی کی اولاد ہوں۔ لڑکے نے جواب دیا حضور میں نے اپنے بڑے بھائی کے انعام کے وقت ہی محسوس کرلیا تھا کہ اگر آپ کے جسم میں شاہی خون ہوتا تو انعام واکرام یا جاگیریں عطا کرتے چونکہ آپ ایک باورچی کی اولاد ہیں اس لنگر خانے میں واپس کردیا۔ اور بادشاہ لڑکے کے جواب سے بے حد متاثر ہوا اور تخت سے اتر کر اپنا تاج لڑکے کو پہنادیا اور لڑکے نے وہ تاج بادشاہ کو دیتے ہوئے کہا" حضور انصاف اندھا ہوتا ہے، بادشاہ نہیں۔ یہ تاج آپ ہی کے لیے ہے۔ بادشاہ نے لڑکے کو گلے سے لگالیا۔ بادشاہ کے حکم سے تینوں بھائی اور ان کے والدین محل میں آکر رہنے لگے۔

پیام تعلیم کیلنڈر ۱۹۸۷ء

عبدالمجید آئینکل بنگلور					جنوری اکتوبر	فروری مارچ نومبر	اپریل جولائی	مئی	جون	اگست	دسمبر ستمبر
۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	جمعرات	اتوار	بدھ	جمعہ	پیر	ہفتہ	منگل
۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	جمعہ	پیر	جمعرات	ہفتہ	منگل	اتوار	بدھ
۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱	ہفتہ	منگل	جمعہ	اتوار	بدھ	پیر	جمعرات
۴	۱۱	۱۸	۲۵	★	اتوار	بدھ	ہفتہ	پیر	جمعرات	منگل	جمعہ
۵	۱۲	۱۹	۲۶	★	پیر	جمعرات	اتوار	منگل	جمعہ	بدھ	ہفتہ
۶	۱۳	۲۰	۲۷	★	منگل	جمعہ	پیر	بدھ	ہفتہ	جمعرات	اتوار
۷	۱۴	۲۱	۲۸	★	بدھ	ہفتہ	منگل	جمعرات	اتوار	جمعہ	پیر

"چھبیس جنوری"

۲۶ جنوری ۱۵۳۰ء۔ بھارت میں مغل بادشاہ بابر کی موت۔

۲۶ جنوری ۱۵۳۱ء۔ شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی۔

۲۶ جنوری ۱۷۲۹ء۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو نکالنے کا ارادہ کیا۔

۲۶ جنوری ۱۸۷۶ء۔ پہلی بار ریل چلی۔

۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹرکی میں انگریزوں کی جیت ہوئی۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء۔ لاہور راوی کے کنارے مکمل آزادی کا منصوبہ بنا۔ جواہر لال نہرو نے ساری جنتا کو مکمل آزادی کا حلف دلایا۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء۔ بھارت میں ودھان لاگو ہوا۔

عنبری ناز۔ ادگانواں

...نل معلومات

...کی سب سے بڑی مورتی نیویارک میں ہے۔
...کا سب سے بڑا چڑیا گھر افریقہ میں ہے۔
...کی سب سے بڑی دیوار چین میں ہے۔
...کا سب سے بڑا پیڑ امریکہ میں ہے۔
...کا سب سے اونچا مینار ایفل ٹاور ہے۔ یہ فرانس
...ہے۔
...کا سب سے مہنگا شہر ٹوکیو ہے
...کی سب سے پرانی یونیورسٹی مراقش میں
...
...کا سب سے اونچا ہوٹل ویسٹ ان اسٹامفورڈ
...ٹل ہے۔ یہ سنگاپور میں ہے۔
...یکل کا ایجاد میک میلن نے کیا تھا۔
...ن سب سے پہلے انگلینڈ میں ایجاد ہوا تھا۔
...ٹکٹ سب سے پہلے برٹین میں شروع ہوا۔
...کورٹ فرانس کے آرمنڈ جو ۲ بج کر ۱۰ منٹ
...پیدا ہوئے تھے۔ ان کی بائیں آنکھ کی دیدہ
...ی کے ڈائل کا صحیح شکل پایا گیا تھا جس
...گھنٹے کی سوئی ۲ بج کر ۱۰ منٹ پر تھی۔

محمد آفتاب عالم
شیخانہ خرد بہار شریف نالندہ ۸۰۳۱۰۱



دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا



ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

فروری ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۲

شیخ الجامعہ کا پیام ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
پیغامات

اس شمارے کے مضمون نگار حضرات

ڈاکٹر سیفی پریمی ۔ خواجہ حسن نظامی
عبداللہ ولی بخش قادری ۔ بیکل اتساہی ۔ شمس کنول
محمد یوسف پاپا ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عرفان پرجنوی
صفیہ رحمٰن ۔ ڈاکٹر قمر احمد رضوی ۔ یوسف ناظم
عزیز قریشی ۔ وقار الرحمٰن جامعی ۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی
ڈاکٹر جاوید وششٹ ۔ ڈاکٹر رشید الوحیدی ۔
نیاز قومی ۔ صادقہ ذکی ۔ تبسم زیدی ۔ اختر الواسع

اس شمارے کی قیمت ۴ روپے ہوگی ۔

قیمت فی پرچہ : 3/= سالانہ : 25/=
غیر ممالک سے : نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز : بارہ ڈالر
فی پرچہ : ایک ڈالر

مینیجنگ اڈیٹر : شاہد علی خاں
اڈیٹر : ولی شاہجہاں پوری
معاون : مختار احمد ، منیجر : شمیم اللہ خاں
تزئین کار : ایس ، ایم ، منظر

بچوں سے باتیں

آپ اس نمبر کو دیکھ کر کہہ رہے ہوں گے "دیر سے آیا مگر اچھا ہے" ہم بھی کیا کرتے ! جشنِ ذاکر کی تقریبات کے سلسلے میں پیام تعلیم کے اس خاص نمبر کے علاوہ ہمیں ذاکر صاحب کے بارے میں کئی کتابیں شائع کرنی تھیں ۔ وہ بھی بہت کم وقت میں ۔ اس لیے ہماری توجہ بٹی رہی ۔ پھر ہم یہ بھی چاہتے تھے ذاکر صاحب کے صدر جمہوریہ ہونے پر ۱۹۶۷ء میں، اور ان کے انتقال پر ۱۹۶۹ء میں، ہم نے جو خصوصی شمارے ترتیب دیے تھے، یہ شمارہ ان سے الگ ہو ۔ ذاکر صاحب کے بارے میں نئی باتیں ہوں ۔ نئے رنگ کے مضامین ہوں، دیکھنے میں بھی یہ نمبر آپ کو پہلے سے زیادہ پسند آسکے ۔

ذاکر صاحب نے ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی کو بہتر بنانے کے تمام منصوبوں میں بچوں کو ہمیشہ یاد رکھا بچے ذاکر صاحب کو پسند کرتے تھے، ذاکر صاحب بچوں کو ۔ ذاکر صاحب نے بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھیں، ان کی تعلیم اور تربیت کا جو خاکہ بنایا، اس کی قدر و قیمت کبھی کم نہ ہوگی یہ شمارہ پیامیوں کے لیے ہے، مگر سچ پوچھیے تو یہ ذاکر صاحب کے لیے پیامیوں کی طرف سے محبت اور عقیدت کا نذرانہ بھی ہے ۔

آخر میں ایک بات ــــ جسے کہتا ہمیں کبھی اچھا نہیں لگتا مگر کہنا ضروری بھی ہے ــــ یہ کہ پیام تعلیم کا خسارہ
باقی صفحہ ۳ پر

پرنٹر، پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

جامعہ کے بچوں کے نام

شیخ الجامعہ کا پیام



یہ اب سے کوئی ۵۲ سال پہلے کی بات ہے۔ پیام تعلیم کے ۱۹۲۴ء کے سالنامے کے لیے قبلہ ذاکر صاحب نے یہ پیام ایڈیٹر کی درخواست پر لکھا تھا۔ پیام تعلیم کے بہت پرانے فائل ۱۹۴۷ء کی گڑبڑ میں ضائع ہو گئے۔ اتفاق سے ہمارے پرانے ساتھی عبدالغفار مدھولی صاحب نے یہ پیام نقل کروالیا تھا اور اسے اپنی آپ بیتی "ایک معلم کی زندگی" میں شامل کر لیا تھا۔ ہم غفار صاحب کے احسان مند ہیں کہ ان کی بدولت یہ اچھوتی چیز حاصل ہو گئی اور ہم اسے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ذاکر صاحب طالب علموں میں کیا کیا اچھائیاں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھیں کیسا انسان بنانا چاہتے تھے۔

(ایڈیٹر)

بچو! خوش رہو اور تندرست!

تمھارے پیام تعلیم کے نکالنے والے پیچھے پڑے ہیں کہ اس پرچے میں تمھارے نام میرا پیام بھی ہونا چاہیے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ جو آدمی تم سے روز ملتا ہو، روز تم سے باتیں کرتا ہو، تمھارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو وہ یکایک کیسے کوئی پیام دے ڈالے۔ جو لوگ کہیں دور ہوں، کبھی کبھی تم سے ملتے ہوں، وہ کوئی پیام بھیجیں تو سمجھ میں آنے کی بات ہے مگر یہ پیام تعلیم والے ایک نہیں سنتے انھیں تو بس پیام چاہیے۔ کیا کیجیے، ان کی بات ماننا ہی پڑے گی اور سچ ہے کہ ان کا یہ پرچہ اور

ے کے پرچوں سے ہے بھی ذرا الگ ۔
لیے پیام نہ سہی آؤ اس موقع پر تم
کچھ باتیں کرلوں۔
تم جانتے ہو اس پرچے میں کیا خاص
تے ہے؟ یہ بات ہے کہ یہ ۲۹ ر اکتوبر کو
ے پیام بھائیوں کو ملے گا۔ چودہ برس ہوئے
ں تاریخ کو جامعہ ملّیہ کا کام پہلے پہل شروع
تھا۔ تم میں سے اکثر تو اس وقت پیدا بھی
ا ہوئے تھے۔ بہت سے چھوٹے لڑکے جو شروع
جامعہ میں آئے تھے وہ اب خدا کے فضل سے
ن ہیں۔ بہت سے دور دور کے ملکوں سے
اسیکھ کر واپس آ گئے ہیں۔ بہت سے یہیں تعلیم
کرکے اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں ۔
سے میں بچّوں کو پڑھا کر لائق اور نیک بنانے
کوشش کر رہے ہیں، اچھے اچھے اخبار اور رسالے
ل کر لوگوں کو سچی خبریں دیتے ہیں اور اچھی
یں بتاتے ہیں۔ بعض تجارت میں روپیا کماتے ہے
ب اور اس کمائی سے دوسروں کی مدد بھی
یتے ہیں۔
یوں تو یہ اپنے اپنے دھندے میں لگے
ب مگر جامعہ کا دھیان سب کو ہے، جامعہ ان
ب کو پیاری ہے اور یہ سب جہاں بھی ہیں
معہ کی مدد کر رہے ہیں۔
ذرا سوچو تو سہی کہ کیوں؟ یہ اس جامعہ
۔ کیوں پیار کرتے ہیں جہاں کا کھانا انھیں

پھیکا سیٹھا معلوم ہوتا تھا، جہاں صبح صبح اندھیرے منہ اٹھنا، وضو کرنا اور نماز پڑھنا، پھر کٹا کٹی کے جاڑوں میں ورزش کے لیے میدان میں جانا انھیں کیسا کیسا کھلتا تھا! جہاں ان کے رہنے کو عالی شان مکان بھی نہ تھے، مدرسے میں بیٹھنے کو میز کرسیاں بھی نہیں تھیں، جہاں نہ بہت آرام تھا نہ بہت ٹھاٹ۔ یہ جامعہ انھیں کیوں اتنی پیاری ہے!

اس لیے پیاری ہے کہ اس نے انھیں آدمی بنایا، ان کے دل میں پاک زندگی کی لگن لگائی، "اور ڈرا ڈرا کر نہیں بلکہ محبت سے ان کے دل میں خدا اور رسول کی محبت ڈالی، ان کے سینوں میں اپنے بھائیوں کی خدمت کا ولولہ پیدا کیا۔ اس نے انھیں سکھایا کہ جہاں رہو، جو کچھ کرو، سچائی کو ہاتھ سے نہ دو۔ اس راستے میں مشکلیں سامنے آئیں تو منہ مت موڑو، خود سختیاں اٹھاؤ اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرو۔ تن بدن موٹے کپڑے سے ڈھانپ لو، روکھا پھیکا کھا کر گزارا کر لو مگر دماغ اونچے سے اونچے خیال سوچ سکے، دل اچھی سے اچھی آرزوؤں سے بھرا ہو! پھر یہ اس کو جتنا پیار کریں کم ہے۔

پیارے بچو! جامعہ تمھیں بھی یہی سکھانا چاہتی ہے اور یقین ہے کہ تم یہ سب کچھ کر پاؤ گے تو یہاں کی تکلیفیں یاد کرکے بھی مزے لوگے اور ان کی شکایت تمھاری زبان پر نہیں آئے گی۔

تم سچے ہوگے، اچھے ہوگے، تندرست ہوگے، صاف ستھرے ہوگے۔ دیانت دار ہوگے، دُھن کے پکّے ہوگے۔ بُروں کے لیے لوہا ہوگے، اچھوں کے لیے موم۔ غریبوں کا سہارا ہوگے، بیکسوں کا آسرا۔ سوتوں کو جگاؤ گے، ڈوبتوں کو تراؤ گے۔ غریب ہوئے تو بھی سیر چشم۔ دوسروں کی دولت کو منہ پھیر کر نہ دیکھو گے۔ امیر ہوگے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھو گے اور اس کے بندوں کی سیوا میں صرف کروگے۔ تم جہاں بھی ہوگے اپنے ساتھیوں کے لیے، پڑوسیوں کے لیے، بستی کے لیے رحمت ہوگے۔ تم اس کے نام لیوا ہو جو سارے جہانوں کے لیے رحمت ہے۔

اُس وقت جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، ہم سب جو اس وقت تمھارے لیے تھوڑا بہت کام کر رہے ہیں، بوڑھے ہوں گے یا مر چکے ہوں گے۔ ہم جیتے ہوں یا مر گئے ہوں اگر تم اچھے ہوگے تو ہماری سب محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔

اس جامعہ کو بھی تمھیں میں سے بعض چلاتے ہوں گے۔ اس وقت روپے کی کمی نہ ہوگی، کرایہ کی عمارتیں نہ ہوں گی، تعلیمی سامان کی کمی نہ ہوگی، کتب خانے میں نہ جانے کتنی کتابیں ہوں گی۔

اس وقت ایک تعلیمی مرکز ہے اس وقت تمھاری کوششوں سے سارے ملک میں ان مرکزوں کا جال بچھا ہوگا۔ پھر اسی ۲۹ اکتوبر کو سارے ملک میں لاکھوں خوش خوش اور تندرست بچے اور صاف ستھرے، محنت مزدوری کر کے حلال کی روٹی کھانے والے لڑکے جامعہ کے ہزاروں مرکزوں میں جلسے کریں گے۔ میری جگہ پر تم میں سے کوئی پیام تعلیم میں اس موقع پر کچھ لکھے گا تو ہندستان کے ہر مسلمان گھر میں لوگ اسے شوق سے پڑھیں گے۔ اس لیے کہ مدرسے کے بچوں ہی پر موقوف نہیں ہر طرف تمھارے کام کا چرچا ہوگا۔ تعلیم تمھارے ہاتھ میں ہوگی، سیاست تمھارے اشارے پر چلے گی۔ رائے عامّہ پر تمھارا اثر ہوگا۔ آج ہم کمزور ہیں اس وقت تم مضبوط ہوگے۔ انشاء اللّٰہ۔ ہاں اس وقت یہ بات نہ بھول جانا کہ تمھاری ساری کامیابی اس لیے ہے کہ تم نے اور تمھارے اگلوں نے بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ جو ٹھیک سمجھا وہ دل لگا کر کیا اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑا۔

بات بہت بڑھ گئی۔ بس اب رخصت چاہو۔ کو اور تمھیں یہ دن مبارک!

تمھارا خیر طلب
ذاکر حسین

پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "پیام تعلیم" ذاکر حسین نمبر شائع کر رہا ہے۔ ذاکر صاحب ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ملک کی جنگ آزادی میں بھی حصّہ لیا اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو کے عمل میں بھی نمایاں طور پر شریک رہے۔ وہ ادیب بھی تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کا شمار ہمارے ملک کے صف اوّل کے ماہرین تعلیم میں بھی ہوتا تھا۔ ان تمام حیثیتوں سے انھوں نے ملک و قوم کے لیے گراں قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں اور اس طرح وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک اٹوٹ حصّہ بن گئے۔

وہ ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور ہماری ثقافتی روایتوں کی ایک مستحکم علامت تھے انھوں نے اس ملک کی سیکولر قدروں کو اپنے قول و فعل اور کردار و عمل سے ہمیشہ تقویت پہنچائی اور انھیں مستحکم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ چنانچہ یہ ہمارا فریضہ اور ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنے ان رہبروں کو نہ صرف یہ کہ ہمیشہ یاد رکھیں بلکہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن بھی رہیں اور نئی نسلوں تک ان کا پیغام پہنچاتے رہیں۔

امید ہے کہ اس روشنی میں "پیام تعلیم" کا ذاکر حسین نمبر ایک خصوصی افادیت کا حامل ثابت ہوگا اور اپنے قارئین کو ذاکر صاحب کی حیات و شخصیت اور کارناموں سے روشناس کرانے میں کامیاب ہوگا۔

میری تمام تر نیک تمنائیں اس سلسلے میں آپ کے ساتھ ہیں۔

(دستخط)
(محمد عثمان عارف)
گورنر، اتر پردیش



پیغام

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمہ جہت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی یاد کو باقی رکھنے کا ہر عمل مختلف عقاید اور مذاہب کے لوگوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ اس صورتِ حال میں یہ واقعہ بہت خوش آیند ہے کہ پیام تعلیم ذاکر صاحب کے تصورات اور ان کے نقوشِ قدم کو روشن کرنے کا بیڑا اٹھا رہا ہے۔ ذاکر صاحب کی شان دار شخصیت مشرقی اور مغربی روایات کا سنگم تھی۔

ذاکر صاحب ایک بالغ نظر عالم بھی تھے اور ایک عظیم انسانیت دوست بھی۔ تعلیم، انسانی ہم آہنگی اور سماجی معاملات کے سلسلے میں ذاکر صاحب کے حقیقت پسندانہ اور ارضی رویّے سے متعلق ان گنت کہانیاں دہرائی جا سکتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ اور زندگی کی اعلا قدروں سے ذاکر صاحب کے عشق کا اظہار اُس محبت میں بھی ہوا ہے جو ذاکر صاحب کو گلاب کے پھولوں سے تھی۔ نازک اور لطیف احساسات رکھنے والا ہر شخص پھولوں، بالخصوص گلاب کے پھولوں میں کشش محسوس کرتا ہے۔ مگر کم ہی لوگ گلابوں کی کاشت کا جوکھم اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب کی حیثیت استثنائی تھی۔ وہ دنیا بھر میں چاروں طرف حسن کے تمام رنگوں کا اثبات کرنا چاہتے تھے۔

Farooq Abdullah

(فاروق عبداللہ)
وزیر اعلا۔ جموں و کشمیر

جموں:
مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۸۶ء



پیغام

'پیام تعلیم' سے ذاکر صاحب کا تعلق وہی ہے جو ایک شفیق استاد کا اپنے ہونہار شاگرد سے ہوتا ہے۔ ہر منصب آگاہ استاد اپنے شاگرد کی شخصیت کو اپنے خوابوں کی جیتی جاگتی تصویر بنانا چاہتا ہے۔ ذاکر صاحب بھی 'پیام تعلیم' کو ان آدرشوں، اصولوں اور آرزوؤں کا نقیب بنانا چاہتے تھے جو انھیں عزیز تھیں۔ ذاکر صاحب کی زندگی ہی میں "پیام تعلیم" نے اپنی ایک خصوصی اشاعت کے ذریعے یہ حق شاگردی ادا کرنے کی کوشش انجام دی تھی۔ ذاکر صاحب کے انتقال پر "پیام تعلیم" نے ایک بار پھر اپنے اس تعلق کی تجدید ایک اور خصوصی اشاعت کے واسطے سے کی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ جشنِ ذاکر کے موقع پر "پیام تعلیم" اس زندہ و تابندہ کہانی کا ایک نیا باب سامنے لا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارادت و عقیدت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا اور "پیام تعلیم" ذاکر صاحب کے تصورات اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کا پیام اسی طرح ہر زمانے تک پہنچاتا رہے گا۔

(خورشید عالم خاں)
امیر جامعہ



پیغام

مجھے خوشی ہے کہ جشنِ ذاکر کے موقع پر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی طرف سے پیامِ تعلیم کا ایک خاص نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اپنی بنیادی قدروں کو یاد رکھنا ہر قوم کے لیے ایک بڑی سعادت ہے۔ ذاکر صاحب جن قدروں کے امین تھے، انھیں محفوظ رکھنے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہے کہ ان قدروں کا اُجالا ہمیشہ پھیلتا رہے۔ ان قدروں کی وساطت سے ہم ذاکر صاحب کو بھی یاد کرتے ہیں اور اپنی روایت و تاریخ کو بھی۔

پیامِ تعلیم نے اپنے سفر کے ہر دَور میں ذاکر صاحب کی اِنھی اقدار کو عام کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصی شمارہ بھی اسی سمت میں ایک موثر قدم ہوگا۔

علی اشرف

(پروفیسر علی اشرف)

شیخ الجامعہ




پیغام

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ماہنامہ "پیام تعلیم" ذاکر حسین نمبر شائع کر رہا ہے
…صاحب صرف جامعہ کے ہی بانی نہیں تھے بلکہ مسلم یونی ورسٹی کے بھی معمار ثانی
…کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخلہ لیا
…بارک کے ایک کمرے میں رہ کر انھوں نے یہاں کی تعلیم و تربیت سے استفادہ
…ان کی شخصیت سازی میں علی گڑھ کا رول نمایاں ہے۔ طالب علمی کے زمانے
…ہی کالج کے ہونہار طلبا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ اسٹوڈنٹس یونین کے
…صدر بھی منتخب ہوئے۔

۲۵ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی برادران کی دعوت پر مہاتما گاندھی جب علی گڑھ
…یف لائے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور انھیں اسٹوڈنٹس یونین کی لائف
…شپ کے اعزاز سے نوازا گیا اور یونی ورسٹی کی جامع مسجد میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ
…قیام کا فیصلہ کیا گیا جس میں علی برادران کے علاوہ ذاکر حسین صاحب بھی شریک
…ے۔ جامعہ ملّیہ کے قیام سے علی گڑھ کالج کے دو ٹکڑے ضرور ہوگئے لیکن پھر بھی
…معہ ملّیہ کو ایک حد تک سرسیّد کی تعبیر سمجھا جاسکتا ہے اور یہ تحریک ترک
…الات اور تحریک خلافت کا تخلیق کردہ کامیاب ترین تعلیمی ادارہ تصور کیا جاتا
…ھا۔

ذاکر صاحب کا جامعہ سرسید احمد خاں کے سوچے سمجھے ہوئے مشن کا
…حصّہ تھا۔ سرسید اور ذاکر صاحب دونوں ہی مسلمانوں کو فرسودہ رسم و
…ج کی، قید و بند سے نکال کر ایک ایسی سمت میں لے جانا چاہتے تھے کہ

مسلمان زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ سر سید نے انگریزی تہذیب کے چڑھتا ہوا سورج دیکھا اور مغربی تعلیم کو اس لیے ضروری سمجھا کہ سائنس اور علوم وفنون کی ساری ترقی اسی کے ذریعہ قوم تک پہنچ سکتی ہے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرف ان کی نظریں بار بار اس لیے اٹھتی تھیں کہ وہ ایک تعلیم یافتہ قوم کی علمی عظمت کا نشان تھے۔ جبکہ ذاکر صاحب نے قدیم ہندستان کی اس تہذیب کو دیکھا جو آزاد ہندستان میں نیا جنم لینے والی تھی اور اس طرح دونوں ہی نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کا ہمیشہ ہی خیال رکھا۔

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا کے سامنے سب سے بڑا کام یہ تھا کہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کی تہذیبی اور علمی زندگی کا ایک نیا خاکہ مرتب کیا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے تقسیم کے ساتھ ہی ہندستانی مسلمانوں کے سامنے پھر یہی سوال پیدا ہو گیا اس مادر درس گاہ کا ایک سپوت جس نے اپنی جوانی کا عزیز ترین سرمایہ یہیں گزارا تھا بہ حیثیت وائس چانسلر اس ادارے کو ایک نئی زندگی عطا کرنے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے اور پھر یہ امیدیں لگائی جانے لگیں کہ اس یونی ورسٹی کا مستقبل ماضی سے زیادہ شاندار ہو سکتا ہے۔ ذاکر صاحب نے جب وائس چانسلر شپ کا عہدہ سنبھالا تو ان کی تمناؤں کا اظہار ان الفاظ میں ہوا۔

"علی گڑھ کی تعلیم و تربیت سے اور اس کے پیامِ عمل سے جدید ہندستان کی حسین تصویر میں جلال و جمال کا رنگ بھریں گے"

ذاکر صاحب نے نہ صرف اس ادارے کو قومی دھارے میں شامل کرایا بلکہ بین الاقوامی سطح تک پہنچایا۔ شاہ سعود اور شاہ ایران انھیں کے دور میں علی گڑھ تشریف لائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ ڈاکٹر راجیندر پرساد، ڈاکٹر رادھا کرشنن مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قومی رہنماؤں کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی اور بھرپور مالی امداد فراہم کرائی انھوں نے ایک وفد کے ہمراہ یونی ورسٹی کی توسیع کے لیے سعودی عرب کا دورہ کیا اور میڈیکل کالج کے قیام کے لیے شاہ سعود سے دس لاکھ

کی امداد اُصول کرنے میں کامیابی حاصل کی ۔ اس کے علاوہ مخطوطات کو جمع کرنے
میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۲۸ جنوری ۱۹۵۷ء کے خطبۂ تقسیم اسناد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے
اکر " یہاں دوست پائے دوستی کی قدر پہچانی ، مل جل کر کام کرنا سیکھا ،
ات کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے ، یہاں فرماں برداری سیکھی ، اطاعت
ی سیکھی ، ادب سیکھا ، بڑوں کا ادب ، ہم چشموں کا ادب ، چھوٹوں کا ادب اور
ا ادب ۔ سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی
کی پابندی کو عین آزادی جانا "

ذاکر صاحب مسلم یونی ورسٹی کے واحد فرزند تھے جو صدر جمہوریہ کے اعلا
تک پہنچے ۔ مسلم یونی ورسٹی اپنے اس مایۂ ناز فرزند پر جتنا بھی فخر کرے

سیّد ہاشم علی
شیخ الجامعہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ



پیغام

قرآن پاک میں ارشاد باری ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ احسن تقویم کی ایک مثال ذاکر صاحب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں طرح طرح کی خوبیوں اور فضیلتوں سے مالا مال کیا تھا۔ وجیہہ، دل کش اور شگفتہ شخصیت دانش مندانہ ذہانت اور وسیع النظری۔ نفاست پسند طبیعت جس کا تانا بانا رئیسانہ تھا جو فرش مخمل اور کرسی زرّیں کا آرزو مند ہوتا مگر اس نے خوشی سے گھاٹے کا سودا پسند کیا اور اپنے اعلا نصب العین اور مقاصد کی خاطر زندگی کا آغاز تہی مائگی اور مالی دشواریوں سے کیا۔ جرمنی سے واپسی پر انھیں بہت اعلا اور آسودگی کا عہدہ مل سکتا تھا لیکن ڈاکٹر عابد حسین اور مجیب صاحب کے ساتھ انھوں نے جامعہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے بے سرو سامانی اور فاقہ مستی کو قبول کیا۔ اپنی ہمت، حوصلہ، شوق، ایثار اور لگن کا سرمایہ اپنے ساتھیوں اور رفقائے کار میں بانٹ کر اور صحیح شعور، صحیح احساس اور صحیح مقاصد کے ساتھ یہ قافلہ ایک مثالی تعلیمی ادارہ کی تعمیر میں مشغول ہوگیا۔ وہ اپنے ملک کی رائج رسمی تعلیم سے بالکل مطمئن نہ تھے۔ جب تک انسان کو اپنے علم سے مناسب کام لینا نہ آئے، جب تک اس کے پاس صالح اقدار کی روشنی نہ ہو، جب تک اس کا علم اور عمل خلق اللہ کے مفاد کے لیے استعمال نہ ہو تب تک وہ انسانیت کے بلند مقام پر فائز نہیں ہوسکتا۔ ذاکر صاحب اور ان کے رفقا نے اپنے طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت، ان کی شخصیت کی تعمیر اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھار کر انھیں اپنے ادب

تاد اور بھروسا کرنا سکھایا۔ ذاکر صاحبؒ اپنے درس سے بلکہ اپنے عمل سے نہ صرف اپنے طالب علموں کو
ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔

جب میں ذاکر صاحب کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں دو لفظ ابھرتے ہیں، کمال
جمال۔ ذاکر صاحب تمام عمر کام میں کمال کے متلاشی رہتے تھے۔ مالی مشکلات اور وسائل کی کمی کی
پر ذاکر صاحب معیار کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئے۔ بے سروسامانی اور
ل مشکلات کے زمانے میں بھی ان کی معیار پسندی اور حوصلہ میں کمی نہ آئی۔ جب جامعہ کو
ول باغ سے اوکھلے منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا تو عمارتوں کے نقشے بنوانے کی فکر ہوئی۔ مختلف اشخاص
نقشے بنائے مگر ذاکر صاحب مطمئن نہ ہوئے۔ سرمایے کی کمی کے باوجود وہ چاہتے تھے کہ عمارت
زوں اور خوبصورت ہو۔ آخر میں ایک نئے دوست مسٹر ہائنس کا پلین پسند آیا جس کی لاگت مقابلتاً
یادہ بیٹھتی تھی مگر ذاکر صاحب کی ہمت اور مساعی کی بدولت اوکھلے میں جامعہ ملیہ کی پہلی ہی عمارتیں
پنی موزونیت اور دیدہ زیبی کی مثال تھیں — وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی کام اس قابل ہے کہ اسے
یا جائے تو پھر اس کے کرنے میں اپنی پوری لیاقت اور صلاحیت صرف کر دو۔ ان کے وائس چانسلر
ننے کے بعد مسلم یونی ورسٹی کی پہلی کورٹ میٹنگ میں بجٹ برائے منظوری پیش ہوا۔ اس میں غالباً
و ڈھائی لاکھ کا خسارہ دکھایا گیا تھا۔ دیر تک بحث ہوتی رہی کہ کن کن مدات میں کانٹ چھانٹ کی
ائے۔ ذاکر صاحب تمام وقت خاموش بیٹھے رہے۔ آخر جب ان کی رائے معلوم کی گئی تو فرمایا کہ
میں اپنی وائس چانسلری کے آغاز بجٹ میں کوئی ایسی کمی کرنے کو تیار نہیں جس سے معیار تعلیم پر
ثر پڑے۔ اگر ہم اپنی مالی مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو معیار کو گرانے کی بجائے
بہتر ہوگا کہ یونی ورسٹی کو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ بجٹ بغیر کسی ترمیم کے پاس ہوگیا اور آگے چل کر
حالات بھی بہتر ہو گئے۔

کمال کے علاوہ ذاکر صاحب جمال کے پرستار تھے۔ اللہ نے انھیں جمیل بنایا تھا مگر اپنے گرد وپیش
کے ماحول کی صفائی، پاکیزگی اور خوبصورتی کے دلدادہ تھے۔ قرول باغ میں رہائش کے زمانے میں بھی باوجود
سادگی اور سستے پن کے ان کے لباس اور گھر کے ماحول میں پاکیزگی اور نفاست ہوتی تھی۔ اگر بیش قیمت
پینٹنگز نہ تھیں تو خطاطی کے اعلا نمونے جمع کرتے تھے۔ استعمال کی چیزوں اور مٹی کے برتنوں میں بھی خوبصورتی

ہوتی تھی۔ بعد میں جب باغبانی کا شوق ہوا تو علی گڑھ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوبصورت درخت، پودے اور پھول لگا کر پورے کیمپس کی چمن بندی کردی۔ جب صدر جمہوریہ بنے تو راشٹرپتی بھون میں بھی یہ عمل جاری رہا اور ان کے پھولوں کے شوق سے متاثر ہوکر چنڈی گڑھ کا مشہور زمانہ گلاب باغ کا نام "ذاکر روز گارڈن" رکھا گیا۔

ذاکر صاحب کے یہاں چھوٹے اور بڑے کی تفریق نہ تھی۔ میں نے انھیں ذی وجاہت لوگوں اعلا عہدیداروں اور رئیسوں سے ملتے ہوئے دیکھا ہے مگر کسی فنکار، ادیب، شاعر یا معلم سے مل کر انھیں کہیں زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ عمر میں چھوٹوں کو ان سے شفقت ہی نہیں عزت بھی ملتی تھی ____ ایک دفعہ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "جامعہ کے ساتھیو، چھوٹے ساتھیو اور بڑے ساتھیو۔ بڑے بڑوں اور چھوٹوں دونوں کو ساتھی کہا ہے۔ ساتھی اس لیے کہ جو کام ہمیں کرنا ہے اس میں چھوٹے بھی اتنے ہی شریک ہیں جتنے بڑے۔ ادب، عزت اور محبت کا ہم ساتھیوں میں رشتہ ہے اور یہی ہمارے طریق کار کی روح ہے۔"

پیارے بچو! آج ذاکر صاحب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی زندگی سے ہمیں امید، حوصلے اور لگن کے ساتھ نیک اور اعلا مقاصد کے حصول کے لیے کام کرنے کا سبق ملتا ہے۔ پختہ ارادے اور ان تھک محنت سے انسان مشکلات اور پریشانیوں پر قابو پاکر کامیابی اور خوش حالی حاصل کرسکتا ہے۔ ذاکر صاحب کی تعلیم ہم سب کے لیے شمع ہدایت ہے جس کی روشنی میں ہم ذاتی کامیابی کے ساتھ ساتھ اپنی لیاقت اور صلاحیت کو پوری طرح کام میں لاکر اپنے وطن کی خدمت کرکے مقام بلند حاصل کرسکتے ہیں۔

(کرنل بشیر حسین زیدی)
زیدی ولا - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵



پیغام

مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے تعارف اور اکثر ملاقات کا شرف حاصل تھا۔ جب ہمارے ملک کے تیسرے پریزیڈنٹ کے عہدے پر تھے میں ان کا آنریری اے ڈی سی ۔ ڈاکٹر صاحب بہت نیک دل اور مہربان انسان تھے اور اتنے اعلا عہدے پر ہونے کے بود انکساری کا مجسمہ تھے۔ اس بات کا سخت افسوس رہا کہ وہ وقت سے پہلے ہی ہم سب سے جدا ہو گئے۔ ان کے گزر جانے سے ہمارے ملک نے ایک سچا اور صاف دل پریزیڈنٹ نہیں کھویا بلکہ ایک ایسا انسان جو عالم و فاضل بھی تھا: "کرتا ملک الموت تقاضہ کوئی دن ہے"

ایک موقعہ پر جب میں ذاکر صاحب سے ملنے گیا تو ملاقات ختم ہونے پر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے رخصت کرنے دروازے تک آنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ بزرگ ہیں آپ کو یہ تکلیف نہیں کرنی چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں ضرور آؤں گا۔ مہربانی فرما کر میری عادت نہ بگاڑیے۔

نائب صدر کی حیثیت سے وہ راج سبھا کی صدارت کرتے تھے۔ اس زمانہ میں میں بھی ممبر تھا۔ وہاں بھی میں نے محسوس کیا تھا وہ کتنے ہمدرد اور غیر جانبدارانہ انداز سے پیش آتے تھے۔ خواہ ممبر کانگریس کا ہو یا کسی اور پارٹی کا۔

مکتبہ جامعہ کے ادارے کا میں ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ موقعہ دیا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے لیے بھی میں چند الفاظ پیش کر سکا۔

مجھے پورا یقین ہے کہ یہ خاص نمبر کامیابی کے ساتھ منظرِ عام پر آئے گا۔

اقبال محمد خاں

(نواب) اقبال محمد خاں



پیغام

یہ معلوم کر کے کہ رسالہ پیام تعلیم کا ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر نکل رہا ہے بڑی مسرت ہوئی
خدا کرے بہت اچھا نکلے! - بچو، تم نے ذاکر صاحب کو نہیں دیکھا۔ تصویر ضرور دیکھی ہوگی۔ بڑے
آدمی تھے۔ بلند قامت، صاف گورا رنگ، چہرہ پر خوبصورت داڑھی۔ گالوں پر ہلکی
دمکتی ہوئی۔ بڑے محنتی، بڑے ذہین اور بڑے ہمدرد۔ اور بچوں سے تو اس قدر گھل مل
باتیں کرتے تھے گویا وہ خود بھی ایک بچہ ہوں۔ ان کے ساتھ کبھی کبھی کھیلتے بھی تھے اور کھیل
کھیل میں بڑے کام کی باتیں بتا دیتے تھے۔

مجھے ان کے ادارہ مکتبہ جامعہ میں کچھ مدت یعنی تین چار سال تک کام کرنے کا
ملا ہے مگر اس وقت جامعہ اور مکتبہ جامعہ قرول باغ میں تھا۔ کئی چھوٹی بڑی عمارتیں
پر لے لی گئی تھیں۔ ان میں مختلف کلاسوں کی پڑھائی بھی ہوتی تھی، دفتر بھی تھا اور مکتبہ
جامعہ بھی۔ ہوا یوں کہ جون ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے میں اپنے
بڑے بھائی کے پاس بھوپال گیا ہوا تھا۔ وہ وہاں تحصیل دار تھے، میرے امتحان (ایم اے) کا بہت
اچھا نتیجہ نکلا ہی تھا کہ مجھے رشید احمد صدیقی صاحب مرحوم کا جو علی گڑھ میں میرے صدر
شعبہ اور استاد تھے، خط ملا کہ ذاکر صاحب نے بلایا ہے فوراً پہنچ کر مکتبہ جامعہ میں کام
کرو۔ بس میں فوراً روانہ ہو کر قرول باغ پہنچ گیا۔ وہاں ذاکر صاحب، عابد صاحب، مجیب
صاحب اور حامد علی خاں صاحب (منیجر مکتبہ جامعہ) نے بڑی ہمت بڑھائی اور میں
نے کام کرنا شروع کر دیا۔ مکتبہ کے قریب ہی رہنے کے لیے ایک بڑی عمارت میں جگہ مل گئی
اس میں مکتبہ اور جامعہ کے کئی کارکن رہتے تھے۔ وہاں سب کے ساتھ رہنے اور اپنا سب

ود کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ مرحوم حسین حسان ندوی صاحب (سابق مدیر پیام تعلیم)
قریب ہی رہتے تھے۔ ان سے بڑی دوستی ہوگئی۔ بہت اچھے آدمی تھے۔ بڑے خاکسار
بڑے محنتی۔ ہر وقت پیام تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے کے چکر میں سرگرداں رہتے تھے۔
ذاکر صاحب سے روز تو نہیں چوتھے پانچویں ضرور کہیں نہ کہیں ملاقات ہوتی تھی۔
ک دفعہ تو ایسا ہوا کہ میں مکتبہ جامعہ سے کھانے کی فرصت میں باہر نکلا۔ دھوپ بہت
تھی لُو چل رہی تھی، دیکھا کہ باہر سڑک پر کھڑے دو ایک طالب علم ذاکر صاحب سے
ی بحث کر رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے ان میں سے ایک برکت علی فراق صاحب تھے۔ وہ بھی
بہ میں کام کرتے تھے۔ بی۔ اے کے طالب علم بھی تھے اور ان کو بحث کرنے کا بڑا شوق
ا۔ بحث کچھ کمیونزم کے متعلق تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں بھی سننے کو وہاں رک گیا۔
ما کہ ذاکر صاحب فراق صاحب کے بعض بے تکے سوالات کے جواب بھی بڑی ملائمت
بات کو بہت سلجھا کر مشفقانہ انداز میں دے رہے ہیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک
ب سڑک پر لُو دھوپ میں کھڑے ذاکر صاحب سے یہ سوالات جوابات ہوتے رہے۔
ذاکر صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے طالب علموں اور ساتھیوں
تھیوں (ماتحتوں کا لفظ میں نہیں لکھوں گا کیونکہ ذاکر صاحب کسی کو ماتحت کے بجائے
ی یا ساتھی کہنا ہی پسند کرتے تھے) کی ضرورتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اگر کسی کو کوئی
ت ہوتی تو وہ ذاکر صاحب کے پاس پہنچ جاتا اور وہ اس کی دقت کو ہر ممکن طریقہ
سے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی اپنی سفارش کسی بڑے افسر کے پاس کرانا
چاہتا تو ذاکر صاحب فوراً ایک زوردار سفارشی خط لکھ کر اسے دے دیتے تھے۔ کوئی
بیمار ہو وہ خود علاج نہ کرا سکے یا جامعہ کی اپنی ڈسپنسری سے اسے فائدہ نہ ہو رہا ہو
تو اس کے لیے ذاکر صاحب اچھے سے اچھے معالج کا انتظام کرتے تھے۔ ہمدردی کرنے کی
یہی اسپرٹ ان کی دیکھا دیکھی جامعہ کے تمام بڑے لوگوں میں سرایت کیے ہوئے تھی۔
یہی ہمدردی اور شفقت کا جذبہ ذاکر صاحب کا ایسا تھا جو ان کے تمام ساتھیوں اور
طالب علموں کے دل کو توی رکھتا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات آپڑے گی تو ذاکر صاحب
ور ہر ممکن مدد کریں گے۔ خود اپنی بات بتاؤں۔ میں ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ چلا آیا تھا لیکن
ل میں ہمیشہ یہ اعتماد جمائے رہا کہ اگر کبھی کوئی مصیبت پڑی جس میں ذاکر صاحب کی مدد

کی ضرورت پڑی تو وہ خواہ علی گڑھ میں ہوں یا پٹنہ میں یا نئی دہلی میں، ان کے پاس چلا جاؤں گا یا خط ہی لکھ دوں گا تو وہ میری مدد ضرور کریں گے۔

ذاکر صاحب محنت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ بچوں کو بتاتے تھے کہ محنت سے اور صحیح ہدایت سے ہر کام بہ آسانی پورا ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ کوئی طالب علم خواہ ذہین کم ہو لیکن اگر وہ محنت کرتا ہے یا محنت سے جی نہیں چراتا تو وہ اس طالب علم سے بڑھ جائے گا جو اس سے زیادہ ذہین لیکن کم محنتی ہے یا کاہل ہے۔ اسی طرح ذاکر صاحب سادہ زندگی اور ہمت حوصلہ کی بلندی پر بہت زور دیتے تھے۔ صحیح ترقی کرنے کے لیے یہ دونوں خوبیاں ضروری ہیں۔ ذاکر صاحب خود بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن ان کے حوصلوں اور ہمت کی بلندی کی کوئی حد نہ تھی۔ جسمانی صفائی اور اپنے کپڑوں کی صفائی پر بھی وہ زور دے کر کہتے تھے کہ اگر کوئی اتنے پیسے نہیں رکھتا ہے کہ اپنے کپڑے دھوبی سے دھلوا سکے تو خود اپنے کپڑے دھولے اس لیے کہ صفائی بہت عمدہ چیز ہے۔

پیارے پیامیو، ذاکر صاحب بہت اچھے آدمی تھے اور یاد رکھو کہ دنیا میں اچھے آدمی بڑی مشکل سے ___ مدتوں میں نظر آتے ہیں۔ اچھا آدمی کسے کہتے ہیں؟ وہ جو بہت سمجھ دار اور ذہین ہونے کے علاوہ اپنے دل میں دوسروں کی مدد کرنے، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا جذبہ رکھتا ہو۔ وہ نیکی اس لیے نہ کرتا ہو کہ خود اسے کوئی فائدہ پہنچے گا بلکہ وہ تو ہمیشہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے یا دوسروں کی خدمت کرنے کا آمادہ رہتا ہو جو ہر کام محنت اور لگن سے کرتا ہو۔ وقت اور وعدہ کا پابند ہو۔ ہر ایک سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہو۔ یہ تمام خوبیاں ذاکر صاحب میں موجود تھیں۔ تم چاہے ہاسٹل میں رہتے ہو یا اپنے گھروں پر، اپنے والدین کے علاوہ ان مرحوم بزرگوں کی بھی عزت کرو جو تمھارے جیسے لڑکوں کے لیے ہمیشہ بہی خواہ رہے ہیں۔ ذاکر صاحب مرحوم بھی ایسے ہی بزرگ تھے۔ خدا ان کی لحد پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ اگر تم ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلو گے تو ایک بڑے اچھے شہری بھی بن جاؤ گے اور ایک بڑے اچھے مسلمان بھی۔

پروفیسر نور الحسن ہاشمی



پیغام

معلّم وہ بھی ہوتے ہیں جو کالجوں اور یونی ورسیٹیوں میں پڑھاتے ہیں، معلّم وہ بھی کہلاتے ہیں جو ہائی اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، اور معلّم ان کو بھی کہتے ہیں جو چھوٹے بچوں کو پڑھاتے ہیں ذاکر صاحب یوں تو بڑے عالم، بڑے قابل اور بہت اونچے درجے کے معلم تھے لیکن جو سچ پوچھو تو وہ دل سے بچوں ہی کے معلّم تھے۔ چھوٹے بچوں کو وہ اسی نظر سے دیکھتے جیسے وہ اپنے باغ کے خوبصورت گلاب کو۔ انھیں دیکھ کر ویسی ہی خوشی ان کو ہوتی تھی جو گلاب کی خوشنما رنگت، اس کی خوشبو اور پنکھڑیوں کی سجاوٹ دیکھ کر ہوتی ؛۔ بچوں میں بچّہ ہوتے انھیں کی طرح باتیں کرتے، ان کی ہنسی اور مذاق میں شریک ہو جاتے، اور بچّے بھی نہ تو ان کے سامنے جھجھکتے نہ خوف کھاتے۔ ایک بڑی عمر اور بڑے علم والے آدمی کے لیے اپنے آپ کو بچے کی سطح پر لے آنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے، مگر یہی تو ان کا کمال تھا؛

ذاکر صاحب کو سب سے پہلے میں نے اس وقت دیکھا تھا جبکہ وہ جامعہ ملّیہ کی سلور جوبلی کے سلسلے میں بمبئی تشریف لائے۔ اس موقع پر جامعہ کے کاموں کی ایک نمائش میرے انسٹی ٹیوشن کے ہال میں لگائی گئی تھی جسے میں نے بڑے شوق سے دیکھا۔ اس کے بعد ذاکر صاحب سے بار بار ملنے کا موقع ملتا رہا۔ کبھی بمبئی۔ کبھی علی گڑھ اور کبھی دہلی میں۔ جب وہ بہار کے گورنر بن کر پٹنہ آئے تو میں نے خط لکھا کہ ہمارے گانو تشریف لائیں۔ یہ گانو پٹنہ سے کوئی سوا سو کلو میٹر دور ہے۔ ذاکر صاحب راضی ہو گئے۔ سفر موٹر سے طے ہوا۔ کئی جگہ سڑک کچّی اور راستہ خراب تھا۔ ایک چھوٹے سے گانو میں ہم ان کے استقبال کے لیے کیا کر سکتے تھے! ایک جلسہ ہوا، ذاکر صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ پھر گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے (بعض گلیاں گندی بھی تھیں اور زمین ناہموار) وہ بڑی بے تکلفی سے ہنستے بولتے

ہمارے گانو کے کتب خانہ الاصلاح پہنچے۔ وہاں کتابوں کے دیکھنے میں ایسے ڈوبے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ بڑے شوق سے نادر کتابیں اور پرانی قلمی کتابیں دیکھتے رہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس گانو کی آبادی پہلی جیسی نہ رہی۔ کتب خانہ کی دیکھ بھال اور کتابوں کی حفاظت گانو والوں کے لیے ممکن نہ تھی۔ ذاکر صاحب سب کچھ سمجھ گئے۔ واپس آکر انھوں نے اس کا انتظام کرادیا کہ کتب خانہ الاصلاح کی ساری کتابیں پٹنہ میں خدابخش لائبریری میں لے آئی جائیں۔ اس طرح کتابوں کا یہ قیمتی خزانہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔

پٹنہ میں راج بھون کا احاطہ بہت بڑا ہے۔ ذاکر صاحب کے گورنر ہو کر آنے سے پہلے یہاں معمولی سا باغ تھا اور کبھی تو اس میں کھیتی ہوا کرتی تھی۔ وہ آئے تو اس کی شکل ہی بدل گئی۔ گلاب کے تختے۔ طرح طرح کے پودے اور پھول۔ ہم لوگ وہاں جاتے تو اس حسین لان سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

ذاکر صاحب کے لیے لکھنے کی بہت سی باتیں ہیں، اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ اڈیٹر صاحب کا حکم ہے کہ جلد از جلد لکھ بھیجیے۔ تو بس "پیام تعلیم" کو مبارکباد دے کر یہ مضمون ختم کرتا ہوں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہ نمبر نکالا۔ ذاکر صاحب کی یادگار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعد یہی "پیام تعلیم" ہے۔ اسے اچھے سے اچھا بنائیے اور اس کے ذریعے تعلیم کا پیام دیجیے۔

سید شہاب الدین دسنوی۔
تاج منزل۔ ٹی این روڈ۔ پٹنہ

اُردو اکادمی، دہلی
دہلی انتظامیہ
گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پیغام

جو قوم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دیتی وہ اپنی بربادی کا موجب خود بنتی ہے۔" ہمارا کل" آج کے بچوں پر منحصر ہے۔ اگر ہم آج انھیں مستقبل کے لیے تیار کریں تو یقیناً ہم ایک قومی و ملی خدمت کریں گے۔

سائنس کے اس دور میں مہینوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کیا جا رہا ہے، نت نئے انکشافات اور ایجادات ہو رہے ہیں۔ اگر ہم اپنی آیندہ نسلوں کو باخبر نہیں رکھتے اور انھیں دیگر اقوام کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کا موقع فراہم نہیں کرتے تو ہم ایک ایسے سماجی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کی پاداشت ہماری نسلوں کو برداشت کرنی ہوگی اور جس نقصان کی تلافی بہت مشکل ہوگی۔

"پیام تعلیم" بچوں کو نہ صرف تعلیم کی طرف مائل کرتا ہے بلکہ ان کے ذہنوں اور دماغوں میں وہ کشادگی پیدا کرتا ہے جس کی ہمارے نونہالوں کو شدید ضرورت ہے۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ "پیام تعلیم" ایک خصوصی نمبر پیش کرنے جا رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ پیش کش ہمیشہ کی طرح دلپذیر اور مفید ہو۔

(سید شریف الحسن نقوی)
سکریٹری

پیامی بچوں سے

"میرا پیغام یہ ہے کہ پیامی بچے ذاکر حسین کے نقش قدم پر چل کر ملک و قوم کی اہم ذمہ داریاں سنبھالیں اور دنیا میں ملک کا وقار بلند کریں۔ اچھی باتوں کو توتے کی طرح دُہراتے رہنے کے بجائے ان پر عمل کریں۔ زندگی عمل سے بنتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو میں وہ قصہ سُناتا ہوں جو ذاکر صاحب نے ہم لوگوں کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے سُنایا تھا۔

"ایک جنگل میں توتے رہتے تھے۔ ایک شکاری جنگل میں آتا۔ پیڑ کی ڈال پر سریس لگا کر چلا جاتا۔ توتے جا کر ڈال پر بیٹھتے اور چپک جاتے۔ پھر شکاری آتا اور توتوں کو پکڑ کر لے جاتا۔

جب بہت توتے پکڑے جانے لگے تو بوڑھے توتوں کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے شکاری سے بچنے کی ترکیب بتانے کے لیے جلسہ کیا اور ایک بزرگ توتے نے سمجھایا کہ "بس اس کی ترکیب یہ ہے کہ جب بھی شکاری آئے اور ڈال پر سریس لگائے تو تم ڈال پر مت بیٹھنا اور اگر بیٹھنا بھی تو اُڑ جانا۔ یہ بات یاد کرلو ــــــ"

توتوں کے جلسے کے چند دن بعد جب شکاری جنگل میں درخت کی

ڈال پر سریس لگانے کے بعد آیا تو اس نے دیکھا کہ پیڑ کی ڈال پر الٹے لٹکے ہوئے توتے رٹ رہے ہیں ۔

"جب شکاری آئے گا۔ درخت کی ڈال پر سریس لگائے گا۔ تو ہم ڈال پر نہیں بیٹھیں گے اور اگر بیٹھیں گے تو اڑ جائیں گے —— جب شکاری آئے گا۔ درخت کی ڈال پر سریس لگائے گا۔ تو ہم ڈال پر نہیں بیٹھیں گے اور اگر بیٹھیں گے تو اڑ جائیں گے ....!"

"اور شکاری پھر انھیں پکڑ لے گیا"

احمد جمال پاشا
کوٹھی نشاط افزا سیوان (بہار)

ڈاکٹر سیفی پریمی
"نگارستان"۔ ذاکر نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

گلابوں کا مسیحا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین

اے خاکِ پاک جامعہ، اے فخرِ سروری
اے یادگارِ جلوۂ عہدِ پیمبری

دانش گہِ دیارِ علی گڑھ کے نونہال
مضمر تھی، تیرے عزم بغاوت میں رہبری

جنگل میں تو نے علم کا گلشن کھلا دیا
بے مائگی کو دے کے متاعِ قلندری

کارِ جہاں تھا شغلِ عبادت ترے لیے
علم و ہنر کو دے گیا معیارِ برتری

فکر و خیال و نطق میں خونِ جگر کا رنگ
حُسنِ عمل میں نکہتِ آدابِ دلبری

تصویر کو، گلاب کو، پتھر کو، شعر کو
حُسنِ نگاہ تھی، تری تہذیبِ آذری

ماتم گسار ہجر میں سارا جہان ہے
سارے جہاں کو آج ہے احساسِ ہم سری

ہم کشتگانِ غم کا، تری روح کو سلام
اے امتزاجِ اکبر و آزاد و بوذری

مصوّر فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی

ڈاکٹر ذاکر حسین — ایک قلمی چہرہ

ڈاکٹر ذاکر حسین فرخ آباد کے پٹھان ہیں۔ فدا حسین خاں کے بیٹے، غلام حسین خاں صاحب کے پوتے۔ خوب گورا رنگ، دوہرا جسم، گداز بدن، حسین چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، جن میں سرخی کے ڈورے ہیں اور ذہانت کی چمک ہے۔ پیشانی چوڑی، قد میانہ، آواز گرجدار، شرافت اور متانت سر سے پانو تک، ہر حصۂ جسم پر چھائی ہوئی۔ عمر پچاس کے قریب۔

یورپ کے تعلیم یافتہ، جرمنی کے علوم و فنون کی سند رکھنے والے دیندار، بے غرض، بے طمع، عیب بینی اور غیبت سے پاک، دنیا کی ہر قوم کے عارف، ہندستان کے سچے ہمدرد، مسلمانوں کے اصلی خیر خواہ، مسلمانوں کی خوش نصیبی کے ستارے، جن کی روشنی مستقبل کے اندھیروں کو دور کرنے والی معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی خلوص کے تقاضے سے زندگی جامعہ ملیہ پر قربان کر دی۔ کہیں اور ہوتے تو ہزاروں روپے ماہوار تنخواہ ملتی۔

اگر ان کو چیر کر دیکھا جائے تو کوئی رگ کوئی پٹھا اور کوئی ہڈی ایسی نہ ملے گی جس پر صادق مخلص تحریر نہ ہو۔ علمی طبقے کے کام کرنے والوں میں مجھے ان جیسا ایک شخص بھی صادق مخلص معلوم نہیں ہوتا ہے۔ سوائے خان بہادر مولوی بشیر الدین اٹاوہ کے کہ وہ ان کی جوڑی کے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ بڈھے ہیں اور یہ جوان۔

ڈاکٹر ذاکر حسین دو صدی پہلے پیدا ہو جاتے تو ہماری سلطنت غارت ہونے سے بچ جاتی۔ مگر وہ سلطنت قائم کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہندستانیوں کو انسان بنانے کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت کا اثر سالہا سال سے میرے دل پر ہے۔ اگر عمر کا منتقل کرنا ممکن ہوتا تو میں اپنی زندگی کے پانچ مہینے ان کو دے سکتا تھا۔ زیادہ نہیں، کیونکہ میں فضول خرچی کو برا سمجھتا ہوں۔

(بہ شکریہ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی)

عبداللہ ولی بخش قادری

ذاکر صاحب اور کام

مشہور کہاوت ہے کہ "حرکت میں برکت ہے"۔ ہم سب جانتے ہیں کہ 'حرکت' سے مراد 'کام'، 'عمل'، یا 'فعل' ہوتا ہے اس کے معنی میں 'چلت پھرت' کو بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ اب رہا لفظ 'برکت'۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ 'بڑھوتری'، یا 'زیادتی'، لہذا یہ کہاوت بالکل صاف صاف یہ بتاتی ہے کہ کام کرنے سے بڑھوتری ہوتی ہے۔ لیکن ہم سب صبح سے لے کر شام تک کیا کچھ نہیں کرتے ___ مثلاً پڑھائی لکھائی ہوتی ہے، کھیل کود رہتا ہے، کاروبار چلتا ہے، کبھی مار کٹائی بھی ہو جایا کرتی ہے، اور نہ جانے کیا کیا۔ اب 'حرکت'، تو ان سب میں نظر آتی ہے مگر کیا یہ سب اپنے آپ بڑھوتری کا سبب بنتے ہیں؟ کیا ہر 'حرکت'، کو 'کام' کہا جا سکتا ہے؟ کیا صرف ہاتھ پاؤں ہلا دینے سے ہی کامیابی حاصل ہو جاتی ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ذاکر صاحب نے 'کام' کے بارے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ذرا دھیان دیجیے

"کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، با مقصد محنت ہے ..... کام ریاضت ہے کام عبادت ہے"

یہاں ہر جملہ اور فقرہ اپنے اندر بہت کچھ معنی رکھتا ہے۔ ان پر غور کرنے سے کام کی حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مثلاً یوں ہی ہم اگر اچھل کود کرتے رہیں تو کچھ کام نہ بنتا۔ وہ تو کھلواڑ ہے، کھیل ہے۔ جب ہمیں بس کچھ کرنے میں مزہ آتا ہے اور اس کے علا ہماری کوئی اور غرض نہیں ہوتی تو ایسا عمل صرف کھیل رہتا ہے۔ کھیل، کھیل کی خا

ٹیچرس کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

ہوتا ہے۔ وہ اپنا انعام آپ ہوتا ہے۔ اس سے اگلا قدم وہ ہوتا ہے جب کہ قاعدے اور ضابطے کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا جاتا ہے۔ یہاں کوئی غرض شامل ہوتی ہے مثلاً زیادہ مہارت حاصل کرنا ـــــــ لیکن پھر بھی اُس کا مقصد اپنے آپ سے باہر نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جب کھیل بھی روپیا پیسا کمانے کے لیے کھیلا جائے یا اسے صحت بنانے کا ذریعہ بنایا جائے تو وہ پیشہ یا ورزش بن جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کچھ یوں ہی تفریحاً کیا جائے، وہ ایک اتفاقیہ عمل ہو، اس میں کوئی ضابطہ نہ ہو تب وہ مشغلہ ہو سکتا ہے۔ اسے آپ دل لگی گردان سکتے ہیں۔ لیکن تفریحی کام یا مشغلے کو ہم کسی وجہ سے کرتے ہیں۔ ہمیں اس عمل سے لگاؤ ہوتا ہے لیکن ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ اس عمل کو حاصل کرنے کی غرض نہیں رکھتے ہیں جب دلچسپی گھٹ جاتی ہے تو وہ عمل بھی رُک جاتا ہے البتہ مشغلوں سے اچھے اچھے فنون کی شُدبُد کا ڈول پڑتا ہے اور ہنر سیکھنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی کام نہیں ہیں۔ کام کی صفت تو یہی ہے کہ وہ 'بامقصد محنت' ہوتا ہے اسے کرنے کے لیے کچھ دُکھ، تکلیف یا زحمت اٹھانی ہوتی ہے، کسی قدر پتّا بھی مارنا پڑتا ہے۔ لیکن کام کی تعریف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ اسے ریاضت اور عبادت قرار دیا گیا ہے۔

ریاضت کے معنیٰ ہوتے ہیں محنت، مشقّت اس میں فرماں برداری بھی آجاتی ہے کام جم کر کچھ کرنے کا نام ہے اور وہ ہم سے پورے طور پر اپنی فرماں برداری چاہتا ہے یعنی جب ہم کچھ کریں تو ہمیں صرف اس کا خیال ہو، ہم کسی اور طرف نہ بھٹکیں۔ اس کا حق ادا کرنے کی ہماری بھرپور کوشش ہی کام کی فرماں برداری ہے اسی لیے وہ ریاضت ہے۔ لیکن کام صرف ریاضت ہی نہیں، وہ عبادت بھی ہے۔ عبادت کا مطلب ہوتا ہے کہ دعا، نماز، پوجا پاٹ اپنے اپنے مذہب کی اپنے اپنے ڈھنگ سے عبادت کی جاتی ہے۔ لیکن سب جگہ عبادت میں اطاعت اور تابع داری پر ہی زور ہوتا ہے۔ اس میں اپنے پروردگار کی پرستش یا بندگی ہوتی ہے یعنی انسان اپنے آپ کو پورے طور پر اپنے خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کا دھیان گیان سب کچھ اسی کی طرف ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، اس میں بالکل ڈوب کر کرتا ہے۔ بس یہی عبادت ہے اور کام کی بھی خوبی یہی ہے کہ ہم اس میں پورے طور پر لگ جائیں، اس میں کھو جائیں تب ہی اس کا حق ادا ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب نے ہمیشہ کام کو اس کے اصل معنوں میں سمجھنے اور برتنے پر زور دیا اور اپنی تمام زندگی اس کی نذر کر دی۔ وہ چاہتے تھے کہ وطن کے بچے، نوجوان سب کام کا حق ادا کریں۔ ان کا وقت فضول برباد نہ ہو، وہ اسے کار آمد اور مفید طریقے سے صرف کریں۔ وہ جو کچھ کریں اسے سمجھ بوجھ کر کریں، دل لگا کر کریں۔ ایسے ہی کام کو انھوں نے 'تعلیمی کام' قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک 'تعلیمی کام' کی چار منزلیں ہوتی ہیں۔ نمبر ۱۔ کام کرنے والے کا ذہن بالکل صاف ہوتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے، اس کا مقصد اور مدّعا کیا ہے، نمبر ۲ کام کو سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھا جائے کہ اسے کیسے کیا جائے، لہٰذا کام کا خاکہ بنا یا جائے، یہ دیکھا جائے کہ کس ترتیب سے اور کیسے اپنا کام کرنا ہے۔ نمبر ۳۔ اپنے سوچے سمجھے ڈھنگ کے مطابق وہ کام کیا جائے۔ نمبر ۴۔ کام پورا ہو جانے کے بعد بھی ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ پرکھنے کی باری آتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ پہلا قدم اٹھاتے وقت جو کچھ سوچا تھا، وہ کہاں تک پورا ہوا۔ اس طور کام کرنے سے کام ہو جاتا ہے، اسے سیکھ لیا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اب بھی وہ 'تعلیمی کام' کا درجہ حاصل کر لے۔ کیوں کہ وہ کام بُرا بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے دوسرے انسانوں کو نقصان بھی پہنچایا جا سکتا ہے جیسے کوئی جیب کاٹنا سیکھ لے یا کوئی اور بے ایمانی کا گر جان جائے مگر ایسے فعل کو 'تعلیمی' نہیں مانا جا سکتا۔ تعلیمی کام میں بھلائی شامل ہوتی ہے وہ بُرائی کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ نیکی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس میں مل کر کرنے کی بات بھی ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو سہارا دینے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انجام دینے کی ترغیب دیتا ہے۔

ذاکر صاحب ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے کہ ہمارے مدرسے، تعلیمی کام کا سچا نمونہ بنیں اور ان کے اندر پرورش پلنے والی نئی نسل کے اندر کام کی لگن پیدا ہو۔ ذاکر صاحب کو بچوں سے بے حد پیار تھا، ان سے وہ بڑی بڑی امیدیں رکھتے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ بڑے ہو کر کام کا آدمی بنیں



بیکل اتساہی

ذاکر حسین

پیکرِ انسانیت کا نام ہے ذاکر حسین
ذاکرِ روحانیت کا نام ہے ذاکر حسین

پیار کی محفل ہو یا بزمِ سیاست ہو کوئی
شوکتِ یکسانیت کا نام ہے ذاکر حسین

آہنی بنیاد ہے تعمیرِ ملک و قوم کی
عظمتِ جمہوریت کا نام ہے ذاکر حسین

جس کے دم سے دلش میں روشن ہے قومی ایکتا
پاسبانِ مملکت کا نام ہے ذاکر حسین

قافلہ بھی، راہ رو بھی، رہبرِ منزل بھی وہ
اک چراغِ عافیت کا نام ہے ذاکر حسین

دیکھ بیکل اس کے کردار و عمل کا آئینہ
حسنِ ہندستانیت کا نام ہے ذاکر حسین

بلرام پور ۔ یو پی

شمس کنول

بچوں کے ذاکر حسین

میں اپنے اس چھوٹے سے مضمون میں بچوں سے باتیں کروں گا
ڈاکٹر ذاکر حسین بہت بڑے آدمی تھے ۔ نہیں! بہت بڑے مسلمان تھے ۔ نہیں!! بہت بڑے
ہندستانی تھے ۔ نہیں یہ بات بھی نہیں!!! بلکہ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے انسان تھے ۔ اچھے
انسان کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی بھلائی چاہے ۔ ڈاکٹر صاحب
جب تک زندہ رہے وہ زیادہ تر کام دوسروں ہی کی بھلائی کے لیے کرتے رہے ۔ وہ دنیا کے
سارے انسانوں کو اپنے ہی کنبے کے لوگ سمجھتے تھے ۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی
وہ سب سے محبت کرتے تھے، یہی ان کا بڑاپن تھا اسی لیے ہم انھیں آج تک یاد کرتے ہیں۔
ڈاکٹر ذاکر حسین کھانسی بخار کے ڈاکٹر نہیں تھے ۔ بلکہ وہ تعلیم، علم اور ادب کے ماہر تھے
(یعنی وہ علم و ادب کے ڈاکٹر تھے) شروع میں ڈاکٹر صاحب ایک چھوٹے سے استاد تھے پھر اپنی
قابلیت، محنت اور لگن سے بہت بڑے استاد ہو گئے اور سارے ملک میں مشہور ہو گئے
اسی لیے پہلے وہ جامعہ ملیہ کے شیخ یعنی وائس چانسلر بنائے گئے اور پھر وہ علی گڑھ یونی ورسٹی
کے وائس چانسلر بنے اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہندستان جیسے عظیم، مہان اور
بڑے ملک کے صدر بھی بنائے گئے ۔ اتنی بڑی عزت کسی کسی ہندستانی کو مل پاتی ہے مگر
سب کچھ بن جانے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب اپنے دل سے استاد ہی تھے، سب کے لیے اور خا
طور پر بچوں کے لیے بچوں کے لیے ان کا پیام یہی تھا کہ سب تعلیم حاصل کریں تاکہ سب آپس م
محبت سے رہیں اور اپنا ملک ترقی کرے اور ساری دنیا پیار سے بھر جائے!

مدیر ماہنامہ "گلشن" قاضی اسٹریٹ ۔ بجنور ۔ ۲۴۶۷۰۱ (یو پی)

ڈاکٹر صاحب نے جب بھی بچوں سے باتیں کیں یا ان کے لیے کوئی مضمون یا کہانی لکھی تو ان کو اچھی اچھی اور نیک، مزے مزے کی اور کام کی باتیں بتائیں ایسی فائدے کی باتیں جو زندگی میں کام آئیں یا جن پر چل کر زندگی کو خوش گوار، سہل اور آرام دہ بنایا جا سکے۔

بچو! تم نے بڑوں کو یہ کہتے سُنا ہو گا کہ "جتنی چادر دیکھیے اتنے ہی پاؤں پھیلائیے!" یعنی اپنی بساط یا اپنی سکت ہی کے مطابق کام کرنا چاہیے یا اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے مگر ڈاکٹر ذاکر حسین کی تو بات ہی نرالی تھی ان کا کہنا تھا کہ "جتنے لمبے پاؤں ہوں اتنی ہی لمبی چادر بنا دُ!" وہ چاہتے تھے کہ انسان کوشش کرے، محنت کرے اور اس کی جتنی جائز ضرورت ہو اس کے مطابق کمائے۔ یہ نہیں کہ اگر رہنے کو جھونپڑی ملی ہے تو ساری زندگی تکلیف کے ساتھ جھونپڑی ہی میں رہ کر گزار دی جائے۔ یہ بھی ہے کہ اگر انسان، قسمت میں جو لکھا ہے اسی کو مان کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے تو پھر دنیا کی ساری ترقی رُک جائے اور تھوڑے ہی دنوں میں آباد شہر کھنڈر بن جائیں۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب نے ایک بہت ہی دلچسپ اور نصیحت والی بات لکھی تھی۔ وہ تم بھی سنو: ایک بار ہندستان کے ایک نواب صاحب لندن گئے۔ انھوں نے لندن کی خوب سیر کی، تاریخی عمارتیں دیکھیں، پارلیامنٹ ہاوس دیکھا، کئی پارک اور عجائب گھر بھی دیکھے اور ٹیمز دریا کی بھی سیر کی۔ ایک دن وہ نواب صاحب آکس فورڈ یونی ورسٹی بھی دیکھنے گئے۔ انھیں یونی ورسٹی کا سرسبز لان بہت پسند آیا۔ لان کی ہری ہری گھاس ریشم جیسی نرم اور ملائم تھی اور ایک سال کٹی ہوئی تھی۔ خوبصورت لان دیکھ کر نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنے گائڈ سے پوچھا کہ "یہ لان کتنے میں تیار ہوا، ہم بھی ہندستان میں، اپنے محل میں ایسا ہی لان تیار کروائیں گے؟" گائڈ نواب صاحب کا یہ سوال سن کر پہلے تو خاموش رہا پھر کچھ سوچ کر بولا "سرکار! مجھے تو یہ بات معلوم نہیں، اچھا میں اس شخص کو بلاتا ہوں جو یہاں کے پیڑ پودوں اور لان کا انچارج ہے!" انچارج سے بھی نواب صاحب نے وہی بات پوچھی کہ "یہ لان ہمیں پسند آیا، اس پر کتنا خرچ ہوا" مگر وہ انچارج بھی جواب نہ دے سکا۔ اس نے کہا کہ میں اس مالی کو بلاتا ہوں جو اس لان کی دیکھ ریکھ کرتا ہے، شاید اس کو اس لان کی قیمت معلوم ہو گی!" جب بوڑھا مالی آیا تو نواب صاحب نے اس سے بھی وہی سوال کیا کہ "اس لان کی تیاری پر کتنا روپیا خرچ ہوا؟" بوڑھے مالی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "حضور! چند کوڑیاں

بھی خرچ نہیں ہوئیں البتہ ہم اپنی پچھلی تین پشتوں سے اس لان کی دیکھ بھال کرتے آرہے ہیں اس پر ہمارا ریاض پچھلے دو سو برس سے جاری ہے!"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس بات سے یہاں یہ بتانا چاہا ہے کہ کسی چیز کو اچھا اور خوبصورت بنانے کے لیے دولت ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کوئی چیز برسوں کی محنت، شوق، لگن اور قربانی سے خوبصورت اور مثالی بنتی ہے۔ اس بوڑھے مالی کے باپ نے بھی اس لان کو بنایا اور سنوارا تھا اور اس کے دادا نے بھی سچے دل سے اس لان کی صفائی، تراش خراش، اس کے لیے مٹی اور پانی کا خیال رکھا تھا اور اس طرح برسوں اور برسوں کے ریاض کے بعد وہ لان ایسا خوبصورت اور مثالی بن پایا۔!

بچو! اب تم شاید یہ جاننا چاہو گے کہ "ریاض" کسے کہتے ہیں؟ لغت (ڈکشنری) میں تو 'ریاض' کے معنی ہیں مشق، محنت، تپسیا، عبادت وغیرہ۔ مگر میں تمھیں ایک بات سناتا ہوں۔ اس بات کے سننے کے بعد تم 'ریاض' کے ٹھیک ٹھیک معنی بھی جان جاؤ گے اور اس لفظ کا صحیح استعمال بھی؛ استاد علی اکبر دنیا میں سب سے اچھے سرود بجانے والے مانے جاتے ہیں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ "گرو دیو! آپ نے یہ کمال کیسے حاصل کیا؟" انھوں نے جواب دیا کہ "میں نے اٹھارہ برس تک اٹھارہ گھنٹے روزانہ سرود کا ریاض کیا ہے!" یعنی چوبیس گھنٹے میں اٹھارہ گھنٹے بلا ناغہ، ذوق شوق، دلچسپی، لگن، پابندی کے ساتھ، پاکیزہ جذبے سے اور اپنے شوق کو عبادت جان کر سرود بجانے کی مشق کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ریاض ہی سے اپنے فن یا ہنر میں کمال پیدا کیا جا سکتا ہے اور نام وری حاصل کی جا سکتی ہے۔ ریاض ہی کی بدولت ہم بنجر زمین میں بھی پھول کھلا سکتے ہیں۔ دراصل ہم منزل پر نہیں پہنچتے بلکہ ہماری تڑپ، لگن، محنت اور ریاض اگر سچا ہے تو وہ ہماری منزل ہی کو ہماری قدموں میں لے آتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یہ خوبی تھی کہ وہ بچوں کو صرف نصیحت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو جو اچھی بات بتاتے تھے اس پر پہلے وہ خود عمل کرتے تھے۔ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ یونی ورسٹی کے ہوسٹلوں میں رہنے والے طالب علم جب ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے تو روٹیوں کے سخت کنارے توڑ توڑ کر الگ رکھ دیتے اور سالن میں جو بڈی ہوتی اسے بھی چوسے بغیر نکال دیتے۔ اس طرح روٹیوں کے

کناروں اور ہڈیوں کا میز پر ڈھیر لگ جاتا اور نتیجے میں بہت سا کھانا ضائع ہو جاتا ــــــ ڈاکٹر صاحب کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ ایک دن اچانک کھانے کی میز پر ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکوں کا رد کیا ہوا وہ کھانا جس میں روٹیوں کے سخت کنارے اور سالن سے نکالی ہوئی ہڈیاں تھیں خود کھانے لگے، اپنی زبان سے کچھ نہ کہا ــــ لڑکوں نے جب یہ دیکھا کہ ہمارا بوڑھا استاد ہمارا ناپسندیدہ کھانا خود کھا رہا ہے۔ اور ہمیں نہ ڈانٹتا ہے اور نہ بُرا بھلا کہتا ہے تو وہ خود ہی بہت شرمندہ ہوئے اور پھر انھوں نے کھانا ضائع کرنے کی بُری عادت خود ہی چھوڑ دی۔

تو ایسے تھے ذاکر صاحب۔ ایسے اچھے اور ایسے بھلے انسان!

بقیہ اداریہ

روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ڈاک کا خرچ بڑھ گیا، کاغذ، کتابت، طباعت کا خرچ بڑھ گیا۔ اسی تناسب سے خریدار بھی بڑھتے رہتے تو ہم پیام تعلیم کی قیمت کو بڑھنے سے روک سکتے تھے۔ مجبوراً مارچ سے ہم پیام تعلیم کے ایک شمارے کی قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے اور سالانہ قیمت ۳۰ روپے مقرر کر رہے ہیں آپ بھی یعنی پیام تعلیم کے خریدار اور ایجنٹ صاحبان ہمارے ساتھ یہ "دکھ" جھیلیں اور مل جل کر کوشش کریں کہ پیام تعلیم کا راستہ آگے آسان ہوتا جائے۔

استادوں کے مدرسے کے سابق استاد: ماہر تعلیم اور ہمارے کرم فرما ڈاکٹر محمد اکرام خاں نے اپنے ذاتی البم سے ذاکر صاحب کی تصاویر فراہم کر کے پیام تعلیم سے جس محبت کا ثبوت دیا اس کے لیے ہم خاص طور پر ان کے شکر گزار ہیں۔

محمد یوسف پاپا

ذاکر صاحب نے فرمایا

(۱) ذاکر صاحب نے فرمایا جیون میں اُپکار کرو تم
اپنے تو سب کو پیارے ہیں بیگانوں سے پیار کرو تم

(۲) ذاکر صاحب نے فرمایا اپنا دیش ہمیں پیارا ہے
ہم بھی پاک بنیں گے ایسے جیسے گنگا کی دھارا ہے

(۳) ذاکر صاحب نے فرمایا علم کرو تم حاصل بچّو
اپنے اپنے فن میں بیشک ہو جاؤ تم کامل بچّو

(۴) ذاکر صاحب نے فرمایا راہ سے کانٹے دور کرو تم
اندھیاری راہوں کو اپنی محنت سے پُر نور کرو تم

(۵) ذاکر صاحب نے فرمایا ہم سب سے مل کر رہتے ہیں
اپنی بانی سندر بانی سچ سنتے ہیں سچ کہتے ہیں

(٦) ذاکر صاحب نے فرمایا ساری دنیا اپنا گھر ہے
ہم سب کے ہیں سب اپنے ہیں کون بھلا ہم سے باہر ہے

سی، ۴۴۔ جامعہ اسٹاف کوارٹر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

صالحہ عابد حسین

ذاکر صاحب خوبصورتی کے پرستار

ذاکر صاحب خوبصورت بھی تھے اور خوب سیرت بھی۔ یہی نہیں انھیں خدا نے خوبصورت چیزوں اور خوب سیرت لوگوں کی قدر اور محبت بھی دی تھی۔ اور زندگی بھر وہ دنیا کی خوبصورت اور اچھی (اسی میں سیرت کی خوبیاں بھی ہیں) چیزوں کی قدر کرتے رہے۔

انھیں صاف ستھرے، سادگی اور اور خوبصورتی سے بنے ہوئے گھر پسند تھے۔ اس کا نمونہ ہم تم جامعہ کی ان عمارتوں میں دیکھ سکتے ہیں جو ان کے زمانے میں بنی تھیں۔ ان کے اور ان کے دوستوں کے گھروں میں بھی خوبصورتی اور سادگی نظر آئے گی۔ ذاکر صاحب کو عمدہ تصویریں (یہ ضروری نہیں کہ وہ قیمتی بھی ہوں) پسند تھیں اور وہ ان کو ہو سکے تو جمع بھی کرتے تھے۔ کتابت کے اعلا نمونوں کا انھیں بہت شوق تھا اور بڑے اچھے کاتبوں سے شعر وغیرہ لکھوا کر جمع کرتے تھے۔ اور تو اور ان کو طرح طرح کے ڈنڈوں، لکڑیوں، چھڑیوں کا شوق تھا اور بعض مرتبہ ان کو اہتمام سے تیار بھی کرتے تھے۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر انھیں خوبصورت جانور بہت پسند تھے۔ خوبصورت بلیاں، نایاب بکریاں، حسین گائیں ان کے گھر میں رہتی تھیں اور اکثر ذاکر صاحب ان کا کام کرتے اور ان کے لاڈ کرتے نظر آتے تھے۔ اور بھی خوبصورت نایاب درختوں اور پودوں کو وہ کہاں کہاں سے منگواتے تھے یہ تو ہم کو بھی معلوم نہیں مگر ان کی خود دیکھ بھال کرتے تھے ہم نے ان کو دیکھا ہے۔ یوں تو ان کو پھول، پودے، کانٹے اور بلکہ تک پسند تھے مگر سب سے زیادہ شوق ان کو گلابوں کا تھا ہر رنگ اور ہر قسم کے نایاب انھوں نے جہاں جہاں رہے، وہاں وہاں لگوائے اور نئی نئی ایجادیں کیں۔ پٹنہ

عابد ولا۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵،

میں کسی نے ایک گلاب (بنانا) اگا یا تھا جس کا نام ذاکر حسین نے گلاب رکھا۔ چندی گڑھ میں ایک بہت بڑا بہت خوبصورت باغ ہے گلاب کا، جس میں بلامبالغہ ہزاروں قسم کے گلاب ہیں۔ جانتے ہو اُس کا نام" ذاکر حسین گلاب باغ" رکھا گیا ہے۔ یہ دراصل ان کے گلاب کا شوق دیکھتے ہوئے اس کا اعتراف کیا ہے۔

اور بھئی یہ بھی تم نے سنا ہوگا کہ ذاکر صاحب کے پاس ہزاروں لاکھوں، کروڑوں بلکہ اربوں سال پرانے پتھروں کا بہت بڑا خزانہ تھا۔ ایسے ایسے خوبصورت پتھر ایسے ایسے نایاب پتھر کہ بس دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ ذاکر صاحب ان پتھروں کو بہت "چاہتے تھے،، اور ان کی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔

اور بھئی کتابیں ——— ارے کتابیں تو ذاکر صاحب کی زندگی تھیں۔ بہت سی کتابیں ان کے پاس تھیں۔ بڑے بڑے لکھنے والوں کی۔ کلام مجید کے نسخے، فارسی کی نادر کتابیں، عربی کے مخطوطے اور چھپی ہوئی کتابیں۔ ذاکر صاحب کتابیں پڑھنے کے تو شوقین تھے ہی مگر اچھی لکھی، اچھی چھپی، اچھی جلد کی خوبصورت کتاب انھیں بہت زیادہ پسند آتی تھی۔ وہ کہتے تھے بُری کتاب چھپوانا کتاب کی توہین ہے۔

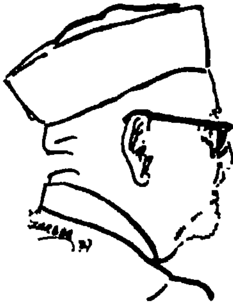
اور تم جانتے ہو کہ ان سب خوبصورت چیزوں میں انھیں سب سے زیادہ پسند اور محبّت کس سے تھی ——— وہ ننھے بچّے ——— غریب بچّے، امیر بچّے، چھوٹے بچّے، بڑے بچّے، حسین بچّے اور بہت معمولی صورت کے بچّے سب ان کو حسین لگتے تھے سب سے وہ پیار کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے سب بچّے اچھّے بنیں، پڑھیں لکھیں، دیس کی سیوا کریں۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے محبّت اور دوسرے انسانوں کی خدمت کریں صاف ستھرے رہیں، کسی کام کو گھٹیا نہ سمجھیں اور اپنی عزّت کریں اور دوسروں کی عزّت کریں۔ اپنے اسکول کا نام روشن کریں اور اپنے بزرگوں اور ہم جولیوں سے بھی محبّت اور عزّت کا برتاؤ کریں۔ وہ ہر ادیب اور شاعر سے کہا کرتے تھے کہ آپ بچّوں کے لیے لکھیے۔ مجھ سے کہا کرتے تھے" آپ صرف بچّوں کے لیے لکھیے سو کتابیں لکھیے۔ ہماری اُمید یہی بچّے ہیں"!

ہاں تو میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ ذاکر صاحب کو ہر خوبصورت چیز پیاری تھی اور اس سے زیادہ پیارے تھے خوبصورت بچّے جن کی سیرت، اخلاق، عادتیں سب خوبصورت

ہوں۔ اصل یہ ہے کہ انسان کا حسن سفید چمڑی میں نہیں اچھی باتوں اچھی سیرت میں ہے۔

تو آئیے ہم سب یہ طے کرلیں۔ جو بڑے ہیں وہ اپنے بچوں کے لیے، جو بچے ہیں وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے ایسے ہی "خوبصورت" بنیں گے (دل کے خوبصورت، دماغ کے خوبصورت، خیالات کے خوبصورت) جیسے ذاکر صاحب بچوں کو دیکھنا چاہتے تھے اور اپنی اور دوسروں کی زندگی کو خوبصورت بنائیں گے۔

عرفان پربھنوی
بھوئی گلی ضلع پربھنی ۴۳۱۴۰۱ (مہاراشٹر)



ڈاکٹر ذاکر حُسین

شخصیت کا تری جواب نہیں　　خوبیوں کا تری حساب نہیں
تو ہے بے انتہا شفیق اُستاد　　بچّے کرتے ہیں تجھ کو ہر دم یاد
علم سے تجھ کو پیار تھا بے حد　　تھا یہی تیری زیست کا مقصد
تو ہے بے مثل ماہرِ تعلیم　　قوم کرتی ہے اس لیے تعظیم
تو مُدبّر ہے اور دانش ور　　کائناتِ حیات کا گوہر
دیش تیرا ہے، دیش کا ہے تو　　ایک بے مثل رہنما ہے تو
اس رسالہ[1] کا تو ہی بانی ہے　　جامعہ بھی تری نشانی ہے
تو نہیں، تیرا نام زندہ ہے　　نام زندہ ہے، کام زندہ ہے

ذہن پر تیری فکر کا سایہ
آج عرفان کب ہے کم مایہ

[1] "پیامِ تعلیم"



صفیہ رحمٰن

میاں کی یاد

میاں سے میری مراد والد مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔ میں، میری بوبو (میری بڑی بہن سعیدہ خورشید) اور ہمارے بچے "ڈاکٹر صاحب" کو میاں کہتے تھے اور اب بھی میاں ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب میاں کا نام زبان پر آتا ہے تو اُن کی ان گنت باتیں یاد آجاتی ہیں۔ اب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میاں کی نوّے سالہ سال گرہ کا جشن منایا جارہا ہے تو یقیناً اُن کی بہت سی باتوں کو یاد کیا جائے گا۔ بزرگوں اور قومی معماروں کی یادگار منانے کا اصل مقصد شاید یہی ہوتا ہے کہ نئی نسل کے نونہالوں اور نوجوانوں کو ان کی گزری ہوئی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آشنا کیا جائے۔ ان کی خدمات کو سنایا جائے۔ ان کے فلسفۂ حیات کو سمجھایا جائے۔ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا حوصلہ پیدا کرایا جائے اور ان کے نامکمل کاموں کو مکمل کرانے کا جوش دے دلایا جائے۔ میں "پیام تعلیم" کے پڑھنے والوں کے لیے میاں کی دو تین باتیں دہرانا چاہوں گی۔ میاں کی ہر بات میں ایک بات ہوتی تھی اور بات تو اصل یہ ہے کہ میاں نے زیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ۔

میاں اللہ میاں کے بڑے صابر، شاکر اور اطاعت گزار بندے تھے۔ وہ صرف اللہ سے ڈرتے تھے اور اسی کے بھروسے جو کچھ کر سکتے تھے کر گئے۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ چھوٹی تو خیر اب بھی ہوں۔ لیکن اتنی چھوٹی نہیں کہ اپنی بات دوسروں سے نہ کہہ سکوں۔ جب بہت چھوٹی تھی تو اپنے چاروں طرف کی دنیا کو دیکھتی تھی لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ بہرحال چھوٹی سی تھی کہ ایک دن گھر میں اماں کو روتے دیکھا۔ میری چھوٹی بہن ریحانہ

اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اس کی دائمی رخصت کے وقت میاں تعلیمی مرکز عدا قرولباغ
میں مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر بچوں کو بتاشے تقسیم کر رہے تھے۔ جلسہ سے فارغ
ہو کر گھر آئے تو اماں کو روتے دیکھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ اماں کے پاس بیٹھ کر کچھ کہ رہے
تھے۔ اماں خاموش ہو گئیں تو میاں نے مجھے گود میں اٹھا کر خوب پیار کیا۔ کبھی گال
چومے اور کبھی ماتھا۔ اب یاد آتا ہے کہ میاں کا وہ پیار دراصل ان کے صبر اور شکر کا اظہار
تھا۔ میاں کے اس پیار کا مطلب تھا اللہ کی موجودہ نعمت کا شکر اور جو نعمت واپس لے
لی گئی تھی اس پر راضی رہنا۔ میاں کہتے تھے کہ اللہ اپنے بندوں کو کبھی دے کر آزماتا ہے
اور کبھی لے کر۔

میاں کہتے تھے "دیا کرو۔ دینے کی عادت پیدا کرو۔ تم دوسروں کو دو گی اللہ تمھیں
دے گا۔ تم دینا بند کر دو گی تو اللہ تم کو دینا بند کر دے گا" وہ عام طور سے ہمیں اس لڑکے
اور لڑکی کو دینے کے لیے اکساتے رہتے تھے جو اماں کی نگرانی میں پرورش پا رہے تھے۔ میں
ان کے نام نہیں بتانا چاہتی۔ اماں ہمارے لیے کچھ پکاتیں یا میاں ہمارے لیے کبھی کچھ لاتے
تو اس میں سے ان دونوں بچوں کو دینے کا شوق دلاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ
بھی قابلِ ذکر ہے کہ میاں بوا کی (جو کہ اماں کی مدد کے لیے رکھی گئی تھیں) خدمت کرتے وقت
خود ہی خود ہمارے سامنے یہ کہتے رہتے تھے کہ بوا کا جو حق ہے وہ پورے طور پر ادا کرنا
چاہیے۔ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتنے سے اللہ ناخوش ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ شاید ۱۹۴۷ء کی مار دھاڑ کے وقت کی بات ہے کہ میں اماں سے
کہ رہی تھی کہ اماں میں بھی بلی پالوں گی۔ مجھے بلی کا بچہ منگا دیجیے۔ ہماری اماں کو
بلی، توتا، بکریاں اور مرغیاں وغیرہ پالنے کا شوق ہے جب میاں نے میری یہ بات
سنی تو بولے کہ صفیہ تم بلی کا بچہ نہیں آدمی کا بچہ پالو۔ اس کو ساتھ رکھنے میں بڑا مزہ آئے
گا۔ میں خاموش ہو گئی۔ دوسرے ہی دن ایک چھوٹی معصوم اور یتیم بچی کو منگا کر میری
گود میں دے دیا۔ ہم سب نے مل کر اس کا نام بشیری رکھا۔ بس اب بشیری ہے اور
میاں۔ میاں بشیری کو صبح شام گود میں لیتے اور مجھ پر اس کو نہلانے اور نئے نئے
کپڑے پہنانے کا تقاضا کرتے رہتے تھے۔ دھیرے دھیرے بشیری کا کام کرنے
میں مجھے مزہ آنے لگا اور پھر بشیری میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ میاں نے میرے ہی ذریعے

بشیری کی وقت پر شادی کرادی۔ اب بشیری ماشاءاللہ اپنے گھر بار کی ہو گئی ہے۔
میں جانتی ہوں کی میاں کی دو بڑی آرزوئیں تھیں۔ ایک ہندستان کی فارغ البالی اور آزادی دوسرے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترقی۔ دوسری خواہش غالباً پہلی خواہش پورا کرنے کا وسیلہ تھی۔ کہتے تھے۔

"ہم چاہتا ہے کہ جامعہ ہندستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندستانی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر قائم رہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی۔ ہندستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی۔ ہندستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔"

جامعہ کے اس اہم اور بڑے مقصد کو یاد رکھنے کے لیے جامعہ کا نشان (مونو) مقرر کیا گیا۔ اس کی تشریح "پیام تعلیم" میں شائع ہو چکی ہے۔ میاں نے ایک مرتبہ مجھے، بوبو کو اور محمود چچا کے بیٹے نوری کو جامعہ کا نشان دکھا کر بتایا تھا۔

"جانتے ہو اس نشان کا مطلب کیا ہے؟ دیکھو اس میں سب سے اوپر ایک ستارہ ہے جس میں لکھا ہے اللہ اکبر۔ جب اندھیری رات میں غریب مسافر جنگل بیابان میں سفر کرتے ہوئے بھٹک جاتے ہیں، کوئی راہ بتلانے والا نہیں ہوتا تو وہ ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکالتے ہیں۔ جامعہ کو راستہ بتلانے والا ستارہ یہی اللہ اکبر کا ستارہ ہے۔ ان کی نظر اسی پر جمی ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے جس نے اس کے آگے سر جھکایا۔ اس نے سچی زندگی کا پتا پایا۔ اس کے سامنے جھک کر پھر یہ سر کسی اور کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔ اس چمکتے ہوئے ہدایت کے تارے کے نیچے ایک کتاب ہے جس پر لکھا ہے "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" یہ کتاب قرآن پاک ہے اس سے خدا نے اپنے بندوں کو اپنی مرضی کا پتا دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے، کس طرح نیکی کر کے آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی جان کر غریب امیر کا فرق مٹا کر، رنگ روپ کی تمیز ہٹا کر آقا اور غلام کی تقسیمیں مٹا کر اس کے بندے اچھے اور سچے بندے بن سکتے ہیں۔ اس کتاب نے آدمیوں کو تاریکی سے روشنی میں پہنچا دیا اور جو راہ بھٹک گئے تھے انھیں بھی سیدھی راہ بتائی،

اور اس کے لانے والے نے اپنی پاک زندگی کی مثال سے اپنی آنکھوں کی تاثیر اور دل کی گرمی سے ایک گروہ ایسے نیک آدمیوں کا تیار کر دیا جس نے دنیا سے طرح طرح کی برائیوں کو مٹا دیا اور اس میں خدا کے بندوں کی سچی برادری قائم کی۔

"اس نشان کے دونوں طرف کھجور کے دو پیڑ ہیں۔ یہ کیا ہیں؟ یہ اس دیس کا نشان ہیں جہاں خدا کا یہ آخری پیغام لانے والا پیدا ہوا۔ اس بنجر وادی کا نشان جس میں یوں تو کچھ اگتا نہ تھا پر وہاں دین الہی کے پودے نے جڑ پکڑی۔ جو لوگ ناموافق حالات سے اپنے کاموں میں گھبرا جاتے ہیں ان کے لیے یہ درخت ڈھارس کا سامان ہیں کہ اس دیس سے جہاں ان کھجوروں کے سوا پھول بوٹا نام کو نہ تھا ہدایت کے چشمے ابل پڑے جن سے دلوں کی بستیاں سیراب ہو گئیں۔ پھر تم ظاہر حالات کو دیکھ کر کیوں ٹھٹھرے دیے ہوتے ہو۔

"سب سے نیچے ایک پتلا سا ہلال ہے جس میں لکھا ہے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" یہ ہلال ابھی چھوٹا سا ہے لیکن جیسے ہلال بڑھ کر چودھویں کا چاند بن جاتا ہے اسی طرح یہ جامعہ جس کے نام کی ابھی ابتدا ہے انشاء اللہ بڑھ کر روشن چاند بنے گی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کا سرور ہو گی۔"

جامعہ کے نشان اور جامعہ کے بنیادی مقصد کو جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ادارہ کس قسم کی تعلیم کے ذریعے کیسے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ دراصل میاں نے تعلیم کو حصولِ آزادی کے لیے وسیلہ بنایا تھا۔ انھوں نے بچوں اور بڑوں کے لیے جو کچھ کہا جو کچھ لکھا اور جو کیا اس سب کا مقصد نونہالوں اور نوجوانوں کی ذہنی تربیت تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندستان کا ہر شہری اچھا، سچا اردوں کا پکا تن درست من درست انسان ہو۔ وہ باادب ہو اور باتمیز۔ وہ اپنے ارادوں کا پکا اور خیالات میں پاک۔ واضح اور صاف ستھرا ہو۔ وہ اپنی بات کہنے کے قابل ہو اور دوسروں کی سننے اور سمجھنے پر آمادہ، وہ زندہ دل ہو اور نڈر۔ وہ بس ایک خدا سے ڈرنے والا ہو اور سب کے ڈر سے بے نیاز۔ وہ صحیح معنی میں آزاد ہو اور آزادی کا دل دادہ۔

حالاں کہ ہم سیاسی اعتبار سے ۱۹۴۷ء میں آزاد ہو گئے تھے اور اس آزادی کے وقت جو خون خرابے ہوئے اور جو دل تقسیم ہوئے اس کو میاں نے آزادی کی سستی قیمت کہا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں سستے داموں آزادی مل گئی ہے اس کی بقا اور حفاظت کے لیے بہت زیادہ قیمت ادا کرنی ہو گی۔ میاں کو آزادی کے بعد دیس

ں غربت جہالت بیماری اور بے انصافی کو دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ تکلیفیں برداشت
رنے کی عادت ہو گئی تھی اس لیے برداشت کرتے رہے۔ جب میاں نائب صدر
مہوریۂ ہند تھے تو انھوں نے اس وقت بھی ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں اس روز سمجھوں
کہ ہمارا دیس آزاد اور خوش حال ہے جب ہر بچہ اسکول جا سکے۔ اس کے پاس صاف ستھرے
پڑے ہوں۔ پیر میں جوتا ہو اور وہ خوراک مل سکے جو ایک بچے کے لیے ضروری ہے۔

میاں کی ان چند باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے پیارے دیس اور اس کے
سب باسیوں سے کتنی محبت تھی۔ انھوں نے دیس کی خدمت آزادی اور ترقی کے لیے ...
جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعہ اپنی زندگی کا عزیز ترین حصہ قربان کیا۔ میری دلی تمنا ہے کہ جامعہ
کے نشان میں جو ہلال ہے وہ ماہ کامل کی طرح تاقیامت نہ صرف جامعہ والوں کو بلکہ پورے
دیس کے سب باسیوں کو اندھیرے میں بھٹکنے سے بچائے اور ترقی کی نئی نئی راہیں دکھاتا
رہے۔ مجھے اس وقت یہ بھی یاد آرہا ہے کہ جب تین مئی ۱۹۶۹ء کو میاں نے ہم سب کو یتیم
چھوڑا تو ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ مرحوم ڈاکٹر صاحب جیسی ایمان دار
شخصیت کا ملنا اب محال ہے۔ ان کی زندگی تجربات سے مالا مال تھی۔ ان سے ہر ملاقات اور
ان سے ہر گفتگو ایک سود مند تجربہ ثابت ہوتی تھی وہ ایک دانش ور عالم تھے۔ ان کا علم
اور تجربہ بے پایاں تھا۔ ان کی سادگی دل کو موہ لیتی تھی۔ وہ شان و شوکت کے دل دادہ
نہیں تھے اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں اسلامی تعلیمات کا رنگ نمایاں تھا۔

ڈاکٹر قنبر احمد رضوی



کون تھا جس کے لیے خلد نہ تھا برِّ صغیر
ہندو و مسلم و سکھ و بدھ و عیسائی تھے
چشتی و نانک و گوتم نے جسے پاک کیا
نغمۂ غالب و ٹیگور تھا اس محفل میں
ملک تقسیم ہوا بھائی سے بھائی چھوٹا
سیکڑوں لوٹ لیے سیکڑوں گھر بار جلے
خیر تو چالیس چلا ہم سے اٹھے برباد ہوئے
ہوئے آزاد کھلی گلشن میں گل تر کے لیے
نغمۂ آشتی پنچ کو مٹ رہا جس نے
اس کا احساس مگر اہلِ وطن بھول گئے

اس کی مٹی سے نہ وابستہ تھی کس کی تقدیر
سب اسی خاک سے اٹھے تھے سبھی بھائی تھے
علم نے جن کے منور دل افلاک کیا
عظمتِ گیتا و قرآن تھی ہر اک دل میں
سالہا سال کا باندھا ہوا رشتہ ٹوٹا
کھیت، کھلیان جلے، وادی و کہسار جلے
خیر گزری کہ کسی طرح سے آزاد ہوئے
کہ مہالی بھی تو گاندھی و جواہر کے لیے
بڑھ گئے جیسے غلامی کو بھی توڑا جس نے
گل تر تھا وہ بھی رشکِ چمن بھول گئے

قافلہ آزادی نے آگے جو بڑھایا تھا قدم
فتنۂ فرقہ پرستی کہیں فریاد زباں
ہوئے آزاد مگر خوگر غم ہوتے گئے
کتنے ادوار سے جو پانی کی روانی دیکھی
جس میں ہر قید کے آباد بیاباں ہے آج

ساتھ خوشبوؤں کے چلتے آئے نئے رنج و الم
دھوپ میں غم کی تھا سنوارا یارخ امن و اماں
اپنی منزل کی طرف تیز قدم ہوتے گئے
سبزہ و گیاہ کی صحرا میں جوانی دیکھی
شہر تو شہر ہے، گاؤں میں چراغاں ہے آج

۱۔ [illegible] شکوہ آباد

...ڑتیس برس گزرے ہیں آزادی کے
...پرچم ہے۔ اک آئین۔ ترانہ ہے ایک
...پر بھی تجھے ہر اک نے پکارا ہے وطن!
...کے خوں اپنا شہیدوں نے سنوارا ہے وطن
...ثاران وطن کا تھا عجب جوشِ جنوں
...ہو روشنی شمعِ وطن اور فزوں
...ور جمہوریہ ہو یا کہ وزیرِ اعظم
...کون ہے جس کے لیے خلد نہیں برِّ صغیر
...ہندو و مسلم و سکھ و بدھ و عیسائی ہیں

دن مگر پھر گئے اس دیس میں ہر وادی کے
اے وطن! تیری محبت کا فسانہ ہے ایک
جان و تن تجھ پہ ہی ہر ایک نے وارا ہے وطن!
کوئی کہہ دے کہ نہیں جان سے پیارا ہے وطن
چاہتے تھے کہ وطن کا نہ کبھی سر ہو نگوں
اندرا نے کبھی گاندھی نے دیا اپنا خوں
ذاکر و نہرو کا ہر قول تھا قولِ محکم
خاک سے اس کی ہے وابستہ ہر اک کی تقدیر
سب اسی خاک سے اٹھے ہیں سبھی بھائی ہیں

یوسف ناظم

وہ جامعی نہیں خود جامعہ تھے

انھیں چار طرح کے لوگ جانتے تھے۔ ایک تو وہ جنھوں نے ان کے ساتھ تعلیم پائی ان کے ساتھ اٹھے بیٹھے، ساتھ پڑھا لکھا۔ سفر کیا، دعوتیں کھائیں۔ خونچے والوں سے طرح طرح کی چیزیں جنھیں اُلّم غلّم کہا جاتا ہے خریدیں، ہنسی مذاق کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ذاکر صاحب علی گڑھ میں طالب علم تھے اور رشید احمد صدیقی وغیرہ ان کے ساتھی تھے۔ دوسرے وہ لوگ جنھوں نے انھیں عملی زندگی میں دیکھا۔ ویسے عملی زندگی میں تو وہ طالب علمی کے زمانے ہی میں حصّہ لینے لگے تھے۔ وہ علی گڑھ میں طالب علم بھی تھے اور معلّم بھی۔ طالب علم ہوتے ہوئے معلّم بن جانا بڑی بات ہوتی ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کے لیے یہ معمولی بات تھی کیونکہ وہ تو پیدا ہی بڑے آدمی ہوئے تھے۔ ان کی اصل عملی زندگی جامعہ ملیہ کی خدمت تھی یہاں نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے کہنے پر ان کے دوسرے ساتھی جو سب کے سب اعلا تعلیم یافتہ تھے مہینوں اور برسوں، بغیر تنخواہ کے کام کرتے تھے۔ جامعہ ملیہ اصل میں ذاکر صاحب ہی کی تحریک پر قائم ہوئی۔ یہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں ایک چھوٹی سی درس گاہ میں تھی۔ ٹھہرو بات ہم ذرا دیر سے بتائیں گے۔ اس وقت تو ہم یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ذاکر صاحب کو تین لوگوں نے کن کن صورتوں میں دیکھا۔ جامعہ ملیہ کے معلّم کی حیثیت سے دیکھنے والوں کی تعداد لاکھوں کی ہوگی کیوں کہ ان میں وہ طالب علم تھے جو ہر سال آتے، جامعہ میں شریک ہوتے اور کئی سال ہوسٹل میں رہ کر اور جامعہ میں پڑھ کر واپس ہوتے۔ وہ لوگ تھے جنھوں نے ان کے ساتھ دفتر میں کام کیا۔ وہ لوگ تھے جنھوں نے جامعہ کے لیے اپنی اپنی حیثیت کے

---

۱۹ رالہلال باندرہ ریکلیمیشن بمبی نمبر ۵۰

مطابق روپے پیش کیے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے جامعہ کے اقامت گاہوں کے طرف
ن میں دکانیں لگائی تھیں۔ انہی میں ہمیں یاد ہے کہ ایک وہ شخص تھا جس کی دکان سے ہوسٹل
لڑکوں کے لیے اناج خریدا جاتا تھا لیکن اس اناج کی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ شخص برسوں
بھی اناج فراہم کرتا رہا اور ذاکر صاحب جب صدر جمہوریہ ہو گئے تب بھی اس شخص کو نہیں
لے اور اسے راشٹرپتی بھون بلا کر اس سے کہا کہ اگر تم اس کڑے وقت میں ہمارا ساتھ نہ
یتے تو پتا نہیں جامعہ کا کاروبار کس طرح چلتا۔ یاد رہے کہ یہ کرانہ فروش غیر مسلم تھا لیکن وہ
مانہ ہی اور تھا۔ مذہب کی اتنی نمائش نہیں تھی لیکن سب کے سب اپنے مذہب اور عقیدے
سختی سے پابند تھے اور جانتے تھے کہ مذہب کا مقصد انسانیت کی تعلیم دینا ہے ـــ خیر ـــ
پھر تیسرے یعنی ذاکر صاحب کے جاننے والے ـــ وہ لوگ تھے جنھوں نے انھیں گورنر،
ب صدر اور صدر جمہوریہ کی حیثیت سے دیکھا ـــ اور چوتھے وہ لوگ تھے۔ تھے
یں بلکہ ہیں ہی وہ لوگ جو ان کی باتیں کتابوں اور رسالوں میں پڑھیں گے اور دوسروں
سنیں گے یعنی تم لوگ۔

ذاکر صاحب سے ہم کبھی کبھی نہیں مل سکے لیکن ان کا نام اس وقت سے سنتے آرہے
جب ہم خود طالب علم تھے وہ تو اسی وقت مشہور ہو گئے تھے جب وہ شاید ۲۰، ۲۵ سال
ہوں گے۔ مقرر تو پہلے ہی سے اعلا درجے کے تھے۔ اردو اور انگریزی کے ادیب تھے۔
ب طالب علم تھے اس وقت انھوں نے افلاطون کی مشہور کتاب 'ریاست' کا ترجمہ اردو
ں کیا۔ یہ کتاب آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ وہ طالب علم بھی بہت
ے تھے۔ بی۔ اے کے امتحان میں انھوں نے نمایاں امتیاز حاصل کیا تھا اور کالج میں
ں آئے تھے حالاں کہ پڑھتے صرف اس وقت تھے جب امتحان سر پر آجاتا تھا۔ طالب
ں کی انجمن کے صدر بھی رہے اور اپنے مخالفین کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کی ذہانت
قابلیت مسلمہ تھی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین تو انھیں
ری وظیفہ (اسکالرشپ) پر اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیجنا چاہتے تھے۔ یوپی کے انگریز افسر انھیں
اسے اچھی ملازمت دینا چاہتے تھے لیکن ذاکر صاحب ان معمولی باتوں سے بہت اونچے
اٹھے۔ انھوں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں 'سوراج' کے لیے انگریزوں سے لڑنا
ط کر لیا تھا۔ کالج کو خیرباد کہہ کے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تھی اور اسی کی خدمت اور ترقی

کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ اس زمانے میں یعنی ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان، اس جامعہ کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ دور دور سے لوگ اپنے بچوں کو جامعہ ملّیہ بھیجا کرتے تھے۔ اس زمانے میں جو پیام تعلیم چھپتا تھا اس میں جامعہ ملّیہ کے کمسن طالب علموں کی تصویریں چھپتی تھیں ان میں کوئی وزیر تعلیم ہوتا تھا کوئی وزیر اعظم۔ بچوں کے بینک قائم تھے اور ان کے تقریری مقابلے ہوتے تھے۔ ہوسٹل میں بچوں ہی کو انتظامی معاملات سنبھالنا پڑتے تھے اور انھیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا تھا ـــــ ذاکر صاحب ہر قدم پر اور ہر جگہ موجود رہتے تھے۔ ہم ریاست حیدرآباد کے ایک چھوٹے سے تعلقے جالنہ میں رہتے تھے اور دلّی وہاں سے ہزاروں میل دور تھی لیکن پیام تعلیم میں ہم جب بھی جامعہ ملّیہ کی خبریں پڑھتے ایسا محسوس ہوتا کہ ہم بھی ان خبروں اور تصویروں میں کہیں موجود ہیں۔ جامعہ ملّیہ نے چند ہی سالوں میں اتنا نام کما لیا تھا کہ بڑی بڑی سرکاری یونی ورسٹیوں نے اتنی شہرت نہیں حاصل کی ہوگی وہاں کے پڑھے ہوئے طالب علم اپنے نام کے آگے قوسین میں جامعی لکھ کر خوش ہوتے تھے ایک جامعی کا دوسرے جامعی پر اتنا ہی حق ہوتا تھا جتنا ایک بھائی کا دوسرے بھائی پر ہوتا ہے۔ یہ سب ایک خاندان کے فرد تھے۔ انھیں ایک رنگ میں رنگنا۔ انھیں اچھا انسان بنانا۔ سر اٹھا کر چلنے کی عادت سکھانا۔ یہ سارے کارنامے جامعہ ملّیہ نے انجام دیے اور ان سب کارناموں پر ذاکر صاحب کی چھاپ تھی۔ ایک مرتبہ جب ریاست حیدرآباد کے حکمراں اور فرماں روا کی جانب سے جامعہ ملّیہ کی رقمی امداد پہنچی تو ذاکر صاحب کی خوشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اعلان کیا کہ آج ۱۱ سال کے بعد جامعہ میں کام کرنے والوں کو پوری تنخواہ دی جا سکی۔ اس زمانے میں ایک تو استادوں کی تنخواہ کتنی ہوتی تھی اور یہ بھی آدھی یا ایک تہائی دی جاتی تھی۔ اگر یہ اساتذہ اس وقت روکھی سوکھی کھا کر جامعہ کی خدمت نہ کرتے تو کیا آج یہ 'جامعہ نگر' کہیں نظر آتا۔ ہو سکتا ہے اوکھلے میں صرف اسٹیل کی الماریاں بنانے یا بنگلور کے ریشمی ساڑیوں کو رنگنے اور چھاپنے کے بڑے بڑے کارخانے ہوتے یا پھر کوئی مرغیوں کا فارم ہوتا۔ پولٹری فارم۔ ان استادوں کو اس نیک کام پر کس نے اکسایا۔ کس کی رہنمائی میں بلکہ کس کی رفاقت میں یہ قافلہ آگے بڑھا۔ یہ ذات ذاکر صاحب کی تھی اس لیے اگر ہم ان سے نہیں مل سکے تو اس کا افسوس ہونا چاہیے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم نے کم سے

ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو دیکھا ہے۔ ان سے ملے ہیں اور
یں سنا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں جامعہ عثمانیہ میں جس کے ہم طالب علم رہے ہیں، استاد
۔ استاد تو وہ تاریخ کے تھے لیکن ان کی دلچسپی ادب سے بھی اتنی تھی جتنی کہ اپنے مضمون
۔ ان کے علاوہ ہم ان کے بھتیجے امتیاز حسین خاں سے بھی ملے ہیں یہ بھی جامعہ عثمانیہ
معاشیات کے استاد تھے ان کا مکان بھی ہمارے ہوسٹل سے قریب تھا اس لیے ان کے
بھی آتے جاتے رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس لحاظ سے ہم نے ذاکر صاحب کو دیکھ ہی لیا
اگی تسلی کے لیے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی چاہیے۔

ذاکر صاحب حاکم بھی تھے اور خادم بھی لیکن عجیب بات یہ کہ حاکم ہو کر انھوں نے
مت نہیں کی مگر خادم رہتے ہوئے دلوں پر حکومت کی۔ جامعہ ملیہ کے خادم کی حیثیت
وہ اتنے ہی معزز، معتبر اور باوقار تھے جتنے کہ ریاست بہار کے گورنر اور جمہوریہ ہند کے
ب صدر اور صدر ہو کر تھے۔ ان کی شرافت، انکسار، اور ملنساری کی جو شہرت جامعہ ملیہ میں تھی
پٹنہ کے گورنر ہاوز اور دِلّی کے راشٹرپتی بھون میں تھی۔ انھیں لوگوں نے ہمیشہ استاد کی حیثیت
جانا۔ ایک شفیق اور محبّت کرنے والے استاد کی حیثیت سے۔ سیاست کے میدان میں
اور تعلیم کے میدان میں بھی ان کے مشورے قبول کیے جاتے رہے۔ انھوں نے نہایت
وشی بلکہ ایک لحاظ سے 'بے زبانی' کے ساتھ اپنا کام کیا بینڈ باجے نہیں بجوائے
ھول تاشے نہیں پٹوائے۔ ذاکر صاحب ایک خاموش اور پُر سکون بہنے والے چھرنے کے
ند تھے جس کا کام سوکھی اور پیاسی زمینوں کو سیراب کرنا تھا۔ وہ سیلاب لانے والے
ش کا پانی نہیں تھے۔ جامعہ ملیہ کی جب بنیاد رکھی گئی تو وہ صرف ایک موم بتی تھی آج
معہ ملیہ ایک مینارۂ نور۔ یہ روشنی کہاں سے آئی ہے سب جانتے ہیں۔

ذاکر صاحب بچّوں کے عاشق تھے۔ وہ بچے جن کے سر پر ذاکر صاحب نے اپنا ہاتھ پھیرا تھا
بھی موجود ہیں اور یقیناً آج بھی اس ہاتھ کی شفقت کو بھولے نہیں ہوں گے۔ ذاکر صاحب
س سے بھی ہنس کر بات کی ہوگی وہ خود پھول کی طرح کھل گیا ہوگا۔

پھول کے ذکر پر یاد آیا کہ ذاکر صاحب تو پھولوں کے بھی عاشق تھے۔ گلاب کا پھول
ا جان تھا۔ جہاں بھی رہتے گلاب ضرور پیدا کرتے۔ پٹنہ کے گورنر ہاوز میں انھوں نے گلاب
غ لگایا تھا اس میں گلاب کی چار سو سے زیادہ قسمیں تھیں۔ چنڈی گڑھ کا ذاکر باغ تو ہم نے

بھی دیکھا ہے ۔ زمین پر تر و تازہ گلاب اس طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے رنگ برنگی لباس پہنے بچے بیٹھے ہوں ۔ کتنے ہی لوگوں نے ذاکر صاحب کے نام پر نئی نئی وضع کے گلاب پیدا کر لیے ۔ اپنے پیدا کیے ہوئے درختوں کا نام انھوں نے 'ذاکر گلاب' رکھ دیا —— جو شخص پھولوں میں اتنا رہے گا ان سے اتنا پیار کرے گا ظاہر ہے اس کے مزاج میں پھولوں کی نرمی خود بخود آ جائے گی ۔ ذاکر صاحب کے جاننے والے کہتے ہیں 'یہی کہتے ہیں کہ وہ بے حد نرم مزاج اور خوش گفتار آدمی تھے —— پھول کی طرح تر و تازہ اور متبسم رہتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خوشبو آج بھی جامعہ نگر میں بکھری ہوئی ہے —— مرنے کے بعد بھی انھوں نے جامعہ ملّیہ کا ساتھ نہیں چھوڑا ۔ وہ اس کا جسم بھی تھے اور جان بھی ۔ اسی لیے ہم نے کہا کہ وہ جامعی نہیں تھے خود جامعہ تھے ۔

ریز قریشی (ایم پی)



ذاکر صاحب ۔ اور بچے

مہاکوی ٹیگور نے کہا ہے کہ جب کوئی بچہ دنیا میں آتا ہے تو اپنے ساتھ خدا کا یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان اور انسانیت کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ ذاکر صاحب بھی یہی کہتے تھے۔ انھیں دو چیزیں بہت پسند تھیں، گلاب کے پھول اور بچے۔ بچے بھی اسی طرح شگفتہ اور خوبصورت ہوتے ہیں نا جیسے پھول! انھوں نے اپنے باغ میں طرح طرح کے گلاب لگا رکھے تھے وہ چاہتے تھے ان کا زیادہ تر وقت بچوں اور پھولوں میں گزرے۔ جیسا کہ آپ سبھی جانتے ہیں کہ انھوں نے جامعہ ملیہ میں بچوں کے پرائمری اسکول کو ہندستان میں نمونے کا اسکول بنایا تھا۔ گاندھی جی جس طرح کی تعلیم کے بارے میں سوچتے تھے وہ ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس اسکول میں بچوں کو دی۔

وہ لوگ جنھوں نے جامعہ میں پڑھا ہے، ان کے ساتھ کام کیا ہے، ان سے ملے ہیں، جانتے ہیں کہ ذاکر صاحب کتنی خوبصورت اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک استاد تھے صحیح معنوں میں استاد۔ وہ استاد جو اپنے طالب علموں کی زندگی کا رُخ پلٹ دیتا ہے۔ جامعہ کے سب بچوں کو وہ اپنا بچہ سمجھتے تھے۔ ان کی تکلیف، ان کی خوشیوں، اور رنج میں برابر کے شریک تھے۔ جو خوبیاں اپنے طالب علموں میں پیدا کرنا چاہتے تھے وہ تھیں صاف ستھرا رہنا، محنت کرنا، وقت کی پابندی، بزرگوں کا ادب، سچی

۱۳۱۔ کیننگ لین۔ نئی دہلی ۱

مذہبی لگن، وطن کی محبت اور انسان دوستی۔ انھوں نے جامعہ میں اس کی کوشش کی کہ یہاں کے طالب علم اسکول اور بورڈنگ میں رہ کر ایسی تعلیم حاصل کریں کہ وہ جس شعبہ میں جائیں اپنا نام اور اعلا مقام پیدا کریں۔ اور زندگی کے کسی میدان میں پیچھے نہ رہیں۔ یہاں بچوں کو تقریر کرنا سکھایا جاتا، اخبار نکالنا، مضمون لکھنا، اپنی حکومت چلانا۔ اپنا بینک اور خوانچہ بھی بچّے چلاتے تھے۔ وہ ایک دن مدرسہ کا انتظام خود کرتے تھے۔ وہ کیمپ فائر کرتے تھے۔ مزے مزے کے ڈرامے کھیلتے تھے۔ بچّوں کو نئی نئی باتیں سکھانے میں ذاکر صاحب کا دماغ خوب چلتا تھا۔ ذاکر صاحب کو قسمت سے ساتھی بھی اچھے مل گئے تھے وہ نئی نئی تجویزیں لاتے تھے اور تعلیم کے نئے نئے تجربوں میں ذاکر صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ سب لوگ مل جُل کر کام کرتے تھے اور یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ جو کام مل جُل کر ہوتا ہے وہ بہت اچھا ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب کہا کرتے تھے کہ استاد کو خود اپنی کمیوں کو دور کرنے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے اس لیے کہ وہ جو خوبیاں اپنے طالب علموں میں پیدا کرنا چاہتا ہے، پہلے وہ اپنے میں پیدا کرتا ہے تاکہ اس کی مثال سے اس کے طالب علم سیکھیں۔ اس کو ہر وقت اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے وہ ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے وہ اپنے طالب علموں کی نظر میں گر جائے۔

ذاکر صاحب جامعہ سے نکلے تو انھیں ایک سے بڑھ کر ایک عہدے ملے۔ انھوں نے ان عہدوں کے فرائض کو بہت مستعدی، ایمانداری اور خوبی سے نبھایا۔ اپنی ذہانت، قابلیت اور بات کرنے کے خوبصورت انداز سے سب کو متاثر کیا۔ ہمیشہ خود کو ملک و قوم کا خادم سمجھا۔ مگر انھوں نے اپنے سب دن ان ہی دنوں کو سمجھا جو انھوں نے جامعہ میں بچّوں اور بچّوں کے لیے کام کرنے والوں میں گزارے تھے۔

انھوں نے بارہا مختلف مواقع پر جامعہ کے بچّوں سے خطاب کیا۔ اسی پیام تعلیم میں بھی انھوں نے اکثر بچّوں کے لیے لکھا ہے ویسے بھی انھوں

نے بچّوں کے لیے بہت اچھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں ان سب کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بچّوں سے کس قدر پیار کرتے تھے اور بچّے ان کے لیے کس قدر اہم تھے۔ آپ نے ان کی کہانی "ابو خاں کی بکری" ضرور پڑھی ہوگی جس میں انھوں نے آزادی کی اہمیت بتائی ہے۔

یہ کہانی میں نے اپنے بچپن میں پڑھی تھی اور آج تک یاد ہے اس نے مجھ پر گہرا نقش چھوڑا ہے۔ ذاکر صاحب نے ایک مرتبہ بچّوں سے کہا تھا "بچّو نیکی کر دجاگو اور جگاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ان ننھے ننھے ہاتھوں سے کیا کر سکتے ہو ان ننھے ہاتھوں میں بڑا زور چھپا ہوا ہے اس زور کو آزماؤ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے برکت کا سبب بن جاؤ کہ سب کی نظریں تم پر لگی ہیں۔"

میں ان الفاظ پر اپنی یہ باتیں ختم کرتا ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ خدا تم سب بچّوں کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

ایک مرتبہ ذاکر صاحب جرمنی کے سفر سے واپس آئے تو ان کے ساتھ جنگ کی بہت سی تصویریں تھیں، ان تصویروں کے نیچے انھوں نے اپنے ہاتھ سے یہ عبارتیں لکھ کر اور تصویریں دے کر مجھے حکم دیا کہ ان کے بڑے بڑے وال پیپر تیار کرا لیجیے پچیس روپے کتابت کے لیے بھی دیے۔ ایسے وال پیپر ہم لوگ تعلیم بالغان کے سلسلے میں تیار کرتے تھے۔ میں نے وال پیپر تیار کرائے مگر جیسا کہ میں کیا کرتا تھا میں نے ڈاکٹر صاحب کی عبارت کو اپنے انداز پر ڈھال دیا اور اس طرح اپنے نزدیک ان کو تیار کر دیا۔ ذاکر صاحب نے وہ وال پیپر دیکھے اور جہاں جہاں بھی کچھ کمی بیشی نظر آئی انھوں نے کہا یہ بھی بہت اچھا ہے۔ میں اس وقت "بھی" کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ ذاکر صاحب نے پھر ان تصویروں کی دوسری نقلیں دیں اور کہا کہ اب ان کے وال پیپر پھر تیار کرائیے مگر اس بار عبارت میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ اب میں سمجھا اس "بھی" کا مطلب دل میں شرمندہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا قائل بھی ہو گیا۔

میں نے ایک اور بھی بڑی غلطی کر ڈالی۔ میں تعلیم بالغان کی لائبریری کا انچارج تھا۔ اس لائبریری سے مرکز کے ممبر بھی کتابیں لیتے تھے اور اسکول کے بچے بھی۔ کتابیں دینے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ لیکن میں نے لاپروائی برتی اور اس طرح کتابیں دینے لگا کہ کسی کو پرچہ دیدیا کہ ان کو کتاب دیدی جائے اور کبھی میں نے بچے کے ہاتھ پر ہی لکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر میں جب اسٹاک کا معائنہ کیا گیا تو آٹھ سو کتابیں غائب تھیں سوال ہوا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے لائبریرین نے میرے پرچے پیش کر دیے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ میں کتاب چاہنے والوں کی ہتھیلی پر بھی آرڈر لکھ دیتا تھا۔ معاملہ پھر ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ وہ جمعہ کے دن آئے اور کہنے لگے کہ کتابیں تو پڑھنے ہی کے لیے تو ہوتی ہیں۔ وہ ان کو پڑھیں گے اور ان کے دوست عزیز بھی پڑھیں گے۔ البتہ اگر کتابیں لائبریری میں رہتیں تو زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ پھر مجھے حکم دیا کہ کتابیں دلوانے کی جو پابندیاں ہیں آئندہ ان پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فیصلہ کئی پہلوؤں سے میرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی سبق آموز تھا۔

۱۹۳۸ء میں جب واردھا اسکیم پر ذاکر حسین صاحب کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو گئی اور اس کو صوبائی کانگریسی وزارتوں نے رائج کرنے کا ارادہ کر لیا تو گاندھی جی نے سیوا گرام

واردھا میں دو سو گریجویٹ لڑکے اور دو سو لڑکیوں کی ٹریننگ کا ایک کیمپ لگا یا جس میں صوبوں کے وزرا اعلا اور وزراے تعلیم بھی شریک تھے۔ جامعہ سے ذاکر صاحب کچھ استادوں کو ٹریننگ دلانے کے لیے ساتھ لے گئے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میں نے جو خاص بات دیکھی وہ یہ کہ دو سو لڑکے اور دو سو لڑکیاں ہیں۔ لیکن نہ شور ہوتا ہے اور نہ لوگ زور سے بولتے ہیں اور آشرم کے آداب کی پوری پابندیاں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اِدھر اُدھر تھوکتے بھی نہیں اس دسپلن پر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا یہ سب معمولی قسم کے لوگ ہیں لیکن یہاں باپو جی کی روحانیت کے زیر اثر ہیں۔ سیوا گرام کا اُبلا ہوا کھانا مجھے نہیں چلا۔ ذاکر صاحب کو اس بات کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے ایک شاگرد سے جو واردھا میں رہتے تھے کہا کہ میرے کھانے کی تو فکر نہ کرو لیکن وفا صاحب کے کھانے کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے۔ تب سے وہ دونوں وقت میرے لیے ناشتہ دان میں کھانا لاکر مجھ کو کھلایا کرتے تھے۔ یہ واضح رہے کہ سیوا گرام اور واردھا کے درمیان چار میل کا فاصلہ ہے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں قرول باغ کا جامعہ ختم ہوگیا اور جامعہ کے کارکن سب تتر بتر ہوگئے اور بہتوں کے دل ٹوٹ گئے۔ لیکن ذاکر صاحب نے ان سب کو اکٹھا کر کے جو تقریر کی اس میں نہ صرف خوف و ہراس کو دور کیا بلکہ انھوں نے ایک نئی ہمت عطا کی۔ ب ہ کو جو کھنڈر بن گیا تھا پھر عالی شان عمارت میں تبدیل کر دیا۔ بگڑے ہوئے کام پھر بننے لگے۔ ان کی تقریر کا اثر جامعہ کے ان ہی کارکنوں پر نہیں ہوا جو دہلی میں تھے، بلکہ تمام ہندستان کے جامعیوں پر ہوا۔ سب کی ہمتیں بڑھ گئیں اور سب تعمیری کاموں میں پھر جوش و خروش سے لگ گئے۔

جامعہ کی بربادی کے ساتھ مکتبہ جامعہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ اس کی کتابیں معہ مسودات کے جل گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ان کتابوں میں خامیاں ہوں گی جو خدا کو پسند نہیں آئیں اس لیے اس کی مرضی یہ ہے کہ ہم ان کاموں کو آئندہ اس طرح کریں کہ وہ خامیاں نہ رہیں۔ خدا کے فضل سے کام کرنے والے بھی موجود ہیں، ان میں لیاقت بھی ہے اور توقع ہے کہ خدا ان کو اتنی ہمت دے گا کہ وہ اپنے کاموں کو از سر نو شروع کریں گے۔ ایسی باتیں کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے جامعہ والوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ پودے نہیں ہیں، درخت

بن چکے ہیں۔ اور وہ زمانہ آیا ہے کہ آپ میں پھل آئیں۔ یہ یاد رکھیے کہ پھل دار درخت اکڑتا نہیں ہے، جھک جاتا ہے۔ اس پر لوگ پتھر پھینکتے ہیں مگر وہ اپنے پھل گراتا ہے لیکن پھر بھی جھکا رہتا ہے یہی آپ لوگوں کو کرنا ہے آخر میں انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو میں نے آج تک کسی اور سماجی لیڈر سے نہیں سنی۔ کہنے لگے کہ جامعہ برادری کے لوگ جہاں بھی کام کرنے جائیں گے وہاں کے لوگ کسی نہ کسی پیشے میں منزد رلگے ہوں گے ان کو چاہیے کہ وہ پیشہ اختیار نہ کریں کیوں کہ ایسا کریں گے تو وہاں کے لوگوں سے مقابلہ ہوگا اور چشمک ہوگی اور وہ پھر سماجی کاموں میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس آخری تقریر کو سنے ہوئے ۴۲ سال ہو گئے ہیں، لیکن یہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ انگلی پکڑے ہوئے مجھے اپنی راہ پر لا رہی ہے جہاں تک مجھ سے بنا ہے میں نے اس پر عمل کیا ہے اور یہ اٹل فیصلہ ہے کہ زندگی بھر اس پر عمل کرتا رہوں گا۔

جب میں ذاکر صاحب کو یاد کرتا ہوں تو یہ شعر میری زبان پر آجاتا ہے۔ ؎

رتبہ شہید ناز کا گر جان جائیے
قربان ہونے والے پر قربان جائیے

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی



حیاتِ ذاکر کا ایک ورق

صوبۂ اتر پردیش کے ایک مشہور و معروف قصبہ قائم گنج کے عالی خاندان گھرانے کا فرد ہونے کا شرف ذاکر حسین خاں کو حاصل ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ان کے مولد حیدر آباد پھر اٹاوہ کے اسلامیہ کالج اور علی گڑھ میں ہوئی جہاں آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار حسین خاں تعلیم پا رہے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر عمر وفا کرتی تو لوگ ذاکر صاحب کو فراموش کر دیتے۔ میں اس ابتدائی چند کلمات کے سوا ذاکر صاحب کے متعلق کوئی بات عرض نہیں کروں گا کہ ساری باتیں عام نہیں۔ میں محض ان واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو کہیں تحریر میں نہیں آسکے ہیں۔

میرے بزرگ اور ذی قدر سید محمد احسن مارہروی مرحوم (ڈپٹی رجسٹرار مسلم یونیورسٹی) کا بیان تھا کہ ذاکر صاحب پڑھنے میں جس قدر تیز اور ذہین تھے، شرمانے میں اس سے کہیں زیادہ تھے۔ جب کہ ان کے بڑے بھائی کی صفت اس کے برخلاف تھی وہ بے حد ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ دوستوں سے ہم نوائی ان کا شیوہ تھا جب کہ ذاکر صاحب اپنے کو لیے دیے رہتے تھے۔ اس کی وجہ ان کے اٹاوہ کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ اس بات کی تصدیق رشید صاحب قبلہ بھی فرماتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ذاکر صاحب کے دل میں جو بات ہوا کرتی ہے وہ بہت بعد میں زبان پر آتی ہے۔ اگرچہ ہم لوگ دوران طالب علمی وہم مکتبی بھی اپنے اندازے سے ان کا مافی الضمیر سمجھ لیتے تھے۔

ذاکر صاحب کو مجھ سے جو نسبت خاص تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے

شعبۂ رابطہ عامہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے میری تقریب شادی (فروری ۱۹۴۹ء) میں بہ نفس نفیس شرکت کی تھی۔ نکاح کے بعد دعائیہ کلمات کہتے ہوئے ایک ایسی بات بطور تعلیم فرمائی جس کو آج تک فراموش نہیں کرسکا ہوں۔ فرمایا۔

"میاں صاحب زادے شادی کو بندھن نہ خیال کرنا۔ اسے حکم رسول خیال کرکے احترام کرنا۔"

۱۹۵۱ء میں جناب حامد علی خاں مرحوم جنرل منیجر مکتبہ جامعہ نے شعبۂ طباعت سے وابستہ کرکے مجھے خدمت کا موقع دیا تھا۔ ان کی سرپرستی میں مکتبہ نے خاصی ترقی کی تھی۔ پیام تعلیم جو ذاکر صاحب کا بچوں کے لیے آرگن تھا۔ اس زمانے میں اظہر پرویز (جن کو ہم لوگ علی گڑھ والے عثمان کے نام سے جانتے تھے) کی ادارت میں نکلتا تھا۔ حامد صاحب کی توجہ اس رسالے پر خاصی تھی۔ مسٹر مبیبی کو وہ خود نئے گوشے تصاویر کے مہیا کرتے۔ اور اکثر ذاکر صاحب بھی ان سے اس موضوع پر بات کیا کرتے۔ خیر علی گڑھ سے جامعہ جاکر ملازمت اختیار کرنے اور قیام کا مسئلہ جب سامنے آیا تو عم ذی قدر احسن صاحب نے ذاکر صاحب سے ذکر کیا۔ موصوف نے ہمیں طلب کیا اور کہا "جب تک مناسب جگہ نہ ملے میری کوٹھی میں قیام کریں۔ اور ہاں کرایہ کے بطور ذرا اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھیے گا" جامعہ آکر میں نے حامد صاحب سے ذکر کیا۔ انھوں نے اتفاقِ رائے کیا۔ چنانچہ کافی عرصہ میرا قیام اس کوٹھی میں رہا۔ اس کے بعد میں پروفیسر زیدی صاحب کے کوارٹر میں منتقل ہوگیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ذاکر صاحب نے علی گڑھ کو بہت کچھ دیا۔ مگر خود ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ علی گڑھ نے ان کو سب کچھ دیا۔ ان کا علمی تشخص، قلمی وجاہت، بولنے اور کلام کی جرات، قوت گویائی کے ساتھ فیصلہ کرنے کی صلاحیت، اصابتِ رائے بلکہ ظاہر و باطن سب ہی علی گڑھ کا مرہون ہے۔ انھوں نے تو بس کفایہ ادا کیا۔ چنانچہ ان کی اس تقریر کا لب و لہجہ بول رہا ہے کہ سچ کیا ہے:

"میں نے (علی گڑھ سے) بہت کچھ سیکھا۔ زیادہ نہ سیکھنے پر دل گیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تعتم بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا۔ یہاں دوست پائے۔ دوستی کی قدر پہچانی۔ مل جل کر کام کرنا سیکھا۔ اختلافات کے باوجود نباہ

کے ڈھنگ سیکھے۔

اس آئینے میں ذاکر صاحب کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ اسی لیے وہ کہا کرتے تھے کہ علی گڑھ نے ان کو بہت کچھ دیا۔ چنانچہ بدرالدین طیب جی کے بعد نواب علی ورجنگ کا تقرر بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا جب ہوا اور وہ واقعہ ئلہ رونما ہوا جسے نہ گزرنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد ذاکر صاحب نے فرمایا تھا کہ:

"بھئی۔ عجیب بات ہوئی۔ سارا اندازہ ہی غلط ہو گیا۔ طیب جی کامیاب آئے اور علی گڑھ کی سرزمین سے یاور جنگ جیسے زمانہ شناس کو خون خرابہ کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ جب کہ ہم لوگ ان کو ایک اچھا ڈپلومیٹ خیال کرتے تھے۔"

عرض کیا۔ "آپ کا اندازہ غلط نہ تھا۔ خود نواب صاحب کا اندازہ وہاں کے تعلق غلط تھا۔ بعد کی تاریخ شاہد ہے کہ نواب صاحب نے اپنے رویہ میں تبدیلی کی اور بنی عالی ظرفی سے ان تمام افراد اور طلبہ کو جو کسی بھی طریقے سے اس حادثہ میں ملوث قرار ے دیے گئے تھے۔ ایک سرکاری شناخت میں ان کی پہنچ ان سے ہی انکار کر دیا ور عفو و درگزر سے کام لے کر علی گڑھ کی ساکھ کو مزید رسوائی سے بچا لیا۔ لیکن ذاکر احب نے وہ جملے جس درد اور دکھ سے کہے تھے۔ اس کا اظہار الفاظ میں کہاں ممکن ہے؟ ذشناسا ہیں، وہ واقف ہیں کہ نواب صاحب کے اس عملِ خیر میں ادبر دہ خود وہ بھی ثریک کار تھے۔ دراصل ذاکر صاحب طلبہ کے درمیان عزتِ نفس، خودداری اور حساسِ خودی کا جذبہ بیدار دیکھنا چاہتے تھے بلکہ میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں طلبہ کو اساتذہ ے زیادہ ممتاز درجہ پر دیکھنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر ہم نوا(؟) میں ے کسی نے توجہ دلائی کہ ـــــ

"افسوس کی بات ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ جو عمدہ اور اچھے لباس۔ کھاتے پیتے گھرانے کے افراد میں سے ہیں۔ وہ بھی وظیفہ کے خواست گاروں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔"

ذاکر صاحب نے ذرا تند اور تیز لہجہ میں خفا اور دل گیر ہوتے ہوئے کہا:

"آپ کا مقصود یہ ہے کہ وہ کٹھ پتلے کے فقیر بن کر آئیں۔"

پھر کہا۔" آپ حضرات واقف ہیں کہ یہ یونی ورسٹی ہندستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے مختلف ہے۔ یہاں کے ذمہ داران میں عہدہ داران، طلبہ اور اساتذہ کا اشتراک عمل شامل رہنا ضروری ہے۔"

ذاکر صاحب کی نظر میں مذہبی اور فلسفیانہ تصورات، عقلیت اور واقعیت شعوری نشوونما، واضح نظامِ حیات کی سمت لے جانے والے افکار کی قدر زیادہ تھی وہ تعلیم کے ساتھ اخلاقی نقطۂ نگاہ کو مسلمانوں میں عام طور پر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ طلبہ کی وہ جماعت جو برہمی یا غصہ کی حالت میں بھی ذاکر صاحب کے پاس آتی۔ وہ پہلی نظر اس کے لباس پر ڈالتے۔ وضع قطع اور طرز آمد پر نظر کرتے اور بسا اوقات صاحب سلامت سے پہلے ہی کسی ایسے طالب علم پر ان کی نظر جا پڑتی جس کی شیروانی کے بٹن کھلے ہوتے۔ وہ آگے بڑھتے اور اس چاک دامانی کو رفو کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتے۔ اس کی شیروانی کا بٹن لگاتے جاتے اور کہتے۔

"میاں صاحب پہلے اپنے لباس کو درست رکھنا سیکھو یعنی اسے درست کرلو پھر اپنی بات کو آگے بڑھاؤ تو سننے والے پر اس کا بہت اثر ہوگا۔"

نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ جماعت ساری ریشہ دوانی کو بھول جاتی اور بات صرف مراحل پر آکر ٹھہر جاتی۔ وہ طالب علموں کی بات غور سے سنتے۔ اس کے مداوے کا وعدہ کرتے اور متعلقہ اشخاص سے بازپرس کر کے تلافیِ مافات کرتے۔

ذاکر صاحب اس یونی ورسٹی میں اقلیتی مفاد کے خلاف کوئی بات سننا گوارا ہی نہیں کرتے تھے مگر اس بات کا اعلان کر کے اسے تصویر کا دوسرا رخ رکھانے کے سخت خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یونی ورسٹی میں اسلامی علوم و افکار اور مذہب کی اشاعت و تبلیغ کے لیے باقاعدہ CHAIRS قائم کرائیں تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت اور تعلیمی تقدیر یکساں صورت اختیار کرسکے اور اس طرح زندگی سنورنے کے بہتر اسباب پیدا ہوسکیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء سے ۱۵ ستمبر ۱۹۵۶ء تک یعنی کامل آٹھ سال مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے فرائض انجام دیے تھے۔ انھوں نے ماسبق میں جو کچھ واقعات رونما ہوئے تھے، ان سے خود بھی چشم پوشی کی اور ارباب

حکومت کو بھی اس مادرِ درسگاہ تک نظر انداز کرتے کے رویہ کو اپنانے پر مجبور کیا۔ اس لیے کہ وہ اپنی ہی قوم کے مظلوم افراد کو جہالت اور سیک ساری کی حالت میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ پشیمانی کا ہونا انسانی وصف ہے مگر اس تنگ نائے میں سدا مبتلا رہنا قوم کے لیے مضر ہے۔ ایک گفتگو میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا۔

"مسلمان قوم کی حالت اس وقت دردناک عذاب میں مبتلا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنا واجب خیال کرتی ہے جب کہ مشتعل رہنا اور نفاق و اختلاف میں مبتلا رہنا کسی اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ان میں اتحاد قومی اور جوش ملی کا پیدا ہونا ہی منفعت بخش ہو سکتا ہے"

ان کے رفیق کار، محب خاص، مخلص صادق پروفیسر رشید احمد صدیقی سے جو مراسم خاص تھے اس کا علم ہر شخص کو ہے۔ وہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ میں نے ایک سلسلہ میں "حیات ذاکر" مصنف خورشید مصطفیٰ رضوی پر مقدمہ لکھنے کی جب استدعا صاحب تصنیف کے ساتھ کی تو رشید صاحب قبلہ نے فرمایا تھا۔

"بلگرامی صاحب جب میں نے خلیق صاحب اور کئی افراد کے سوا خود مؤلف کی خواہش پر اپنے کو اس کام کے لیے آمادہ نہ کر سکا تو بتائیے اب کیسے اپنے کو مجبور کر دوں"۔

رشید صاحب کے فرمان کے ختم ہوتے ہی میں نے معذرت خواہی کی اور ہم دونوں ناکام و نامراد رخصت ہو گئے مگر چند ہی دن بعد میرے نام خط آیا۔ پھر ملاقات پر فرمایا۔

"آپ کے رخصت ہونے کے بعد دل نے کہا کہ ایک سیّد زادے کا حکم نہ ماننا تو عذاب مول لینا ہے۔ اس لیے ان صاحب سے کہیے کہ وہ اپنا مسودہ بھیج دیں"۔

چنانچہ وہ مقدمہ ہی تصنیف کی اصل جان ہے جس میں ذاکر صاحب کے جگری دوست کی تنقید بھی ہے۔ محاسبہ بھی اور جن لوگوں کی نظر سے یہ کتاب گزری ہے وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ رشید صاحب نے صدر مملکت ہند پر جو کچھ کہا وہ اصل ہے یا نقل

داس کتاب کی ابتدا میں ذاکر صاحب کے مختصر حالات زندگی خود ان کے دست و قلم کے، جو راقم کی استدعا پر، موصوف نے اپنے عہد گورنری میں رقم فرما کر ارسال کیے تھے۔ شریک ہے) سچ یہ ہے کہ خود ذاکر صاحب اپنے طور پر اس مسئلہ پر قوم سے شرمسار تھے یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اس کا اظہار برملا نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے اپنے زندگی کے بقیہ ایام بہت دکھ سے گزارے، جس کا علم ان حضرات کو ضرور ہے، جو ان سے قریب رہے اتفاق سے مجھے یہ شرف عہد وائس چانسلری سے صدر مملکت تک کے منصب پر بھی حاصل رہا یہاں تک کہ موصوف نے ۱۹۶۶ء میں ایک مرد بزرگ کی نہایت ناشائستہ حرکت پر جو میرے ذیل میں انھوں نے سرزد کی تھی۔ اپنے عہدۂ جلیلہ کا پاس وخیال نہ کرتے ہوئے ٹیلیفون پر گفتگو کی۔ اور میرے دا اپنے پرائیوٹ سکریٹری مسٹر بھڑ کے موجودگی میں کی۔ جب کہ میں نے ان سے استدعا بھی کی تھی کہ وہ ان صاحب سے بات نہ کریں۔ جو ہونا ہو گا۔ وہ ہو جائے گا۔ مگر موصوف نے بات کی اور ختم کلام پر فرمایا۔

"مجھے بہلایا جارہا ہے"

لیکن جب میری وہ آفت تمام ہو گئی اور میری بحالی کا پروانہ جاری ہو گیا تو اس وقت صدر مملکت ہند کے لٹرہیڈ پر مبارک باد کا خط میرے نام سے ارسال کیا۔ جو میرے لیے اعزاز اور فخر کا باعث ہے۔

مندرجہ بالا بات کی تائید میں ذاکر صاحب کے اس بیان کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو میرے خیال و بیان کی تائید کے لیے کافی ہے۔

"اپنی قومی زندگی کے سارے عیب برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔ اس کی ساری آرزوں اور تمناؤں کا نقش یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ اپنی خام تشدد خرابیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا۔ سوکھے پتوں کی کی طرح ایک چنگاری سے بھڑک اٹھے مگر پچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا..... تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا۔ یہیں فرماں برداری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب"۔

اس اعلان اور منشور میں جو سچائی اور حق گوئی پنہاں ہے۔ وہی ذاکر صاحب کی
صل سیرت اور علی گڑھ کا کارنامہ ہے شریف خاندان کے افراد اسی قسم کے اخلاق کا مظاہرہ
رتے ہیں اور ذاکر صاحب یہ صفت ہر علیگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔

ریاضی اور معاشیات کے ماہرین عددی خصوصیت سے کما حقہ، واقف ہوتے
ہیں۔ ذاکر صاحب معاشیات کے ماہر تھے۔ لہذا وہ انسانوں کو عددی نظر سے دیکھتے
تھے۔ وہ دو اور دو چار اور دُو دُو بائیس (۲۲) کے فرق اور اصل سے لاعلم نہ تھے
سے زیادہ آگاہ تھے۔ لیکن کبھی وہ صرف نظر کے بھی قائل تھے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ
بلِ تذکرہ ہے۔

۱۹۵۲ء میں لیاقت علی خاں پہلے وزیر اعظم پاکستان کو ایک جلسہ گاہ میں گولی ماردی
ئی۔ یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پوری دنیا میں سیکنڈوں میں پھیل گئی وہ مسلم یونی ورسٹی
ے قدیم طالب علم بھی تھے اور سرگرم رکن بھی رہ چکے تھے اس لیے طلبہ کا فیصلہ ہوا کہ ان کی
فات کے سلسلے میں یہاں چھٹی بھی ہو اور یونی ورسٹی کا سائرن بھی بجایا جائے مگر یونی ورسٹی
ی مجلس منتظمہ نے پہلے کردیا تھا کہ کسی کی موت پر سائرن کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس
نظوری کے بعد یہ پہلا حادثہ رونما ہوا۔ لڑکوں کا جم غفیر یونین ہال سے چل کر وائس چانسلر
ی رہائش گاہ پر آیا۔ اس عرصہ میں ذاکر صاحب نے GANDHI EYE HOSPITAL, ALIGARH
ندھی شفاخانۂ چشم میں اپنے کو منتقل کرلیا۔ طلبا جب کوٹھی پر آئے تو مرید صاحب (سکریٹری
ائس چانسلر) نے مجمع سے کہا کہ ـــــ ذی سی کی آنکھ میں تکلیف ہے اور وہ شفاخانہ میں داخل
ہیں ـــــ لڑکے سیدھے شفاخانہ پہنچے۔ ذاکر صاحب سے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے
ونی ورسٹی میں تعطیل کرنے اور سائرن بجانے کا مطالبہ کیا۔ پہلے تو انھوں نے اِدھر اُدھر
ی باتیں کی۔ مجلس منتظمہ کے فیصلہ کا ذکر کیا مگر لڑکے نہ مانے آخر کار انھوں نے کہا۔ اچھا
یونین چلیے۔ ادھر یونین کی گھنٹی مستقل بج رہی تھی رفتہ رفتہ لڑکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا
ارہا تھا کہ وہ جماعت ٹوٹ آئی۔ یونین کا ہال کھچا کھچ بھرا تھا تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد ذاکر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ لڑکوں نے باقاعدہ تعزیتی جلسہ کیا۔
قرارداد منظور کی اور ایک دن کی تعطیل و سائرن بجانے کا مطالبہ کیا۔ وائس چانسلر نے
فراست سے کام لیا۔ ضد یا ہٹ دھرمی کے بجائے ایک مختصر سی تقریر کی۔ یونی ورسٹی کے

ناموربوت کی اس دنیا سے جدائی اور وحشیانہ قتل پر اظہار غم کیا۔ پھر کہا۔
" جو لوگ سائرن بجانے کے حق میں نہیں ہیں وہ پہلے اپنے ہاتھ اٹھائیں۔"
بات ختم ہونے سے پہلے ہی پورے ہال نے ہاتھ بلند کر دے۔ مگر فوراً ہی ا
نے اپنی غلطی کا احساس کیا اور نہیں، نہیں کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ذا
صاحب بے اختیار ہنس دیے۔ دوبارہ پھر ووٹنگ کی اور سوا ایک طالب علم کے
نے سائرن بنانے کے حق میں ہاتھ اٹھائے۔ اس پر ذاکر صاحب نے فرمایا: "صرف تین
سائرن بجے گا۔" طلبہ نے کہا۔ "سات بار بجایا جائے گا" ـــ اب واقعی کتنی بار سائرا
بجایا گیا۔ اس کی تعداد کسے یاد ہے۔ سوا اس واقعہ کے جو یونین ہال میں اس طالب
کے ساتھ گزرا جس نے سائرن نہ بجانے کی موافقت میں ہاتھ اٹھایا تھا۔

اسی طرح حکومت ہند نے یونی ورسٹی میں مقررہ تعطیلات کو کم کرنے اور
حکومت ہند کی مقرر کردہ تعداد پر لانے کے لیے جب اصرار کیا تو اس وقت یہاں
بہت کرائسس پیدا ہوگیا۔ خصوصی طور پر محرم کی تعطیلات جو کم از کم بارہ یوم کی ہوا
کرتی تھیں ذاکر صاحب کو اسے کم کرنے اور قومی سطح پر مقابلہ کرنا پڑ گیا۔ یہاں تک کہ
اس وقت کے طلبہ یونین کے سکریٹری سعید انڈا نے یونی ورسٹی کے اس عملیہ پر اپنی
ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ـــ "ذاکر حسین ہیں ذاکر حسین علیہ السلام کرنے
سے منع کر رہے ہیں" ـــ یہی نہیں یونی ورسٹی کے طلبہ میں سے کسی ایک نے بھوک
ہڑتال بھی کی۔ شورش نے جب زیادتی اختیار کرلی تو ذمہ داران یونی ورسٹی نے درمیان
میں پڑکر معاملات کو سلجھایا اور ذاکر صاحب نے باور کرایا کہ طلبہ یونی ورسٹی کو مجالس
اور ذکر شہادت حسین علیہ السلام کی پوری آسانی یونی ورسٹی کی طرف سے فراہم کی جائے
گی اور آپ سب حضرات غم امام اپنے اسی درس گاہ میں منائیں۔ چنانچہ ہم نذیر احمد روڈ
کو مجالس اور عزا خانہ قرار دے دیا گیا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ پھر بھی والد
۱۰ محرم کی تعطیلات عزا کا اعلان کرکے اس قضیہ کو تمام کر دیا گیا۔ لیکن ذاکر صاحب کی
دلی پریشانی قابل دید تھی۔ انھوں نے وہ لمحات بہت کرب میں گزارے تھے۔

ذاکر صاحب بنیادی طور پر تعلیم و تعلم کے آدمی تھے اور وہ چاہتے تھے کہ
طلبہ میں تعلیم کے ساتھ نظم و ضبط۔ توازن اور تربیت نیز حفظ ما تقدم کے علاوہ خود

کفالتی کی ذہنیت بھی پیدا ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابتدا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہی
کردی تھی مگر اسے اعلا درجہ پر پہنچانے کی سبیل علی گڑھ آکر کی۔ چنانچہ بہار کے ایک
طالب علم عبدالحفیظ اور امروہہ کے ایک طالب علم سید حسین رضا نقوی نے اس تحریک میں
خاصی دلچسپی ظاہر کی۔ SELF HELP اس کا نام رکھا گیا۔ وائس چانسلر نے ان کے
جذبے کی قدر کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے بہت سے لڑکے چھوٹے موٹے
کام کرکے اپنی کفالت خود کرنے کے عادی ہو گئے۔ بعد میں انھوں نے نام بھی کمایا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا ذاکر صاحب بنیادی طور پر تعلیم و تعلم والے شخص تھے۔
سچے اور پاک باز مسلمان۔ سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اور جس وقت بھی انھوں
نے سیاست سے کام لیا۔ وہاں ان کو خسارہ اٹھانا پڑا۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی کی
وائس چانسلری کے آخری لمحہ پران سے جو فعل سرزد ہوا اس پر وہ زندگی بھر متاسف
رہے۔ جس کا اظہار انھوں نے بھی ایک موقع پر کیا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جس
کی نشان دہی اپنے مقدمہ "حیات ذاکر" میں کی ہے اور سچ یہ ہے کہ انھوں نے وہ بیان غیر
سیاسی شخص ہونے کی بنا پر دیا تھا۔ ورنہ ان کی جگہ کوئی اور دوسرا ہوتا تو کوئی ایسی
بات کرگزرتا کہ حکومت وقت کی شکایت بھی ختم ہوجاتی اور وقت بیت کر اس واقعہ کو زمانہ
فراموش کردیتا۔ اگرچہ مورخ کی زبان کبھی بند نہیں ہوتی۔ تذکرہ نگار تذکرہ تو کرے گا
ہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ واقعات کی شدت میں کمی کا آجانا لازمی
و لابدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم سوا اس بات کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ذاکر صاحب
نے ۱۹۴۷ء کے پرآشوب حالات کو مد نظر رکھ کر اگر مسلم یونیورسٹی کی زمام اپنے ہاتھ میں
نہ لی ہوتی تو اس ادارے اور مسلمان قوم کا حشر کیا ہوتا؟ خدا ہی علیم ہے ذاکر صاحب
کا یہ عمل سرسید کے اس کارنامے کی مثل ہے، جب ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو معاشی،
بدحالی، ملکی افراتفری، قتل، غارت گری اور استحصال در استحصال سے واسطہ پڑ رہا تھا۔
اس وقت سرسید نے جو اگرچہ ملکی حالات سے بددل ہو کر ہجرت کی بات سوچ رہے تھے اور
مصر کو اپنی آخری آرام گاہ بنانے کی سوچ رہے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے آپ کو نہ دیکھ کر
قوم پر نظر کی اور جی جان سے لگ کر ایسی خدمت قومی سرانجام دی کہ باید و شاید۔ ذاکر
صاحب نے ٹھیک سو سال بعد سرسید ثانی بن کر اور اس درس گاہ علمی کے ناموس کو

بن کر خدمت کی۔ جسے ہم ناقابل فراموش کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ وہ اس مادرِ درس گاہ کی خدمت کرتے کرتے ہی ختم ہوں اور اس کی زمین ہی کو اپنی آخری آرام گاہ بنائیں۔ باغی بیٹے نکالے گئے دوسری بستی بساتے میں ایک ربع صدی کاٹ دی مگر اس مادرِ علمی کی طرف سے دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ بن باس میں بھی دل اس میں اٹکا رہا۔۔۔۔ امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سرِ شوریدہ کو یہیں پائیں آسائش نصیب ہو جائے گی۔ مگر یہ مقدر نہ تھا۔ (ایک تقریر) اور یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی' مگر جس طرح سیاست نے مسلمان قوم سے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کو چھین لیا۔ اسی طرح مسلم یونی ورسٹی کے فدائی ڈاکٹر حسین خاں کو ملکی سیاست نے چھین لیا۔ یہاں تک کہ وہ نہ مسلم یونی ورسٹی کے آدمی رہے نہ ہی اردو زبان کے فدا کار۔ نہ مسلمان قوم کے فرد رہے بلکہ پوری ہندستانی قوم کے فرد بن کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ ۶۹ء میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہی اور مسلم یونی ورسٹی کی سرزمین کے بجائے اپنی ہی بسائی ہوئی آبادی جامعہ نگر کو آخری آرام گاہ بنا لیا۔

ڈاکٹر جاوید وششٹ

ذکرِ ذاکر صاحب

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم بھارت کے تیسرے راشٹرپتی تھے۔ دوسرے لفظوں میں بسرے صدر جمہوریہ ہند تھے۔ اس سے پہلے وہ اُپ راشٹرپتی یعنی نائب صدر بھی رہ چکے تھے ہم انھیں احترام اور پیار سے "ذاکر صاحب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ ماہرِ تعلیم اور شفیق ستاد تو تھے ہی، گاندھی جی کے نظریۂ اخلاقیات و تعلیمات سے بھی بہت متاثر تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے گاندھی جی کے نظریۂ تعلیم کی روشنی میں ایک قومی تعلیمی اسکیم بھی تیار ا تھی۔ مگر افسوس حکومتِ ہند نے اس پر عمل نہیں کیا۔ ذاکر صاحب قومی ادارہ جامعہ ملّیہ سلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی کے اوّلین معماروں میں سے ایک تھے۔ جامعہ سے ان کا رشتہ خر تک استوار رہا ؎

مومن باعمل تھا دیوانہ درس لیتا تھا آکے فرزانہ
وہ کہ استاد تھا، معلّم تھا رازداں کائنات و فطرت کا

سادگی سے زندگی بسر کرنا اور اونچے وچاروں اور بلند خیالات پر عمل پیرا ہونا ہی ذاکر صاحب ی زندگی کا نصب العین یعنی آدرش تھا۔ ان کی سادگی کبھی پُرکاری نہیں بنی۔ ان کی سادگی میں معصومیت، سنجیدگی اور نفاست جھلکتی تھی۔ وہ انسان دوست تھے۔ ان کے نزدیک جملہ مذاہب عالم قابلِ احترام تھے۔ وہ مذاہبِ عالم کو مختلف راستے تصوّر کرتے تھے جو ایک ہی منزل پر پہنچتے ہیں۔ منزل ایک اور راہیں انیک ہیں۔ دل آزاری ان کے مشرب میں گناہِ کبیرہ تھا۔ وہ جملہ آفاقی انسانی اعلا قدروں کے پاسبان و علمبردار تھے۔ روحانی، اخلاقی، سماجی اور انسانی

وششٹ آشرم، فتح پور (ہریانہ)

اقدار کے پاس دار تھے۔ ؎

سادگی میں قلندرانہ شان فکر میں ایک دلبرانہ آن
دردِ انسانیت ربا مذہب اور انسان دوستی مشرب
مشترک درد آب و گل میں تھا سارے عالم کا درد دل میں تھا
پیکرِ دوستی، خلوصِ دل مشترک درد کی حسیں منزل

ذاکر صاحب کی شخصیت بڑی پہلو دار اور تہہ دار تھی۔ لیکن مجموعی طور پر وہ اتنی پرکشش تھی کہ سبھی ہماری طرح انھیں "ہمارے ذاکر صاحب" ہی سمجھتے تھے۔ گویا ذاکر صاحب بلا لحاظ مذہب و ملّت، رنگ و نسل پورے عالمِ انسانیت کے تھے۔ ؎

فقر عادت تھی زندگانی کی اسکی جس پہ مہربانی کی
اس نے دھرتی کے درد کو جانا آدمی کے دکھوں کو پہچانا
چھو لیے اس کے تارِ احساسات بات کی جس سے پیار سے کی بات

ذاکر صاحب کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بڑے بڑے رموز و اسرار پوشیدہ ہوتے تھے۔ وہ عاشقِ گلاب تھے۔ بڑی نفاست سے گلاب کی قلمیں لگا کر ان کو شاداب بہاریں عطا کرتے تھے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنی شیروانی میں گلاب کا پھول نہیں سجایا جیسے بھارت کے پہلے پردھان منتری سجاتے تھے یا ہمارے موجودہ راشٹر پتی شری گیانی ذیل سنگھ جی ہمیشہ اپنی شیروانی میں گلاب کا پھول سجاتے ہیں تو نہرو جی کی یاد زیادہ ہو جاتی ہے۔ ذاکر صاحب پھول توڑنا پسند نہیں کرتے تھے تو شاخِ گل پر شاداب گلاب کے دیدار سے ہی ان کی روح مسرور اور شادکام ہو جاتی تھی۔ ؎

تھا بہت وہ گلاب کا عاشق زندگی کی کتاب کا عاشق
خود بنا کر گلاب کی کیاری زندگی کی چمن طرازی کی
اپنے ہاتھوں سے کیاری کیاری میں دوستی کی لگائی تھیں قلمیں
وہ گلابوں کو سینچتا تو تھا پر سجاتا نہ تھا وہ اپنی قبا

گلابوں کے ساتھ ساتھ سنگریزوں کو پرکھنا اور جمع کرنا بھی ذاکر صاحب کی ہابی تھی۔ یہ دلچسپ تضاد بھی بڑا معنی خیز ہے۔ گلابوں نے انھیں نفاست و تازگی بخشی مگر ان سنگریزوں نے ذاکر صاحب کو کیا دیا؟ میرا خیال ہے کہ چٹانی عزم حیات بخشا اور ان

سنگ پاروں نے ذاکر صاحب کو بنادیا ہے۔
عزم صد ا اجتہاد کا پیکر

و سنگ دونوں ذاکر صاحب کے کردار کی تعمیر میں کام آئے۔ تعضاد کے بغیر تعمیر ناممکن ہے ثال کے طور پر اسکول کی سفید دیوار پر آپ چاک سے کچھ لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ پائیں گے۔ پائیں گے۔ لکھ بھی دیا تو وہ پڑھا نہیں جائے گا لیکن تختۂ سیاہ پر چاک کی تحریر کس قدر نمایاں ہو جاتی ہے یہ تضاد کا ہی ادنا سا کرشمہ ہے۔

گل و سنگ زمانے کے سرد گرم کا اشارہ یہ بھی ہے۔ گل نرمی اور سنگ سختی کی علامت ہے۔ یہ نرمی اور سختی کردار کی معمار ہیں۔ نرمی بزم اور سختی رزم کی نشانی بھی ہے۔ ہماری زندگی زم و رزم سے عبارت ہے۔ حق کی طرفداری میں انسان کو چٹان کی طرح سنگین اور اٹل رہنا پڑتا ہے۔ دنیا جہان کے شہیدوں نے حق پرستی کے لیے جاں نثار و جاں بازی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اپنا سر کٹا کر۔ اور اس طرح حق گوئی اور بیباکی کی زندگی مثالیں قائم کی ہیں۔ یہ سختی مومن کا کردار پیش کرتی ہے ؎
مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اب آپ سمجھے ذاکر صاحب نے سنگریزوں سے کردار کی صلابت حاصل کی اور گلابوں نے بر نو، تازہ بہ تازہ حیاتِ رنگین کے دروازے کھول دیے۔ زندگی کو گلابوں سے شرنگار ملا رنگ و بو کی لطافتیں ملیں، باغ جنّت کی بشارت حاصل ہوئی۔ ذاکر صاحب گل و سنگ کے مابین توازن قائم کرکے ایک ایسی شخصیت کے روپ میں ابھرے جس نے ہمارے دیس کو ایک بالغ نظر مفکر، قوم پرور شفیق استاد اور ماہر تعلیم دیا جس نے صلہ و ستائش سے بے نیاز ہو کر، خدمتِ خلق کو ہی اپنا مشن بنایا اور ذاکر صاحب اپنے مشن میں کامیاب و کامراں رہے۔

ذاکر صاحب کی ہر دلعزیز شخصیت ایک سبق یہ بھی سکھاتی ہے کہ گلاب کی سُندر کومل کلی سے سختیِ سنگ تک، گل و سنگ میں ایک توازن قائم کرنا یعنی متوازن زندگی بسر کرنا ہی معراجِ انسانیت ہے۔ جس نے گل و سنگ کے مفہوم کو جان لیا، وہ گیانی ہوا۔ اسے عرفان حاصل ہو گیا۔ گل کی رنگینی اور سنگ کی سنگینی کے پردوں کو اٹھا کر ہی ذاکر صاحب کا دیدار کیا جا سکتا ہے
اس گل و سنگ کو سمجھیے،　　ذاکر صاحب سمجھ میں آجائیں گے

ڈاکٹر رشید الوحیدی



ذاکر صاحب بہت یاد آتے ہیں

میں نے اسی جامعہ میں اسی مبارک شخصیت کو کئی بار دیکھا۔ دور سے قریب سے۔ کچھ واقعات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں جس زمانے میں جامعہ میں بی، اے کر رہا تھا، میری مالی حالت کمزور تھی۔ ذاکر صاحب حکومت ہند کے نائب صدر تھے۔ ایک دن پریشان ہو کر میں نے ان کے سکریٹری کو فون کیا اور ملنے کے لیے وقت مانگا، چوتھے دن ۹ بجے صبح کا وقت مل گیا۔ میں نے ایک درخواست لکھی، جس میں مختصراً اپنی پریشانی اور مطلب کی بات لکھ دی کہ مجھے تعلیم مکمل کرنے کو وظیفہ عنایت فرمائیں۔ ملاقات کی تاریخ پر میں تیار ہو کر ذاکر صاحب کی کوٹھی پر جانے کے لیے نکلا، بس کے انتظار میں کھڑا رہنا پڑا اور جب کوٹھی پر حاضری ہوئی تو سوا نو بج چکے تھے۔ سکریٹری سے ملا۔ اس نے صاف کہ دیا "آپ کا وقت ختم ہو گیا" میں نے بہت اصرار کیا مگر سکریٹری نے یہی صحیح کہا کہ "اب ذاکر صاحب دوسرے کام میں مصروف ہو گئے ہیں"۔ میں نے اجازت لے لی کہ جب صاحب باہر جانے کو نکلیں تو گاڑی پر بیٹھنے سے پہلے میں یہ درخواست دیدوں۔

میں ذاکر صاحب کی گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی ذاکر صاحب باہر آئے بڑھ کر پرچہ دے دیا، ذاکر صاحب نے بڑے سکون سے درخواست پڑھی اور مجھے واپس کرتے ہوئے فرمایا "مگر میں تو اس وقت وظیفہ نہیں دیتا، آپ سے کس نے کہا" میں نے عرض کی "جناب مجھے نہیں معلوم، مجھے تو تعلیم مکمل

رتی ہے' مسکرانے لگے۔ مسکراہٹ سے مجھے کچھ امید بندھی۔ مگر گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے فرمایا۔ ٹھیک ہے! مگر میں کیا انتظام کر سکتا ہوں'۔ میں' مایوس ہو گیا۔ اور حسرت سے ذاکر صاحب کے ظاہری سراپا کو دیکھنے لگا۔ گاڑی میں بیٹھ گئے اور دروازہ بند ہونے سے پہلے "ایک اور ذاکر صاحب" کی آواز آئی، دور سے' بہت دور سے' " کل ملیے"۔ جامعہ ہائر سکنڈری کے ایک پرانے چپراسی کا انتقال ہو گیا تھا۔ طلبہ' اساتذہ اور اسٹاف کے لوگ' نمازِ جنازہ کے بعد جامعہ کے قبرستان میں اسے دفن کر کے واپس آرہے تھے۔ جامعہ میں چھٹی ہو گئی تھی' میں قبرستان سے سیدھے کمرے کی طرف چلا آرہا تھا۔ اچانک ایک لمبی سی جھلملاتی گاڑی میرے قریب آکر رکی۔ دروازہ کھلا' ذاکر صاحب اترے' مجھ سے پوچھا کیا انہیں دفن کر دیا میں نے کہا جی ہاں۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ ذاکر صاحب پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور سے کچھ فرمایا اور گاڑی قبرستان کی طرف روانہ ہو گئی۔

"قرول باغ کی جامعہ" کے ایک پرانے چپراسی کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس چپراسی کی رہائش اوکھلا گاؤں میں تھی، ذاکر صاحب نئی دہلی کی جھلملاتی چمکتی سڑکوں سے گزرتے ہوئے اوکھلا پہنچ گئے۔ دلھن کے غریب باپ سے بغیر ملے ہوئے اندر تشریف لے گئے۔ رخصت ہونے والی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کے ہاتھ میں روپے سے بھرا ہوا ایک لفافہ تھما دیا اور معذرت کر کے واپس تشریف لے گئے۔

جامعہ کی تقسیم اسناد کے جلسے میں ذاکر صاحب ضرور تشریف لاتے تھے۔ امیر جامعہ تو وہی تھے نا۔ مڈل کے بچوں کی تو جیسے عید ہو جاتی تھی۔

ذاکر صاحب سادہ آدمی تھے' چھوٹی نمائش ان میں نہ تھی۔ وہ زبردستی بڑا بننے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب جامعہ کے ایک جلسے میں شریک تھے۔ مغرب کی اذان ہو گئی۔ دوسری صف میں میرے ہی برابر اتفاق سے آکھڑے ہوئے' میں از خود ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا' ذاکر صاحب نے بازو پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔" میاں مل کر کھڑے ہوا کرتے ہیں"۔

کالج میں اسٹوڈینٹ یونین کا جلسہ ہوا، میں نے اس وقت یونین کے صدر منتخب ہونے والے "جاوید صاحب" کا منظوم مزاحیہ تعارف لکھا۔ میں ذرا حد سے گزر گیا۔ یعنی جاوید صاحب کی لمبی کھنچائی کردی۔ صدر جلسہ ذاکر صاحب تھے سنتے رہے سکون سے پوری نظم سنی۔ جب میں مائک سے آنے لگا مسکرائے ہلکی سی آواز سنائی دی " زیادتی کردی "۔

ابتدائی مدرسہ ذاکر صاحب کی اصل جامعہ ملیہ تھی۔ اسی ابتدائی مدرسے کے صحرا اور ریگستان میں وہ یورپ سے ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے علاوہ اور آپا جان کو لائے تھے۔ اسی ابتدائی مدرسے کو وہ نہایت فخر سے مہمانوں کو دکھلاتے تھے۔ یہ ان کی محبت، ان کی جدوجہد کا میدان تھا۔ نئے سے نیا پروجکٹ، قسم قسم کے تعلیمی و تدریسی پروگرام، عملی نظام تعلیم و تربیت، کھیل و رزش غرض کیا کیا حوصلہ تھا جو ذاکر صاحب اس اسکول کو دیتے رہے۔ آج وہ عطا کیے ہوئے نمونے اپنی اصلی حالت میں نہ سہی۔ تو اس میں کیا تعجب، آج وہ جامعہ ہی کہاں رہ گئی !!!

اللہ پاک ذاکر صاحب پر قیامت تک رحمتیں نازل فرمائے ●

ذاکر صاحب

یادوں کے آئینے میں

ایک بلند پایہ ماہر تعلیمات اور مفکر معاشیات، قومی و ملی درد سے سرشار ایک مثالی محب وطن
،، سنجیدگی اور متانت سے بھرپور ایک پیکر اخلاص غرض کہ ذاکر صاحب کو دیکھ کر
اقبال کے " مردِ مومن " کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی تھی۔

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہو کر جب ذاکر صاحب تشریف لائے تو میں ایم اے
شیات) کا طالب علم تھا۔ چونکہ موصوف خود بھی علم معاشیات کے ماہر تھے اس لیے اکثر شعبۂ
یات میں تشریف لاتے تھے چنانچہ موصوف کا شرفِ تلمّذ مجھے بھی حاصل ہوا۔

سرسید ہال میں ذاکر صاحب کو استقبالیہ دیا گیا تو ہمارے پرووسٹ پروفیسر شفیع نے
بالیہ تقریر کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ اس وقت ذاکر صاحب کی کتاب "معاشیات قومی"
ام پر آ چکی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کئی بار اس کتاب کا حوالہ دیا اور یوں بھی ذاکر صاحب
خدمات کو مختلف پہلوؤں سے سراہتے ہوئے شاید لفظ "قومی" کا ضرورت سے زیادہ
سال کر گیا تھا۔ ڈنر ختم ہونے کے بعد جب ذاکر صاحب جانے لگے تو ان کی مشفق نگاہیں مجھے
اکر رہی تھیں اور میں سینیئر طلبا ر کے ہجوم میں موصوف کے پیچھے چل رہا تھا۔ انھوں نے
سر شفیع سے پوچھا " قومی کدھر گئے "
صاحب کو سمجھنے میں کچھ دیر لگی تو ذاکر صاحب نے وضاحت کی " وہ صاحب زادے جو تقریر
ہے تھے "
گے بڑھ کر حاضر ہوا تو موصوف نے مجھ سے بھی اجازت طلب کی۔

اسی دن سے میں نے عطیۂ استاد جان کر اپنے نام کے ساتھ لفظ " قومی " کا اضافہ کر لیا۔

ایک دن اسٹریچی ہال کے پیچھے سے ہو کر میں مٹن لائبریری جا رہا تھا۔ اپنے سینیر ہونے کے زعم میں شیروانی کے سارے بٹن کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اچانک دوسری طرف سے ٹہلتے ہوئے ذاکر صاحب نکل پڑے۔

میں نے سٹ پٹا کر سر نیچے کر کے کترانے کی کوشش کی تو فوراً ایک وزن دار آواز آئی۔ میرے پیر کانپ گئے۔

" السلام علیکم ادھر آئیے "

میں چار و ناچار موصوف کے قریب گیا تو انھوں نے میرا حال پوچھا۔ کچھ ہاسٹل کے مسائل پوچھے کچھ شعبۂ معاشیات پر سوالات کیے۔ کچھ لائبریری کا تذکرہ کیا ——— اور آخر کار میرے کندھے شفقت پدری سے ہاتھ رکھ کر فرمایا " اچھا جائیے۔ سلام علیکم "

ایک قدم آگے بڑھ کر میں نے دیکھا سارے بٹن بند تھے۔ سوالات کے دوران ہی ذاکر صاحب نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک کر کے میری شیروانی کے سارے بٹن بند کر دیے تھے۔ اس دن کے بعد سے علی گڑھ میں آخر وقت تک میں شیروانی کے بٹن کھول کر نہیں نکلا۔

میں ایم اے کے آخری سال میں تھا۔ ایک روز بڑی موسلا دھار بارش ہوئی۔ علی گڑھ کی دیرینہ روایتوں میں " مڈ رائٹ " (MUD RIOT) یعنی ہنگامۂ کیچڑ بھی ایک انوکھی روایت تھی سر سید ہال کے سینیر طلبا کی ایک ٹولی پانی میں بھیگتے اور ایک دوسرے پر زمین سے اٹھا کر کیچڑ پھینکتے ہوئے ہاسٹل سے باہر نکل پڑے۔ ہنگامہ کرتے ہوئے ہم لوگ وی سی ہاؤس پہنچ گئے۔ ذاکر صاحب سے ملنے کی خواہش تھی، مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ موصوف کی طبیعت ناساز ہے۔ ہم لوگ واپس ہونے لگے تب تک کسی طرح انھیں ہماری ہنگامہ آرائی کا علم ہو گیا۔ اور تیز بخار کے باوجود وہ برآمدے میں آ گئے۔ ہم لوگ بھی سلام کرنے ٹوٹ پڑے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا؛

" میری بیماری اس ہنگامہ آرائی میں آپ کا ساتھ دینے میں مانع ہے "۔

اور اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر کہا کہ اس میں تھوڑی سی مٹی لگا ہی دیجیے۔ آپ لوگوں کو تسلی ہو جائے گی اور سو روپیہ کا ایک نوٹ ہم لوگوں کو دے کر اس تاکید کے ساتھ رخصت کیا کہ فوراً جا کر کپڑے بدلیے پھر آپ سب ایک ساتھ کیفے ڈی پھوس میں جا کر ناشتہ کیجیے۔

سر سید ہال باب اسحاق سے ملا ہوا میرا کمرہ تھا۔ جس کے دروازے پر سفید رنگ کا جالی

ی دار پردہ پڑا رہتا تھا۔ ایک دن جمعہ کی نماز سے واپس ہوتے ہوئے ذاکر صاحب کی نگاہ
ی تو کار سے اتر کر کمرے تک آئے اور دروازے پر دستک دی۔ اندر تشریف لائے ذرا دیر
ھ پھر جانے لگے۔ ہم نے چائے کے لیے روکنا چاہا تو آپ نے پوچھا:
ا آپ لوگ چائے بناتے ہیں بجلی کے ہیٹر سے؟"
وگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا کیونکہ بجلی کے ہیٹر بورڈنگ کے کمروں میں استعمال کرنے کی
ازت نہیں تھی۔

ھبرائیے مت! مجھے تو آپ کے کمرے کا یہ سفید پردہ کھینچ لایا تھا" اور اس کے بعد سے جب بھی
ادھر سے گزرتے چند لمحے ضرور ہمارے کمرے میں گزارتے۔

ذاکر صاحب کہا کرتے تھے کہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اخلاق و کردار کی
یر میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں ۔ ذاکر صاحب ایک انوکھے معلم اخلاق تھے لیکن کبھی
وراست تنقید نہیں کرتے تھے بلکہ اشارات و کنایات کے ذریعے بڑی شفقت سے اصلاح
رتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ موصوف کی معمولی باتیں بھی انسان کے ذہن پر ایک لافانی نقش
ھوڑ دیتی تھیں۔

ذاکر صاحب کی پُرکشش اور مقناطیسی شخصیت کی پرچھائیاں جس خوش نصیب
ر پڑ گئیں ______ اخلاق و کردار کا سرمایہ اس کے ہاتھ لگا۔

صادقہ ذکی



ڈاکٹر ذاکر حسین (ذاکر صاحب)

ذاکر صاحب کا خاندانی اور نسلی تعلق پٹھان قوم سے ہے یہ لوگ اپنی خاندانی اور نسلی آن بان قائم رکھنے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ ہندستان کے شمالی مغربی علاقے سے ذاکر صاحب کے اجداد بھی ہندستان آکر ایک ایسے مقام پر آباد ہو گئے جو بعد میں قائم گنج کہلایا۔ ذاکر صاحب ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد وہاں وکالت کرتے تھے۔

ذاکر صاحب نے ۱۹۱۸ء میں بی، اے اور اقتصادیات میں ایم۔ اے پاس کیا اسی شعبے میں انھیں پڑھانے کا موقع بھی دیا گیا۔ اس دور میں سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی جوہر نے سرکاری اداروں کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کردی تھی۔ ذاکر صاحب اس جدوجہد میں پورے خلوص سے شریک ہوئے۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ چھوڑ کر لال ڈگی پر خیموں میں قائم درس گاہ میں گئے۔ اس کا نام جامعہ ملیہ تھا۔ وہ ۱۹۲۲ء میں معاشیات میں ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے برلن چلے گئے۔ ہندستان سے باہر انھوں نے دنیا کے حالات کو قریب سے دیکھا۔ ذاکر صاحب کے حالاتِ زندگی میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمن قوم کے انتھک کاموں کے جنون کو بھی انھوں نے دیکھا تھا۔ روس میں اشتراکی انقلاب آچکا تھا۔ اِدھر مالی حالات خراب ہونے کی وجہ سے جامعہ ملیہ کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ لہٰذا وہ کچھ تو اس وقت جامعہ میں کام کرنے والوں کے اصرار پر اور کچھ جامعہ کی خستہ حالی کو محسوس کرکے

شعبۂ اردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرکے ہندستان چلے آئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ میں ذاکر صاحب کا عظیم کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے ایسے نازک دور میں اس کے وجود کی حفاظت کی۔ وہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر "شیخ الجامعہ" مقرر ہوئے۔ پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر سید عابد حسین ان کے ساتھیوں میں تھے۔

جامعہ کی حالت سدھارنے کو۔ مالی کمیٹیاں بنائیں۔ درس وتدریس کا نیا تجرباتی کام شروع کیا۔ "حیاتی اراکین" کا سلسلہ قائم کیا جس میں کارکنوں نے بیس برس تک کم تنخواہ پر کام کرنے کا عہد کیا۔

۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے "قومی بنیادی تعلیم" کی اسکیم بنانے کا منصوبہ ذاکر صاحب کے سپرد کیا۔

چنانچہ تعلیمی تجربوں میں کسی نہ کسی صنعت کو مرکز بنا کر پریکٹیکل تجربوں کے ذریعے تعلیم دی جانے لگی۔ تاکہ بچے ہاتھ کے کام کا ہنر بھی سیکھیں اور روزی کمانے کا سلیقہ بھی آئے۔ ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ اس ہنرمندی کے ساتھ انسانی خوبیوں کا قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ ہنرمندی سے بُرے کام بھی کیے جا سکتے ہیں۔ چور اور ڈاکو بھی بڑے ہنرمند ہوتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات میں سب سے زیادہ توجہ انسان کے کردار پر دی گئی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہمارے تعلیمی ادارے "انسانیت" کا احساس اور متواتر کام کرنے کی لگن پیدا کریں تو سماج ترقی یافتہ بھی ہوگا اور صحت مند بھی۔ اور یہ استادوں کا فرض ہے۔ اس لیے کہ ان کے لیے صرف علم اور ہنر کا ماہر ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کے زندگی کے سرورق پر محبت کا عنوان ہونا چاہیے۔ وہ طبیعت کی جس تبدیلی کا تقاضا کرتے ہیں وہ ایک یا دو دن کی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ کردار میں انسانی حسن پیدا کرنے کے لیے پوری زندگی کوشش کرتے رہنے کی بات ہوتی ہے۔ اسی طرح قومیں اپنے وجود میں خوبیاں پیدا کرتی ہیں۔

ایک طرف تعمیری پروگرام چل رہا تھا اور دوسری طرف سماج میں

مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے لیے نفرت اور دشمنی پھیل رہی تھی۔ اس پس منظر کے لیے ذاکر صاحب نے کہا تھا۔ "آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے" لیکن ذاکر صاحب نے اپنی چمن بندی کو جاری رکھا۔ ۱۹۴۵ء میں جامعہ کے پچیس سال پورے ہوئے ۔۔۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ بھی فرقہ پرستی کی زد میں تھی اس لیے ذاکر صاحب کو ۱۹۴۸ء میں وہاں بھیجا گیا۔ اب وہ اپنے قدیم ادارہ کے وائس چانسلر ہو گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے یونی ورسٹی کے تعلیمی خاکہ کو درست کیا۔ اور وہاں امن کی فضا پیدا کی۔ علی گڑھ کے دور میں پارلیمنٹ کے ایوان بالا کی ممبری یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن، عثمانیہ یونی ورسٹی کی تنظیم نو کی بعض ذمہ داریاں سامنے آئیں ۔۔۔ پنڈت نہرو کی خواہش پر ۱۹۵۷ء میں وہ بہار کے گورنر بنائے گئے۔ پھر ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ اور ۱۹۶۷ء میں جمہوریۂ ہند کی صدارت کے اعلا عہدے پر پہنچے۔ اب ذاکر صاحب کے سامنے محض تعلیمی ادارے ہی نہیں تھے۔ بلکہ پورا ہندستان تھا۔ پوری ہندستانی قوم تھی۔ اب ان کے خیال کا مرکز بھارت اور بھارت واسی ہو گئے تھے۔ ہم ان کے خیالات کو پہلے انسانیت اور پھر قومیت کے دائروں میں دیکھ سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب نے اپنے ملک کے باسیوں کے لیے کہا تھا۔ "سارا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے رہنے والے میرا پریوار" ان کے اس پریوار میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب ہی شامل تھے۔ سب کی محبتیں اور سب کے جھگڑے لڑائیاں اور نفرتیں تھیں۔ انھوں نے کہا تھا۔

"اصل چیز راج نہیں ہے۔ قومی جیون ہے۔ قومی جیون روگی ہو تو راج ملا ملایا بگڑتا ہے۔"

سچ بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب سمجھتے تھے کہ کام کرتے رہنے کے لیے آزادی قائم رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا۔ آپ آزاد ہیں۔ لیکن آزادی کی قیمت دینا نہیں چاہتے۔ آزادی کی قیمت ہوتی ہے اس کے لیے مسلسل کوشش کرنا۔ آزادی کو حاصل کرنا جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ مشکل اس کا باقی رکھنا ہے۔

ذاکر صاحب نے بیعت کے اپنے عمل سے ادا کی۔ انھوں نے بڑی تعداد میں
خطبات دیے۔ ان کا نکھرا ہوا ادبی ذوق اور بچوں کے لیے خوبصورت کہانیاں
اس کی مثال ہیں۔ آزادی اور دیگر موضوع پر انھوں نے بہت سی اچھی کہانیاں لکھیں
ذاکر صاحب اس پھیلی ہوئی دنیا کے رنگ و بو سے بھر دل۔ چنانچہ فنون، ہنرمندوں
فنکاروں۔ مصوروں اور موسیقاروں سے محبت رکھتے تھے۔

بچوں کے ذاکر صاحب

اس کتاب میں ان لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین ہیں جنھوں
نے ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھا برتا۔ ان میں سے کوئی تو ان کا دوست
ہے، کوئی ساتھی۔ کوئی شاگرد ہے اور کوئی جامعہ کا استاد لیکن
ذاکر صاحب کی عقیدت اور محبت میں سب ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان
سب کے علاوہ ذاکر صاحب کی بڑی صاحبزادی
محترمہ سعیدہ خورشید عالم خاں بھی ہیں۔

قیمت : =/6

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵



تبسم زیدی

ذاکر صاحب اور ان کی یاد

دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنی زندگی میں دوسروں کے کام آتے ہیں اور اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد بھی انسانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی دوسروں کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا لکھنا پڑھنا دوسروں کے لیے مثالی بن جاتا ہے۔

انھیں میں جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے، جو کبھی بہار کے گورنر رہے، کبھی نائب صدر اور آخر میں ہندستان کے صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔

ذاکر حسین صاحب نے ۱۹۲۶ء میں جامعہ کو اس وقت سنبھالا، جب جامعہ کا مستقبل ڈگمگا رہا تھا۔ اور اس کو ایک ایسے سرپرست کی ضرورت تھی، جو اسے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر اس کی آبیاری کر سکے۔

۱۹۴۸ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی کا مستقبل خطرے میں تھا اس لیے آپ کو وائس چانسلر بنایا گیا وہاں آپ نے تعلیمی ماحول اور امن کی فضا قائم کی اس کے بعد آپ بہار کے گورنر، نائب صدر جمہوریہ اور پھر صدر جمہوریہ ہند کے عہدوں پر فائز ہوئے

ذاکر صاحب کی ایک ذات میں بہت سی خوبیاں پوشیدہ نہیں۔ وہ ایک ماہر تعلیم فلسفی منتظم، مقرر، قدرت کی نیرنگیوں سے پیار کرنے والے، بچوں کے شفیق اور غریبوں کے ہمدرد تھے وہ ایک سچے اور اچھے ہندستانی تھے تو دوسری طرف ایک اچھے مسلمان بھی کھدر کا کرتا پائجامہ اور شیروانی ان کا لباس تھا

مصطفےٰ لاج جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جس زمانے میں وہ شیخ الجامعہ تھے، تو اپنا کام خود کرنا ہی پسند کرتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ "کام عبادت ہے"۔ بقول رشید احمد صدیقی "جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہر وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اور ذاکر صاحب کیا ہیں۔ اور کیا کر رہے ہیں اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی خوبیوں کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کی خوبیوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ کلرک یہ دیکھتا تھا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں چپراسی یہ پاتا تھا کہ ان سے زیادہ دوڑ دھوپ ذاکر صاحب کرتے ہیں۔ اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں"۔

جامعہ میں ۱۳ اپریل کا دن قومی ہفتہ کی حیثیت سے منایا جاتا تھا۔ اس دن جامعہ میں چھٹی ہو جاتی تھی اور جامعہ کے تمام طلبہ اور اساتذہ مل کر اسکول اور بورڈنگ کی صفائی کرتے تھے۔ خود ہی کھانا پکاتے تھے۔ شام کو نہا دھو کر سب مدرسہ ابتدائی کے صدر دروازے پر ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ یہ دن جلیان والا باغ کی یاد میں منایا جاتا تھا۔ جس سے اس بات کا احساس بھی ہوتا تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔

ذاکر صاحب کو اچھے پھولوں کا بہت شوق تھا اور ان میں بھی گلاب کے پھولوں کے وہ عاشق تھے۔ جب تک وہ جامعہ میں رہے اسکول کے لان میں گلاب کے پھول مہکتے رہے۔ جب بھی وہ ہندستان سے باہر جاتے تو واپسی پر ان کے پاس صرف گلاب کی قلمیں ہوتی تھیں۔ جن کو وہ کیاریوں میں لاکر لگوا دیتے تھے۔

میرے پاپا یہ قصہ سناتے ہیں کہ ۱۹۶۴ء میں جب ان کی نانی کا انتقال ہوا (والدہ مجتبیٰ حسین زیدی صاحب) تو اس وقت ذاکر صاحب نائب صدر جمہوریہ تھے۔ وہ اس خبر کو سنتے ہی گھر پر تشریف لائے اور جب ڈرائیور نے ذاکر صاحب کے آنے کی اطلاع ہمارے دادا جان کو دی اور وہ باہر نکل کر آئے تو دیکھا ذاکر صاحب لان میں گلاب کی کیاریوں کے پاس جھکے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہے ہیں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کسی ملک کے صدر ہندستان آنے والے تھے ذاکر صاحب انھیں گلاب کے پھول دکھانا چاہتے تھے بیچ میں کچھ دن کا وقفہ تھا۔ گلاب کھلنے والے تھے۔ مالی نے آکر کہا کہ صاحب! پھول صدر کے آنے سے پہلے ہی کھل کر مرجھا جائیں گے اس کا کیا علاج ہو۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ کلیوں کو ڈورے سے باندھ دو اور صدر کے آنے سے

ایک دن قبل کھول دیتا۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ اور اس ملک کے صدر ان گلاب کے خوشنما پھولوں کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ ذاکر صاحب کو خوبصورت پتھر بھی جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ جب بھی ہندستان میں یا ہندستان سے باہر جاتے تو نایاب پتھر ساتھ لاتے ان کا خیال تھا کہ پتھر بھی اپنی کہانی خود میں سمیٹے ہوتے ہیں۔

ذاکر صاحب کو کھانے پینے کا بڑا شوق تھا۔ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو دہلی سے علی گڑھ واپس جا رہے تھے۔ دریا گنج سے گزر ہوا تو موتی محل ریسٹورنٹ راستے میں ملا۔ گاڑی رکوائی گئی اور ڈرائیور سے کہا کہ ایک عدد بھنا ہوا مرغا خرید لائیے، چونکہ دل کے مریض تھے، چکنائی منع تھی۔ ڈرائیور نے یاد بھی دلوایا تو کہنے لگے میں کھاؤں گا نہیں علی گڑھ لے جاؤں گا مرغا سیٹ کے پیچھے رکھ دیا گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور نے دیکھا کہ "صاحب" مرغے کی ہڈی چبا رہے ہیں ڈرائیور نے پھر یاد دلایا تو ذاکر صاحب کہنے لگے میں ذرا چکھ رہا تھا لیکن علی گڑھ پہنچنے تک پورا مرغا صاف ہو چکا تھا۔ جامعہ میں جب تک رہے۔ اکثر دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

غریبوں کے بہت ہمدرد تھے۔ جامعہ میں تنخواہیں نہ ملنے کے برابر تھیں۔ لیکن اس کے باوجود غریبوں اور بیواؤں کی مدد ہمیشہ کرتے رہتے تھے۔ شروع مہینے میں لفافوں میں روپے رکھے جاتے اور بہت خاموشی سے غریبوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ نماز روزے کا بہت خیال رکھتے تھے اپنے خاندان والوں سے کہتے تھے کہ رات کے نو بجے کے بعد میرا اور تمہارا رشتہ ختم اور اب میرا اور اللہ کا رشتہ شروع۔ وہ رات نو بجے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی سعیدہ خورشید سے دریافت کیا کہ تم نماز میں کیا دعا مانگتی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں آپ کی صحت، اپنے شوہر کی صحت اور بچوں کی تندرستی کے لیے دعا مانگتی ہوں۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ تم اللہ کے معاملے میں مداخلت کرتی ہو۔ یہ غلط بات ہے تم کو کہنا چاہیے کہ اے اللہ تیری جو مرضی ہو اور جس میں ہماری بہتری ہو۔

ذاکر صاحب اپنے ملازمین کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خاص طور سے اپنے ڈرائیور

اور ذاتی ملازم کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے۔ جب وہ نائب صدر ہند بن گئے تھے اس وقت ان کے جامعہ کے زمانے کے ایک ملازم کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اس نے ذاکر صاحب کو بھی دعوت دی۔ ذاکر صاحب وقت مقررہ پر تشریف لائے۔ اس دن شدید بارش ہورہی تھی۔ ذاکر صاحب نے لڑکی کو تحفے اور دعاؤں سے نوازا۔ جامعہ میں آنے کے بعد وہ اپنے باڈی گارڈ وغیرہ کو ہٹا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ میں اب جامعہ برادری میں آگیا ہوں۔ اب آپ لوگوں کا کوئی کام نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جامعہ ملیہ اور جامعہ برادری نے ان کو اپنی آغوش میں جگہ دی اور وہ یہاں ابدی نیند سو رہے ہیں اور ان کا وہ خواب جو انھوں نے ۱۹۲۶ میں دیکھا تھا پورا ہوگیا۔

ملاقات : اختر الواسع



ذاکر صاحب کی زندگی

کے ہولناک واقعہ کی کہانی ذاکر صاحب کے ایک پرانے خادم منظور احمد صاحب کی زبانی

منظور صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرانے کارکنوں میں سے ایک ہیں۔ یہ کوئی بارہ تیرہ سال کی عمر میں جامعہ آئے جہاں ان کے بھائی عبدالغفور صاحب ذاکر صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ منظور صاحب جب جامعہ آئے تو ذاکر صاحب کے ساتھ ہی رہے اور مہینے دو مہینے بغیر تنخواہ کے ذاکر صاحب کی خدمت میں گزار دیے۔ ۱۹۴۵ء میں جب ذاکر صاحب لندن جانے لگے تو اپنے سکریٹری جناب سید مجتبےٰ حسین زیدی سے کہہ گئے کہ "منظور کو دفتر میں لگا لینا" اس طرح یکم نومبر ۱۹۴۵ء سے منظور صاحب جامعہ سے وابستہ ہیں۔ جب وہ جامعہ آئے تو خود ان کے بقول "یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جامعہ میں فقر و فاقہ کا دورہ تھا اور ذاکر صاحب بھی فقیرانہ زندگی گزارتے تھے"۔ ذاکر صاحب کو جو عظمت ملی، منظور صاحب کا کہنا ہے کہ "وہ بیگم ذاکر حسین کی قربانیوں کے نتیجہ میں ہے۔ یہ بیگم صاحبہ کی خوبی تھی کہ انھوں نے کبھی ذاکر صاحب کو گھر کے لیے پریشان نہ ہونے دیا"۔

۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی منائی گئی تھی اس کے بعد ذاکر صاحب ڈاکٹروں کے مشورے پر کشمیر کے لیے دلی سے روانہ ہوئے لیکن جالندھر کے اسٹیشن پر وہ فسادیوں کی زد میں آگئے۔ اس سفر میں منظور صاحب ان کے ساتھ تھے۔ ہم نے منظور صاحب سے اس واقعہ کی تفصیلات پوچھیں تو انھوں نے جو کچھ بتایا اس کو ہم انھیں کے الفاظ میں (اپنی کوشش بھر) پیامیوں کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

" ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی کے انتظامات میں ذاکر صاحب اس قدر تھک

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

گئے رہتے کہ ڈاکٹروں نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ پہاڑ پر جاکر کچھ دنوں آرام کریں۔ رات دن جاگتے رہنے اور لکھنے پڑھنے کا کام بہت زیادہ کرنے کی وجہ سے ذاکر صاحب کی آنکھ کی پرانی تکلیف نے بھی زور پکڑ لیا تھا۔ اس لیے ذاکر صاحب آرام کے لیے راضی ہو گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ جب انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں چلنا چاہیے۔ تو میں نے کہا کہ میاں کشمیر چلیں۔ میرا ابھی بڑا ارمان ہے پورا ہوجائے گا" (یہ عجیب بات ہے کہ میں آج تک کشمیر نہ دیکھ سکا) ذاکر صاحب تیار ہو گئے اور ہم لوگ دلّی سے کشمیر کے لیے ریل سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں کسی اسٹیشن پر کپور صاحب نام کے ایک دہلی کے باشندے ملے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔ جب میں نے کہا جی ہاں تو انھوں نے جالندھر کے فضل حق نامی ایک صاحب کو جو بڑے رئیس تھے اور اسی ٹرین کے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے خبر دی۔ ڈاکٹر صاحب کے نام کی کشش یہ تھی کہ فضل حق صاحب فرسٹ کلاس چھوڑ کر ذاکر صاحب کے پاس سیکنڈ کلاس میں چلے آئے اور باتیں کرتے رہے۔ فضل حق صاحب نے ذاکر صاحب سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ جالندھر چل کر رہیے۔ میں پھر وہاں سے آپ کو کشمیر بھجوانے کا انتظام کر دوں گا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ اگر لدھیانہ پر کوئی انتظام نہ ہوا تو جالندھر چلیں گے۔ جب گاڑی لدھیانہ پہنچی تو اسٹیشن پر سناٹا تھا۔ ذاکر صاحب نے اسٹیشن ماسٹر سے جب جمّوں کی گاڑی کے بارے میں پوچھا تو اس نے جان بوجھ کر کہا کہ تمھارا انتظام تو جالندھر میں ہوگا۔ اس وقت تو اس بات کو ذاکر صاحب نہ سمجھ پائے لیکن جب جالندھر پہنچے اور ٹرین رکتے ہی فسادیوں کی ایک جماعت نے گورکھا فوج کی موجودگی کے باوجود ہمارا سامان چھین لیا اور ہمیں باہر چلنے پر مجبور کیا تبھی دہ دلّی والے کپور صاحب بھاگے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے اور انھوں نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ ان فسادیوں کو روکو۔ یہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو لے جا رہے ہیں۔ اگر انھیں کچھ ہوگیا تو غضب ہو جائے گا۔ تب اسٹیشن ماسٹر نے اپنے کمرے میں ذاکر صاحب، فضل حق صاحب، فضل حق صاحب کے بیٹے اور مجھے بلا لیا۔ وہاں پر تین سکھ نوجوانوں نے ذاکر صاحب سے کہا کہ آپ باہر مت جائیے گا۔ یہ غنڈے اسٹیشن سے باہر لے جاکر لوگوں کو جان سے مار دیتے ہیں اس پر اسٹیشن ماسٹر غصّے ہو گیا۔ اور

اس نے ان نوجوانوں کو اپنے کمرے سے باہر نکال دیا ۔ شاید اس کی بھی فسادیوں سے ملی بھگت تھی۔اتنے میں ڈاکٹر صاحب کو گورکھا رجمنٹ کا کپتان جس کا نام سردار گوردیال سنگھ تھا نظر آ گیا ذاکر صاحب اس کی طرف لپکے اور اسے اس قدر ڈانٹا کہ تمہاری اور تمہارے ان فوجیوں کی کیا ڈیوٹی ہے ؟ یہ کیا ہو رہا ہے ؟ اس سے پہلے کہ کپتان گوردیال سنگھ کچھ کہتے دلی والے کپور صاحب آئے اور انھوں نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں ۔ وہ بھی شاید نام سے واقف تھا ۔ اس نے فوجیوں کو ہماری حفاظت کا حکم دیا جو تھوڑی دیر پہلے فسادیوں کے حکم پر ہمارے سینے پر بندوقیں تان چکے تھے، اور خود ہمارا اسامان تلاش کرنے چلا گیا ۔ تھوڑی ہی دیر میں واپس آ کر بولا کہ سامان کی فکر چھوڑیے، جان کی فکر کیجیے ۔ کیونکہ حالات بہت خراب ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں ۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا مجھے سب پر بھروسا ہے اور وہ ہم لوگوں کو لے کر اسٹیشن سے باہر نکلا تو ہر طرف فسادیوں کی بھیڑ تھی اور عمارتوں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور سڑکوں پر سامان جلائے جا رہے تھے ۔ ذاکر صاحب کی شیروانی اور داڑھی کو دیکھتے ہی بھیڑ ہماری طرف آئی لیکن کپتان نے ہمارے قریب نہ آنے دیا اس پر فسادیوں نے کہا یہ ہمارے آدمی ہیں ان کو آپ کہاں لے کر جا رہے ہیں ۔ کپتان نے کہا ان سے میں نے وعدہ کیا ہے میں ان کو لے کر جاؤں گا تو فسادیوں نے کہا کہ آپ ان کو کچھ دور لے جا کر چھوڑ دیجیے ۔ اس پر اس نے خفا ہو کر کہا کہ آپ لوگ میری بات نہ مانیں گے تو میں گولی چلوا دوں گا ۔ اور وہ ہمیں ایک ٹرک میں لے کر روانہ ہوا ۔ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ فضل حق صاحب نے کہا کہ مجھے میری کوٹھی پر چھوڑ دیجیے ۔ اس پر کپتان نے کہا یہاں اب کس کی کوٹھی ہے آپ میرے ساتھ چلیے میں آپ کو صحیح جگہ پر لیے چل رہا ہوں ۔ کچھ دور چلنے کے بعد فضل حق صاحب نے کہا کہ جج صاحب کی کوٹھی پر چھوڑ دیجیے ۔ جج صاحب کا نام سنتے ہی اس نے ٹرک کو روکا اور یہ کہا کہ میں پہلے دیکھ لوں کہ وہ ہیں بھی یا نہیں ۔ معلوم ہوا جج صاحب کوٹھی میں تھے ۔ اس نے جا کر جج صاحب کو ساری بات بتائی اور کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین باہر ہیں تو جج صاحب جن کا نام بیدی تھا ۔ (مشہور صحافی اور ادیب دیوان بریندر ناتھ' ظفر پیامی کے بڑے بھائی) ننگے

یا لو' دوڑتے ہوئے باہر آئے اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب اس آگ میں آپ کہاں؟ اور پھر اس بیچ میں ذاکر صاحب کی شیروانی اور داڑھی کو دیکھتے ہی ایک بھیڑ جمع ہوگئی لیکن کپتان گوردیال سنگھ نے ان لوگوں کو دور تک رگید کر بھگا دیا۔ بیدی صاحب ہم سب کو بڑی عزت کے ساتھ گھر میں لے گئے۔ کپتان گوردیال سنگھ نے ذاکر صاحب سے پھر کہا کہ اگر آپ کو اطمینان ہو تو آپ رکیں ورنہ میرے ساتھ چلیں۔ ذاکر صاحب نے پھر وہی جواب دیا "مجھے سب پر بھروسا ہے" بیدی صاحب اور ان کی بیوی نے ذاکر صاحب سمیت ہم سب کی بڑی تواضع کی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ فضل حق صاحب کی کوٹھی پر انھوں نے گیروے کپڑے پہنا کر اپنے ملازموں کو بھیج رکھا تھا تاکہ کوٹھی بچی رہے اور لوگ یہی سمجھیں کہ یہ کسی مسلمان کا گھر نہیں بلکہ سادھوؤں کا ڈیرا ہے۔ بعد میں فضل حق صاحب کو انھوں نے عزت کے ساتھ پاکستان بھجوا دیا۔ یہ بات مجھے میاں نے ہی بعد میں بتائی۔ دوسرے دن۔ بیدی صاحب اور ان کی بیگم کے اصرار کے باوجود ذاکر صاحب وہاں نہ رکے اور دلی کے لیے واپس لوٹنے کی ضد کرتے رہے۔ بیدی نے مسلح پولیس والوں کے ساتھ جو سب کے سب سکھ تھے اپنی کار میں ہمیں جالندھر چھاؤنی کے اسٹیشن پر بھیجا اور ان پولیس والوں کو ہدایت کر دی کہ بہ حفاظت انھیں ریل تک پہنچانا اور ریل کے ڈبے کے دونوں طرف کھڑے ہو کر دیکھ بھال کرنا کہ کوئی بھی ان کے ڈبے میں چڑھ نہ سکے۔ ہم بیدی صاحب کی کوٹھی سے جالندھر کینٹ کے اسٹیشن جا رہے تھے کہ کپتان گوردیال سنگھ ہمیں اپنے فوجی ٹرک میں آتے ہوئے راستے ہی میں مل گئے اور انھوں نے گاڑی رکوا کر ذاکر صاحب سے کہا آپ کیوں جا رہے ہیں میری بیوی نے تو آپ کو رات کے کھانے پر بلایا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نہ ملتے اس نے کہا کہ میں کچھ روپے لایا ہوں جو سفر میں آپ کے کام آئیں گے۔ ذاکر صاحب نے روپے نہ لیے اور کہا کہ پیسے میرے پاس ہیں مجھے فکر اس بات کی ہے کہ جو آگ آج یہاں لگ رہی ہے وہ کل دہلی بھی پہنچے گی۔ اس طرح ہم جالندھر کینٹ کے اسٹیشن پر آ گئے۔ سکھ سپاہیوں نے ہمارا پورا ساتھ دیا۔ وہاں سے روانہ ہو کر گاڑی لدھیانہ اسٹیشن آئی اور وہاں چھ گھنٹے تک کھڑی رہی کیونکہ آگے اس سے پہلے ایک گاڑی لٹ چکی تھی اور اس گاڑی کا انتظار ہو رہا تھا۔ اس لیے اسٹیشن

ماسٹر نے اس گاڑی کو آگے جانے سے روک دیا۔ اس بیچ میں ایک جوان آگیا اور ذاکر صاحب کے پیروں میں گر پڑا۔ جب ذاکر صاحب نے اٹھایا تو اس نے کہا میرا نام (اگر مجھے صحیح یاد ہے تو) موتی لال ہے اور آپ تو میرے استاد کے استاد ہیں میں آپ کے ساتھ اس ڈبے میں دہلی تک جاؤں گا اور آپ پر کوئی آنچ آنے سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گا۔ اسی بیچ میں وہ تین سکھ نوجوان بھی وہاں آگئے جنھوں نے ایک دن پہلے جالندھر اسٹیشن پر ذاکر صاحب سے کہا تھا کہ آپ باہر مت جائیے گا۔ ان تینوں نے ذاکر صاحب سے کہا کہ ہم بھی آپ کے ساتھ دلی تک جائیں گے اور آپ پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ اس بیچ میں ذاکر صاحب کی شیروانی اور داڑھی کو دیکھ کر کچھ مسلمان بھی وہاں آگئے۔ اور انھوں نے ذاکر صاحب سے کہا آپ اس گاڑی میں مت جائیے فسادی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ نہیں میں اس گاڑی سے واپس جاؤں گا چاہے کچھ بھی حشر کیوں نہ ہو کیوں کہ یہ گاڑی چلی گئی تو میں پچھتاتا ہی رہ جاؤں گا۔ خیر چھ گھنٹے کے بعد یہ گاڑی لدھیانہ سے روانہ ہوئی اور رات کے تین بجے ہم لوگ پرانی دلی کے اسٹیشن پر پہنچے۔ دلی پہنچ کر میں نے کہا کہ میں جامعہ ٹیلیفون کیے دیتا ہوں گاڑی آجائے گی مگر ذاکر صاحب راضی نہ ہوئے اور کہا رات میں کیوں سب کو پریشان کرتے ہو ــ رات کا بقیہ حصہ بلیماران کے مسافر خانہ میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک ہوٹل کی چھت پر کھرّی چارپائی پر بکریوں کے بیچ گزارا اور صبح پہلی بس سے ہم لوگ اوکھلا واپس آئے اور جب گھر پہنچے تو سب حیران رہ گئے کہ میلے کپڑوں میں خالی ہاتھ ہم لوگ اتنی جلدی کیوں واپس آگئے۔ جب سارا واقعہ گھر والوں کو معلوم ہوا تو سب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہماری جان بچائی اور ہم خیر سے گھر واپس آئے ●●

ملاقات: اختر الواسع

ذاکر صاحب

جامعہ کے ایک پرانے کارکن بتو بھائی کی نظر میں

نام تو ان کا حبیب احمد ہے لیکن جامعہ میں آکر اگر یہ نام بتا کر آپ ان سے ملنا چاہیں تو شاید بڑی مشکل ہوگی کیونکہ جامعہ کا ہر چھوٹا اور بڑا انھیں بتو بھائی کے نام سے جانتا ہے۔ بتو بھائی رہنے والے تو موضع سرٹیاں رستم خاں کے ہیں لیکن ان کی ننھیال موضع داعی پور، قنوج ضلع فرخ آباد ہے اور ننھیال کے اسی واسطے سے یہ جامعہ تک پہنچے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تین بڑے معماروں میں سے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب بھی موضع داعی پور ہی کے رہنے والے تھے۔ بتو بھائی کے ایک چچا حسینی صاحب کی قرولباغ میں جامعہ کے قریب ہی سبزی کی دکان تھی اپنے انھیں چچا کے بلانے پر بتو بھائی ۱۹۲۷ء میں دِلّی چلے آئے اور عابد صاحب کے یہاں رہنے لگے۔ دس سال تک عابد صاحب کے یہاں گھر کی ذمہ داری انجام دیتے رہے اور پھر ۱۹۳۷ء میں جامعہ کی ملازمت میں آگئے۔ یہاں حافظ فیاض صاحب نے جو اس وقت رجسٹرار تھے ان کا دو روپے زیادہ تنخواہ پر تقرر کر دیا۔ تقریباً چالیس سال کی طویل مدّت تک جامعہ کی ملازمت کر کے ۱۹۷۷ء میں بتو بھائی ریٹائر ہوئے۔ ہم نے پوچھا "بتو بھائی آپ نے ذاکر صاحب کو سب سے پہلے کب دیکھا تھا؟" بتو بھائی نے جواب دیا۔ "۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۷ء تک میں نے ذاکر صاحب کو عابد صاحب کے یہاں مجیب صاحب سمیت اکثر آتے جاتے دیکھا۔ اور جب یہ تینوں آپس میں ملتے تو ایسی محبت اور پیار ان میں دیکھنے کو ملتا جیسے یہ ماں جائے ہوں۔"

سوال:۔ کیا آپ کو ذاکر صاحب کا کوئی خاص واقعہ بھی یاد ہے؟

جواب:۔ ۱۹۴۴ء میں میں نے ایک تانگہ خرید لیا تھا جس میں اکثر ذاکر صاحب

شہر میں ہونے والی میٹنگوں یا دیگر کاموں سے جایا کرتے تھے ورنہ بس سے سفر کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں گوالیار کی دو بسیں اوکھلے سے فوارے (پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن) تک چلا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ذاکر صاحب بس کے انتظار میں گھر سے آکر دفتر (جہاں آج جامعہ کی ڈسپنسری ہے) کے پاس کھڑے تھے کہ بس آئی اور تیزی سے آگے نکل گئی ڈرائیور نے شاید ذاکر صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ ذاکر صاحب کو بھی کچھ غصہ آگیا کہنے لگے کہ وہ جب تک نہیں جائیں گے جب تک بس واپس نہیں آئے گی۔ اس پر ان کے عزیز بھتیجے رحیم الدین خاں صاحب (جواب پاکستان میں لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین خاں گورنر صوبہ سرحد ہیں) جو جامعہ ہی میں پڑھتے تھے بھاگے ہوئے گئے اور بس واپس لے کر آئے تب ذاکر صاحب شہر گئے۔

سوال:۔ ذاکر صاحب کے گھر میں بھی آپ کا آنا جانا رہتا تھا۔ اس کے بارے میں بھی کچھ بتائیے؟

جواب:۔ ذاکر صاحب کی بیگم صاحبہ ہمیشہ بڑی مہربانی اور محبت سے پیش آتی تھیں اور آج بھی اسی طرح ہمارا خیال رکھتی ہیں۔ بیگم صاحبہ جب کبھی کوئی سامان وغیرہ منگاتی تھیں تو چاندی کے دو روپے کام ختم ہونے کے بعد دیتی تھیں اور جب میں منع کرتا تو کہتیں "یہ تمہارے لیے نہیں بچوں کے لیے ہیں"۔ اکثر اپنے خاندان کے بچوں سے یہ کہہ کر تعارف کراتی تھیں کہ ببّو، میاں (ذاکر صاحب) کے پاس مجھ سے پہلے آئے تھے۔ جب ذاکر صاحب علی گڑھ چلے گئے تو میں ان کے اور بیگم صاحبہ کے پاس حاضری دینے کے لیے جایا کرتا تھا۔ سب بڑے پیار سے ملتے۔ ایک ایک کا حال پوچھتے اور اگر رکنا پڑتا تو کوٹھی ہی میں رہنے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔

سوال:۔ جب ذاکر صاحب گورنر، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہوئے تب آپ کا ان سے کیسا تعلق رہا؟

جواب :۔ جب ذاکر صاحب گورنر ہوئے تو جامعہ سے ان کا تعلق بدستور رہا۔ مجھے ایک دفعہ کا واقعہ اب تک یاد ہے۔ ذاکر صاحب گورنر ہونے کے بعد جب پہلی دفعہ جامعہ آئے اور آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں ان کا استقبال کیا گیا تو وہ کلام صاحب مرحوم (آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے استاد) سے بار بار پوچھتے "بنّو نظر نہیں آرہے ہیں" اور پھر جب عبدالرزاق صاحب (ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول) نے مجھے بتایا کہ ذاکر صاحب یاد کر رہے ہیں اور میں گیا تو انھوں نے سارے لوگوں کے بیچ یہ کہہ کر میری عزت بڑھائی کہ "بنّو نہ صرف خود صاف ستھرے رہتے ہیں۔ بلکہ اپنے بچّوں کو بھی اسی طرح صاف ستھرا رکھتے ہیں جو کہ بڑی بات ہے"

جب ذاکر صاحب نائب اور صدر جمہوریہ ہوئے تو انھوں نے اپنے اسٹاف کو یہ تاکید کر رکھی تھی کہ جب ہم میں سے کوئی آئے تو اُسے فوراً ملایا جائے۔ راشٹرپتی بھون ہم نے پہلی اور آخری دفعہ انھیں کی صدارت کے زمانے میں بار بار دیکھا اور ذاکر صاحب نے ہمیں کبھی بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ اس ملک کی سب سے بڑی ہستی ہیں بلکہ ہمیشہ اُسی پیار سے ملے جس سے کہ وہ جامعہ میں ملتے تھے۔

جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ تھے تو اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہمارے گاؤں کے یا جان پہچان کے کچھ لوگ راشٹرپتی بھون میں جاکر صدر جمہوریہ سے ملنے کی خواہش لے کر ہمارے پاس آجاتے اور جب ہم ذاکر صاحب سے کہتے کہ "میاں ہمارے گاؤں کے یا دور پاس کے کچھ رشتہ دار آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں تو وہ فوراً ان سے ملنے کے لیے تیار ہو جاتے اور پیار بھری باتیں کرکے انھیں خوش خوش رخصت کرتے۔ ●

پیامیوں سے

"پیام تعلیم" کے مضامین کے بارے میں اپنی رائے خط یا کاغذ پر لکھ کر بھیجا کریں۔

اردو اکادمی، دہلی

گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، دہلی

اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کی میٹنگ مورخہ ۲۲ر اگست ۱۹۸۶ء میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ ثقافتی پروگرام و سیمنار کمیٹی سال رواں میں پانچ سیمنار منعقد کرے۔ اس سلسلے کا پہلا سیمنار بہ عنوان "اردو لیسانی... لرز سیمنار" ۲۹ اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۶ کو دہلی یونی ورسٹی میں منعقد ہو چکا ہے۔ باقی چار سیمنار حسب تفصیل ذیل منعقد کیے جائیں گے۔

۱۔ "نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس" پر دو روزہ کل ہند سیمنار ۷ اور ۸ر فروری ۱۹۸۷ء کو اردو اکادمی دہلی کے ہال میں منعقد ہوگا۔ اس سیمنار میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے ممتاز ماہرینِ تعلیم 'اقلیتوں کے درس و تدریس کے آئینی تحفظات اور نئی تعلیمی پالیسی، کالج اور یونی ورسٹی کی سطح پر نئی تعلیمی پالیسی اور اردو، نئی تعلیمی پالیسی ... لسانی فارمولا اور اردو داں لوگوں کی ملازمت کا مسئلہ جیسے موضوعات پر اپنے خیالات پیش کریں گے۔

۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی قومی و ادبی خدمات پر ایک کل ہند دو روزہ سیمنار ۱۴ اور ۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین میں منعقد ہوگا۔ اس سیمنار میں مرحوم ذاکر صاحب کی قومی و ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا جائے گا۔ مرحوم ذاکر صاحب بحیثیت مفکر، دانشور اور ماہرِ تعلیم ہمارے لیے جو ورثہ چھوڑ گئے ہیں اس کی قدر و قیمت اور عصری افادیت پر اسکالرز مقالات پیش کریں گے۔

۳۔ اردو اور ہندی کے رشتے کو مزید تقویت دینے کے لیے ایک سہ روزہ سیمنار "اردو شاعری کی ہندی اصناف" کے زیرِ عنوان ۲۸ فروری، یکم مارچ اور ۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین میں منعقد ہوگا۔ اس سیمنار میں فارسی شاعروں کے یہاں ہندی اصناف، قوالیوں میں ہندی بولوں کا چلن، اردو کی عوامی شاعری میں دوہوں کی روایت، اردو میں بارہ ماسہ کی روایت، گیت نگاری جیسے موضوعات پر علمی و تحقیقی مقالے پڑھے جائیں گے۔

۴۔ اردو مرثیہ پر ایک کل ہند سہ روزہ سیمنار ۲۱، ۲۲، اور ۲۳ر مارچ ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں منعقد ہوگا۔ اس سیمنار میں اردو مرثیے کے آغاز و ارتقا، مرثیے کی ... مرثیے کی عالمی روایت، مرثیے کی ادبی و لسانی اہمیت، اردو مرثیہ دہلی میں، اردو مرثیہ لکھنؤ میں، اردو مرثیے میں ہندستانی تہذیب کی عکاسی، سانحۂ کربلا کا علامتی و شعری استعمال جیسے عنوانات پر اسکالرز ... کریں گے

سید شریف الحسن نقوی

فون: ۲۷۴۲۱۱

گھٹا مسجد روڈ

ہم
بھارت کے لوگ



اپنی جمہوریہ کے محبوب آدرشوں

جمہوریت
سوشلزم
سیکولرزم
انصاف
آزادی
مساوات
اخوت
ہم آہنگی
اتحاد
سالمیت
امن اور
ترقی

کے علمبردار ہیں

ہم ہمیشہ ان پر قائم رہیں گے

بچوں کی باتیں

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر آپ کو دیر سے ملا شاید کچھ آپ
کے تاثرات ابھی تک ہمیں نہیں معلوم ہو سکے لیکن
ہمیں یقین ہے کہ آپ نے [illegible] پسند کیا ہوگا۔ ذاکر صاحب
پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا [illegible] شخصیت
تمام پہلوؤں [illegible]
[illegible] ان سے متعلق [illegible]
تو ابھی [illegible] ہم نے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] اور [illegible] سے [illegible] وہ بھی شامل
ہونے سے رہ گئے تھے ان میں سے کچھ اس شمارے
میں پڑھیے اور اس شمارے کو ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر کا ضمیمہ سمجھیے

یہ شمارہ بھی بہت عجلت میں تیار کرنا پڑ رہا ہے اس لیے
اس مرتبہ بچوں کی کوششیں، آدھی ملاقات اور دوسرے مستقل
کالموں کے لیے گنجائش نہ نکل سکی۔ انشاء اللہ اگلے ماہ سے
ان مستقل عنوانات کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا جائے گا۔

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مارچ ۱۹۷۵ء جلد ۲۵ شمارہ ۳

[illegible]
ذاکر صاحب [illegible]
نظمیں [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اور دلچسپ [illegible]

قیمت فی پرچہ 3/50 [illegible] 30/-
غیر ممالک سے [illegible] ڈالر
فی پرچہ: ایک ڈالر

مینیجنگ ایڈیٹر: شاہد علی خاں
ایڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری
معاون: مختار احمد، شمیم اللہ خاں
تزئین کار: ایس۔ ایم۔ مظہر

پرنٹر پبلشر [illegible] نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے [illegible] آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

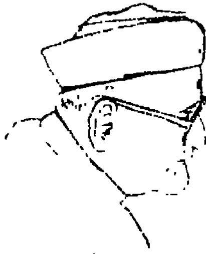
ڈاکٹر حبیب احمد حامی

حمد باری تعالیٰ

کون و مکاں میں جلوا تیرا — گلشن تیرا صحرا تیرا
آدمؑ تیرا عیسیٰؑ تیرا — نوحؑ تیرا اور موسیٰؑ تیرا
دیر و کلیسا اور حرم میں — ہم نے جلوہ دیکھا تیرا
حمد کناں ہے ماہی و دریا — آب رواں میں جلوا تیرا
جن و بشر اور حور و ملائک — گاتے ہیں سب نغما تیرا
شمس و قمر کی تابانی میں — نور ہے دیکھا بھالا تیرا
رکھتے ہیں جو خاک کے اوپر — کرتا ہوں میں سجدا تیرا
صبح و شام بنائی تو نے — سورج چاند بنایا تیرا
برگ و گل و اشجار چمن میں — گاتے ہیں سب نغما تیرا
تو سب کا ہے روز ازل سے — سب نے ہے گن گایا تیرا

ہے وظیفہ ہر لمحہ حامی
نام کا میں کہنا تیرا

ڈی ۱۱۱ ۔ مراتی بالا فیسرز کیمپس
فتح آباد، یوپی



پروفیسر آل احمد سرور

ذاکر صاحب کی شخصیت کے چند پہلو

ذاکر صاحب ماہرِ تعلیم تھے، ادیب تھے، ممتاز مقرر تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معمارِ اعظم تھے، علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزند تھے، بہار کے گورنر تھے، پہلے نائب صدر جمہوریہ رہے اور پھر صدر جمہوریہ ہوئے۔ پھر وہ اچھے انسان، اچھے ساتھی، اچھے دوست تھے۔ ان کے دل میں دوسروں کا درد تھا۔ ان کی طبیعت میں بلا کا صبر و ضبط تھا۔ وہ بہت کچھ خاموشی سے جھیل جاتے تھے۔ ان کی صورت میں ایک موہنی تھی۔ جو انھیں دیکھتا تھا، وہ ان سے متاثر ہوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو خوابوں کو حقیقت بنانا جانتے ہیں جو صحرا میں پھول کھلا دیتے ہیں۔ جو دشت کو گلزار بنا دیتے ہیں۔ وہ بہت ذہین آدمی تھے۔ فوراً ہر بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ دوستوں کی محفل کی جان تھے۔ ان کے پرلطف فقروں سے سبھی کے دلوں کے کنول کھل جاتے تھے۔

میں نے انھیں سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں رشید احمد صدیقی کے یہاں دیکھا اور بہت جلد ان سے قریب ہو گیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں ان کے انتقال تک ان سے ربط ضبط رہا۔ میں نے کبھی کبھی انھیں افسردہ تو دیکھا ہے مگر برہم نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو جامعہ میں وہاں ایک شاندار خواب کو حقیقت بنانے میں مصروف، تعلیم، تربیت، تعمیر اور علمی کاموں میں منہمک پایا، مگر ہر حال میں شگفتہ اور باغ و بہار۔ میں نے انھیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی سربراہی کے زمانے میں دیکھا ہے اور اس کے علمی کاموں کی قیادت کرتے یا جلسوں کو خطاب کرتے اور

اقبال انسٹی ٹیوٹ۔ کشمیر یونی ورسٹی۔ سری نگر

بارہا ان کی پر مغز اور پر سوز گفتگو سنی ہے۔ میں نے انھیں راشٹرپتی بھون میں اعلا اور ادنا ہر قسم کے لوگوں سے تبادلۂ خیالات کرتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ان کی پر سوز شخصیت [illegible] ان کے اخلاقی اور تعلیمی اصولوں [illegible] ایک استاد کا تھا۔ وہ واقعی ہم سب کے [illegible] سے تعیین نہیں سکتا۔ وہ [illegible] تھے۔

[illegible]

[illegible] کرکے بیٹا ہیں شکر آتی تھی اس لیے [illegible] ڈاکٹر صاحب گھر کے لوگوں کی آنکھ بچا کر بدپرہیزی [illegible] کے دورے میں انھیں کسانوں نے گنے [illegible] نوش فرما کر چلے تھے۔ پوچھنے پر فرمایا [illegible]

ذاکر صاحب بڑی اچھی اُردو اور بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے اور اتنی ہی اچھی تقریر کرتے تھے۔ ان کی تقریر میں لفاظی نہیں ہوتی تھی۔ وہ الفاظ اور فقروں کی تکرار نہیں کرتے تھے۔ مگر اس میں مغز ہوتا تھا پھر لہجے کے اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے اور آواز کی دل کشی کی وجہ سے ان کا ہر جملہ دل پر اثر کرتا تھا۔ شعر پڑھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ شعر انھیں پر نازل ہوا ہے۔ ان کی دو تقریریں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک تو [illegible] کی تقریر جس نے بہت سے لوگوں کو اشکبار کر دیا تھا۔ دوسرا ان کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد [illegible] جس میں انھوں نے اپنے زمانے کے علی گڑھ کو یاد کیا تھا اور دل [illegible] کی خصوصیات [illegible] تھا۔

ذاکر صاحب کے پاس کوئی اپنا چھوٹا سا مسئلہ لے کر جاتا تو وہ اپنا [illegible] اس کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے۔ انھوں نے [illegible] کے لیے [illegible] انھوں نے [illegible] شخص [illegible] وہ کسی سے اپنی بات منوانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ [illegible] ان کی [illegible] ذہن اور دل دونوں کو متاثر کرتی تھی۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتے تھے [illegible] سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اپنی اصلاح کرو تو دوسروں کی بھی [illegible] وہ اچھے مسلمان [illegible] ہندستانی تھے اور ان میں [illegible]

فارم ۴ حسب قاعدہ ۸

بابت: پیام تعلیم نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت: ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام: سید احمد ولی ہندستانی پتہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام: " " "

۵۔ اڈیٹر کا نام: " " "

مالکان کے نام اور پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

چیرمین: کرنل بشیر حسین زیدی: جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ڈائریکٹر: نواب اقبال محمد خاں [illegible] بمبئی

۲۔ [illegible] تقی حسین زیدی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۳۔ [illegible] الحسن فاروقی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۴۔ مالک رام [illegible] نئی دہلی

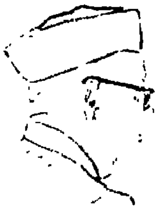
۵۔ پروفیسر علی اشرف وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایہ کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلامی جیم خانہ لمیٹڈ کی [illegible] بمبئی

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔ دستخط

۲۰ فروری ۱۹۸۰ء سید احمد ولی

صابر ابوہری
معرفت اگرو کلینکس کورٹ روڈ
جگادری پنجاب



ڈاکٹر ذاکر حسین

زندگی کی رونق رواں تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
حریت کے پاسباں تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible] تھے جن سے [illegible] حریت
[illegible] تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible] تھے [illegible] خلقِ خدا
[illegible] کا نشاں تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible]
[illegible] تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible]
[illegible] تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible]
[illegible] تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible]
[illegible] تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible]
[illegible] تھے ڈاکٹر ذاکر حسین
[illegible]
[illegible] داستاں تھے ڈاکٹر ذاکر حسین

علقمہ شبلی

ذاکر صاحب



بچّوں کے لیے پیار تھے ذاکر صاحب
اور بزرگوں کے بھی دلدار تھے ذاکر صاحب

گفتار کے غازی تو بہت ہیں لیکن
اک صاحبِ کردار تھے ذاکر صاحب

سوئی ہوئی ملّت کو جگانے کے لیے
ہر موڑ پہ بیدار تھے ذاکر صاحب

اپنوں ہی کے دکھ درد کا نہ تھا ان کو خیال
غیروں کے بھی غم خوار تھے ذاکر صاحب

منزل سے جو نا آشنا تھے ان کے واسطے
وہ قافلہ سالار تھے ذاکر صاحب

سرشار تھا دل دردِ ملّت سے بھی
بھارت کا بھی پندار تھے ذاکر صاحب

۹/۱۵ رپن اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ ۱۶

نظم

قسیم رضوی
ڈی۔ ۱۵/۷، پارک سائٹ
وکرولی، بمبئی ۷۹

لطیف علم کے چشمے ہیں تشنگی کے لیے
خطوط ابھرے ہیں ہستی میں آگہی کے لیے
ردائے وقت نے چہرے چھپا لیے کتنے
نظر جو آئے رفاقت میں دلکشی کے لیے

جلے بجھے سے کروڑوں دیے ہیں راہوں میں
ہیں موڑ موڑ اجالے جو تیرگی کے لیے
نگاہِ فکر کے فانوس بھی ہیں رنگا رنگ
جو سرد و گرم کے مظہر ہیں آدمی کے لیے

پیامِ علم، مدارج مزاج ہوتے ہیں
جدا جدا ہیں معالج فسردگی کے لیے
یہ قرن قرن بدلتے ہوئے حیات کے رنگ
چلے ہیں لَو سے سوئے برق روشنی کے لیے

نقوش وقت کے ابھرے ہیں جادۂ نو میں
صدائیں رہتی ہیں محفوظ آگہی کے لیے
متاعِ عمر ہیں یادوں کے قافلے یارو
ابھرتے خواب ہیں شاداب زندگی کے لیے

بنامِ حضرت ذاکر حسین یہ نمبر
وہی پیام ہے تعلیم نوری کے لیے
نسیم فصلِ بہاراں کی یاد آتی ہے
خزاں میں ہوتے ہیں تیار تازگی کے لیے

سطوت رسول
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، نئی دہلی



ثنا واسع کی سالگرہ

۲۸/ فروری

اک لڑکی ہے پیاری سی
گھر کی راج دلاری سی

چینی کی اک گڑیا سی
ننھی منی چڑیا سی

امی ابو پیار کریں
گھر کے لوگ دلار کریں

گھر میں کتنا شور کرے
سب کو اپنی اور کرے

آنکھوں میں جو کاجل ہے
پیروں میں جو پایل ہے

اس کی بہن ہے ایک ارم
موہنی صورت والی صنم

نازک سی وہ کومل سی
گڑیا ہے وہ چنچل سی

پھولوں کے سنگ ہنستی ہے
سب سے نخرے کرتی ہے

اس کو خدا یوں شاد رکھے
پھولوں میں آباد رکھے

انٹرویوز

جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے "یوم تاسیس" کے موقع پر جامعہ مڈل اسکول کی جماعت ہفتم اور ہشتم کے بچوں نے ایک پروجیکٹ چلایا جس میں ذاکر صاحب، اور جامعہ کے کاموں پر روشنی ڈالی گئی۔

اس سلسلے میں ہم نے جامعہ کے پرانے کارکنان، اساتذہ، طلبہ اور حیاتی اراکین کے تاثرات جاننے کے لیے انٹرویوز لیے۔

ہم اپنے استاد جناب سید افتخار احمد صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس سلسلے میں ہر قدم پر ہماری مدد اور رہنمائی کی۔

سید احمد ولی صاحب شاہجہاں پوری نے انٹرویوز کو "پیام تعلیم" میں چھاپنے کی عنایت کی۔ اس کے لیے ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔

ہم اپنے ان تمام بزرگوں کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے انٹرویوز دینے کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

طلبہ جماعت ہفتم و ہشتم
جامعہ مڈل اسکول

انٹرویو لینے والے

درجہ ہشتم
۱. صفیہ پروین
۲. پروین بانو
۳. نسرین فاطمہ
۴. کوثر نفیس
۵. فریدہ اکرام
۶. سہیل احمد
۷. محمد سلیم

جناب شکیل اختر فاروقی صاحب سے

سوال :- آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :- جتنی میری عمر ہے اتنا ہی پرانا رشتہ ہے۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار دنوں کی بات نہیں۔

سوال :- آپ جامعہ کیوں تشریف لائے؟

جواب :- میں تو پیدا ہی یہیں ہوا تھا۔ میرے والد صاحب یہیں رہتے تھے۔

سوال :- پرانی اور آج کی جامعہ میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب :- وہی جو مجھ اور تم میں ہے۔ پہلے جامعہ چھوٹی سی تھی سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اب وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی لیکن میری خواہش یہ ہے کہ جو جامعہ کی پرانی باتیں تھیں اور اچھی تھیں ان کو آپ لوگ برقرار رکھیں۔

سوال :- ایک زمانے میں ملک کے تعلیمی اداروں میں جامعہ کی انفرادی حیثیت تھی اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب :- ملک کے تعلیمی اداروں میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں جامعہ کی انفرادی حیثیت تھی۔ اگر شہر میں جامعہ کا کوئی طالب علم چلا جاتا تھا تو وہ الگ ہی پہچانا جاتا تھا اپنے لباس، اپنی بول چال اور اپنی تہذیب کے ذریعے۔ یہاں کتابی تعلیم سے زیادہ عملی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ یہاں بچوں کے لیے اساتذہ کا کردار ایک نمونہ تھا۔ بچوں کے ساتھ رہنا اور انھیں سمجھنا۔ ہر استاد یہ چاہتا تھا کہ جو بھی طالب علم یہاں آئے اس پر جامعہ کی پوری

چھاپ ہو۔

سوال :۔ آپ کے زمانہ کی کوئی ایسی شخصیت جس نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا ہو؟

جواب :۔ ہاں بہت سی ہیں۔ سب سے پہلے تو میں اپنے والد صاحب (اختر فاروقی صاحب) کا ہی نام لوں گا۔ جنھوں نے نہ صرف میرے لیے بلکہ سبھی کام کیا۔ اس کے علاوہ مجتبیٰ حسین زیدی صاحب، محمد حسین صاحب (ابو) اور محمد مجیب صاحب وغیرہ ایسی ہستیاں ہیں جن کو میں بھلا نہیں سکتا۔

سوال :۔ جامعہ اور جامعہ کے آس پاس تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا جامعہ کے تعلیمی معیار اور تہذیب و تمدن پر کیا اثر پڑا ہے؟

جواب :۔ بہت برا اثر پڑا ہے۔ اسے ہم جامعہ کے محدود دائرے میں نہ دیکھیں بلکہ پورے ملک پر نظر ڈالیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ ہر جگہ چھوٹی چھوٹی بستیاں بس گئی تھیں جامعہ کو اس قسم کی بستیوں سے بچنے کے لیے ہی ایک پُرسکون فضا میں پلنے بڑھنے کے لیے اوکھلا میں منتقل کیا گیا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ کتنی ہی بستیاں جامعہ کے آس پاس بس گئی ہیں جن کے بُرے اثرات بچوں پر بھی پڑ رہے ہیں پہلے ہر بچے پر نظر رکھی جا سکتی تھی ان کو غلط جگہ جانے سے روکا جا سکتا تھا لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے۔

سوال :۔ کیا آپ نے اپنے بچوں کو ابتدائی اور اعلا تعلیم جامعہ میں ہی دلوائی؟

جواب :۔ جی ہاں۔ جس طرح میں نے جامعہ میں ہی تعلیم حاصل کی اسی طرح میرے بچے بھی جامعہ میں ہی پڑھ رہے ہیں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ تعلیم مادری زبان میں ہی دلوانی چاہیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب معیار کچھ گرتا جا رہا ہے لیکن اس میں ہم استادوں کا ہی قصور ہے۔

سوال :۔ اب آپ کو جامعہ کیسی لگتی ہے؟

جواب :۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ ہم جامعہ سے چلے جائیں کیونکہ وہ بات اب نہیں رہی جو پہلے تھی۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ کچھ قدریں اور پرانی روایات اب تک موجود ہیں جو تسکین کا باعث ہیں اب یہاں استادوں کو پڑھانے سے اتنی دلچسپی نہیں رہی۔ لیکن عمر کا تقاضا یہ ہے کہ اب ہم نئی زندگی پھر سے شروع

نہیں کر سکتے۔

سوال :۔ آپ کے زمانے کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

جواب :۔ میں بہت چھوٹا تھا چوتھی یا پانچویں جماعت میں رہا ہوں گا تب جامعہ کی پچیسویں سالگرہ منائی جا رہی تھی جس میں ذاکر صاحب سے لیکر ہر چھوٹے بچے نے کام کیا تھا۔ اس کا اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آزادی سے پہلے کا واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں پاتا ہوں۔

سوال :۔ آپ کا جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی سے بھی تعلق رہا ہے آپ کے خیال میں کیا اب اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

جواب :۔ مدرسۂ ابتدائی سے تو میرا بہت پرانا رشتہ ہے اور میرے والد صاحب نے بھی وہیں سے اپنا کیریر شروع کیا تھا۔ میری ملازمت وہیں سے شروع ہوئی۔ حالانکہ میری دلی خواہش تھی کہ میں وہیں کام کروں لیکن حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مجھے مدرسہ چھوڑنا پڑا اور استادوں کے مدرسے میں نوکری کرنی پڑی۔ تبدیلی تو کافی ہوئی ہے۔ ابتدائی سے مڈل ہو گیا۔ ترقی اور تبدیلی تو ہونی ہی چاہیے یہ ایک اچھی بات ہے۔

انٹرویو لینے والے

۱۔ نسرین فاطمہ
۲۔ فریدہ اکرام
۳۔ عاصم رشید
۴۔ سلیم احمد

درجہ ہشتم

بیگم سعیدہ خورشید صاحبہ سے

سوال :۔ آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

جواب :۔ اب دو بہنیں ہیں۔ ہماری پانچ بہنیں تھیں اور ایک بھائی۔ تین بہنوں اور ایک بھائی کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا۔

سوال :۔ ذاکر صاحب اتنی مصروفیت کے باوجود کیا آپ کے بچپن میں آپ کے لیے وقت نکال لیتے تھے؟

جواب :۔ ہاں تھوڑا بہت تو نکال ہی لیتے تھے۔ میں بہت چھوٹی تھی وہ جہاں جاتے تھے مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتے تھے۔

سوال :۔ آپ کے بچپن میں ذاکر صاحب عام طور پر آپ سے اور آپ کی بہن سے کس قسم کی گفتگو کیا کرتے تھے ؟

جواب :۔ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جس مذاق کا آدمی ہو وہ ویسی ہی بات کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ہم لوگوں سے ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ لطیفے سناتے تھے۔ اچھی اچھی کہانیاں سناتے تھے وہ ہمیں سوتے سے جگاتے تھے تو بہت پیار سے جگاتے تھے۔ ہمیں جگانے کے بعد یہ شعر پڑھا کرتے تھے "اُٹھا ہے کوئی کچی نیند سے خفا خفا"

سوال :۔ آپ دونوں کی تربیت میں انھیں سب سے زیادہ کس بات کا خیال رہتا تھا ؟

جواب :۔ بھئی ! تھے تو وہ تعلیم کے میدان لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ہم لوگوں کی تعلیم کی طرف سے کافی غافل رہے۔ ویسے ان کی نظر میں تعلیم کی اہمیت تو تھی ہی لیکن وہ عام تربیت پر زیادہ زور دیتے تھے وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ بچوں کا اخلاق اچھا ہو، بات چیت اچھے ڈھنگ سے کریں اور بڑوں کی عزت کریں۔

سوال :۔ آپ دونوں کے مستقبل کے بارے میں وہ کیا سوچتے تھے ؟

جواب :۔ میرے خیال میں تو انھوں نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا مستقبل کو مستقبل کے حوالے کر دیا تھا بس وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ ہمیں تو گھر ہی چلانا ہے اس لیے اسی کا ماہر ہونا چاہیے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جو بھی کام کرو اسے اچھی طرح کرو۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس میں کوئی احساسِ کمتری کی بات نہیں کہ تم کوئی نوکری نہیں کرتیں۔

سوال :۔ وہ عام طور پر کس قسم کی کہانیاں سناتے تھے ؟

جواب :۔ وہ اکثر بزرگوں کی کہانیاں بہت سناتے تھے۔ آنحضرتؐ کی زندگی سے متعلق قصے سناتے تھے۔ جب کھانے کی میز پر بیٹھتے تھے تو اکثر کوئی نہ

کوئی قصہ کہانی ضرور سناتے تھے۔

سوال :۔ کیا ذاکر صاحب گھریلو کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے؟ آپ کی کچھ مدد کرتے تھے۔

جواب :۔ بہت دلچسپی لیتے تھے۔ وقت انھیں کم ملتا تھا۔ لیکن جب بھی انھیں وقت ملتا تھا تو وہ مشورہ دیتے تھے۔ اگر کوئی نئی چیز باہر سے معلوم کر کے آتے تھے تو میرے ساتھ بیٹھ کر بکواتے تھے۔ جب ہم نے نیا گھر لیا تھا تو اس کا باورچی خانہ انھوں نے ہی سجایا تھا۔

سوال :۔ جب آپ چھوٹی تھیں تو وہ آپ کی کن باتوں پر خفا ہوتے تھے؟

جواب :۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کبھی خفا ہوئے ہوں۔

سوال :۔ وہ اپنی خفگی کا اظہار کس طرح کرتے تھے؟

جواب :۔ وہ دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچاتے تھے بلکہ خود ہی ضبط کرتے تھے۔ انھیں بہت کم غصہ آتا تھا۔

سوال :۔ کیا آپ ان سے ڈرتی تھیں یا آپ ان سے ہر موضوع پر بات چیت کر سکتی تھیں؟

جواب :۔ میں ڈرتی نہیں تھی بلکہ میرے ان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے اور کبھی تو میں ان سے بے ادبی کی حد تک بات چیت کر لیتی تھی۔

سوال :۔ کیا بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد بھی وہ گھر کے افراد کو وقت دیتے تھے؟۔

جواب :۔ وقت انھیں کم ملتا تھا صرف ناشتہ اور کھانے کے وقت ان سے ملاقات ہوتی تھی انھیں پیر دبوانا بہت اچھا لگتا تھا اور یہ کام میں کرتی تھی اس طرح ان سے کافی ملاقات ہو جاتی تھی۔

سوال :۔ آپ کے خیال میں ذاکر صاحب کے لیے بچے اتنے اہم کیوں تھے؟

جواب :۔ دراصل آنے والے سماج کا بچوں ہی پر مدار ہے۔ کچھ قدرتی طور پر بچے انھیں بھی بہت پیارے تھے۔

سوال :۔ ذاکر صاحب کیا لباس پہنتے تھے؟۔

جواب :۔ کھدر کا کُرتا پاجامہ، شیروانی اور ٹوپی پہنتے تھے۔ کُرتا پاجامہ پہن کر باہر نہیں نکلتے تھے شیروانی ضرور پہنتے تھے اور ٹوپی بھی لگاتے تھے۔

سوال :۔ انھیں کیا غذا مرغوب تھی؟۔

جواب :۔ انھیں اچھا کھانا اچھا لگتا تھا ویسے وہ ہرا ہری کھانا کھاتے تھے۔ مگر میٹھا انھیں بہت پسند تھا۔ حالانکہ انھیں شکر کی بیماری تھی لیکن وہ دوسروں کو میٹھی چیز کھلاتے میں بھی اتنا ہی مزہ محسوس کرتے تھے جیسے خود کھارہے ہوں۔ بدمزہ کھانا بھی وہ بغیر کچھ کہے کھالیتے تھے۔

سوال :۔ ذاکر صاحب کی دلچسپیاں کیا تھیں؟

جواب :۔ ان کے شوق بہت تھے۔ انھیں پھولوں سے، پتھروں سے، جانوروں سے اور پینٹنگز سے بہت شوق تھا۔ ہر پرانی چیز سے انھیں پیار تھا۔ دوسروں کو کھلانے کا۔ دعوتیں کرنے کا انھیں بہت شوق تھا۔ خود اچھے کھانے کھانے کا بھی انھیں بہت شوق تھا۔

سوال :۔ کیا اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد بھی وہ اپنی دلچسپیوں کے لیے وقت نکال لیتے تھے؟

جواب :۔ ہاں نکال لیتے تھے۔ خاص کر باغبانی کے لیے۔ ملنے جلنے والوں میں ایسے لوگوں سے ان کی دوستی ہو جاتی تھی جن کو ان کی طرح کے شوق ہوتے تھے۔

سوال :۔ شروع شروع میں جامعہ کو چلانے میں انھیں کیا دشواریاں پیش آئیں؟

جواب :۔ میرے خیال میں مالی پریشانیاں بہت تھیں۔ پیسا پاس نہیں تھا۔ چندہ کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی تنخواہیں تھیں۔ حیاتی رکن بناتے تھے۔ جنھوں نے قسم کھائی تھی کہ بیس سال تک ہم بہت کم تنخواہوں پر کام کریں گے۔

سوال :۔ جامعہ کو انھوں نے اتنی محبت سے چلایا پھر وہ اسے چھوڑ کر علی گڑھ کیوں چلے گئے۔؟

جواب :۔ وہ بھی ایک مصلحت تھی۔ جامعہ تقریباً اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی تھی۔

یونیورسٹی علی گڑھ سے بھی انھیں پیار تھا۔ اور وہ یونیورسٹی اس وقت خطرے میں تھی۔ اس لیے جامعہ انھیں چھوڑنی پڑی۔ علی گڑھ سے ان کا رشتہ ایسا تھا جیسے ماں باپ سے ہوتا ہے اور جامعہ سے ایسا تھا جیسے اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔

سوال :۔ کیا جامعہ سے جانے کے بعد بھی کبھی ذاکر صاحب نے دوبارہ جامعہ میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا؟

جواب :۔ کبھی نہیں۔ جامعہ کو وہ بہت چاہتے تھے لیکن جب جامعہ ایک بار دوسروں کے حوالے کر دی تو وہ کہتے تھے کہ انھیں لوگوں کو چلانا چاہیے۔

سوال :۔ ذاکر صاحب کی زندگی ہی میں جامعہ نے بہت ترقی کر لی تھی۔ کیا اس مادی ترقی پر ذاکر صاحب خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے تھے؟

جواب : یقیناً۔ لیکن انھیں یہ اندیشہ رہتا تھا کہ جامعہ کو بنانے کا جو مقصد تھا اس سے وہ ہٹ نہ جائے۔

سوال :۔ آپ کے خیال میں اگر وہ آج حیات ہوتے تو ہم بچوں کو کیا پیغام دیتے؟

جواب :۔ وہی پیغام دیتے جو وہ زندگی بھر دیتے رہے کہ اچھا اخلاق بناؤ۔ بڑوں کی عزت کرو، جہاں رہو وہاں تمہاری نمایاں حیثیت ہو۔ انسانی قدروں پر وہ زیادہ زور دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو تمہارا کردار اتنا اچھا ہونا چاہیے کہ تکلیف پہنچانے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ آخر اس نے تمھیں تکلیف کیوں پہنچائی۔

انٹرویو لینے والے

۱۔ فریدہ اکرام
۲۔ نسرین فاطمہ } درجہ ہشتم
۳۔ احمد مجید ظہوری ـ درجہ ہفتم

بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ سے

سوال :۔ آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :۔ ۴۰ سال پرانا رشتہ ہے

سوال :- ہمیں کچھ پرانی جامعہ کے بارے میں بتائیں۔

جواب :- اس وقت جامعہ بہت چھوٹے پیمانے پر تھی۔ صرف دو عمارتیں تھیں۔ مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی، چند اساتذہ تھے۔ سڑکیں نہیں تھیں۔ بجلی نہیں تھی۔ پانی نہیں تھا۔ صرف لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ تھا۔ اس زمانے میں جلسے ہوتے تھے جو کہ بہت منظم ہوتے تھے۔ غفار مدھولی صاحب جو کہ وقت کے بہت پابند تھے، ان جلسوں کے منتظم ہوتے تھے۔

سوال :- اس زمانے میں جامعہ کے کاموں میں خواتین کس طرح حصّہ لیتی تھیں؟

جواب :- بھئی! جامعہ میں کچھ خواتین تو ایسی تھیں جو جامعہ کے کاموں میں براہِ راست حصّہ لیتی تھیں جیسے مشیر صاحبہ، بیگم نور فاطمہ صاحبہ، بیگم اشرف صاحبہ، اور شمیم فاطمہ صاحبہ، اس کے علاوہ ہم لوگ تھے جن کا براہِ راست جامعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا یعنی جامعہ میں ملازمت نہیں کرتے تھے لیکن ہم لوگ اپنی کچھ انجمنیں چلاتے تھے اور کچھ جامعہ کے کاموں میں بھی حصّہ لیتے تھے، جلسوں میں حصّہ لیتے تھے تقریریں کرتے تھے۔ لڑکیوں اور خواتین کے جلسہ کرتے تھے۔

سوال :- ذاکر صاحب سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟

جواب :- بھئی ذاکر صاحب سے پہلے تو میں پردہ کرتی تھی۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں ان سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ دراصل میرے بھائی سیدین صاحب سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔ جب میں ان کے سامنے آگئی تو ظاہر ہے کہ ان سے بھائیوں کے سے تعلقات ہو گئے۔

سوال :- ان سے ملنے کے بعد آپ کا پہلا تاثر کیا تھا؟

جواب :- ہم مرعوب تو نہیں تھے لیکن ان سے محبت بہت کرتے تھے۔ تاثر یہ تھا کہ وہ بہت قابل ہیں۔ عظیم شخصیت ہیں۔ ان کی ڈانٹ بھی سن لیتے تھے اور ان سے لڑ بھی لیتے تھے۔

سوال :- ذاکر صاحب نے جامعہ میں خواتین کے لیے کیا کام کیے ؟

جواب :- کچھ نہیں۔ جو کچھ کیا ہم نے خود کیا۔ لڑکیوں کا اسکول کھولنے کا اُن کا ارادہ تھا لیکن کھول نہیں سکے۔

سوال :- ذاکر صاحب کے زمانے میں جامعہ میں بچوں کی تعلیم کا کیا انتظام تھا؟

جواب :- ہمارے دونوں مدرسے بہت معیاری تھے صفائی کا معیار ہو یا تعلیم کا معیار۔ بچوں میں بہت ادب تھا۔ مدرسہ ابتدائی کا تو جواب نہ تھا۔ گاندھی جی نے اپنے پوتے کو یہیں پڑھانے کے لیے بھیجا تھا۔

انٹرویو لینے والے

۱۔ پروین بانو
۲۔ کوکب ناز
۳۔ عفت جبیں
۴۔ وسیم احمد
۵۔ عاصم رشید
۶۔ محمد سلیم
۷۔ سہیل احمد

درجہ ہشتم

جناب محمد طیب صاحب سے

سوال :- آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :- میں جامعہ میں اگست ۱۹۲۶ء میں آیا تھا یعنی اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے

سوال :- آپ جامعہ کیوں تشریف لائے ؟

جواب :- میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اور صرف پڑھنے کے غرض سے آیا تھا۔

سوال :- اس زمانے میں جامعہ میں کیا کیا پروگرام ہوتے تھے؟

جواب :- اس زمانے میں ایک تو جامعہ بہت غریب ادارہ تھا۔ بالکل پیسے نہیں تھے۔ جامعہ قائم تو علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ جب مالی پریشانی بڑھی تو لوگوں نے طے کیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ لیکن سب لوگ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا گیا۔ کچھ اساتذہ علی گڑھ میں رہ گئے۔ اور کچھ دہلی آگئے۔ ان

مشکل حالات [illegible] جامعہ کو چلانا پڑا۔ اس زمانے میں اساتذہ کے پاس صرف ایک کام ہوتا کہ طالب علموں کو ایسا اچھا طالب علم بنا دیں جس کی مثال دوسری جگہ نہ مل سکے۔ ہر استاد کو بچوں سے خاص لگاؤ اور دوستی تھی ہر استاد کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ بچوں کو ان کی دلچسپیوں کے مطابق ڈھالیں۔ ہر وقت بچوں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی اور بچوں کو جب اتنی توجہ ملتی تھی تو ان میں بھی وہ خوبیاں پیدا ہوتی فطری بات تھی جو اچھے طالب علم میں ہونی چاہیں۔

سوال :- ایک زمانے میں ملک کے تعلیمی اداروں میں جامعہ کی انفرادی حیثیت تھی اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب :- جامعہ کی انفرادی حیثیت اس اعتبار سے بھی تھی کہ سرکاری اداروں کے پاس سب کچھ تھا لیکن جامعہ کے پاس کچھ نہ تھا پھر بھی بچوں کے لیے سب کچھ کیا جاتا تھا۔

سوال :- آپ کے زمانے کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ؟

جواب :- ہمارے زمانے میں ہمیں سے متعلق ایک واقعہ ہے۔ اس بے سروسامانی میں بھی بچوں نے طے کیا کہ سائکل سے کشمیر کا سفر کریں۔ چنانچہ تین لڑکے اور ایک استاد یہاں سے روانہ ہوئے۔ ۱۸ دن میں کشمیر پہنچے۔ کشمیر کی سیر ان لوگوں نے سائکل سے نہیں کی اور نہ ہی گھوڑوں کا استعمال کیا۔ جہاں گئے پیدل گئے۔ راستہ ڈھال والا تھا۔ اس لیے واپسی میں صرف ۱۲ دن ہی لگے۔

سوال :- آپ کے زمانے کی کوئی ایسی شخصیت جس نے آپ کو خاص طور سے متاثر کیا ہو!

جواب :- ہمارے جتنے بھی استاد تھے ہم ان سب سے بہت متاثر تھے۔ مگر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ہم خاص طور سے متاثر تھے۔

سوال :- جامعہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کا آپ کی رائے میں جامعہ کے تعلیمی معیار اور تہذیب و تمدن پر کیا اثر پڑا ہے؟

جواب :- کیا بتاؤں؟ اس کا جواب اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ اب زیادہ احتیاط اور زیادہ لگن کی ضرورت ہے۔

سوال :- کیا آپ نے اپنے بچوں کو ابتدائی اور اعلا تعلیم جامعہ میں ہی دلوائی؟

جواب :- جی ہاں۔ میں نے اپنے بچوں کو جامعہ میں ہی تعلیم دلوائی۔

سوال :- آپ کو اب جامعہ کیسی لگتی ہے؟

جواب :- جامعہ مجھے جتنی اچھی پہلے لگتی تھی اتنی ہی اچھی اب بھی لگتی ہے۔

سوال :- آج جو طلبہ و طالبات ہیں کیا آپ ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب :- پہلے بھی میں لوگوں سے کہا کرتا تھا: جیو اور جینے دو، اور آج بھی یہی کہوں گا اگر اس پر عمل کیا جائے تو اچھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

انٹرویو لینے والے

درجہ ہشتم
۱. فریدہ اکرام
۲. نسرین فاطمہ
۳. سہیل احمد
۴. نکہت آرا
۵. عاصم رشید

جناب مجتبیٰ حسین زیدی صاحب سے

سوال :- آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :- گزشتہ چھبیس سال سے میں ۱۹۳۲ء میں آیا تھا چالیس سال ملازمت میں گزر گئے۔

سوال :- جامعہ تشریف لانے کا کیا آپ کا کوئی خاص مقصد تھا؟

جواب :- دوسرے ادارے برطانوی حکومت سے متاثر تھے لیکن جامعہ آزاد تھی اس لیے میں بھی یہاں آزادی سے کام کر سکتا تھا۔

سوال :- جامعہ آکر آپ کا پہلا تاثر کیا تھا؟

جواب :- پہلا تاثر یہ تھا کہ جب میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ملا تو پتا چلا کہ یہ لوگ کتنے سادہ اور عظیم انسان ہیں۔

سوال :- آپ کے زمانے کی کوئی ایسی شخصیت جس نے آپ کو خاص طور پر متاثر کیا ہو؟

جواب :- ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور غفار مدھولی صاحب کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

سوال :- قدیم اور جدید جامعہ میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب :۔ قدیم اور جدید جامعہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلے استاد کا بہت ادب کیا جاتا تھا۔

سوال :۔ آج جو جامعہ کے طلبہ و طالبات ہیں کیا آپ ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے ؟

جواب :۔ جناب میں طلبہ کو کیا پیغام دوں گا۔ اساتذہ کو دینا چاہیے۔ پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ وہ دل لگا کر پڑھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے سب کچھ سیکھ لیا۔ ایک اور پیغام دینا چاہوں گا کہ بڑے اپنے چھوٹوں کا خیال رکھیں۔

انٹرویو لینے والے

۱۔ پروین بانو
۲۔ نسرین فاطمہ } درجہ ہشتم
۳۔ عاصم رشید

۴۔ احمد مجید ظہوری ← درجہ ہفتم

جناب منوّر صاحب سے

سوال :۔ آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے ؟

جواب :۔ میں ۱۹۳۲ء میں جامعہ آیا تھا۔

سوال :۔ آپ کا جامعہ آنے کا کوئی خاص مقصد تھا ؟

جواب :۔ مقصد ملازمت کا تھا۔ اس وقت جو ہماری کام کرنے کی لگن تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ ذاکر صاحب ہمیں اپنے خاندان کا فرد سمجھتے تھے اور لڑکوں کو بھی بتایا جاتا تھا کہ ملازم کو ملازم نہ سمجھو۔

سوال :۔ آپ نے جامعہ مطبخ میں کتنے عرصے تک کام کیا ؟

جواب :۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۷۴ء تک یعنی ۴۲ سال۔

سوال :۔ اس زمانے میں بورڈنگ کے بچے کیا مطبخ کے کھانے سے مطمئن تھے ؟

جواب :۔ اس وقت سب لوگ مطبخ کے کھانے سے مطمئن تھے۔ بڑے بڑے لوگ یہاں آتے تھے۔ ان کی دعوتیں ہوتی تھیں۔

سوال :۔ آپ جامعہ میں کافی عرصے سے رہ رہے ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ جامعہ کی

کس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ؟

جواب :- میں جامعہ میں ۱۹۲۲ء سے رہ رہا ہوں۔ میں ذاکر صاحب کی شخصیت اور مجیب صاحب، شفیق الرحمٰن صاحب، ماسٹر عبدالحیٔ صاحب عفّار دھولی صاحب، راجہ نظیر احمد صاحب، عبد القادر صاحب، چودھری اکبر علی صاحب، عتیق احمد وغیرہ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔

سوال :- آپ کو پرانی جامعہ اور آج کی جامعہ میں کیا فرق نظر آتا ہے ؟

جواب :- بہت فرق ہے۔ اب وہ پیار اور محبت نہیں ہے جو پہلے تھی۔ پہلے جامعہ میں کام سے محبت تھی اب تو پیسے سے محبت ہے۔ پہلے ہمیں تین تین مہینے تک تنخواہ نہیں ملتی تھی تب بھی ہم کام کرتے تھے۔ اس وقت ہم کو تنخواہ بھی صرف ۷ روپے ملتی تھی ۱۹۴۷ء میں تنخواہیں بڑھیں، ترقیاں بھی ہوئیں لیکن تب بھی ہم رٹائر ہو چکے تھے اب لوگوں کی تنخواہیں کافی بڑھ گئی ہیں پھر بھی لوگ کام میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے۔

انٹرویو لینے والے

۱۔ صفیہ پروین
۲۔ کوثر نفیس
۳۔ پروین بانو
۴۔ فریدہ اکرام
۵۔ نکہت آرا
۶۔ عاصم رشید

درجہ ہشتم

محترمہ جمال فاطمہ صاحبہ سے

سوال :- آپ جامعہ میں کب سے مقیم ہیں ؟

جواب :- جب سے پیدا ہوئی ہوں تبھی سے یہاں رہ رہی ہوں۔ میں ۱۹۲۴ء میں جامعہ میں پیدا ہوئی۔ میرے والد صاحب شروع سے یہیں تھے۔

سوال :- آپ نے جامعہ میں تعلیم کون سی جماعت سے شروع کی ؟

جواب :- میں نے جامعہ میں پہلی جماعت سے ہی تعلیم شروع کی پھر علی گڑھ چلی گئی اور

بعد میں پھر جامعہ ہی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

سوال :۔ آپ نے جامعہ میں عام پڑھائی کے علاوہ اور کیا کیا سیکھا؟ یعنی تعلیم کے دوران اسکول میں آپ کی اور کیا دلچسپیاں تھیں؟

جواب :۔ میں نے چونکہ جامعہ میں صرف پانچویں جماعت تک پڑھا اس لیے باقاعدہ کسی ACTIVITY میں حصہ نہیں لیا۔

سوال :۔ آپ جامعہ نرسری سے کب سے وابستہ ہیں؟ وہاں ننھے منے بچوں کے ساتھ کام کرنا آپ کو کیسا لگتا ہے؟

جواب :۔ میں ۱۹۵۶ء سے نرسری میں کام کر رہی ہوں۔ ننھے منے بچے مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔

سوال :۔ ہم نے سنا ہے کہ ایک زمانے میں جامعہ میں جرمن آپا جان (فلپس بوراں) ہوا کرتی تھیں جن کا تعلق شاید جامعہ نرسری سے بھی رہا ہے کیا آپ ہمیں اُن کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟

جواب :۔ جرمن آپا جان جس زمانے میں تھیں تو میں بہت چھوٹی سی بچی تھی۔ اس وقت نرسری تو نہیں ہوا کرتی تھی پرائمری اسکول تھا اس میں وہ پڑھاتی تھیں۔ بچوں سے وہ بہت پیار کرتی تھیں۔ مجھے بھی وہ بہت اچھی لگتی تھیں۔

سوال :۔ پرانی اور آج کی جامعہ میں آپ کوئی فرق محسوس کرتی ہیں؟

جواب :۔ بہت محسوس کرتی ہوں۔

سوال :۔ کسی ایسی شخصیت کے بارے میں بتائیے جس سے آپ زیادہ متاثر ہوئی ہوں؟

جواب :۔ دیکھیے جامعہ اسکول میں ایک استاد تھے غفار مدھولی صاحب اُن سے مجھے بہت اُنسیت تھی۔ اس کے بعد میں نے اسکول میں جامعہ میں نہیں پڑھا۔

سوال :۔ ایک زمانے میں جامعہ کی انفرادی حیثیت تھی اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب :۔ وجہ تو بہت سی ہیں۔ ایک تو جامعہ چھوٹا سا ادارہ تھا لوگوں میں کام

کرنے کی لگن بہت زیادہ تھی۔ پہلے ہمارا اسکول میں کم طالب علم ہوتے تھے
اور کم استاد تھے۔ سب لوگ ایک ساتھ مل جل کر ایک خاندان کی طرح
رہتے تھے۔ بچے ہوسٹل میں رہتے تھے بچے اور طالب علم ایک ساتھ بیٹھ
کر کھانا کھاتے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں آپ کے اسکول میں اس انداز
سے کام کیا جاتا ہے یا نہیں۔

سوال :- آپ کو اب جامعہ کیسی لگتی ہے؟

جواب :- یہ تو مجھے تو بہت ہے۔ اب تو وقت پورا کر رہی ہوں۔

سوال :- کیا آپ نے اپنے بچوں کو ابتدائی اور اعلا تعلیم جامعہ میں ہی دلوائی؟

جواب :- جی ہاں۔ میری دو لڑکیاں ہیں۔ ایک نے ہائر سکنڈری تک اور دوسری نے بی۔ اے تک تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہی حاصل کی ہے۔

انٹرویو لینے والے

۱۔ نسرین فاطمہ
۲۔ فریدہ اکرام
۳۔ عفت جبیں
۴۔ کوکب ناز
۵۔ سہیل احمد
۶۔ محمد سلیم

درجہ ہشتم

جناب عبداللطیف اعظمی صاحب سے

سوال :- آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :- میرا جامعہ سے ۱۹۳۶ء سے رشتہ قائم ہے جبکہ میں نے بی۔ اے۔ فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔

سوال :- جامعہ کے بارے آپ کے کیا تاثرات تھے؟

جواب :- جامعہ میں جو اساتذہ پڑھاتے تھے وہ ہر لحاظ سے بہت قابل تھے۔ وہ اپنے کام میں بہت ہی مخلص تھے ساتھ ہی وہ اپنے مضمون میں منفرد حیثیت کے مالک بھی تھے۔

سوال :- پرانی جامعہ اور آج کی جامعہ میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں ؟

جواب :- بہت بڑا فرق محسوس کرتا ہوں میں نے ۱۹۴۱ء میں یہیں تعلیم مکمل کی تھی اب تقریباً ۴۵ سال ہو چکے ہیں اتنی طویل مدّت میں بہت سی تبدیلیاں ملک گیر سطح پر آئی ہیں اس لحاظ سے جامعہ میں بھی تبدیلیاں آئیں اور سب سے بڑا فرق اس وقت آیا جب جامعہ کو یونی ورسٹی کا درجہ ملا۔ اس تبدیلی کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دوسری یونی ورسٹیوں میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہا۔ اب وہ لوگ آنے لگے جنھیں سرکاری نوکری درکار تھی۔ اس وجہ سے پہلے جامعہ کا جو تعلیمی معیار تھا وہ باقی نہ رہا۔

سوال :- ایک زمانے میں ملک کے تعلیمی اداروں میں جامعہ کی انفرادی حیثیت تھی اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب :- اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس جامعہ میں پڑھانے والے اور جامعہ کو چلانے والے سب کے سب منفرد حیثیت کے مالک تھے چونکہ انھیں جامعہ سے غیر معمولی محبت تھی وہ بہت اچھی طرح اپنا کام سمجھ کر انجام دیتے تھے بہت سے لوگوں نے تو جامعہ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی جب کہ ملک کے دوسرے اداروں میں یہ بات نہیں تھی۔ اس طرح جامعہ ہر لحاظ سے ایک انفرادی حیثیت کی مالک تھی۔

سوال :- آپ کے زمانے کی کوئی ایسی شخصیت جس نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا ہو؟

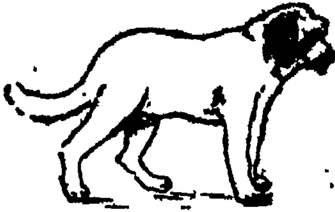
جواب :- جامعہ کی شخصیتوں میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن سے میں بہت متاثر ہوا مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، محمد مجیب صاحب، مولانا اسلم جیراج پوری صاحب، اور شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب۔

سوال :- آج جو جامعہ کے طلبہ و طالبات ہیں کیا آپ ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے ؟

جواب :- ۱۹۳۵ء میں جامعہ میں یوم تاسیس کے موقع پر "پیام تعلیم" کا ایک خاص نمبر شائع ہوا تھا۔ اس موقع پر اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ کے بچّوں کو ایک پیغام دیا تھا۔ پیغام ذرا طویل ہے مگر میں یہاں اس

کے چند اہم حصے بیان کرتا ہوں اسے میرا بھی پیغام سمجھ لیا جائے۔ ذاکر صاحب [illegible] جہاں رہو جو کچھ کرو سچائی کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اس راستے میں مشکلیں آئیں تو منہ مت موڑو۔ خود سختیاں برداشت کرو اور مدرسہ کے لیے آسانی پیدا کرو۔ تن بدن موٹے کپڑے سے ڈھک لو اور ہلکا پھلکا کھا کر گوارا کرلو۔ مگر اپنے دماغ اونچے رکھو: میرا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کا یہ پیغام جتنا مفید پہلے تھا اس سے کہیں زیادہ مفید آج ہے مجھے امید ہے جامعہ کے بچے بچیاں اس پر عمل پیرا ہوں گے۔

نسیم ستار کھی



للّی کی کہانی

بچو۔ بہت دنوں کی بات ہے کہ ملک انگلستان کے چھوٹے سے قصبہ میں ایک تاجر رہتا تھا۔ بچو وہ تاجر کوئلے کی تجارت کرتا تھا ایک شہر سے کوئلہ خرید کر دوسرے شہر میں کوئلہ کو فروخت کرتا تھا۔ اس کے گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی اس کا گھر بڑا خوبصورت تھا۔ پورے گھر میں وہ اکیلا رہتا تھا کیونکہ اس کے بیوی بچے نہیں تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس تنہائی سے گھبرانے بھی لگتا تھا۔ اپنی اس تنہائی کو مٹانے کے لیے اس تاجر نے کتے کا ایک بچہ پالا۔ یہ کتے کا بچہ بڑا خوبصورت تھا اس کا رنگ سفید تھا صرف آنکھیں کالی تھیں۔ اس تاجر نے اپنے اس کتے کا نام للّی رکھا۔ کچھ سالوں کے بعد للّی کافی بڑا ہو گیا اور اپنے مالک سے بہت پیار کرنے لگا۔ تاجر بھی للّی کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا تھا جب بھی تاجر اپنے گھر سے باہر جاتا اور اُسے آنے میں دیر ہو جاتی تو للّی بڑی بے چینی سے انتظار کرتا بار بار دروازے کے پاس جا کر بھونکتا اور واپس آ جاتا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ یہ تاجر اپنی تجارت کی غرض سے کسی دوسرے شہر جانے کے لیے گھر سے باہر نکلا۔ للّی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تاجر نے اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ خریدا اور ٹرین میں سوار ہو کر چلا گیا۔ للّی اس کو دیکھتا رہا پھر گھر واپس چلا آیا۔

ہر روز للّی اسٹیشن پر جا کر ٹرین سے اترنے والے مسافروں کو دیکھتا جب اپنے

۱۴/۲۷۳ نصیر آباد۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی

لک کی صورت نظر نہ آتی تو اداس ہو کر واپس گھر چلا آتا۔ اس طرح للّی کافی دنوں
ے اسٹیشن کے چکر لگاتا رہا لیکن اس کا مالک واپس نہیں لوٹا۔ آخر کار ایک دن
ی نے اپنے مالک کے انتظار میں پوری رات اسٹیشن ہی پر گزار دی ——— اب للّی
نے گھر آنا چھوڑ دیا تھا وہ ہر وقت اسٹیشن پر گھومتا رہتا ہر آنے والی ٹرین کے مسافروں
بڑے غور سے دیکھتا اور پھر مسافر خانے میں آکر چپ چاپ لیٹ جاتا ——— اپنے
لک کی یاد میں للّی بہت دبلا ہو گیا تھا اکثر وہ بیمار رہتا تھا ——— سال پر سال گزرتے
گئے پھر ایک دن ایسا آیا کہ اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ٹرین کے آگے پیچھے بھاگ رہا تھا
رین یک بیک چل پڑی للّی کا آدھا جسم ریل کے پہیوں کے نیچے آگیا اور اس طرح غم سے
نڈھال یہ کتا مر گیا۔ قصبے کے لوگوں کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو سب نے للّی کی
وت پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ کتے کی وفاداری کو دیکھتے ہوئے پورے قصبے کے آدمیوں
نے مل کر ایک فنڈ قائم کیا جس کا نام للّی فنڈ رکھا گیا۔ پورے ملک سے اس فنڈ کے لیے
ندے کی اپیل کی گئی ——— اس طرح للّی فنڈ میں لاکھوں روپیا جمع ہو گیا۔ قصبہ کے
دمیوں نے جب دیکھا کہ للّی فنڈ میں کافی رقم جمع ہو گئی ہے تو سب آدمیوں نے
ملاح و مشورہ کر کے اسی روپے سے معذور بچوں کا ایک اسکول کھول دیا جس میں
رے ملک سے اندھے گونگے بہرے بچے آکر تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہ اسکول اسٹیشن
کے بالکل قریب بنایا گیا تھا۔ اسکول کے بڑے میدان میں ایک اونچا سا مینار بنایا گیا
یہ مینار للّی کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جب اسکول کی چھٹی ہوتی اور معذور
اپنے اپنے کلاسوں سے نکل کر اس یادگاری مینار کے قریب جمع ہو کر ہنستے کھیلتے یا اچھل کود
نے میں مصروف ہوتے تو پاس سے گزرنے والی ٹرینوں کے مسافروں کی نگاہیں اس
ب اٹھ جاتیں۔

قیہ اداریہ

اب تو آپ کے سالانہ امتحانات سر پر آگئے ہیں اس لیے آپ کا پہلا کام پڑھائی
دھیان دینا ہونا چاہیے۔ خوب جی لگا کر پڑھیے اور کامیاب ہو کر ترقی کی منزلیں
ے کیجیے۔ ہماری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

جہانگیر انس



بچّوں کے ادیب

احمد جمال پاشا

پیارے پیارے! چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے بچّو! میں بڑا بچّہ اپنے استادِ محترم حضرت احمد جمال پاشا سے آپ کو ملواتا ہوں۔ آپ سے ملیے۔ جب آپ بچّے تھے یعنی ۱۹۲۶ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ بلکہ پیدا ہوتے ہی ان کا شمار بچّوں میں ہونے لگا۔۔۔۔ انگوٹھا چوسنا۔ کتابوں اور رسالوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا۔ اُن کے ورق پھاڑنا۔ غرض کہ علم وادب کے جراثیم بچپن سے ہی اُن کی گھٹی میں پڑے تھے۔

پھر یہ لکھنؤ چلے گئے۔ بلکہ ماں باپ کے ساتھ جانا پڑا۔ جب کچھ سیانے ہوئے تو لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ مگر وہ زمانہ لد چکا تھا جب منشی پریم چند بی اے کہلاتے تھے۔ اب تو کرشن چندر ایم اے کا زمانہ تھا۔ مجبوراً انھیں ایم اے کرنے کے لیے علی گڑھ جانا پڑا۔ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ یہ گئے نہیں بلکہ لے جائے گئے تھے اور یونیورسٹی نے یقین دلادیا تھا کہ آپ کے جیسے ہونہار طالب علم سے ایک پیسا نہیں لیں گے بلکہ اُلٹا آپ کو وظیفہ دیں گے۔ پڑھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی پاس ہونے کے لیے صرف داخلہ ہی کافی سمجھا جائے گا بس صرف لکھتے رہیے۔"

لکھنے تو یہ حضرت ہائی اسکول سے ہی لگے تھے ۱۹۵۰ء میں بچّوں اور بڑوں کے رسالوں میں یہ نظر آنے لگے تھے۔ ان کی مزاح نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور طنز و تحریف کے میدان میں اچھے اچھوں کے کان کاٹنے لگے تھے۔ جب یہ کالج میں پہنچے تو برِّصغیر میں

تلمشا، سیوان

بچوں کے لیے
...ں اور دلچسپ کتابیں

ترانے	۴/۵۰
ول	۲/۰۰
نیاں	۲/۵۰
رانی	۲/۰۰
ہزلوی	۳/۰۰
تیرا	۳/۰۰
ق	۳/۰۰
سفر	۳/۵۰
ندی	۴/۵۰
چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰
ہرو	۲/۵۰
چار ٹانگیں	۳/۰۰
ادو	۴/۰۰
راز	۳/۰۰
[illegible]	۲/۰۰
فسر	۵/۰۰
ی پر	۵/۰۰
بستی	۳/۵۰
تے	۳/۰۰
مصامہ	۴/۵۰
[illegible]	۲/۰۰
کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰
کی الف بے	۳/۰۰
کی دکھنی افریقہ میں	۲/۰۰
پہیلیاں	۶/۰۰
س کی بیوی	۲/۵۰
رشتہ	۴/۵
را	۴/۵۰
ی	۲/۵۰
علم کی کہانی	۲/—
کا دربار	۴/۵۰
کے جانور	۲/۵۰

آؤ دعا کریں	۲/۰۰
اس نے کیا کر دجانا	۱/۲۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
جوہر قابل	۳/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰
محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰
مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰
چار یار	۴/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۳/۰۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
پھولوں کی کہانیاں	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
تاک دنا دن تا کے سے	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
ایک دیس ایک خون	۳/۰
جیت کس کی ؟	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
جادو کا گھر	۱/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مدو دانا پردیس چلے	۱/۵۰
ہپو جیپو	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
شیر خاں	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵۰
اردو خوشخطی اول	۱/۵۰
اردو خوشخطی دوم	۲/۵۰
اردو خوشخطی سوم	۲/۵۰
اردو خوشخطی چہارم	۲/۵۰

ریڈیو نیچر	۲/۵۰
سرکس	۱/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی	۴/۰۰
ہمارے محاورے	۸/۵۰
کہاوت اور کہانیاں	۶/۰۰
ہمارا دین (دو حصے) فی حصہ	۶/۰۰
چوری کی عادت	۲/۰۰
چمپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
چنبیلی	۱/۲۰
چٹانوں کی کہانی	۲/۵۰
بچوں کے اقبال (نظمیں)	۴/۵۰
دھنک (")	۳/۰۰
کھیل سنسار (")	۴/۵۰
شہزادہ اور ٹھگ	۲/۰۰
سندر چنار	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور غبارے	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد	۲/۰۰
اچھی کہانیاں	۲/۵
میر انیس	۲/۰۰
دادا نہرو	۴/۰۰
جلو ہر غابی	۲/۰۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	۱/۵
میاں ڈھینچوں کے بچے	۱/۵۰
ہرن کے بچے	۱/۵۰
بہادر	۲/۵۰
بٹ کھوری تیل میں	۱/۵۰
مانبیل خاں	۱/۵۰
تین اناڑی	۳/۰۰
پہیلیاں	۰/۸۰
جھوٹا لڑکا	۱/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اول، دوم) فی حصہ	۲/۵۰
چڑماں	۳/—
ہمارا دین اول	۷/—
تیار رہو	۱/۵۰
تاریخ ہند کی کہانیاں اول	۱/۵۰

پڑھنا شروع کیا۔ روزانہ آٹھ دس گھنٹے پڑھنے کی بآسانی عادت ڈال لی۔ انھوں نے پڑھ پڑھ کر ڈھیر لگا دیے۔ اردو ادب۔ انگریزی ادب۔ ہندی ادب۔ اور دوسری زبانوں میں مزاحیہ ادب، بچوں کا ادب۔ ضرورت سے زیادہ ہی پڑھ ڈالا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نامور ادیب اور شاعر بہت کچھ جانتے ہیں انھیں بھی یہ نئی نئی باتیں بتانے لگے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ یہ بچوں کے ادیب اور مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ نقادوں اور محققوں میں بھی شمار کیے جانے لگے۔ بچو! ایسے لوگوں کا آخر میں یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اب یہ بھی شخصیت سے انجمن بنے اور پھر ادارہ اور ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی کھول لی۔ جہاں پر لوگ دور دور کی یونی ورسٹیوں سے آکر تحقیق کرتے ہیں۔

آپ کی شادی مارچ ۱۹۴۴ء میں بچوں کی ادیبہ اور مزاح نگار محترمہ سرور داؤد صاحبہ سے ہوئی۔ اور سرور داؤد سے سرور جمال ہو گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا گھر لائبریری اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بن کر رہ گیا۔ اگر یہ الماری میں سے کپڑے بھی نکال لیں تو ایک جوڑ کپڑے کے ساتھ چار جوڑ کتابیں نکل آتی ہیں۔ ان کی کھانے کی میز اور ڈرائنگ روم تک پر لائبریری کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ بلا کتابیں ہٹائے اپنے بستر پر کروٹ تک نہیں بدل سکتے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ پتا لگائیں کہ باہر کے ادیب گھروں میں کس طرح رہتے ہیں۔ کراچی میں مشفق خواجہ سے مل کر مطمئن ہو گئے کہ بالکل فرنیچر سے رہ رہے ہیں۔ پھر انھیں عاقبت سنوارنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ سرور جمال صاحبہ اور ان کی ہمشیرہ محترمہ بلقیس جہاں صاحبہ حج بیت اللہ کی سعادت سے سرفراز ہو گئے۔ واپسی میں پاشا صاحب کے چہرے پر ایک عدد نورانی داڑھی کا اضافہ ہو گیا۔ ادب، تنقید اور تحقیق میں اصول برتنے لگے۔ بچو! تم بھی بڑے ہو کر ادیب اور ناقد بننے کے بعد جب حج کر کے لوٹو گے۔ تو پھر تم بھی ادب اور تنقید میں انصاف کرنے لگو گے۔

بچو! اب ہم اس وارننگ کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں کہ تم کبھی بھول کر بھی پاشا صاحب کو ہرگز خط مت لکھنا۔ کیونکہ یہ جواب کے معاملے میں بڑے کاہل ہیں۔ جس دن یہ کسی کے خط کا جواب لکھ دیں اس دن ان کے گھر میں مٹھائی بٹتی ہے۔ اگر تمھیں جواب مل جائے تو تم بھی مٹھائی بانٹنا۔ ان کے اسپیشل دستخط بھی تمھیں مل جائیں گے۔ جس کو خط لکھتے ہیں اس کی کارٹون نما تصویر بنا دیتے ہیں۔ دیکھو یہ ہیں ان کے دستخط

احمد جمال پاشا

قاضی جی کا انصاف



ایک دکان دار کی تھیلی گر گئی جس میں اُس کے پانچ سو روپے تھے۔ دکان دار نے ڈگی پٹوائی کہ۔

تھیلی ڈھونڈ کر لانے والے کو وہ ایک سو روپے انعام میں دے گا۔

ایک غریب کپڑا بننے والے مزدور کو ایک نالی کے پاس جہاں کچھ اندھیرا تھا۔ اتفاق سے دکان دار کی تھیلی پڑی مل گئی۔ اس نے تھیلی اٹھائی اور اس کے مالک کی تلاش میں چل دیا۔ راستے میں ڈگی سُن کر وہ سیدھا دکان دار کے پاس پہنچا اور بولا۔

"یہ تھیلی مجھے پڑی ملی ہے۔ لیجیے جناب"

ایمان دار مزدور نے تھیلی دے دی۔ بے ایمان دکان دار نے تھیلی کھول کر روپے گننے تو پورے پانچ سو روپے اُس میں موجود دیکھے تو وہ بڑی پریشانی میں پڑ گیا۔ سو روپے دینا اس کے حلق سے نہیں اُتر رہا تھا، روپے بھی سامنے گنے جا چکے تھے اور جناب

نوکھی نشاط افزا۔ سہوان (بہار)

پورے تھے۔ آخر اس نے بہت سوچ کر ایک چال چلی تاکہ اُسے انعام نہ دینا پڑے۔ اور بولا۔

"میں اس تھیلی کو لے کر کیا کروں گا۔ تم فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ کیونکہ اس میں ایک ہیرے کی انگوٹھی بھی تھی۔ وہ غائب ہے"

یہ کہہ کر دکان دار نے غصے سے تھیلی مزدور کو واپس کر دی۔ مزدور سمجھ گیا کہ دکان دار اسے انعام نہ دینے کے لیے یہ سب ڈراما کر رہا ہے۔ بس اس نے بھی سوچا کہ اسے اس کی بے ایمانی کا مزہ چکھانا چاہیے۔ اور وہ اس سے بہت زور شور سے لڑنے لگا۔ بھیڑ بڑھنے لگی۔ آخر لوگ دونوں کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے۔ قاضی نے دونوں کے بیانات بہت غور سے سنے پھر اس نے دکاندار سے پوچھا "تمھاری ہیرے کی انگوٹھی کیسی تھی؟ تم نے اسے کس دکان سے خریدا تھا؟ انگوٹھی کس سنار نے بنائی تھی؟ انگوٹھی رسید کہاں ہے؟ انگوٹھی کتنی قیمت کی تھی؟"

اتفاق سے دکان دار ہیرے کی انگوٹھی کی قیمت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ اگر صحیح جواب دیتا تو جیل میں بند کر دیا جاتا۔ اس لیے وہ ڈر کے مارے چپ رہا۔ قاضی جی سمجھ گئے کہ دکان دار جھوٹ بول رہا ہے۔ انھوں نے فیصلہ دیا "اس مزدور کو جو تھیلی پڑی ملی ہے۔ وہ تمھاری نہیں ہے۔ اب تم دوبارہ ڈگی پٹواؤ کہ تمھاری تھیلی میں پانچ سو روپے اور ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی۔" قاضی جی نے مزدور کو حکم دیا۔

"تم چالیس دن تک یہ تھیلی اپنے پاس بطور امانت رکھو۔ اگر چالیس دن کے اندر تھیلی کا مالک آکر یہ تھیلی نہ لے جائے اور اس کے مالک کا پتا نہ لگے تو پھر یہ تھیلی اور اس کے اندر کی ساری رقم تمھاری ہو جائے گی۔"

مزدور تھیلی لے کر ہنسی خوشی چل دیا۔ لالچی دکان دار قاضی جی کی عدالت سے اپنا منہ پیٹتا ہوا نکلا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

ضروری اعلان

طباعت اور کاغذ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے ہمیں مجبوراً پیام تعلیم کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے اب مارچ ۸۷ء سے عام شمارے کی قیمت ۲/۵۰ روپے ہوگی اور سالانہ ۳۰ روپے ہوگی۔

محمد مسیح الدین صدیقی

ہم سب کا حقیقی سرپرست و مولیٰ

"کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا۔ زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبر گیر اس کے سوا نہیں ہے۔ اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔" (کہف: ۲۶)

"تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں۔ اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست و مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔" (عنکبوت: ۲۲)

"اور لوگو! تم جو باتیں بناتے ہو ان کے مقابلے میں ہمارا ربِّ رحمٰن ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے۔" (انبیاء: ۱۱۲)

"حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔" (نمل: ۷۳)

"تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کرے گا۔" (کہف: ۱۶)

"پس! نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دو۔ اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ۔ بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ۔ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔" (حج: ۷۸)

کلمۂ حکمت دنیا کی راحت بجلی کی چمک کی طرح محض لمحہ بھر کی اور بالکل بے ثبات ہے۔ اور دنیا کی محبت، ابر کی تاریکی کے مثل۔ کہ جسے بقا اور ٹھہراؤ نہیں۔

عقلمند وہ ہے کہ نعمتِ دنیا کے حقیر فائدوں سے محبت نہ کرے اور دنیا کی سختیوں پر غم نہ کھائے۔ کیونکہ نہ یہ دائمی ہے نہ وہ مستقل!

کلمۂ حکمت جب تک کوئی زندہ رہتا ہے تو لوگ اس کی برائیاں کر کر کے اس کا جینا دشوار کر دیتے ہیں۔ اور جب مر جاتا ہے تو اس کی اچھائیاں گِنا گِنا کر روتے ہیں۔ کاش! مرنے سے پہلے ہی اس کی خوبیوں کی قدر کی جائے۔

مکان ۲۰-۴-۱۱۹۹/۳۰ لاڈ بازار حیدرآباد ۲

آغا شیدا کاشمیری

وہیل کی کہانی

(آپا گھر کے اندر ایک کمرے میں) آؤ بچو! آج تمہیں وہیل مچھلی کی کہانی سناؤں جس وہیل مچھلی کی کہانی سناؤں گی وہ کبھی بحر الکاہل میں رہا کرتی تھی پر اب معلوم نہیں کس سمندر میں رہتی ہے۔

ایک بچہ..... بحر الکاہل کسے کہتے ہیں آپا؟

آپا۔ (دہرا کر) بحر الکاہل ...... ؟ معلوم ہوتا ہے جناب جغرافیے میں بالکل کورے ہیں۔

وہی بچہ۔ (چہک کر) کون کہتا ہے میں جغرافیے میں کورا ہوں میں تو اپنی جماعت میں اوّل ہوں جی اور مانیٹر بھی!

آپا۔ جبھی کہتے ہو..... بحر الکاہل کسے کہتے ہیں۔

وہی بچہ۔ خیر ایک سوال نہ آنے کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے کچھ آتا نہیں آپ کوئی اور سوال پوچھ دیکھیں۔

آپا۔ ٹھیک ہے اچھا بتاؤ تو ایشیا کے شمال میں کیا ہے؟

بچہ: بحر منجمد شمالی۔

آپا۔ اور مشرق میں....... ؟

بچہ۔ (ہنس کر) ارے تو آپ اسی بحر الکاہل کا پوچھ رہی تھیں؟

آپا۔ اب کھلی آنکھ حضور کی۔ (باقی بچے جو پاس بیٹھے ہیں ہنس پڑتے ہیں)

دوسرا بچہ۔ اور وہ وہیل مچھلی والی کہانی کیا ہوئی آپا۔

آپا۔ (چونک کر) ارے ہاں وہ تو میں بھول ہی گئی تھی اچھا لو سنو! لیکن ہاں خاموشی سے خوامخواہ شور نہ مچانا۔ البتہ جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ پوچھ سکتے ہو۔ سمجھ گئے نا؟ ہاں تو ایک تھی وہیل مچھلی

اور ایک تھا اس کا بچہ۔ بالکل تم جیسا (بچوں کے ہنسنے کی آواز) دونوں ماں بیٹا بحر الکاہل میں تیر رہے تھے ماں بچے کو الف بے پے پڑھا رہی تھی اور بچہ فر فر پڑھ رہا تھا (بچے پھر ہنستے ہیں)

ہاں تو سبق پڑھا چکنے کے بعد مچھلی نے بیٹے سے کہا۔۔۔۔۔ آؤ اب غوطہ لگائیں اور دونوں نے غوطہ لگایا اور کچھ دیر کے لیے گہرے نیلے پانیوں میں ڈبکی لگا گئے۔ پھر جلدی انھوں نے سانس لینے کی خاطر اپنے سر باہر نکالے پھر بچے نے کہا اماں جان ہمارا بدن پانی میں یخ کیوں نہیں ہو جاتا ماں نے جواب دیا اول تو سمندر کا پانی اتنا ٹھنڈا نہیں ہوتا کہ ہمارا بدن یخ ہو جائے۔ دوسرے ہماری کھال کے نیچے چربی کی ایک موٹی تہ ہوتی ہے اور چربی ہوتی ہے سخت گرم۔ علاوہ اس کے ہمارے جسم میں ایک خاص قسم کا تیل بھی ہوتا ہے اور وہ تیل بھی کافی گرم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں ٹھنڈ محسوس نہیں ہوتی لوگ ہمارے تیل سے گلسرین اور صابن وغیرہ بناتے ہیں اس کے علاوہ چند باتیں اور بھی ہیں مچھلی نے بچے سے کہا اور وہ یہ کہ ہم عام مچھلیوں کی طرح نہیں ہیں ہماری کھال پر چانے وغیرہ نہیں ہوتے اور ہم گلپھڑوں کے بجائے پھیپھڑوں سے سانس لیتے ہیں مچھلی کی طرح گلپھڑوں سے نہیں۔ ہمارا خون آگ کی طرح گرم ہوتا ہے اور یہ کہ ہم زندہ پیدا ہوتے ہیں مچھلی کی طرح انڈے سے نہیں نکلتے۔

ایک بچہ۔ (بات کاٹ کر) آپا مچھلیاں انڈے بھی دیتی ہیں؟

آپا۔ ہاں لیکن وھیل انڈے نہیں دیتی۔ اس لیے تو ہم وہیل کو مچھلی نہیں کہہ سکتے یہ تو یوں ہی مشہور ہو گیا ہے وھیل اور مچھلی میں زمین آسمان کا فرق ہے خیر یہ ایک لمبی بات ہے اس کے متعلق پھر کبھی بتاؤں گی ہاں تو پھر وھیل کے بچے نے کہا اماں مجھے ان خشکی پر بسنے والوں سے بہت ڈر لگتا ہے میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ ہماری تاک میں لگے رہتے ہیں وھیل بچے کا جواب سن کر آگ بھبوکا ہو گئی اور غصے سے اس نے اپنی دم پانی پر اس زور سے ماری کہ قریب قریب آدھ میل تک سمندر میں ہل چل مچ گئی اور بچہ پانی میں اس طرح ہچکولے کھانے لگا جیسے کشتی پانی کی سطح پر۔۔۔۔۔۔

دوسرا بچہ۔ (حیران ہو کر) ارے تو کیا وھیل اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس سے آدھ میل تک پانی میں کھلبلی پڑ جاتی ہے۔

آپا۔ ہاں۔ وہیل عموماً اسی فٹ لمبی ہوتی ہے اور پیدائش کے وقت بیس فٹ سے کچھ اوپر۔ اور لطف یہ کہ ایک سال میں قد پچاس فٹ سے زیادہ بڑھ جاتا ہے خیر تو آگے مچھلی نے

ترش رو ہو کر بچے سے کہا ہم ذات کے دھیل ہیں اور دھیل سمندر کی سب سے طاقت ور قوم ہے ہمیں سمندر اس لیے دیا ہے کہ ہم اپنا اپنا کام کریں اور کسی سے کبھی نہ ڈریں ہمیں ڈرپوکوں جیسی باتیں نہیں کرنی چاہییں نہ ہم کسی کو تنگ کرتے ہیں نہ ہمیں کوئی تنگ کر سکتا ہے بچہ ذرا تمھاری طرح شریر تھا چھک کر بولا کہ ......

سب بچے۔ (بات کاٹ کر ملی جلی آوازیں) اے لو ہمیں خواہ مخواہ شریر بنا دیا شریر ہو گا وہ ہم کاہے کو ہونے لگے۔ ہم تو شریف ہیں...... جی ہاں

آپا۔ (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) ہاں ہاں بھئی وہی تھا یہی۔ یہ تو یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا خیر آگے سنو۔ بچے نے کہا واہ ہم تو ہر روز لاکھوں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور غریب مینڈک ہڑپ کر جاتے ہیں کیا ہم ان غریبوں کو تنگ نہیں کرتے؟ لیکن وہیل بچے کی باتیں سن کر چپ نہ رہ سکی اور بچے کو سمجھانے کی خاطر اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا اس میں شک نہیں کہ ہم اپنے سے چھوٹی مخلوق کو ہڑپ کر جاتے ہیں لیکن بیٹا اس میں ہرج کی کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ ہم ان ننھی منی مچھلیوں اور زرد پیلے مینڈکوں کے سوا اور کچھ کھا بھی نہیں سکتے تم جانتے ہو کہ اللہ میاں نے ہمیں دانت وغیرہ نہیں دیے رہا ہمارا گلا سو اتنا تنگ ہے کہ کوئی بڑی شے اس میں سے گزر ہی نہیں سکتی اور یہ جو جھالر کہ ہمارے منہ لگی ہے صرف برش کا کام دیتی ہے دھیل ابھی اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ پاس سے ایک زرد بوڑھا مینڈک گزرا بچے نے ذرا سا منہ کھولا اور دوسرے لمحے مینڈک اس کے حلق کے نیچے اتر چکا تھا ماں بچے کو گھور گھور کر دیکھنے لگی جس کا مطلب یہ تھا کہ اب کہاں گئی تمھاری ہمدردی اور رحم دلی۔ اور بچے نے اپنی دو رنگی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ دیا کہ کیا کرتا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا اسے نہ کھاتا تو اور کیا کھاتا۔

ایک لڑکا۔ (انگڑائی لے کر) بھئی واہ۔ دوسرے کو نصیحت اور آپ میاں فضیحت۔

آپا۔ لو بھئی کہانی تو ہوئی ختم۔ اب میں جاتی ہوں اور تم سب کے سب آرام سے اپنے اپنے بستروں پر جا کر سو جاؤ سمجھے کل پھر کہانی سناؤں گی۔

(بقیہ اداریہ)

اب تو آپ کے سالانہ امتحانات سر پہ آ گئے ہیں اس لیے آپ کا پہلا کام تو پڑھائی پر دھیان دینا ہونا چاہیے۔ خوب جی لگا کر پڑھیے اور کامیاب ہو کر ترقی کی منزلیں طے کیجیے۔ ہماری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں



شمیم عالم مصحفی

قیمت محنت کی

یہ بہت پرانے زمانے کی نہیں بلکہ چند سال قبل کی بات ہے۔ گوپال پور گاؤں میں ایک خوشحال کسان رہتا تھا۔ نام تھا اس کا کملشوری۔ اسکا ایک ہی بیٹا تھا تاراچند۔ جسے پیار سے گھر والے تارو کہتے تھے تارو بے حد نکما اور کاہل تھا۔ اس کی عمر کے لڑکے دن بھر کھیتوں میں کام کرتے تھے لیکن تارو اپنے جیسے ہی چند نکمے لڑکوں کے ساتھ گاؤں میں سارا دن آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا۔ حد سے زیادہ فضول خرچ ہونے کی وجہ سے اس کے خوشامد پسند دوست اس کے ساتھ ہر وقت چمٹے رہتے تھے۔

کملشوری اپنے بیٹے کی آوارہ گردی سے بہت پریشان اور فکر مند تھا وہ جب تارو کی آیند زندگی کے بارے میں سوچتا تو اسے اسکا مستقبل بے حد تاریک نظر آتا تھا وہ تارو کو راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا۔ مگر اس کو کامیابی نہیں ملی۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس کے کھیتوں میں گاؤں کے دوسرے لوگ کام کرتے تھے زمین خاصی زرخیز تھی۔ مگر کملشوری اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر تارو کی فضول خرچی اور دن بدن بڑھتی ہوئی آوارہ گردی پر روک نہیں لگائی گئی تو اس آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی وہ تمام زمینوں کو جنھیں اس نے اپنے خون اور پسینے سے سیراب کیا ہے کوڑیوں کے مول بیچ کر وہ خود کو تباہ برباد کرے گا۔ کملشوری کو اپنے پرکھوں کی اس بات پر یقین تھا کہ کسان کی عزت ان کی زمین ہوتی ہیں۔ زمین بک گئی تو باپ دادا کی عزت بھی نیلام ہو گئی۔

ایک دن کملشوری نے اپنے بیٹے کو اپنے پاس بلا کر کہا "تارو بیٹے بھگوان کی کرپا سے ہمارے یہاں روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ مگر تمھاری فضول خرچی اور آوارہ گردی سے میں بے حد پریشان رہتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری آنکھیں بند ہوتے ہی میری محنت اور خون پسینے سے حاصل کی ہوئی دولت کو چند مہینوں میں پھونک ڈالو گے میں چاہتا ہوں کہ تم عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ کر ابھی سے محنت کی عادت ڈالو۔ تاکہ تمھیں پتا چل سکے۔ کہ محنت سے حاصل کی ہوئی

(سہار)

دولت کس قدر عزیز ہوتی ہے۔ مگر باپو آپ اس کی چنتا کیوں کرتے ہیں آپ کے مرنے کے بعد آپ کی جایداد کا مالک تو میں ہی ہوں گا۔ پھر میں محنت کرنے میں اپنا وقت کیوں برباد کروں آپ کی محنت ہی میری تمام عمر کے سکھ کے لیے کافی ہے۔

بیٹے "زخمی گیدڑ کی طرح جھوٹا کھانے کی عادت مت ڈالو۔ شیر بن کر جینا سیکھو۔ شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ آج سے تمھیں جیب خرچ کے لیے ایک پیسا بھی نہیں دوں گا۔ تم خود محنت مزدوری کروگے اور جو کچھ کماؤ گے مجھے لاکر دو گے اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں اپنی ساری جایداد یتیم خانے کے نام لکھ دوں گا۔

باپو ایسا ہرگز مت کیجیے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ محنت مزدوری کروں گا اور جو کماؤں گا آپ کے ہاتھ پر لاکر رکھ دوں گا۔

باپ کی باتیں سن کر تارو بے حد دکھی ہوگیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا کھیت کی جانب چل پڑا بیٹے کا فکرمند چہرہ دیکھ کر کلیشوری کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

تارو جب اپنے خوشامد پسند دوستوں سے ملا۔ اور اپنے باپ کی شرط ان کے سامنے رکھی تو ان لوگوں کے چہروں کا رنگ پھیکا پڑگیا۔ مگر تارو کی دل جمعی کی خاطر سبھوں نے ایک زبان ہوکر کہا "اس میں فکر کرنے کی کیا بات ہے" ہم لوگوں پر تمھارے بہت احسان ہیں بطور قرض چند روپے روزانہ دے دیا کریں گے۔ جب تمھارے باپو کو یقین آجائے کہ تم ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے ہو تو دولت ہاتھ آتے ہی بیاج سمیت واپس کردینا تارو کو اپنے دوستوں کا مشورہ پسند آیا۔ اس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اور یقین دلایا کہ باپ کا اعتماد حاصل ہوتے ہی وہ انھیں اس قدر نواز دے گا۔ کہ وہ سب تصور بھی نہیں کرسکتے۔

تارو شام کے وقت اپنے باپ کی ہتھیلی پر تین روپے رکھ دیتے۔ اور اپنی انگلیاں اس طرح چٹخانے لگا۔ جیسے دن بھر کی تھکاوٹ دور کر رہا ہے۔ باپ نے مسکراتے ہوئے کہا شاباش میرے بیٹے، جاؤ۔ ان روپوں کو سامنے والے کنویں میں ڈال آؤ۔ تارو نے فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہوئے روپے کنویں میں ڈال آیا۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ تارو اپنے دوستوں سے قرض کے طور پر روپیا مانگ کر لاتا اور باپ کے کہنے پر کنویں میں ڈال آتا۔ مگر آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا، آخر کار اس کے خوشامدی دوستوں نے مزید روپے دینے سے انکار کردیا مزید ستم یہ کہ اپنے روپوں کے تقاضے

بھی کرنے لگے۔ تارو ویسے بھی اپنے باپ کے روپے سے پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس طرح کنویں میں روپے ڈال دینے سے اس کے باپ کا مقصد کیا ہے۔ مگر اس میں اپنے باپ سے یہ بات پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ تارو نے اپنے دوستوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ ان سب نے اسے جتنے روپے قرض کے طور پر دیتے تھے۔ ان سے تین گنا زیادہ وہ ان لوگوں پر خرچ کر چکا ہے مگر وہ سب تو ناچشم نکلے۔ روپے پیسے سے تعاون کرنا تو الگ، اب تو ان لوگوں نے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ تب تارو کو احساس ہوا کہ اس کے سبھی دوست موقع پرست اور خوشامدی ہیں وہ سب اس سے نہیں بلکہ اس کی دولت سے محبت کرتے ہیں۔ مگر اس وقت تارو کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ شام تک اپنے باپ کے ہاتھ میں روپے نہیں دے گا تو وہ تمام جایداد یتیم خانے کے حوالے کر دیں گے تارو ایک درخت کے نیچے بیٹھا انھیں باتوں میں کھویا ہوا تھا کہ ایک شخص اس کے قریب آیا اور بولا۔ لڑکے "میرا چرواہا دو دن سے بیمار ہے۔ تو اگر میری بکریوں کو پہاڑ کی اس جانب کی چراگاہ سے چرا کر سورج ڈوبنے سے پہلے واپس لے آیا تو میں تمھیں دو روپے دوں گا اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ تارو فوراً راضی ہو گیا اور بکریوں کو ہانکتے ہوئے پہاڑ کی دوسری جانب چل پڑا۔ دن بھر کڑی دھوپ میں بکریوں کو چراتا رہا۔ شام کو جب اسے دو روپے ملے تو خوشی کے مارے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر گیا اور باپ کے ہاتھ میں روپے پکڑا دیے۔ اس نے حسبِ معمول اپنی بات دہرائی۔

"جاؤ، انھیں کنوئیں میں ڈال آؤ ــــ"

"نہیں ــــ" تارو نے اپنے باپ کے ہاتھ سے روپے جھپٹتے ہوئے کہا "میں یہ روپے کسی قیمت پر کنوئیں میں نہیں ڈالوں گا ــــ"

"کیوں ــــ؟" باپ نے حیرت سے پوچھا۔ تارو نے روپے کو اپنی مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا۔

"باپو، میں نے ان روپوں کے حصول کے لیے دن بھر کڑی دھوپ میں پسینے کی جگہ اپنا خون جلا کر بکریاں چرائی ہیں۔ اور آپ انھیں کنوئیں میں ڈال دینے کی بات کرتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اپنے خون اور پسینے کی کمائی کو اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ بھگوان کے لیے مجھے مجبور مت کیجیے باپو ــــ"

(بقیہ صفحہ ۵۰ پر)

نسیم صادق

ٹیلیفون کی کہانی

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمیں عام زندگی میں ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کے لیے کسی آلے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اگر ہم کسی ایسے شخص سے بات کرنا چاہیں جو ہم سے کافی فاصلے پر ہے تو چاہے ہم چیخ کر بولیں تو بھی ہماری آواز زیادہ دور نہیں جا سکتی۔ اس مشکل کو دور کرنے میں سائنس نے ہماری مدد کی اور ایک ایسا آلہ ایجاد ہوا جس کی بدولت پل بھر میں دور دراز علاقوں میں رہنے والے ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہیں۔

بچو! پہلے آپ کو یہ بتا دیں کہ اس آلے کا نام ٹیلیفون کیسے بنا۔ یہ دو یونانی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ ٹیلی کا مطلب ہے دور اور فون کا مطلب ہے آواز۔ آواز کو دور تک پہنچانے کا سہرا اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنس داں گراہم بیل کے سر ہے اس نے آج سے سو سال پہلے ٹیلیفون ایجاد کیا تھا۔ گراہم بیل نے جو آلہ بنایا تھا اس کی شکل آج کے ٹیلی فون سے بہت مختلف تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایڈیسن اور دوسرے سائنس دانوں نے اس میں اضافے کیے۔ چنانچہ ٹیلیفون کی موجودہ شکل بہت سے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بچو! آپ یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ ہماری آواز بذات خود زیادہ دور کیوں نہیں جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آواز کی لہریں ہمارے منہ سے نکلنے کے بعد ہوا میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو جاتی ہیں یا یوں کہیے کہ مدھم پڑ جاتی ہیں اور یہ

،کر ہوا چونکہ ایک اچھا واسطہ یا ذریعہ نہیں ہے اس لیے آواز کو دور تک پہنچانے لیے اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ آواز کی لہروں کو پہلے بجلی کی لہروں میں بدیل کیا جاتا ہے جو تار کے ذریعے سفر کرتی ہیں۔

اب کچھ باتیں ٹیلیفون سیٹ کے بارے میں کرتے ہیں۔اس کے دو حصّے ہوتے ں۔ ایک حصّے میں ڈائل نصب ہوتا ہے۔ اور دوسرے حصّے کے مزید دو حصّے وتے ہیں۔ ایک ماؤتھ پیس (MOUTH PIECE) کہلاتا ہے جس میں آپ بولتے ہیں ور دوسرا ریسیور (RECEIVER) جسے کان سے لگا کر سنتے ہیں۔ جب آپ کسی سے ات کرتے ہیں تو ماؤتھ پیس (MOUTH PIECE) میں نصب مائیکروفون (MICROP-HONE) آپ کی آواز کی لہروں کو برقی رو میں بدل دیتا ہے۔ یہی برقی رو جب دوسری طرف سننے والے کے ریسیور (RECEIVER) میں جاتی ہے تو یہ برقی رو دوبارہ آواز ی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

بچو! ٹیلیفون، تار کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑے جاتے ہیں۔ اگر ہمیں مرف دو ٹیلیفونوں کو آپس میں ملانا ہو تو یہ کوئی مشکل بات نہ ہوگی۔ لیکن چھوٹے شہروں میں بھی آج کل ہزاروں ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ انھیں آپس میں ملانے کا کام ٹیلیفون ایکسچینج کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ مرکزی ایکسچینج سے علاقے کے سب ٹیلیفون مختلف تاروں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان تاروں کو اکٹھا کر کے کیبل (CABLE) کا نام دیا گیا ہے اور یہ زمین کی سطح کے نیچے بچھائی جاتی ہیں۔ آج کل ٹیلیفون ایکسچینج زیادہ تر خودکار ہوتے ہیں اور پہلے کی طرح آپ کا نمبر آپریٹر نہیں ملاتا۔ اس خودکار ایکسچینج سے آپ کا رابطہ ٹیلیفون کے ڈائل سے ہوتا ہے۔ ڈائل پر دس ہندسے ہوتے ہیں۔ ہر ہندسہ ایکسچینج میں مختلف خودکار سلیکٹرز کو جنبش میں لاتا ہے اس طرح جو نمبر آپ ڈائل کرتے ہیں ایکسچینج آپ کو اسی نمبر سے ملاتا ہے۔ یہ سلیکٹرز عمل میں اس وقت آتے ہیں جب ڈائل اپنی اصل جگہ پر واپس آتا ہے اس لیے ضروری کہ آپ ڈائل کو اپنے طور پر واپس آنے دیں۔

کچھ عرصہ پہلے ٹرنک کال آپریٹر کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ اب آپ ٹرنک کال بھی خود ڈائل کر سکتے ہیں اس نظام کو ایس۔ٹی۔ڈی۔ (STD) کہتے ہیں۔

بچو! آپ سوچتے ہوں گے کہ ٹیلیفون آپس میں تاروں کے ذریعے جڑے ہوئے ہوتے ہیں تو ایک بر اعظم سے دوسرے بر اعظم تک یہ کیبلز (CABLES) کیسے پہنچتی ہیں تو یہ مسئلہ بہت پہلے حل ہو چکا ہے آبدوز کشتیوں کی مدد سے سمندر کی تہہ میں ان کیبلز (CABLES) کو بچھایا گیا ہے۔ آج کل ایک اور طریقہ بھی اپنایا گیا ہے جس میں برقی لہروں کو مصنوعی سیاروں کی مدد سے جنھیں مواصلاتی سیارے کہا جاتا ہے دور دراز کے ملکوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ غرض انسان کی ترقی کے ساتھ ٹیلیفون بھی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

ضلع پریشد، ایوت محل، ایجوکیشن کمیٹی کی "پیام تعلیم" اور "کتاب نما" کے لیے سفارش،

موضوع :- اردو میڈیم اسکولوں کے لیے رسائل کی خریداری

تجویز نمبر ۹ :- مندرجہ بالا موضوع کے تحت تفصیلی بحث کے بعد متفقہ طور پر طے پایا کہ درجہ ہفتم کے طلبہ و طالبات کے لیے "پیام تعلیم" اور ہائی اسکول کے طلبہ و طالبات کے لیے "کتاب نما"، کا استعمال تعلیمی نقطۂ نظر سے مفید و موثر ہوگا۔ اس لیے میٹنگ میں دونوں رسائل اردو مدارس میں جاری کیے جانے کی سفارش کی جاتی ہے۔

محرک :- شری ایڈوکیٹ وی۔ ایس چلاتے ممبر ضلع پریشد۔

موئد :- شری ایم۔ اے۔ ونجاری۔ ضلع پریشد ممبر۔

بحوالہ مراسلہ نمبر۔ ایوت محل ضلع پریشد۔ شکشن وبھاگ سبھا۔ ۱۰ اہم۔ ۸۶۔ ایوت محل ضلع پریشد ایوت محل۔

تاریخ۔ ۸۶۔ ۱۲۔ ۱۔

امام بخاریؒ

عبدالرؤف

امام بخاری ایک بار پانی کے جہاز میں سفر کر رہے تھے، ان کے پاس ہزار اشرفیاں تھیں۔ سفر میں ایک شخص سے ان کی ملاقات ہوئی۔ امام بخاریؒ نے باتوں باتوں میں اس سے اشرفیوں کا ذکر کر دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک دن اچانک اس شخص نے شور مچا دیا اور آہ و بکا کرنے لگا۔ لوگوں نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو وہ بولا: "میرے پاس ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی تھی مگر آج وہ میرے سامان میں نہیں ہے۔"

لوگوں نے اسے تسلی دی کہا۔

"فکر نہ کرو ہم ابھی تمھاری تھیلی ڈھونڈ کر دیتے ہیں۔" جہاز والوں کی تلاشی لی جانے لگی۔ امام بخاریؒ نے یہ دیکھا تو تھیلی سمندر میں پھینک دی ان کی بھی تلاشی لی گئی۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ کسی مسافر سے تھیلی نہ نکلی۔ لوگوں نے اس شخص کو بہت شرمندہ کیا۔ سفر ختم ہوا اور جہاز کے تمام مسافر اتر گئے تو وہ شخص امام بخاریؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"آپ نے اشرفیوں کی جس تھیلی کا ذکر کیا تھا، وہ کہاں ہے؟"

امام نے کہا کہ "وہ تھیلی میں نے سمندر میں گرا دی تھی۔" اس شخص نے حیرت سے کہا کہ "اتنی بڑی رقم برباد کرنے کے لیے کیسے آمادہ ہوئے۔" امام بخاریؒ نے کہا۔

"میری پوری زندگی حدیثوں کی تدوین و ترتیب میں گزر گئی ہے اب میری دیانت اور پاکیزگی ضرب المثل بن گئی ہے۔ جو دولت میں نے عمر عزیز کے گراں قدر لمحات گنوا کر حاصل کی تھی اسے بچانے کے لیے آپ پر چوری کا شبہ کیسے ہونے دیتا۔"

(فضل الباری شرح بخاری)

رحمٰن حمیدی



ہمالہ ہندستان کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ سے دو بڑی بڑی ندیاں نکلی ہیں۔ ایک ندی کا نام جمنا ہے۔ اور دوسری ندی کا نام گنگا۔ گنگا کے کنارے ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں کا نام ہیرا پور ہے۔ یہ کہانی اسی گاؤں کی ہے۔

اس گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کا نام راج کمار تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ خدا نے اسے صرف ایک اولاد دی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو پیار سے ہیرا کہا کرتا تھا۔ وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اس لئے وہ اپنے بیٹے کو ماں کی کمی نہیں محسوس ہونے دیتا تھا۔

ہیرا نیک اور شریف لڑکا تھا۔ باپ کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ کھیت پر اپنے باپ کے لیے کھانا اور پانی لے جاتا۔ جانوروں کو چارہ کھلانے میں مدد کرتا۔ وہ کھیل کود میں بہت کم رہتا۔ گاؤں کے شریر لڑکوں سے وہ ہمیشہ دور دور رہتا تھا۔ گاؤں کے آوارہ لڑکے بھکاریوں کی تاک میں لگے رہتے۔ بھکاریوں کو طرح طرح سے ستاتے کبھی بھکاری کے خالی کٹورے میں کنکر ڈال دیتے۔ کبھی لنگڑے بھکاری کا ڈنڈا چھپا دیتے، اندھے بھکاری کو غلط راستے پر کھڑا کر دیتے۔ ہیرا اس طرح کی باتوں سے بے چین ہو جاتا۔ وہ چھپ کر بھکاریوں کی مدد کرتا۔ انھیں تھوڑا بہت اناج دے کر گاؤں کے باہر پہنچا دیتا۔ بھکاری اسے دعائیں دے کر چلے جاتے۔

ایک دن ایک بڑھیا گاؤں کے اندر بھیک مانگنے کے لیے آئی۔ اس کی شکل بے حد ڈراونی تھی۔ اسے دیکھ کر عورتوں نے اپنے اپنے بچوں کو گود میں چھپا لیا۔ کچھ عورتوں نے اپنے اپنے گھروں کا دروازہ بند کر لیا۔ بڑھیا ہر دروازے پر رکتی۔ آواز لگاتی اور جب کچھ نہ ملتا تو آگے بڑھ جاتی۔ اسے دیکھ کر گاؤں کے سارے لڑکے اکٹھا ہو گئے۔ ایک لڑکے نے اچھل کر بڑھیا کا خالی کٹورا چھین لیا۔ دوسرے لڑکے نے چپکے سے اس کے ہاتھ کا ڈنڈا چھین لیا۔ بڑھیا کے مانگنے پر لڑکے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ ہیرا دور سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بڑھیا

دکھ پہنچا کر بچے خوش ہوتے تو ہیرا کو بے حد دکھ ہوتا۔ وہ لڑکوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور بڑھیا کو سہارا دیکر اپنے گھر لے آیا۔ بڑھیا بے حد کمزور اور لاغر تھی گاؤں کے آوارہ لڑکے بھی اسی طرف آچکے تھے اور بڑھیا کو ستانے کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ ہیرا نے بڑھیا کو کھانے پیش کیا لیکن جیسے ہی بڑھیا نے کھانے کے لیے لقمہ اٹھایا ایک لڑکے نے غلیل سے ایک کنکر اس کی ہتھیلی پر مارا لقمہ بڑھیا کی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ درد کے مارے چیخ پڑی اس کے ہاتھ سے خون ابل پڑا۔ لڑکے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

ہیرا کو بہت غصہ آیا۔ ہیرا کے تیور کو دیکھ کر سارے لڑکے ادھر اُدھر بھاگ گئے، ہیرا دوڑ کر گھر کے اندر گیا اور پرانے کپڑے لے کر آیا۔ بڑھیا کو سہارا دیکر اٹھایا۔ اور پرانے کپڑے سے زخم پر پٹی باندھی اور اپنے ہاتھ سے روٹی توڑ کر اسے کھلانے لگا۔ بڑھیا کھانا تو کھا رہی تھی لیکن درد سے کراہ بھی رہی تھی۔ بڑھیا کو اس حال میں دیکھ کر ہیرا کا دل درد سے بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ بڑھیا تے غور سے ہیرا کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کر کے بولی۔

"بیٹا! میں اس گاؤں کے اندر بھیک مانگنے کے لیے نہیں آئی تھی! میں تو گاؤں کے لڑکوں کو دیکھنے کے لیے آئی تھی کہ مجبور۔ اپاہج۔ اور بھکاری کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ انسان کے دکھ درد میں آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو روپے، پیسے سے زیادہ قیمتی ہے۔ اب میں جارہی ہوں۔ اپنے قیمتی جواہرات کو اٹھالو ــــــ!!

اتنا کہہ کر بڑھیا نظروں سے غائب ہوگئی۔

ہیرا کی آنکھ سے ٹپک کر جو آنسو زمین پر گرے تھے، وہ قیمتی جواہرات بن چکے تھے۔ ہیرا نے ان جواہرات کو اٹھالیا۔ اور شہر لے جاکر فروخت کیا۔ اور پھر وہ گاؤں کا سب سے بڑا دولت مند آدمی بن گیا۔

یہ خبر پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور سارے لوگ اس گاؤں کو ہیرا پور کہنے لگے۔

شبنم آرا

عقلمند کسان



بہت دنوں پہلے کی بات ہے کسی گاؤں کی چوپال میں بیٹھے ہوئے چند کسان آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ اسی وقت ایک امیر کسان وہاں آیا اور کہنے لگا!

"تم لوگ میرا مقابلہ کیا کر سکتے ہو۔ میں تو کئی بار زمیندار کی گاڑی میں سفر کر چکا ہوں"

یہ سنتے ہی وہیں بیٹھے ایک غریب کسان نے جو بڑا عقلمند بھی تھا جواب دیا۔

"ارے زمیندار کے ساتھ سفر کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ میں جب چاہوں تو مہمان بن کر اس کے ساتھ کھانا بھی کھا سکتا ہوں"

امیر کسان کو یہ سنتے ہی غصہ آگیا۔ وہ بولا۔

"کیا کہا؟ تم زمیندار کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہو؟ یہ ماننے کی بات ہی نہیں ہے۔ میں اس پر شرط لگانے کے لیے تیار ہوں"

"اچھی بات ہے میں گھمنڈ تو نہیں کرتا مگر تم شرط لگاؤ۔ میں تمھیں زمیندار کے ساتھ کھانا کھا کر دکھا دوں گا" غریب کسان نے بڑے اعتماد سے کہا۔

بہرحال ان دونوں میں شرط لگ گئی کہ اگر غریب کسان زمیندار کا مہمان بن کر اس کے گھر دعوت کھائے گا تو امیر کسان اسے دو گھوڑے دے گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکا تو اسے دو سال تک امیر کسان کے کھیتوں میں مفت کام کرنا ہوگا۔

اس واقعے کے دوسرے ہی دن غریب کسان زمیندار کے گھر پہنچا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "حضور! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری ٹوپی کے سائز کے سونے کا ٹکڑا

معرفت نفیس احمد۔ تارنی پرساد لین۔ پٹنہ ۔ ۸

کتنی قیمت کا ہوگا؟"۔۔۔ زمیندار نے بڑے غور سے اس غریب کسان کو دیکھا۔
"حضور! میں یہ پوچھ رہا تھا کہ سونے کا ایک ٹکڑا جو میری ٹوپی کے سائز کا ہو۔۔۔"
غریب کسان نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
زمیندار بڑا لالچی تھا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے بیچ میں ہی کسان کی بات کاٹ دی اور اپنے نوکر کو آواز دے کر کہنے لگا۔
"ارے رامو یہ میرے مہمان ہیں، بھاگ کر جاؤ اور ہم دونوں کے لیے مٹھائی اور چائے لے آؤ۔ اس کے بعد دو آدمیوں کا کھانا بھی لگا دینا" پھر وہ غریب کسان سے بولا۔
"ارے بھائی اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے ذرا دم لو اور کچھ کھاؤ پیو۔ پھر میں تمہارے سوال کا بھی جواب دوں گا" غریب کسان نے ہاتھ جوڑے اور کہنے لگا۔
"حضور گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں۔ بھلا۔۔۔۔" لیکن زمیندار نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا بڑی اپنائیت سے بولا۔
"ارے میرے بھائی اطمینان سے بیٹھو"
"پہلے چائے پیو۔ پھر کھانا کھاؤ۔۔۔ اس کے بعد آرام سے باتیں کریں گے"۔ اسی بیچ زمیندار کا نوکر واپس آ گیا۔ زمیندار نے ضد کر کے کسان کو مٹھائی کھلائی اور چائے پلائی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اتنی دیر میں کھانا بھی لگ گیا۔ اور غریب کسان نے ایک ہی دسترخوان پر زمیندار کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر چائے کا دور چلا اور تب زمیندار اس غریب کسان سے کہنے لگا۔
"ہاں تو اب تم جلدی سے گھر جاؤ اور وہ سونے کا ٹکڑا لے آؤ۔ میں تمھیں اس کے بدلے ایک من آٹا اور ایک روپیا نقد دوں گا"
"سونے کا ٹکڑا؟۔۔۔۔۔ لیکن سونے کا ٹکڑا میرے پاس ہے کہاں ہے میں تو بس یوں ہی جاننا چاہتا تھا کہ اس سائز کا سونے کا ٹکڑا کتنے کا ہوگا؟"
غریب کسان نے بڑی متانت سے کہا۔ یہ سنتے ہی زمیندار غصے سے پاگل ہو گیا اور چلّانے لگا۔
"بے وقوف آدمی! اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔۔۔"
وہ غریب کسان زمیندار کے گھر سے باہر نکلتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولا۔ "حضور اور چاہے جو کچھ ہو مگر بے وقوف تو میں نہیں ہوں میں نے آپ کے ساتھ بیٹھ کر مٹھائی کھائی

چائے پی اور بہترین کھانا کھایا۔ ساتھ ہی میں نے ایک شرط بھی جیت لی جس کے مطابق آپ کے ساتھ کھانا کھانے کے بدلے مجھے دو گھوڑے ملیں گے۔"

یہ سن کر زمیندار بھونچکا رہ گیا۔ غریب کسان اسے چھوڑ کر گاؤں واپس پہنچا۔ اس نے امیر کسان سے دو گھوڑے لے لیے۔ اور اپنی عقل مندی پر مسکراتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بقیہ صفحہ ۱۴ کا

کملشوری جو چار پائی پر بیٹھا، بیٹے کی باتوں کو دلچسپی سے سن رہا تھا، اٹھ کر تارو کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"بیٹا، بھگوان کا شکر ہے۔ تیری آنکھیں وقت پر کھل گئیں۔ محنت کی کمائی برباد ہوتے دیکھ کر مجھے بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی تھی، جتنی اس وقت تمھیں ہو رہی ہے۔ بیٹا، آج میرے پاس جو کچھ بھی ہے میری اپنی محنت اور لگن کا پھل ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ تم بھی اپنے باپ کی طرح خوب دل لگا کر محنت کرو اور مجھ سے بھی زیادہ خوشحال کسان بن کر دیکھاؤ۔ یہ ایک کسان کا سپنا ہے بیٹا، جسے پورا کرنا تمھارا فرض ہے!"

"باپو، مجھے معاف کر دیجیے میں برے دوستوں کی صحبت میں پڑ کر اپنے راستے سے بھٹک گیا تھا ____" کملشوری نے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! خوشامدی اور موقع پرست کبھی کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اب میری تمام جائیداد کے مالک تم ہو۔ تم انھیں جس طرح چاہو خرچ کر سکتے ہو ____"

"نہیں باپو، اب میں آپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے صرف آپ کا آشیرواد چاہیے ____"

"شاباش بیٹے، مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی ____" یہ کہتے ہوئے کملشوری نے تارو کو ایک بار پھر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا ____"

دل چسپ خبریں

روسی پرندے کھانے سے متعدد افراد پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا۔

ٹھٹھہ، دسمبر (پ پ) ضلع ٹھٹھہ کے علاقہ میں متعدد افراد پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ بیماریاں روس سے نقل مکانی کرکے آنے والے پرندوں کا گوشت کھانے سے پیدا ہو رہی ہیں اور شبہ ہے کہ یہ پرندے چرنوبل کے ایٹمی ری ایکٹر سے خارج ہونے والی تابکاری سے متاثر ہیں ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کے پاس معدے کے درد اور پیچش کے مریض بڑی تعداد میں آرہے ہیں اور ابتدائی تحقیقات کے مطابق انہیں روس سے نقل مکانی کرکے آنے والے پرندوں کا گوشت کھانے سے یہ بیماریاں لاحق ہو رہی ہیں یہ پرندے ہر سال سردیوں میں روس سے اڑ کر ٹھٹھہ کے ضلع میں آجاتے ہیں کیونکہ یہاں بڑی تعداد میں ندیاں پائی جاتی ہیں ڈاکٹروں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس معاملہ کی تفصیلی تحقیقات کرائی جائیں کہ روس سے آنے والے پرندے تابکاری سے متاثر ہیں یا نہیں۔

طویل داستان

طویل القامت بانس کے مانند اس شخص کا نام مینوٹ بول ہے۔ وہ امریکہ میں واشنگٹن بلیٹس کے لیے باسکٹ بال کھیلتا ہے۔ ۷ فیٹ ۷ انچ طویل القامت بول سوڈان کا رہنے والا ہے۔ اپنے جسم کی عجیب و غریب ساخت کے باوجود وہ دنیا کے سب سے زیادہ مقابلہ آرائی کے اسپورٹنگ لیگ نیشنل باسکٹ بال ایسوسی ایشن میں کھیل کر گذر اوقات کے لیے اچھی رقم کما رہا ہے۔ اسے خرطوم میں سوڈانی نیشنل ٹیم کے لیے کھیلتے ہوئے ایک امریکی کوچ نے دیکھا اور اسکی ہمت افزائی کی۔ انگریزی سیکھنے کے بعد اسے کنیکیٹ میں برج پورٹ یونیورسٹی لے جایا گیا جہاں اس نے کالج حلقے میں عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۸۶ء میں بول نے سنسنی خیز ۸۲ گیم سیشن میں عمدہ کارکردگی کے ذریعے واشنگٹن ٹیم کو آگے بڑھایا اس وقت وہ اپنا وزن بڑھانے کی فکر میں ہے کیونکہ اسکا وزن صرف ۱۸۷ پونڈ ہے

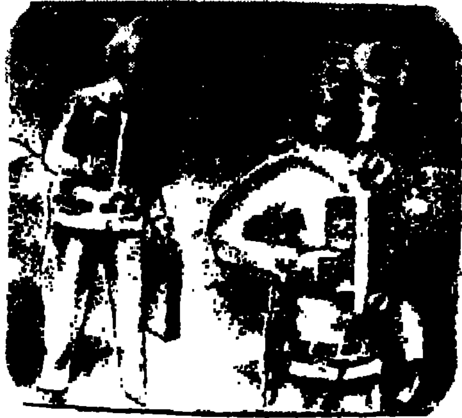


روبوٹ کی دنیا

سائی بورگ کس قسم کا روبوٹ ہے؟

بشیر محمود

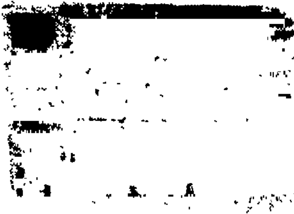
9



بایونک کا لفظ دو الفاظ کے ملنے سے بنا ہے یہ الفاظ بایلوں جیکل اور الیکٹرانک ہیں یہ ایک الیکٹرانک مشین دکھانے کے لیے سامنے لایا جاتا ہے جو زندہ شخصیت کے کسی حصے کا کام بخوبی انجام دے سکتا ہو۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی سکس ملین ڈالر مین کی کہانی ایک عرصے تک ٹی وی پر دکھائی جاتی رہی ہے۔ سائی برگ بی بی سی کے ٹیلی ویژن کے پروگرام ڈاکٹر ہو میں دکھائے جاتے رہے ہیں۔ یہ سائی برگ کبھی زندہ انسان تھے جوں جوں یہ عمر رسیدہ ہوتے چلے گئے تو ان اعضا میں روبوٹ فٹ کر دیے جاتے رہے حتیٰ کہ ان کے دماغوں میں بھی کمپیوٹر لگا دیے مگر یہ سب کچھ صرف قصے کہانیوں تک ہی محدود ہے اس کی اصل حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

روبوٹ کا دماغ؟

10





روبوٹ کا دماغ ہندسوں والے ایک کمپیوٹر پر مشتمل



ہوتا ہے۔ اس قسم کا کمپیوٹر ہندسوں کے ذریعہ کام کرتا ہے یہ ہر قسم کی اطلاع یا خبر کو خفیہ اشاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

کمپیوٹر کو چلانے کے لیے اسے اطلاعات مہیا کرنا ہوتا ہے عموماً اپریٹر ان کو یہ اطلاعات مہیا کرتا ہے۔ وہ صرف حروف کو ٹائپ کرتا ہے اس طرح کمپیوٹر میں بے شمار اطلاعات جمع ہو جاتی ہیں اور پھر بغیر کسی قسم کی غلطی کے یہ مطلوبہ نتیجہ نکال کر دکھا دیتا ہے۔ سب سے پہلا کمپیوٹر بہت بھاری تھا اس میں سیکڑوں بٹن اور تاریں لگی ہوئی ہوتی تھیں پھر والوز کی جگہ پر ٹرانسسٹر لگا دیے گئے اور ان کا حجم کم ہو گیا اور اب تو یہ ساری اشیا ایک سلی کون پٹی میں لگا دی جاتی ہیں۔

11 کیا روبوٹ خطرناک ہوتے ہیں؟

روبوٹ کے متعلق یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ یہ بہت منحوس ہوتے ہیں اور یہ ایسی مخلوق ہے جو بنی نوع انسان کے لیے نقصان دہ ہے چنانچہ بہت سی ایسی فلمیں تیار کی گئی ہیں جن میں روبوٹس کو خوفناک دکھایا گیا ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ روبوٹس ایسی مخلوق ہے جو انسانی نسل کو ختم کرنا چاہتی ہے یعنی انسان کی دشمن ہے اور انسان کو روئے زمین سے نکال باہر کرے گی۔ چنانچہ "ڈاکٹر ہو" کی فلموں کے کردار روبوٹس اسی قسم کے ہی دکھائے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ہو کی فلموں کے کردار انسانوں سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں اور ہر وقت ایذا دہی کی سوچتے رہتے ہیں۔

تیار کر رہا ہے وہ الٹ
کیسے ہو سکتا ہے وہاں اگر کسی دوسری دنیا کے روبوٹ زمین پر اتر آئیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمین کے باسیوں کو ضرور یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ اب تو جس طرح کے روبوٹ ہم بنائیں گے اسی طرح کا عمل وہ کریں گے۔

12

روبوٹ کا دماغ کیسے کام کرتا ہے؟





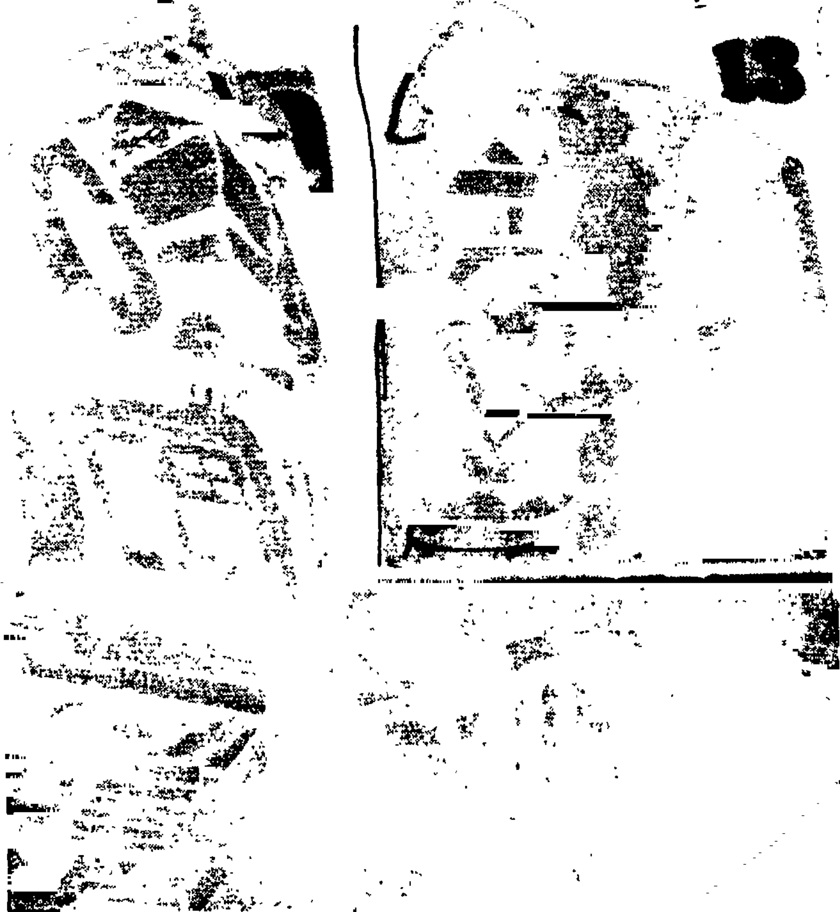
روبوٹ کا دماغ یا کمپیوٹر کئی حصوں پر مشتمل ہوتا ہے سب سے پہلے ایک "ان پٹ" یونٹ کا ذکر کرتے ہیں اس کے ذریعے سے کمپیوٹر کو ڈیٹا جمع کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے کمپیوٹر کو بتایا جاتا ہے کہ اسے فلاں کام کرنا ہے۔ "ان پٹ" یونٹ کی بورڈ یا کوئی دوسرا حصہ بھی ہو سکتا ہے۔

کمپیوٹر کے اندر سنٹرل پراسیسنگ یونٹ خبروں کا مواد حاصل کرتا ہے اور اس مواد کو دوسرے یونٹ میں بھیج دیتا ہے۔ حساب کتاب والا یونٹ اپنا ضروری کام انجام دیتا ہے اور "یادداشت" جس مزید اطلاع کی ضرورت ہو اسے فراہم کرتی ہے۔ بعض اوقات ایک کمپیوٹر کو کسی مزید "یادداشت"

...ن رہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

بیشتر فلموں اور کتابوں میں ایسے روبوٹ دکھائے گئے ہیں جن کا مقصد بنی نوع انسان کی خدمت کرنا اور ان کو خوش رکھنا ہے۔ مثال کے طور پر ایک انگریزی فلم "ڈبر دی گریٹ" جو ۱۹۵۴ء میں تیار کی گئی۔ خاص طور پر بچوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں کام کرنے والے روبوٹ جن اصولوں پر عمل کرتے تھے۔

یہ کہانی ۱۹۴۰ء کے دھائے میں تحریر کی گئی تھی۔



بچوں کے لیے

نئی اور دلچسپ کتابیں

		پہاڑ کی چوٹی پر	۵/۰۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
		رنگوں کی بستی	۲/۵۰	پیارے رسول	۴/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/۰۰	سرخ جوتے	۲/۰۰	چار یار	۴/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۶/۰۰	سلامہ وصمصامہ	۴/۵۰	رسول پاک کے اخلاق	۲/۰۰
اندھے کا بیٹا	۴/۵۰	شرارت	۲/۰۰	ہار کی تلاش	۶/۰۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰	صحت کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰	بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/۰۰	صحت کی الف بے	۳/۰۰	بندر اور نائی	۲/۵۰
سہانے ترانے	۴/۵۰	جدید پہیلیاں	۶/۰۰	بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
ہرن کا دل	۲/۰۰	مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰	تاک دنا دن تاکے سے	۱/۵۰
اچھی کہانیاں	۲/۵۰	ننھا فرشتہ	۴/۵۰	پانچ بونے	۱/۵۰
دریا کی رانی	۲/۰۰	نیلا ہیرا	۴/۵۰	ایک دیس ایک خون	۳/۰۰
گوہر شہزادی	۳/۰۰	ماں کی کھیتی	۲/۵۰	جیت کس کی؟	۲/۵۰
شریر شیرا	۳/۰۰	ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰	انعامی مقابلہ	۳/۲۵
پری رانی	۳/۰۰	سرکار کا دربار	۴/۵۰	جادو کا گھر	۱/۵۰
خطرناک سفر	۳/۵۰	دنیا کے جانور	۲/۵۰	چیونٹی رانی	۱/۵۰
اندرا گاندھی	۴/۵۰	آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰	روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰	اس نے کیا کر نہ جانا	۱/۲۰	لال مرغی	۱/۵۰
ننھا جبرو	۲/۵۰	خرگوش کی چال	۲/۵۰	لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۰۰	بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰	مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
پلک نہ مارو	۴/۰۰	جوہر قابل	۲/۰۰	ہپو چپو	۱/۵۰
ایک کھلا راز	۳/۰۰	خرگوش کا سپنا	۵/۰۰	بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
بابا نامے	۲/۰۰	موم کا محل	۴/۰۰	شیر خاں	۱/۵۰
بچوں کے افسر	۵/۰۰	محمد شفیع الدین نیّر	۲/۵۰	لومڑی کے بچے	۱/۵۰

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اپریل ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۴

قیمت فی پرچہ: 3/50 سالانہ: 30/=
غیر ممالک سے: نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز: بارہ ڈالر
فی پرچہ: ایک ڈالر

منیجنگ اڈیٹر: شاہد علی خاں
اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری
معاون: مختار احمد، منیر
تزئین کار: ایس، ایم، مظہر

کچھ اپنی باتیں

لیجیے اپریل کا [illegible] حاضر ہے۔
[illegible] ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر پسند کیا گیا۔

شہرت حاصل کرنے کی خواہش سب کو ہوتی ہے کسی کو کم کسی کو زیادہ اس کے حصول کے کئی طریقے ہیں۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی محنت کرے جو لوگ ایسا نہیں کرتے انھیں منزل تک پہنچنے میں تھوڑی بہت کامیابی تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ وقتی ہوتی ہے پائیدار نہیں ہوتی۔

شہرت کا ایک ذریعہ اخباروں یا رسالوں میں اپنا نام چھپوانا بھی ہے لیکن یہاں بھی بات وہی ہے کہ نام صحیح طریقے پر چھپوایا جائے شاعر ہو یا ادیب اگر اس کا کلام یا مضمون اچھا ہے تو لوگ اسے پسند کرتے ہیں بخل سے کام نہیں لیتے لیکن غلط چیزوں کے ذریعے شہرت حاصل کرنے کی کوشش اس کو نہ صرف بدنام کر سکتی ہے بلکہ اس کی راہ میں روڑے بھی اٹکا دیتی ہے۔

نومبر ۸۵ء کے پیامِ تعلیم میں "ایک تھا بیوقوف" کہانی ایک صاحبزادے کی بھیجی ہوئی شائع کی گئی تھی پندرہ مہینے کے بعد انھیں صاحبزادے نے وہی چھپی ہوئی کہانی اپنے ہی نام سے دوبارہ بھیج دی یہ بہت غلط طریقہ ہے یہ صرف اس لیے اپنایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ پھر ان کا نام چھپ جائے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں

پرنٹر، پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا



محمد منیر غلام محمد بکر شہاب



میرے دل کو روشن کر دے یا اللہ　　　میرا خالی دامن بھر دے　یا اللہ

جس کی آنچ میں تپ کر کندن بن جاؤں　　　مجھ کو ایسا سوزِ جگر دے　یا اللہ

رات اندھیاری اور ہے منزل کوسوں دور　　　روشن دل، پُر نور نظر دے　یا اللہ

بستی بستی صحرا صحرا گھوم چکا　　　مجھ کو اپنے در کی خبر دے　یا اللہ

میری ہستی ایک مسلسل غم کی رات　　　اس کو اک خوش رنگ سحر دے یا اللہ

تیرے سوا جو اور کسی در پر نہ جھکے　　　ایسا غیرت والا سر دے　یا اللہ

میرا جینا مرنا سب ہو تیرے لیے　　　اپنی محبت، اپنا ڈر دے　یا اللہ

تو میرا بن جائے یہی ہے ایک دعا
میری دعا سے دل کو اثر دے یا اللہ

بہادر شہزادہ

ایم یوسف

سیکڑوں برس پہلے کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا اس کے چار بیٹے تھے۔ شہزادہ امیر، شہزادہ امین، شہزادہ قمر اور شہزادہ آفتاب۔ ان میں سب سے چھوٹا شہزادہ آفتاب تھا۔ پہلے تین شہزادوں کی شادیاں ہو چکی تھیں لیکن چھوٹا شہزادہ ابھی کنوارہ تھا۔ تینوں بڑے بھائی چھوٹے بھائی کو بہت چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تینوں بھابیاں شہزادے آفتاب سے جلا کرتی تھیں۔ ایک دن شہزادہ آفتاب شکار کھیل کر واپس آیا اور باغ سے گزرتا ہوا محل کی طرف جا رہا تھا۔ تینوں بھابیاں باغ میں بیٹھی ہوئی آپس میں کچھ باتیں کر رہی تھیں۔



آفتاب کو آتے ہوئے دیکھ کر ایک بھابی بولی۔ ذرا شہزادے کو تو دیکھو۔ بھائی بچارے سارا سارا دن بادشاہ سلامت کا حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہ چھوٹا شہزادہ نکھٹوؤں کی طرح کوئی کام نہیں کرتا اور آوارہ گردی کر کے مفت کی روٹیاں کھاتا ہے؛ دوسری بھابی نے کہا: ہاں بہن اسے کوئی شہزادی بھی پسند نہیں آتی کہ اس کا بیاہ ہو۔ میں تو اس کے کام کاج کر کر کے تنگ آ چکی ہوں۔ تیسری بولی: ارے تم جانتی نہیں، یہ شادی اس لیے نہیں کرتا کہ اس کو تو شہزادی نور محل کو بیاہ کر لانا ہے۔ اس پر تینوں بھابیوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بھابیوں کے ان طعنوں کو سن کر شہزادہ آفتاب کو بہت غصہ آیا اور اس نے طے کیا کہ جب تک شہزادی نور محل کو بیاہ کر نہ لے آؤں

بھابیوں کو شکل نہیں دکھاؤں گا۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بغیر سوچے سمجھے ایک سمت چل دیا خاصی دور جاکر اسے اس بات کا احساس ہوا کہ نہ جانے نور محل کون ہے۔ کس ملک کی شہزادی ہے۔ بھابیوں سے معلوم تو کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن اب وہ بہت دور آچکا تھا اس لیے واپس جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کئی دن کے سفر کے بعد وہ جنگل میں آرام کرنے کی غرض سے ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اس نے دیکھا بہت سی چونٹیاں ایک قطار میں درخت پر چڑھ رہی ہیں اور پھر اسے ایک بہت عجیب و غریب چونٹی نظر آئی جو دوسری چیونٹیوں سے خاصی بڑی تھی اور اس کی رنگت بھی نارنجی رنگ کی سی تھی۔ ایک اور بات جس پر وہ چونک پڑا، یہ تھی کہ اس چیونٹی کے سر پر بہت چھوٹا سا تاج بھی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ چیونٹی دوسری چیونٹیوں کی رانی ہے۔ وہ بڑے غور سے اس چیونٹی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ چیونٹی نے بھی یہ بات محسوس کرلی کہ شہزادہ اسے دیکھ کر حیران ہو رہا ہے وہ بولی: "شہزادے تم مجھے دیکھ دیکھ کر کیوں حیران ہو رہے ہو۔ کیا تم نے کبھی کسی رانی کو نہیں دیکھا؟" یہ آواز بہت مہین تھی لیکن شہزادے نے سن لی اور بولا: "اچھی رانی میں خود شہزادہ ہوں میں نے دوسرے ملکوں کی بہت سی رانیاں دیکھی ہیں لیکن کسی چیونٹی رانی کو پہلی بار ہی دیکھ رہا ہوں" شہزادے نے جواب دیا: "اچھا شہزادے تم یہ بتاؤ تم جا کہاں رہے ہو؟" چیونٹی رانی نے پوچھا۔

"میں شہزادی نور محل کی تلاش میں نکلا ہوں" شہزادے نے بتایا۔

اس پر چیونٹی رانی ہنس دی اور بولی: "شہزادے شہزادی نور محل تو یہاں سے بہت دور ایک ملک کی شہزادی ہے تم وہاں کیسے پہنچو گے؟"

"تو کیا تم شہزادی نور محل کو جانتی ہو کہ وہ کس ملک کی شہزادی ہے؟" شہزادے نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں شہزادے وہ کوہ قاف میں پریوں کی شہزادی ہے" چیونٹی رانی نے بتایا۔

"اچھا رانی تمہارا بہت بہت شکریہ" یہ کہتے ہوئے شہزادہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چل دیا۔ چلتے چلتے کئی دن کے سفر کے بعد وہ ایک سمندر کے کنارے جا پہنچا۔ اچانک اس کی نظر پانی پر چلتے ہوئے ایک بزرگ پر پڑی جو کنارے کی طرف آرہے تھے۔ شہزادہ حیرت زدہ انھیں پانی پر چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ کنارے پر پہنچ کر وہ اس کی طرف آئے اور بڑی شفقت سے بولے:

"بیٹا تو اس ویران ساحل پر کھڑا کیا کر رہا ہے؟"

"بابا میں کوہ قاف جانا چاہتا ہوں۔ آگے سمندر ہے اور راستہ مجھے معلوم نہیں" شہزادے نے انکساری سے کہا۔

"بیٹے کوہ قاف تو یہاں سے بہت دور ملک ایران کے برفانی علاقے کی طرف ہے۔ تم بھلا وہاں کیسے پہنچو گے؟" بزرگ نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بابا آپ ہی میری رہنمائی کریں۔ میں ساری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گا" شہزادے نے التجا کرتے ہوئے کہا۔



اس بزرگ کو شہزادے پر رحم آگیا اور انھوں نے اپنی کھڑاویں شہزادے کو دیں اور کہا۔ "شہزادے تم یہ کھڑاویں پہن لو اور جہاں جانا چاہو گے بس اتنا کہہ دینا کہ میں فلاں جگہ جانا چاہتا ہوں کھڑاویں تمھیں اڑا کر وہاں پہنچا دیں گی لیکن شہزادے اس کے بدلے میں تمھیں مجھ سے بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ تم کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔ ماں باپ کی خدمت کرو گے اور غریبوں پر احسان کرتے رہو گے۔"

شہزادے نے وعدہ کیا اور کھڑاویں پہن کر بولا: "مجھے کوہ قاف جانا ہے۔" اس کا اتنا کہنا تھا کہ وہ فضا میں اڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ برفانی پہاڑوں پر جا پہنچا جہاں کی ہر شے دودھ کی طرح سفید اور چاندی کی طرح چمکدار تھی اور پھر آسے ایک بڑا ہی خوبصورت محل نظر آیا۔ دھوپ کی وجہ سے وہ نور کی طرح جگمگا رہا تھا۔ شہزادہ وہ محل کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اچانک بہت سی پریوں نے اسے پکڑ لیا اور اپنے بادشاہ کے پاس لے گئیں۔

بادشاہ نے پوچھا "شہزادے تم یہاں کس غرض سے آئے ہو؟" شہزادے نے سوچا اسے سچ سچ بتا دینا چاہیئے۔ چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ کیوں کہ اس نے بزرگ بابا سے سچ بولنے کا وعدہ کیا تھا اور پھر اس نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ شہزادی

نور محل کو بیاہنے آیا ہے: اس کی اس بات پر بادشاہ آگ بگولہ ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اس گستاخ نوجوان کو لے جاکر قتل کر دو بس پھر کیا تھا۔ اسے لے جاکر ایک درخت کے ساتھ باندھا گیا اور جیسے ہی ایک پہرے دار نے تلوار سے اس کا سر قلم کرنا چاہا تو اس کا وہ ہاتھ پتھر کا بن گیا۔ اب تو دوسرے پہرے دار بہت گھبرائے اور یہ ماجرا انہوں نے بادشاہ کو سنایا۔ یہ سن کر بادشاہ بھی خوف زدہ ہوا اور اس نے حکم دیا کہ شہزادے کو باعزت چھوڑ دیا جائے اور ہمارے پاس محل میں لایا جائے ہم اس کی شادی اپنی بیٹی شہزادی نور محل سے کریں گے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خوب زور شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اور شہزادے کی شادی شہزادی نور سے کر دی گئی۔ اسی وقت وہ بزرگ وہاں آموجود ہوئے اور بولے:۔

شہزادے تم نے سچ کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہ کی اس لیے ہم نے تمھیں موت کے منہ سے بچالیا۔ اگر تم جھوٹ بول کر چھوٹ جاتے تو تم پر اور کئی مصیبتیں نازل ہوتیں اور تم ہلاک ہو جاتے اور پھر وہ دعائیں دیتے ہوئے غائب ہو گئے۔

شہزادہ آفتاب شہزادی نور محل کو ساتھ لے اور اڑن تخت پر بیٹھ اپنے ملک پہنچا تو اس کا زبردست استقبال ہوا۔ بھائیوں کو شرمندگی ہوئی اور پھر کبھی انھوں نے شہزادے کو برا نہ جانا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

●●

بچوں کے اقبال

مرتبہ

ڈاکٹر اطہر پرویز

اس کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ کئی غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل ہیں جو علامہ اقبال نے خاص طور پر بچوں کے لیے کہی تھیں۔

4/50

اندھے کا بیٹا

(کورا و غلو)

محمد بھرنگی

ترجمہ

پروفیسر شعیب اعظمی

کورا وغلو کی بہادری کی داستانیں دلچسپ بھی ہیں، حیرت انگیز بھی۔ پڑھیے اور لطف اٹھایئے۔

قیمت ۲/۵۰

قومی ادبی ایوارڈ

بچوں کے ممتاز ادیب غلام حیدر صاحب کو این، سی، ای، آر، ٹی کے ۲۳ ویں قومی ادبی انعامی مقابلے میں پانچ ہزار روپے آپ کی نئی کتاب "آزادی کی کہانی۔ انگریزوں اور اخبارات کی زبانی" پر ملا



اعجاز علی ارشد

شیر اور راہ گیر

ایک شخص سائکل پر سینڈل میں لگی ہوئی باسکٹ میں بچّے کو بٹھا کر تیز تیز جا رہا تھا اور بچہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ ایک آدمی نے اسے روک کر کہا۔ تم عجیب آدمی ہو، بچہ رو رہا ہے اور تم اس کی پرواہ کیے بغیر تیزی سے سائکل چلا رہے ہو۔

اس نے جواب دیا۔

بچہ رو نہیں رہا بلکہ رلایا جا رہا ہے کیوں کہ میری سائکل میں گھنٹی نہیں ہے۔

کسی جنگل میں ایک شیر رہا کرتا تھا۔ وہ بوڑھا ہونے کی وجہ سے زیادہ چلنے پھرنے سے مجبور تھا۔ اس لیے جنگل کے درمیان سے گزرنے والے راستے پر بیٹھا رہتا اور موقع ملتے ہی کسی نہ کسی راہ گیر کو اپنا شکار بنا لیتا۔ ایک دن کسی چالاک آدمی نے اپنے کچھ ساتھیوں کی مدد سے اسے ایک کٹہرے میں بند کر دیا اور خود بچ نکلا۔ چند دنوں بعد ایک اور آدمی اس طرف سے گزرا۔ شیر نے اس کی آہٹ سنتے ہی رونا چلانا شروع کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اُسے غار سے باہر نکال دے۔ راہ گیر نے کہا۔ "اگر میں تمھیں باہر نکال دوں گا تو تم مجھے کھا جاؤ گے۔"

شیر نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ آزاد ہونے کے بعد کسی بھی آدمی کو تنگ نہیں کرے گا۔ لیکن باہر آتے ہی وہ اپنا وعدہ بھول گیا اور کہنے لگا:

"میں کئی دنوں سے بھوکا رہنے کے سبب کمزور ہو گیا ہوں۔ زیادہ دور تک نہیں جا سکتا۔ اس لیے کیوں نہ پہلے تمھیں کھا کر ہی اپنی بھوک مٹالوں۔"

راہ گیر نے بہت منت سماجت کی مگر شیر نہ مانا۔ آخر اس نے کچھ سوچ کر شیر سے کہا:

"اچھا ہم تین لوگوں کی رائے لیتے ہیں۔ اگر سبھوں نے تمھارے حق میں فیصلہ دیا تو تمھیں اختیار ہوگا کہ تم مجھے کھا جاؤ۔"

شیر نے اس کی یہ شرط منظور کر لی اور سب سے پہلے وہ ایک پیڑ کے پاس پہنچے۔ پیڑ

فلاور کاٹیج۔ باغ پاتو۔ پٹنہ ۸

نے کہا:

"میں آدمی کو سایہ اور پھل دیتا ہوں مگر وہ مجھے کاٹ دیتا ہے۔ ایسا ہی آدمی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔"

اب شیر اور راہ گیر ایک کتے کے پاس گئے۔ کتے نے کہا:

"آدمی نے اس وقت تک مجھے بھر پیٹ کھلایا جب تک میں طاقتور تھا۔ اب میں کمزور اور بوڑھا ہو گیا ہوں تو کوئی مجھے ٹھیک سے روٹی کا ٹکڑا تک نہیں دیتا۔ اس لیے آدمی پر بالکل رحم نہیں کرنا چاہیے۔"

راہ گیر بہت مایوس ہو گیا۔ پھر بھی آخری مشورے کے لیے وہ دونوں ایک گیدڑ کے پاس پہنچے۔ گیدڑ نے کہا کہ وہ اسی وقت کوئی فیصلہ دے گا جب سارے واقعات ایک بار اپنی نظروں سے دیکھ لے گا۔ شیر اور راہ گیر نے اس کی بات مان لی اور وہ تینوں غار کے قریب گئے۔ گیدڑ نے کہا:

"سب سے پہلے مجھے یہ دکھایا جائے کہ شیر کٹہرے میں کس طرح بند تھا۔"

شیر کٹہرے کے اندر چلا گیا اور راہ گیر نے کٹہرے کو پھر ایک پتھر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ گیدڑ کی طرف دیکھنے لگا۔ گیدڑ بولا:

"اب کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، فوراً بھاگ جاؤ۔"

(مرکزی خیال ایک تھارو لوک کہانی سے ماخوذ)

سید وقار عظیم

کہاوتوں کی کہانیاں

ایک امیر اور مغرور شخص سے اس کے غریب دوست نے بہت برسوں کے بعد اس سے ملا تھا پوچھا۔ کیوں بھائی تم نے مجھے نہیں پہچانا۔
مغرور شخص نے جواب دیا۔ بالکل نہیں۔ میں گدھوں کو نہیں پہچانتا۔
اس پر غریب دوست نے کہا لیکن میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

کہانی کے لفظ میں کتنی مٹھاس ہے۔ بچّے جب ہوش سنبھالتے ہیں اور انھیں اپنے آس پاس کی چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے تو کھیل کود کے علاوہ ان کی تفریح کی سب سے بڑی چیز کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ کہانی چاہے کیسی ہو سچی ہو یا جھوٹی کسی کی ہو۔ جن، دیو، پری، مینڈک، بکری، بیل، چڑیا اور کسی نے کہی ہو۔ نانی اماں نے، ماسٹر صاحب نے یا کلاس کے کسی ساتھی نے، دلچسپی سے سنی جاتی ہے اور ایسی دلچسپی سے سنی جاتی ہے کہ کہانی کے آگے کھانے پینے اور سونے جاگنے کی بھی سُدھ نہیں رہتی۔

کہانیوں کی یہ دلچسپی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک یکساں قائم رہتی ہے اور عورت مرد، جوان اور بوڑھے سب کہانی پر جان دیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ چھوٹوں اور بڑوں کی کہانیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ بڑے بوڑھے ساتھ بیٹھتے ہیں تو چڑیا چڑے کی کہانی نہیں کہتے اور لال پری اور کالے دیو کا قصّہ بھی نہیں سنتے۔ ان کی کہانیاں آپ بیتی ہوتی ہیں جو جس پر گزری ہے وہ مزے لے لے کر سناتا ہے کبھی دوسروں کی زندگی کی باتیں اس طرح سنی اور سنائی جاتی ہیں کہ کیا کوئی پریوں اور شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں سنائے گا۔

کہاوتیں ہم میں سے ہر ایک استعمال کرتا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو کتابیں پڑھتے وقت ان سے سابقہ پڑتا ہے کہاوت جہاں کہیں آتی ہے عبارت میں حُسن پیدا ہو جا

ہے اور بات کی تاثیر دُگنی ہو جاتی ہے لیکن یہ تاثیر اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ جو کہاوت عبارت میں آتی ہے وہ پہلے پہل بنی کیسے تھی۔ ہر کہاوت کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے اور اصل میں یہی کہانی بات کی تاثیر میں کئی گنا اضافہ کرتی ہے جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ کوئی کہاوت پہلے پہل کب استعمال ہوئی تھی اور اس کے ساتھ کون سی کہانی شامل ہے انھیں اس بات پر بڑا لطف آتا ہے۔

یوں تو اردو میں ایسی سیکڑوں کہاوتیں ہیں جن کی کوئی نہ کوئی کہانی مشہور ہے لیکن ہم تین کہاوتوں کی کہانیاں بتاتے ہیں۔ کہانیاں پڑھو، کہانیوں کا لطف اٹھاؤ اور ساتھ ساتھ یہ بھی سوچو کہ جو کہاوت تم نے کتابوں میں پڑھی تھی اس کے معنی بھی تمھیں معلوم تھے لیکن اب جب کہ تم کو اس کہاوت کی کہانی بھی معلوم ہو جائے گی تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ اس کہاوت کے معنی تمھارے لیے کتنے گہرے اور اس کی تاثیر کتنی تیز ہو گئی ہے ایک مشہور کہاوت ہے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" اس کے معنی یہ ہیں کہ جب آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے تو یہ چیز طرح طرح کی خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ خاص کر دشمنوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے یا دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو آدمی ہمارے بھید سے واقف ہو اس کی دشمنی ہمارے لیے بڑے نقصان کا سبب بنتی ہے۔ اس کہاوت کے معنی تم بھی جانتے ہو اور کوئی کہے تو تم میں سے بہت سے اسے بے تکلفی سے عبارت میں استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ شاید سب کو نہ معلوم ہو کہ اس کہاوت کے پیچھے تاریخ کا ایک بڑا واقعہ چھپا ہوا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ اب سے کئی ہزار برس پہلے سری رام چندر جی ہندوؤں کے ایک بڑے راجا گزرے ہیں۔ ان کے والد راجا دشرتھ اجودھیا کے راجا تھے انھوں نے اپنے ایک رانی کے کہنے سے اپنے بڑے بیٹے رام چندر جی کو چودہ برس کے لیے بن میں بھیج دیا۔ جب رام چندر جی بن کو جانے لگے تو ان کے بھائی لچھمن اور ان کی بیوی بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہ لوگ جنگل میں رہتے تھے۔ ایک دن رام چندر جی شکار کو گئے تھے۔ سیتا جی اپنی جھونپڑی میں اکیلی تھیں کہ ایک فقیر بھیک مانگنے آیا۔ سیتا جی اسے بھیک دینے کے لیے باہر نکلیں تو وہ فقیر انھیں زبردستی اٹھا کر لے گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ یہ آدمی فقیر نہیں تھا بلکہ لنکا کا راجا راون تھا۔ راون سیتا کو لے گیا۔ رام چندر جی کو جب اس بات کا پتا چلا تو انھوں نے راون سے لڑائی کرنے

کی شہائی۔ کئی برس تک اس سے لڑائیاں لڑتے رہے لیکن چونکہ راون بہت بڑا راجا تھا اور اس کی طاقت ہر طرح سے رام چندر جی سے زیادہ تھی اس لیے رام چندر جی کو لڑائی میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر یہ ہوا کہ راون کا بھائی بھبھیکن رام چندر جی سے مل گیا اور اس کی مدد سے انھیں بہت سے ایسے بھید معلوم ہو گئے جن کی مدد سے انھوں نے لنکا کی لڑائی جیت لی۔ یہ لڑائی چونکہ راون اپنے بھائی کی وجہ سے ہارا جو اس کے سارے بھیدوں سے واقف تھا۔ اس لیے یہ کہاوت اب اس موقع پر استعمال ہونے لگی جو تمھیں بھی معلوم ہے۔

اس کہانی کا علم کہاوت میں کتنی جان ڈال دیتا ہے۔ لو، دو کہاوتوں کی کہانیاں اور پڑھ لو۔

ایک سیدھی سادی سی کہاوت ہے "لینا ایک نہ دینا دو" یہ کہاوت ایسے موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جب کہنا ہو کہ ہمیں اس جھگڑے سے واسطہ نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا کسی چیز سے کوئی تعلق ہو نہ واسطہ اور وہ مفت میں کسی جھگڑے میں پھنس جاتے۔ اس کہاوت کی ابتدا یوں ہوتی۔ کہتے ہیں کسی امیر کے بچوں کو کچھوے بہت پسند تھے۔ وہ بچے کچھوؤں سے کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن بچوں نے شرارت میں بے زبان کچھوے کو اٹھا کر گلی میں پھینک دیا۔ امیر کو خبر ہوئی تو اس نے نوکر سے کہا "جاؤ کچھوے کو دریا میں ڈال آؤ"۔ نوکر کچھوے کو دریا میں ڈال آیا۔ امیر نے کچھوے پر جو یہ احسان کیا تو اس نے سوچا "اس احسان کا بدلہ کس طرح چکاؤں۔ آخر دریا میں سے ایک قیمتی موتی نکالا۔ موتی منہ میں رکھا اور رینگتا ہوا امیر کے گھر پہنچا۔ امیر نے جو دیکھا کہ کچھوے صاحب پھر رینگتے چلے آ رہے ہیں تو بڑا تعجب ہوا۔ اس کی طرف بڑھا۔ اتنے میں کچھوا بھی پاس آ پہنچا۔ امیر کے قدموں پر سر رکھ کر لوٹنے لگا اور منہ سے وہ قیمتی موتی اُگل دیا۔ امیر نے موتی دیکھا تو اس کی آب و تاب دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ کچھوے کو پکڑ کر کہا۔ میاں اس موتی کا بہت بہت شکریہ! مگر مزہ تو جب ہے کہ اس کی جوڑی بھی ہو۔ اس لیے اگر رہائی چاہتے ہو تو اس کے ساتھ کا موتی بھی لا کر دو۔ کچھوا یہ سن کر بڑا گھبرایا لیکن فوراً ہی ایک ترکیب سوجھی۔ امیر سے کہنے لگا "آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ دو موتی کیا ایسے سیکڑوں موتی آپ کے قدموں پر نثار ہیں۔ لیکن مجھے دریا تک جانے کی اجازت دیجیے۔

یہ موتی میں اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں اس کی ناپ کا دوسرا موتی بھی لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔"

امیر صاحب باتوں میں آگئے۔ کچھوے صاحب نے موتی منہ میں دبایا اور دریا کی طرف چل دیے۔ امیر نے اپنے نوکر کو ساتھ کر دیا۔ نوکر کچھوے کے ساتھ ساتھ دریا تک گیا۔ کچھوا دریا میں کود پڑا اور نوکر باہر کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا تھوڑی دیر میں کچھوے نے پانی سے باہر منہ نکالا اور نوکر سے کہا "میاں جاؤ اپنے آقا سے میرا سلام کہنا، ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنا۔ انھیں لینا ایک نہیں مجھے دینے دو نہیں" یہ کہا اور پانی میں ڈبکی لگائی۔ نوکر اپنا سا منہ لے کر رخصت ہوا اور اس کہانی کی بدولت ایک مزے دار کہاوت ہماری زبان کے ہاتھ آئی۔ اب ہم اور تم اسے بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں لیکن کچھوے بے چارے کو کوئی بھول کر بھی یاد نہیں کرتا جس نے یہ کہاوت ہمیں دی۔

اس سلسلے کی ایک کہانی اور پھر بس! کہاوت ہے "تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" یہ ایسے موقعوں پر استعمال ہوتی ہے جب ہم کسی سے یہ کہنا چاہیں کہ ابھی جلدی مت کرو پورا نتیجہ یا انجام دیکھ لو۔ اس کہاوت کے یہ معنی کیسے ہوتے۔ اس کی کہانی اُن دو کہانیوں سے زیادہ مزے دار ہے جو پہلے بیان کی گئی ہیں۔ کہانی یہ ہے کہ ایک تھا شہزادہ اس کے چار دوست تھے ان سب کا ہر وقت ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ کسی وقت ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے۔ کھانے پینے، سونے جاگنے میں سب ایک دوسرے کے شریک تھے۔ ان دوستوں میں ایک تو سپاہی تھا ایک مولوی صاحب تھے ایک اونٹ والا تھا اور ایک تیلی۔ اتفاق کی بات شہزادے کے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ شہزادہ بادشاہ ہوا۔

شہزادے نے دوستی کا حق اس طرح ادا کیا کہ بادشاہ ہوتے ہی اپنے چاروں دوستوں کو اپنا وزیر بنا لیا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس پاس کے کئی بادشاہوں نے مل کر اس ملک پر حملہ کر دیا اب تو بادشاہ سلامت بہت گھبراتے اور اپنے چاروں وزیروں سے صلاح مشورہ کرنے بیٹھے۔ سپاہی نے کہا "سرکار اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیجیے فتح انشاء اللہ ہماری ہوگی" مولوی صاحب بولے "صاحب مجھے تو اس رائے سے اتفاق نہیں جنگ ہوئی تو ہزاروں بندگان خدا کا خون ہوگا ان سب کا عذاب آپ کی گردن پر ہوگا اس لیے آپ اس ناحق جھگڑے

میں نہ پڑے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا نا کہ ملک چھن جائے گا چھن جانے دیجیے اللہ کسی اور طرح رزق دے گا۔" اونٹ والے نے ان دونوں کی باتیں سنیں تو کہنے لگا کہ حضور آپ گھبراتے کیوں ہیں؟ ہر بات کی مہار اللہ میاں کے ہاتھ میں ہے آپ تو یہ دیکھیے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔ اب تیلی کی باری آئی اونٹ والے دوست کی بات سن کر وہ اچھل پڑا۔ کہنے لگا جہاں پناہ! میاں ساربان کی بات لاکھ روپے کی ہے۔ کسی کام میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی تیل دیکھیے تیل کی دھار دیکھیے۔ معلوم نہیں بادشاہ نے کس دوست کی بات مانی کس کی نہ مانی اور ہمیں اس سے غرض بھی نہیں۔ ہمیں تو بس یہ یاد رکھنا ہے کہ ساربان اور تیلی نے ہمارے کہاوتوں کے خزانے میں دو قیمتی کہاوتیں اور بڑھا دیں۔

ایسی ایسی سیکڑوں کہاوتیں ہماری زبان میں ہیں اور ہر کہاوت کا رشتہ ایک دلچسپ کہانی سے جڑ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کہانی تاریخ کا کوئی واقعہ ہو یا گزرے ہوئے زمانے کی داستان یا محض خیالی افسانہ۔ اس لیے کہ کبھی کبھی کہاوتیں اس طرح بنتی ہیں کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی اور لاکھ کھوج لگانے پر بھی آدمی کو اس کی اصل نسل کا پتا نہیں چلتا۔

سلام بن رزاق

آزادی کے شہید

● بھائی جان۔ کیا تمھارے ماسٹر صاحب بھاگ گئے کہ سوالوں کو حل کرنے میں میں نے تمھاری مدد کی ہے!
عفران۔ جی ہاں" وہ کہتے تھے یہ کام دو آدمیوں کا ہے۔ صرف ایک آدمی اتنی غلطی نہیں کر سکتا ہے

ہمارے استاد صاحب نے ایک کہانی سنائی تھی کہ ایک دفعہ اللہ میاں کسی فرشتے سے ناراض ہو کر اسے جنت سے نکال دیتے ہیں۔ فرشتہ گڑگڑاتا ہے تب اللہ میاں کہتے ہیں کہ دنیا سے کوئی ایسا تحفہ لاؤ جو سب سے زیادہ انمول اور نایاب ہو۔ فرشتہ پہلے ایک بیمار اور پیاسے بچّے کے آنسو اور دوسری بار ایک مہاتما کی چتا کی راکھ لے جاتا ہے۔ جو یکے بعد دیگرے نامنظور کر دیے جاتے ہیں۔ آخر میں فرشتہ وطن کی حفاظت کے لیے شہید ہونے والے ایک بہادر سپاہی کے لہو کے قطرے اللہ کی حضور میں پیش کرتا ہے۔ اور اس کی بخشش ہو جاتی ہے کیونکہ قدرت کے نزدیک آزادی کے لیے شہید ہونے والے سپاہی کا لہو سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ غلام انسان کے جینے کا تصور ایک عذاب سے کم نہیں۔

اگر ہم آزادی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو تاریخ کا ایک ایک ورق شہیدوں کے خون کی شہادت دیتا نظر آتا ہے۔ ٹیپو سلطان شہید نے کہا تھا "گیدڑ کی سو دن کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"۔ یہ قول سلطان ٹیپو کی زندگی کا آئینہ ہے۔ جب سرنگا پٹم کے قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ اور انگریز قلعہ کا دروازہ توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگے تب سلطان ٹیپو کے سرداروں نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ بال بچوں سمیت پچھلے دروازے سے فرار ہو جائیں۔ مگر سلطان نے سختی سے انکار کر دیا۔ اور کہا "تنہا در تو

سینے پر زخم کھاتے ہیں۔ اور بزدل کتے کی موت مارے جاتے ہیں۔ یہ کہ کر تلوار اٹھائی اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور ثابت کر دیا کہ بہادروں کو صرف بانکپن سے جینا ہی نہیں بلکہ بانکپن سے مرنا بھی آتا ہے۔

دراصل وطن کی آزادی کے آگے جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جب رانی لکشمی بائی کی جھانسی پر انگریزوں نے مکاری سے قبضہ کرنا چاہا تو لکشمی بائی تڑپ اٹھی۔ اور گرج کر کہا "اپنی جھانسی نہیں دوں گی" پھول کی ڈالی سی نازک عورت وطن کی آبرو کے لیے تلوار کی طرح سخت اور خونخوار ہو گئی اور اس وقت تک لڑتی رہی جب تک اس کے لہو کا ایک ایک قطرہ ٹپک ٹپک کر وطن کی پاک مٹی میں جذب نہیں ہو گیا۔ تانتیا ٹوپے جو ناناصاحب پیشوا کے ساتھیوں میں سے تھا آخری سانس تک آزادی کے لیے لڑتا رہا۔

انگریز سپاہی بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ اور وہ ایک بگولے کی طرح جنگل جنگل وادی وادی بھٹکتا رہا۔ جہاں موقعہ ملتا عقاب کی طرح انگریزوں پر ٹوٹ پڑتا۔ اور ان کی فوجوں کو تتر بتر کر کے ہوا کے جھونکے کی طرح نکل جاتا۔ اگر وہ چاہتا تو انگریزوں سے صلح کر کے دولت، عزت اور حکومت سب حاصل کر سکتا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس رزق سے موت اچھی ہوتی ہے۔ جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو۔ آخر تانتیا ٹوپے گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور اسے پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ چندر شیکھر آزاد اور بھگت سنگھ بھی آزادی کے متوالوں میں سے تھے۔ چندر شیکھر آزاد انگریزوں سے لڑتے ہوئے خود اپنی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اور بھگت سنگھ ہنستے مسکراتے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔

ٹیپو سلطان شہید، رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد جیسے شہیدانِ وطن کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں بہادر ایسے گزرے ہیں جن کے نام تاریخ کے صفحات پر درج نہیں۔ مگر یہ ایسے گمنام شہید ہیں جن کے لہو نے اس دیش کی دھرتی کے ایک ایک ذرے کو آفتاب کی سی عظمت بخشی ہے۔ ان کے نام کسی کو یاد نہیں مگر ان کا کام آج بھی ہمیں ظلم، جھوٹ اور ناانصافی کے خلاف لڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان شہیدوں کی کہانیاں روشنی کے وہ مینار ہیں جن کے اجالے میں ہم زندگی کے صحیح راستے پر چل سکتے ہیں۔ ؎

جینا انھیں کا جینا مرنا انھیں کا مرنا ... اک بانکپن سے جینا اک بانکپن سے مرنا

رئیس فروغ

شہر نے گاؤں سے کہا

شہر ہنسا اور ہنستے ہنستے گاؤں سے بولا سُنو سُنو
اُونچے ہیں مینار مرے
بڑے بڑے بازار مرے
کاریں سب چمکیلی ہیں
بسیں بھی نیلی پیلی ہیں
مل بھی ہیں مشہور بہت
محنت کش مزدور بہت

گاؤں ہنسا اور ہنستے ہنستے شہر سے بولا سُنو سُنو
فصلیں میری ہَری ہَری
گیہوں کی بالیں بھری بھری
لوگ جو سیدھے سادے ہیں
دھرتی کے شہزادے ہیں
سارے گھر آباد رہیں
بسنے والے شاد رہیں

ہم کہتے ہیں دونوں ہی تم
اپنی جگہ پر سچّے ہو
اپنی جگہ پر اچھّے ہو





طوفانی رات

میمونہ اقبال

رات کے اندھیرے اور طوفان کے باوجود، وہ اپنے باپ کی مدد کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے پڑوسی کی جھونپڑی میں ایک غیر ملکی جاسوس چھپا ہوا تھا!

رات بڑی سرد اور اندھیری تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے مکان کے دروازوں کو توڑنے ڈالتے تھے۔ دادی جان اپنے پوپلے مُنہ میں بڑا سا پان دباتے ہوئی بولیں: "اللہ خیر کرے کیسی طوفانی رات ہے۔ احسان کو مغرب تک آجانا چاہیے تھا۔ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔"

"انھوں نے قریب کی کسی بندرگاہ میں پناہ لے لی ہوگی۔" اماں نے کہا۔ "وہ سمندر میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ صبح جب طوفان تھمے گا تو وہ آجائیں گے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" دادی اماں بولیں۔ "ویسے تو وہ ماشاء اللہ سے بہت سمجھ دار ہے لیکن اس خوفناک طوفان سے تو بڑے بڑے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ انجم عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ان کے کمرے میں آیا اور بولا۔ "اماں! میں نے ابا کی آواز سُنی ہے۔ وہ مجھے پکار رہے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا ہے وہ راستہ بھول گئے ہیں۔ انھیں کوئی روشنی دکھانے والا نہیں۔"

"کیا بکتا ہے؟ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔" دادی اماں نے للکارا۔ "دس سال کا لڑکا ہے۔

اور اپنی طرف سے کہانی گھڑنے لگا۔ "جا لڑکے سو جا۔"
انجم دھاڑا۔ اُس نے کہا: "امّاں مجھ پر یقین کیوں نہیں کرتیں۔ میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے۔ میں نے ابّا کو مدد، مدد، چلّاتے سُنا ہے۔"

"انجم! بحث مت کرو۔ تمھیں وہم ہو گیا ہے۔"
امّاں نے اُسے سمجھایا "جاؤ، جا کر سو جاؤ۔"

ان کے کہنے پر انجم اپنے بستر پر لحاف کے اندر دبک گیا لیکن ہزار کوشش کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابّا مجھے بُلا رہے ہیں۔ انھیں روشنی نہ دکھائی گئی تو وہ طوفان میں گھِر جائیں گے۔

وہ خاموشی سے بستر میں پڑا رہا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ دادی جان اور امّاں سو چکی ہیں تو وہ بستر سے اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا باورچی خانے میں جا کر لالٹین تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے چولھے کے پاس رکھی ہوئی لالٹین مل گئی۔ اُس نے اُسے جلدی سے روشن کیا اور ہاتھ میں لے کر گھر سے ہوتا ہوا باہر کے دروازے کے قریب پہنچا۔ اُسے ڈر تھا کہ دروازہ کھولتے پر آواز پیدا ہو گی جس سے دادی جان اور امّاں جاگ سکتی ہیں۔ ایک ترکیب اُس کے دماغ میں آئی۔ اُس نے دروازے کے قبضوں پر تھوڑا سا تیل ٹپکایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

باہر بلا کی سردی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے اُس کے گالوں پر تھپیڑے سے مار رہے تھے۔ پورے علاقے میں ہی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ لالٹین کی روشنی میں راستہ تلاش کرتا ہوا بڑی احتیاط سے ساحلِ سمندر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے گاؤں کے ہر راستے سے بخوبی واقف تھا۔ اُسے اندھیری اور طوفانی رات میں سفر کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ ڈر صرف یہ تھا کہ اگر کسی گاؤں والے نے دیکھ لیا تو وہ اُسے زبردستی پکڑ کر گھر لے جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے لالٹین کی بتّی نیچے کر دی اور اس کی چمنی کو رُومال سے ڈھانپ لیا۔ اب وہ بالکل محفوظ تھا۔

اُس نے ابھی چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ سہم کر ایک طرف رُک گیا۔ دور سے کوئی شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ چونکہ وہ سفید کپڑے پہنے ہوا تھا، اس لیے رات کی تاریکی میں بھی نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد انجم کا خوف خود بخود جاتا رہا۔ وہ کریم چاچا معلوم ہوتے تھے۔ جن کا گھر وہیں قریب ہی تھا جہاں انجم اُس وقت چھپا کھڑا تھا۔ انھوں نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور اندر چلے گئے۔

انجم کو حیرت محسوس ہوئی کہ اتنی رات گئے کریم چاچا کہاں گئے تھے جب کہ وہ عشاء کے بعد کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

وہ آڑ سے باہر نکلا اور پھر تیز تیز قدم رکھتا آگے بڑھنے لگا۔ اب وہ سمندر سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ ساحل پر موجوں کے سر پٹخنے کا شور اُسے صاف سنائی دے

رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی اونچی چٹان پر چڑھ جائے گا اور لالٹین ہاتھ میں لے کر اپنے ابّا کو روشنی دکھائے گا لیکن ابھی وہ چٹان پر پوری طرح چڑھ بھی نہیں پایا تھا کہ اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ قلابازی کھاتا ہُوا نیچے آ رہا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں اور سر میں چوٹیں آئیں لیکن اُسے جو بات پریشان کر رہی تھی وہ لالٹین کا بُجھنا تھا۔ اب وہ اِسے کِس طرح جَلائے گا۔ وہ اپنے ساتھ ماچس بھی نہیں لایا تھا۔ گھر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وقت بھی زیادہ لگتا اور آہٹ سے کسی کی آنکھ بھی کھُل سکتی تھی۔

اچانک اُسے کریم چاچا کا خیال آیا۔ وہ اُن سے کہہ سکتا تھا کہ گھر میں ماچس کی ضرورت ہے۔ وہ اُس پر شک بھی نہ کرتے کیوں کہ انجم پہلے بھی کئی مرتبہ اُن سے دیاسلائی مانگ کر گھر لے جاچکا تھا، لہٰذا اُس نے فوراً کریم چاچا کے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس کا بدن دُکھ رہا تھا۔ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ اِس پر ستم یہ کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہوگئی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر کہیں زور کی بارش شروع ہوگئی تو وہ کِس طرح اپنے ابّا کو روشنی دکھائے گا۔

کریم چاچا کے گھر پہنچ کر اُس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو وہ کھُل گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ دروازے میں اندر سے کوئی کنڈا نہیں تھا۔ اُس نے آہستہ سے کریم چاچا کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پاکر اُس نے دو چار آوازیں اور دیں۔ آخری آواز تو گھر کے باہر تک سنائی دی لیکن کریم چاچا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ چارپائی کے قریب پہنچ گیا اور لحاف ہٹاکر انھیں جھنجوڑنے لگا پھر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انجم جھنجلا گیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ کریم چاچا کی جیبوں میں ماچس تلاش کرنے لگا۔ یہ جان کر اُسے سخت حیرت ہوئی کہ وہ کُرتے شلوار کی بجائے پینٹ اور قمیص پہنے ہوئے تھے۔ اُسے اُن کی پینٹ کی جیب میں ماچس مل گئی، جسے لے کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہُوا۔

بوندا باندی اب ختم ہو چکی تھی۔ لیکن گھرے کالے بادل ابھی تک منڈلا رہے تھے اور تیز سرد ہوا کا زور ابھی تک کم نہیں ہُوا تھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف ایک سویٹر میں پُوری رات چٹان پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اُسے فوراً مسجد کا خیال آیا جو ساحل کے قریب ہی تھی وہ سیڑھیوں کے ذریعے چڑھا۔ لالٹین کی لَو اُونچی کر کے اُس نے اُسے لوہے کی ایک سلاخ سے لٹکا دیا اور خود ٹھٹھرا ہُوا کونے میں بیٹھ گیا۔ نہ جانے اُسے کب نیند آگئی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ ابّا کا چھوٹا سا جہاز طوفان کی زد میں آگیا ہے اور سمندر میں اُٹھتی ہوئی لہروں پر ہچکولے کھا رہا ہے۔ اُس کے ابّا پریشان ہیں اور مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ وہ خود اُس چٹان پر کھڑا اُن کو لالٹین کی روشنی دکھا رہا ہے۔ جس سے وہ پھسل کر نیچے گرا تھا۔ اتنے میں کریم چاچا دَوڑے ہوئے آئے اور اُسے نیچے گرا کر جھنجوڑنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "تُو نے میری جیب سے ماچس

کیوں چرائی تھی؟

اتنے میں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کے ابّا کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مؤذن فجر کی اذان دے رہا تھا۔ انجم ابّا سے لپٹ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے ابّا نے بتایا کہ اُن کا جہاز واقعی طوفان میں گھِر گیا تھا۔ وہ راستہ بھول گئے تھے۔ لالٹین کی روشنی ہی کی مدد سے سمت کا پتا چلتا اور وہ صحیح سلامت یہاں پہنچ گئے۔

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد جب انجم اور اُس کے ابّا گھر جا رہے تھے تو اُسے کریم چاچا کا خیال آیا۔ وہ آج مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں آئے تھے۔ ان کی ماچس ابھی تک اُس کی جیب میں تھی۔ جب وہ اُن کے گھر کے قریب سے گزرے تو انجم ماچس دینے کے خیال سے اُن کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ ابھی تک لحاف تانے پڑے سو رہے تھے۔ اُس نے جب اُن کے سر سے رضائی ہٹائی تو بے ساختہ اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ کریم چاچا نہیں کوئی اور تھا۔ اُس کا سر زخمی تھا اور چہرے اور گردن پر خون جم گیا تھا۔

انجم کی چیخ سُن کر اُس کے ابّا اور کچھ دوسرے لوگ کریم چاچا کے مکان میں گھس آئے۔ انجم کے ابّا نے کہا: "یہ شخص بے ہوش ہے۔"

اُسے فوراً ہوش میں لایا گیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ شخص ڈر گیا اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اُن لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔

انجم نے کہا: "بتاؤ کریم چاچا کہاں ہیں؟ تم نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

اُس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں چارپائی ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انجم نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں کمبل میں لپٹا ہوا کوئی شخص پڑا تھا۔ اس نے فوراً کمبل ہٹا دیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کریم چاچا کے ہاتھ پاؤں ایک موٹی رسّی سے بندھے ہوئے ہیں، جس کے دونوں سِرے چارپائی کے پایوں سے اس طرح کَسے ہوئے ہیں کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے مُنہ میں ایک بڑا سا رومال ٹھونسا ہوا تھا۔

اُس شخص کو جلدی جلدی تھانے پہنچایا گیا تب پتا چلا کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے اور پولیس اُس کی تلاش ہی میں تھی جسے پچھلی رات ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ہمارے علاقے میں پیراشوٹ سے اُترا ہے۔

پولیس انسپکٹر نے مزید کہا کہ اگر انجم اُسے نہ دیکھ لیتا تو یہ ہوش میں آ کر آسانی سے فرار بھی ہو سکتا تھا۔

سب گاؤں والوں نے انجم کی بہت تعریف کی اور پولیس انسپکٹر نے اُسے انعام دیا۔ جب گاؤں کے مولوی صاحب تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے انجم کو بتایا کہ جو شخص دل لگا کر نماز پڑھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اور اللہ اُس کی اسی طرح مدد کرتا ہے۔

رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی اونچی چٹان پر چڑھ جائے گا اور لالٹین ہاتھ میں لے کر اپنے ابّا کو روشنی دکھائے گا لیکن ابھی وہ چٹان پر پوری طرح چڑھ بھی نہیں پایا تھا کہ اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ قلابازی کھاتا ہُوا نیچے آرہا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں اور سر میں چوٹیں آئیں لیکن اُسے جو بات پریشان کر رہی تھی وہ لالٹین کا بُجھنا تھا۔ اب وہ اسے کس طرح جَلائے گا۔ وہ اپنے ساتھ ماچس بھی نہیں لایا تھا۔ گھر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وقت بھی زیادہ لگتا اور آہٹ سے کسی کی آنکھ بھی کُھل سکتی تھی۔

اچانک اُسے کریم چاچا کا خیال آیا۔ وہ اُن سے کہہ سکتا تھا کہ گھر میں ماچس کی ضرورت ہے۔ وہ اُس پر شک بھی نہ کرتے کیوں کہ انجم پہلے بھی کئی مرتبہ اُن سے دیا سلائی مانگ کر گھر لے جا چکا تھا، لہٰذا اُس نے فوراً کریم چاچا کے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس کا بدن دُکھ رہا تھا۔ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ اِس پر ستم یہ کہ ہلکی ہلکی بونداباندی بھی شروع ہو گئی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر کہیں زور کی بارش شروع ہو گئی تو وہ کس طرح اپنے ابّا کو روشنی دکھائے گا۔

کریم چاچا کے گھر پہنچ کر اُس نے دروازے کو آہستہ سے دھکّا دیا تو وہ کُھل گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ دروازے میں اندر سے کوئی کنڈا نہیں تھا۔ اُس نے آہستہ سے کریم چاچا کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پاکر اُس نے دو چار آوازیں اَور دیں۔ آخری آواز تو گھر کے باہر تک سنائی دی لیکن کریم چاچا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ چارپائی کے قریب پہنچ گیا اور لحاف ہٹا کر انھیں جھنجوڑنے لگا۔ پھر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انجم جھنجلا گیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ کریم چاچا کی جیبوں میں ماچس تلاش کرنے لگا۔

یہ جان کر اُسے سخت حیرت ہوئی کہ وہ کُرتے شلوار کی بجائے پینٹ اور قمیص پہنے ہوئے تھے۔ اُسے اُن کی پینٹ کی جیب میں ماچس مل گئی، جسے لے کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہُوا۔

بونداباندی اب ختم ہو چکی تھی۔ لیکن گہرے کالے بادل ابھی تک منڈلا رہے تھے اور تیز سرد ہوا کا زور ابھی تک کم نہیں ہُوا تھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف ایک سوئیٹر میں پُوری رات چٹان پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اُسے فوراً مسجد کا خیال آیا جو ساحل کے قریب ہی تھی، وہ سیڑھیوں کے ذریعے چڑھا تھا۔ لالٹین کی لَو اُونچی کر کے اُس نے اُسے لوہے کی ایک سلاخ سے لٹکا دیا اور خود ٹھٹھرا ہُوا کونے میں بیٹھ گیا۔ نہ جانے اُسے کب نیند آگئی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ ابّا کا چھوٹا سا جہاز طوفان کی زد میں آگیا ہے اور سمندر میں اُٹھتی ہوئی لہروں پر ہچکولے کھا رہا ہے۔ اُس کے ابّا پریشان ہیں اور مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ وہ خود اُس چٹان پر کھڑا اُن کو لالٹین کی روشنی دکھا رہا ہے۔ جس سے وہ پھسل کر نیچے گرا تھا۔ اتنے میں کریم چاچا دوڑتے ہوئے آئے اور اُسے نیچے گرا کر جھنجوڑنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے: "تُو نے میری جیب سے ماچس

کیوں چرائی تھی؟

اتنے میں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کے ابا کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مؤذن فجر کی اذان دے رہا تھا۔ انجم ابا سے لپٹ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے ابا نے بتایا کہ اُن کا جہاز واقعی طوفان میں گھر گیا تھا۔ وہ راستہ بھول گئے تھے۔ لالٹین کی روشنی ہی کی مدد سے سمت کا پتا چلتا اور وہ صحیح سلامت یہاں پہنچ گئے۔

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد جب انجم اور اُس کے ابا گھر جا رہے تھے تو اُسے کریم چاچا کا خیال آیا۔ وہ آج مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں آئے تھے۔ ان کی ماچس ابھی تک اُس کی جیب میں تھی۔ جب وہ اُن کے گھر کے قریب سے گزرے تو انجم ماچس دینے کے خیال سے اُن کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ ابھی تک لحاف تانے پڑے سو رہے تھے۔ اُس نے جب اُن کے سر سے رضائی ہٹائی تو بے ساختہ اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ کریم چاچا نہیں کوئی اور تھا۔ اُس کا سر زخمی تھا اور چہرے اور گردن پر خون جم گیا تھا۔

انجم کی چیخ سُن کر اُس کے ابا اور کچھ دوسرے لوگ کریم چاچا کے مکان میں گھس آئے۔ انجم کے ابا نے کہا "یہ شخص بے ہوش ہے۔"

اُسے فوراً ہوش میں لایا گیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ شخص ڈر گیا اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اُن لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔

انجم نے کہا۔ "بتاؤ کریم چاچا کہاں ہیں؟ تم نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

اُس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں چارپائی ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انجم نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں کمبل میں لپٹا ہوا کوئی شخص پڑا تھا۔ اس نے فوراً کمبل ہٹا دیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کریم چاچا کے ہاتھ پاؤں ایک موٹی رسّی سے بندھے ہوئے ہیں، جس کے دونوں سِرے چارپائی کے پایوں سے اِس طرح کَسے ہوئے ہیں کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے مُنہ میں ایک بڑا سا رومال ٹھونسا ہوا تھا۔

اُس شخص کو جلدی جلدی تھانے پہنچایا گیا۔ تب پتا چلا کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے اور پولیس اُس کی تلاش ہی میں تھی جسے پچھلی رات ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ہمارے علاقے میں پیراشوٹ سے اُترا ہے۔

پولیس انسپکٹر نے مزید کہا کہ اگر انجم اُسے نہ دیکھ لیتا تو یہ ہوش میں آ کر آسانی سے فرار بھی ہو سکتا تھا۔

سب گاؤں والوں نے انجم کی بہت تعریف کی اور پولیس انسپکٹر نے اُسے انعام دیا۔ جب گاؤں کے مولوی صاحب تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے انجم کو بتایا کہ جو شخص دل لگا کر نماز پڑھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اور اللہ اُس کی اسی طرح مدد کرتا ہے۔

اس ترجمہ شدہ کہانی پر ۵۰۰ روپے انعام دیا گیا

تین قیمتی مشورے



ترجمہ۔ ذیشان بن صفدر

خیسو بہت ہی غریب لڑکا تھا۔ وہ دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک گاؤں میں اپنی چھوٹی بہن چنبلا کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں بھائی بہن بڑی محبت اور شفقت سے مل جل کر رہتے تھے۔ خیسو گاؤں کے وڈیرے کے یہاں کام کاج کرتا اور جو تنخواہ ملتی، اُس سے رُوکھی سوکھی کھا کر دونوں بھائی بہن گزارا کرتے۔

ایک صبح کی بات ہے کہ خیسو ٹرے میں ناشتا رکھ کر وڈیرے کے پاس آیا۔ ابھی اُس نے ٹرے نیچے رکھی بھی نہیں تھی کہ کسی ضرورت سے وڈیرے کا ہاتھ اٹھ گیا اور سیدھا ٹرے سے جا کر لگا۔ ہاتھ کا لگنا تھا کہ ٹرے الٹ گئی۔ ایک زور دار چھناکا ہوا اور سارے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ وڈیرا برتن ٹوٹنے پر بہت ناراض ہوا اور خیسو کو سخت اور بُرا بھلا کہتے ہوئے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ وہ بہت

روپا پیٹا۔ غلطی نہ ہونے کے باوجود اُس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور آیندہ مزید احتیاط سے کام کرنے کا یقین دلایا مگر وڈیرے کو اُس کا قصور معاف کرنا تھا نہ کیا۔

گیسو افسردگی سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا سر جھکائے جھونپڑی میں داخل ہوا تو چندا اپنے بھائی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ جب بھائی سے سارے حالات کا علم ہوا تو وہ خود بھی افسردہ ہو گئی، پھر بھی زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ "بھائی اللہ رازق ہے۔ اُس نے ہمیں دنیا میں پیدا کیا ہے تو ہمارے لیے رزق بھی اتارا ہو گا۔ تم کہیں اور کوشش کرو۔"

دوسرے دن گیسو نے گاؤں کے لوگوں سے ملازمت کے لیے کہا مگر وڈیرے کے خوف سے کوئی بھی اُسے ملازمت دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ ناچار گیسو اپنی بہن چندا کو ضروری ہدایتیں دے کر ملازمت کی تلاش میں دوسرے گاؤں چلا گیا۔ دوسرے گاؤں میں ایک چھوٹے زمیندار نے اُس سے سوال کیا۔ "میاں تم کیا کام کر سکتے ہو؟"

"جناب میں کیا کر سکتا ہوں کیا نہیں اُسے چھوڑیے ملازمت کا خواہش مند ہوں۔ آپ جو بھی کام بتائیں گے، میں اُسے پوری توجہ اور ذمے داری کے ساتھ انجام دوں گا اور اپنی ذات سے کبھی کسی شکایت کا موقع نہ آنے دوں گا۔"

زمیندار گیسو کے اس جواب سے بہت متاثر ہوا اور اُسے اپنے یہاں کھیتوں میں کام کرنے کے لیے ملازم رکھ لیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ بہ طور اُجرت گیسو کو تین اشرفیاں سالانہ اور گزر اوقات کے لیے عید بقرعید پر دو نئے جوڑے کپڑوں کے علاوہ اناج بھی دیا کرے گا۔ گیسو نے فوراً اُس کے کھیت میں کام کرنے کا اقرار کر لیا۔

گیسو بہت محنتی تھا۔ زمیندار اُس کی محنت اور کام کی لگن سے بہت خوش ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال بیت گیا۔ زمیندار نے وعدے کے مطابق اُسے اناج، کپڑا اور تین اشرفیاں دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اپنی تین اشرفیاں مجھے دے دو تو میں ایک بہت ہی مفید اور کارآمد بات بتاؤں گا۔"

گیسو نے سوچا میرے پاس اناج اور کپڑا تو ہے ہی، اشرفیاں تو میں جمع کر لوں گا۔ اچھا ہے ان کے بدلے کوئی اچھی بات معلوم ہو جائے چنانچہ اُس نے زمیندار کو وہ اشرفیاں دے کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کام کی اچھی سی بات بتا دیں۔"

زمیندار نے کہا۔ "غور سے سنو اور اسے یاد رکھو پھر ضرورت پڑے تو عمل بھی کرنا۔ جہاں کہیں تم کسی ایسے راستے پر پہنچو جو کچا، تکلیف دہ، لمبا اور پرانا ہو اور دوسرا نیا، پکا اور منزل پر پہنچنے کے لیے مختصر ہو تو سفر کے لیے پرانے کچے اور تکلیف دہ راستے کا ہی انتخاب کرنا۔"

خیسو نے زمیندار کی بات بڑی توجہ اور غور سے سنی پھر ضرورت پڑنے پر عمل کرنے کا اقرار بھی کرلیا۔

دوسرے دن اُس نے کپڑا اور اناج بہن چندا کے لیے اپنے گاؤں بھجوا دیا اور خود دوسرے سال کے لیے کھیت میں کام شروع کر دیا۔ اُس کی محنت اور لگن سے کھیت کی فصل بڑی اچھی ہوئی اِدھر اُسے کام کرتے ہوئے دوسرا سال بھی پورا ہو گیا تو زمیندار نے اُسے حسبِ وعدہ اناج، کپڑا اور تین اشرفیاں ادا کرتے ہوئے اپنی بات دُہرائی کہ اگر وہ پھر اُسے تین اشرفیاں واپس کر دے تو بدلے میں ایک بہت ہی مفید اور قابلِ عمل بات بتائے گا۔ خیسو اس بار بھی اشرفیاں واپس دے کر بات معلوم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

زمیندار نے اس بار اُسے بتایا: "اگر تمھیں کسی دوسرے گاؤں میں کہیں رات کو قیام کرنا پڑ جائے تو کسی ایسے گھر میں کبھی مت ٹھہرنا جہاں کوئی بوڑھا شخص اپنی خوب صورت اور جوان بیوی کے ساتھ رہتا ہو۔"

خیسو نے اس بات پر بھی عمل کرنے کا عہد کر لیا اور پہلے کی طرح دوسرے دن زمیندار سے ملا ہوا اناج اور کپڑا اپنی بہن چندا کے لیے گاؤں بھجوا دیا اور خود تیسرے سال کے لیے کام شروع کر دیا۔

بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے۔ یوں خیسو نے اپنی ملازمت کا تیسرا سال بھی ہنسی خوشی پورا کر لیا۔ اس بار زمیندار نے خوش ہو کر اُسے اور زیادہ اناج اور کپڑوں کے چار جوڑے دیے جب کہ تین اشرفیاں بھی دے کر اُس سے کہا کہ اگر وہ اس بار پھر اپنی اشرفیاں اُسے واپس دینا منظور کر لے تو وہ پہلے کی طرح اُن کے بدلے مفید اور کارآمد بات بتائے گا۔ خیسو نے سوچا اشرفیوں کا کیا ہے اور کما لوں گا۔ اُن کے بدلے اچھی بات سیکھنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے بہ خوشی وہ اشرفیاں واپس کر دیں اور کہا: "بتائیے وہ بات کیا ہے؟"

زمیندار نے مُسکراتے ہوئے خیسو کی طرف دیکھ کر کہا: "دیکھو میاں صاحبزادے! اگر کبھی کوئی چیز تمھیں کہیں راستے میں ملے تو اُسے اپنے پاس رکھنے کی بجائے اُس کے مالک کا پتا لگا کر واپس کر دینا۔ اسی میں بہتری اور بھلائی پوشیدہ ہے۔"

خیسو نے اس پر بھی عمل کرنے کا وعدہ کر لیا۔

دوسرا دن ہوا تو وہ زمیندار کے پاس پہنچ کر بولا: "جناب مجھے تین سال ہو گئے ہیں آپ کے یہاں کام کرتے ہوئے۔ میں نے اس تمام عرصے میں اپنی پوری ذمے داری کے ساتھ کام کیا ہے اور آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اب میری خواہش ہے کہ اپنے گھر واپس جاؤں اور کچھ دن بہن کے ساتھ گزاروں۔"

زمیندار نے کہا: "ٹھیک ہے۔ تم خوشی سے اپنے گھر جاؤ اور جب بھی کام کی ضرورت ہو تو میرے پاس لوٹ آنا مگر آج کے دن اور یہاں ٹھہر جاؤ تاکہ میں راستے کے لیے کچھ انتظام کردوں اور تمھارے لیے اپنی طرف سے ایک تحفہ بھی تیار کرالوں۔"

خمیسو کو ایک دن ٹھہرنے میں بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا، وہ ٹھہر گیا۔ دوسرے دن زمیندار نے اُسے ایک خصوصی طور پر تیار کی ہوئی ڈبل روٹی رومال میں باندھ کر دیتے ہوئے کہا: بیٹا! یہ ڈبل روٹی میری بیٹی نے تمھارے لیے خاص طور پر تیار کی ہے۔ یہ بہ ظاہر ڈبل روٹی ہے مگر اس کا ذائقہ تمھیں کیک جیسا لگے گا۔ یہ ڈبل روٹی تم اُس وقت اپنی بہن کے ساتھ کھانا جب تم دونوں بہت خوش ہو۔

اس کے بعد زمیندار نے اُسے کچھ اور تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا۔

خمیسو زمیندار سے رخصت ہو کر ہنسی خوشی گنگناتا ہوا اپنے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ چلتے چلتے دن ختم ہو گیا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹنے لگے۔ سورج دن بھر کی مسافت کے بعد آرام کے لیے جلد مغرب میں غروب ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ اُسی وقت تین اور مسافر اُس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ بھی اُسی کے گاؤں کے رہنے والے تھے جو روزگار کے لیے شہر چلے گئے تھے۔ اس وقت وہ بھی شہر سے گاؤں جا رہے تھے۔ وہ تینوں بہت خوش تھے کیونکہ انھوں

طویل ترین داڑھی

ناروے کے شہری مسٹر ہینس کے انتقال کے وقت اُن کی داڑھی ۱۷½ فٹ لمبی تھی۔ یوں سمجھیے کہ طویل ترین داڑھی کا اپنے زمانے کا یہ عالمی ریکارڈ تھا۔ مسٹر ہینس ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور اُن کا انتقال سنہ ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا۔

[redacted] نے شہر میں رہ کر اچھی خاصی رقم کمائی تھی۔

اب وہ چار ہو گئے۔ چاروں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ سب اپنی اپنی داستانیں ایک دوسرے کو سنا رہے تھے کہ کس کس طرح انھوں نے کہاں کہاں کام کیا۔ چلتے چلتے خاصی رات ہو گئی۔ آخر وہ ایک ایسے دوراہے پر پہنچے جہاں سے اُن کے گاؤں کے لیے ایک پگڈنڈی کھیتوں میں سے گزر کر جاتی تھی اور ساتھ ہی ایک نئی پکی سڑک بھی تعمیر ہو گئی تھی۔ یہ سڑک پگڈنڈی کے مقابلے میں جلدی گاؤں پہنچتی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ چاروں سوچ میں پڑ گئے کہ کس راستے سے گاؤں جائیں۔ خمیسو کے تینوں ساتھی پکی سڑک سے گاؤں جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ ان کی دلیل تھی کہ پکی سڑک پر سفر کرنے سے تھکن بھی نہیں ہوگی اور جلدی گاؤں پہنچ جائیں گے مگر خمیسو کو زمیندار کی وہ بات یاد تھی جو اُس نے تین اشرفیاں لے کر بتائی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا، یہی موقع ہے زمیندار کی بات کی صداقت

جانچنے کا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے اختلاف کرکے کچے راستے پر دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔

ابھی اس کے ساتھیوں نے تھوڑا ہی فاصلہ پکی سڑک پر طے کیا تھا کہ سڑک کے کنارے لگے ایک درخت کی اوٹ میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں نے انھیں گھیر لیا اور مطالبہ کرنے لگے کہ جو کچھ بھی اُن کے پاس ہے نکال کر فوراً ان کے حوالے کر دیں۔ وہ سب اس اچانک افتاد سے حواس باختہ ہو کر چلانے لگے: "بچاؤ... بچاؤ..."

ان کے چیخنے کی آواز پگڈنڈی پر سفر کرتے خیبسو نے سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ ضرور اس کے ساتھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ وہیں سے چیخ کر بولا: "ساتھیو! گھبراؤ نہیں میں ابھی تم سب کی مدد کو اپنے پندرہ ساتھیوں سمیت پہنچتا ہوں" اور اس کے ساتھ ہی اُس نے پکی سڑک کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

ڈاکو تعداد میں پانچ تھے۔ انھوں نے خیبسو کی آواز سنی ساتھ ہی دوڑنے کی آہٹ بھی۔ وہ یہ سوچ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے کہ یہ تینوں اور پندرہ آنے والے کے ساتھ ہیں کس کس کا مقابلہ کریں گے چنانچہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

خیبسو وہاں پہنچا تو ڈاکو بھاگ چکے تھے۔ تینوں ساتھی پھر خیبسو کے ساتھ ہو لیے اور پکی سڑک چھوڑ کر کچی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ وہ تینوں بار بار خیبسو کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اس کی بروقت مدد سے وہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے سے بچ گئے۔ تینوں نے اپنے اپنے طور پر خیبسو کو کچھ روپے بھی بطور شکریہ پیش کیے۔

انھیں چلتے چلتے کافی رات ہو گئی تھی۔ اب وہ تھکن بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ آخر انھوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ پگڈنڈی سے ہٹ کر قریب ہی جو قصبہ ہے وہاں کسی کے گھر رک کر آرام کریں اور صبح ناشتے کے بعد اپنے گاؤں کے لیے سفر شروع کریں۔

آخر چاروں قصبے میں داخل ہو گئے۔ قصبے میں صاف ستھری گلیاں تھیں۔ لکڑی اور پھوس کے مکان بنے ہوئے تھے۔ چاروں نے گلی میں پہنچ کر ایک مکان پر دستک دی۔ دستک سن کر ایک خوب صورت اور نوجوان خاتون نے دروازہ کھولا اور اُن سے مدعا طلب کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا: "ہم مسافر ہیں۔ شہر سے روزی کما کر اپنے گاؤں جا رہے تھے راستے میں رات ہو گئی اور تھکن بھی اس لیے اگر آج کی شب گزارنے کی اجازت مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ چاہیں گی تو ہم کچھ معاوضہ بھی پیش کر دیں گے۔"

وہ خاتون جواب میں بولی: "نہیں نہیں معاوضے کی کیا ضرورت ہے! میرا گھر کافی بڑا اور کشادہ ہے۔ میں اپنے بوڑھے شوہر کے ہمراہ رہتی ہوں آپ لوگ بہ صد شوق رات یہاں گزاریں۔"

خیبسو نے جب یہ سنا کہ خاتون کا شوہر بوڑھا

ہے تو وہ اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ تم لوگ چاہو تو یہاں رات بھر قیام کر سکتے ہو مگر میں یہاں ٹھہرنا قطعی مناسب نہیں سمجھتا۔ اُسے زمیندار کی نصیحت یاد آگئی تھی اور اُس نصیحت کی آزمائش کا یہ بہترین موقع تھا۔

خمیسو کے تینوں ساتھی اُس کی اس عجیب و غریب حرکت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ انھیں اس وقت خمیسو کی یہ بات بے وقوفی نظر آئی۔

خمیسو برابر والے گھر میں جا پہنچا۔ دستک دی تو ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔ خمیسو نے اپنی ضرورت بتا کر رات بھر اپنے یہاں ٹھہرنے کے لیے اجازت کی درخواست کی۔ بوڑھے نے بہ خوشی اجازت دے دی اور دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ خمیسو اندر آجائے۔

خمیسو نے اندر جا کر دیکھا کمرا خاصا بڑا اور آرام دہ تھا۔ ایک طرف بوڑھے میزبان کا بستر بچھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک تخت پر اس کا بیٹا سو رہا تھا۔ کسان نے بتایا: "عرصہ ہوا اُس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب یہی ایک بیٹا ہے جو کھیتوں میں کام کاج کر کے کچھ کما لاتا ہے اور دونوں اسی سے گزر بسر کرتے ہیں۔" پھر بوڑھے نے خمیسو کے سامنے مکئی کی روٹی اور ساگ کھانے کے لیے رکھا جسے اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

بوڑھے نے خمیسو کے لیے اُس دیوار کے ساتھ



بہت ساری پیال بچھا کر بستر لگا دیا جو پڑوس کے مکان سے ملتی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو دیوار کے ٹوٹے ہوئے تختے میں سے اُسے ہمسائے گھر کا نقشہ نظر آنے لگا۔ ابھی وہ غنودگی کے عالم میں تھا کہ اُس نے برابر والے گھر کے دروازے پر دستک کی آواز سنی، آواز بڑی آہستہ تھی۔ جواب میں وہی خوب صورت خاتون اپنے سوئے ہوئے بوڑھے شوہر کو دیکھتی ہوئی اُٹھی۔ پھر اُس نے ایک نظر اُس کے تینوں سوئے ہوئے ساتھیوں پر ڈالی اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر دھیرے سے دروازے کی کُنڈی کھول دی سامنے ایک نوجوان شخص کھڑا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی اور اشارے سے اُسے اندر بلا لیا، پھر سرگوشی میں بولی۔ "اچھا ہوا تم آگئے شبراتی یہ تینوں مسافر تھکے ہوئے ہیں اور گہری نیند سو رہے ہیں۔ بوڑھا بھی گھوڑے بیچ کر سویا ہوا ہے۔ تم اپنا کام کر گزرو۔"

یہ سُن کر اُس شخص نے اپنی جیب سے ایک رومال نکال کر بوڑھے کی ناک پر لمحے بھر کے لیے رکھ کر ہٹا لیا پھر غور سے بوڑھے کا مُنہ دیکھنے کے بعد جیب سے چاقو نکال کر بوڑھے پر لگاتار کئی وار کیے اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ بوڑھا زندہ نہیں رہا تو وہ چاقو اُس کے پلنگ کے نیچے کی زمین کھود کر دبا دیا۔ جب وہ چاقو کو زمین میں دبانے کے لیے بیٹھا تو نمیسو نے لکڑی کی دیوار کے ٹوٹے ہوئے حصے میں سے ہاتھ ڈال کر اس نوجوان کی قمیص کا دامن پیچھے سے کاٹ لیا۔ نوجوان خاموشی سے واپس چلا گیا۔

نمیسو کافی دیر تک جاگنے کے بعد نہ جانے کب سویا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو گلی میں خاصا ہنگامہ تھا۔ وہ بھی آنکھیں ملتا ہوا باہر آگیا۔ دیکھا گلی میں قصبے کے لوگ جمع ہیں اور وہ خوب صورت خاتون رو رو کر سب کو بتا رہی ہے "رات کو تین مسافر ہمارے یہاں ٹھہرے تھے۔ انھوں نے میرے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔"

گلی میں موجود لوگوں نے اُن تینوں آدمیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور قصبے کی پولیس چوکی لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔

اُن تینوں نے نمیسو کو دیکھا تو رو رو کر التجا کرنے لگے۔ "نمیسو خدا کے واسطے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔ ہم بے قصور ہیں۔ ہمیں قطعی پتا نہیں کہ بوڑھے کو کس نے قتل کیا ہے۔ ہم بوڑھے کے قاتل نہیں ہیں۔"

ان کی بات سن کر وہ خاتون زار و قطار روتے ہوئے پھر بولی۔ "نہیں۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ انھوں نے ہی میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔"

نمیسو ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ چکا ہوتا تو شاید وہ بھی خاتون کی بات کا یقین کر لیتا۔ پھر بھی وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "دیکھا میں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ اس مکان میں مت ٹھہرو، مگر تم لوگوں

نے میری بات نہ مانی، پھر وہ گلی میں موجود لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا: حضرات! یہ تینوں واقعی قاتل نہیں ہیں۔ یہ عورت خود اپنے شوہر کی قاتل ہے اور اسی نے یہ قتل شبراتی نامی نوجوان شخص کی مدد سے کیا ہے۔ آپ لوگ یہ بات تو مانیں گے کہ میں بھی آپ کے قصبے میں اجنبی ہوں۔ ایک اجنبی شخص شبراتی نامی نوجوان سے کیوں کر واقف ہو سکتا ہے۔ اگر اس نام کا کوئی آدمی یہاں رہتا ہے تو اسے بلوائیے۔

یہ سن کر تو جیسے سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا پھر کچھ سوچ کر انھوں نے شبراتی کو بلوالیا۔

شبراتی اب بھی رات والی قمیص شلوار پہنے ہوئے تھا۔ عیسو نے اس نوجوان سے سوال کیا: تم رات کو اس خاتون کے مکان میں کیوں آئے تھے؟

یہ سوال سن کر وہ لرز کر رہ گیا۔ پھر ہمت کر کے بولا: میں تو یہاں آیا ہی نہیں، یہ جھوٹ ہے۔

اب لوگ پھر عیسو کی طرف دیکھنے لگے۔ عیسو نے قریب کھڑے لوگوں سے کہا: اگر یہ شخص رات کو یہاں نہیں آیا تو اس سے دریافت کریں کہ اس کی قمیص کا دامن پیچھے سے کس نے اور کہاں کاٹا ہے؟

شبراتی نے اپنا کٹا ہوا دامن دیکھا تو بہت گھبرایا اس کی اس گھبراہٹ پر عیسو نے مسکراتے ہوئے دامن کا کٹا ہوا ٹکڑا سب کے سامنے اپنی جیب سے نکال کر پیش کر دیا اور ساری بات بھی بتادی۔ لوگوں نے بوڑھے کے پلنگ کے نیچے تازہ کھدی ہوئی مٹی ہٹا کر دیکھی تو وہاں خون آلود چاقو موجود تھا۔ اب تو کسی شک و شبے کی گنجائش نہ تھی۔ لوگوں نے شبراتی کے ساتھ ساتھ اس عورت کو بھی پکڑ لیا اور تینوں مسافروں کو چھوڑ کر ان دونوں کو پولیس چوکی کی طرف لے کر چلے گئے۔

اتنی بڑی مصیبت سے اتنی آسانی کے ساتھ رہائی مل جانے پر وہ تینوں ساتھی عیسو کے بے حد احسان مند تھے۔ یہ احسان تو پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ اگر عیسو نہ ہوتا تو یقیناً ان تینوں کو بوڑھے کے قتل کے الزام میں پھانسی ہو جاتی۔ انھوں نے اب اور زیادہ رقم عیسو کی خدمت میں بہ طور شکریہ پیش کی۔

عیسو خوشی خوشی گھر پہنچا۔ وہ بہت زیادہ خوش تھا کیوں کہ اس نے جو دو باتیں چھ اشرفیوں کے عوض معلوم کی تھیں، ان پر عمل کر کے اسے خاصی رقم مل چکی تھی وہ اب خالی ہاتھ بھی نہ تھا۔ گھر آ کر اپنی بہن کو ساری چیزیں دکھائیں چندا بھی بہت خوش ہوئی لیکن سب سے زیادہ خوشی تو بھائی کے گھر واپس آنے کی تھی۔ کچھ دیر بعد عیسو کی نظر اچانک جھونپڑی میں رکھے ہوئے لکڑی کے ایک صندوق پر پڑی۔

"یہ صندوق کس کا ہے؟" اس نے چندا سے سوال کیا۔

وہ بولی: یہ صندوق وڈیرے کا ہے۔ اس کے یہاں شہر سے سامان آیا تھا۔ ٹرک یہاں سے گزرا

تو یہ صندوق ٹرک سے کھسک کر یہاں گر گیا۔ میں نے دیکھا تو اٹھا کر رکھ لیا کہ کوئی آئے گا تو دے دوں گی مگر اس کی تلاش میں یہاں کوئی آیا ہی نہیں۔"

تبھی ٹمیسو کو تیسری بات یاد آگئی زمیندار نے اس سے کہا تھا کہ اگر کہیں راہ میں کوئی چیز گری ہوئی ملے تو اُسے گھر میں رکھنے کی بجائے اُس کے مالک کو تلاش کر کے پہنچا دینا۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، لکڑی کا وہ صندوق اٹھایا اور کندھے پر رکھ کر وڈیرے کی حویلی کی طرف چل دیا۔

وڈیرا اپنے ملازموں پر ناراض ہو رہا تھا کہ ان کی بے پروائی سے ایک صندوق گم ہو گیا ہے۔ ٹمیسو نے جب اُس کے سامنے صندوق لے جا کر رکھا تو وہ حیرت سے اُسے دیکھتا ہو گیا۔ پھر بولا "ارے ٹمیسو تو کب گاؤں واپس آیا؟ میں تو تیری تلاش میں تھا۔"

ٹمیسو نے وڈیرے کو ساری بات بتا دی پھر بولا "میں آج ہی گھر لوٹا ہوں تو معلوم ہوا کہ یہ بکس آپ کا ہے۔ جب ٹرک میری جھونپڑی کے سامنے سے گزرا تو یہ وہاں گر گیا۔ میری بہن چندا نے اُسے اس خیال سے اُٹھا کر رکھ لیا کہ آپ کا کوئی کارندہ تلاش کرتا ہوا اِدھر آئے گا تو دے دے گی۔ یہ بات معلوم ہوتے ہی میں اسے یہاں لے آیا یہ آپ کی امانت ہے۔"

وڈیرے نے سب کے سامنے بکس کھولا تو وہ اُوپر تک سونے کی سلاخوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُس لکڑی کے صندوق میں لاکھوں روپے کی مالیت کا سونا تھا۔ وڈیرے نے ٹمیسو سے کہا "اگر تو یہ بکس خود رکھ لیتا تو کسی کو بھی پتا نہ چلتا۔ میں پہلے تیری محنت سے خوش تھا اب تیری اور تیری بہن کی ایمان داری نے مجھے جیت لیا ہے۔ پہلے مجھے تیری تلاش ملازم رکھنے کے لیے تھی۔ پر اب تو میری حویلی میں میرے بیٹے کی طرح رہے گا۔ تیری بہن کی شادی میں اپنے بھتیجے کے ساتھ کروں گا۔"

ٹمیسو یہ سن کر خوشی خوشی گھر آیا اور ساری باتیں چندا کو سنائیں۔ پھر پوچھا "کیوں چندا تم بھی خوش ہو گئیں اس بات سے اب ہم دونوں اس جھونپڑی میں رہنے کی بجائے وڈیرے کی حویلی میں رہیں گے۔"

چندا نے اپنی خوشی کا اظہار اپنی شرمیلی مسکراہٹ سے سر ہلا کر کیا۔ اب ٹمیسو کو یاد آیا کہ زمیندار نے چلتے وقت اپنی بیٹی کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ایک ڈبل روٹی دی تھی اور کہا تھا کہ یہ ڈبل روٹی اُس وقت دونوں بھائی بہن کھانا جب تم دونوں بہت خوش ہو۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔ وہ ڈبل روٹی لے کر اپنی بہن کے پاس آیا۔ دونوں نے اس کے ٹکڑے کاٹے تو اندر سے نو اشرفیاں نکل کر تھالی میں گریں۔ یہ وہ نو اشرفیاں تھیں جو ٹمیسو خان نے اچھی باتوں کے عوض زمیندار کو اپنی خوشی سے دی تھیں مگر زمیندار نے وہ اس طرح واپس کر دیں۔ دونوں بھائی بہن اشرفیاں واپس مل جانے پر اور بھی خوش ہوئے اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔

موتی کی تلاش

مہ ناز مظہر علی

ایک تھا بادشاہ۔ اسے ہیرے، جواہرات اور دوسرے قیمتی پتھر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس ایسے نایاب پتھر، موتی، ہیرے اور جواہرات تھے جو کسی کے پاس نہیں تھے۔

ایک دن بادشاہ اپنے وزیروں کے ہمراہ جنگل کی سیر کو جا رہا تھا کہ راستے میں ایک خستہ حال جھونپڑی دیکھ کر رک گیا۔ بادشاہ اپنے وزیروں کو ساتھ لیے جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت پرانی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بادشاہ اور وزیروں کی خاطر تواضع کی۔

بادشاہ کے ساتھی پھل کھا رہے تھے مگر بادشاہ اس موتی کی طرف دیکھ رہا تھا جو بڑھیا نے اپنے ماتھے پر باندھ رکھا تھا۔ بڑھیا بھانپ گئی اور اس سے پہلے کہ بادشاہ اس سے موتی مانگتا، بڑھیا نے خود ہی وہ موتی اتار کر بادشاہ کو دے دیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ موتی دیتے وقت بڑھیا نے بادشاہ سے کہا کہ تم اکیلے کسی وقت آنا تمہیں اس موتی کے متعلق بتاؤں گی۔ کچھ دیر بعد بادشاہ اپنے ساتھیوں کو لے کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

بادشاہ کا ایک وزیر تھا جس پر بادشاہ کو بڑا اعتماد تھا۔ بادشاہ نے وہ موتی اپنے وزیر کو رکھنے کے لیے دے دیا۔ وزیر اتنا قیمتی اور چمک دار موتی دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کوئی ایسا طریقہ ہو کہ یہ موتی میں لے لوں اور بادشاہ کو شک بھی نہ ہو۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ اس ترکیب پر خوش ہونے لگا۔

جب بادشاہ آرام کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو اسے اچانک اس موتی کا خیال آیا۔ بادشاہ نے وزیر سے موتی طلب کیا تو پہلے تو وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا اور پھر پریشان ہو کر کہنے لگا کہ وہ موتی شائد راستے میں کھو گیا ہے۔ بادشاہ نے وزیر کی بات کا یقین کر لیا اور موتی ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ ہزار کوشش کے باوجود موتی نہ ملا۔ آخر بادشاہ کو بڑھیا کا خیال آیا اور وہ بڑھیا کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب بادشاہ جھونپڑی میں داخل ہوا تو بڑھیا لیٹی ہوئی تھی۔ بادشاہ کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے" بادشاہ کہنے لگا: "وہ موتی میرے وزیر سے کھو گیا ہے اور میں اسی پریشانی میں تمہارے پاس آیا ہوں"

بُڑھیا نے کہا: "بادشاہ سلامت! وہ موتی کھویا نہیں ہے بلکہ آپ کے وزیر کے پاس ہے۔"

بادشاہ نے بُڑھیا سے پوچھا: "وہ موتی وزیر سے کیسے غائب ہو گیا؟"

بُڑھیا نے کہا: "وہ موتی وزیر نے ایک الماری میں رکھ دیا تھا جسے ایک سانپ نے نگل لیا اور اپنے بادشاہ سانپ کے سامنے حاضر ہو گیا اور موتی اپنے پیٹ سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ سانپ یہ موتی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس موتی کا راز میں بعد میں، جب تم اکیلے ہو گے تو بتاؤں گی۔ میں تم سے اس موتی کی حفاظت کے بارے میں کہنا چاہتی تھی کیوں کہ جب تک اس موتی کو جسم کے کسی حصے میں نہ باندھا جائے، اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے تو میں نے یہ موتی اپنے ماتھے پر باندھ رکھا تھا اور سنو! اس موتی کا فائدہ یہ تھا کہ جس کے پاس یہ موتی ہوتا، سانپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔"

بادشاہ نے بڑھیا سے پوچھا کہ وہ یہ موتی کس طرح حاصل کرے؟

"یہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ یہ کام کوئی بہادر نوجوان ہی کر سکتا ہے۔" یہ کہہ کر بڑھیا نے پرانے صندوق سے ایک تھیلا نکالا اور بادشاہ کو دے دیا۔ اس تھیلے میں ایک مرا ہوا سانپ تھا۔

اب بڑھیا نے بادشاہ کو موتی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا۔ بڑھیا نے یہ بھی کہا کہ جسے بھی موتی لینے بھیجو اسے یہ بھی بتا دینا کہ موتی کو جسم کے کسی حصے کے ساتھ باندھ کر لائے۔

بادشاہ نے رات بے چینی سے گزاری۔ دوسرے دن ایک لڑکے کو محل میں بلوایا اور اسے ساری ہدایتیں دے دیں۔ وہ لڑکا وزیر کا بیٹا، فراز تھا۔ وہ بادشاہ کی بات ماننے پر تیار ہو گیا۔ وہ سانپوں کے شہر میں داخل ہوا اور تھیلے میں سے مرا ہوا سانپ نکال کر پھینکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے سانپ مرے ہوئے سانپ کے گرد جمع ہو گئے۔ فراز چپکے سے محل میں داخل ہو گیا۔ اس نے موتی اٹھا کر اپنے سر پر باندھ لیا اور واپس اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا بادشاہ کے محل پہنچ گیا اور وہ موتی بادشاہ کے حوالے کر دیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے وزیر کو بلایا اور اسے وہی موتی دکھایا۔ موتی دیکھ کر وزیر پریشان ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے تمام قصہ سنایا، یہ سن کر وہ شرمندہ ہو گیا اور پوچھا: "آخر وہ بہادر نوجوان کون ہے؟"

بادشاہ نے کہا: "وہ بہادر تمہارا بیٹا فراز ہے۔"

وزیر نے آئندہ کے لیے توبہ کر لی اور سچے دل سے کام کرنے کا عہد کیا۔ بادشاہ نے فراز کو بہت سی دولت دی اور وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔



روزہ کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا روزہ ڈھال ہے۔ اس لیے روزہ دار نہ بیہودہ گوئی کرے اور نہ جہالت کے کام ـــ اور اگر کوئی اس سے لڑائی کرے یا اسے گالی دے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔ دو مرتبہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ اپنے کھانے پینے اور شہوت کو میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ اور (دیگر) نیکیوں کی ایک کی دس گنا۔ (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے اللہ پر ایمان لاتے ہوئے اور اجر آخرت کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کیے جاتے ہیں (بخاری، کتاب الایمان)

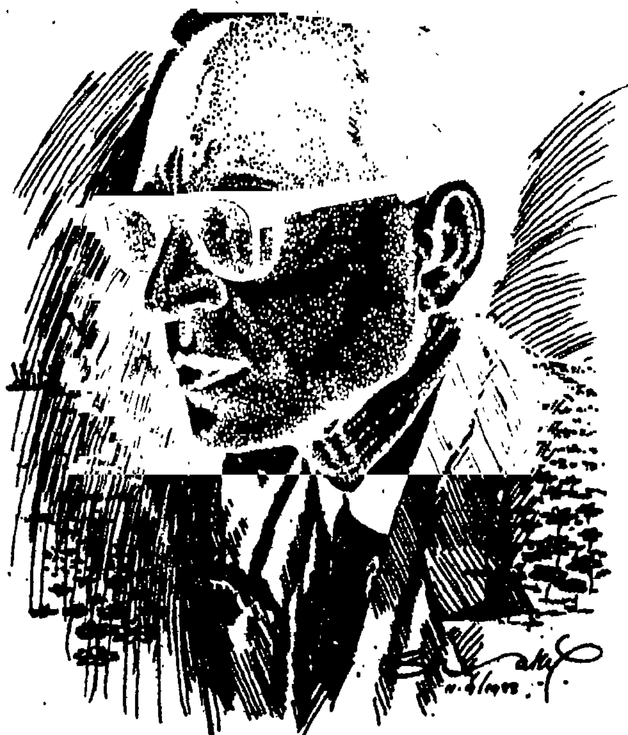
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ روزہ اور قرآن بندہ کی سفارش کریں گے روزہ کہے گا۔ اے پروردگار! میں نے اسے دن میں کھانے اور خواہشات سے روکے رکھا۔ پس اس کے لیے میری سفارش قبول کر۔ اور قرآن کہے گا۔ میں نے اس کو رات کی نیند سے باز رکھا۔ پس اس کے حق میں میری سفارش قبول کر۔ چنانچہ ان کی سفارش قبول کی جائے گی۔ (بیہقی مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمیوں کی دعا رد نہیں ہوتی۔ ایک تو روزہ دار کی دعا افطار کرتے وقت دوسرے عادل حاکم کی دعا اور تیسرے

مظلوم کی دعا کر اس کی دعا کو خداوند تعالیٰ فرماتا ہے قسم ہے اپنی عزت کی میں تیری ضرور مدد کروں گا اگرچہ کچھ دنوں کے بعد ہی سہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص رمضان میں ایک دن بغیر کسی اجازت عذر یا بیماری کے روزہ نہ رکھے تو ساری عمر روزہ رکھنا بھی اس کا معاوضہ نہیں ہو سکتا (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر　　مخدوم محی الدین (مرحوم)



مصور۔ شکیل اعجاز

حشمت کمال پاشا
بی ۱۱۹۔ بنگالی بازار گارڈن ریچ۔ کلکتہ

اکّڑ بکّڑ لوہے کی چھڑ، اِکّا، دُگّی، دس

میہر، ڈبّو، نجّو آؤ، آؤ بی پروین
مِل جُل کر سب ساتھی کھیلیں کبھی نہ ہوئیں تین
بھول کے ہم آپس کے جھگڑے اک آواز میں بولیں بس
اکّڑ بکّڑ لوہے کی چھڑ، اِکّا، دُگّی، دس

مالی کی جو نظر بچا کر باغ میں جائیں کود
بھاگیں توڑ کے جلدی جلدی جامن، بیر، امرود
پھسلے گر تو ٹوٹی ٹانگ اور کبھی گئے یوں پھنس
اکّڑ بکّڑ لوہے کی چھڑ، اِکّا، دُگّی، دس

دس پیسے کا مول نہیں کچھ گھڑی یہ کیسی آئی
ممی، ڈیڈی ریٹ بڑھا ہائے ہوئی مہنگائی
پیڑا برفی ملتے ہیں نہ اب گنّے کا رس
اکّڑ بکّڑ لوہے کی چھڑ، اِکّا، دُگّی، دس

گالی سے پرہیز کریں نہ کھیلیں گلّی ڈنڈا
ہرگز اس سے بھلا نہ جو پڑھنے میں پاتا انڈا
بھِڑ کے چھتّے کو نہ چھیڑو ورنہ لے گی ڈس
اکّڑ بکّڑ لوہے کی چھڑ، اِکّا، دُگّی، دس

ڈبّو بھیّا، نجّو بہنا چھوڑ کھیل اب آؤ
شام ہوئی لو چھ بجتے ہیں پڑھنے بیٹھ بھی جاؤ
رہنے دو یہ کھیل تماشا بس بھئی پاشا بس
اکّڑ بکّڑ لوہے کی چھڑ، اِکّا، دُگّی، دس

نظر برنی



• مالک اور نوکر کرکٹ کھیل رہے تھے نوکر مالک کو بڑی طرح ہرا رہا تھا بڑی مشکل سے مالک نے نوکر کو آؤٹ کر دیا اور خود کھیلنے لگے۔ نوکر نے بولنگ شروع کی مالک نے زوردار ہٹ لگائی تو گیند سیدھی باورچی خانہ میں گئی۔ نوکر گیند لانے بھاگا تو بیگم صاحبہ کا سامنا ہو گیا انھوں نے ڈانٹ کر کہا ارے کمبخت تو صاحب کے ساتھ کھیل رہا ہے، گھر کا سودا کون لائے گا۔ جا جلدی سے گوشت اور سبزی لا دے۔

نوکر جب خریداری کرکے واپس آیا تو دیکھا کہ لان میں ہانپتے ہوئے صاحب رن بنا رہے ہیں ایک سو دو، ایک سو تین اور ایک سو چار۔

دوسروں سے اپنی تعریف سننا ہر انسان کی کمزوری ہے۔ چند بھلے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کردار پر نظر ڈال کر یہ سوچ بچار کریں کہ کس طرح اپنی شخصیت میں اعتدال و بلندی قائم رکھیں اور کیسے اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں میں اپنی خوبیوں کے ذریعے مقبولیت پیدا کریں؟

غرور انسانی فطرت کا وہ جذبہ ہے جو سماج کے بڑے سے بڑے فرد کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے اور اس برائی سے بچنا نہایت مشکل کام ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ غرور کے پنجے سے بادشاہ بھی نہ بچ سکے اور بڑے بڑے عالم بھی اس کے شکار ہوتے۔ دانشوروں نے اس کے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیے تو سرمایہ داروں، جنگجو لوگوں اور لیڈروں نے بھی اس سے پناہ مانگی۔

اتنا سب جانتے ہیں کہ غرور انسان کو اندھا بنا دیتا ہے ڈھاک کا پھول دیکھنے میں کتنا خوب صورت نظر آتا ہے لیکن اس میں خوشبو نہیں ہوتی۔ مغرور آدمی ڈھاک کے پھول کے مانند ہے۔ اس کو اپنے جسم، اپنی عقل، اپنی دولت، اپنے خاندان اور اپنے ہتھکنڈے پر بڑا غرور ہوتا ہے لیکن یہ سب چیزیں کھوکھلی ہوتی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کے دل میں رتی برابر غرور ہوگا۔

ادبی سنگم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

غرور ایک اعصابی بیماری ہے۔ اس بیماری کے دوران انسان غیر معمولی حرکتیں کرتا ہے۔ وہ بعض دفعہ ایسی باتیں کرتا ہے جو ہوش مندی میں ہرگز ممکن نہیں۔ اس انفرادی عمل کا پورے معاشرے پر اثر پڑتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے:

"..... اور زمین پر اکڑ کے نہ چلا کر دیکھوں کر اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے تو زمین پھٹ نہ جائے گی اور نہ ہی تو تن کر چلنے سے پہاڑوں کی لمبائی کم ہو جائے گی۔"

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ جو آدمی خود مغرور ہو اور دوسروں کو منہ نہ لگاتے، بھلا وہ دوسروں پر مغرور ہونے کا الزام کیسے لگا سکتا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ ایسا شخص انصاف و مساوات کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس کا لازمی نتیجہ ظاہر ہے: مایوسی، ذلت اور نفرت، اس کو ہمیشہ پریشان کرتے ہیں۔

ایک یونانی نے اپنے قابل، تعلیم یافتہ اور دانش مند غلام پر اپنی سبقت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ غلام نے برجستہ کہا:

اگر آپ اپنی نفیس اور مہنگی پوشاک کی بدولت اپنے آپ کو مجھ سے برتر سمجھتے ہیں تو قیمتی وہ ہے جو آپ زیب تن کیے ہوئے ہیں یعنی لباس۔ اگر آپ مجھ سے اس قیمتی اور چالاک گھوڑے کی وجہ سے خود کو اعلا سمجھتے ہیں تو وہ نفاست اور چالاکی بھی آپ کی اپنی نہیں ہے بلکہ گھوڑے کی ہے۔

دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کے بجائے انسان اپنے آپ کو اس کسوٹی پر پرکھے تو زیادہ مفید ہوتا ہے۔ مال دولت اور ثروت پر اترانا حماقت ہے کیونکہ دولت ایسی شے ہے جو کسی کے پاس نہیں ٹھہرتی۔ خوب صورتی انسان کی وہ ظاہری خوبی ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ قوت کا غرور بھی انسان کو ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ یہ شے بھی غارت ہوتی رہتی ہے۔ بقول فرینکلن: سچ تو یہ ہے کہ غرور کے برابر کوئی نفسیاتی خواہش ایسی نہیں جس کی اصلاح دشوار ہوتی ہے۔

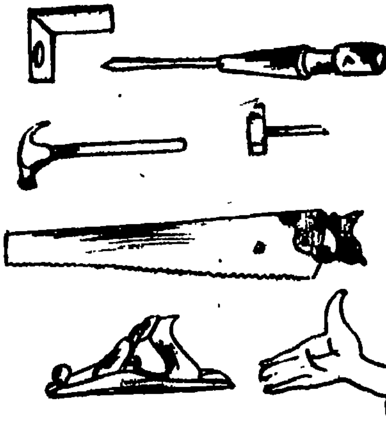
بچوں کی مذہبی کتابیں

حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/-	ہمارا دین (اول، دوم، سوم) فی حصہ	۷/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول)	۴/۰
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/۰
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	-/۴۰	ارکان اسلام	۲/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	عقائد اسلام	۳/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	چار یار	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا اول	۷/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	خلفائے اربعہ	۶/۵۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	نبیوں کے قصے	۵/
اللہ کے صفی	۲/۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
قاعدہ یسرنا القرآن	۲/۲۵	سرکار دو عالمؐ	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

غنی غازی



روم کا بڑھئی

بہت پرانی بات ہے۔ روم نام کا ایک شہر تھا۔ اس شہر پر ایک راجا راج کرتا تھا۔ روم کے لوگ ووٹ دے کر اپنا راجا چنتے تھے۔ اس راجا کو بھی انھوں نے ہی چنا تھا۔ ایک مرتبہ جب اس راجا کا جنم دن آیا تو راجا نے منادی کرائی "میرا جنم دن سب لوگ تہوار سمجھ کر منائیں؛ اس دن میٹھے پکوان پکائیں۔ قیمتی کپڑے پہنیں، گیت گائیں، کھیلیں کودیں۔ اس دن کوئی بھی کام نہ کرے۔ میرے مخبر اس دن شہر میں گھومیں گے کام کرنے والے شہری کو پھانسی دے دی جائے گی۔"

سالگرہ کے دن سب لوگوں نے کام بند رکھے۔ نئے کپڑے پہنے میٹھے پکائے، راستوں پر جلوس نکالے اور ناچ گانے میں دن گزر رہا تھا۔

کام کرنے والوں کو دیکھنے کے لیے راجا کے مخبر شہر میں گھوم رہے تھے لیکن وہ جہاں جاتے لوگ انھیں ناچتے اور گاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ سب نے راجا کے حکم پر عمل کیا تھا۔

تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے مخبروں کو ایک گھر سے "کھٹ کھٹ" کی آواز سنائی دی۔ آواز سنتے ہی مخبروں کو خوشی ہوئی۔ اُن کو یقین ہو گیا کہ کوئی شخص راجا کے حکم کے خلاف کام کر رہا ہے۔ انھوں نے زور سے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک بڑھئی کام کرتا ہوا نظر آیا۔ مخبروں نے اس سے کہا۔

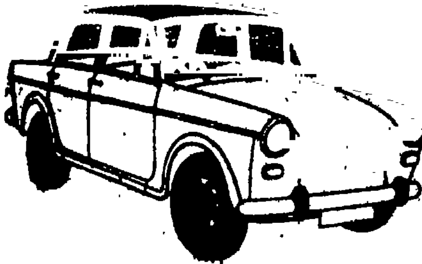
"اے بڑھئی! آج راجا کا جنم دن ہے۔ راجا کا حکم ہے کہ آج کوئی شخص کام نہ کرے لیکن تو نے اس حکم کو توڑ دیا۔ چل اُٹھ! ہم تجھے بیڑیاں پہنا کر راجا کے سامنے حاضر کریں گے۔"

اے۔ کے۔ آئی اردو ہائی اسکول، بمبئی ۸۰

مجزدوں نے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ کر راجا کے سامنے پیش کیا اور کہا "مہاراج!! جاہل بڑھئی نے آپ کے حکم کو توڑا ہے وہ آج بھی اپنا کام کر رہا تھا"
راجا نے کہا "آج اسے جیل میں بند کر دو۔ کل سب لوگوں کے سامنے اس کا انصاف تم خود ہی کرنا" سب لوگ چیخ اٹھے۔ "مہاراج! اُسے اِسی وقت پھانسی کا حکم دے دیجیے"
راجا نے بڑھئی کی طرف پلٹ کر کہا۔ "لوگوں نے تجھے پھانسی دینے کا فیصلہ کیا ہے مرنے سے پہلے تیری کوئی خواہش ہو تو بتا دے"
بڑھئی پہلے تو خاموش رہا۔ پھر بولا۔
"مہاراج! میں نے آپ کا حکم نہیں مانا، مجھے پھانسی دینا ہی ٹھیک ہے لیکن آپ نے مجھے بولنے کا موقع دیا ہے اس لیے میں اپنی بات پیش کرتا ہوں" بڑھئی نے کہا۔ "مہاراج! میں ایک سیدھا سادہ بڑھئی ہوں دن بھر کام کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہوں۔ دن بھر محنت کرنے پر مجھے صرف تین روپے ملتے ہیں۔ رات میں سونے سے پہلے ان تین روپیوں کے سکے لے کر میں بیٹھتا ہوں۔ ان میں سے پچاس پیسے میں پہلے الگ کر کے ایک مٹکے میں ڈالتا ہوں، اپنے والد کے وقت کا قرض میں اسی سے ادا کرتا ہوں۔ بیٹا ہونے کے ناطے وہ قرض مجھے ہی ادا کرنا چاہیے۔ دس پیسے میں خیرات کے لیے نکالتا ہوں۔ دوسرے دن وہ غریبوں میں بانٹ دیتا ہوں کیونکہ انسان کو اگلی زندگی کے لیے ثواب کے کام کرنا چاہیے۔ دس پیسے بچوں کی تعلیم کے لیے رکھتا ہوں۔ ان کے معلم کو تھوڑا بہت نذرانہ دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بیس پیسے گھر کے لوگوں کے لیے رکھتا ہوں۔ ڈیڑھ سو پیسے ہمیں روزانہ اناج کے لیے لگتے ہیں۔ روٹی، نمک، مرچ، سبزی، ترکاری، ایسا ہی ہمارا سادا کھانا ہوتا ہے۔ دس پیسے دوائیوں کے لیے اٹھا رکھتا ہوں! حساب کر کے دیکھ لیجیے، والد کا قرض، خیرات، تعلیم وغیرہ پر ڈھائی سو پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ بچے ہوئے پچاس پیسے اپنے بڑھاپے کے لیے رکھتا ہوں۔
یہ سچ ہے کہ حضور نے اپنی سالگرہ پر کام نہ کرنے کا حکم دیا تھا لیکن میں اس حکم کو توڑ کر کام کرتا رہا۔ اگر میں کام نہ کرتا تو کیا ہوتا؟ روزانہ والد کا پچاس پیسے کا قرض چکاتا ہوں، وہ چکا نہیں سکتا تھا، روزانہ دس پیسے خیرات کرتا ہوں وہ خیرات اس رات نہ کر پاتا اور اس کا گناہ بھی میرے سر پر رہ جاتا۔ کام نہ کر کے اگر ہم سودا لاتے تو دکاندار کے ایک سو پچاس پیسے مجھ پر قرض ہو جاتے اگر میں اس دن کا قرض ادا کیے بغیر مر جاتا تو میرے بچوں کو وہ قرض ادا کرنا پڑتا۔ اس لیے میں نے کام کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ مقروض مرنے سے اس طرح مرنا اچھا ہے۔ اب آپ لوگ مناسب سمجھیں تو مجھے

گوتم داس سونی

موٹر کار کیسے چلتی ہے



کیا آپ جانتے ہیں کہ کار میں تقریباً سات ہزار مختلف پرزے ہیں؛ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی وجہ سے کار دیکھنے میں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور انھی کی بدولت سواریوں کو آرام ملتا ہے۔ لیکن زیادہ تر پرزے ایسے ہیں جو کار چلانے میں مدد دیتے ہیں۔

انجن:۔ (جو پیٹرول کی مدد سے چلتا ہے)

کلچ۔ یہ ایک ایسا پرزا ہوتا ہے جو چلتے ہوئے انجن کو موٹر کار کے پہیوں سے جوڑ دیتا ہے۔ اور وہ چلنے لگتی ہے۔ آج کل ایسی کاریں عام ہوگئی ہیں جن میں کلچ نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص قسم کی ہیڈرالک کپلنگ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہیڈرالک کا مطلب ہے "جوڑ" ہیڈرالک کپلنگ ایسا جوڑ ہے جو ضرورت کے وقت انجن کو پچھلے پہیوں سے جوڑ دیتا ہے۔

آٹومیٹک ٹرانسمیشن آٹومیٹک کا مطلب ہے اپنے آپ۔ ایسی ہر شئے کو آٹومیٹک کہا جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کام کرتی ہو ٹرانسمیشن کا مطلب ہے۔ منتقل یعنی کسی شئے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا۔ آٹومیٹک ٹرانسمیشن کا مطلب ہے کوئی ایسا طریقہ جو کلچ کے بغیر اپنے آپ انجن کی طاقت کو پچھلے پہیوں پر منتقل کرتا ہے۔

گیئر بکس جس میں کئی گیئر بدلنے ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت کلچ انجن کی طاقت کو پچھلے پہیوں پر منتقل کرتا ہے۔ امریکہ کے لوگ گیئر بکس کو بھی ٹرانسمیشن کہتے ہیں۔

فرنشل:۔ یہ بھی ایک قسم کا گیئر بکس ہے جو کہ پچھلے پہیوں کے درمیان میں ہوتا ہے۔

موٹر کو اسٹارٹ کرنے چلانے کے لیے ڈرائیور سب سے پہلے کیا کام کرتا ہے۔ وہ سب

سے پہلے اپنے سامنے انسٹرومینٹ پینل پر جہاں کئی قسم کی گھڑیاں اور آلات لگے ہوتے ہیں۔ کنجی کے ذریعے بیٹری کا سوئچ آن کرتا ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ بیٹری میں سے بجلی کی طاقت انجن گھمانے والی بجلی موٹر یعنی اسٹارٹر میں پہنچ جاتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے انجنوں کو ہینڈل کے ذریعے گھمانا پڑتا تھا۔ اسٹارٹر جو حقیقت میں بجلی سے چلنے والی موٹر ہے، اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ انجن کو گھمانا شروع کر دیتا ہے جس کے بعد انجن چالو ہو جاتا ہے۔ بیٹری کی کنجی گھمانے کے بعد دوسرا کام یہ ہے کہ اسٹارٹر کا بٹن دبایا جائے۔ یہ یا تو ڈرائیور کے پاؤں میں ہوتا ہے جسے وہ اپنے پاؤں سے دباتا ہے۔ یہ عام طور پر انسٹرومینٹ پر لگا ہوتا ہے۔ اسے بعض اوقات دبا دیا جاتا ہے اور بعض اوقات باہر کھینچا جاتا ہے۔ بعض کاروں میں بیٹری کی کنجی ہی سے اسٹارٹر کے بٹن کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

موٹر کاروں میں جہاں جہاں بجلی کی ضرورت ہوتی ہے بیٹری ہی سے حاصل کی جاتی ہے۔ یہ سب سے پہلے اسٹارٹر کی بدولت انجن کو چالو کرتی ہے۔ آج کل کاروں میں ریڈیو، ہیٹر اور چھوٹے چھوٹے پنکھے بھی لگے ہوتے ہیں انھیں چلانے کے لیے بھی بیٹری سے مدد لی جاتی ہے۔ ہارن اسی سے بجتا ہے سامنے والے بڑے شیشے کو برسات میں صاف رکھنے والے برش اسی سے کام کرتے ہیں۔ اور کار کے تمام چھوٹے بڑے لیمپوں میں بھی بیٹری کی طاقت خرچ ہوتی ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر بیٹری میں موجود بجلی کو خرچ کیا جائے لیکن اس کمی کو پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو بہت جلد بیٹری ختم ہو جائے گی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جنریٹر سے جوڑ دیا جاتا ہے جسے عام طور پر ڈائنمو کہا جاتا ہے۔ یہ انجن کی مدد سے گھومتا ہے اور گھوم گھوم کر بجلی پیدا کرتا رہتا ہے جس سے بیٹری کی بجلی ختم نہیں ہو پاتی۔

پیٹرول پمپ انجن کے گھومتے ہی پیٹرول پمپ پیٹرول ٹینک میں سے بہت سا پیٹرول کاربوریٹر میں پہنچاتا ہے۔ انگریزی زبان میں کاربوریٹر ایک ایسے پرزے کو کہتے ہیں جو پیٹرول کے ساتھ آکسیجن یا ہوا کو ملا کر ایسی کیمیاوی مرکب بنا سکے جو پیٹرول انجن کے صحیح کام کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کاربوریٹر کے اوپر جو ہیڈی

گول سی چیز لگی ہوتی ہے اسے فلٹر کہتے ہیں یا ایسی ہر چیز کو فلٹر کہا جاتا ہے جو ہوا پانی وغیرہ کو چھان سکے۔ چونکہ پیٹرول کے ساتھ بہت سی مقدار میں ہوا بھی شامل ہوتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہوا میں چھوٹے چھوٹے ریزے پانی کے قطرے اور کسی قسم کا میل وغیرہ نہ رہے۔ کاربوریٹر میں جتنی ہوا جاتی ہے، فلٹر میں سے ہو کر جاتی ہے۔ انجن میں جو پیٹرول اور ہوا کا مرکب جلتا ہے اس میں پٹرول کے صرف ایک گیلن میں دو ہزار گیلن ہوا شامل ہوتی ہے مرکب بنانے کا کام کاربوریٹر انجام دیتا ہے۔ کاربوریٹر میں ہوا اور پٹرول اکٹھے داخل ہوتے ہیں۔ اب وہاں سے نکل کر انجن میں جاتے وقت وہ دونوں ایک دوسرے میں ایسے گھل جاتے ہیں کہ دیکھا جائے کہ ان کی صورت ایک لطیف دھند یا کہر کی سی ہوتی ہے پیٹرول اور ہوا کا یہ انتہائی لطیف مرکب ہے جسے انگریزی میں مکسچر کہتے ہیں جو ایک خاص والو کے ذریعے سیلنڈر میں پہنچتا ہے والو ایک طرح کا ایسا راستہ ہے جسے اپنی مرضی سے کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے چھوٹی کاریں چار سیلنڈر درمیانی چھ سیلنڈر اور بڑی بڑی کاریں آٹھ سیلنڈر کی ہوتی ہیں۔

فولاد کے مستطیل ٹکڑے میں گول آر پار سوراخ کو سیلنڈر کہتے ہیں جس میں پسٹن اوپر نیچے حرکت کرتا ہے سیلنڈر کی طرح پسٹن بھی بالکل گول ہوتا ہے سلینڈر اوپر سے بند ہوتا ہے جس میں پلگ اور والو لگے ہوتے ہیں پلگ کے ذریعہ سیلنڈر میں مکسچر داخل ہوتا ہے۔ ہر سیلنڈر میں دو والو ہوتے ہیں ان میں سے ایک کو ان لٹ والو کہتے ہیں۔ جس سے کاربوریٹر میں بنا ہوا مکسچر سیلنڈر میں جل جاتا ہے اسے ایگزاسٹ والو کہتے ہیں جو مکسچر سیلنڈر میں جل جاتا ہے۔ اسے ایگزسٹ والو کے راستے باہر خارج کر دیا جاتا ہے۔

ہر ایک اسپارک پلگ تار کے ذریعہ ایک چھوٹے سے گول بکس کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اس کو ڈسٹری بیوٹر کہتے ہیں ڈسٹری بیوٹر کا مطلب ہے تقسیم کرنے والا اس کے ذریعہ مختلف پلگوں میں برقی شعلے پہنچائے جاتے ہیں۔ ڈسٹری بیوٹر باری باری ہر ایک اسپارک میں بجلی بھیجتا ہے۔ اور یہ کام اتنی تیزی سے ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی سکینڈ میں پلگ میں ہزاروں شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ جب پٹرول اور ہوا کا مرکب جلتا ہے تو سلینڈر میں دھماکا ہوتا ہے۔ جب مکسچر بارود کی طرح پھٹ پڑتا ہے

تو پسٹن کو نیچے کی طرف دھکیلتا ہے۔ پسٹن کے نچلے سرے پر ایک سلاخ ہوتی ہے جسے کنکٹنگ راڈ کہتے ہیں۔ یہ راڈ کرینک شافٹ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اس طرح وہ پہلے پہیوں کو گھماتے ہیں ● ●

(بقیہ صفحہ ۴)

پھانسی دے دیں؟

بڑھئی کی سچی باتیں سن کر سب لوگ چپ ہو گئے۔ بڑھئی کی سادگی اور محنت نے ان کے دلوں کو موہ لیا۔ سب نے ایک زبان ہو کر اس بڑھئی کی تعریف کی اور راجا سے کہا کہ وہ بڑھئی کی پھانسی کی سزا معاف کر دے۔

ادقا بلجی

کچھ دنوں بعد وہ راجا مر گیا۔ راجا کی کوئی اولاد نہیں تھی تب دربارِ خاص میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ رعایا ہی اپنے لیے اپنی مرضی کا راجا چنیں جو ایماندار، مخلص، محنتی اور ذہین ہو اور جس کے دل میں اپنی رعایا کی خدمت کا جذبہ ہو ـــــ اور رعایا نے بھاری اکثریت کے ساتھ اسی ایماندار اور مخلص بڑھئی کو اپنا راجا چنا۔ اس نے بھی ہوشیاری اور ایمانداری سے راج کر کے لوگوں کو خوش رکھا۔

(مراٹھی سے ترجمہ)

● ● ● ●

ضمیر عارف شائیکوهان

مچھر انسان کا قدیم دشمن تِنگا

آئیے آج آپ کو دشمن کیڑوں کے بارے میں بتایا جائے دشمن کیڑوں میں مچھر اور مکھی شامل ہیں جو مختلف بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔

مچھر ہمارے ملک میں عام پایا جاتا ہے اور اس کے کاٹنے سے ملیریا بخار ہوتا ہے مچھر کی دو اقسام قابل ذکر ہیں ۱۔ اینوفلیز ۲۔ کیولیکس

اینوفلیز کے کاٹنے سے ملیریا بخار ہوتا ہے کیونکہ یہ حیوانی اور انسانی خون کو پسند کرتی ہے اور ڈنک سے ملیریا میں ملیریا کے جراثیم داخل کر دیتی ہے۔

مادہ اینوفلیز کی شناخت یہ ہے کہ اس کے پروں پر کالے نشان ہوتے ہیں اور یہ سیدھا بیٹھتا ہے۔

کیولیکس یہ مچھر بے ضرر ہے کیونکہ اس کے کاٹنے سے ملیریا بخار نہیں ہوتا یہ زیادہ تر گندے پانی میں پیدا ہوتا ہے مادہ ایک وقت میں دو سو سے چار سو تک گچھوں میں انڈے دیتی ہے۔

مچھروں کو مارنے کا موزوں طریقہ ہے کہ پانی کی سطح پر مٹی کے تیل کی تہ بنادی جائے تاکہ مچھروں کے انڈے وہیں ہلاک ہو جائیں مچھر ملیریا بخار کے علاوہ زرد بخار پھیلانے میں بھی مدد دیتا ہے۔

مکھی: انسان کی بدترین دشمن ہے کیونکہ اس کے ذریعے بہت سی بیماریاں صحت مند آدمیوں تک پہنچتی ہیں مکھی ہر قسم کی غلاظت پر بیٹھتی ہے اس کی افزائش نسل اور نشوونما غلاظت پر ہی ہوتی ہے جب یہ غلاظت پر بیٹھتی ہے تو جراثیم اس کی ٹانگوں اور پروں پر چمٹ جاتے ہیں جب یہ غلاظت سے اڑ کر کھانے پینے کی چیزوں پر بیٹھتی ہے تو بیماری کے جراثیم وہاں منتقل کر دیتی ہے اس طرح انسان جب وہ خوراک کھاتا ہے تو مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے مکھی مختلف بیماریاں پھیلانے میں مدد دیتی ہے جن میں ہیضہ۔ تپ دق، پیچش اور بچوں کا اسہال شامل ہیں۔

بچو! ہمیں ہر ممکن کوشش کر کے ان بیماریوں اور مکھی و مچھر کا خاتمہ کرنا چاہیے تاکہ ہمارا ملک ان بیماریوں سے پاک و صاف ہو جائے۔ ●●

آفتاب اکرم

صدقے کی برکت

حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بڑھیا تھی اس نے ایک مرتبہ دو تین روٹیاں راہِ خدا میں دیں۔ اور پھر آٹا گوندھنے بیٹھی اچانک ہوا آئی اور اس کا سارا آٹا اڑا کر لے گئی۔ بڑھیا حضرت داؤد کے پاس فریاد لے کر پہنچی اور ہوا کی شکایت کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ہوا کو بلایا اور پوچھا تم نے اس کا آٹا کیوں اڑایا؟ ہوا نے عرض کی ہوا کے فرشتے سے پوچھیے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے بلایا اور اس سے پوچھا تو اس نے عرض کی خدا سے پوچھیے۔ خدا سے پوچھا تو خدا نے فرمایا کہ اے داؤد! ہمارا کوئی کام عبث نہیں ہوتا۔ سمندر میں ایک کشتی میں بڑے بڑے تاجر جا رہے تھے کہ ان کی کشتی میں ایک چوہے نے سوراخ کر دیا اور کشتی کو ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ میں نے ہوا کو حکم دیا کہ وہ یہ آٹا اڑا کر اس کشتی میں ڈال دے تاکہ وہ لوگ اس آٹے سے سوراخ بند کر لیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی آٹے سے سوراخ بند کیا اور بہ سلامتی کنارے پہنچ گئے۔ اے داؤد ان کشتی کے تاجروں سے ان کے سارے مال کا تیسرا حصہ اس بڑھیا کو دلا دو چنانچہ داؤد علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور تین تین سو ہزار دینار کا مال بڑھیا کو ملا۔ داؤد نے فرمایا یہ اس کی تین روٹیوں کے

پہیلیاں

(۱) چار ہیں رانیاں اور ایک ہے راجہ
ہر ایک کام میں اُن کا ہے ساجھا

(۲) دو چڑیاں رکھتی ہیں پر
کبھی نہ چھوڑیں اپنا گھر

(۳) گرچہ دھنوکر تا نہیں دیتا ہے اذائیں
کیا نام ہے اس شوخ کا بتلاؤ تو جی

(۴) گرمی راس آئی ہے اس کو
سردی میں مرتا ہے بھوکا
پی کر خون پنپتا ہے یہ
پیاسا ہے انسان کے لہو کا

(۵) اندھا لیکن راہ دکھائے
آنکھ وہ اندھوں کی کہلائے

(۶) ہم نے دیکھی ایسی رانی
جس کی آنکھ سے ٹپکے پانی

(۷) پانی کا مٹکا
پیڑ پہ لٹکا

جوابات

(۱) انگوٹھا اور انگلیاں (۲) آنکھیں (۳) مرچ (۴) مچھر (۵) لاٹھی (۶) موم بتی (۷) ناریل۔



جناب خالد سیف اللہ صاحب سے

انٹرویو لینے والے

۱۔ احمد مجید ظہوری درجہ ہفتم
۲۔ نسرین فاطمہ
۳۔ کوثر نفیس ← درجہ ہشتم
۴۔ محمد سلیم

سوال :۔ آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :۔ میں ۱۹۶۳ء میں آیا تھا۔

سوال :۔ کیا جامعہ تشریف لانے کی کوئی خاص وجہ تھی؟

جواب :۔ میں اپنی بہن کو چھوڑنے جامعہ آیا تھا۔ مجھے یہاں کا ماحول بہت اچھا لگا اور میں نے یہاں بی۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد میں یہاں سے چلا گیا۔ تین سال بعد میں پھر جامعہ آگیا۔

سوال :۔ جامعہ آکر آپ کا پہلا تاثر کیا تھا؟

جواب :۔ مجھے یہاں کے طالب علموں میں ایک خاص اپناپن دکھائی دیا۔ یہاں کے استاد بھی مجھے بہت اچھے لگے۔

سوال :۔ پرانی جامعہ اور آج کی جامعہ میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب :۔ پرانی جامعہ ایک خاندان کی طرح تھی کچھ لوگ اونچے عہدوں پر تھے اور کچھ کم اونچے عہدوں پر لیکن ہر شخص ہر ایک کے سکھ دکھ میں برابر کا شریک رہتا تھا۔ ہر شخص جو بھی کام کرتا تھا بہت لگن سے کرتا تھا۔

سوال :۔ آپ کے خیال میں "تعلیمی میلا" طلبہ اور طالبات کی عام فہم کو بڑھانے میں کس حد تک مددگار ثابت ہوتا ہے جب کہ یہ صرف سال میں ایک بار ہوتا ہے؟

جواب :۔ بیٹے۔ جامعہ تعلیمی میلا صحیح معنوں میں پہلے جیسے ہوتا تھا ویسا اب

نہیں ہوتا۔ پہلے بھی میلا سال میں صرف ایک بار ہی ہوتا تھا اور اب بھی
ایک ہی میلا ہوتا ہے لیکن پہلے بڑے پیمانے پر تیاریاں ہوتی تھیں
مگر اب [illegible]ات جیسی بھی اصل کا مقصد یہی تھا کہ بچے کچھ سیکھ لیں۔
مل جل کر اور سوچ سمجھ کر کام کیا جائے تو چیزوں کو خوبصورت بنایا
جا سکتا ہے۔ مجھے میلا اب بھی اہم لگتا ہے بشرطیکہ تمام بچے محنت
اور لگن سے کام کریں۔

سوال :- جامعہ کی کوئی ایسی شخصیت جس نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا ہو؟

جواب :- بھئی! جامعہ میں صرف ایک شخصیت کا نام لینا تو مشکل ہے۔ کم از کم جس
وقت میں یہاں پڑھنے آیا تھا اس وقت یہاں بہت سے ایسے لوگ تھے
جنھوں نے مجھے بہت متاثر کیا اور ایک طرح سے میری زندگی کا رُخ ۴۱
بدل دیا۔ ان میں پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب، کالج
میں ہمارے ایک استاد تھے عابد ملک صاحب اور اسکول میں اختر حسین صاحب
اور محمد حسین اتو صاحب تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب کبھی ان کے پاس بیٹھنے
کا موقع مل جاتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ دل اور دماغ دونوں کو ایک نئی روشنی
مل رہی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ان لوگوں سے ملنے کا موقع اکثر ملتا تھا

انٹرویو لینے والے

۱۔ نسرین فاطمہ
۲۔ فریدہ اکرام
۳۔ محمد سلیم

درجہ ہشتم

جناب مشیر الحق صاحب سے

سوال :- آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :- میں بحیثیت طالب علم ۱۹۵۴ء میں آیا تھا۔

سوال :- ذاکر صاحب سے آپ کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟

جواب :- ذاکر صاحب ۱۹۴۸ء میں جامعہ سے جا چکے تھے وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے وائس چانسلر ہو گئے تھے لیکن پھر بھی جامعہ آتے رہتے تھے میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ بہار کے گورنر بننے سے پہلے اپنی جامعہ والی کوٹھی میں آکر رہے تھے۔

سوال :۔ ذاکر صاحب سے ملنے کے بعد آپ کے کیا تاثر تھے؟

جواب :۔ وہ بہت عظیم انسان تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان سے ایک یا دو بار ملاقات ہوئی اور مجھے یہ تاثر ملا کہ وہ اس بات کی کوشش کیا کرتے تھے کہ جو شخص ان سے مل رہا ہے اسے یہ احساس نہ ہو کہ وہ کسی بہت بڑے آدمی سے مل رہا ہے۔ وہ ہر شخص سے اسی کے معیار کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ نصیحتیں بھی کیا کرتے تھے لیکن اس انداز سے کیا کرتے تھے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ نصیحتیں کر رہے ہیں؟

سوال :۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کی کوئی ایسی بات بتایئے جس نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا ہو؟

جواب :۔ اپنی بات کو بہت اچھے انداز میں دوسروں تک پہنچاتے تھے اگر دوسرے سے کچھ کروانا چاہتے تھے تو پہلے خود اس کے لیے نمونہ بنتے تھے۔ جس کام کو اچھا سمجھ کر دوسروں سے کرنے کے لیے کہتے اُسے پہلے خود بھی کرتے۔ جیسے چیزوں کو قرینے سے رکھنا، صفائی کا خیال رکھنا یہ وہ دوسروں سے بھی چاہتے تھے اور خود بھی اس پر عمل کرتے تھے۔

سوال :۔ ذاکر صاحب کا دوسروں سے کام لینے کا کیا طریقہ تھا؟

جواب :۔ مختصراً یہ کہ دوں کہ وہ خود ہی کام کو شروع کر دیتے تھے اور پھر دوسرے لوگ اس کام میں شریک ہو جاتے تھے۔

سوال :۔ ذاکر صاحب جامعہ کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں سے کیا توقع رکھتے تھے؟

جواب :۔ ان کا مشہور مقولہ ہے کہ اگر کوئی کام اس قابل ہے کہ اسے کیا جائے تو وہ اس قابل بھی ہے کہ اسے اچھی طرح کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جامعہ میں لوگ اس وقت کام کرنے آئے جب گورنمنٹ کے سامنے جامعہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی ڈگریوں کی کوئی قدر نہیں تھی لیکن پھر بھی لوگ یہاں کام

کرنے آئے اس کا مطلب تھا کہ ان لوگوں میں خدمت کا جذبہ ہو۔
ذاکر صاحب یہ چاہتے تھے کہ دوسروں پر نظر رکھے بغیر کام کو ایمانداری
اور محنت سے کیا جانا چاہیے۔

سوال :۔ ذاکر صاحب جامعہ کو کس قسم کا ادارہ بنانا چاہتے تھے؟

جواب :۔ جامعہ کے بارے میں ان کی جو تقریریں ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ
ان کی نظر میں ایک تجربہ گاہ تھی جہاں لوگوں کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو
ابھرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ ذاکر صاحب کی جامعہ میں کام کو زیادہ اہمیت
تھی جو شخص جس کام کے لیے مفید ہوتا تھا اس سے اسی طرح کا کام لیتے تھے۔

انٹرویو لینے والے

جناب نذیر الدین مینائی صاحب سے

۱۔ محمد سلیم — درجہ ہشتم
۲۔ احمد مجید ظہوری — درجہ ہفتم

سوال :۔ آپ کا جامعہ سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟

جواب :۔ میں یہاں ۱۵ ستمبر ۱۹۵۰ء کو آیا تھا۔

سوال :۔ جامعہ تشریف لانے کا آپ کا کوئی خاص مقصد تھا؟

جواب :۔ مقصد تو کوئی خاص نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس سے لوگ صرف
واقف ہی نہ تھے بلکہ یہاں کام کرنا بھی پسند کرتے تھے۔ میں دہلی میں سرکاری
ملازم تھا لیکن مجھے وہ نوکری چھوڑ کر جامعہ میں کام کرنا زیادہ اچھا لگا۔

سوال :۔ جامعہ آنے سے پہلے یا جامعہ آنے کے بعد اس ادارے کے بارے
میں آپ کے کیا تاثرات تھے؟

جواب :۔ میں جامعہ آنے سے پہلے بھی جامعہ سے واقف تھا۔ دراصل میرے
کچھ عزیز جامعہ میں پڑھتے تھے اور کچھ پڑھاتے تھے ان سب کے ذریعہ

جامعہ سے واقفیت ہوئی۔ اس کے علاوہ کتابوں اور رسالوں نے بھی جامعہ سے میری واقفیت میں اضافہ کیا۔ اس لیے جامعہ کے بارے میں میرے تاثرات تسلی بخش تھے۔

سوال :۔ ہندستان کے تعلیمی اداروں میں جامعہ کی انفرادی حیثیت تھی اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب :۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جامعہ کا اپنا الگ مقصد تھا۔ جو طالب علم یہاں سے پڑھ کر نکلتے ہیں وہ صحیح معنوں میں آزاد شہری ہوتے ہیں۔ یہاں دینی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا تھا۔

سوال :۔ پرانی جامعہ اور آج کی جامعہ میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب :۔ ہاں اب میں پرانی جامعہ اور نئی جامعہ میں فرق محسوس کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے جامعہ کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کردیں وہ اب تقریباً ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اب تو لوگ درخواستیں دیتے ہیں اور ہم ان کا تقرر کر لیتے ہیں۔ پہلے جو لوگ آیا کرتے تھے ان کا جامعہ سے ایک تعلق تھا اب تو بہت سے لوگ جامعہ کے نظریات سے واقف ہی نہیں ہیں۔ اب جامعہ میں کام کرنے والے لوگوں کے مزاج اور ڈھنگ الگ ہیں۔

سوال :۔ جامعہ کے ارد گرد تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا اثر آپ کی رائے میں جامعہ کے تعلیمی معیار اور تہذیب اور تمدن پر کیا پڑا ہے؟

جواب :۔ یقیناً اس کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑا ہے۔

سوال :۔ کیا آپ نے اپنے بچوں کی ابتدائی اور اعلا تعلیم جامعہ ہی میں دلوائی؟

جواب :۔ میرے کسی بھی بچے نے جامعہ سے ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کی۔ جامعہ سے ثانوی اور اعلا تعلیم ہی حاصل کی ہے۔

اور باقی نوے لاکھ شہر کے نواحی علاقے



پیکنگ میں ڈیڑھ لاکھ "چوہے مار"

پیکنگ۔ چین کے ایک اخبار "چائنا ڈیلی" کی اطلاع ہے کہ وہاں کی راجدھانی پیکنگ میں حال ہی میں بڑے پیمانے پر چوہوں کے خلاف مہم چلائی گئی۔ اس مہم میں ڈیڑھ لاکھ "سورما" شریک ہوئے۔ جنھوں نے ۱۵۰ ٹن زہر کا استعمال کرکے ڈیڑھ کروڑ چوہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

چوہے مار مہم ۴۵ دن چلی۔ اس کے نتیجے میں پیکنگ میں چوہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کم کرکے، ملک کے دوسرے بڑے شہروں کے چوہوں کی تعداد کے مطابق کرنے میں مدد ملی۔

اتنے چوہوں کے مارے جانے سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم سے کم ۵۰۰ر۷ ٹن اناج کی بچت ہو سکے گی جو پیکنگ کے لگ بھگ ایک کروڑ لوگوں کے کام آسکے گا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مارے گئے ڈیڑھ کروڑ چوہوں میں سے ساٹھ لاکھ چوہے پیکنگ شہر کے اندر مارے گئے

عجیب و غریب

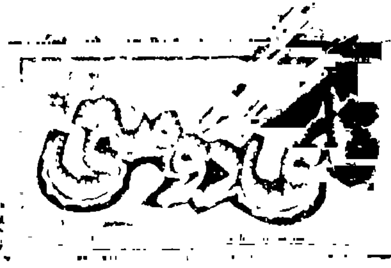
۱۔ کرنل لیونارڈ اسٹون اس وجہ سے مشہور تھا کہ جب وہ اپنی فوج کو کوئی حکم دیتا تھا تو اس کی آواز بہت دور تک بہ آسانی سنی جا سکتی۔

۲۔ سولہویں صدی عیسوی میں ایک سنار نے ملکہ الزبتھ کو سونے کی ایک زنجیر پیش کی جس میں ۲۵ کڑیاں تھیں۔ اور وہ اتنی ہلکی تھی کہ مکھی کی ٹانگ میں باندھی گئی تو وہ اسے آسانی سے لے کر اڑ گئی۔ زنجیر سیاہ کاغذ پر رکھنے سے نظر آتی تھی۔

۳۔ جاپان میں ایک ایسا درخت ہے جس میں سے سورج غروب ہوتے ہی دھواں نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔

۴۔ جنوبی امریکہ میں بڑے جگنوؤں کی ایک ایسی نسل پائی جاتی ہے کہ دو جگنوؤں اگر ہمارے کمرے میں آجائیں تو ہم لوگ آسانی سے کمرے میں کسی بھی جگہ بیٹھ کر پڑھ لکھ سکتے ہیں ان کی روشنی بلب کی طرح تیز ہوتی ہے۔

۵۔ لارڈ فلینگ اسکاٹ لینڈ کا پہلا شخص تھا جس نے اپنی لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کے لیے "۱۴۰۰" میل کا فاصلہ طے کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے یہ تمام سفر ننگے پاؤں طے کیا..."



۱:- محمد شبیر الاسلام
:- ۱۳ سال
مشغلہ :- کہانیوں کی کتابیں پڑھنا۔ قرآن کی تلاوت
کرنا۔ کرکٹ کھیلنا۔ پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔
پتا :- محلہ مہراج گنج۔ پوسٹ رفیع گنج۔ ضلع
اورنگ آباد (بہار) ۸۲۴۱۲۵
نام :- ۔ شگفتہ بانو
عمر :- ۱۵ سال
مشغلہ :- پانچ وقت پابندی سے نماز پڑھنا، قرآن کریم
کی تلاوت کرنا، والدین کی خدمت کرنا، پیام تعلیم
کی مطالعہ کرنا سہیلی سے قلمی دوستی کرنا۔ گھر میں لائبریری
بنانا۔
پتا :- مکان نمبر ۳۰۶ احمدی نگر آمبور ۶۳۵۸۰۲
نام :- شبانہ پروین
عمر :- ۱۱ سال
مشغلہ :- پیام تعلیم، نور، کھلونا پڑھنا، نماز و
قرآن پڑھنا۔ بڑوں کا ادب کرنا۔
پتا :- معرفت محمد صفدر امام، شیخانہ خورد بہار شریف
(نالندہ)

نام : محمد آفتاب عالم
عمر : ۱۶ سال
مشغلہ : نماز پڑھنا، گھر کا کام کرنا، کالج
جانا اور بچے وقت میں کیرم کھیلنا اور ناول پڑھنا
وغیرہ۔
پتا : محلہ شیخانہ، خورد بہار شریف
(نالندہ) ۸۰۳۱۰۱ (بہار)
نام : خورشید عالم
عمر : ۱۴ سال
مشغلہ : جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا
کرکٹ کھیلنا کامنٹری سننا۔
پتا : گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول
گینسڑی گوبڈا۔
نام : تسنیم فردوس
عمر : ۱۲ سال
مشغلہ : پابندی سے اسکول جانا۔
ہوم ورک کرنا اچھی اچھی کہانیاں پڑھنا۔
پتا : پلسودہ۔ ضلع کٹک (اڑیسہ)۔
نام :- ظفرالدین	عمر ۱۶ سال
مشغلہ : پابندی سے نماز پڑھنا، ادبی رسائل کا
مطالعہ کرنا روزانہ اخبار پڑھنا پابندی سے
اسکول جانا دل لگا کر پڑھنا۔
پتا : گاؤں مڑھیاکی ضلع گوڑگاواں (ہریانہ)
نام : محمد یوسف خاں	عمر ۱۰ سال
مشغلہ : ادبی رسائل پڑھنا، نماز پڑھنا والدین
کا احترام کرنا پابندی سے اسکول جانا۔
پتا : گاؤں مڑھیاکی ضلع گوڑگاواں (ہریانہ)
نام : سمینہ پروین	عمر ۱۴ سال
مشغلہ : پابندی سے نماز پڑھنا، اسکول جانا۔
پتا : گاؤں گھاٹا شمس آباد ضلع گوڑگاواں (ہریانہ)



● پیام تعلیم کا ذاکر حسین نمبر نکال کر یقیناً آپ نے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے جو ان کی شخصیت اور فن کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔
ذاکر حسین کی ذات گرامی ہمہ جہت تھی خصوصاً بچوں کے ادب اور تعلیم کے سلسلے میں کہانیاں اور مضامین ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ ان کی کہانی "ابو خان کی بکری" یوں تو بچوں کی کہانی ہے لیکن دراصل وہ آزادی کی ایک علامتی دستاویز ہے۔
پیام تعلیم نے اپنی طویل زندگی میں بچوں کے ادب میں جو اضافہ کیا ہے اسے بچوں کے ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔

ڈاکٹر یوسف تقی کلکتہ

● آپ نے پیام تعلیم سے نہ صرف بچوں کا دل بہلایا بلکہ ان کے ناپختہ ذہنوں کی تربیت کی، انھیں دنیا کی حقیقتوں سے آگاہ کیا دنیا کی بے راہ روی سے باخبر کیا اور کامیاب زندگی کی راہ پر چلنے کے طور طریقے سے روشناس کیا تاکہ ان کا مستقبل روشن ہو اور اس ملک کا مستقبل روشن تر ہو۔ آپ کی ان خدمات کی اہل نظر قدر کرتے ہیں اور مختلف موقعوں پر ان کا ذکر کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی بھوپال

● میں آپ کے یہاں سے ہر ماہ شائع ہونے والا رسالہ "پیام تعلیم" اپنے دوست جناب شارق نظامی سے مانگ کر پڑھتا ہوں پر مجبوری یہ ہے کہ مجھے وقت سے نہیں مل پاتا لیکن اب میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ میں آپ کو ۲۵ روپیا سالانہ قیمت بھیج دوں اور گھر پر ہی منگا لیا کروں۔

شمشیر احمد شمیس (رامپور)

● پیام تعلیم کا ہر کالم ایک خوشگوار اور مفید دھماکا سے کم نہیں تازہ شمارہ اتنا زبردست ہے کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

محمد منور عالم تھانوی (بہار شریف)

● ہر مہینہ ابا حضور کے ہاتھوں بمبئی (بھنڈی بازار) سے پیام تعلیم موصول ہو جاتا ہے۔
واقعی پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے سبھی کہانیاں نظمیں وغیرہ معلوماتی ہوتی ہیں۔

عالیہ مہر بنت ایم رشید گوونڈی بمبئی ۴۳



ایک پاگل کھمبے پر چڑھا اور ایک پرچہ
پکا کر اترا آیا۔ ایک صاحب کھڑے ہوئے
سب دیکھ رہے تھے۔ ان صاحب
نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہ پرچہ کیسا
گا کر آیا ہے۔ پڑھ کر دیکھا جائے۔
صاحب بہت ہمت کرنے کے بعد
بے پر چڑھے اور پرچہ پڑھا۔ پرچہ
رلکھا تھا۔ یہ کھمبے کا اوپری حصہ ہے۔

● عالیہ پروین (نالندہ)

باپ (بیٹے سے) دیکھو بیٹے! آج جو
مہمان آنے والا ہے اس کی ناک کے
متعلق کوئی سوال نہ کر بیٹھنا۔
جب مہمان آیا تو بیٹا حیرانی سے باپ
سے کہنے لگا، آپ تو کہتے تھے کہ ان کی
ناک کے متعلق کوئی سوال نہ کرنا مگر
ان کی تو ناک ہی نہیں ہے۔

● شان احمد (رامپور)

(پہلا دوست) ارے بھائی کس سوچ میں
ہو؟ (دوسرا دوست) ارے کیا بتاؤں
وہ جو پڑوس کی شو بھا بھابی ہیں نا، ان کے
ایک ساتھ تین بچے پیدا ہوئے ہیں۔
پہلے دوست! ارے تو اس میں سوچنے کی
کیا بات ہے آج کل دنیا میں اتنے فسادات
ہو رہے ہیں کہ اب بچے بھی اکیلے آنے سے
ڈرتے ہیں۔ ● محمد منور عالم (نالندہ)

فقیر:۔ ایک آنے کا سوال ہے بابو جی۔
میں لنگڑا ہوں!
بابو:۔ شکر کرو تم لنگڑے ہو اندھے نہیں۔
فقیر:۔ بابو جی، پہلے تو میں اندھا ہی تھا۔ مگر
لوگ کھوٹے سکے دینے لگے۔ چنانچہ مجبوراً
مجھے لنگڑا بننا پڑا۔

پہلا:۔ تم گدھے ہو۔
دوسرا:۔ تم گدھے کے باپ ہو۔
پہلا:۔ چلو اچھا ہوا باپ بیٹے نے ایک
دوسرے کو پہچان لیا۔

● امت الرحیم صالحہ (تلگنڈہ)

استاد (شاگرد سے) اتنا سمجھانے کے باوجود
حساب غلط کر کے لائے۔
(غصے سے) ایک ایسا چانٹا لگاؤں گا کہ نانی
یاد آ جائے گی۔
شاگرد:۔ جناب ذرا زور سے چانٹا لگائیے مجھے
دادی جان کی بہت یاد آ رہی ہے نانی کی نہیں۔ (نوشین خسرو)

بچوں کی کوششیں



غریبوں اور مسکینوں کا حق

● رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو عزت و بزرگی والا ہے۔ قیامت کے دن کہے گا: اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے نہیں کھلایا؟ وہ کہے گا: اے میرے رب میں تجھے کیوں کر کھلاتا جب کہ تو سب لوگوں کا پالنے والا ہے؟ اللہ تعالیٰ کہے گا: کیا تجھے معلوم نہیں تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا۔ لیکن تو نے اسے نہیں کھلایا۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اگر تو اس کو کھلاتا تو اپنے کھلاتے ہوئے کھانے کو میرے یہاں پاتا: پھر اللہ تعالیٰ کہے گا: اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا! اور وہ آدمی کہے گا: اے رب میں تجھے کیسے پانی پلاتا جب کہ تو خود تمام جہان کا پالنے والا ہے: اللہ تعالیٰ کہے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے اسے پانی نہیں دیا اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو وہ پانی میرے یہاں پاتا: (مسلم ابو ہریرہ رضی)

پیارے بچو! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانا اور پیاسوں کو پانی پلانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ بھوکوں کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے سے بہت خوش ہے اور قیامت کے دن اس کا بہت اچھا بدلا دے گا۔

شکیل احمد فطرت بھٹ
کے باؤس شوکت علی روڈ بھٹکل کرناٹک

شہزادے گلفام کا خطرناک جادوگر سے مقابلہ

● پرانے زمانے میں ایک بادشاہ ملک شام پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام عادل تھا اور وہ بڑا رعایا پرور اور انصاف پسند تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام گلفام تھا۔

شہزادہ گلفام، ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا تھا۔ شہزادے نے بچپن سے ہی تیر اندازی اور تلوار چلانی سیکھ لی تھی۔ بادشاہ بوڑھا ہوا تو اس نے اپنا تخت و تاج شہزادے کو سونپنے

کا فیصلہ کیا۔ یہ بات سن کر شہزادے نے بادشاہ سے عرض کی کہ میں ابھی دنیا کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے اسے اجازت دے دی۔

شہزادہ چند دن بعد بادشاہ سے رخصت ہو کر چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچا۔ رات ہو گئی تو شہزادے نے وہیں سونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک محفوظ جگہ تلاش کر کے لیٹ گیا ابھی مشکل سے اس کی آنکھ لگی تھی کہ عورتوں کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور آواز کی سمت میں چل پڑا۔ یہ آوازیں ایک غار سے آرہی تھیں۔ وہ وہاں پہنچا اور غار میں داخل ہو گیا۔ شہزادے نے اپنا قدم اندر رکھا تو اسے ایک جھٹکا لگا اور یوں لگا جیسے وہ گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ شہزادہ بے ہوش ہو گیا جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک پنجرے میں بند پتھروں سے بنے ایک کمرے میں پایا۔ اس کے سامنے بھی ایک پنجرا چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی رو رہی تھی۔

جب اس نے شہزادے کو دیکھا تو بہت خوش ہوئی کیونکہ اس نے برسوں کے بعد ایک آدم زاد کو دیکھا تھا۔ شہزادے نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے بتایا کہ وہ پرستان کی شہزادی صندل ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ یہ جگہ ایک کالے جادوگر کی ہے۔ اور اس نے شہزادی کو قید کر رکھا ہے۔ پھر شہزادے نے اپنی کہانی سنائی۔ اس اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک کالے رنگ کا خوفناک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا گلفام! تمھارے اور صندل پری کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے میں سن چکا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو سنا دوں پھر اس نے اپنی بغل میں سے ایک پتھر نکالا اور اس پر منتر پڑھا تو شہزادے اور شہزادی کے درمیان کی گفتگو سنائی دی اور پھر اس پتھر سے آواز آنا بند ہو گئی۔ اب جادوگر پری کی طرف متوجہ ہوا اور بولا تم مجھ سے شادی کرو گی۔ شہزادی نے انکار کر دیا۔ اس نے کوڑے لگائے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولا شہزادی تم مانو یا نہ مانو۔ آج سے ٹھیک دس دن بعد میری اور تمھاری شادی ہو گی۔ پھر وہ ایک قہقہہ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ لگا کر چلا گیا۔

دوسرے دن جادوگر آیا اور اس نے کہا شہزادے! میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ایک ذوالفغان کے ملک کے بادشاہ فرنگی کے پاس ایک پتھر ہے۔ جس کے پانچ ہزار دیو غلام ہیں وہ پتھر تم ہی لا سکتے ہو۔ میں تمھیں آزاد کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ شہزادے نے یہ کام کرنے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ صندل پری کو رہا کر دیا جائے۔ جادوگر مان گیا۔ مگر اس کے دل میں کھوٹ تھی۔ دوسرے دن شہزادے کو اس ملک کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ شہزادہ ایک کشتی میں سوار چلا جا رہا تھا۔ کشتی خود بخود چل رہی تھی۔ شہزادے نے کشتی کا رخ موڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ کشتی چلتی رہی اور دوسرے دن ابھی ساحل پر قدم رکھا ہی تھا کہ کشتی غائب ہو گئی۔ اچانک چند دیو نمودار ہوئے اور بادشاہ نے کہا وہ پتھر تمھیں ایک شرط پر مل سکتا ہے کہ تم زناٹا اور گل نگل دیو کا مقابلہ کرو اگر تم جیت گئے تو وہ پتھر تمھیں مل جائے گا۔ دوسرے دن شہزادہ کا مقابلہ زناٹا دیو سے ہوا وہ بڑا

طاقت ور تھا لیکن شہزادے نے دونوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی اس شہزادے سے کردی۔ شہزادہ نرگس کو اپنے ملک لے جانا چاہتا تھا۔ جب وہ ساحل پر پہنچا تو کشتی پہلے سے موجود تھی۔ شہزادہ اس میں بیٹھا ہی تھا کہ جادوگر کے غلام اسے جادوگر کے پاس لے گئے۔ اس نے شہزادے کو پتھر چھین کرا سے پنجرے میں بند کر دیا۔ جب شہزادے نے اپنے سامنے صندل پری کو دیکھا تو اسے جادوگر کی مکاری کا پتا چل گیا۔ اسے ایک ترکیب سوجھی اس نے صندل پری کے کان میں کچھ کہا اور جب جادوگر آیا تو شہزادی نے شادی کا اقرار کر لیا۔ پھر شہزادی نے جادوگر سے کہا کہ تمھاری جان کس میں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد تمھیں کوئی مار دے۔ جادوگر نے اسے بتایا کہ اس کی جان اس کی کھوپڑی میں ہے۔ جو اس کے بازو میں لٹک رہی تھی۔ پھر اس نے شہزادے اور شہزادی کو پنجروں سے آزاد کر دیا۔ ایک انگوٹھی دی اور کہا رگڑو گی تو جن حاضر ہو جائے گا اور وہ تمھارا ہر حکم مانے گا۔ پھر شہزادے اور شہزادی نے انگوٹھی رگڑی اور جن حاضر ہو گیا۔ تو انھوں نے حکم دیا کہ وہ تلوار پیش کرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تلوار حاضر ہو گئی۔ جب دوسرے دن جادوگر کمرے میں داخل ہوا تو شہزادے نے اس کے بازو میں لٹکی ہوئی کھوپڑی پر بھرپور وار کیا۔ ایک دھماکا ہوا جادوگر کی لاش زمین پر پڑی تھی اور پلک جھپکتے ہی وہ غائب بھی ہو گئی۔ اب وہاں نہ محل تھا نہ کمرہ۔ زمین صاف میدان تھا۔ صندل پری اپنے ملک روانہ ہو گئی۔ شہزادہ اور شہزادی اپنے ملک کو روانہ ہو گئے۔ اور اپنے ملک میں جا کر ہنسی خوشی رہنے لگے۔

●●

حسین شاہد
درجہ۔ یازدہم (گیارواں) جامعہ ملیہ اسلامیہ



اسکول

لیٹ آنے پہ آف سزا اتنی
ہم سے تر خفا بنا نہیں جاتا
کوئی لائن ذرا ہوئی ٹیڑھی
کان کا غم سہا نہیں جاتا
خوف ڈنڈے کا اس قدر ہاتے
ہم سے کچھ بھی کیا نہیں جاتا
وہ کسی وقت آ دھمکتے ہیں
کاپیوں کو رکھا نہیں جاتا
نل پہ جائیں وہاں بھی ٹیچر ہیں
ہم سے پانی پیا نہیں جاتا
اب نتیجہ شعیب نکلے گا
آگے کچھ بھی کہا نہیں جاتا

●●

ایم شعیب
۱۳/۱ بٹلہ ہاؤس نئی دہلی ۲۵

چغل خور مٹھو

● کسی گانو میں ایک حلوائی رہا کرتا تھا۔ ٹھائی کی بڑی دکان تھی۔ دن بھر خوب کمائی ہوتی ور شام کو وہ جب تھکا ماندہ اپنے گھر پہنچتا تو تھکن سے اس کی آنکھیں بوجھل ہوجاتیں اور وہ بے خبر ہوکر سو جاتا۔ وہ بالکل اکیلا تھا اتنی بڑی دنیا ں اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ شام کو جب وہ گھر لوٹتا سوچتا۔ کاش کوئی اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے میرا ل بہلانے والا ہوتا۔ آخر کار اس نے اپنی اس ہائی کو دور کرنے کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت مٹھو پال لیا۔ اب صبح ہوتے ہی مٹھو اس ے خوب باتیں کرتا اور شام کو حلوائی دکان سے پس ہوتا تو مٹھو کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں تا اور بڑے پیار سے مٹھو کو اپنے ہاتھ سے ھلاتا۔ اتفاق سے ایک روز حلوائی کو راستے میں ے بلی نظر آئی۔ وہ لنگڑی تھی بلی پر حلوائی کو ت ترس آیا۔ وہ بلی کو اٹھا کر اپنی گود میں لیے گھر پہنچا۔ جب مٹھو نے حلوائی کی گود میں بلی کو اس ح بیٹھے ہوتے دیکھا تو اسے بے حد جلن ہوئی ر وہ حلوائی سے پوچھ بیٹھا۔ حضور آپ اس لنگڑی اور بد صورت بلی کو کہاں سے اٹھا لائے؟ ں پر حلوائی مسکرایا اور بولا نہیں مٹھو بیٹے سا نہیں کہتے۔ اب یہ بلی بھی ہمارے ساتھ ہے گی تم بھی دن بھر اکیلے رہتے ہو اب یہ تمھاری دست ہے۔ اس پر مٹھو خاموش رہا اور دل ہی ں میں کڑھ گیا۔ اب حلوائی اپنا تھوڑا وقت کے ساتھ گزارنے لگا اور اسے بھی طرح طرح مٹھائیاں کھلاتا۔

دن اسی طرح بیتتے رہے۔ لیکن مٹھو اس بلی کو دشمن کی نظر سے دیکھتا۔ شام کو جب حلوائی گھر آتا تو مٹھو اس سے بلی کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کرتا جس

پر حلوائی کو بہت غصہ آتا اور وہ بلی کی پٹائی کر دیتا۔ ایک دن کی بات ہے۔ مٹھو نے حلوائی سے کہا مالک! آج بلی نے مجھے بھوکا مار ڈالا۔ اس پر حلوائی نے دریافت کیا وہ کیسے! مٹھو بڑی معصوم صورت بنا کر بولا۔ آپ کے جاتے ہی بلی میرے پنجرے سے سب کچھ نکال کر کھا گئی اور مجھے دن بھر بھوکا رہنا پڑا۔ حلوائی نے بلی کی بری طرح پٹائی کر دی۔ بچاری بلی اف بھی نہ کر سکی۔ لیکن اس کے اندر ہی اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔

اتفاق سے صبح کو جب حلوائی جانے لگا تو جلدی جلدی میں مٹھو کے پنجرے کی زنجیر لگانا بھول گیا۔ بلی تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ جس دن سے وہ آئی تھی مٹھو نے اس سے دشمنی باندھ لی تھی۔ بلی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ دھیرے دھیرے مٹھو کے پنجرے کی طرف بڑھ رہی تھی مٹھو تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور چغلی کھانے پر پچھتا رہا تھا۔ اچانک بلی نے اپنا پنجہ بڑھا کر مٹھو کی گردن دبوچ لی مٹھو جو دن بھر ٹیں ٹیں اور جھوٹی باتیں کرتا تھا اب وہ ٹیں بھی نہ کر سکا۔ بلی کے پنجوں میں پھڑپھڑاتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بلی نے نوچ پھاڑ کر اس کو ہڑپ کر لیا۔

پیارے بچو! دیکھا تم نے چغل خوری کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ●●

ناصرہ افشاں
اردو ہائی اسکول بورڈ۔ سبزے خاں ضلع امراوتی

ہندستان کے وزیر اعظم
اور عہدے کی مدت



● جواہر لال نہرو: ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک
گلزاری لال نندا: ۱۹۶۴ء میں ۲۷ مئی سے ۹ جون تک
لال بہادر شاستری: ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک۔
گلزاری لال نندا: ۱۹۶۶ء میں ۱۱؍جنوری سے ۲۴؍جنوری تک۔
اندرا گاندھی: ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۷ء تک
مرارجی ڈیسائی: ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک
چرن سنگھ: ۱۹۷۸ء میں کچھ دن۔
اندرا گاندھی: ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک
راجیو گاندھی: ۱۹۸۴ء سے ......

ہندستان کے صدر
اور عہدے کی مدت

● ڈاکٹر راجندر پرشاد: ۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک۔
ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن: ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک۔
● ڈاکٹر ذاکر حسین: ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک
وی۔وی۔گیری: ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۴ء تک
ایم۔ ہدایت اللہ: ۱۹۶۹ء میں ۲۰؍جولائی سے ۲۴؍اگست تک۔
فخرالدین علی احمد: ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک
وی۔ڈی۔جتی: ۱۹۷۷ء میں ۱۱؍فروری سے ۲۵؍جولائی تک۔
نیلم سنجیوا ریڈی: ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۲ء تک۔
گیانی ذیل سنگھ: ۱۹۸۲ء سے ......

ہندستان کے نائب صدر
اور عہدے کی مدت

● ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن: ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک۔
ڈاکٹر ذاکر حسین: ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک۔
وی۔وی۔گیری: ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک۔
گوپال سروپ پاٹھک: ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۴ء تک
وی۔ڈی۔جتی: ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۹ء تک۔
ایم۔ ہدایت اللہ: ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک۔
آر۔ وینکٹ رمن: ۱۹۸۴ء سے ......

خالد ریحان
محلہ درگاپور کٹیہار ۸۵۴۱۰۵

ایک چڑیا

● ایک مولوی صاحب فجر کی نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ ڈال پر ایک چڑیا بیٹھی ہوئی چہچہا رہی تھی۔ مولوی صاحب نے چڑیا کو دیکھا اور کہا کہ

اہ تو چڑیا کہہ رہی ہے کہ سبحان تیری قدرت۔ مولوی صاحب چڑیا کی بولی سن کر بڑے خوش ہوتے۔ نماز ادا کر کے مسجد سے باہر آئے۔ ایک لالہ جی راستے سے گزر رہے تھے۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے۔



● لالہ جی نے پوچھا کیا بات ہے مولوی صاحب آج صبح سویرے بڑی ہنسی آرہی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ بھئی! صبح سویرے یہ چڑیا کہہ رہی تھی۔ "سبحان تیری قدرت" لالہ جی نے کہا نہیں نہیں وہ چڑیا کہہ رہی ہے ! راجا رام دشرتھ" مولوی صاحب بگڑ گئے۔ دونوں میں خوب جھگڑا ہونے لگا۔ اتنے میں ایک سبزی بیچنے والا آگیا اس نے پوچھا کیا بات ہے ، کس چیز کا جھگڑا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ یہ چڑیا کہتی ہے "سبحان تیری قدرت" اور یہ لالہ جی کہتے ہیں "راجا رام دشرتھ" اس نے کہا کہ نہیں نہیں وہ چڑیا کہہ رہی ہے "لہسن، پیاز، ادرک" اب ان تینوں میں تکرار ہونے لگی۔ ادھر سے ایک پہلوان ورزش کرنے کے لیے اکھاڑے میں جا رہا تھا۔ جھگڑے کی آواز سن کر پوچھنے لگا کیا بات ہے۔ کیسا جھگڑا ہے۔ مولوی صاحب نے جھٹ سے کہا کہ یہ چڑیا کہہ رہی ہے "سبحان تیری قدرت" اور یہ لالہ جی کہتے ہیں "راجا رام دشرتھ" اور یہ سبزی والا کہتا ہے کہ لہسن، پیاز، ادرک، پہلوان نے کہا کہ نہیں نہیں وہ چڑیا کہہ رہی ہے "کھا گھی کر کثرت" اب تینوں کو اور غصہ آیا اور پہلوان سے اکڑ گئے۔ پہلوان سے کیا مقابلہ کرتے اتفاق سے ایک پڑھا لکھا سمجھ دار آدمی ادھر سے گزرا ان چاروں کی لڑائی دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے ، آپ لوگ صبح سویرے کیا ہنگامہ کر رہے ہیں ؟ مولوی صاحب نے کہا کہ دیکھو یہ چڑیا کہہ رہی ہے "سبحان تیری قدرت" اور لالہ جی کہتے ہیں "راجا رام دشرتھ" اور یہ سبزی والا کہتا ہے "لہسن، پیاز، ادرک" اور یہ پہلوان بتاتے ہیں "کھا گھی کر کثرت" اس سلجھے ہوئے آدمی نے کہا کہ آپ سب ٹھیک کہتے ہیں۔ سب کی باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ زبان اور رہن سہن کا فرق ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تم رام کہو وہ رحیم کہیں دونوں کی غرض اللہ سے ہے۔ سب گلے ملے اور ہنستے ہوئے اپنے اپنے کام پر روانہ ہوگئے۔ ●●

محمد بشیر الاسلام
محلہ مہراج گنج پوسٹ، رفیع گنج اورنگ آباد (بہار)

دو لکڑہاروں کی کہانی

● ایک گاؤں میں دو لکڑہارے رہتے تھے۔ وہ دونوں بہت پکے دوست تھے۔ ایک کا نام احمد اور دوسرے کا نام ناصر تھا۔ احمد بہت رحم دل انسان تھا اور ناصر بہت کنجوس تھا۔ پھر بھی احمد ناصر سے دوستی رکھتا تھا۔ احمد کے ایک لڑکا تھا اور ناصر کے ایک لڑکی۔ احمد کا بیٹا جب بڑا ہوا تو شہر کے اسکول میں پڑھنے کے لیے روپوں کی ضرورت

پڑی۔ احمد اپنے دوست ناصر کے پاس روپے لینے گیا۔ ناصر کنجوس تھا اس نے کہا میرے پاس ایک روپیا بھی نہیں۔ احمد نے اپنے بیٹے کو شہر کے اسکول میں پڑھنے کو نہیں بھیجا۔ اب باپ بیٹے مل کر دونوں ایک ساتھ لکڑیاں کاٹنے جاتے اور دو گنے روپے لے کر گھر آتے تھے۔ ایک دن احمد کی طبیعت خراب ہو گئی۔ احمد کا بیٹا ہی لکڑیاں کاٹنے گیا لکڑیاں کاٹتے ہی ایک سانپ اپنے منہ میں سونے کا ہار لیے آیا احمد کا بیٹا ڈر کر بھاگنے لگا۔ لیکن سانپ نے اس کا پیچھا کیا۔ احمد کا بیٹا بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ سانپ بھی درخت کے پاس پہنچا اور زمین پر ہار رکھ کر چلا گیا۔ احمد کا بیٹا اس ہار کو گھر لے گیا۔ احمد نے پوچھا یہ ہار کہاں سے آیا۔ بیٹے نے پوری کہانی سنادی۔ پھر دوسرے دن احمد کا بیٹا لکڑیاں کاٹنے گیا تو پھر وہی سانپ آیا احمد کا بیٹا سوچ میں پڑ گیا۔ اب ہر روز سانپ آتا اور احمد کے بیٹے کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا تھا لیکن احمد کا بیٹا نہیں لیتا تھا۔ ایک دن یہ بات ناصر کو معلوم ہوئی۔ ناصر موقع کی تلاش میں تھا۔ ایک دن احمد اپنے بیٹے کے ساتھ شہر چلا گیا۔ ناصر اس درخت کے پاس جا کر لکڑیاں کاٹنے لگا سانپ اپنے منہ میں سونے کی انگوٹھی لیے نکلا اور زمین پر رکھ دی۔ ناصر کنجوس اور لالچی تھا اس نے انگوٹھی لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ سانپ نے ناصر کے ہاتھ میں کاٹ لیا وہ مر گیا۔

پیارے بچو! دیکھا لالچ اور کنجوسی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ●●

رفیع احمد خان
دیشی پیٹھ روڈ، ورنگل۔

گھوڑے کی کھیتی

● دو جگری دوست تھے جو ہاتھ ایک پر دے دو اس کو ماں لیتا۔ ایک دفعہ دونوں دوستوں نے طے کیا کہ ہمیں کچھ کام کرنا چاہیے۔ ایک نے کہا کہ دن کر تجارت کی جائے کیوں کہ یہ سنتا ہے۔ دوسرے نے کہا پونجی کہاں سے آئے گی دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ بادشاہ سلامت سے پونجی حاصل کی جائے۔ اس طرح دونوں بادشاہ سلامت کے دربار میں حاضر ہوئے

بادشاہ نے ان دونوں کی فریاد کو سن کر کچھ روپے گھوڑے کی کھیتی کرنے کے لیے دے دیے۔ یہ دونوں خوش و خرم دربار سے باہر آئے ایک گھوڑا خریدا اور اس پر سوار ہو کر گھر کو روانہ ہوئے۔ راستے میں شام ہو گئی۔ وہ دونوں ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔ سرائے کے پاس ہی ایک کھیت تھا۔ ان لوگوں نے اس کھیت میں گھوڑے کی کھیتی کرنا مناسب سمجھا۔ صبح ہوتے ہی کھیت کو ہموار کر کے اس میں گھوڑے کو ذبح کر کے دفن کر دیا اور وہیں رہنے لگے۔

کچھ دنوں بعد ایک سوداگر کا گزر اس طرف سے ہوا اس کے پاس ایک ہزار گھوڑے تھے۔ شام کو وہ بھی اسی سرائے میں ٹھہر گیا۔ صبح ہوتے ہی دونوں دوست گھوڑوں کو دیکھ کر

بہت خوش ہوتے۔ وہ دن ان لوگوں کے لئے عید جیسا تھا۔ سوداگر اپنے گھوڑوں کو لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہی ہونے کو تھا کہ دونوں نے سوداگر کو پکڑ لیا اور مارنے لگے۔ شکایت بادشاہ تک پہنچی۔ دربار میں دونوں نے بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ ہم نے آپ ہی سے روپے لے کر گھوڑے کی کھیتی کی تھی اب گھوڑوں کی فصل اُگ آئی ہے اور یہ سوداگر ان گھوڑوں کو لے کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے سوداگر کو گھوڑوں کا معاوضہ دے دیا۔ اور کہا کہ سچ ہے اگر آدمی لگن سے کوئی کام کرے تو اس کا محنت کا پھل ملتا ہے اور نیا تجربہ انسان کو نئی سمجھ دیتا ہے۔

دونوں دوست بادشاہ سلامت کو دعائیں دیتے ہوئے دربار سے خوشی خوشی اپنے گھر کو گھوڑوں کے ساتھ واپس گئے۔

اظہر حسین انصاری
محلہ، صدا نگر موتی





ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مئی ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۵

قیمت فی پرچہ: 3/50 سالانہ: 30/=
غیر ممالک سے: نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز: بارہ ڈالر
فی پرچہ: ایک ڈالر

مینیجنگ اڈیٹر: شاہد علی خاں
اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری
معاون: مختار احمد، منیجر:
تزئین کار: ایس، ایم، منظہر

بچوں سے باتیں

ساری دنیا کے مسلمان پورے سال جس مبارک اور مقدس مہینے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں وہ ہے رمضان شریف کا مہینا۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس مبارک مہینے میں اللہ تعالیٰ ہمارے اگلے، پچھلے گناہ بخش دیتا ہے۔ اس مہینے کے پہلے دس دن رحمت کے ہیں، دوسرے دس دن گناہوں سے توبہ اور آخری دس دن جہنم کی آگ سے نجات کے ہیں۔ ان آخری دس راتوں میں ایک رات لیلۃ القدر یا شب قدر ہے۔ اس رات کی عبادت ہزاروں مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔ اس رات کو اللہ کا کلام قرآن شریف نازل ہوا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اس بابرکت مہینے سے ہمیں فیض حاصل کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

اس شمارے میں رمضان شریف سے متعلق کئی مضامین شامل کر دیے گئے۔ امید ہے آپ سب کو پسند آئیں گے۔ اپنی رائے سے ضرور مطلع فرمائیں۔

پرنٹر پبلشر سید احمد دلی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آفسٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا



سیدہ شہاب الدین دسنوی

روزے

کیا بات ہے آج سب لوگ آسمان کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں؟

اچھا، رمضان کا چاند دیکھا جا رہا ہے۔ چاند نکل آیا تو کل سے نہیں تو پرسوں سے رمضان مہینا شروع ہو جائے گا۔ رمضان میں ہم روزے رکھتے ہیں لیکن چھوٹے بچوں اور بیمار آدمی کے لیے روزے رکھنا ضروری نہیں ہیں۔

رمضان میں فجر ہونے سے پہلے ہی سحری کھائی جاتی ہے۔ سحری میں ہلکی غذا ہوتی ہے۔ فجر سے سورج غروب ہونے تک کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سورج ڈوبتے ہی مغرب کی اذان ہو جاتی ہے اور اس وقت سے کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے

رمضان کا مہینا ختم ہوتے ہی روزے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

رمضان بڑی برکت کا مہینا ہوتا ہے کیوں کہ اس مہینا میں:۔

- مسلمان جھوٹ بولنا چھوڑ کر ہمیشہ سچ بولنے کی عادت ڈالتا ہے۔
- مسلمان لڑنا جھگڑنا چھوڑ کر ہمیشہ محبت سے پیش آنے کی کوشش کرتا ہے۔
- مسلمان گالی گلوج یا سخت لفظ نہ بول کر نرمی سے پیش آتا ہے۔
- مسلمان قرآن مجید کثرت سے پڑھتا ہے اور اللہ کا حکم سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔
- مسلمان کثرت سے اللہ کی عبادت کرتا ہے۔
- مسلمان غریبوں کی خوب مدد کرتا ہے۔

یعنی رمضان کا پورا مہینا عبادت کا مہینا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے مل جل کر اور محبت سے رہنے کا مہینا ہوتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرنے کا مہینا ہوتا ہے۔ اللہ کو خوش کرنے کا مہینا ہوتا ہے اسی لیے یہ برکت کا مہینا کہلاتا ہے۔

ان کا مہینا ختم ہوتا ہے تب عید الفطر آتی ہے۔ عید کے معنی ہیں خوشی کے۔ عید کے دن مسلمان خوشی
اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ اچھا کھانا کھاتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ غریبوں کی مدد بھی کرتا ہے تاکہ
اچھا کھا سکیں اور اچھا پہن سکیں۔
نماز پڑھنے سے پہلے ہر مسلمان فطرہ ادا کرتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ

(روزوں کا مہینا) رمضان کا مہینا (ہے) جس میں
قرآن (پہلے پہلے) نازل ہوا
جو لوگوں کا رہنما ہے
اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں۔ اور
(جو حق اور جھوٹ کو) الگ الگ کر کے دکھانے
والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں
موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے
اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو
دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کی گنتی پوری کرے

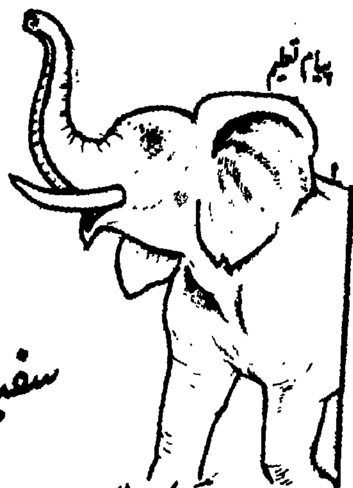
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا ھَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور
سختی نہیں چاہتا اور (یہ آسانی کا حکم) اس لیے
(دیا گیا ہے) کہ تم روزوں کی گنتی کر لو
اور اس احسان کے بدلے کہ اللہ نے تم کو
ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو۔
اور اس کا شکر کرو۔

(قرآن کریم: سورۃ البقرہ)

("ہمارا دین" حصہ اول سے)

کلثوم بانو



سفید ہاتھی

دلاور خاں ایک شکاری تھا۔ وہ جنگلی جانوروں کو پکڑ کر منڈی میں لے جاکر بیچا کرتا تھا اور اچھا خاصا کما لیتا تھا۔ خوب عیش کی زندگی تھی لیکن یہ عیش یونہی نہیں تھے اکثر اسے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑتا تھا۔

اس کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا بچی ذرا سیانی تھی لڑکا پانچ برس کا تھا لڑکی کا نام آسیہ اور لڑکے کا نام بہادر تھا۔

ایک دن دلاور خاں بہادر کو بھی اپنے ساتھ شکار پر لے گیا تاکہ ابھی سے ہی اس کے اندر سے درندوں کا ڈر اور خوف جاتا رہے۔

یہ لوگ جنگل میں گئے اور وہاں پڑاو ڈال دیا۔ بہادر کو یہ جنگل بہت اچھا لگا کیونکہ جنگل میں نیل گائے، ہنس، ہرن اور دوسرے بہت سے جانور اسے نظر آئے۔ وہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ دلاور خاں جدھر جاتا بہادر کو اپنے ساتھ رکھتا۔ بہت سے ملازم بھی ساتھ تھے اس لیے اسے ڈر نہیں تھا کہ کوئی جانور بہادر کو نقصان پہنچا سکے گا۔ شام کے وقت انھیں ہاتھی کا ایک سفید بچہ نظر آیا جسے دیکھ کر دلاور خاں بہت خوش ہوا۔ کیوں کہ ہاتھیوں کی یہ نسل نایاب تھی۔ وہ اس بچے کو اچھے داموں فروخت کر سکتا تھا اور پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس بچے کو پکڑ لیا اور اپنے پڑاو میں لے آیا اور اسے زنجیروں سے باندھ دیا۔ پانچ برس کے بہادر کو یہ بات اچھی نہ لگی جب خاصی رات ہو گئی اور دوسرے لوگ سو گئے تو وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے شامیانے سے باہر آ گیا۔ دور دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی جس سے جنگل میں اچھا خاصا اجالا تھا

پھر وہ سفید ہاتھی کے بچے کے قریب گیا اور اس نے زنجیروں کو کھول کر اسے آزاد کر دیا۔ ہاتھی کا بچہ اسے احسان مند نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور بہادر واپس ہو گیا۔ صبح تمام پڑاؤ میں ہنگامہ برپا تھا۔ دلاور خاں ملازموں پر برس رہا تھا کہ ہاتھی کس طرح آزاد ہو کر بھاگ گیا۔ اس کی آواز سن کر بہادر کی آنکھ کھل گئی اور وہ آنکھیں ملتا ہوا شامیانے سے باہر آ گیا اسے دیکھ کر دلاور خاں خاموش ہو گیا اور اس کا غصہ اتر گیا۔



"میرا بیٹا اٹھ گیا"۔ یہ کہتا ہوا وہ اس کی طرف بڑھا اور اسے گود میں اٹھا لیا۔

"ابو! میں نے رات ہاتھی کے بچے کو آزاد کر دیا تھا"۔ بہادر لاڈ میں آتے ہوئے بولا۔

"ارے شیطان کیا یہ تیرا کام تھا تو نے مجھے کیوں نہیں اٹھا دیا۔ اگر کوئی جنگلی جانور نقصان پہنچا دیتا تو میں کیا کرتا۔

"ابو! رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں سوچتا رہا تھا کہ اگر مجھے کوئی اس طرح باندھ کر لے تو آپ لوگ کتنے پریشان ہوں گے۔ ہاتھی کے بچے کے بھی تو ماں باپ ہوں گے۔ انھیں پریشانی نہیں ہو گی"۔ بہادر معصوم چہرہ بناتے ہوئے بولا۔

"بیٹے تم اتنے چھوٹے ہو کر سیانوں کی سی باتیں کرنے لگے ہو۔ خدا تمھیں نظر بد سے بچائے"
یہ کہتے ہوئے دلاور خاں بہادر کو خود سے چمٹا لیا اور پیار کرنے لگا۔

"حضور! ہم لوگ جلد ہی ہاتھی کے بچے کو تلاش کر کے دوبارہ پکڑ لیں گے۔ آپ فکر نہ کریں" ایک ملازم نے آگے بڑھ کر کہا۔

"نہیں ہم اس بچے کو نہیں پکڑیں گے"۔ دلاور خاں بولا۔

"سرکار! اس کے بہت دام مل جائیں گے"۔ ایک اور ملازم بولا۔

"نہیں! ہم نے کہہ دیا۔ ہاتھی کے اس بچے کو نہیں پکڑیں گے"۔ دلاور خاں غصے میں بولا اور ملازم سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس دوران ان لوگوں نے بہت سے جانور پکڑے اور واپس آ گئے۔

دلاور خاں جس گاؤں میں رہتا تھا اس کے ایک طرف جنگل اور دوسری طرف دریا تھا۔ دلاور خاں نے بہادر کو گھر پر چھوڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑی بڑی کشتیوں پر سوار ہو کر اس پار جا اترا۔ جانوروں کو انھوں نے پنجروں میں بند کر دیا تھا۔ دریا کے پار جا کر بیل گاڑیوں پر یہ لوگ بڑے شہر گئے۔ جہاں منڈی میں غیر ملکی تاجر آیا کرتے تھے۔ دلاور خاں جانوروں کو انھیں کے ہاتھ فروخت کیا کرتا۔ کبھی کبھار وہ خود بھی دوسرے ملکوں میں جا کر جانور فروخت کرتا اس طرح منافع کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا لیکن اس بار اس نے شہر کی منڈی میں ہی تمام جانور بیچ دیے اور روپے لے کر واپس گاؤں آ گیا۔

اب وہ اکثر بہادر کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ ایک دن بہادر کے ننھیال سے خبر آئی کہ بہادر کا نانا انتقال کر گیا ہے۔ ان دنوں دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ لوگ ڈر کے مارے چھوٹی کشتیوں پر پار نہیں جاتے تھے۔ دلاور خاں نے سوچا بہادر اور اس کی ماں کو اپنے چھوٹے بھائی کے پاس چھوڑا جائے جو اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے بیوی کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا کہ وہ یہیں گاؤں میں اپنے چچا چچی کے پاس رہ جائیں۔ بیوی تو فوراً مان گئی لیکن بہادر نے کچھ ضد کی لیکن پھر وہ بھی مان گیا اور دلاور اپنی بیوی کے ساتھ کشتی پر سوار ہوا اور کشتی دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔ کشتی میں پچاس آدمیوں کی گنجائش تھی لیکن چونکہ لوگ ڈرتے ہوئے چھوٹی کشتیوں پر

سفر نہیں کر رہے تھے اس لیے بڑی کشتی والوں نے سواریاں زیادہ ہی اٹھانا شروع کر دیں۔

کہتے ہیں لالچ انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ یہ کشتی جس پر دلاور خاں سوار تھا جب بیچ دریا کے پہنچی تو وہ پانی کے بہاو کا مقابلہ نہ کر سکی اور ڈولنے لگی۔

یہ دیکھ کر کشتی پر سوار لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ ملاحوں نے کشتی کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ایک بڑے بھنور میں پھنس کر ڈوب گئی۔

دوسرے کنارے پر کھڑے لوگوں نے دیکھا تو وہ چیخنے چلانے لگے اور پھر دو بڑی کشتیاں بھی اس طرف بڑھیں تاکہ مسافروں کو بچا سکیں۔ لیکن اس کشتی پر سوار ایک شخص بھی زندہ نہ بچا۔ یہ خبر آگ کی طرح دلاور خاں کے گاؤں بھی پہنچ گئی اور لوگ بھاگتے ہوئے پتن پر آئے۔ ملاحوں نے مرنے والوں کی لاشوں کو نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن بہت کم لوگوں کی لاشیں مل سکیں۔

دلاور خاں اور اس کی بیوی کی لاش مل گئی جنھیں گاؤں والے اٹھا لائے۔ اور گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ آسیہ اور بہادر بہت روئے۔ بہادر چونکہ ابھی بہت چھوٹا تھا اس لیے تو وہ جلد ہی ماں باپ کو بھول گیا۔ لیکن آسیہ بے چاری صبح شام ماں باپ کو یاد کر کے رویا کرتی۔

دلاور خاں کا بھائی ایک کسان تھا مشکل سے ہی اس کی گزر بسر ہوتی تھی بھائی کے مرنے کے بعد وہ بھائی کے گھر میں ہی آگیا اور وہاں جو روپے ہاتھ آیا اسے عیش میں جلد ہی گنوا بیٹھا اور پھر آخر ہی اپنا پرانا پیشہ اختیار کر لیا۔ اب بہادر بھی تیرہ برس کا ہو چکا تھا۔

ایک دن وہ بیوی کے سکھانے پر بہادر سے کہنے لگا "بہادر تو بھیڑوں کو جنگل میں لے جایا کر اور شام کو واپس لے آیا کر۔" آسیہ نے یہ سنا تو بولی۔

چچا جان بہادر تو ابھی بچہ ہے اور میں اسے گھر پر پڑھا رہی ہوں۔ آپ اسے جنگل میں نہ بھیجیں اور کسی اسکول میں داخل کرا دیں۔ ابا کی بھی بڑی خواہش تھی کہ بہادر پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے اور بہادر کو بھی پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔"

تم لوگوں کی وجہ سے گھر کا خرچ زیادہ ہو گیا ہے اس لیے ہم ملازم نہیں رکھ سکتے بھیڑ بکریوں کو اب بہادر کو ہی لے جانا ہوگا۔ مفت میں بیٹھا روٹیاں توڑتا ہے۔" بہادر کی

چچی بولی۔

"چچی میں جو گھر باہر کے تمام کام کرتی ہوں" آسیہ بولی۔

"تو کیا تمھیں کھانے کو روٹی نہیں ملتی کام کرتی ہو تو ہم پر کیا احسان کرتی ہو" چچی غصّے میں آتے ہوئے بولی۔

"تم ان کے منہ کیوں لگتی ہو جاؤ جا کر آرام کرو" بہادر کا چچا اپنی بیوی سے بولا۔ اور پھر ان لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"دیکھو جس طرح میں کہتا ہوں کرو ورنہ مار مار کر کھال ادھیڑ دوں گا"

آسیہ اور بہادر سہم کر ایک طرف ہو گئے۔ اس دن سے بہادر بھیڑ، بکریوں کو جنگل لے جانے لگا، پہلے پہلے تو وہ بہت گھبرایا۔ لیکن پھر وہ عادی ہو گیا۔ جنگل میں ایک مینا بھی اس کی دوست ہو گئی تھی۔ آسیہ روٹیاں چھپا کر اپنے بھائی کو دیتی کہ دوپہر کو بھوک لگے تو کھالے۔ بہادر روٹیوں کا چورا بنا کر مینا کو بھی کھلایا کرتا تھا۔

مینا سارا سارا دن انسانوں کی طرح جنگل میں اس سے باتیں کر کے اس کا دل بہلایا کرتی تھی وہ تو چاہتا تھا کہ گھر کبھی نہ جائے لیکن گھر میں اس کی پیاری بہن جو تھی اور چچا اور چچی کے ظلم سے وہ بہت تنگ آیا ہوا تھا۔

ایک دن اس کا سامنا شیر سے ہو گیا جسے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا اس میں اتنی ہمّت بھی نہیں تھی کہ بھاگ جاتا اور پھر اس کی دوست مینا کی آواز سنائی دی۔

"بہادر، بہادر ڈرو نہیں شیر بھوکا نہیں ہے تمھیں کچھ نہیں کہے گا" اس آواز نے بہادر کی ڈھارس بندھائی اور اس کے خوف میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ گو شیر بھوکا نہیں تھا لیکن شرارتی تھا۔ بہادر کو خوف زدہ کرنے کے لیے دھاڑا اور اس کی طرف بڑھا اور پھر اچانک ایک چنگھاڑ سے پورا جنگل گونج اٹھا۔

اس آواز نے شیر کو بھی خوفزدہ کر دیا اور وہ دم دبا کر وہاں سے بھاگ گیا۔ بہادر جو پہلے ہی شیر کو دیکھ کر ڈر رہا تھا اب زیادہ ہی خوف زدہ ہو گیا۔ ایک سفید ہاتھی جھومتا ہوا بہادر کے سامنے آگیا اور اس نے سونڈ اٹھا کر بہادر کو سلام کیا۔ بہادر بھی اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اب اسے پانچ برس پہلے کا زمانہ یاد آگیا۔ جب وہ اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں آیا تھا اور اس کے باپ نے ایک سفید ہاتھی کے بچے کو پکڑ لیا تھا۔

جسے اس نے آزاد کر دیا تھا۔
یہ وہی ہاتھی تھا۔ گو آٹھ برس کا زمانہ گزر گیا تھا مگر وہ ہاتھی کے بچے کو بھولا نہیں تھا۔

اس ہاتھی نے بھی جواب خاصا بڑا ہو گیا تھا بہادر کو پہچان لیا تھا۔ اسی لیے اس کی مدد کو دوڑا آیا تھا۔ اب سفید ہاتھی ہر روز بہادر سے جنگل میں ملتا۔ اس طرح بہادر کا اب اس جنگل میں اور بھی ایک ساتھی ہو گیا تھا۔ یہ ہاتھی پورے جنگل کا بادشاہ تھا۔ جنگل کا ہر جانور اس کی رعایا تھی۔ اس طرح اب تمام جنگل والے بہادر کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔

شام کو جب بہادر بھیڑ بکریوں کو لے کر گاؤں پہنچتا تو وہ بہت سا پھل بھی اپنی بہن کے لیے لے جاتا تھا۔ ان کی چچی حیران تھی کہ وہ آسیہ اور بہادر کو کھانے کو بہت کم دیتی ہے پھر بھی دونوں بہن بھائیوں کی صحت قابلِ رشک تھی۔

ایک دن اس نے ان دونوں کو پھل کھاتے دیکھ ہی لیا اور پھر بہادر کی خوب پٹائی کی کہ وہ یہ پھل کہاں سے چوری کر کے لاتا ہے گو بہادر نے بہت کہا کہ وہ پھل چوری کر کے نہیں لاتا ہے۔ لیکن وہ نہ مانی خود بھی خوب مارا اور بہادر کے چچا کو کہہ کر بھی پٹائی کروائی۔
اس رات مار کھانے کی وجہ سے بہادر سو نہیں سکا۔ اس کا تمام جسم درد کرتا رہا تھا۔ آسیہ اپنے بھائی کی حالت دیکھ کر خوب روئی۔

ایک دن بہادر کی چچی بازار سے ایک جوڑا خرید کر لائی اور جب بہادر شام کو لوٹ کر گھر آیا تو اس نے وہ جوڑا بہادر کو تھمایا اور بولی۔
"دیکھو یہ جوڑا میں اپنی ماں کے لیے خرید کر لائی ہوں تم فوراً اسے لے جا کر میری ماں کو دے آؤ۔" قریب ہی آسیہ کھڑی تھی بولی۔
چچی جان! وہ گاؤں تو جنگل کے پار ہے۔ اب رات ہو رہی ہے بھلا بہادر اس وقت وہاں کیسے جا سکتا ہے۔
کھانا تو خوب ٹھونس ٹھونس کر کھاتا ہے۔ میری ماں کے یہاں جاتے ہوئے اسے کیا ہو گا اور پھر تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو جاؤ جا کر کام کرو حرام خور دونوں بہن بھائی کام سے کیسے جی چرا لیتے ہیں۔" وہ بولی۔

آسیہ روتی ہوئی چلی گئی اور پھر بہادر کپڑوں کا وہ جوڑا لے کر وہاں سے چل پڑا۔ دن کی کچھ اور رات تھی۔ اب خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لیے بہادر بھی کچھ خوف زدہ ہو گیا تھا لیکن مجبوری تھی وہ جنگل میں داخل ہو گیا۔ ابھی کچھ دور ہی چلا ہوگا کہ اس کی دوست مینا کی آواز سنائی دی۔ بہادر، بہادر کہاں جا رہے ہو؟

"بچی کی ماں کے گاؤں جا رہا ہوں۔ بچی نے ایک جوڑا کپڑوں کا دیا ہے وہ وہاں پہنچانا ہے"۔ بہادر نے کہا۔

"تمہاری بچی بہت ظالم ہے جو اتنی رات گئے تمہیں جنگل میں سے گزرنے کو کہا ہے لیکن تم گھبراؤ نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں"۔ مینا بولی۔

"بہت بہت شکریہ! اب مجھے کوئی ڈر نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

کہتے ہیں کچھ ایسے خطرناک جانور جو دن کے وقت نظر نہیں آتے رات کے وقت باہر نکل آتے ہیں۔ اس لیے جنگل میں طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چلتے چلتے اچانک وہ سہم کر کھڑا ہو گیا۔ ایک درخت پر سے ایک بہت بڑا اژدھا پھنکارتا ہوا اپنے پھن کو لہرا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک بندر جو درخت پر سے اسے دیکھ رہا تھا چھلانگ مار کر اژدھے پر آ رہا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اژدھے کے سر کو دبوچ رکھا تھا۔

دراصل بندر نے بہادر کو دیکھ لیا تھا اس لیے وہ اس کی مدد کو آگیا تھا اور پھر بہادر نے بندر اور اژدھے کی لڑائی دیکھی۔ کبھی اژدھا بندر کو دبوچ لیتا تو کبھی بندر اس کے سر کو زمین پر رگڑتا۔ اس طرح کافی دیر لڑنے کے بعد بندر اژدھے پر حاوی ہو گیا اور اژدھا ہار مان کر وہاں سے کھسک گیا۔ اب بہادر آگے بڑھا ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ شیر دھاڑتا ہوا بہادر کے پیچھے لپکا۔ اس جنگل میں ایک شیر ہی تھا جس نے بہادر کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ آج جب کہ وہ بھوکا تھا اور اسے کوئی شکار بھی نہیں ملا تھا اور اس کی نظر بہادر پر پڑی تو وہ اس کے پیچھے لگ گیا بہادر بھی ڈر کر بھاگنے لگا۔ شیر برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا اور پھر ایک جگہ بہادر ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

عید نمبر :- پیام تعلیم کا آئندہ شمارہ عید الفطر نمبر ہوگا اپنے مضامین جلد از جلد بھیجیے



ایک کھیل بہت سے سوال

کرکٹ

(ساجد علی ساجد)

۱۔ کرکٹ میں استعمال ہونے والے سازوسامان کا ناپ اور وزن کیا ہوتا ہے؟

۲۔ تینوں وکٹوں کو باہم جوڑ رکھنے والی ڈنڈیاں بیلز (BAILS) کہلاتی ہیں۔ کیا بیلز کے بغیر بھی کرکٹ کھیلی جا سکتی ہے؟

۳۔ پچ پر (جسے وکٹ بھی کہا جاتا ہے) جھاڑو پھیرنے اور رولر چلانے کے لیے کوئی مدت مقرر ہے؟

۴۔ پانچ روزہ ٹیسٹ میچ میں اگر کوئی ٹیم مخالف ٹیم کے بڑے اسکور کے مقابلے میں چھوٹے اسکور پر آؤٹ ہو جائے تو اسے فالوآن ہو جاتا ہے۔ فالوآن کے لیے کسی ٹیم کو کتنے رن کی برتری کی ضرورت ہوتی ہے؟

۵۔ گیند ہٹ کرنے کے بعد کھو جائے تو بیٹسمین کو کتنے رن ملتے ہیں؟

۶۔ ایک بیٹسمین کل کتنے طریقوں سے آؤٹ ہو سکتا ہے؟

۷۔ آؤٹ ہونے کے عجیب و غریب یا انوکھے طریقے کون کون سے ہیں؟

۸۔ کس پاکستانی کھلاڑی نے ٹیسٹ میچوں میں ایک ساتھ تین سیکڑے (ٹرپل سنچری) بنائے تھے؟

۹۔ وہ بھارتی کھلاڑی جس کے پاس کسی ٹیسٹ کے پانچوں دن کریز پر رہنے کا ریکارڈ ہے؟

۱۰۔ سب سے زیادہ سست رفتاری سے (سیکڑہ) سنچری کس نے بنائی؟

۱۱۔ سب سے کم عمری میں ٹیسٹ میچ کھیلنے والے کھلاڑی کون ہیں؟

۱۲۔ سب سے کم عمری میں ٹیسٹ سنچری کس پاکستانی بیٹسمین نے بنائی؟

۱۳۔ وہ کون سے کھلاڑی ہیں جو پہلے بھارت کی طرف سے اور پھر پاکستان کی طرف سے بھی کھیلے؟

۱۴۔ پاکستان کے خلاف دنیا کے کس بیٹسمین نے سب سے زیادہ رن بنائے؟

۱۵۔ ٹیسٹ کرکٹ کے واحد کھلاڑی کا نام بتائیے جو چینی نسل سے ہے؟

۱۶۔ پاکستان کے کس بڑے کھلاڑی کو 'ایشیائی بریڈمین' کہا جاتا ہے؟

۱۷۔ وہ کھلاڑی کون تھا جو مسلسل چار ٹیسٹ میچوں میں صفر پر آؤٹ ہوا!

۱۸۔ دنیا میں پہلا کرکٹ ٹیسٹ کب اور کہاں کھیلا گیا؟

۱۹۔ پاکستان کے کس وکٹ کیپر نے سب سے زیادہ کھلاڑیوں کو آؤٹ کرنے کا ریکارڈ قائم کیا؟

۲۰۔ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کا وہ واحد کھلاڑی کون ہے جس نے مسلسل دو بار دو کھلائے؟

۲۱۔ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں پہلی ہیٹ ٹرک کس نے کی تھی؟

۲۲۔ مسلسل دو اننگ میں ہیٹ ٹرک کرنے والا کھلاڑی کون تھا؟

۲۳۔ اس کھلاڑی کا نام بتائیے جس نے مسلسل پانچ ٹیسٹ میچوں میں دو سیکڑے (سنچریاں) بنائے۔

۔ انگلستان کی کرکٹ ٹیم کے اس کپتان کا نام بتائیے جو اولمپک کا باکسنگ چیمپین بھی رہا۔

۔ سب سے کم وقت میں ڈبل سنچری، سنچری اور آدھی سنچری کس کس کھلاڑی نے بنائی؟

۲۔ اس کھلاڑی کا نام بتائیے جو ایک اننگ میں سب سے زیادہ سست رفتاری سے کھیلا!

۲۷۔ ایک بار فرسٹ کلاس کرکٹ میں کون سا باپ اور بیٹا ایک ساتھ میچ کھیلے تھے، نام بتائیے!

۲۸۔ سب سے کم عمر ٹیسٹ کپتان کون گزرا ہے؟

۲۹۔ ایک اوور میں زیادہ سے زیادہ کتنے رن بنائے گئے؟

جوابات

(۱) گیند کا قطر ۲۲ء۸ سے ۹ء۲ سینٹی میٹر تک اور وزن پانچ اونس ہوتا ہے۔ بلے کی اونچائی زیادہ سے زیادہ ۳۸ انچ اور چوڑائی زیادہ سے زیادہ سوا چار انچ ہونی چاہیے۔ اسٹمپ زمین سے ۲۸ انچ تک بلند ہوتے ہیں۔ وکٹوں کو جوڑنے والی ڈنڈی (بیلز) کی لمبائی ۴۳/۸ انچ ہوتی ہے۔ (۲) جب تیز ہوائیں چل رہی ہوں تو کپتانوں اور امپائروں کی مرضی سے بیلز ہٹائی جا سکتی ہیں۔ (۳) چھ یا سات منٹ مقرر ہیں۔ (۴) دو سو رن (۵) چھ رن۔ (۶) نو طریقوں سے (۷) گیند کو ہاتھ لگنے سے، گیند کو دو بار ہٹ کرنے سے اور فیلڈنگ میں رکاوٹ ڈالنے سے۔ (۸) حنیف محمد جنہوں نے ۵۹-۱۹۵۸ء میں برج ٹاؤن میں میزبان ٹیم ویسٹ انڈیز کے خلاف ۳۳۷ رن بنائے تھے یہی کسی پاکستانی کا سب سے بڑا ٹیسٹ اسکور ہے۔ (۹) ایم ایل جیسیا ۶۰-۱۹۵۹ء میں کلکتہ ٹیسٹ میں آسٹریلیا کے خلاف پانچوں دن بیٹنگ کرتے رہے۔

(۱۰) مدثر نظر بمقابلہ انگلستان لاہور ۷۸-۱۹۷۷ء (۱۱) مشتاق محمد لاہور میں ۱۹۵۹ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلے تو پندرہ سال ۱۲۴ دن کے تھے (۱۲) مشتاق محمد بمقابلہ بھارت نئی دہلی، ۶۱-۱۹۶۰ء (۱۳) عبدالحفیظ کاردار، امیر الٰہی اور گل محمد (۱۴) سر گیری سوبرز جنھوں نے ۱۹۵۹ء میں پاکستان کے خلاف ۳۶۵ رن بنائے تھے (۱۵) ایلس آچرکنگ، ویسٹ انڈیز (۱۶) ظہیر عباس (۱۷) پی رائے، بھارت بمقابلہ انگلستان، ۱۹۵۲ء (۱۸) میلبورن، مارچ ۱۹۷۸ء۔ (۱۹) وسیم باری، جنھوں نے ۲۲۸ کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ (۲۰) آرمز اسٹرونگ (آسٹریلیا) بمقابلہ انگلستان ۲۱-۱۹۲۰ء (۲۱) ایف۔ آر اسپونورتھ۔ (۲۲) ٹی۔ جے میتھیوز جنھوں نے ۱۹۱۲ء میں مانچسٹر میں انگلستان کی طرف سے جنوبی افریقہ کے خلاف یہ کارنامہ انجام دیا۔ (۲۳) ایورٹن ویکس جنھوں نے ۴۸-۱۹۴۷ء میں انگلستان کے خلاف پانچ ٹیسٹ سنچریاں بنائیں۔ (۲۴) جے ڈبلیو۔ ایچ ڈگلس۔ (۲۵) ایسے کھلاڑیوں کے ترتیب وار نام یہ ہیں:۔ الف: ڈون بریڈمین (آسٹریلیا) ۲۱۴ منٹ بمقابلہ انگلستان، لیڈز، ۱۹۳۰ء۔ ب: جے۔ ایم گریگوری (آسٹریلیا) ۷۰ منٹ بمقابلہ جنوبی افریقہ ۲۲-۱۹۲۱ء۔ ج: جے۔ ٹی براؤن (انگلستان) ۲۸ منٹ بمقابلہ آسٹریلیا ۹۵-۱۸۹۴ء (۲۶) جے ٹی مرے، جنھوں نے سڈنی میں انگلستان کی طرف سے آسٹریلیا کے خلاف ۶۳-۱۹۶۲ء میں ایک سو منٹ میں صرف ۴ رن بنائے (۲۷) بھگوت سنگھ جی (مہاراجہ میواڑ) اور رویندر کمار سنگھ جو ۶۲-۱۹۶۱ء میں راجستھان کی طرف سے ودربھا کے خلاف ایک ساتھ کھیلے۔ (۲۸) نواب پٹودی جونیر جنھوں نے ۱۹۶۲ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف بھارتی ٹیم کی قیادت کی تھی اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال تھی۔ (۲۹) ۳۶ رن جو گیری سوبرز نے ناٹنگھم شائر میں اور گلمورگن کے میچ کے دوران ایک اوور میں بنائے۔

یہ چاند ستارے

فیضان عارف

یہ چاند ستارے اپنے ہیں   رنگین نظارے اپنے ہیں
یہ گلشن سارا اپنا ہے   یہ نور کے دھارے اپنے ہیں

یہ چاند ستارے اپنے ہیں
رنگین نظارے اپنے ہیں

ہم اپنا چمن مہکائیں گے   چاہت کے پھول کھلائیں گے
الفت کے ترانے گائیں گے   ہم ماضی کو دہرائیں گے

یہ چاند ستارے اپنے ہیں
رنگین نظارے اپنے ہیں

ہم چاند نگر میں بستے ہیں   ہم ہر دم ہر پل ہنستے ہیں
اسلاف ہمارے جن پہ چلے   اپنائے ہم نے وہ رستے ہیں

یہ چاند ستارے اپنے ہیں
رنگین نظارے اپنے ہیں

غزالہ حیدر

رمضان المبارک

رمضان المبارک وہ مقدس مہینا ہے جب رب ذوالجلال نے اپنے محبوب، ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن پاک نازل فرمایا۔ یہ مہینا ہمارے لیے رحمتوں اور برکتوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔

روزہ ارکانِ اسلامی کا تیسرا اہم رکن ہے۔ سن ۲ ہجری میں روزے مسلمانوں پر فرض ہوئے تھے روزہ رکھنے کے بعد چوں کہ روزہ دار کھانے پینے کے علاوہ خود کو دوسری برائیوں سے بھی بچاتا ہے یعنی جھوٹ نہیں بولتا، چغلی نہیں کھاتا، چوری نہیں کرتا۔ زبان اور ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتا وغیرہ وغیرہ اس لیے روزہ کو عربی زبان میں صوم کہا جاتا ہے۔ صوم کا مطلب ہے کسی چیز سے رک جانا۔

سورۂ بقر کی آیت ۱۸۳ میں رب ذوالجلال ارشاد فرماتا ہے کہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ یعنی جب روزہ دار خود کو برائیوں سے بچا کے رکھے گا تو لامحالہ اس راستے پر چلے گا جس پر چلنے کا خدا نے اسے حکم دیا ہے۔ اسی سورت کی آیت ۱۸۵ میں روزے کے دو اور مقاصد بھی بیان کیے ہیں یعنی تاکہ تم شکرگزار ہو جاؤ۔ اور اللہ کی کبریائی کا اعتراف کر سکو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص روزہ رکھنے کے بعد بھی جھوٹ اور فریب کے کاموں کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان کھانا پینا چھوڑ دے۔"

اس حدیث پاک سے واضح ہوتا ہے کہ روزے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کھانا پینا چھوڑ دیں اور اپنے اندر موجود برائیوں کی اصلاح نہ کر سکیں۔ دراصل روزہ ہمارے نفس کی اصلاح کرتا ہے اور ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ کر لیا، اس نے فلاح پالی اور جس نے ایسا نہ کیا، اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔

بڑی سہولتیں عطا فرمائی ہیں۔ جو شخص مستقل بیمار ہو اور روزہ نہ رکھ سکتا ہو، اس کے لیے حکم ہے کہ وہ ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اسی طرح مسافر پر بھی روزہ رکھنا لازم نہیں۔ ہاں سفر کے بعد روزے رکھنے کا حکم ضرور ہے۔

رمضان المبارک کے مقدس مہینے کے بارے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے رمضان کا پہلا حصّہ رحمت ہے، درمیانی حصّہ مغفرت جب کہ آخری حصّہ دوزخ سے آزادی ہے یعنی مسلمان اگر ان پوری شرائط کے ساتھ روزہ رکھے، جس طرح کہ رکھنے کا حکم ہے تو اس کے لیے خدا تعالیٰ دنیا میں بھی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش کرتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے لیے انعام ہی انعام ہوں گے۔ روزہ دار جس دروازے سے جنّت میں داخل ہوں گے، اسے باب الریان" کہا جاتا ہے۔ روزے کی فضیلت کے بارے میں ایک اور جگہ ہمارے آقا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جس شخص نے رمضان کے روزے ثواب کی نیت سے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے رکھے تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔

۲۹ یا ۳۰ روزوں کے بعد عید آتی ہے جو دراصل روزہ داروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔ پہلی عید مسلمانوں نے یکم شوال ۲ ہجری کو منائی تھی۔ عید کے روز صبح اٹھ کر غسل کرنا، نئے اور دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، عید کی نماز سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھانا، ایک راستے سے عید گاہ کو جانا اور دوسرے سے واپس آنا۔ راستے میں آتے جاتے تکبیر پڑھنا، عزیزوں، دوستوں سے عید ملنا، نماز سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنا، انتہائی ثواب ہے۔



▲ کسی کو نصیحت تنہائی میں اور تعریف محفل میں کرو۔

▲ کانٹوں سے دل لگاؤ جو عمر بھر ساتھ دیتے ہیں، پھول تو سانس کی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

(غلام مرتضیٰ شاد۔ وزیر آباد)

لیلۃ القدر یا شب قدر

قرآن مجید ایک کتاب ہے جس میں اچھی زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اسے پڑھ کر مـ
جانتے ہیں کہ کون سے کام کرنا ضروری ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کیا چیزیں حلال اور کون سی حرا
کی ہیں۔ قرآن انھیں سکھاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کیسا سلوک رکھیں، قرآن انھیں
ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ رحم کریں۔ اللہ کی بنائی ہوئی دنیا کو سمجھنے کے لیے اور اس۔
فائدہ اٹھانے کے لیے علم حاصل کریں۔

اس برکت والی کتاب کی سب سے پہلی بات ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رمضان کے مہـ
کی ایک بڑی رات میں اللہ کے حکم سے سکھائی گئی (اسے قرآن کا نازل ہونا کہتے ہیں)، اس لیے،
رات کتنی مبارک ہو گی جس میں قرآن نازل ہوا اس رات کو "شب قدر" یا "لیلۃ القدر" کہتے ہیں "ذ
اور "لیل" کے معنی "رات" ہے۔

رمضان کی ستائیسویں تاریخ شب قدر مانی جاتی ہے۔ ہر سال مسلمان اس مبارک شب کی سا
مناتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس رات کو خوب عبادت کرتے ہیں، قرآن کی تلاو
کرتے ہیں۔ اس کے معنی اور مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا کام کرنا چاہیے اور کیا نہیں
جا ہیے۔ کیا حرام ہے اور کیا حلال ہے۔

اللہ پاک نے لیلۃ القدر کی بڑائی قرآن پاک میں اس طرح بیان فرمائی ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥

شروع (کرتا ہوں) اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱	ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲	اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟
لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳	شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے
تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴	اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے (انتظام) کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں۔
سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵	اس (رات میں) صبح ہونے تک (امن و) سلامتی ہے

[illegible]



دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان رہتے ہیں، رمضان کے مبارک مہینے میں وہ بڑے شوق اور بڑے اہتمام سے روزے رکھتے ہیں۔ روزہ رکھنا ایک عبادت ہے، لیکن اس کے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ روزے سے ہم اپنی خواہشوں اور عادتوں پر قابو پانا سیکھ لیتے ہیں اور بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کر کے ہم زیادہ حوصلہ مند اور باہمت ہو جاتے ہیں اور بڑی سے بڑی تکلیفوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ روزہ رکھنے سے ہم میں یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا اور جو فاقے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، کس قدر تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، اس لیے ہمیں ان کی عزت اور مدد کرنی چاہیے۔ روزوں میں صرف کھانے پینے پر پابندی نہیں ہوتی بلکہ بے کار باتیں کرنے، کسی کا دل دکھانے اور دکھ پہنچانے اور بے کار کاموں میں وقت ضائع کرنے سے بھی روزے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ روزے میں اللہ تعالیٰ سے لو لگانے میں ایک قسم کی فرحت محسوس ہوتی ہے۔

ان فائدوں کے علاوہ روزے صحت کے لیے بھی انتہائی فائدہ مند ہوتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے سے صحت کو نقصان پہنچانے والے مادے جسم میں جمع ہو جاتے ہیں، وہ روزوں کے دنوں میں خود بہ خود خارج ہو جاتے ہیں۔ پھسپھسا مٹاپا ختم ہو جاتا ہے اور بدن کے اندرونی حصوں کی صفائی ہو جاتی ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے روزے رکھنے پر بہت زور دیا ہے۔

تمہارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

خیال کے پھول

● حضور اکرمؐ

مومنوں میں سے کامل وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق ان میں سب سے اچھے ہیں۔

مرسلہ: این۔ڈی۔جہانگیر

● حضرت ابوبکرؓ

کتنی شرم کی بات ہے کہ صبح ہمارے جاگنے سے پہلے پرندے جاگ جائیں۔

مرسلہ: اکبر حیات اکبر'

● حضرت علیؓ

تو کسی پر احسان کرے تو چھپا کوئی تجھ پر احسان کرے تو سب کو بتا۔

مرسلہ: محمود حسین خان اعوان

● مولانا رومؒ

مصیبت ہلاکت کے لیے نہیں بلکہ آزمائش کے لیے ہوتی ہے۔

● علامہ اقبالؒ

زندگی اور موت میں سانس کا فرق ہے۔

مرسلہ: عمران رشید

● ارسطو

لگن کے بغیر کسی میں بھی عظیم ذہانت پیدا نہیں ہوسکتی۔

مرسلہ: محمد قیصر امام

● نادر شاہ

مجھے پھول اور سانپ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

مرسلہ: محمد خالد اعوان

● شیخ سعدیؒ

ماں باپ کی خوشنودی دنیا میں باعث دولت اور آخرت میں باعث نجات ہے۔

مرسلہ: محسن رجب علی

● سقراط

اپنا وقت دوسروں کی تحریروں کے مطالعے سے اپنی لیاقت بڑھانے میں صرف کرو، اس طرح تم ان چیزوں کو نہایت آسانی سے حاصل کرسکو گے، جن کو حاصل کرنے میں دوسروں کو منت شاقہ برداشت کرنی پڑی۔

مرسلہ: ناصر حسین خان

● حکیم محمد سعید

جب کسی کام کا ارادہ کرلیا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ آدھا کام ہوگیا۔

مرسلہ: مجیب ظفر انوار

● گوتم بدھ

صبر سب سے بڑی عبادت ہے۔

مرسلہ: سلمان اقبال

اَلسَّلام عَلیکم

مسعود احمد برکاتی

ایک بزرگ تھے۔ بازار میں ان کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا، لیکن وہ اکثر شام کے وقت بازار چلے جایا کرتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ بازار کیوں جایا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، اس لیے جاتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سلام کرسکوں اور جواب میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا سلام لے سکوں۔ آپ اگر کسی کو بھول سے سلام کیے بغیر آگے بڑھ جاتے تو پلٹ کر آتے اور سلام کرتے۔ یہ بزرگ تھے حضرت عبداللہؓ ابن عمر فاروق۔

اس واقعے سے سلام کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ سلام کے معنی ہیں سلامتی۔ جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو کہتے ہیں:

اسلام علیکم یعنی تم پر سلامتی ہو۔

سلام عربی لفظ ہے اور اس کے بہت سے معنی ہیں: سلامتی، دعا، امن، امان، سلام، تسلیم، بندگی، آداب، کورنش۔

جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی سلامتی، اس کی بھلائی کی دعا کرتے ہیں۔ ہمارے سلام کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہم نے سلام کیا ہم اُسے جانتے ہیں، چاہے معمولی طور پر ہی جانتے ہوں اور اس کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اُس شخص پر ہمارا اچھا جذبہ، اچھی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے اُس شخص کو سکون ملتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی بھلائی چاہنے والے بھی ہیں۔ اس طرح باہم اُنس اور پیار بڑھتا ہے۔ محبت کی فضا بنتی ہے۔ یہ محبت کی فضا بڑی ضروری اور کام کی چیز ہے۔ اس سے انسان، انسان میں قربت بڑھتی ہے۔ ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں۔ دیکھا آپ نے سلام کا ایک لفظ کتنے کام کرتا ہے، لیکن سلام صرف

ایک لفظ ہی نہیں ایک جذبہ ہے، ایک مزاج ہے۔ یہ جذبہ ترقی کرتا ہے تو معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ یہ مزاج معاشرے کو سکون، راحت اور خوشی عطا کرتا ہے۔ معاشرہ بہت سے انسانوں کے مجموعے سے بنتا ہے۔ معاشرہ چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ سب سے چھوٹا معاشرہ خاندان کہلاتا ہے۔ اس سے بڑے معاشرے کو برادری کہہ سکتے ہیں۔ پھر شہر اور ملک آتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا ایک معاشرہ ہوتا ہے۔ جس خاندان جس برادری اور جس قوم کے لوگ ایک دوسرے کے سچے دوست اور بھائی ہوں اُن کا معاشرہ بڑے امن اور چین سے رہتا ہے اور خوب پھلتا پھولتا ہے۔

جنّت کو دارُالسلام کہتے ہیں، کیوں کہ وہاں داخل ہونے کے بعد لوگ تمام پریشانیوں، بُرائیوں، مصیبتوں، عیبوں اور آپس کی دشمنیوں سے محفوظ رہیں گے۔ جنّت کو دارالسّلام اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں جنّت والے ایک دوسرے سے خلوص اور محبت رکھیں گے اور اس کو ظاہر کرنے کے لیے بار بار سلام کریں گے بلکہ فرشتے اور خود اللہ میاں بھی جنّت والوں کو سلام کرتے رہیں گے۔ جنّت کو شاید دارالسّلام اس لیے بھی کہتے ہوں گے کہ اللہ میاں کا ایک نام "سلام" بھی ہے اور جنّت کو خانۂ خُدا یا اللہ کا گھر کہا گیا ہے۔

دونوں جہانوں کے سردار اور ہمارے پیارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"تم لوگ جنّت میں نہیں جا سکتے جب تک کہ مومن نہیں بنتے اور تم مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ میں تمھیں وہ تدبیر کیوں نہ بتا دوں جس کو اختیار کر کے تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو۔ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔"

یعنی سلام کو پھیلانے سے محبت بڑھے گی۔ محبت مومن ہونے کی ایک نشانی ہے اور جنّت کا راستہ کھولتی ہے بلکہ دنیا کو بھی جنّت بناتی ہے۔ آپؐ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

"جب تم گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو اور جب تم گھر سے باہر جاؤ سلام کر کے رخصت حاصل کرو۔"

آپؐ کا یہ ارشاد بھی سونے سے لکھے جانے کے قابل ہے:

"غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور ہر مسلمان کو سلام کرو، چاہے تمہاری اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔"

ہر مسلمان کو سلام کرنے کی ہدایت کرکے آپؐ نے محبت اور مساوات (برابری) کی تعلیم دی ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک دوسرے کی سلامتی اور بھلائی چاہنا اُن کا فرض ہے۔ آج بہت سے بڑے لوگ سلام کرنے کے بجائے سلام سننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹوں کو سلام کرنا شاید اپنی توہین سمجھتے ہیں، لیکن سلام کرنا توہین نہیں ہے، بڑائی کی نشانی ہے۔ بڑا آدمی ہی دوسروں کی بھلائی اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس امید میں رہتے ہیں کہ دوسرے ان کو سلام کریں اُن کے دل میں کھوٹ ہوتی ہے، محبت نہیں ہوتی۔ حضورؐ کا ایک اور ارشاد پڑھیے:

"وہ آدمی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔"

خود حضورؐ کا طریقہ کیا تھا؟ آپ کا طریقہ یہ تھا:

آپؐ کے پاس جو شخص بھی آتا آپؐ اس کو سلام کرنے میں پہل فرماتے۔ آپؐ کی کوشش ہوتی کہ اس سے پہلے کہ کوئی شخص آپؐ کو سلام کرے، آپؐ پہلے اس پر سلامتی بھیج دیں۔ آپؐ اس طرح سلام کرتے تھے:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللہ

ایک دن آپؐ مسجد کے پاس سے گزرے۔ وہاں کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، آپؐ نے اُن کو اپنے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ آپؐ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا، اس شخص کو تیس نیکیاں ملیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ 'السلام علیکم' کا جواب 'وعلیکم السلام' ہے، یعنی "اور تم پر بھی سلامتی ہو"۔ لیکن اگر کوئی جواب میں "ورحمۃ اللہ (اور اللہ کی رحمت ہو) کے الفاظ بڑھادے تو اچھا ہے اور "وبرکاتہٗ" (اور برکتیں بھی نازل ہوں) جواب میں شامل کرلے تو کیا کہنے۔ اس طرح اس کی خوش دلی زیادہ ظاہر ہوگی۔

سلام تہذیب کی علامت بھی ہے۔ جو آدمی سلام کرتا ہے وہ مہذب کہلاتا ہے اور لوگ

اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ سلام کرنے میں ایک آسانی بھی ہے۔ آدمی کے پاس ہمیشہ اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ کسی جاننے والے سے رُک کر بات چیت کرے، لہٰذا وہ سلام کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ سلام کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں اور آپس میں ناراض نہیں ہیں، خوش ہیں۔ دو جاننے والوں کا آمنا سامنا ہو اور وہ وقت کی کمی کی وجہ سے بات چیت نہ کر سکیں، ویسے ہی گزر جائیں تو شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں دلوں میں فرق تو نہیں آگیا۔ سلام کرنے سے یہ شبہ نہیں ہوتا اور ذہن صاف رہتا ہے۔

اب ذرا اردو میں سلام کے معنی اور محاورے بھی دیکھیے۔ سلام عربی لفظ ہے اور اس کے معنی بھی میں نے اوپر لکھ دیے ہیں، لیکن اردو بھی ایک بڑی اور مستقل زبان ہے۔ ہر زبان دوسری زبان سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے بعض لفظ اپنا بھی لیتی ہے لیکن مستقل اور زندہ زبان کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبان کے لفظ لے تو لیتی ہے، لیکن ان کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مشکل ہی سے کسی لفظ کو جوں کا توں قبول کرتی ہے۔ کہیں زیر زبر بدل دیتی ہے کہیں معنی بدل دیتی ہے اور کہیں اس کے ساتھ اپنا کوئی لفظ لگا کر نئے معنی پیدا کرتی ہے۔ لفظ سلام کے ساتھ بھی اردو نے کچھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ عربی میں سلام کے جو معنی ہیں ان کے ساتھ ساتھ اردو میں کئی معنی ایسے بھی ہیں جو عربی میں نہ ہوں گے، مثلاً اردو میں سلامتی کے علاوہ الزام دینے کے لیے بھی سلام کہتے ہیں۔ اسی طرح کے چند اور محاورے اور ان کا مفہوم لکھتا ہوں:

سلام پھیرنا : نماز ختم کرنا۔
سلام پیام : بات چیت۔ منگنی یا شادی کے سلسلے میں بات چیت۔
سلام دینا : دُور کرنا، رخصت کرنا۔
سلام کرنا : آداب کرنا، رخصت ہونا۔ کسی کام کو چھوڑنے کے معنی میں بھی سلام کرنا بولتے ہیں جیسے داغ نے اس شعر میں لکھا ہے:

تھی نہ تابِ ستم تو حضرتِ دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

کسی کی مہارت یا قابلیت کا قائل ہو جانا۔

سلام لینا : سلام کا جواب، اشارے یا زبان سے دینا۔ میل ملاپ چھوڑنے کے معنی میں بھی سلام لینا بولتے ہیں۔
سلام ہونا : ملاقات ہونا۔
سلام ہے : ہم باز آئے۔ معاف کیجیے۔ اللہ محفوظ رکھے، اللہ کام نہ ڈالے۔
سلام نیاز : عاجزی کا سلام۔
سلام رُوستائی : غرض مندی کا سلام۔
سلام : ایک قسم کی تعریفی نظم کو بھی کہتے ہیں، جو غزل کے انداز پر ہوتی ہے اور جس میں حضورؐ کی سیرت یا واقعۂ کربلا کا ذکر ہوتا ہے۔
سلام پڑھنا : میلاد میں حضورؐ پر منظوم سلام پڑھنا۔
سلام بھیجنا : درود اور سلام پڑھنا۔


بیٹے۔ مجھے بتاؤ وہ لڑکا کون ہے جس نے تمھاری ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی ہے۔
امی! وہ تو مجھے بڑے زور کی دھمکی دیتا، مگر میں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ یہ دیکھیے اس کی جرسی!


ماشاء اللہ تم صحت مند ہو، میرے گھر کی صفائی کر دیا کرو ....
نہیں بیگم صاحبہ، میں جیب کی صفائی کر کے ہی سزا بھگت چکا ہوں، اب گھر کی صفائی میں کیا ملے گا؟

ہنرمند شہزادہ

وہ تھا تو شہزادہ مگر اس نے قالین بُننا سیکھ لیا تھا۔ اپنے اس ہنر کی وجہ سے اسے ڈاکوؤں کی قید سے رہائی ملی۔



سید کاشان جعفری

ساتھیو! ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ بہت عرصے قبل کا ذکر ہے کہ پرانے زمانے میں ہماری تمہاری طرح کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کا نام آصف شاہ تھا۔ وہ بہت ہی نیک دل، نرم مزاج اور عادل حکمران تھا۔ اس کی سلطنت میں دنیا کی ہر چیز اور ہر نعمت موجود تھی مگر اس کے باوجود وہ اولاد نہ ہونے کے غم میں افسردہ رہتا اور دل ہی دل میں کڑھا کرتا۔ ایک روز کسی نے بتایا کہ شہر سے باہر ایک بہت ہی خدا رسیدہ بزرگ آئے ہیں جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ آصف شاہ نے شہر سے باہر نکل کر ان کی خدمت میں حاضری دی اور درخواست کی کہ وہ خدا سے دعا کریں



کہ وہ اُسے صاحبِ اولاد بنا دے۔ بزرگ نے دُعا کی اور آصف شاہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدا تمہاری مُراد پوری کرے گا۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہُوا کرتے۔ وہ بڑا رحیم و کریم اور بے نیاز ہے۔"

آصف شاہ بزرگ کی باتوں سے مطمئن ہو کر اپنے محل لوٹ آیا۔ سال بھر کے اندر اندر ملکہ کی گود میں تاج و تخت کا وارث کھیلنے لگا۔ شہزادے کا نام نجومیوں سے مشورے کے بعد عامر رکھا گیا۔ سارے ملک میں تین ماہ تک شہزادہ عامر کی پیدائش پر چراغاں ہوا جشن منایا گیا، غریبوں، محتاجوں میں دل کھول کر خیرات تقسیم کی گئی۔

وقت گزرتا رہا اور وقت کے ساتھ ساتھ شہزادہ عامر بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکپن کے دَور میں داخل ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے قابل ترین اساتذہ کا انتظام کیا۔ کتابی علم کے ساتھ ساتھ امورِ سلطنت کی دیکھ بھال سپہ گری اور شہسواری کی تعلیم بھی دی گئی۔ جب عامر ۲۰ سال کی عمر کو پہنچا تو وہ ایک ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھا۔

ایک دن شہزادہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا اور ایک ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر راستے سے بھٹک گیا۔ سورج دن بھر کی مسافت کے بعد دھیرے دھیرے غروب ہو رہا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا مگر شہزادہ باوجود انتہائی کوشش کے راستہ تلاش نہ کر سکا اور بھٹک کر ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا نکلا۔ گاؤں میں داخل ہوا تو اُس نے کنوئیں پر ایک لڑکی کو پانی بھرتے دیکھا۔ وہ صبح سے بھوکا پیاسا تھا۔ جھٹ گھوڑا بڑھا کر کنوئیں کے قریب پہنچا اور لڑکی سے پانی پینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

لڑکی پانی کا گھڑا لے کر آگے بڑھی۔ جیسے ہی شہزادہ عامر پانی پینے کے لیے ہاتھ سے چُلّو بنا کر منہ قریب لایا تو لڑکی نے پانی الگ گرا دیا۔ شہزادہ سمجھا کہ شائد میں نے فاصلہ دے کر پانی پینے کی کوشش کی ہے۔ وہ قدم بڑھا کر مزید قریب ہو گیا اور پھر پانی پینے کے لیے چُلّو بنا لیا مگر لڑکی پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ لڑکی نے جب تیسری بار بھی پانی پلانے کی بجائے نیچے چھلکا دیا تو شہزادہ سیدھا کھڑا ہو کر حیرت سے اُسے دیکھنے لگا اور قدرے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں پوچھا "یہ کیا حرکت ہے؟ پانی پلانا ہے تو پلا دو ورنہ منع کر دو!"

لڑکی مسکراتے ہوئے بولی "مسافر! تم بہت تھکے ہوئے اور پیاسے ہی نہیں، بھوکے بھی لگتے ہو۔ میں نے تین بار پانی جان بوجھ کر اس لیے گرایا ہے تاکہ تمہارا گرم تھکا ہوا جسم پُرسکون ہو جائے۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ تھکن اور شدید بھوک پیاس کے عالم میں پانی پی لینے سے نقصان ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہاری تھکن کم ہو چکی ہو گی۔ لو اب بہ صد شوق پانی پیو اور مناسب سمجھو تو میرے گھر چل کر کچھ تھوڑا بہت کھا بھی لو۔"

شہزادہ عامر غریب دیہاتی لڑکی کی اس عقلمندی پر بے حد حیران ہُوا۔ اُس نے خاموشی سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی، پھر لڑکی سے بولا "میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا

ہوں بہتر ہوگا کہ میں رات تمہارے گھر گزار لوں، بشرطیکہ تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔

لڑکی نے کہا "مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور اللہ کی رحمت پر کون اعتراض کرے گا! شوق سے میرے گھر چلو۔"

شہزادہ لڑکی کے گھر آ گیا۔ اُس نے اپنا گھوڑا گھر کے باہر درخت سے باندھ دیا اور خود لڑکی کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہو گیا۔ لڑکی اُسے بیٹھک میں بٹھا کر اندر چلی گئی۔ شہزادے نے دیکھا، چھوٹا سا خوبصورت گھر بڑے سلیقے سے سجا ہوا ہے۔ بیٹھک میں کشیدہ کاری اور دستکاری کے بہترین نمونے خوبصورتی سے سجے ہوئے ہیں۔ بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ یہ ساری ہنرمندی اُس لڑکی کے ہاتھوں کی ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں اُس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر خود اُس پر اپنا شہزادہ ہونا ظاہر نہ کیا۔

رات وہاں گزار کے صبح سویرے ناشتا کرنے کے بعد وہ پھر اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جنگل میں داخل ہوا تو اُس کے ساتھی اُسے تلاش کرتے ہوئے مل گئے۔ اُنھوں نے اس دوران کافی شکار بھی کر لیا تھا چنانچہ سب ہنسی خوشی محل لوٹ آئے۔

واپسی پر شہزادے نے اُس لڑکی کے متعلق اپنی ماں کو بتایا اور کہا کہ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ملکہ نے یہ بات بادشاہ کو بتا دی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ شہزادے نے لڑکی پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہونے دی ہے۔ بادشاہ نے دوسرے دن اپنے وزیر کو بیش قیمت تحائف کے ہمراہ لڑکی کے گاؤں بھیج دیا۔

وزیر سپہ سالار کے ہمراہ رشتہ لے کر گاؤں پہنچا۔ اُس کا خیال تھا کہ لڑکی والے شاہی پیغام سن کر خوشی سے جھوم اُٹھیں گے اور فوراً ہی اپنی منظوری دے دیں گے مگر لڑکی کے والدین نے کہا کہ وہ یہاں شام تک ٹھہر جائیں۔ لڑکی کھیتوں پر کام کرنے گئی ہے۔ شام کو گھر کے لیے پانی لیتے ہوئے واپس آئے گی تو اُس سے پوچھ کر جواب دیا جائے گا۔

سوکھے پتے

آتے آتے — دن پت جھڑ کے
پیلے پیلے — سوکھے سوکھے
ڈھیروں پتے — پیڑ سے گر کے
تیز ہوا سے — جیسے ڈر کے
بھاگے جائیں
ہاتھ نہ آئیں
کھڑکھڑ کرتے — شور مچاتے
جاتے جاتے — خاک اُڑاتے
اس سے بچتے — اُس کو بچاتے
کرتب اپنے — سب کو دکھاتے
بھاگے جائیں
ہاتھ نہ آئیں

★ قیوم نظر ★

وزیر اور سپہ سالار وہاں ٹھہر گئے۔

شام ہوئی تو لڑکی جس کا نام یاسمین تھا، سر پر پانی کا مٹکا رکھے گھر واپس آگئی۔ اس کی ماں نے ساری بات یاسمین کو بتا کر اس کی مرضی دریافت کی تو یاسمین نے وزیر سے سوال کیا: "لڑکا کیا کام کرنا جانتا ہے اور کس ہنر میں ماہر ہے؟"

لڑکی کا سوال سن کر وزیر اور سپہ سالار حیرت میں پڑ گئے مگر اسے چھپاتے ہوئے مسکرا کر بولے: "بیٹی! اُسے بھلا کسی کام کرنے یا ہنر جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ خود ان کے یہاں سیکڑوں لوگ ملازمت کرتے ہیں۔ کام اور ہنر تو غریب لوگ اپنا پیٹ پالنے کے لیے کرتے اور سیکھتے ہیں۔"

یاسمین کو اُن دونوں کا یہ جواب مطمئن نہ کر سکا۔ وہ پھر بولی: "دیکھیے، مجھے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر آپ لڑکے کو بتا دیں، وہ اس ملک کا شہزادہ ہی کیوں نہ ہو، اچھی طرح یہ بات ذہن نشین کرا دیں کہ میں صرف اور صرف اسی شخص سے شادی کروں گی جو کوئی کام کرتا ہو یا کسی ہنر میں ماہر ہو۔"

یہ سن کر وزیر اور سپہ سالار دونوں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور مایوسی سے سر جھکائے محل لوٹ آئے۔

شہزادہ عامر کو جب یاسمین کے خیالات کا علم ہوا تو اس نے خصوصی طور پر قالین سازی کا ہنر سیکھنا شروع کر دیا۔ آدمی محنت اور لگن سے کام کرے تو کیا نہیں کر سکتا! شہزادے کو تو یاسمین سے شادی کرنے کی دھن تھی۔ چند ہی ماہ میں اُس نے سالوں کا کام مہینوں میں سیکھ لیا۔ پھر سونے کے تاروں کی آمیزش سے ایک خوبصورت قالین بُن کر وزیر اور سپہ سالار کو دیا اور دونوں کو یاسمین کے گاؤں بھیجا۔

دونوں شاہی قاصد گاؤں پہنچے تو انھوں نے شہزادے کے ہاتھوں کا بنا ہوا قالین یاسمین کو پیش کرتے ہوئے کہا: "عامر نے آپ کی شرط کے مطابق قالین سازی کا کام سیکھ لیا ہے۔ اور یہ قالین اُسی کے ہاتھوں کا بُنا ہوا ہے۔"

یاسمین نے قالین کو دیکھا۔ وہ واقعی بہت نفیس اور شاندار تھا۔ اُس نے پیغام منظور کر لیا۔ وزیر اور سپہ سالار خوشی خوشی محل لوٹے اور فوراً ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

آخر شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ سارے ملک میں شادی کی خوشیاں منائی گئیں۔ یاسمین دلہن بن کر گاؤں سے محل میں آگئی۔ اس کی خدمت کے لیے بے شمار کنیزیں اور غلام موجود تھے پھر بھی وہ اپنا اور شہزادے کا بیشتر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی۔ محل میں آنے کے بعد اس کی طبیعت میں غرور و حسد کی بجائے مزید نرمی و بُردباری آگئی۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ صبر و تحمل سے کام لینے لگی۔

شادی کے کچھ عرصے بعد اچانک شاہ آصف شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کا سوگ چالیس دن تک ملک بھر میں منایا گیا۔ شہزادہ عامر اب بادشاہ بن کر لوگوں کی مشکلات حل کرنے لگا تھا۔ یاسمین اس کی ہر طرح مدد اور دلجوئی کرتی تھی۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اُن دنوں ڈاکوؤں نے ملک

قولِ رسولؐ • اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہ ہے جو تقویٰ میں تم سب سے بڑھ کر ہے۔

- اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور تمھارے جسموں سے غرض نہیں رکھتا، بلکہ وہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ (مسلم)
- آگاہ رہو کہ جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب یہ تندرست ہو تو تمام بدن تندرست رہتا ہے اور اگر یہ بیمار ہو جائے تو سارا بدن بیمار پڑ جاتا ہے۔ جان لو کہ وہ دل ہے۔ (بخاری)
- میں تمھیں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں کیوں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بہترین تلقین کر سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اُسے آخرت کے لیے آمادہ کرے اور تقویٰ کا حکم دے۔ (طبری)

مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اُن کا طریقۂ واردات بڑا انوکھا تھا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح آتے اور اپنا کام ختم کر کے اچانک غائب ہو جاتے۔ شاہی اہلکار ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے سے عاجز آ چکے تھے۔ آخر بادشاہ کو خود اُن کی گرفتاری کے لیے عملی طور پر میدان میں آنا پڑا۔

ڈاکوؤں کا گروہ بہت چالاک تھا۔ ادھر عامر نے ان کی سرکوبی کے لیے فیصلہ کن پروگرام بنایا، اُدھر انھیں اس کی اطلاع مل گئی۔ بادشاہ عامر کے ساتھ وزیر، سپہ سالار اور شہر کوتوال وغیرہ بھی مہم میں شریک ہو گئے تھے جنھیں ڈاکوؤں نے دھوکا دے کر زندہ گرفتار کر لیا اور انھیں پہاڑی سلسلے میں واقع ایک خفیہ غار میں لے گئے۔

غار میں لانے کے بعد ڈاکوؤں کے سردار نے سب سے پہلے کوتوال سے دریافت کیا کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے؟ پھر یہی سوال سپہ سالار اور وزیر سے بھی باری باری پوچھا۔ تینوں نے نفی میں جواب دیا۔ اب سردار نے عامر شاہ سے وہی سوال دریافت کیا۔ عامر نے بتایا کہ وہ قالین سازی کا کام کر سکتا ہے۔ اس کا جواب سن کر سردار کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے حکم دیا: ”اِن تینوں لوگوں کو تو محنت مشقت کے کاموں پر لگا دیا جائے کیونکہ یہ کوئی ہنر نہیں جانتے اور عامر شاہ کے لیے کھڈی کا انتظام کر دیا جائے جس پر یہ ہمارے لیے قالین تیار کرے۔“

سپہ سالار، وزیر اور شہر کوتوال کو ڈاکوؤں نے پتھر کاٹ کر نئی سرنگ کھودنے پر لگا دیا۔ اُنھوں نے تو تصور میں بھی پتھر کاٹنے کا کام نہیں کیا تھا، بھلا یہ کیسے کرتے! جب وہ تھکن سے بے حال ہو کر اپنا ہاتھ کھدائی سے روکتے تو پہرے دار ان پر چابک برسانے لگتے اور تینوں چابک کی مار سے بچنے کے لیے تیزی سے کھدائی میں مصروف ہو جاتے۔ چند ہی دنوں کے کام نے اُن کے حلیے بگاڑ کر رکھ دیے جبکہ عامر شاہ آرام سے قالین بُنتا رہتا۔ اُس نے کئی قالین بُنے، جو شہر میں اچھی قیمت پر فروخت ہو گئے۔

عامر شاہ نے قالین بُنتے بُنتے ایک ترکیب سوچی اور اُس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن جب سردار اُس کے کام کا معائنہ کرنے خود آیا تو عامر شاہ نے اُس سے کہا: ”اگر آپ چاہتے ہیں کہ قالین کی زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کریں تو مجھے سونے کے تاروں کا گچھا منگوا دیں۔ میں اُن سے جو قالین تیار کروں، اُسے شاہی محل لے جائیں اور بادشاہ اور

ملکہ کی خدمت میں فروخت کرنے کے لیے پیش کر دیں وہاں سے ایک ہی قالین کی آپ کو اتنی رقم مل جائے گی جو میرے بنے ہوئے پچیس قالینوں کے برابر ہو گی۔"

سردار نے عامر شاہ کی بات پر خوشی اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سونے کے تار فراہم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے بھلا اچھی اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ ایک ہی قالین سے پچیس قالینوں کا نفع اسے مل جائے۔ دوسرے ہی دن اس نے عامر شاہ کو سنہری تار فراہم کر دیے۔

عامر شاہ نے ان تاروں کی مدد سے بالکل ویسا ہی قالین تیار کرنا شروع کیا جیسا کہ شادی سے قبل یاسمین کو تحفے میں بھیجا جا چکا تھا۔ اس قالین میں ایک نئی تبدیلی اس نے یہ کی کہ قالین پر پہاڑوں کے درمیان اس خفیہ غار کا نقشہ بھی بنا دیا۔ جو ڈاکوؤں کا مسکن تھا۔

قالین تیار ہوا تو سردار اسے لے کر اپنے معتمد ساتھیوں کے ہمراہ شاہی دربار پہنچا اور ملکہ یاسمین کی خدمت میں پیش کیا۔

یاسمین ایک ہی نظر میں پہچان گئی کہ یہ قالین اسی کے شوہر کے ہاتھوں سے تیار ہوا ہے۔ پھر اس کی نظر نقشے پر پڑی تو چونک گئی مگر بھرے دربار میں اس نے اپنی حیرت کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ اس نے خادم سے کہا کہ وہ قالین محل میں لے جائے اور وزیر خزانہ کو دربار میں بھیج دے۔

ان احکامات کے بعد وہ تاجر کے روپ میں آنے والے ڈاکوؤں کے سردار سے بولی: "آپ لوگ تشریف رکھیں۔ واقعی بہت عمدہ قالین لے کر آپ یہاں تشریف لائے ہیں میں اس کی قیمت آپ کے تصور سے بھی زیادہ ادا کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ محل جانے کے لیے اٹھ گئی۔

محل میں پہنچ کر اس نے قالین کو بغور دیکھا وہ سمجھ گئی کہ عامر نے جو نقشہ قالین پر بنایا ہے، وہیں وہ قید ہے نقشہ سمجھنے کے بعد اس نے نائب وزیر اعظم اور نائب سپہ سالار کو دوسرے کمرے میں بلا کر مشورہ کیا اور سوداگروں کو وہیں گرفتار کر لینے کا حکم دے دیا پھر نقشے کی مدد سے خفیہ پناہ گاہ میں پہنچ کر عامر شاہ اور دوسرے تمام قیدیوں کو رہائی دلائی اور پورے گروہ کا صفایا کر دیا۔

یاسمین نے عامر شاہ کی غیر موجودگی کے دوران میں کسی کو بھی اس کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ نہ ہی اس کی گمشدگی کا کسی کو پتا چلنے دیا تھا اس نے دربار میں امرا اور وزرا کو بھی بتایا تھا کہ عامر شاہ، وزیر اعظم سپہ سالار اور کوتوال کے ہمراہ خیر سگالی غیر ملکی دورے پر گئے ہیں۔

ڈاکوؤں کی گرفتاری اور ان کے گروہ کے خاتمے کے بعد رہائی پانے پر وزیر اعظم اور سپہ سالار کو بھی کوئی نہ کوئی ہنر سیکھنے کا احساس ہوا پھر تو انھوں نے عامر شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ ملک بھر میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کو بھی کوئی نہ کوئی ہنر سیکھنے کا پابند کر دے۔ عامر شاہ نے فوراً ہی اس مفید مشورے پر عمل کرنے کے احکامات صادر فرما دیے۔





مسکراتے رہو

● ایک صاحب کا جوتا تنگ تھا۔ چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ کسی نے پوچھا "جوتا کہاں سے لیا ہے؟" جلے بھنے تو تھے ہی۔ بولے "درخت سے توڑا ہے۔"

دوسرا بولا "بڑی جلدی کی آپ نے، ایک ہفتہ ٹھیر جاتے تو جوتا پورے ناپ کا ہو جاتا۔"

مرسلہ: افتخار احمد

● ایک دوست (دوسرے سے) کہتے ہیں میرے گانے سے پانی کھولنے لگتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

دوسرا دوست: ہو سکتا ہے۔ خون کھولتا ہوا تو خود کئی بار مجھے محسوس ہوا ہے۔

مرسلہ: محمود مظفر

● منا: (باجی سے) "بارش کا پانی کہاں جاتا ہے؟"

باجی: (جو پہلے ہی غصے میں بیٹھی تھیں) "میرے سر میں۔"

منا: (معصومیت سے) "تب ہی آپ کی ناک بہتی رہتی ہے۔"

مرسلہ: سہیل کوثر، طرابلس، لیبیا

● ایک اداکار اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا "کل رات اسٹیج پر میری اداکاری دیکھ کر لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔"

ایک دوست بولا "ناممکن۔ اتنے سارے لوگ ایک ہی وقت میں کیسے جماہی لے سکتے ہیں۔"

مرسلہ: محمد سلیم سبھی

● ایک بچی جب پہلے دن اسکول سے واپس آئی تو اس نے اپنی امی سے کہا:

"میں اپنا وقت برباد کر رہی ہوں۔"

امی: "وہ کیسے؟"

بچی: "نہ مجھے پڑھنا آتا ہے، نہ لکھنا آتا ہے اور اسکول والے مجھے کھیلنے بھی نہیں دیتے۔"

● شوہر نے مرنے سے پہلے بیوی کو وصیت کرتے ہوئے کہا "دیکھو، میری دکان عمران کو دے دینا۔"

بیوی: "میرے خیال میں تو دکان عارف کے پاس ٹھیک رہے گی۔"

شوہر: "اچھا تو پھر بیوی گاڑی عمران کو دے دیتا۔"
بیوی: "نہیں، اس گاڑی کی مجھ کو زیادہ ضرورت ہے۔"
شوہر (جھلا کر) "تو پھر عمران میرا بھائی ہے یا تم؟"

مرسلہ: ناصر عامر

● ایک انگریز اپنی شہریت کے کاغذات کی کارروائی مکمل کرنے کے لیے عدالت میں پہنچا۔ جج نے پوچھا،

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"کون میں؟"

"ہاں تم۔"

"ڈیلیسی اسٹریٹ میں۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"کون میں؟"

"ہاں تم۔"

"میں درزی ہوں۔"

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"کس کی، میری؟"

"نہیں، میری۔" جج نے چڑ کر کہا۔

"جج صاحب، میرے خیال میں آپ کی عمر پچاس پچپن کے درمیان ہو گی۔"

● ایک مقدمے کے دوران دو وکیلوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ ایک بولا، "اس دنیا میں تم جیسا بے وقوف اور کوئی نہیں ہو گا۔" دوسرے نے طیش میں آکر جواب دیا، "تم سے زیادہ بدتمیز اور گھٹیا انسان کوئی اور نہیں ہو گا۔" جج نے فوراً کہا، "آرڈر، آرڈر، تمہیں احساس نہیں کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔"

مرسلہ: تسلیم فاطمہ

● یہ قصہ اُن دنوں کا ہے جب برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ بہت سے انگریز افسر ہندوستان میں رہا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک انگریز نے اپنے دوست سے پوچھا،

"میں کیا کروں، میرا ہندوستانی ملازم انگریزی نہیں جانتا۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ "دروازہ کھولو" یا "بند کرو" مگر وہ بیوقوفوں کی طرح دیکھتا رہتا ہے۔"

اس کے دوست نے کچھ سوچ کر کہا، "یہ تو بہت آسان ہے۔ اگر دروازہ بند کروانا ہو تو کہا کرو:

THERE WAS A BANKER

اور کھلوانا ہو تو یوں کہو: COLD DAY

مرسلہ: احمد افضال

● لڑکا: (فقیر سے) "تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟"
فقیر: "تاکہ سخی اور کنجوس کا پتا چل سکے۔"

● بچہ: (دکان دار سے) "اس پنسل کی کیا قیمت ہے؟"
دکان دار: "کون سی؟"
بچہ: "پچاس آنے والی۔"

مرسلہ: آسیہ نائلہ

●

منوّرہ نوری خلیق

(قرآنی کہانی)

حضرت ایوب علیہ السلام

(سلسلہ کے لیے پیام تعلیم کا جنوری ۸۷ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں)

دوسرے دن حضرت رحمت بنت افرائیم محنت مزدوری کے لیے گھر سے نکلیں تو ان کے لیے کوئی دروازہ نہ کھلا نہ کسی نے ان کی آواز سنی نہ ضرورت کو محسوس کیا اور یہ دن اللہ کے اس جلیل القدر بندے اور اس کی وفادار بیوی نے فاقے سے گزارا اور اپنے تین خاص شاگردوں کا انتظار کرتے رہے۔ یہ وہی تین شاگرد تھے جنھوں نے بچپن سے جوانی تک اسی در سے کھایا تھا۔ علم بھی حاصل کیا تھا اور پرورش بھی اب وہ دوسرے تیسرے دن صرف رسمی عیادت کے لیے آتے تھے۔ اب بھی آئے تو حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا: "تم ہمیں کسی دور دراز کے علاقے میں چھوڑ آؤ"

"لیکن کوئی بھی آپ کو جگہ نہ دے گا"۔ ان شاگردوں نے ایسے جواب دیا جیسے ان کی مدد کرنے سے گریز کر رہے ہوں۔ یہ انداز محسوس کر کے حضرت ایوب علیہ السلام چونک گئے اور بولے۔

"خدا کی قسم میں نے تم سے مدد نہیں مانگی اور نہ میں انسانوں سے مانگ کر شرک کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو اپنے خدا سے ہی امیدیں رکھتا ہوں بس تم سے اتنا چاہتا ہوں کہ میں پیروں میں زخموں کے سبب کھڑا نہیں ہو سکتا۔ مجھے انسانوں سے دور کسی ویرانے میں ڈال آؤ۔ کیا تم یہ احسان نہیں کر سکتے؟"

ان تینوں نے یہ بات سنی، انھیں ایک ٹاٹ میں لپیٹا، پھر دونوں جانب سے پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ اس وقت رحمت بنت افرائیم ضرورت کی چند چیزیں اور کپڑوں کی ایک پوٹلی لیے ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ اس طرح علاقۂ عوص کا عظیم سردار، صاحب علم انسان، خدا کی عبادت کرنے اور انسانوں کی ہر ضرورت پوری کر دینے والا رئیس، اپنے ہی علاقے سے ذلیل و خوار اور مایوس ہو کر نکال دیا گیا۔ جس وقت ان کے تین شاگردوں نے انھیں اس علاقے سے نکالا تو یہاں کے لوگ خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ مدتوں کی مصیبت ختم ہوئی۔ اب وہ جہاں بھی جائیں انھیں اس بات سے غرض نہ تھی، بس وہ خوش تھے کہ انھیں نجات مل گئی۔

ان کے تینوں شاگرد انھیں ایک نئے علاقے میں لے آئے جس سے کچھ فاصلے پر بہت سے مسلمان اور کافروں کے کچھ گھرانے آباد تھے۔ وہاں پر انھوں نے ایک گھنے درخت کے سائے میں انھیں ڈال دیا اور آخری سلام کر کے چلے گئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نئی جگہ آئے تو مرض اور بھوک کا مسئلہ یہاں پرانی جگہ سے زیادہ اہم تھا۔ ایک کمزور سی عورت ان کے ساتھ تھیں اور وہ خود سر سے پیر تک زخموں میں مبتلا۔ بھوک نے اپنی اہمیت واضح کی تو رحمت بنت افرائیم آبادی کی طرف روانہ ہو گئیں اور حضرت ایوب علیہ السلام آنکھیں بند کر کے اپنے رب کی تسبیح کرنے لگے۔ اس دن ایک مرتبہ پھر شیطان نے انھیں ورغلانا چاہا۔ اچانک ہی محسوس ہوا کہ کوئی ان کے نزدیک آیا ہے۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ وہی تھا جو ان کے علاقے میں امیر رہا، کبھی کبھی عیادت کے لیے آتا تھا۔ اس نے کہا: "علاقہ عوص کے سردار! تم اس حالت میں کیسے آ گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ تمھاری قوم نے تمھیں نکال دیا ہے۔ تمھیں مفلس پا کر آنکھیں پھیر لیں۔ کیا میں تمھاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

اس پیشکش کو سن کر انھوں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ اے خدا! مجھے انسانوں کی مدد اور ہمدردی سے بچا! ۔۔۔ پھر سے بولے: "میرے اجنبی دوست! مجھے تمھاری نہیں بلکہ اسی قادر مطلق کی مدد کی ضرورت ہے جو سب کا مالک ہے۔ یہ درست ہے کہ مجھے مفلسی اور مرض نے گھیر لیا۔ میرے سر سے پیروں تک جلتے ہوئے پھوڑے ہو گئے۔ میرا جسم کیڑوں کی غذا بن گیا لیکن خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ میری زبان خدا کی حمد و ثنا کے لیے موجود ہے۔ بے شک دائمی عزت و سرداری اسی کے لیے ہے۔ انسان کے لیے وہی بہت ہے، جو وہ عطا فرما دے۔"

اجنبی یہ بات سنتے ہی غائب ہو گیا اور سامان کی وہ تھیلی جو اُن کی بیوی علاقے سے ساتھ لائی تھیں اسے بھی لیتا گیا۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام دیر تک توبہ و استغفار کرتے رہے اور دعا کرنے لگے: "اے خدا! مجھے شیطان کے شر سے بچانا۔ بے شک برائی کی ہر طاقت سے بچانے والا تو ہی ہے۔"

چند گھنٹے وہ تنہا لیٹے خدا کی حمد و ثنا کرتے رہے اس کے بعد رحمت بنت افرائیم واپس آ گئیں۔ متعدد گھروں میں جانے کے بعد انھیں ایک گھر میں مستقل کام مل گیا تھا۔ اب وہ صبح کو جاتیں اس گھر کے سارے کام کرتیں اور جو روٹی ملتی لا کر انھیں کھلا دیتیں۔ انھوں نے خود ہی محنت سے ایک جھونپڑی بنا لی تھی اور

شوہر کی خدمت کر کے مطمئن ہو چکی تھیں لیکن خود ان کی حالت دن رات مزدوری اور ان کی خدمت کرنے سے کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ شروع میں انھیں سہارا دے کر بٹھا تیں لیکن اب ہاتھوں میں جان نہ رہی تو اپنی دراز چوٹیاں ان کے ہاتھ میں تھما دیتیں جن کا سہارا لے کر وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹ جاتے۔

شیطان ان دونوں کی اس قناعت کو گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اس کی دیرینہ تمنا تھی کہ یہ انسان جو اپنے رب کا اس وجہ سے شکر ادا کرتا ہے کسی طرح شکوہ و شکایت زبان پر ضرور لائے۔ شیطان انھیں مایوس کرنے کے ہر طریقے آزما تا گیا لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس آنے اور انھیں بہکانے میں کامیاب نہ ہوا تو ایک نیا انداز سوچا۔

ایک دن رحمت بنت افرائیم مزدوری کے لیے گئیں تو انھوں نے کسی سے سنا کہ وہاں کوئی نیا طبیب آیا ہے جو ہر مرض کا علاج کر سکتا ہے۔ اس خبر نے انھیں بے قرار کر دیا۔ اس دن کام کر کے اس طبیب کا پتا لے کر وہ وہاں پہنچیں۔ اس سے ملیں۔ اپنے شوہر کی طویل علالت، مجبوری و معذوری کا مفصل حال بیان کیا جسے اس نے بہ غور سنا اور بولا۔

"خاتون! تمھارے شوہر کا مرض لاعلاج نہیں ہے۔ بس دو خاص دوائیں ہیں۔ ایک کھانے کی اور ایک پینے کی۔ اگر وہ انھیں استعمال کر لیں تو چند گھنٹوں کے اندر اندر زخم درست ہو کر وہی پرانی توانائی بحال ہو جائے گی۔"

یہ سن کر رحمت بنت افرائیم بڑی پُرامید ہوئیں۔ بولیں: "وہ دوائیں کہاں سے ملیں گی۔ میں ہر قیمت پر انھیں حاصل کروں گی۔"

طبیب نے کہا: "کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ دوائیں ہمارے پاس ہیں۔"

اس کے بعد اس نے انھیں کچھ گوشت اور ایک بھرا ہوا پیالہ دیا کہ انھیں پلا دیں اور وہ یہ دونوں چیزیں لے کر لوٹ آئیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ طبیب نے انھیں بتا دیا تھا کہ یہ خنزیر کا گوشت اور شراب ہے۔

اس دن وہ واپس آئیں تو حسبِ دستور حضرت ایوب علیہ السلام ان کے منتظر تھے۔ انھوں نے طبیب کی تعریف کرتے ہوئے یہ دونوں چیزیں ان کے سامنے رکھ دیں اور بولیں: "اس قابل طبیب کا دعویٰ ہے کہ اگر آپ یہ دونوں چیزیں استعمال کر لیں تو چند گھنٹوں کے اندر اندر تندرست ہو جائیں گے۔"

حضرت ایوب علیہ السلام نے ان دونوں چیزوں کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر تاسف سے بولے۔

"نادان عورت! وہ طبیب یا حاذق نہیں شیطان تھا جو تمہارے ذریعے حرام اشیاء کھلا کر میرا ایمان خراب کرنا چاہتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ جب وہ مرد پر قابو نہیں پا سکتا تو اسے زیر کرنے کے لیے عورت کو وسیلہ بناتا ہے اور خوب سن لو کہ میں خدا کی منشا و مرضی کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قبل مر جانا پسند کرتا ہوں۔"

اس وقت رحمت بنت افرائیم رونے لگیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ خدا کی رضا و خوشنودی تو انھیں بھی سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اس وقت وہ توبہ کرنے لگیں۔ یوں شیطان کا یہ وار بھی خالی گیا اور وہ دونوں میاں بیوی اپنی حالت پر قانع پھر سے صبر و شکر کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ اب شیطان نے اپنی اس ناکامی کے بعد ایک اور انداز اختیار کیا۔ وہ یہ کہ جہاں رحمت بنت افرائیم ملازمت کے لیے جاتیں، ان گھروں کی عورتوں کو ان سے بدظن کر کے ان کے دلوں کو وسوسوں سے بھر دیا۔

ایک دن کام کے لیے گئیں تو ان کی مالکن نے ان کا حساب کر کے دروازہ بند کر لیا اور چند دن کے اندر اندر علاقے کی عورتوں میں یہ بات کہی جانے لگی: "رحمت ایک خوبصورت عورت ہے۔ مرد اسے پسند کرتے ہیں۔"

اب تمام عورتیں انھیں خطرناک عورت تصور کر کے ٹالنے لگیں۔ ہاں کسی کا مرد اگر گھر نہ ہوتا تو ان سے چند کام کرا کے دو روٹی ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ اس طرح زندگی بڑی مشکل ہو گئی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انھیں کہیں کام ملا نہ روٹی۔ ایسے میں بیمار شوہر کی کمزوری کا احساس انھیں ستا رہا تھا۔ انھوں نے سوچا کیوں نہ گھروں میں آواز لگا کر وہ کام طلب کریں ورنہ ادھار مانگ لیں۔ اس خیال سے انھوں نے کئی دروازے کھٹکھٹائے لیکن جواب ملتا رہا۔ ایک گھر سے کسی عورت نے پوچھا: "کیا تم وہی عورت ہو جس کے بال بہت خوبصورت ہیں؟"

"خوبصورت نہیں ہیں، دراز ہیں۔ جنھیں پکڑ کر میرے شوہر بیٹھتے، اٹھتے ہیں۔" وہ بولیں۔

"میں یہ سب سننا نہیں چاہتی۔" عورت بولی۔ "بس تو مجھے اپنی چوٹی کاٹ کر دے دے میں تجھے کھانا دے دوں گی۔"

اس فرمائش پر رحمت بنت افرائیم سکتے کے سے عالم میں رہ گئیں۔ عورت نے انھیں متذبذب دیکھا تو بولی: "بال دے کر اپنے شوہر کے لیے کھانا لے لے ورنہ اپنا راستہ ناپ میرا وقت ضائع مت کر۔"

پھر شوہر کی بھوک اور کمزوری کا خیال غالب آ گیا اور وہ اپنے بال کاٹ کر دینے پر مجبور ہو گئیں۔

ادھر یہ واقعہ پیش آیا ادھر حضرت ایوب علیہ السلام اپنی بیوی کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے کہ اپنے نزدیک قدموں کی چاپ محسوس کر کے چونک گئے۔ انھیں محسوس ہوا کہ دو اجنبی گفتگو کرتے ہوئے

ادھر سے گزرے۔ ان میں ایک نے دوسرے سے کہا: "میں نے سنا ہے کہ اس گاؤں میں ایک عورت سب کے گھروں میں کام کر کے روزی کماتی ہے۔ آج کسی عورت نے اسے اپنے شوہر کے ساتھ برائی کرتے پا کر اس کی چوٹی کاٹ دی ہے۔"

"اچھا کیا۔ ایسی عورتوں کی یہی سزا ہے۔" دوسرے نے کہا۔

یہ سن کر حضرت ایوب علیہ السلام متوحش سے ہو گئے۔ گھروں میں مزدوری کر کے روزی تو ان کی بیوی بھی کماتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ بے چینی سے اُن کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ غم و غصے اور مایوسی نے ان کا سکون غارت کر دیا تھا۔ وہ واپس آئیں تو بولیں: "آج مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

اس وقت حضرت ایوبؑ کا ذہن بدگمان ہو رہا تھا۔ جوں ہی وہ کھانا رکھنے کے لیے ان کے نزدیک جھکیں انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ان کی اوڑھنی کھینچ لی تب وہ بال جو انھیں بہت پسند تھے اور ان کا سہارا تھے۔ ایک دم سے بکھر گئے۔ اس وقت دونوں ہی غم زدہ تھے۔ رحمت بنتِ افرائیم اس لیے کہ وہ اپنی پاکی اور عظمت کا یقین نہیں دلا سکتی تھیں اور حضرت ایوبؑ اس لیے کہ پوری طرح سے بدگمان ہو چکے تھے۔ انھوں نے شدتِ غم و غصے سے کہا: "میں آج اپنے خدائے بزرگ و برتر کو گواہ بنا کر قسم کھاتا ہوں کہ اگر اس مرض سے شفا پا گیا تو اس بدکاری کے جرم میں تجھے سو کوڑے ماروں گا۔"

اس وقت رحمت بنتِ افرائیم نے انھیں اصل واقعہ بتا کر اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی لیکن وہ قسم کھا چکے تھے۔ اس رات دونوں اپنی اپنی جگہ دکھی دل لیے خدا کے حضور فریاد کرتے رہے اور دوسرے دن رحمت پھر اپنے کام پر چلی گئیں۔ اس دن کافی عرصہ بعد حضرت ایوب علیہ السلام کے شاگرد ادھر سے گزرے تو ان کو دیکھنے ٹھہر گئے اور ان کو سوتا ہوا سمجھ کر گفتگو کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا:

"یقیناً کوئی گناہ تو ایسا ہوا ہے جس کی پاداش میں خدا نے اس بیماری اور بربادی میں مبتلا کیا ہے۔ خدا بے گناہوں کے ساتھ تو ایسا نہیں کرتا۔"

اس وقت حضرت ایوب علیہ السلام کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔ یہ ان کی آزمائش کا اٹھارواں برس تھا۔ جب ہر قسم کی بربادی، بیماری، نقصان اور غموں سے گزرے تھے مگر انھوں نے خدا سے کبھی بھی گلہ نہ کیا تھا شکر ہی ادا کرتے تھے۔ اب بھی انھیں شکایت نہ ہوئی۔ ان کے شاگرد تو یہ گفتگو کرتے ہوئے چل دیے لیکن وہ خود بے تاب ہو کر رو دیے اور اسی لمحہ خدا کی رحمت کو جوش آ گیا اور ایک طویل آزمائش کے بعد اس نے انھیں بلند ترین منصب عطا فرمانے کا فیصلہ کیا۔ اسی دن پہلی بار فرشتہ ان کے پاس آیا اور کہا: "خدا کا

حکم ہے کہ اپنے پیر کو زمین پر مارو۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے بمشکل تمام اپنے پیر سے زمین پر ہلکی سی ضرب لگائی تو پانی نکلنے لگا۔

فرشتے نے کہا: خدا کا حکم ہے کہ اس پانی سے غسل کرو اور اسی کو پیو۔

پھر تعمیلِ حکم کی تو ان میں توانائی آتی چلی گئی، مرض اور کمزوری سب ختم ہو گئے اور شدید آزمائش سے گزارنے کے بعد اللہ نے انھیں نبوت عطا فرمائی اور پہلے سے بہت زیادہ دولت اور اولاد عطا فرمائی۔ سب وہ اپنے علاقے کے سردار بھی تھے اور نبی بھی۔

قرآن پاک میں ان کے بارے میں ہے:

اور ایوب کو یاد کرو جب انھوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ مجھے اذیت ہو رہی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والوں میں سے ہے تب ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور جو انھیں تکلیف تھی دور کر دی پھر انھیں بال بچے بھی عطا فرمائے اور اپنی مہربانی سے ان کے ساتھ اتنے ہی اور بخشے۔ (سورۂ انبیاء آیت نمبر ۸۴)

حضرت ایوب علیہ السلام نے ایک سو چالیس برس کی عمر پائی۔ اپنی چار نسلیں دیکھیں۔ انھیں اپنی مصیبت کے وقت کام آنے والی بیوی بہت عزیز تھیں۔ اللہ نے ان دونوں کو ان کے صبر و شکر کے بدلے میں حد درجہ نعمتیں بخشیں۔ وہ جب تک زندہ رہے علاقے کے لوگوں کو خدا کی عبادت کا درس دیتے رہے۔ انھوں نے حالتِ مرض میں جو قسم کھائی تھی اس کو پوری کرنے کے بارے میں قرآن پاک میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔

(ہم نے اس سے کہا) تنکوں کا ایک مٹھا (جھاڑو) لے کر اس کے مار دے اور اپنی قسم نہ توڑ (سورہ ص آیت ۴۴)

اس طرح ان کی آزمائش کا زمانہ گزرا تو ان کا خاندان، علاقہ اور ان کے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور مدتوں ہدایت پاتے رہے۔





پاؤں سن ہو جاتے ہیں

س : زمین پر بیٹھنے سے دونوں پاؤں عموماً سو جاتے ہیں، وجہ اور پرہیز بتائیں۔

عبدالعلیم قمر دیرم

ج : انسان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں خون دورہ نہ کرتا ہو، خون کے اس دوران پر زندگی کا انحصار ہے۔ یہ خون حیات بخش ہے۔ یہ ہر حصۂ جسم اور ہر عضو کی زندگی کا سامان کرتا ہے۔ جب ہم زمین پر بیٹھتے ہیں تو اس طرح بیٹھنے سے گوشت دبتا ہے، خون کا دوران عارضی طور پر رکتا ہے۔ پھر وہاں جو اعصاب (پٹھے، نروز) ہوتے ہیں وہ بھی دبتے ہیں اور ان تک خون پوری روانی سے نہیں پہنچتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عارضی طور پر سُن ہو جاتے ہیں۔ یہ سُن ہونا بعض اوقات جسم میں حیاتین ب کی کمی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

پیدائشی کھانسی

س : میری چھوٹی بہن جس کی عمر ڈھائی سال ہے۔ اس کو پیدائشی کھانسی ہے، بہت علاج کروایا لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا، براہ کرم آپ ہی کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ عابد علی

ج : ننھی بہن کو آپ صرف لعوق سپستاں دیجیے۔ ۴ گرام یہ لعوق گرم پانی یا نیم گرم عرق گاؤزبان ۳۶ گرام میں گھول کر صبح، شام اور رات کو دیجیے ان شاء اللہ اس سے فائدہ ہوگا۔

منھ سے بُو آتی ہے

س : میری سہیلی جو تقریباً ۱۴ سال کی ہے وہ روزانہ باقاعدگی سے دانت صاف کرتی ہے مگر اس کے منھ سے بو آتی ہے۔ ڈاکٹر خون کی خرابی بتاتے ہیں۔ علاج بھی ہو رہا ہے مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ ازراہ کرم کوئی علاج تجویز فرمایئے۔ فرناز اختر

ج : ہو سکتا ہے کہ آپ کی سہیلی صاحبہ کا معدہ خراب ہو یا اُن کو قبض رہتا ہو۔ ہضم کی خرابی اور آنتوں میں فضلات کا جمع رہنا بھی منہ میں بدبُو پیدا کر دیتا ہے۔ ان کو زیادہ سے زیادہ پانی پی کر اپنا قبض رفع کرنا چاہیے۔ یہ تازہ صاف پانی معدہ آنتوں اور گردوں کو غسل دے کر صاف کرتا رہتا ہے۔

شرم اور جھجک

س: میں کسی کے سامنے بولتے ہوئے جھجکتا ہوں۔ کلاس میں اگر ٹیچر کوئی سوال پوچھ لیں تو میں جواب نہیں دے پاتا حالانکہ مجھے یاد ہوتا ہے، جسے میں لکھ بھی سکتا ہوں مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا اور اگر کسی بڑے آدمی کے سامنے یا کسی دفتر میں جاؤں تو دل دھڑکنے لگتا ہے جبکہ میں دوستوں کے سامنے تقریر بھی کر سکتا ہوں، مگر اسٹیج یا مجمع کے سامنے ساری باتیں بھول جاتا ہوں، کوئی علاج بتائیے کہ میں اپنی اِس کمزوری پر قابو پالوں۔

محمد ہمایوں ظفر

ج: یہ اکثر انسانوں کی کمزوری ہوتی ہے۔ بہت سے انسان ایسے ہیں کہ اپنے میں خود اعتمادی پیدا کر لیتے ہیں اور یہ خود اعتمادی اُن کو بے جھجک بنا دیتی ہے۔ پھر اُن کا دل دھڑکتا ہے اور نہ وہ بھولتے ہیں، ہاں جو لوگ خود پر اعتماد پیدا نہیں کر سکتے وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ مگر یہ خود اعتمادی ایسے ہی پیدا نہیں ہو جاتی۔ اُس کے لیے تعلیم سے آراستہ ہونا پڑتا ہے۔ خود کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ معلومات کا حامل بنانا پڑتا ہے۔ آپ ذرا محنت کر کے دیکھیے۔ پختہ ارادہ کر لیجیے اور دو چار بار ہمت کر کے بولنا شروع کر دیجیے۔ آہستہ آہستہ آپ کی شرم نکل جائے گی اور آپ میں اعتماد آجائے گا۔

گلے میں درد

س: میرے گلے میں درد ہوتا ہے شدید درد ہوتا ہے، پہلے کم تھا اب زیادہ ہو گیا ہے

خورشید احمد،

ج : آپ کی اس تحریر سے بات واضح نہیں ہوتی۔ مناسب ہے کہ آپ اپنے شہر کے ہمدرد مطب میں جا کر وہاں طبیب صاحب سے مشورہ کر لیجیے اگر گلے کے غدود (ٹانسلز) بڑھ گئے ہیں تو برگِ بنفشہ کسی دواخانے سے خرید لیجیے۔ ۲ گرام برگ بنفشہ دو گلاس پانی میں جوش

دے کر چھان کر اس سے غرارے کرنا شروع کر دیجیے اِس سے فائدہ ہوگا۔

کم زور آنکھ

س : میں بچپن ہی سے بھینگے پن میں مبتلا ہوں اور مجھے سیدھی آنکھ سے صاف دکھائی نہیں دیتا آپ از راہ کرم اِس بارے میں مشورہ دیں۔ دل عزیز صدیقی

ج : آپ کو کسی اچھے ماہر چشم (آئی اسپشلسٹ) سے مشورہ کرنا چاہیے۔ بھینگے پن کا علاج اپریشن سے ممکن ہے۔

چہرے پر فالتو بال

س: میری عمر ۱۵ سال ہے۔ میرے چہرے اور پیشانی کے اُوپر بہت سے فالتو بال موجود ہیں' یہ بال داڑھی کے بالوں کے علاوہ ہیں' برائے مہربانی مجھے اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ بتادیجیے۔ سید مبین الدین

ج : سید صاحب ان بالوں سے چھٹکارا ممکن نہیں ہوگا۔ آپ ان کو برداشت کر لیجیے۔

آنکھ نہیں کھلتی

س : میری عمر ۱۴ سال ہے' مجھے نیند بہت آتی ہے رات کو جلدی بھی سوؤں تو بھی صبح نو' دس بجے آنکھ کھلتی ہے اور دوسرا چاہے کتنا ہی اُٹھائے میری آنکھ نہیں کھلتی' براہ کرم اس سلسلے میں میری مدد فرمایئے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ سید محمد عدنان موسیٰ

ج: انسان جتنا زیادہ سوئے نیند اتنی ہی زیادہ آتی ہے' کیوں کہ نیند کی زیادتی اور آرام سے سوئے پڑے رہنا کاہلی ہے اور کاہلی کے معنی یہ ہیں کہ جسم کا نظام بھی سوگیا ہے۔ دماغ سوگیا ہے' جسم کے وہ غدود بھی سو گئے' جن کی رطوبتیں نکل کر اور خون میں مل کر عزائم کو جواں رکھتی ہیں' آپ "حرکت میں برکت" کے مقولے کو کبھی فراموش نہ کریں۔

چہرے پر مہاسے

س : میری عمر بیس سال ہے گرمیوں میں میرے چہرے پر مہاسے نکلے تھے۔ اب وہاں پر گڑھے پڑ گئے ہیں اور میرا رنگ بھی کافی سانولا ہوگیا ہے مہربانی فرما کر کوئی مشورہ دیں کہ میرا مسئلہ حل ہوجائے۔ سید ذاکر حسین

ج : اگر مہاسوں کو نوچا جاتا ہے تو چہرے کی نازک جلد پر گہرائیاں پڑ سکتی ہیں اور شاید اُن کا دُور کرنا اب ممکن نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ چہرے پر کسی اچھی کریم سے مرتب مالش سے کوئی فائدہ نظر آجائے ایسا کر کے دیکھ لینے میں حرج نہیں ہے۔

شہد بھی مفید، ڈنک بھی مفید

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شہد میں انسانوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ علمی تحقیق کرنے والوں نے جہاں شہد پر خوب غور و خوض کیا اور اس کی خوبیوں کا پتا چلایا ہے وہاں انھوں نے شہد کی مکھی کی زندگی کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شہد کی مکھی ڈنک مارتی ہے اور اکثر لوگوں کو اس کے زہر سے نہ صرف شدید تکلیف ہوتی ہے بلکہ موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ سائنس داں اس کھوج میں ہیں کہ اس کے زہر سے جسم میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ برطانوی سائنس دانوں نے پتا لگایا ہے کہ شہد کی مکھی کے زہر سے ایسی دوائیں بننے لگیں گی جن سے انفلوئنزا اور گٹھیا جیسے تکلیف دہ مرض کا علاج ممکن ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ اس کا زہر پہلے بھی گٹھیا کے لیے مفید سمجھا جاتا تھا۔ اب برطانیہ کے سائنس دانوں نے جسم پر اس کے اثر کا پتا لگایا ہے اور انھوں نے بھی اعلان کیا ہے کہ اس کے زہر کے انجکشن دوسری دواؤں سے کہیں بہتر ثابت ہوں گے۔ گویا شہد کے علاوہ اس کی مکھی کے زہر میں بھی انسانوں کے لیے صحت موجود ہے۔

سنترے کا تیل چیونٹیوں کا قاتل ہے۔

بعض اتفاقات نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ جارجیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر گریگ ٹیلر ڈنے بھی اتفاقاً یہ دریافت کیا کہ سنترے کے چھلکے کا تیل یا نچوڑ چیونٹیوں کے لیے زہر ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے گرہیں کی چکنائی دور کرنے کے لیے ایک دوا بنائی تھی جس میں سنترے کا تیل بھی شامل تھا۔ اس دوا کے چیونٹیوں کے بِل پر گرنے سے تمام چیونٹیاں مر گئیں۔ اس طرح اس تیل میں کیڑے مارنے (کرم کشی) کی صلاحیت معلوم ہوئی۔ اس کی روشنی میں انھوں نے یہ دریافت کیا کہ سنترے، لیمو اور انگور کے چھلکے سے نکلنے والا تیل کیڑے کے حق میں مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اور اس سے دیگر دواؤں کے برخلاف انسانوں اور ریڑھ والے جانوروں کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچتا محض اس کی بھاپ اور بو بھی کافی ہوتی ہے۔ انھیں یقین ہے کہ اس قدرتی کرم کش دوا کے ذریعہ سے انسانوں اور جانوروں کو کیڑے مکوڑوں سے نجات مل جائے گی۔ اس کے علاوہ غذاؤں کی حفاظت بھی زیادہ اچھی طرح ہو سکے گی۔ سنترے، لیمو اور انگور کی کاشت کرنے والے ملکوں میں اس تیل کا حصول بہت آسان ہے۔ اس طرح ہندستان سمیت ایسے کئی ملک ایک محفوظ، مؤثر اور سستی کیڑے مار دوا تیار کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

عجیب عجیب باتیں



بونا اور چھڑ

چین کے مشہور بونے چیہ مہ کا قد صرف ۲۸۔ انچ تھا، لیکن وہ اتنا کھیلنے کی جو ک چھڑ استعمال کرتا تھا وہ ۱۲ فیٹ لمبی تھی۔

چلتی پھرتی لائبریری

۹۳۸ء سے ۹۹۵ء کے دوران ایران کا وزیر اعظم قاسم اسمٰعیل تھا۔ لوگ اسے عام طور پر "صاحب" کہتے تھے۔ وہ مطالعہ کا بہت شوقین تھا۔ اس کے اپنے کتب خانے میں ۱۷۰۰۰ کتابیں تھیں۔ اُسے انتظامی کاموں یا اپنے ملک کی فوجوں کی کمان کرنے کے لیے اکثر طویل سفر کرنے پڑتے۔ وہ جب بھی کسی سفر پر روانہ ہوتا تو چار سو اونٹوں پر اپنی تمام کتابیں لاد کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ ان اونٹوں کو یہ تربیت دی گئی تھی کہ وہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے سفر کرتے، یعنی جس اونٹ پر ایسی کتابیں لدی ہوتیں جن کے نام 'الف' سے شروع ہوتے ہوں، وہ سب سے آگے ہوتا، اس کے پیچھے وہ اونٹ ہوتا جس پر ایسی کتابیں ہوتیں جن کے نام 'ب' سے شروع ہوتے، اور اسی طرح۔ ان اونٹوں کے نگران بڑے اچھے لائبریرین تھے۔ "صاحب" کو جس کتاب کی ضرورت ہوتی وہ ذرا سی دیر میں یہ کتاب نکال کر اُس کے سامنے پیش کر دیتے۔



آسمانی بجلی اور گرجا گھر

اسپین میں ایک گرجا گھر ایسا بھی ہے جو صرف بجلی گرنے کی وجہ سے گرجا گھر بنا ہے ورنہ پہلے یہ صرف شہر کی فصیل کا ایک مینار تھا۔ ۱۲ویں صدی میں اس پر بجلی گری تو مینار کے اوپر کا حصّہ ٹوٹ گیا اور ایسی شکل بن گئی جیسے کوئی آدمی بیٹھا ہو۔ مقامی لوگوں نے جب صبح اس مینار کو دیکھا تو انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے آدمی کی جو شکل بنی ہے وہ شاہ الفانسو کی شکل ہے۔ اس زمانے میں اسپین میں اسی کی حکومت تھی۔ لوگوں نے بادشاہ سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے بھی آکر دیکھا تو یہی کہا کہ یہ شکل اُسی کی ہے، چناں چہ اُس نے اس مینار کو گرجا بنا دیا۔

عجیب درخت

ہالینڈ کا یہ درخت قدرتی طور پر اس طرح بڑھا ہے کہ اس کے تنے کا ایک حصّہ جیکوبس وان ہیرین نامی ایک شخص کی صورت کا نظر آتا ہے۔ اسی شخص نے یہ پودا لگایا تھا۔



ناچنے والا چانسلر

سر کرسٹوفر ہیٹن ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۹۱ء تک زندہ رہے۔ انھیں لندن کا لارڈ چانسلر بنایا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی بہت بڑے قانون داں تھے، بلکہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ بہت عمدہ ناچتے تھے۔

چور جادوگر



ترجمہ: حمیرا فاطمہ

ڈیم راؤنڈی ایک بہادر بوڑھی عورت تھی وہ بابرکت اور خوش قسمتی والے موزے لال، ہرے، نیلے پیلے، نارنجی اور بھورے رنگوں میں بناتی تھی۔ جو کوئی اس کے موزے پہنتا، اس کا پورا دن خوشگوار گزرتا تھا اس لیے اس کے یہ موزے زیادہ تعداد میں فروخت ہوتے تھے۔ اس کے گھر کے سامنے لڑکوں اور بچوں کی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ وہ یہ موزے خریدنے آتے تھے مگر ڈیم راؤنڈی یہ موزے ساحروں اور جادوگرنیوں کو کبھی نہیں دیتی تھی۔ وہ کہتی تھی: "مجھے جادوگروں پر بھروسا نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے موزے وہ پہنیں۔"

اسی وجہ سے جادوگر شیکی، جو قریب ہی رہتا تھا، جب بھی موزے لینے آتا اسے مایوس ہو کر لوٹنا پڑتا تھا حالانکہ وہ کوئی برا جادوگر نہیں تھا بلکہ دوسروں کی طرح وہ بھی فیاض اور رحم دل تھا البتہ اس کی مونچھیں بڑی اور کالی تھیں۔

ایک دن اسے "بابرکت موزوں" کی شدید ضرورت محسوس ہوئی، اس لیے کہ وہ بہت دنوں سے ہر روز کسی نہ کسی بدقسمتی کا شکار بنتا چلا آ رہا تھا۔ وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا، خراب ہو جاتا۔ کسی دن چمنی خراب ہو جاتی تو کبھی جمعدار چھٹی کر لیتا۔ ان واقعات کے علاوہ ایک دن اتنے زور سے ٹھوکر لگی کہ وہ گر پڑا اور اسے گھٹنے میں بہت زور کی چوٹ آئی، پھر اسے شدید نزلہ بھی ہو گیا۔

"مجھے خوش قسمتی کی ضرورت ہے!" شیگی نے اپنے آپ سے کہا: "مجھے ڈیم راؤنڈی کے پاس جانا چاہیے اور اس سے وہ بابرکت موزے لینے چاہئیں۔ اگر اس نے مجھے موزے دینے سے انکار کیا تو دوسرا طریقہ اپناؤں گا۔"

وہ موزے لینے کے لیے پہنچا تو ڈیم راؤنڈی نے کہا: "شیگی! تم میرے اصول جانتے ہو۔ میں تمھیں موزے نہیں دوں گی کیوں کہ تم جادوگر ہو!"

یہ سن کر شیگی اپنے گھر واپس آ گیا اور جب رات ہوئی تو وہ دوبارہ ڈیم راؤنڈی کے گھر پہنچا اور چپکے سے جائزہ لینے لگا کہ وہ سو رہی ہے یا نہیں؟ اس کے خراٹوں کی آواز نے شیگی کو بتا دیا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔

شیگی کو وہ جگہ معلوم تھی جہاں بابرکت موزے رکھے ہوئے تھے۔ ڈیم راؤنڈی کے پاس ایک لال ڈبا تھا جس میں وہ موزے تیار کر کے ڈال دیتی تھی۔

شیگی باورچی خانے کی کھڑکی سے اندر گیا کیا کہ وہ کھڑکی بند نہیں تھی۔ جلدی سے اس نے لال ڈبا کھولا تو اس میں بہت سارے موزے رکھے تھے۔ اس نے اتنے موزے نکالے جتنے وہ اٹھا سکتا تھا۔ اسے تو ایک جوڑے کی ضرورت تھی مگر اس نے سوچا کہ باقی موزے میں دوسرے جادوگروں کو بیچ دوں گا جو ہمیشہ ان موزوں کے آرزومند رہتے ہیں۔ اس نے ڈبا بند کیا اور پھر کھڑکی سے نکل کر اسے بند کر کے تیز تیز قدموں سے جنگل کی طرف چل دیا۔

"واہ! میرے پاس اتنے سارے موزے ہیں۔ اب مجھے خوش قسمتی مل جائے گی۔" اس نے سوچا مگر جب وہ گھر پہنچا تو یہ سوچ کر بہت پریشان ہوا کہ اگر بڑھیا کو پتا چل گیا کہ میں نے اس کے موزے چرائے ہیں تو وہ پولیس کو اطلاع دے دے گی اور پولیس میرے گھر کی تلاشی لے کر سب موزے برآمد کر لے گی چنانچہ اسے موزے پہننے کی جرأت ہی نہیں ہوئی کیوں کہ وہ موزے پہنتا تو کوئی نہ کوئی ضرور دیکھ لیتا اور ڈیم راؤنڈی کو بتا دیتا۔

"میں اتنا بہادر نہیں جتنا میں نے سوچا تھا۔" اس نے اپنے آپ سے کہا: "مجھے اب موزوں کو کسی ایسی جگہ چھپانا پڑے گا جس کا کسی کو پتا نہ چل سکے۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔" اس کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا: "یہ سارے موزے ایسے درختوں کے پتوں میں چھپائے جا سکتے ہیں جن کے رنگ موزوں

سے ملتے جلتے ہوں۔"

چنانچہ شیگی نے جنگل میں جا کر تمام موزے مختلف درختوں پر اس طرح لٹکا دیے جیسے وہ انہی درختوں کے پتے ہوں۔ اس طرح شیگی کو اطمینان ہو گیا کہ اب کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا وہ گھر جا کر آرام سے اپنے بستر پر سو گیا۔

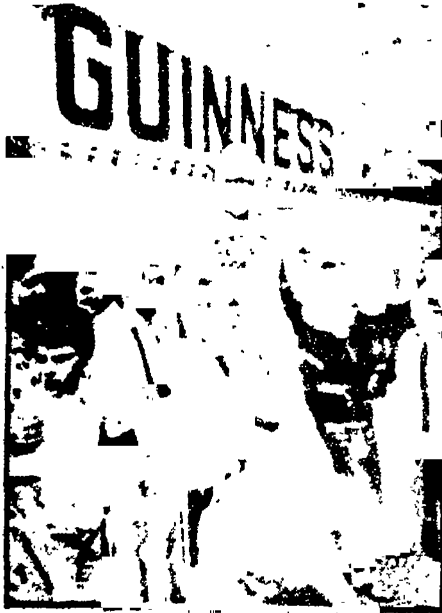
صبح کو ڈیم راؤنڈی کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اس کے موزے چوری ہو گئے ہیں۔ اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے پولیس مین برلی کو چوری کا واقعہ بتاتے ہوئے کہا: "یہ جادوگر شیگی ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ وہ کل میرے پاس چند موزے خریدنے آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھ کر بات آگے چلاؤ۔"

جب برلی شیگی جادوگر کے گھر جانے لگا تو راستے میں اسے ایک پیلا موزہ پڑا ہوا ملا۔ اسے یقین ہو گیا کہ موزے شیگی کے پاس ہی ہیں اور شیگی نے انھیں کہیں چھپا دیا ہے۔

برلی کو دیکھ کر شیگی کو بہت تعجب ہوا اور اس نے چوری کے الزام سے بچنے کے لیے جھوٹے واقعات سناتے ہوئے کہا: "نہیں، میں نے موزے نہیں چرائے۔ میں تو رات باہر ہی نہیں نکلا۔ میں بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ اگر یقین نہیں آتا تو تم دیکھ لو اور اچھی طرح میرے گھر کی تلاشی لے لو۔"

برلی نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر کوئی موزہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اسے شیگی کی بات پر یقین آ گیا اور وہ اس کے گھر سے چلا گیا تب شیگی نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا: "کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی میرے چھپائے ہوئے موزوں کا پتا نہیں چلا سکتی۔"

دُنیا کی سب سے طویل القامت خاتون



سینڈی ایلین کا قد اس کی ۲۶ ویں سالگرہ کے موقع پر سات فٹ ساڑھے سات انچ تھا۔ یہ تصویر اس کی سالگرہ کے موقع پر نیاگرہ میں کھینچی گئی۔ دعوت کا انتظام اس کے دوستوں نے کیا تھا۔



مکڑیوں کے جال کے باریک تاروں سے بنی ہوئی ایک ڈوری، فولاد کے تاروں سے بنی ہوئی اتنی ہی موٹی ڈوری کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔

یہ خزاں کا موسم تھا۔ ہوا کے اتنے تیز جھکڑ چلے کہ سارے درختوں کے بیشتر پتے جھڑ گئے۔ ہوا مزید تیز ہو گئی اور باقی پتے بھی شاخوں سے ٹوٹ کر زمین پر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

بہت سارے بونے بچے اسکول سے گھر جا رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ زمین پر ہر طرف پتے ہی پتے پڑے ہوئے ہیں۔

"سب درخت بے برگ (ننگے) ہو گئے ہیں" ایک بونے لڑکے نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ تب سب نے اوپر دیکھا۔

"مگر کچھ پتے ابھی درختوں کی شاخوں پر لٹکے ہوئے ہیں لیکن یہ تو عجیب و غریب پتے ہیں، بالکل موزوں کی طرح" دوسرا لڑکا بولا۔

"یہ تو ڈیم راؤنڈی کے موزے ہیں جو چوری ہو گئے تھے اور چور نے انھیں یہاں چھپا دیا تھا۔ جلدی کرو، آؤ برلی اور ڈیم راؤنڈی کو بتائیں" تیسرے نے کہا۔

*

بونے بھاگتے ہوئے پہلے برلی اور پھر ڈیم راؤنڈی کے پاس پہنچے۔ اِدھر شیگی نے آکر دیکھا کہ پتے درختوں سے نیچے گر گئے ہیں اور موزے اُن پر لٹک رہے ہیں۔ شیگی نے جلدی جلدی موزے درختوں سے اتارنا شروع کر دیے۔ ابھی وہ تمام موزے اتارنے بھی نہ پایا تھا کہ ڈیم راؤنڈی اور برلی وہاں پہنچ گئے۔

"تو تم ہو چور اور تم نے انھیں یہاں چھپایا تھا" برلی بولا۔

یہ دیکھ کر شیگی تھر تھر کانپنے لگا۔ "تم میرے ساتھ چلو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" برلی نے کہا۔

"اوہ! میں اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتا تھا اور موزے میں نے درختوں کی شاخوں میں چھپا دیے تھے" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"تم بالکل بے وقوف ہو، یہ تو پانچ سال کا بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم بھول گئے تھے کہ خزاں میں پتے جھڑ جاتے ہیں" ڈیم راؤنڈی نے کہا اور سارے موزے جمع کر لیے۔

"ہم اسے کیا سزا دیں؟" برلی نے پوچھا۔

"اسے میرے پاس بھیج دو تاکہ یہ برکت والے موزے بُننا سیکھ لے" ڈیم راؤنڈی نے ہنس کر کہا۔ "اس کے لیے یہ اچھا سبق ہوگا کہ مبارک موزے لوگوں کے لیے بُنے لیکن خود کبھی نہ پہن سکے۔"

اب شیگی موزے بُنتا ہے اور سخت محنت کرتا ہے۔ ڈیم راؤنڈی اس کی نگرانی کرتی ہے۔ اگر آپ کو یہ موزے چاہئیں تو آپ کا نیک دل انسان ہونا بہت ضروری ہے۔



سید شہاب الدین دسنوی

ثروت کا روزہ

رمضان کا مہینا تھا۔ گھر میں خالد، انور، آفتاب، سب روزے سے تھے۔ ایک دن چھوٹی ثروت جس کی عمر کوئی پانچ سال ہوگی، ضد کرنے لگی کہ میں بھی روزہ رکھوں گی۔ امّی، ابّا نے سمجھایا: "نہیں بیٹی، تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا روزہ رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ کچھ اور بڑی ہو جاؤ گی تب رکھنا۔" مگر ثروت کہاں ماننے والی تھی، دوسرے بچّوں نے بھی سفارش کی: "امّی! اسے رکھنے تو دیجیے۔"

پھر طے ہوا کہ ثروت بی بی ستائیسویں دن رمضان کا روزہ رکھیں گی۔"

اس روز صبح ہی سے گھر بھر میں اعلان ہو گیا کہ ثروت بی بی روزے سے ہیں، اس لیے دودھ نہیں پیئیں گی، ناشتا نہیں کھائیں گی۔ گھر میں جو آتا ثروت بی بی بڑے فخر کے ساتھ اس سے کہتیں: "آج میرا روزہ ہے۔" اور لوگ کہتے: "اتنی چھوٹی ہو کر تم نے روزہ رکھا! کمال کر دیا بٹیا تم نے! پھر تو ثروت بی بی کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہتا، باچھیں کھل جاتیں۔

دن گزرتا جا رہا تھا۔ ثروت کھیل کود میں کچھ ایسی مشغول رہیں کہ کھانے پینے کی یاد بھی نہ آئی۔ سہ پہر کے وقت خالد اور ثروت باہر سے کھیلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ سامنے الماری پر پلیٹ میں انگوروں کا ایک بڑا سا خوشا رکھا تھا۔ ثروت نے جھپٹ کر اس پر ہاتھ مارا اور دو چار انگور عڑاپ سے منہ میں ڈال لیے۔ یاد ہی نہ رہا کہ روزہ ہے۔ خالد نے دیکھ لیا۔ لگا شور مچانے: "ہائے ہے، ثروت کا روزہ ٹوٹ گیا!" ثروت رونے لگی۔ امّی دوڑی آئیں، بولیں: "کیا ہوا؟"

خالد نے کہا: "ثروت نے انگور کھا لیے، تو اب اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔"

امّی نے کہا: "نہیں بھئی، اس نے جان بوجھ کر تھوڑے ہی کھائے، غلطی سے کھا لیا۔ اللہ معاف کر دے گا۔ تم بھی بھول چوک سے اگر منہ میں کچھ ڈال لو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اور پھر

میری ثروت پہ تو روزے ابھی فرض بھی نہیں ہوئے ہیں۔"

خالد نے پوچھا: "امی، روزہ ٹوٹ کیسے جاتا ہے؟"

"اب یہ باتیں افطار کے بعد اطمینان سے سننا۔ اس وقت مجھے بہت سے کام ہیں۔"

شام کو مغرب کی اذان پر سبھوں نے روزہ افطار کیا، نماز پڑھی۔ ابّا جان چائے پینے بیٹھے تو خالد نے وہی سوال دُہرایا: "روزہ کیسے ٹوٹتا ہے؟"

ابّا جان نے بتایا: "کوئی آدمی روزہ رکھ کر جان بوجھ کر یعنی یہ جانتے ہوئے کہ وہ روزے سے ہے، کوئی چیز چکھنے یا پینے کے لیے منھ میں ڈال لے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ البتہ پانی جس کا مزہ نہیں ہوتا ہے کلّی کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ کسی حالت میں پانی کی ایک بوند بھی حلق سے نیچے نہ اترے۔"

خالد نے کہا: "کوئی آدمی بھول کر مُنھ میں کھانے یا پینے کی چیز ڈال لے اور دوسرا شخص اسے ٹوک دے تو کیا کرنا چاہیے؟"

ابّا جان نے کہا: "جو اس کے پیٹ میں یا حلق سے نیچے جا چکا، جو اس کے منھ میں ہے اسے فوراً تھوک کر کلّی کرلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ منھ بھر قے ہو جانے کی صورت میں بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔"

انور جو چپ چاپ بیٹھا تھا، بولا: "کیا یہ صحیح ہے کہ جھوٹ بولنے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟"

ابّا جان نے کہا: "جھوٹ بولنے، چغلی کرنے، گالی بکنے، واہیات کھیل تماشے میں وقت گزارنے میں، غصہ اور لڑائی جھگڑا کرنے سے روزہ ٹوٹتا تو نہیں لیکن مکروہ ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ایسے روزے کا ثواب بہت کچھ گھٹ جاتا ہے۔"

آفتاب نے کہا: "ابّا جان، ہم نے پچھلے سال پڑوس کے حکیم صاحب کو دیکھا تھا کہ رمضان میں کچھ دنوں کے لیے وہ مسجد ہی میں دن رات رہنے لگے تھے۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

ابّا جان نے بتایا: "اس کو "اِعتکاف" کرنا کہتے ہیں۔ رمضان کے آخری چند دنوں میں بعض لوگ دس اور بعض اس سے کم دنوں کے لیے کسی مسجد میں جا کر معتکف ہو جاتے ہیں۔ وہاں سارا وقت اللہ کی یاد میں صرف کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی

چاہتے ہیں۔ آئندہ کے لیے توبہ کرتے ہیں۔ وہ کسی وقت کے لیے بھی مسجد سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ البتہ وہاں لوگوں سے کام کی بات چیت کرنے پر کوئی پابندی نہیں، آرام بھی وہیں کرتے ہیں۔ عید کا چاند دیکھ کر اپنے گھر واپس آتے ہیں۔ ایسی عبادت اللہ کے نزدیک بہت اچھی سمجھی جاتی ہے۔ کیوں کہ ان دنوں میں ایک شخص اپنے آپ کو دنیا کے تعلق سے الگ کر کے صرف اپنے کو اچھا انسان بننے کو سوچتا ہے۔

ابّا جان جب یہ کہہ چکے تو امّی بچّوں کے لیے فیرنی لے کر آئیں جو انھوں نے خاص طور پر ثروت کے لیے بنائی تھی اور جسے سبھوں نے بڑے شوق سے کھایا۔

(ہمارا دین حصہ سوم سے)

ایک انمول حدیث قدسی

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا کہ :

میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے لوگ انھیں دوسری چیزوں میں تلاش کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

۱۔ میں نے اپنی رضا کو مخالفتِ نفس میں رکھ دیا ہے، لوگ اس کو موافقتِ نفس میں تلاش کرتے ہیں۔

۲۔ میں نے راحت و آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔

۳۔ میں نے علم و حکمت کو بھوک میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے سیری میں تلاش کرتے ہیں۔

۴۔ میں نے اطمینان و سکون کو قناعت میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے دولت میں تلاش کرتے ہیں۔

۵۔ میں نے عزّت کو اپنی اطاعت میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے بڑے بڑے مرتبوں اور جھوٹے جاہ و جلال میں تلاش کرتے ہیں۔

(مرسلہ : ملک وحید عاصی)

ارشد رضا مہر



طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور بری باتوں سے اپنے آپ کو روکنے کو روزہ کہتے ہیں اور روزہ ہر عاقل و بالغ مرد و عورت پر فرض ہے۔ البتہ پاگل و مجنوں اور بہت چھوٹی عمر کے بچے اس عبادت میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اور ان پر روزے فرض بھی نہیں ہیں۔ ماہ صیام کا مہینا عبادت کا ایک اہم ترین مہینا ہے اس مہینے میں روزے سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان صرف فاقہ کرے اور اپنے جسم کو تکلیف میں ڈالے بلکہ روزے کا مطلب نفسی انسانی کی اصلاح ہے روزہ رکھنے سے انسان میں نفسیاتی خواہشات کو قابو میں رکھنے کی قوت پیدا ہوتی ہے اور جب تک انسان اپنی نفسیاتی خواہشوں سے مقابلہ کرنے کا خوگر نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں مصائب برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ روزہ دراصل خدا کی طرف سے ایک درس ہے جو انسان کو صبر سکھاتا ہے تاکہ وقت پڑنے پر وہ تکالیف سے نہ گھبرائے اور تمام مصائب کو خندہ پیشانی سے قبول کرے اس کے علاوہ روزہ انسان کو مفلسی و غریب بہن بھائیوں کی فاقہ کشی کا احساس بھی دلاتا ہے خدا کا بندہ خدا سے والہانہ محبت کے تحت کھانا پینا چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کرکے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ مجھے خدا سے سچی محبت ہے ماہ صیام کے روزوں سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے "اے ایمان والو تم پر روزے فرض ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ" مزید ارشاد ہوتا ہے کہ "تم میں پرہیزگاری اور خدا کا خوف پیدا ہوگا جو دین اور دنیا کی بھلائی کا سرچشمہ ہے جس میں خیر ہی خیر ہے۔

●●

SANCTUARY'S WONDERWORLD

تصویریں: غلام حسین

آج تک سب سے طویل [illegible] عمر [illegible] معلوم ہوا ہے [illegible]

ٹائیگر شارک ایک وقت میں ۸۰ بچوں کو جنم دے سکتی ہے۔

یہ جاننا دلچسپ ہے کہ ۱۳۰ الگ الگ نسلوں پر مشتمل ایک خاندان میں کوکولیڈائی (CUCULIDAE) نام کا ایک پرندہ ملتا ہے، جس نے اپنے بچوں کی پرورش کا ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ اس کام کے لیے دوسرے پرندوں کے گھونسلے استعمال کرتا ہے۔ وہ ایسے پرندوں کے گھونسلے میں انڈے دیتی ہے، جو اس کی نسل سے تعلق نہیں رکھتے اور وہ بے چارے نہ صرف ان انڈوں کو سیتے ہیں بلکہ انڈوں سے بچے نکلنے کے بعد ان کی پرورش بھی کرتے ہیں۔ انہیں کھلاتے پلاتے ہیں اور بعض اوقات اس چکر میں خود ان کے بچے بھوکے رہ جاتے ہیں۔ زیر نظر تصویر میں [illegible] پرندہ [illegible] نظر آ رہا ہے [illegible] کوکولیڈائی [illegible] ہندوستان میں اس نسل سے تعلق رکھنے والا جو پرندہ پایا جاتا ہے وہ کوئل ہے اور کوئل کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے انڈے کوے کے گھونسلے میں رکھتی ہے۔

پروفیسر محمد شفیق

بجلی کی گھنٹی

آپ نے بجلی کی گھنٹی تو دیکھی ہی ہوگی بلکہ اسے کئی بار بجایا بھی ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ بجلی کی گھنٹی بجتی کیسے ہے اور یہ سائنس کے کس اصول کے تحت کام کرتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بجلی کی گھنٹی کو کھول کر دیکھا جائے تو اس میں یُو (U) کی شکل کا ایک پرزہ لگا نظر آتا ہے جس پر تانبے کا ایک تار لپٹا ہوتا ہے۔

یہ پرزہ ایک الیکٹرونک میگنٹ یعنی برقی مقناطیس ہوتا ہے اس میں لوہے یا نکل کی بنی ہوئی چیزوں کو کھینچنے کی طاقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے اندر سے برقی رو گزرتی ہے جیسے ہی برقی رو گزرنا بند ہو جاتی ہے اس کی مقناطیسی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ بجلی کی گھنٹی میں اس برقی مقناطیس کے سامنے ایک لوہے کا ٹکڑا رکھ دیا جاتا ہے، برقی مقناطیس اور لوہے کے ٹکڑے کے درمیان ایک اسپرنگ بھی لگا دیا جاتا ہے۔ اس عمل سے لوہے کا ٹکڑا پنڈولم کی طرح دائیں بائیں حرکت کرتا ہے۔ لوہے کا یہی ٹکڑا ایک سوئچ کا کام بھی کرتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب لوہے کا ٹکڑا برقی مقناطیس سے دور ہٹتا ہے تو وہ تانبے یا پیتل کے ٹکڑے سے آ کر ٹکراتا ہے جس کا پہلے ہی بجلی کے ایک تار سے تعلق پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح برقی رو چلنے لگتی ہے برقی مقناطیس میں مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے اور یہ لوہے کے ٹکڑے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جب لوہے کا ٹکڑا اس کی طرف جاتا ہے اس کا وہ رشتہ جو پیتل یا تانبے کے ٹکڑے کے ساتھ قائم ہو چکا تھا۔ ختم ہو جاتا ہے۔ برقی رو چلنا بند ہو جاتی ہے اور برقی مقناطیس کی کشش بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لوہے کا ٹکڑا اب اچھل کر

پیچھے ہٹتا ہے۔ اس طرح برقی رو چلنے میں پیدا ہونے والی رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ برقی مقناطیس میں ایک بار پھر کشش پیدا ہوتی ہے۔ لوہے کا ٹکڑا پھر اس کی طرف کھینچتا ہے لیکن ایسا ہوتے ہی برقی رو کا سلسلہ ایک بار پھر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ہم گھنٹی کا سوئچ دبائے رکھتے ہیں لوہے کا ٹکڑا تیزی سے دائیں بائیں پنڈولم کی طرح ہلتا چلا جاتا ہے۔ اس لوہے کے ٹکڑے کے نیچے اگر ایک اسٹرائیکر لگا دیا جائے اور سامنے ایک گھنٹی تو جیسے جیسے لوہے کا ٹکڑا دائیں بائیں ہٹے گا کبھی وہ گھنٹی سے ٹکرائے گا اور کبھی دور ہٹ جائے گا۔ اسی حرکت کی وجہ سے گھنٹی بجنے لگے گی۔

اگر اسٹرائیکر اور گھنٹی دونوں موجود نہ ہوں تو بھی کچھ نہ کچھ آواز ضرور پیدا ہوگی لیکن یہ آواز گھنٹی کی آواز سے بالکل مختلف ہوگی یہ آواز ایک مکھی یا مچھر کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوگی۔



بعض آلے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں گھنٹیوں کی جگہ لوہے یا پیتل کے چھوٹے بڑے پائپ لگا دیے جاتے ہیں۔ اسٹرائیکر اُن پائپوں سے آکر ٹکراتا ہے اور مختلف قسم کی آوازیں پیدا کرتا ہے۔ ایسی گھنٹیاں ڈِنگ ڈانگ بیلز یا میوزیکل بیلز کہلاتی ہیں۔ بجلی کی ایسی گھنٹیاں بھی آج کل عام ہیں۔ تو یہ ہے سائنس کا وہ اصول جس کے تحت بجلی کی گھنٹی بجتی ہے۔

▲

بچّوں کی مذہبی کتابیں

حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/-	ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۷/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل)	۴/۰
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/۰
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	-/۴۰	ارکان اسلام	۴/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	عقائد اسلام	۳/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	چار یار	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا اوّل	۷/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	خلفائے اربعہ	۶/۵۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	نبیوں کے قصے	۵/
اللہ کے صفی	۲/۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
قاعدہ یسرنا القرآن	۲/۲۵	سرکار دو عالمؐ	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی



● افضل حسین
عمر۔ ۱۰سال
مشغلہ۔ قلمی دوستی کرنا، نماز پڑھنا، کرکٹ کھیلنا۔ پیام تعلیم کا پابندی سے مطالعہ کرنا۔ دل لگا کر پڑھنا
پتا۔ نرکھوسیا۔ ضلع بستی (یوپی)

● نام۔ نسیم اختر
عمر۔ ۱۱سال
مشغلہ۔ قلمی دوستی کرنا، کامنٹری سننا۔ پابندی سے اسکول جانا اور نماز پڑھنا۔
پتا۔ پوڈھیارہ۔ گونڈہ (یوپی)

● نام: شہباز ابراہیم
عمر: ۱۱سال
مشغلہ کہانیوں کی کتابیں پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا۔ نماز پڑھنا۔ سبق یاد کرنا
پتا: پنڈپری منتان گڑھ۔ رتنا گیری

● نام: عفت ناز خواجہ
عمر: ۱۲سال
مشغلہ: "پیام تعلیم" اور دیگر دینی کتب مطالعہ کرنا۔ پابندی سے اسکول جانا۔ والدین کی خدمت اور استادوں کی فرماں برداری کرنا
پتا: محلہ سندھی پورہ برہان پور ضلع کھنڈوہ (ایم پی)

● نام: ناہید قیصر بنت عبدالغفار
عمر: ۱۱سال
مشغلہ: اچھی کتابیں پڑھنا۔ نماز پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ پیام تعلیم کا پابندی سے مطالعہ کرنا۔ شعروں کا مجموعہ رکھنا۔
پتا: چھاپا نگر۔ مسجد کے پیچھے۔ المتین منزل ضلع۔ امراوتی (ایم۔ ایس)

● نام: محمد منور عالم
عمر: ۱۶سال
مشغلہ: صبح سویرے اٹھنا اور پابندی سے نماز پڑھنا۔ کالج جانا، فٹ بال کھیلنا اور افسانہ پڑھنا
پتا: محمد منور عالم۔ انجمن فیض ادب، محلہ شیخانہ خورد بہار شریف (نالندہ) ۸۰۳۱۰۱

● نام: عنان احمد ولد جناب عبدالباقی
عمر: ۱۳سال
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا۔ لائبریری میں مطالعہ کرنا، کرکٹ کھیلنا، ماں باپ کی عزت کرنا، دوستوں کے خطوں کے جواب دینا۔
پتا: اردو لائبریری۔ پوسٹ خیرآباد۔ ضلع اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۴۰۳

بچوں کے لیے

نئی اور دلچسپ کتابیں

بچوں کے ذاکر صاحب	۴/۰۰
ٹوٹے کھلونے	۴/۰۰
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۴/۰۰
سہانے ترانے	۴/۵۰
ہرن کا دل	۲/۰۰
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/۰۰
گوہر شہزادی	۳/۰۰
شریر شیرا	۳/۰۰
پری رانی	۳/۰۰
خطرناک سفر	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۴/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰
ننھا جیرو	۲/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۰۰
پلک نہ مارو	۴/۰۰
ایک کھلا راز	۳/۰۰
بابا ناصح	۲/۰۰
بچوں کے افسر	۵/۰۰
پہاڑ کی چوٹی پر	۵/۰۰
رنگوں کی بستی	۲/۵۰
سرخ جوتے	۳/۰۰
سلام و مصافحہ	۴/۵۰
شرارت	۲/۰۰
صحت کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰
صحت کی الف بے	۳/۰۰
جدید پہیلیاں	۶/۰۰
بھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
ننھا فرشتہ	۴/۵۰
نیلا ہیرا	۴/۵۰
ماں کی کھیتی	۲/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰
دنیا کے جانور	۲/۵۰
آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰
اس نے کیا کر نہ جانا	۱/۲۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
جوہر قابل	۲/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰
محمد شفیع الدین نیر	۲/۵۰
مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
پیارے رسول	۴/۵۰
چار یار	۴/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۳/۰۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
تاک دنا دن تک کے سے	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
ایک دیس ایک خون	۳/۰۰
جیت کس کی؟	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
جادو کا گھر	۱/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مدو رانا پردیس چلے	۱/۵۰
ہپو چپو	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
شیر خاں	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵۰



پیام تعلیم موصول ہوا پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ تعلیم کا پہلی مرتبہ مطالعہ کیا۔ مجھے یہ رسالہ بہت مد آیا۔ آپ نے حقیقت میں اس میں چار چاند ہیے ہیں

حافظ علاء الدین رضوی

رضوی کتاب گھر ۱۱۴۔ غیبی نگر۔ بھیونڈی

پیام تعلیم میں بہت دنوں سے پڑھ رہا ہوں پیام تعلیم کا ہر شمارہ دلچسپ لگتا ہے۔ ی ۸۷ء کے شمارے میں خالد ریحان، عزیز اور گاؤ والا نے اس مشورے کی تائید کی تھی کہ قلمی کالم ہٹا دیا جائے۔ ان کا یہ سوچنا غلط ہے رائے تو یہ ہے کہ قلمی دوستی کے کالم کو شائع کیا جائے۔ اور اگر ممکن ہو تو پیامی ں کے فوٹو بھی شائع ہوں تو اچھا ہے سب ایک دوسرے سے قلمی دوستی کر سکیں۔ پیام تعلیم ایک خوب صورت اور بہترین رسالہ بچے ہی نہیں بڑے بھی پسند کرتے ہیں۔

ایم نعیم رضا صدیقی۔ جنرل سکریٹری

یا اسلامک فیڈریشن گنج ڈونڈوارہ (ایٹہ)

اپریل ۸۷ء کا شمارہ اپنے اسکول کے ٹیچر جناب طارق عمر صاحب کے ہاتھ میں دیکھا۔ سب بچے کہنے لگے کہ سر مجھے دیجیے لیکن جیت میری ہی ہوئی اور میں نے پیام تعلیم پڑھنا شروع کر دیا جب بچوں کی کوششیں کا صفحہ دیکھا۔ اس میں میری نظم "اسکول" بھی ہے۔ ہمت افزائی کے لیے شکریہ۔ سچ مچ "پیام تعلیم" ایسا رسالہ ہے جسے پڑھنے کو ہر ایک کا دل چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں کو رائگاں نہیں جانے دے گا۔ اپریل کے پیام تعلیم میں "یا اللہ" "بہادر شہزادہ" "شیر اور راہ گیر" "کہاوتوں کی کہانیاں" "آزادی کے شہید" "شہر نے گاؤں سے کہا" "طوفانی رات" "تین قیمتی مشورے" "مرغی کی تلاش" "روزے کی فضیلت" "اکڑ بکڑ" "غرور" "روم کا بڑھئی" "موٹر کار کیسے چلتی ہے" "مچھر" غرض یہ کہ پورا پیام تعلیم قابل تعریف ہے۔

محمد شعیب

۱۴ / ۷ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔

"پیام تعلیم" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ دیکھ کر دل کو راحت و سکون ملا اور دل سے آپ کی عمر درازی کے لیے دعا نکلی۔ مضامین۔ حمد۔ نظمیں اور کہانیاں سبھی اپنی اپنی جگہ لاجواب اور بے مثال ہوتے ہیں۔ خاص طور سے کتابت اور طباعت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔

ظہیر ناز۔ ۲۲۹/۳ الپ شہر روڈ۔ جمال پور علی گڑھ



پیامیوں سے

- یہ صفحات صرف آپ کے لیے ہیں۔ خود لکھیے / اپنے دوستوں کو لکھنے کا مشورہ دیجیے۔
- کسی بھی زبان کی اچھی کہانی کا ترجمہ بھی بھیج سکتے ہیں لیکن ایسی صورت میں اصل مصنف کا نام لکھنا ضروری ہے (ادارہ)

اصول اپنا اپنا

● اسلم اور راشد دو بھائی تھے دونوں بھائی ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ بڑا بھائی اسلم نویں جماعت میں اور چھوٹا بھائی راشد آٹھویں جماعت میں تھا بڑے بھائی کا یہ اصول تھا کہ گیارہ مہینے کھیل کود اور پورے سال میں ایک مہینا پڑھائی۔ امتحان سر پر آگئے تو اسلم نے اپنے اصول کو اپناتے ہوئے گھر سے جانا بالکل بند کر دیا اور گھر والوں سے کہہ دیا کہ اگر میرا کوئی بھی دوست مجھے بلانے آئے تو صاف منع کر دینا کہ اسلم گھر پر موجود نہیں ہے۔ اسلم کے امتحان ہونے میں کل تیس دن باقی رہ گئے تھے۔ اب تو اسلم کے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔

اسلم نے جی جان سے محنت کرنا شروع کر دی۔ نہ کھانے کا ہوش نہ نیند سے واسطہ جب اسلم کو دن رات جاگتے ہوئے چار پانچ دن ہو گئے تو اس کی شکل بدل گئی اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو گئیں نورانی چہرہ پیلا پڑ گیا۔ رات رات بھر چائے پی کر جاگتا تھا جس سے بھوک بھی بہت کم لگتی تھی پھر حرارت ہو گئی مگر بخار میں بھی رات دن جاگنا نہیں چھوڑا۔ ادھر امتحان کا ڈر ہر وقت بھوت بن کر اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت ہی کمزور ہو گیا۔ بیماری نے اسلم کو آسانی سے دبا لیا۔ ٹھیک ہونے میں دو تین مہینے لگ گئے اور وہ امتحان دینے سے محروم رہ گیا۔ اب اسلم اپنے کیے پر رہ رہ کر پچھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں کہنے لگا اگر میں شروع سے ہی روزانہ تھوڑی تھوڑی دیر پڑھ لیا کرتا تو میں رات رات بھر نہ جاگتا، نہ جاگتا نہ بیمار پڑتا، نہ بخار ہوتا نہ امتحان سے محروم ہوتا نہ اپنے انمول دن اپنی زندگی میں سے کم کرتا۔

یہ سب باتیں ٹھوکر کھانے کے بعد سوچ رہا تھا اگر ان ہی باتوں کو وہ پہلے سے سوچتا تو آج اسے پچھتانا نہ پڑتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک ہفتے کا کھانا ایک دن بیٹھ کر نہیں کھایا جا سکتا اسی طرح ایک سال کی پڑھائی کی تیاری ایک مہینے میں کسی بھی حالت میں نہیں کی جا سکتی خاص طور سے آٹھویں کلاس کے بعد۔

اسلم کے چھوٹے بھائی کا یہ اصول تھا۔ روزانہ دو تین گھنٹے دل لگا کر پڑھنا اور باقی وقت میں کھیل کود کرنا اور سیر و تفریح کو جانا۔ راشد اچھے نمبروں سے پاس ہوا اور اپنے بڑے بھائی کی جماعت میں آگیا۔ اچھا اصول یہ ہے کہ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیل کے وقت کھیل۔ پڑھتے وقت پڑھائی کے علاوہ کسی بھی طرح کا کوئی خیال نہیں آنا چاہیے جو کام جس وقت کا ہو اسے اسی وقت دل لگا کر اچھی طرح انجام دینا چاہیے۔ روزانہ تھوڑا تھوڑا پڑھنا تیس دن تیس رات لگا تار پڑھنے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔

محمد ظہیر

جمال پور۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

بے وقوفوں کی کہانی

ایک بے وقوف تیل خرید کر لے جا رہا تھا راستے میں ایک آدمی نے اس سے کہا کہ تیل کی بوتل کو بڑی حفاظت سے لے جانا اس میں سے تیل خارج ہو رہا ہے۔ تیل بوتل میں سے کہاں خارج ہو رہا ہے دیکھنے کے لیے اس نے بوتل کا منہ نیچے کر دیا سارا تیل مٹی میں مل گیا۔ بے وقوف اپنی ایک غلطی درست کرنے کے لیے دوسری غلطی کر بیٹھتے ہیں۔

..... ایک گاؤں میں ایک بے وقوف لڑکا تھا اس کی ماں نے پانچ روٹیاں باندھ کر اسے جنگل کو بھیج دیا۔ جنگل میں محنت کر کے اس کو خوب بھوک لگی۔ ایک ایک کر کے وہ تین روٹیاں کھا گیا لیکن پیٹ نہ بھرا۔ چوتھی روٹی بھی کھائی تب تھوڑا پیٹ بھر گیا۔ پانچویں روٹی کھائی تو پیٹ بھرپور بھر گیا۔ اب بے وقوف کو یہ خیال آیا کہ پانچویں روٹی ہی پہلے کھا لیتا تو پیٹ بھر کر بھی چار روٹیاں باقی رہ جاتیں میں نے بہت بڑی غلطی کی دیکھا آپ نے معمولی سی معمولی بات بھی بے وقوفوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

..... ایک گاؤں میں ایک بے وقوف شاگرد تھا اس نے اسکول میں صرف ایک ہی ضرب کا سوال سیکھا تھا۔ اس کے والد نے ایک گھڑا پانی کنویں سے کھینچ کر لانے کے لیے کہا۔ وہ گھڑے میں رسی باندھ کر کنویں سے پانی لے آیا۔ پھر اس کے والد نے تین گھڑے پانی لانے کے لیے کہا۔ اسے فوراً ضرب کا سوال یاد آیا اور اپنے باپ سے کہنے لگا ایک گھڑا پانی لانے کے لیے مجھے تین میٹر رسی دی تھی اب تین گھڑے پانی

..... ایک مالک نے اپنے نوکر سے کہا کہ باغ جا کر کچھ میٹھے میٹھے بیر لانا۔ وہ باغ گیا اور درخت سے بیر توڑ کر مزہ چکھ چکھ کر جوٹھے بیر بھر لایا یہ دیکھ کر مالک نے کہا بے وقوفوں سے کام لینا بے کار ہے



لانے کے لیے تو بیٹر رتی چاہیے۔ لڑکے کی اس بے وقوفی کو دیکھ کر اس کے والد کو بڑی فکر ہوئی۔

●●

ریاض احمد
ہاگیواڑی۔

گڑیا کی رانی

آؤ سنائیں دلکش کہانی
عنوان ہے جس کا گڑیا کی رانی
گڑیا ہماری شاداب شیریں
کتنی ہے بھولی کیسی سہانی
ضد پہ جو آتے کچھ بھی نہ مانے
کرتی ہے اکثر وہ من مانی
لفظ ادھورے مطلب ہے پورا
یوں بھی سیانی، یوں بھی سہانی
چہرے پہ اس کے ایسی ہے رونق
جیسے چڑھا ہو سونے کا پانی
مدنی اس سے گھر میں ہے زینت
سب کے لیے ہے وہ لاثانی

از۔ عبدالسبوح مدنی بھدرک

اندھیر نگری چوپٹ راج

● یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے۔ ایک ماسٹر صاحب اپنے کلاس کے طالب علموں کے ساتھ دوسرے شہروں کی سیر کرنے گئے تھے۔ ان کے ساتھ قریب پندرہ طالب علم تھے۔ گھومتے گھومتے وہ ایک ایسے شہر میں پہنچے جہاں ہر چیز ایک آنے کی ایک سیر ملا کرتی تھی وہ ہر دکان پر جاتے اور بھاؤ کرتے مثلاً ہلدی کیا بھاؤ۔ ایک آنے کی ایک سیر کوئی بھی سبزی ہو ایک آنے کی ایک سیر وہ ایک مٹھائی کی دکان پر گئے وہاں دودھ بھی ایک آنے کا ایک سیر تھا اور ربڑی بھی۔ اس شہر کا نام اندھیر نگری تھا۔ ان لڑکوں میں ایک تھا خالد۔ خالد نے سوچا کہ اگر یہاں رہ کر روزانہ ربڑی کھائی جائے تو مزہ آجائے اور اس سے سستی چیز کہیں ملے گی بھی نہیں۔ دراصل وہ ربڑی کھانے کا بہت شوقین تھا۔

جب ماسٹر صاحب طالب علموں کو لے کر اپنے شہر چلنے لگے تو خالد نے جانے سے انکار کر دیا ماسٹر صاحب نے اسے بہت سمجھایا کہ یہاں تمھارا اکیلا رہنا ٹھیک نہیں تم کبھی بھی مصیبت میں پڑ سکتے ہو۔ لیکن خالد کسی قیمت پر گھر جانے کو تیار نہ ہوا آخر ماسٹر صاحب نے خالد کو ایک تعویذ دیا اور کہا خدا نہ کرے اگر تم پر کوئی پریشانی آئے تو یہ تعویذ زمین پر گھس دینا میں فوراً وہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

خالد نے وہ تعویذ اپنے پاس سنبھال کر رکھ

لیا۔ اور شہر میں ہی کرایے پر رہنے لگا۔ چونکہ اس کے پاس روپے خوب تھے۔ اور وہ ایک مالدار گھر کا تھا۔ اب خالد روزانہ خوب ربڑی کھاتا اور صبح و شام کثرت کرتا۔ روزانہ ربڑی کھانے اور کثرت کرنے سے وہ دن بہ دن موٹا ہوتا جا رہا تھا۔

جس طرح سے اس شہر میں چیزیں بکا کرتی تھیں ویسے ہی یہاں کی عدالت تھی اور عجیب طریقے سے یہاں فیصلے سنائے جاتے تھے۔



ایک دن شہر کے قاضی کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: "حضور! میں بہت غریب آدمی ہوں میرے پاس ایک بکری تھی جس کا دودھ بیچ کر میں گھر کا خرچ چلایا کرتا تھا۔ آج پڑوسی کی دیوار گرنے سے میری بکری دب کر مر گئی۔ حضور کچھ کیجیے میں برباد ہو گیا۔"

اتنا سنتے ہی قاضی نے سپاہیوں سے کہا فوراً جاکر اس آدمی کے پڑوسی کو لایا جائے تھوڑی دیر بعد سپاہی اس کے پڑوسی کو پکڑ کر قاضی کے سامنے لائے۔ قاضی نے اس سے پوچھا: "آج تمھاری دیوار گرنے سے اس بچارے کی بکری مر گئی کیا یہ بات صحیح ہے؟"

پڑوسی نے کہا: "ہاں حضور! یہ بات صحیح ہے:" لہٰذا قاضی صاحب نے حکم سنایا۔ اس شخص کو پھانسی کی سزا دی جائے۔ لیکن سزا سے پہلے یہ اپنے بچاؤ کے لیے کوئی بات کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔ اس آدمی نے کچھ سوچ کر کہا: "سرکار! مانا کہ دیوار میری ہی گری تھی۔ لیکن یہ میری بنائی ہوئی تو نہیں تھی۔ اسے تو شہر کے ایک راج نے بنایا تھا۔" قاضی کو اس کی بات صحیح لگی۔ چنانچہ اس راج کو بلایا گیا جس نے دیوار بنائی تھی اور اس پڑوسی کو چھوڑ دیا۔

اب قاضی نے راج سے پوچھا "کیا یہ دیوار تم نے ہی بنائی تھی جس کے گرنے سے اس غریب کی بکری دب کر مر گئی؟" راج نے ڈرتے ہوتے جواب دیا: "ہاں سرکار یہ دیوار میں نے ہی بنائی تھی۔" قاضی صاحب نے حکم سنایا: "اس راج کو پھانسی کی سزا دی جائے جس نے ایسی دیوار بنائی جو گر گئی اور بکری مر گئی لیکن یہ اپنی صفائی کے لیے کوئی بات یہاں کہہ سکتا ہے۔" راج تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا۔ "سرکار! گستاخی معاف ہو یہ دیوار تو میں نے ہی بنائی تھی۔ لیکن میں نے اس کا گارا، مسالا نہیں بنایا تھا وہ تو مزدور نے بنایا تھا۔ اس میں میری کیا غلطی ہے۔ مزدور نے زیادہ پانی ملا دیا۔ اس لیے دیوار گر گئی:" راج کی بات قاضی کو صحیح لگی۔ فوراً مزدور کو بلایا گیا اور راج کو باعزت بری کر دیا گیا۔

اب قاضی نے مزدور سے کہنا شروع کیا۔ "کیا وہ گارا۔ مسالا۔ تم نے ہی بنایا تھا جس سے بنی ہوئی دیوار گر گئی اور بکری مر گئی؟" مزدور نے اٹکتے ہوئے جواب دیا: "جی..... جی ہاں۔ سرکار۔ وہ گارا میں نے ہی بنایا تھا۔" قاضی نے حکم دیا: "اسے ابھی پھانسی کی سزا دی جائے بکری مارنے کا اصل مجرم یہی ہے۔ اس نے ہی گارے میں زیادہ پانی ملایا تھا جس سے دیوار نہ رک سکی اور گر گئی لیکن اپنے جرم کی صفائی کے لیے یہ بھی کوئی

بات ہو سکتا ہے۔" مزدور کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کہنے کو کچھ نہ تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسے جلاد پھانسی کے تختے کے پاس لے گیا۔ مزدور کو تختے پر کھڑا کیا اور جلاد نے اس کے گلے میں پھندا ڈالا۔ لیکن مزدور کی گردن بہت پتلی تھی اور پھندا اس کی گردن میں ڈھیلا تھا جلاد نے سوچا اسے پھانسی کیسے دی جائے پھندا بڑا ہے۔ وہ فوراً قاضی صاحب کے پاس گیا اور عرض کیا صاحب مجرم کی گردن بہت پتلی ہے اور پھندا کافی بڑا ہے اس لیے اسے پھانسی دینا ناممکن ہے۔ قاضی صاحب نے تھوڑی دیر کچھ سوچا پھر بولے۔ "اس میں اتنے گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تم اسے چھوڑ دو۔ اور شہر سے پھندے کے ناپ کی گردن والا آدمی پکڑ لاؤ اسے پھانسی دے دو۔"

قاضی کا حکم سنتے ہی سپاہی ایک خوب موٹے آدمی کی تلاش میں لگ گئے۔ آخر ایک سپاہی کو ایک موٹا آدمی نظر آگیا۔ یہ خالد تھا جو ربڑی کھا کھاکر اور کثرت کر کے خوب موٹا ہو گیا تھا سپاہی خالد کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے قاضی نے خالد سے کہا "چونکہ تم ہی اس شہر کے سب سے موٹے آدمی ہو اور تمھاری گردن پھندے میں آسکتی ہے۔ اس لیے اس مزدور کے بجائے تمھیں پھانسی دی جائے گی۔" یہ سن کر خالد حیران رہ گیا اس کی آنکھوں کے سامنے اسے موت ناچتی نظر آئی۔ جلاد اسے تختے کے پاس لے گیا۔

اچانک خالد کو ماسٹر صاحب کا دیا ہوا تعویذ اور کہی ہوئی بات یاد آئی "خدا نہ کرے اگر تم پر کوئی پریشانی آئے تو یہ تعویذ زمین پر گھس دینا میں فوراً ہی حاضر ہو جاؤں گا۔"

خالد نے فوراً تعویذ زمین پر گھسا۔ اور وہاں ماسٹر صاحب حاضر ہو گئے۔ ماسٹر صاحب نے خالد کے کان میں کچھ کہا۔ جلاد نے خالد کو تختے پر کھڑا کیا۔ وہ گلے میں پھندا ڈالنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ماسٹر صاحب نے خالد کا پیر پکڑ کر کھینچ لیا اور جلاد سے بولے کہ پھانسی مجھے لگادو۔ جب ماسٹر صاحب تختے پر کھڑے ہوئے تو خالد نے ان کا پیر کھینچ لیا اور جلاد سے کہا کہ پھانسی مجھے لگادو۔ اس طرح سے دونوں ایک دوسرے کے پیر پکڑ کر کھینچتے رہے۔ جلاد پریشان ہو گیا اور دونوں کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے گیا اور بولا "صاحب! یہ دونوں لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں وہ کہتا ہے پھانسی مجھے لگے وہ کہتا ہے مجھے۔ قاضی نے ان سے پوچھا "پھانسی لگوانے کا حکم اسے دیا گیا ہے پھر تم کیوں پھانسی لگانا چاہتے ہو؟"

ماسٹر صاحب نے کہا "حضور بات دراصل یہ ہے کہ آج کے دن جس کسی کو پھانسی لگے گی وہ آدمی سیدھا جنت میں جائے گا۔"

ماسٹر صاحب کی بات سن کر قاضی کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر جلاد سے کہا۔ "اگر یہی بات ہے تو پھر ان دونوں کو چھوڑ دو اور مجھے پھانسی لگا دو۔ میں بھی تو جنت میں جانا چاہتا ہوں۔ اس طرح قاضی کو پھانسی لگادی گئی۔ ایک مشہور کہاوت بنی "اندھیر نگری چوپٹ راج۔"

●●

ایم۔ وسیم انصاری
علیم میڈیکل اسٹور
گنج ڈونڈوارہ (یوپی) ۲۰۷۲۴۲

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جون ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۶

بچوں سے باتیں

جس دن یہ پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا آپ عید کا چاند دیکھنے کے لیے بے چین ہوں گے ہماری طرف سے آپ کو آپ کے بزرگوں کو عید مبارک۔ خدا کرے آپ اپنے بزرگوں کے سایے میں رہ کر عید کی خوشیاں عرصے تک مناتے رہیں۔ آمین۔ ثم آمین۔



پرچہ پریس جا چکا تھا کہ اچانک ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء کو صبح ۵ بجے یہ افسوسناک خبر ملی کہ آپ کے پیارے اڈیٹر ولی شاہجہاں پوری سوتے سوتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

تفصیلات آیندہ شمارے میں پڑھیے گا۔

قیمت فی پرچہ: 3/50 سالانہ: 30/=
غیر ممالک سے: نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز: بارہ ڈالر
فی پرچہ: ایک ڈالر

مینیجنگ اڈیٹر: شاہد علی خاں
اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری
معاون: مختار احمد
تزئین کار: ایس، ایم، منظر

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا



سید شہاب الدین دسنوی

عید مبارک

رمضان کے ۲۹ روزے پورے ہوگئے تو مغرب کی نماز کے بعد لوگ باہر نکل آئے۔ سڑک پر سے چھتوں پر، مسجد کے میناروں پر چڑھ کر آسمان کی طرف پچھم کی جانب تکنے لگے۔ یہ سب عید کا چاند دیکھ رہے ہیں۔ اگر آج شوال کا چاند دکھائی دیا تو کل عید ہوگی۔ ورنہ تیس روزوں کے بعد پرسوں ہوگی۔

کل چاند دکھائی دیا۔ آج عید ہے۔ گھر کے سب لوگ اندھیرے منھ جاگ اٹھے۔ جلدی جلدی نہا دھوکر نئے نئے یا دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے اور جوتے ٹوپی پہن کر تیار ہو گئے عید کی نماز کے لیے جانا ہے۔ عارف آج پہلی بار عید کی نماز پڑھنے اپنے ابا کے ساتھ جائے گا اس نے نئے کپڑے بھی پہن لیے۔ ٹوپی۔ جوتا، موزہ، بھی پہن لیا لیکن ایک بڑی مشکل تھی کہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ عید کی نماز پڑھی کیسے جاتی ہے۔

"ابا جان، عید کی نماز بھی کیا جمعہ کی نماز کی طرح پڑھی جاتی ہے؟" عارف نے پوچھا۔

عارف کے ابا جان احسان صاحب بولے: "تم نے پوچھ لیا، اچھا کیا، میں تو بتانا ہی چاہتا تھا۔ انوار کو بھی بلا لو تو میں بتا دوں۔"

عارف اور اس کا خالہ زاد بھائی انوار جو چھٹیاں منانے آیا تھا اور عارف ہی کے سن کا تھا۔ آگیا تو احسان صاحب نے کہا: "کیوں بیٹے انوار، تم کو عید کی نماز پڑھنے کا طریقہ معلوم ہے؟"

"نہیں خالو جان" انوار نے جواب دیا۔

"اچھا تو سنو" احسان صاحب بولے: "پہلے تو یہ جان لو کہ عید کی نماز دو رکعت ہوتی ہے اور یہ واجب نماز ہے۔ اب بتاؤ اس نماز کی نیت کیسے کروگے؟"

انوار نے کہا: "نیت کرتا ہوں میں دو رکعت واجب نماز عید الفطر کی، پیچھے امام کے، منھ

تاج منزل - بی - این - بنرجی روڈ - پٹنہ

میرا کعبہ کی طرف۔"

احسان صاحب نے کہا: "لیکن اس نماز میں اور نمازوں سے چھ تکبیریں زیادہ ہوتی ہیں اس لیے نیت اس طرح کرنی چاہیے۔ نیت کرتا ہوں میں دو رکعت واجب نماز عید الفطر کی مع چھ زائد تکبیروں کے، پیچھے امام کے، منہ میرا کعبہ کی طرف۔"

عارف نے پوچھا: "اور یہ چھ زائد تکبیریں کب کہی جاتی ہیں؟"

احسان صاحب نے بتایا: "جب نماز شروع ہوتی ہے تو امام اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر ہاتھ باندھ لیتا ہے۔ سب مقتدی (یعنی پیچھے نماز پڑھنے والے) بھی ہاتھ باندھ لیں گے اور دوسری نمازوں کی طرح ثنا (سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ) پڑھتے ہیں۔ دوسری بار امام کہتا ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ تب مقتدی کانوں تک دونوں ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ایک تکبیر زیادہ ہوئی۔ تیسری بار تکبیر کہنے پر پھر کانوں تک دونوں ہاتھ لے جاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ دوسری تکبیر زیادہ ہوئی۔ چوتھی بار تکبیر کہنے پر پھر کانوں تک دونوں ہاتھ لے جاتے ہیں اور اب ان کو نیچے لاکر باندھ لیتے ہیں۔ یہ تیسری زیادہ تکبیر ہوئی۔ پھر امام اور نمازوں کی طرح سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید کی کچھ آیتیں یا سورہ پڑھ کر رکوع اور سجدے کرتا ہے۔ مقتدی بھی اسی کے مطابق رکوع اور سجدے کرتے ہیں۔

جب دوسری رکعت شروع ہوتی ہے تو امام اسے بھی اور نمازوں کی طرح ادا کرتا ہے۔ پہلے سورہ فاتحہ اس کے بعد کوئی اور سورہ۔ پھر امام کہتا ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ تو رکوع میں جانے کے بجائے کانوں تک دونوں ہاتھ لے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ چوتھی زائد تکبیر ہوئی۔ دوسری بار امام کے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کے کہنے پر کانوں تک دونوں ہاتھ لے جاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ پانچویں زائد تکبیر ہوئی۔ تیسری بار امام اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتا ہے، پھر کانوں تک دونوں ہاتھ لے جاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ چھٹی زائد تکبیر ہوئی۔ چوتھی بار امام کے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنے پر رکوع میں چلا جانا چاہیے اور نماز پوری کرنی چاہیے۔"

انوار اور عارف نے احسان صاحب کی باتیں بڑے غور سے سنیں اور چھ زائد تکبیروں کا طریقہ یاد کرلیا۔ جب سب نماز کو جانے کے لیے تیار ہو گئے تو احسان صاحب نے عارف کی امی سے پوچھا: "آپ نے فطرہ تو تقسیم کر دیا تھا نا؟"

"جی ہاں، وہ تو پرسوں ہی میں نے مسجد کے ناظم خلیل صاحب کو بھجوا دیا تھا کہ ضرورت

مندوں میں تقسیم کر دیں۔"

انوار نے پوچھا: "خالو جان، یہ فطرہ کوئی مٹھائی ہوتی ہے جو خالہ جان نے تقسیم کرنے کے لیے مسجد بھجوا دیا؟"

عارف فطرہ کے بارے میں پہلی کتاب میں پڑھ چکا تھا، اس نے کہا: "نہیں بھائی یہ مٹھائی نہیں ہے بلکہ عید کی خوشی میں غریبوں کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی۔ یہ کیسی بری بات ہوگی کہ عید کے موقع پر کچھ لوگ تو نئے نئے کپڑے پہنیں، سویاں، مٹھائی، اور پھل کھا دیں اور جو غریب ہیں وہ ان سب چیزوں سے محروم رہیں۔ اس لیے ہمارا دین سکھاتا ہے کہ نماز سے پہلے ہر شخص پونے دو سیر کے حساب سے گیہوں یا اس کی قیمت نکال کر محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دے دیں۔ اسی کو "فطرہ" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان کے بعد جو عید آتی ہے اُسے عید الفطر کہتے ہیں۔"

انوار نے پوچھا: "لیکن خالو جان، ہم یہ کیسے جانیں کہ ضرورت مند کون ہے، فطرہ اسی کو دینا چاہیے۔؟"

احسان صاحب نے کہا: "اسی لیے ہماری مسجد کے شیخ خلیل نے پچھلے جمعہ کو اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ چاہیں وہ اپنے فطرہ کی رقم یا اناج ان کے پاس لا کر جمع کر دیں، وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں گے۔ ایسے بہت سے حاجت مند مسجد میں ان سے ملتے رہتے ہیں۔"

عارف نے کہا: "اور راستے میں جو بھکاری بیٹھتے ہیں ان کو بھی خیرات دیتے چلیں گے۔"

"نہیں بھئی راستوں پر بھیک مانگنے والوں کو پیسے دینے کا طریقہ اچھا نہیں ہے۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو ہٹے کٹے ہوتے ہیں، کہیں مزدوری یا کام کر کے اپنا پیٹ پال سکتے ہیں۔ ان کو بھیک دے کر ہم انھیں نکما بھی بنا دیتے ہیں اور خود ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ خیرات اور زکوٰۃ کے لیے بھی مسجدوں ہی میں صندوق رکھ دیں اور ان پر "خیرات" یا "زکوٰۃ" کا لفظ لکھ دیا جائے۔ پھر سال میں دو ایک بار انھیں کھول کر رقم یتیم خانے، مدرسے یا جانے پہچانے ضرورت مند لوگوں تک پہنچا دی جائیں۔ بیواؤں اور یتیموں کی مدد بھی اسی سے کی جا سکتی ہے۔" احسان صاحب نے بچوں کو سمجھانے

ہوئے کہا۔

اب بچوں نے کچھ شیر خرما اور سویاں کھائیں اور نماز کے لیے روانہ ہوگئے۔ احسان صاحب نے چلتے وقت بتایا: "یاد رکھو، جب ہم نماز کے لیے چلیں گے تو راستے میں ذرا آہستہ آواز سے تکبیر، تحمید، اور تسبیح پڑھتے ہوئے چلیں گے۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ دوسری بات یہ کہ نماز کے بعد جب تک خطبہ ہوتا رہے گا ہم اسی طرح بیٹھے رہیں گے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں۔ نہ باتیں کریں گے۔ نہ ادھر اُدھر دیکھیں گے۔ تیسری بات یہ کہ ہم ایک راستے سے جائیں گے تو واپس دوسرے راستے سے ہوں گے۔ مقصد یہ ہے کہ آتے جاتے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔ بس اب چلو، بسم اللہ۔

سب مل کر کہو۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔



(ہمارا دین حصہ سوم سے)

میرے پسندیدہ اشعار

آئندہ ماہ سے قلمی دوستی کی جگہ پر آپ کے پسندیدہ اشعار شائع کیے جائیں گے۔ شعر کے ساتھ شاعر کا نام اور اپنا نام و پتا علاحدہ صفحے پر لکھ کر بھیجیے۔

خورشید حیات

معلوماتی تھرمامیٹر

آج کے دور میں معلوماتِ عامّہ کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے، ہر طالب علم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے مختلف موضوعات پر معلومات حاصل ہوں۔ چنانچہ اس کے لیے لوگ رسالوں و دیگر ذرائع سے کام لیتے ہیں اور حقیقتاً یہ ان کے لیے معلومات عامہ میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے میں "پیام تعلیم" میں معلوماتی تھرمامیٹر کے عنوان سے معلوماتِ عامہ پر سوالات کا سلسلہ شروع کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ کوشش پیامی بھائی بہنوں کے لیے معلومات میں اضافہ کا سبب بنے گی۔

تو لیجیے تیار ہو جائیے اپنی معلومات آزمانے کے لیے آپ سے سات سوال پوچھے جا رہے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب صرف پندرہ منٹ میں دینا ہے۔ دیکھیے اس سے زیادہ وقت مت لیجیے گا۔ اگر جواب ٹھیک ٹھیک نہیں دے سکے تو اسی رسالہ میں جوابات دیکھ کر معلومات میں اضافہ کر لیجیے۔

۱۔ ریڈیوگراف کس چیز کو کہتے ہیں؟
۲۔ ٹیکومیٹر (Tacho metre) سے کیا چیز ناپی جاتی ہے؟
۳۔ کیا آپ زنگ کا کیمیائی نام بتا سکتے ہیں؟
۴۔ وہ کون سے ٹھوس عناصر ہیں جن کی کثافت پانی سے بھی کم ہے؟
۵۔ Infra red rays روشنی کی شعائیں ہیں یا حرارت کی؟
۶۔ اگر پروٹونس (Protones) کو فیوز کیا جائے تو کون سا عنصر حاصل ہوگا؟
۷۔ سب سے طاقت ور زہر کا نام بتائیے؟

جوابات معلوماتی تھرمامیٹر: ۱۔ X-Rays سے بننے والی فوٹو کو۔ ۲۔ کسی گھومتے ہوئے پہیے کی رفتار فی منٹ ۳۔ فیرک آکسائڈ (Ferric Oxide) ۴۔ لیتھیم، سوڈیم، پوٹاشیم ۵۔ حرارت کی ۶۔ ہیلیم (Helium) (۷) پوٹاشیم سائنائیڈ ●●

نیو کریم گنج۔ گیا۔ ۸۲۳۰۰۱۔



سفید ہاتھی

قسط نمبر ۲

کلثوم بانو

شیر اس کے قریب کھڑے ہو کر بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ چاہتا تھا آگے بڑھ کر بہادر کو اپنی خوراک بنالے لیکن وہ ڈر رہا تھا کیونکہ اسے جنگل کے بادشاہ کی وشبو قریب ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ ڈر کر بھاگ اٹھا کیونکہ جنگل کا بادشاہ جھومتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔

قریب پہنچ کر اس نے بہادر کو بڑے غور سے دیکھا۔ اپنی سونڈ اس کے چہرے کے ریب لے جا کر اس کی سانس دیکھی۔ اسے اطمینان ہو گیا۔ کیوں کہ بہادر مرا نہیں تھا صرف ، ہوش ہوا۔

سفید ہاتھی نے کچھ سردی محسوس کی اس لیے وہ اپنی سونڈ سے اس درخت کی ٹہنیوں کو نے لگا۔ درخت پر سرخ رنگ کے پھول لگے ہوئے تھے جو جھڑ جھڑ کر گرنے لگے اور انھوں بہادر کے جسم کو ڈھانپ لیا۔ صرف چہرہ باہر رہا۔ صبح ہوتے ہوتے بہادر ہوش میں یا اور اٹھ بیٹھا اور پھر اس کی نظر جو سفید ہاتھی پر پڑی اور رات والا واقعہ یاد آیا کہ کس طرح شیر اس کا پیچھا کر رہا تھا تو وہ ساری بات سمجھ گیا۔ اس کے دوست نے شیر سے اس کی جان بچائی تھی۔

پیارے دوست میں تمھارا شکریہ کس طرح ادا کروں اگر تم وقت پر نہ آتے تو شیر مجھے

ہلاک کر دیتا۔" بہادر نے کہا۔

اس پر ہاتھی نے سونڈ اٹھا کر خوشی کا اظہار کیا اور کپڑوں کا جو جوڑا بہادر کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ اٹھا کر بہادر کی طرف بڑھایا۔

بہادر نے مسکراتے ہوئے جوڑا پکڑ لیا اور پھر اٹھ کر آگے بڑھا۔ اب سفید ہاتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا اور پھر بہادر جیسے ہی جنگل سے نکل کر آبادی کی طرف بڑھا۔ سفید ہاتھی وہیں رک گیا۔ گاؤں میں پہنچ کر بہادر نے وہ جوڑا بچی کی ماں کو دیا تو اس نے اس کا شکریہ تک ادا نہ کیا اور بولی۔

"میری بیٹی کا کھا کھا کر کس طرح موٹے ہو رہے ہو کچھ کام کیا کرو۔"

"کام تو دن رات کرتا رہتا ہوں اور کیا کروں"، بہادر بولا۔

"آگے سے زبان چلاتے ہو دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے۔" وہ بڑھیا غصے سے بولی۔

"میں نے کل سے کچھ کھایا نہیں، نانی اماں کچھ کھانے کو تو دو۔" بہادر بولا۔

"گھر میں تو کچھ ہے نہیں یہ لو دس پیسے اس سے کچھ لے کر کھا لینا۔" بڑھیا بولی۔

اور پھر بہادر دس پیسے لے کر بازار میں گیا۔ بھلا دس پیسے میں کیا آتا وہ سیدھا ایک پھل والے کی دکان پر گیا اور اسے دس پیسے دیتے ہوئے بولا۔

"چچا دس پیسے کے کیلے دے دو۔ میں اپنے ساتھی ہاتھی کو دوں گا۔"

دکاندار رحم دل انسان تھا اس نے اسے چار کیلے دے دیے اور دس پیسے بھی واپس کر دیے بہادر اب تیز تیز چلتا ہوا جنگل کی طرف بڑھا وہاں پہنچا تو ہاتھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"دیکھو میرے ساتھی میں تمہارے لیے کیلے لایا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دو کیلے ہاتھی کے منہ میں ڈالے اور دوسرے کیلوں کو چھیل کر خود کھانے لگا۔ اس دوران دس پیسے اس کے ہاتھ سے گر پڑے جن پر ہاتھی کی نظر پڑ گئی وہ ان سکوں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا اور پھر زمین پر بیٹھ کر اس نے بہادر کو اپنی کمر پر سوار کر لیا اور لے کر ایک طرف چل دیا۔

خاصی دیر چلنے کے بعد وہ ایک غار کے قریب پہنچ گیا اور اس نے بہادر کو نیچے اتارا اور پھر اپنی لمبی سونڈ غار کے اندر ڈالی اور واپس نکال کر ایک سکہ بہادر کے سامنے

ڈال دیا۔

بہادر اس سکے کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ کیوں کہ وہ سونے کا سکّہ تھا۔ بہادر نے وہ سکّہ سنبھال کر رکھ لیا، اور پھر جب وہ واپس گھر گیا تو وہ سکّہ اس نے اپنے بہن کو دکھایا۔ جسے دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئی۔ اس نے اپنے بھائی پر شک نہیں کیا مگر پوچھا۔

"بہادر یہ سکّہ تمھیں کہاں سے ملا؟"

"بہن یہ مجھے میرے ساتھی ہاتھی نے دیا تھا۔ میرا خیال ہے اس جنگل میں ایسے بہت سے سکّے ہیں۔"

"اچھا" آسیہ حیران ہو کر بولی۔

"ہاں بہن! میرا ساتھی ہاتھی مجھے ایسے بہت سے سکّے دے سکتا ہے۔ میں اس سے اور سکّے مانگوں گا۔"

بہادر! پھر تو ہم بہت امیر ہو جائیں گے۔ اچھے اچھے کپڑے پہنیں گے اور پھر میں تمہیں کتابیں بھی لے دوں گی اور اسکول میں بھی داخل کرا دوں گی۔" آسیہ کہتی چلی گئی۔ لیکن اسے خبر نہیں تھی کہ اس کی چچی ان کی باتیں سن چکی ہے اور وہاں سے جا کر اس نے اپنے خاوند کو بھی یہ باتیں بتا دیں اور بولی۔

"دیکھو میاں اب اگر ہم امیر بننا چاہتے ہیں تو اس وقت تک ان بچّوں سے اچھا سلوک کرو جب تک وہ خزانہ ہمیں نہ مل جائے۔" اور پھر دونوں میاں بیوی ان سے بہت اچھا سلوک کرنے لگے ان لوگوں سے کام بھی زیادہ نہ لیتے۔

اور پھر ایک دن بہادر کا چچا بولا۔

"بیٹے بہادر، گانو کا چودھری بہت تنگ کر رہا ہے۔ دراصل تمھارے باپ کو اس کا قرض ادا کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں میں شہر چلا جاؤں اور وہاں سے محنت مزدوری کر کے بہت سے سکّے کما لاؤں اور چودھری کا قرض اتار دوں۔"

بہادر چچا کی چال میں آ گیا اور بولا۔

"چچا تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ یہ دیکھ کر اس کا چچا بھی اس کے پیچھے ہو لیا اور پھر اس نے دیکھا، بہادر ایک غار میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد جب غار میں سے نکلا تو اس کی مٹھیاں سکّوں سے بھری ہوئی تھیں۔

یہ دیکھ کر وہ اس کے آگے آگے بھاگ کر واپس اس جگہ آ گیا اور یوں بیٹھ گیا جیسے یہاں سے اٹھا ہی نہ ہو۔ بہادر نے وہ سکے اپنے چچا کے آگے ڈال دیے اور بولا۔

"چچا یہ لو ان سکوں سے میرے باپ کا قرض اتار دو۔"

سکوں کی چمک نے اس کے چچا کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ وہ حیرت سے ان سکوں کو دیکھنے لگا اور پھر دونوں واپس گھر آ گئے۔

جب رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو جگایا اور وہ سکے اس کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ جنھیں دیکھ کر وہ بھی چونک پڑی۔

"ارے حیران کیا ہو رہی ہو۔ میں نے اس خزانے کو دیکھ لیا ہے جہاں سے بہادر یہ سکے اٹھا کر لایا ہے۔" وہ جوش کی حالت میں بولا۔

"تو پھر اب کیا کریں؟" اس کی بیوی حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"کرنا کیا ہے ایک بوری اور لالٹین ساتھ لو ہم ابھی وہاں جاتے ہیں اور بوری بھر کر سکے لے آتے ہیں۔" وہ بولا اور پھر دونوں میاں بیوی ایک بوری لے کر وہاں سے جنگل کی طرف بڑھے اور پھر جنگل میں داخل ہو کر اس غار کی طرف چلے، جہاں سے بہادر سکے لایا تھا۔ اور وہاں پہنچ کر انھوں نے لالٹین جلائی اور غار میں داخل ہو گئے۔

ان کے سامنے سکوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو لالٹین کی روشنی میں جگمگا اٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر ان دونوں میاں بیوی کے ہوش اڑے جا رہے تھے خوشی کے مارے دونوں سکوں کو مٹھیوں میں اٹھا اٹھا کر اچھالنے لگے۔

ابھی وہ خوشی پر قابو نہیں پائے تھے کہ ایک دم چونک پڑے، قریب ہی دو ناگ اپنے پھن اٹھائے پھنکار رہے تھے۔

کہتے ہیں سانپ کا بہت خوف ہوتا ہے۔ یہی حالت اس وقت میاں بیوی کی ہو رہی تھی، خوف کے مارے ان دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے دونوں چیختے چلاتے ہوئے غار سے نکلے کیوں کہ دونوں کو سانپوں نے ڈس لیا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے ایک سمت چلے کچھ دور جا کر دونوں گر پڑے اور تڑپنے لگے۔ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اس جنگل میں ان کی یہ حالت دیکھنے والا کوئی نہیں تھا ان کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں اور پھر دونوں کے جسم ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس طرح ظلم اور لالچ کا انجام پورا ہوا۔

صبح سویرے بہادر اور آسیہ جب اٹھے تو چچا اور چچی کو نہ پاکر دونوں حیران ہوئے اور پھر بہادر نے کل والا واقعہ جب آسیہ کو بتایا تو وہ سمجھ گئی اور بولی۔

" بہادر میرا خیال ہے چچا اور چچی ضرور جنگل میں خزانہ حاصل کرنے گئے ہیں اور ہو سکتا ہے انھیں کسی جانور نے ہلاک کر دیا ہو۔"

"ہاں جنگل میں بہت خوفناک درندے ہیں۔"

بہادر بولا اور پھر دونوں بہن بھائی جنگل کی طرف دوڑے اور چچا اور چچی کو تلاش کرتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے جہاں کچھ فاصلے پر انھیں ان دونوں کی لاشیں نظر آگئیں۔

یہ دیکھ کر وہ لوگ گاؤں واپس آئے اور لوگوں کو بتایا کہ ان کے چچا اور چچی کو جنگل میں کسی نے ہلاک کر دیا ہے۔

گاؤں والوں نے یہ سنا تو وہ لوگ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لیے ان کے ساتھ ہو لیے اور پھر جب وہ لوگ ان لاشوں کے قریب پہنچے اور دونوں کو دیکھا تو سمجھ گئے کہ انھیں کسی زہریلے سانپوں نے کاٹا ہے اور پھر وہ ان لاشوں کو اٹھا کر گاؤں لے آئے جہاں ان دونوں کو ایک قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اب آسیہ اور بہادر اکیلے رہ گئے تھے۔

بہادر بھیڑ بکریوں کو جنگل میں لے جاتا۔ یہ لوگ بکریوں کا دودھ بیچ کر گھر کا خرچ چلا رہے تھے پھر انھیں دنوں شکاریوں کا ایک ٹولا اس گاؤں سے گزرا۔ ان لوگوں نے گاؤں سے بہت سے لوگوں کو اچھے معاوضے پر جنگل میں ساتھ چلنے کو کہا۔ جس پر گاؤں کے بہت سے لوگ تیار ہو گئے۔ ان لوگوں میں بہادر بھی تھا۔ وہ اگر چاہتا تو جنگل کی غار میں سے بہت سی اشرفیاں حاصل کر کے دونوں بہن بھائی خوب عیش سے زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن وہ محنت مزدوری کر کے روپیا کمانا چاہتا تھا اور پھر وہ اپنے چچا اور چچی کا حشر بھی دیکھ چکا تھا۔ اس لیے معقول معاوضے پر وہ ایک شکاری کے ساتھ ہو گیا۔ گو وہ ابھی بچہ تھا، لیکن شکاری کو جب یہ پتا چلا کہ یہ لڑکا اس جنگل سے خوب واقف ہے تو وہ اسے ساتھ رکھنے پر رضامند ہو گیا۔ اور یہ لوگ چھکڑا گاڑیوں پر سوار جنگل کی طرف چل دیے۔

کچھ شکاریوں کے پاس اپنے ہاتھی بھی تھے۔ جنگل میں پہنچ کر ان لوگوں نے پڑاؤ ڈال دیا اور شکار کی تلاش میں لگ گئے۔ اس دوران بہادر موقع پاکر اپنے دوستوں یعنی مینا اور سفید ہاتھی سے مل آتا۔

ایک دن ایک آدمی نے بہادر کو سفید ہاتھی کے ساتھ دیکھ لیا اور اس نے آکر یہ بات شکاریوں کو بتائی۔

سفید ہاتھی کا سن کر سبھی شکاری اس ہاتھی کو پکڑنے کے لیے تیار ہو گئے کیونکہ دنیا میں سفید ہاتھیوں کی نسل نایاب تھی۔

وہ لوگ جانتے تھے کہ سفید ہاتھی کے اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے۔

اس بات کا بہادر کو بھی پتا چل گیا اور وہ چھپ کر اپنے دوست سفید ہاتھی کے پاس گیا اور بولا۔

"میرے پیارے دوست! تم دور کہیں بھاگ جاؤ شکاری تمھیں پکڑ لیں گے۔"

لیکن ہاتھی نے سونڈ اٹھا کر انکار کیا۔

"نہیں میرے دوست وہ لوگ بہت ہیں اور پھر ان کے پاس بہت سے ہتھیار ہیں اس لیے تم بھاگ جاؤ۔" ابھی وہ ہاتھی سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے بہت سے شکاری وہاں آگئے اور انھوں نے چاروں طرف گھیرا ڈال کر سفید ہاتھی کو پکڑ لیا اور لے جا کر اس کے پاؤں میں موٹے موٹے سنگل ڈال دیے۔

یہ دیکھ کر بہادر نے ان شکاریوں کے ہاتھ جوڑ لے منتیں کیں کہ وہ سفید ہاتھی کو چھوڑ دیں۔ بھلا وہ لوگ اس بچے کی بات کیسے مان سکتے تھے۔ جب کہ انھیں پتا تھا کہ اس ہاتھی کے انھیں بہت دام مل جائیں گے۔ ان شکاریوں میں ایک رحم دل شکاری بھی تھا۔ اسے بہادر پر ترس آرہا تھا لیکن وہ مجبور تھا کیوں کہ دوسرے شکاری اس کے کہنے پر سفید ہاتھی کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہ لوگ بہت ہی لالچی قسم کے لوگ تھے وہ بہادر سے بولا۔

"بیٹے بہادر کیا سفید ہاتھی سے تمھاری بہت دوستی ہے؟"

"ہاں جناب وہ میرا پکا دوست ہے۔" بہادر نے جواب دیا۔

"بیٹے اگر میرے پاس اتنے روپے ہوتے کہ میں ان لوگوں کو دے کر اس ہاتھی کو چھڑا سکتا تو میں تمھارے لیے ضرور یہ کام کرتا۔ مجھے پتا چلا ہے تم دلاور خان کے بیٹے ہو اور دلاور خان میرا دوست تھا" وہ شکاری بولا۔

"چچا اگر ان لوگوں نے میرے دوست ہاتھی کو نہ چھوڑا تو بہت برا ہوگا۔ یہ ہاتھی جنگل کا بادشاہ ہے اور ہر بادشاہ کی اپنی ایک فوج ہوتی ہے مجھے امید ہے وہ فوج اپنے بادشاہ کو بچانے ضرور آئے گی۔" بہادر کہتا چلا گیا۔

"ہاں بیٹے! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی بزرگوں سے سُنا ہے جس طرح انسانوں کے بادشاہ ہوتے ہیں اسی طرح جنگل کا بھی ایک بادشاہ ہوتا ہے" شکاری نے کہا۔

بہادر سفید ہاتھی کے پاس جاکر بہت رویا اور بولا! دوست میں جا رہا ہوں۔ میناکو تمہارے بارے میں بتادوں گا' ہو سکتا ہے وہ کچھ مدد کرے "سفید ہاتھی نے سونڈ اٹھاکر اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھر بہادر وہاں سے بھاگا۔ وہ دوڑتا جارہا تھا اور میناکو پکارتا تھا اور پھر ایک جگہ اسے مینا کی آواز سنائی دی جو آم کے ایک درخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"بہادر، بہادر کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو"

اور پھر بہادر رُک گیا اور درخت پر بیٹھی ہوئی مینا کو دیکھ کر بولا۔

"مینا مجھے بتاؤ جنگل کے تمام جانور سفید ہاتھی کی رعایا ہیں اور فوج بھی؟ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو" مینا بولی۔

جنگل کے بادشاہ کو شکاریوں نے پکڑ لیا ہے تم بادشاہ کی فوج کو بلاؤ تاکہ وہ اپنے بادشاہ کو چھڑائیں" بہادر بولتا چلا گیا۔

اس کی بات سن کر مینا پکاری۔

"بھاگو دوڑو اپنے بادشاہ کی مدد کو آؤ" اس کی آواز پورے جنگل میں گونجتی چلی گئی اور اس کی آواز پر سانپ بچھو' شیر بھیڑیے ہاتھی تمام جانور دوڑے چلے آئے پورے جنگل میں ہلچل مچ گئی۔ شکاری اپنے ٹھکانوں میں پڑے آرام کر رہے تھے کہ اس شور کو سن کر گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر جنگلی جانوروں کی فوج کی فوج دیکھ کر خوف زدہ ہوگئے۔ لیکن جنگلی جانوروں نے انھیں بھاگنے کا موقع نہیں دیا جو شخص جس کے ہاتھ لگا ہلاک ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سوائے اس نیک شکاری کے تمام لوگ ہلاک ہو گئے۔ اس طرح جنگل کے بادشاہ کو آزادی ملی۔ اب بہادر سفید ہاتھی پر سوار تھا اور جنگلی جانوروں کی فوج ان کے ساتھ تھی۔ سفید ہاتھی بہادر کو جنگل کے پار تک چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ نیک دل شکاری حیران تھا کہ کوئی جانور بھی انسان کا ایسا دوست ہو سکتا ہے۔ شکاری بہادر کے ساتھ اس کے گاؤں آگیا۔ اس نے سیتا اور بہادر کو اپنا بیٹا بنالیا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا تھا تاکہ سیتا کا کسی اچھی جگہ شادی کردے اور بہادر کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنا سکے۔

وہ دونوں بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئے۔

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

توحید ربانی خاں

کوہ قاف کا جادوگر



ملک یونان
کی شہزادی عندلیب
بہت خوبصورت تھی۔
اس کی خوبصورتی کا چرچا
دُور دُور تک پھیلا ہوا
تھا۔ جو بھی اسے دیکھتا
بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔
ایک دن
شہزادی باغ میں
سیر کر رہی تھی۔ آسمان
پر شہزادہ جن سیر کر
رہا تھا۔ اس کی نظر
شہزادی پر پڑ گئی
اس نے اتنی خوبصورت
شہزادی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

شہزادہ جن باغ میں اُتر آیا۔ اور شہزادی کو اٹھا کر اپنے ساتھ اپنے محل میں لے گیا۔ د
اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

اُدھر بادشاہ کے محل میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ملکہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ چاروں طرف شاہی فوج کے سپاہی شہزادی کو تلاش کر رہے تھے۔

جب شہزادی، شہزادہ جن کے مجبور کرنے پر بھی اس سے شادی پر راضی نہ ہوئی تو شہزادے جن نے شہزادی کو کوہ قاف کی ایک پہاڑی کے غار میں قید کر کے ایک کالے جن کو حفاظت پر مامور کر دیا

بادشاہ نے پورے ملک میں اعلان کر وا دیا کہ جو بھی شہزادی کو تلاش کر کے لائے گا، اسے انعام میں آدھی سلطنت دے دی جائے گی اور اس کی شہزادی سے شادی کر دی جائے گی۔ بہت سے نوجوانوں نے شہزادی کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی ایک بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

اس شہر کی فصیل کے پاس رحیم نامی ایک راج رہا کرتا تھا۔ رحیم اب بوڑھا ہو گیا تھا اس لیے اس کا فرمانبردار بیٹا پرویز دن بھر محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے ماں باپ کا پیٹ پالتا تھا۔ پرویز ہمیشہ سچ بولتا تھا، اس نے کبھی اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہیں کی تھی۔ جب پرویز کو شہزادی کی گمشدگی کا حال معلوم ہوا تو اس نے بھی شہزادی کو تلاش کرنے کا ارادہ کر لیا۔

پرویز، والدین کی اجازت اور دعائیں لے کر گھر سے رخصت ہوا۔ سارا دن وہ شہزادی کو تلاش کرتا رہا۔ چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچا۔ اس نے وہاں ایک جھونپڑی دیکھی۔ وہ اس کے اندر چلا گیا۔ اس نے دیکھا ایک بزرگ آنکھیں بند کیے عبادت میں مصروف تھے۔ جب بزرگ عبادت سے فارغ ہوئے تو پرویز نے سلام کیا اور اپنا مقصد بیان کیا۔

بزرگ نے کہا بیٹا چونکہ تم اپنے والدین کا کہنا مانتے ہو، اور سچ بولتے ہو اس لیے میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔

پھر بزرگ نے پرویز کو ایک چمک دار تارا اور ایک تلوار دی۔ اور کہا کہ یہ تارا تم اپنے ہاتھ میں پکڑ لو۔ یہ تمہیں کوہ قاف کے غار تک پہنچا دے گا۔ اور یہ تلوار پہرے دار جن کو ہلاک کرنے میں تمہیں مدد دے گی۔

پرویز نے دونوں چیزیں لے کر بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ جب پرویز کوہ قاف کے غار پر پہنچا تو اس وقت پہرے دار جن سو رہا تھا۔

پرویز نے ایک ہی وار میں جن کو ختم کر دیا اور چمک دار تارے کی مدد سے شہزادی کو لے کر اپنے گھر پہنچ گیا۔

محل میں ان کے پہنچتے ہی چاروں طرف خوشیاں بکھر گئیں ہر طرف پرویز کی تعریف کی جا رہی تھی۔ بادشاہ

نے پرویز کا شکریہ ادا کیا اور چند دنوں بعد پرویز کی شادی شہزادی سے کر دی۔
تھوڑے ہی عرصے بعد بادشاہ نے پرویز سے کہا بیٹا میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس سلطنت کا بار تم پر ڈالنا چاہتا ہوں۔ اور یوں پرویز بادشاہ بن گیا۔
پیارے بچو! یہ سب کچھ پرویز کو ماں باپ کی فرماں برداری کے نتیجے میں ملا تھا۔ اس لیے ہمیں بھی ماں باپ کی فرماں برداری کر کے ان سے دعائیں لینی چاہییں چونکہ ان کی دعاؤں میں بہت اثر ہوتا

بقیہ صفحہ ۱۲

پھر ایک دن جب یہ لوگ شہر جانے کے لیے نکلے تو سامنے سفید ہاتھی کو کھڑے پایا۔ اس لوہے کا ایک صندوق اپنی سونڈ میں اٹھایا ہوا تھا۔ اور وہ صندوق اس نے بہادر کے قدم کے قریب رکھ دیا اور سونڈ اٹھا کر بہادر کو الوداع کہنے لگا۔
بیٹے یہ تمھارے دوست کی طرف سے تمھیں تحفہ ملا ہے اس میں جو سونے کے سکے ہیں، شہر کی زندگی میں تمھارے بہت کام آئیں گے اور پھر اس صندوق کو ایک بیل گاڑی پر لاد دیا گیا تمام گانو والوں نے ان کو الوداع کہا۔ سفید ہاتھی اس وقت تک واپس جنگل میں نہیں گیا جب تک ان کی بیل گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

اچھی باتوں کو یاد رکھیے

کسی کام میں عجلت پسندی اگرچہ اچھی نہیں ہوتی مگر پانچ کام ایسے ہیں جن میں عجلت بالکل معیوب نہیں ہے بلکہ ان میں جلدی کرنا بڑا ثواب ہے۔ مہمان کو روٹی کھلانا، میت کو دفن کرنا، قرض ادا کرنا۔ گناہوں سے توبہ کرنا۔ بالغ کی شادی کرنا۔

دانا دوست کی تلاش

لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا بیٹے دیانت داری اور ایمان داری کے بعد ایک اور دانا دوست کو تلاش کرنا نہ بھولنا۔ کیوں کہ ایک دانا دوست پھل دار درخت کی طرح ہوتا ہے کہ اگر اس کے نیچے بیٹھو گے تو سایہ دے گا اور اگر اوپر چڑھو گے تو پھل دے گا۔

حامد ریاض ڈوگر

عید کی دوہری خوشی

عید مسلمانوں کے لیے مسرت اور خوشی کا تہوار ہے اس موقع پر دنیا بھر میں مسلمان نہا دھو کر نئے اور صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں، عمدہ کھانے پکا کر خود کھاتے اور ہمسایوں، دوستوں اور عزیزوں میں تقسیم کرتے ہیں، تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر تمام مسلمان یہ خوشیاں عطا فرمانے پر اپنے پیدا کرنے اور پالنے والے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں۔

پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ منوّرہ میں عید کا ایک ایسا ہی دن تھا۔ نبی اکرمؐ نماز عید کے لیے عید گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں بچے رنگا رنگ لباس پہنے خوش خوش کھیل کود میں مصروف تھے۔ بچوں کو خوش دیکھ کر پیارے رسولؐ بھی خوش ہو رہے تھے۔ کہ اچانک آپ کی نظر ایک بچے پر پڑی جس کے کپڑے پرانے اور میلے کچیلے تھے۔ اور وہ سب بچوں سے الگ تھلگ بیٹھا رو رہا تھا۔ پیارے رسولؐ سے یہ دیکھا نہ گیا فوراً اس بچے سے رونے کی وجہ پوچھی۔ ہمدردی کے دو بول سن کر بچا اور زور زور سے رونے لگا آپ نے اسے دلاسا دیا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر دوبارہ رونے کا سبب پوچھا جس پر بچے نے بتایا کہ میرے والد ایک جنگ میں شہید ہو گئے تھے میری والدہ نے بعد میں ایک اور شخص سے شادی کر لی اور مجھے بھی ساتھ لے گئیں لیکن میرے نئے والد زیادہ دن مجھ سے خوش نہ رہ سکے اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ میری والدہ محبت کے باوجود اب میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے اب میں بے سہارا ہوں، نہ میرا کوئی گھر ہے اور نہ والدین۔ ان حالات میں مجھے نئے کپڑے کون دے؟ اور میں عید کیسے مناؤں؟ بچے کی درد بھری کہانی سن کر پیارے رسولؐ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ آپؐ نے بچے سے فرمایا" بیٹے کیا تم پسند کرو گے کہ کیا اللہ کے رسولؐ تمہارے باپ، عائشہؓ تمہاری امّی اور فاطمہؓ تمہاری بہن بن جائیں؟" بچے نے یہ سنا تو ذرا سنبھلا، حیرانی و خوشی کے ملے جلے جذبات سے آپؐ کی طرف غور سے دیکھا اور کہنے لگا" اللہ کے رسولؐ مجھے معاف

کہنے لگے ۔ میں نے آپؐ کو پہچانا نہیں تھا اس لیے بے باکی سے باتیں کرتا رہا" حضورؐ نے بچے کو تسلی دی اور کہا "بیٹے کوئی بات نہیں" پھر بچے کا ہاتھ محبت سے پکڑا اسے گھر لے آئے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ "عائشہؓ اللہ تعالےٰ نے ہمیں عید کے دن ایک اور خوشی عطا فرمائی ہے اور یہ بیٹا عطا فرمایا ہے ۔ لو اسے نہلا دھلا کر اچھے کپڑے پہناؤ اور مزے دار کھانے کھلاؤ" یہ سن کر حضرت عائشہؓ کا چہرہ بھی خوشی سے چمکنے لگا اور وہ خوشی خوشی بچے کو عید کے لیے تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں ۔

یہ بچہ تمام عمر حضورؐ کے پاس رہا اور جب آپؐ کا وصال ہوا تو غم سے اس بچے کا بہت برا حال تھا اور وہ سب سے کہتا پھرتا تھا "آج میں یتیم ہو گیا" حضرت صدیق اکبرؓ نے جب بچے کو غم سے نڈھال دیکھا تو پیار سے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور فرمایا "آج سے تم میرے گھر میں رہو گے ۔"

ننھے منّے اور اچھے ساتھیو! پیارے رسولؐ کی زندگی کے اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد ہمیں یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم بھی اپنے غریب اور بے سہارا بھائیوں کی مدد کریں گے اور انھیں اپنی خوشیوں میں ہمیشہ شریک رکھیں گے ۔

عید

مہدی پرتاپ گڑھی

ہو گیا ختم آج ماہِ صیام
"عید کا دن" خدا کا ہے انعام
عید کا چاند، اک نیا پیغام
عیش کی داستان ہیں خاص و عام
کیجیے زیبِ تن نئے کپڑے
اور غریبوں پہ چاہیے اکرام
حق ادا ہو یتیم و مسکین کا
تا کہ تم پہ خدا کا ہو انعام
عید کے دن گلے ملو سب سے
ہے مساوات کا یہی پیغام
ایک آہنگ پہ قدم رکھو
دہر میں امن کو ملے گا قیام
اپنے ہم سایے سے جو مل کے رہے
ہو گا اس آدمی کا خوش انجام

عید اپنی وہی ہے اے مہدی
امن سے جب رہیں گے سارے عوام

شاہجہاں علی شاہ

یتیم کی عید

عید کا دن تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز ادا کرنے کی غرض سے عید گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں بچے عید کی خوشی میں رنگ برنگے کپڑے پہنے کھیل کود رہے تھے۔ حضور اکرمؐ ان بچوں بچیوں کو زرق برق لباس میں ملبوس دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور بچوں کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ آپؐ کی نظر ایک ایسے بچے پر پڑی جو ایک گلی کے کونے پر بیٹھا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کا لباس پھٹا پرانا، پیوند زدہ اور نہایت میلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس بچے نے کئی دن سے غسل نہ کیا ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کو دیکھ کر پوچھا تم کیوں رو رہے ہو ان بچوں کے ساتھ کھیلتے کیوں نہیں۔ لڑکے کو یہ معلوم نہ تھا کہ آپ ہی رسولِ خدا ہیں۔ اس نے روتے ہوئے جواب دیا کہ میرے والد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جہاد میں گئے تھے اور وہیں شہید ہو گئے۔ میری والدہ نے دوسرے شخص سے شادی کر لی اور میرے نئے والد نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا وہ مجھے کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں دیتے یہ کہہ کر لڑکا پھر رونے لگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عالمین کے لیے رحمت تھے۔ آپؐ نے اس معصوم بچے کی داستان سنی تو آپ کو دکھ ہوا۔ آپؐ نے شفقت سے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارا باپ، عائشہ تمہاری ماں علی تمہارے چچا اور حسن و حسین تمہارے بھائی بن جائیں۔

لڑکا کچھ دیر کے لیے حیران ہو گیا اور پھر جلدی سے بولا کیوں نہیں یا رسول اللہ!
حضورؐ پر نور اس بچے کو فوراً اپنے گھر لے گئے حضرت عائشہؓ اس بچے کو دیکھ کر خوش

ہوئیں۔ جلدی جلدی نہلا کر اچھے اچھے کپڑے پہنائے اور پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ بچّہ نئے کپڑے پہن کر بہت خوش ہوا اور دوڑتا ہوا گھر سے نکل گیا اور ان کھیلتے ہوئے بچّوں سے جا ملا وہ لڑکے اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حیران بھی ہوئے اور پوچھنے لگے ابھی کچھ دیر پہلے تو تم رو رہے تھے اور تمھارے کپڑے بھی میلے کچیلے تھے۔ یہ تم اتنی جلدی کیسے بدل گئے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ میں بھوکا پیاسا تھا۔ حضورؐ نے مجھے کھلایا پلایا۔ میرے کپڑے میلے تھے حضورؐ نے مجھے نئے کپڑے دیے۔ میں یتیم تھا اور اب حضورؐ میرے ابّو حضرت عائشہؓ میری ماں۔ حضرت علیؓ میرے چچا۔ فاطمہؓ میری بہن اور حضرت حسن و حسین میرے بھائی ہیں۔ جب سب لڑکوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو بے اختیار کہنے لگے۔ کاش ہمارے ماں باپ بھی اسی جہاد میں شہید ہو گئے ہوتے تاکہ ہمیں بھی یہ خوش نصیبی حاصل ہوتی۔

مجیب ظفر موبی



اپنے عید کے جوڑے کے بھاری سے سرخ دوپٹے پر گوٹا ٹانکتے ہوئے آپی نے ہمیں قہر آلود نظروں سے گھورا۔ "موبی اس منحوس کو میرے کمرے سے لے جاؤ فوراً۔" وہ غصّے سے بولیں۔ "وہ آپی آپ اپنے غرارے کا بچا ہوا کپڑا دے دیں نا۔" ہم نے التجائیہ لہجے میں آپی سے کہا۔ "کیا...؟؟" آپی آنکھیں نکال کر چیخیں اور پھر دوپٹا اپنے ہاتھوں میں سے رکھ کر ہماری طرف دیکھ کر غصّے سے بولیں: "اس کو لے جاؤ یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔" وہ وزے کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ہم بات بنتی نہ دیکھ رنا چار اپنے چہیتے چوزے کو لے کر ان کے کمرے سے نکل آئے۔



ہوا یوں کہ ہماری چتکبری مرغی نے ایک عدد چوزے صاحب جنم دیا اور خود اس دنیائے فانی کو داغ مفارقت دے گئیں۔ ہمیں اس بن ماں کے چوزے پر بے انتہا ترس ا اور ہم نے اس کی پرورش اپنے ذمّے لینے کی سوچی۔ یہ چوزا ہمیں جان سے پیارا تھا۔ اور سے زیادہ پیارا آپی کو تھا۔ مگر ایک واقعے نے آپی کے دل میں اس چوزے کے خلاف سخت نفرت ں دی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے ہم سب رات کے وقت ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھے تھے قریب ا صوفے پر آپی بھی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ مگر ان کے ہاتھ سلائیوں پر تیزی سے کام کر ہے تھے۔ آپی اون سے خوب صورت میز کور بن رہی تھیں۔ اسی اثنا میں وہ چوزہ پھرتا پھڑتا مرآنکلا اور آپی کے اون کے گولے پر ٹھونگیں مارنے لگا۔ آپی اسے نہ دیکھ سکیں اور نظریں ٹی ، اسکرین پر جائے سلائیاں چلاتی رہیں۔ اب جو بے خیالی میں اون کھینچی تو چوزہ اون میں کر اُن کے ساتھ ان کی انگلیوں سے ٹکرایا۔ اس وقت تک ان کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر ں۔ اب جو انھیں اپنی انگلیوں کے نیچے کسی جاندار شے کے وجود کا احساس ہوا تو وہ ایک

دل خراش چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مگر جب ان کی نظریں چوزے پر پڑیں تو وہ سخت ناراض ہوئیں اور اس چوزے سے ہمیشہ کے لیے کٹی کر لی۔

اس واقعے کے بعد آپی کے دل میں چوزے کے خلاف نفرت کے جذبات سلگنا شروع ہو گئے تھے مگر ایک اور واقعے نے انھیں چوزے کا جانی دشمن بنا دیا۔ اس واقعے نے چوزے کے خلاف آپی کے دل میں نفرت کی جڑیں پختہ کر دیں۔ پاپا کے دفتر سے آنے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ ہماری نوکرانی صاحبہ چھٹی پر تھیں اور آپی روٹی پکا رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا اور یہ وقت چوزے کے گھومنے پھرنے کا وقت تھا۔ حسب عادت وہ کم بخت گھومتا پھرتا آیا اور آپی کو روٹی پکاتے دیکھا تو جھٹ چھلانگ مار کر ان کی گود میں جا بیٹھا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹیں اور ان کا پیر چولھے سے لگا۔ چولھے پر توا تھا، چولھا جلنے سے وہ توا کھولتا گرم سرخ تو آپی کے پیر پر آ گرا۔ اب تو آپی نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور روتی دھوتیں امی کے پاس بھاگیں۔ امی کو جب سارے واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے انتہائی غصے سے کہا "آنے دو آج اپنے پاپا کو۔ آج اس چوزے کے گلے پر چھری ہی رکھنی ہوگی۔" یہ سن کر ہم لرز گئے اور امی سے بولے "امی اس بار اس کی جان بخش دیں آئندہ یہ آپی کے قریب بھی نہ آئے گا۔" "چپ نالائق۔" آپی نے جل کر کہا اور ہمارے ایک ہاتھ رسید کیا اور بولیں "تم سے مرغی وصیت کر کے مری تھی کہ میرے بعد میرے بچے کا خیال رکھنا۔" "ہاں آپی ایسا ہی سمجھ لیں۔" ہم بولے۔ "ابھی سمجھتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لنگڑائی ہوئی ہمارے پیچھے بھاگیں۔ مگر ہم رفوچکر ہو گئے۔ ہمیں اپنی آپی کے نقصان کا سخت افسوس تھا مگر ہم دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ان دنوں ہماری عمر بھی نو یا دس سال تھی اور ہم میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی بہت کم تھی۔ آپی تو ہم سے شدید محبت کرتی تھیں۔ شام کو میٹھے سموسے اور صبح کو پراٹھا بنا کر دیتی تھیں۔ مگر وہ چوزے سے بہت ڈرتی تھیں اس دن بھی ہماری منتوں اور رونے پیٹنے سے چوزے کو بچا لیا۔ ورنہ ندیم بھائی تو گٹر کے ڈھکنے پر چھری بھی تیز کر کے لے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں نزلہ ہے۔ چوزے کا سوپ بنا کر پئیں گے۔ مگر ہماری آہ و بکا نے چوزے میاں کو موت کے منھ سے نکال لیا۔ "بھئی آخر تمھیں اس سے اتنی محبت کیوں ہے؟" ندیم بھائی منھ میں بھر آنے والے پانی کو نگلتے ہوئے بولے۔ "پتا نہیں۔" ہم نے ٹال مٹول سے جواب دیا۔ آپی۔ خونخوار نظروں سے چوزے کو صحن میں پھدکتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

دن گزرتے رہے عید کا زمانہ آگیا۔ سارا گھر نئے نئے کپڑے بنا رہا تھا۔ چوزے کا تن ڈھکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس بات سے دل برداشتہ ہو کر ہم آپی کے کمرے میں گئے تھے۔ مگر ان کا ٹکا سا جواب سن کر ہم چپ چاپ ان کے کمرے سے نکل آئے۔ اگر وہ اپنے غرارے کا بچا ہوا ذرا سا کپڑا چوزے کے نام خیرات ہی کر دیتیں۔ تو کیا قیامت آجاتی بھلا آج چاند رات تھی۔ پورے گھر میں ہلچل مچی تھی۔ مگر ہم چوزے کی پوزیشن کے متعلق سوچ رہے تھے کہ کل عید پر ہم اسے کیا پہنائیں گے۔ یکایک امی کی آواز سنائی دی وہ آپی کو بلا رہی تھیں۔ رانی بیٹی ذرا اپنے کرتے کے لیے کاسنی رنگ کی ربن لے آؤ موبی کے ساتھ جاکر" امی نے کمرے میں سے آواز لگائی۔ "اچھا امی جان" آپی نے سن کر کہا۔ "جلدی جاؤ" امی بولیں۔ آپی ہمیں اپنے ساتھ لے کر بازار چل دیں۔ ہم نے چھپ کر چوزے کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تاکہ وہ بھی چاند رات کی گہما گہمی دیکھ کر لطف اندوز ہو سکے۔ آپی اس بات سے بے خبر تھیں۔ دکان سے ہم نے ربن لی۔ اور واپس آرہے تھے کہ گلی کا موڑ مڑتے ہی آپی نے ایک چیخ ماری اور بوکھلا گئیں۔ ایک کار پوری رفتار سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی اور آپی بیچ سڑک پر کھڑی خوفناک نظروں سے کار کے روپ میں موت کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہی تھیں۔ موت کو وہ اتنا قریب پاکر جمی کی جمی رہ گئیں۔ کار ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی اور قریب تھا کہ چند لمحوں بعد آپی کار کے پہیوں تلے روندی جاتیں۔ اچانک چوزے نے ہمارے ہاتھوں سے جست لگائی اور آپی کے قدموں میں جا گھسا۔ چوزے کی سرسراہٹ ٹانگوں میں محسوس ہوتے ہی جیسے آپی ہوش میں آگئیں۔ انھوں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور ایک چیخ کے ساتھ بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹیں۔ بس یہی لمحہ ان کی زندگی بچا گیا۔ ورنہ وہ گاڑی کے نیچے آگئی تھیں۔ آپی کے پیچھے ہٹتے ہی ایک "چرر چیرر... چیں" کی آواز آئی اور چند ہی لمحوں بعد چوزا گاڑی کے ایک پہیے کے نیچے خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کے بعد ہمیں ہوش نہیں کہ کون ہمیں اور آپی کو گھر تک لایا۔ ہم پوری رات بے ہوش رہے۔ جب ہمیں ہوش آیا تو ہماری نظر دھندلی دھندلی سی آپی پر پڑی ہم نے کپکپا کر آنکھیں کھولیں مکمل طور پر کھول دیں۔ آپی ہمیں ہوش میں آتے دیکھ کر خوشی سے چیخیں" امی، امی شکر ہے موبی کو ہوش آگیا امی..." آپی خوشی سے

چند ہی لمحوں بعد
چوزا گاڑی کے نیچے
خون میں
لت پت پڑا تھا

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

شازیہ نور





چاند رات

"چاند ہوگیا، چاند ہوگیا" ٹی۔ وی پر خبر سنتے ہی سب چلائے "ارے میری چوڑیاں تو آئی ہی نہیں" مسرت نے کہا۔

"اور میرے رومال اور موزے" شاہد اچھلتے ہوئے بولا۔

"نزہت گڑیا کی فراک بھی درزی کے پاس ہے ابھی" امی بولیں۔

"ابو مجھے جلدی سے چوڑیاں پہنا لائیں"

"اور میرے موزے اور رومال؟ شاہد بولا۔

اتنے میں ثروت اٹھلا کر بولیں "سب سے پہلے میرا سامان آئے گا۔ ابو میرے لیے رومال ربن اور جوتے لے آئیے"

"ابو چلیے نا" شاہد نے شور مچایا۔

"اچھا بابا اچھا" ابو نے کہا تو احمد ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"کیا تلاش کر رہے ہو؟" ابو نے پوچھا۔

"ابھی آپ نے ہی تو کہا ہے 'اچھا بابا اچھا' میں بابا کو تلاش کر رہا ہوں" شاہد شرارت سے بولا۔

"ہا ہا ہا..... ابو ہنس پڑے اور سب بچوں کو لے کر بازار کی طرف چل پڑے۔ تین چار گھنٹے بعد وہ سب تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے۔ بارہ بج چکے تھے۔

"بہت بھیڑ ہے بازار میں تو" ابو نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عید کا موقع جو ہے" امی نے جواباً کہا۔

سب بچے اپنی اپنی چیزوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ ثروت بار بار اپنی نئی

جوتیوں کو دیکھتی، پہنتی اور اُتار دیتی۔ مسرت ہاتھ بار بار ہلاتی تو چوڑیاں چھنک چھنک جاتیں۔ واہ کیسی مدھر آواز تھی۔

"ابو میرا دوپٹا رنگنے گیا ہوا ہے۔ دیکھیے رنگ گیا ہے کہ نہیں۔" باجی جو ابھی تک سو رہی تھیں، بچوں کے شور سے اٹھ گئیں۔

"اب تو بہت رات ہو گئی ہے بٹیا، پہلے کہنا تھا۔" ابو جو بہت تھکے ہوئے تھے، بولے۔

"کس کو معلوم تھا کہ کل عید ہو جائے گی۔ جائیے نا لائیے دوپٹا، ورنہ میں نہیں پہنوں گی



کل نئے کپڑے۔" باجی نے منہ پھلا لیا۔

باجی کو ناراض دیکھ کر ابو ہنس پڑے اور اسے مناتے ہوئے بولے۔ "یہ کیسے سکتا ہے کہ ہماری بیٹی نئے کپڑے نہ پہنے۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔ باجی کا موڈ ے دم ٹھیک ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ابو آ گئے مگر معلوم ہوا کہ دکان بند ہو گئی ہے اور دوپٹا نہیں ملا۔ جو چند لمحے پہلے بہت خوش تھیں دوپٹا نہ ملنے کی وجہ سے خفگنے لگیں باقی خاموشی سے

یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ایک بج گیا تھا۔ سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ابّو تو تھکے ہوئے تھے، فوراً ہی سو گئے۔ تھکاوٹ تو بچّوں کو بھی ہوئی تھی، مگر انھیں خوشی کے مارے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

صبح سب جلدی اُٹھ گئے۔ باجی گھر کی صفائی میں لگ گئیں اور امّی پکوان میں۔ ابّو نماز کے لیے چلے گئے۔ شاہد بھی نئے کپڑے پہن کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ خیر یہ عید تو گزر گئی۔

ایک سال گزر گیا۔ اب کے امّی نے تمام تیاری رمضان سے پہلے کر لی تھی۔

"چاند ہو گیا، چاند ہو گیا۔ کل عید ہو گی۔" بچّے چلّائے مگر اس مرتبہ کسی نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ ابّو کو یہ سب کچھ پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ ان کا دل چاہا کہ بچّے پھر شور مچائیں مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ سب جلدی سے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ مگر ابّو کو نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھے اور بولے، "آؤ بچّو باہر سیر کو چلیں۔ چاند رات یوں ہی چپ چاپ گزر جائے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" امّی حیران ہو کر ابّو کا منھ دیکھنے لگیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۳ کا)

چلائیں اور پھر ہم اٹھ کر آپی سے لپٹ گئے اور انھوں نے ہمیں لپٹا لیا۔

"عید مبارک" وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولیں۔ ہم نے ان کے کان میں آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا "عید مبارک آپی واقعی عید کی سچّی خوشی تو ہمیں اب ملی ہے۔"

"بے وقوف۔" آپی نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ تازہ تازہ جان دار ہنسی۔ عید جیسی میٹھی میٹھی ہنسی، ہنسی ہی ہنسی، ہم مسکراتے رہے وہ ہنستی رہیں..... !!

محمد یٰسین نورانی

ہماری عید

"ہر قوم کے لیے عید اور خوشی کے دن ہیں اور آج ہم مسلمانوں کی عید ہے"

یہ الفاظ فرمان رسالت ہیں۔ عید عود سے ہے جس کے معنی لوٹنے اور بار بار آنے کے ہیں۔ محاورے میں خوشی اور مسرت کے اس دن کو کہا جاتا ہے جو ہر سال اہل اسلام میں نہایت شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بے حد احسان و کرم ہے کہ اس نے روزہ رکھنے کی توفیق بخشی۔ آج اسی سلسلے میں جشن کا دن ہے۔ یہ سرور و انبساط اس لیے ہے کہ ہم ایک بڑے امتحان میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آج انعام کی تقسیم کا دن ہے قرآن کریم کی سالگرہ کا زمانہ ختم ہوا۔

قرآن مجید کے نزول سے رمضان شریف مہینا بھی مبارک بن گیا۔ اس مہینے میں ہر مسلمان ایمانی حرارت تازہ ہو جاتی ہے اور روزہ دار ...وک و پیاس کی تکلیف برداشت کر کے خدا کا ...وب اور پیارا بن جاتا ہے اور خدا کی ان گنت ...شیوں اور مسرتوں کو حاصل کر کے خوش و خرم جاتا ہے۔

حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ... اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ ...ریف لائے تو مدینہ شریف کے مسلمانوں کو ...ی کا دن مناتے اور لہو و لعب کرتے دیکھا تو ...یا کہ یہ کیسا دن ہے؟ ان لوگوں نے کہا کہ قدیم زمانے سے ہم لوگ ان دنوں میں کھیل اور لہو و لعب کر کے خوشیاں مناتے چلے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ان دنوں سے بہتر دو دن مقرر فرمائے ہیں۔ تم ان میں خوشی منایا کرو۔ ایک عیدالفطر اور دوسرا عیدالاضحیٰ ہے۔ مسلمانوں کی عیدوں میں نہ کھیل تماشہ ہے اور نہ لہو و لعب ہے بلکہ ان خوشی کے دنوں میں بھی عبادت الٰہی اور ذکر و تسبیح و تہلیل ہے۔

زکوٰۃ اور فطرہ ادا کر کے ہم اپنے غریب بھائیوں اور بہنوں کو بھی عید کی مسرتوں میں شامل کر لیتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔
"عید ان کی نہیں ہے جو کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔ عید ان کی ہے جنھوں نے اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کیا"

عید ان کی نہیں جنھوں نے عمدہ لباس سے اپنے کو آراستہ کیا عید ان کی ہے جو خدا کی وعید اور پکڑ سے ڈر گئے۔

عید ان لوگوں کی نہیں جنھوں نے بہت سی خوشبوؤں کا استعمال کیا۔ عید تو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اس پر قائم رہے۔

عید ان لوگوں کی نہیں ہے جنھوں نے بڑی بڑی دیگیں چڑھائیں اور بہت سے کھانے پکائے

عید تو ان لوگوں کی ہے جس نے تقویٰ و پرہیزگاری کو توشہ بنا لیا۔

۱/۱۵۳۱ ۔ ۰۴ ۔ ۱ ۔ شہر آباد حیدر آباد ۔ ۸۴

شہاب الدین دسنوی

عید کا دن

لو۔ رمضان کا مہینا ختم ہوا۔ عید کا چاند دکھائی دیا۔ اب روزے بھی ختم ہوئے۔ مسلمان عید منانے کی تیاریاں کرنے میں لگ گئے۔ اس عید کو "عید الفطر" یعنی فطرہ دینے کی عید کہتے ہیں۔ عید الفطر شوّال مہینا کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس روز سارے مسلمان عید الفطر مناتے ہیں۔ چھوٹے، بڑے، بوڑھے جوان سب کو عید کی خوشی ہوتی ہے۔ عید سب کے لیے آتی ہے جو مالدار ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے بھی اور جو غریب ہوتے ہیں ان کے لیے بھی۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ عید کے دن اپنے بال بچّوں پر دل کھول کر خرچ کرے اور ایسی خوشی کے موقع پر یہی ہونا چاہیے۔ جن کے پاس روپیا ہوتا ہے وہ تو بے شک خرچ کر سکتے ہیں، لیکن جن غریبوں کے پاس روپیا نہ ہو وہ کیا کریں؟ اپنے بال بچّوں کے لیے چیزیں کیسے خریدیں؟ اسی لیے اللہ نے حکم دیا کہ جن کے پاس بہت سے روپے ہیں یا مال ہے وہ اس میں سے کچھ حصّہ نکال کر غریبوں کو بھی دیں۔ لوگ عید کے موقع پر یہ حصّہ نکالتے ہیں۔ اس طرح غریب بھی اپنے بال بچّوں کے لیے کپڑے، جوتے، ٹوپی اور دوسری چیزیں خرید سکتے ہیں، وہ بھی خوشی خوشی عید منا سکتے ہیں۔ عید الفطر کے دن جو اناج یا اس کی قیمت کے برابر روپیا غریبوں کے لیے نکالا جاتا ہے اُسے "فطرہ" کہتے ہیں اسی لیے یہ عید بھی "عید الفطر" کہلاتی ہے۔ فطرہ دینا اس مسلمان کے لیے ضروری ہے جس کے پاس دینے کے لیے مال یا روپے ہوں۔

(ہمارا دین حصّہ اوّل سے)

● تاج منزل۔ ٹی۔ این۔ بنرجی روڈ۔ پٹنہ

گدگدیاں

استاد:۔ بتاؤ پانچ اور پانچ کتنے ہوتے ہیں۔
شاگرد:۔ دس ہوں گے جناب۔
استاد:۔ دس اور دس کتنے ہوئے۔
شاگرد:۔ بیس ہوں گے جناب۔
استاد:۔ واہ بھئی واہ تم تو کمال کے لڑکے ہو۔
شاگرد:۔ سر میں کمال کا نہیں جمال کا لڑکا ہوں۔

ایک دیہاتی اپنے بچے کو اسکول میں داخل کروانے کے لیے لے جا رہا تھا۔ راستے میں لڑکے سے کہنے لگا جو کچھ میں کہوں، ماسٹر جی سے تو بھی وہی ان سے کہہ دینا۔

دونوں اسکول پہنچے، ماسٹر جی نے بچے کے باپ سے پوچھا۔ "یہ تمہارا بچہ ہے؟"

دیہاتی نے جواب دیا۔ "جناب میرا کب ہے اب تو آپ کا ہی ہے۔"

ماسٹر جی نے خوش ہو کر بچے سے پوچھا "کیوں بھئی یہ تمہارا باپ ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ "جناب میرا کب ہے اب تو آپ ہی کا ہے۔"

ایک شخص بکنگ کلرک سے ک۔ک۔ک۔ک۔ کیا آ۔آ۔آپ۔ب۔ب بتا۔س۔س۔ کتے ہیں کہ بمبئی جانے و۔ا۔لا گاڑی۔ک۔ک کتنے ب بجے جاتی ہے۔

بکنگ کلرک۔ جس وقت آپ بول رہے تھے وہ چلی گئی تھی۔

گاہک نے مصور سے کہا۔ "تم اپنی بنائی ہوئی تصویر پر بڑا ناز کرتے ہو۔ ذرا وہ سامنے والی تصویر غور سے دیکھو کتنی خراب اور بھدی ہے مجھے تو ذرا بھی پسند نہیں۔"

مصور معاف کیجیے گا وہ میری بنائی ہوئی تصویر نہیں بلکہ آپ خود آئینے کے سامنے کھڑے ہیں۔

(ساجد کمالوی)

(۲)

ایک دیہاتی کے پاؤں میں پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ وہ دیہاتی ایک سرجن کے پاس گیا اور اسے اپنا زخم دکھایا۔

سرجن نے کہا۔ اس زخم کو کاٹنا پڑے گا۔ اور کاٹنے کے چار ہزار روپے لگیں گے۔

دیہاتی نے جواب دیا۔ واہ کتے نے مفت کاٹا اور آپ کاٹنے کے ہزار روپے مانگتے ہیں۔ (انیس بشیر احمد)

مجسٹریٹ نے عادی مجرم لڑکے کے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا آخر تم اپنے بیٹے کی اصلاح کیوں نہیں کرتے اسے کیوں نہیں بتاتے کہ درست طریقہ کون سا ہے۔

بتاتا ہوں جناب عالی برابر بتاتا ہوں۔ باپ نے کہا اور میرا بیٹا اس پر عمل بھی کرتا ہے مگر پکڑا جاتا ہے۔

کیا تمھاری نئی وردی تمھارے جسم پر فٹ ہے؟ سارجنٹ نے رنگروٹ سے پوچھا۔

جناب جیکٹ تو خیر ٹھیک ہے لیکن پتلون سینے کے گرد کچھ ڈھیلی ہے۔

(شیخ محمد عثمان جان)

(۳)

ایک افیمی ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا۔ "جب اگلا اسٹیشن آئے تو مجھے جگا دینا۔"

جب اگلا اسٹیشن آیا تو اس آدمی نے اس افیمی کو جگا دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی پگڑی کے بجائے پولیس مین کی ٹوپی پہن لی اور نیچے اتر گیا۔ بعد میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ بے وقوف نے میری بجائے کسی پولیس مین کو جگا دیا۔

امجد کو مصوری کا بڑا شوق تھا مگر آتا کچھ نہیں تھا۔ ایک دن اپنے ابو کی تصویر بنانے بیٹھ گیا۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو آہ بھر کر بولا "آہ ابو آپ کتنے بدل گئے ہیں۔"

باپ نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ بیٹا میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ کبھی شادی نہ کرنا ورنہ بہت الجھنوں میں پھنس جاؤ گے۔

بیٹا: "ابا جان میں آپ کی بات پر عمل کروں گا اور اپنے بچوں کو بھی یہی نصیحت کروں گا۔

(غزالہ ناہید)

ایک گپی نے اپنے دوست سے کہا یار! کل میں نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔

بھئی کیا کارنامہ؟" ہم بھی تو سنیں" دوسرے نے دریافت کیا۔

کل میں نے ایک مضبوط ہاتھی کے دونوں دانت باہر کر دیے۔ کراٹے کے ایک وار سے شیر کی کمر توڑ دی اور چیتے کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا" گپی بولا۔

پھر کیا ہوا؟ دوست نے حیرت سے پوچھا۔

وہ ہونا کیا تھا۔ کھلونوں کے دکان دار نے مجھے کان سے پکڑ کر دکان سے باہر نکال دیا۔

ایک دیہاتی کو کہیں سے ایک آلہ پڑا ہوا ملا اس نے ملا نصیر الدین سے پوچھا۔ یہ کیا چیز ہے؟ ملا نصیر الدین جواب دینے کے بجائے پہلے ہنسے اور بعد میں رو دیے۔ دیہاتی نے حیران ہو کر پوچھا

معاملہ کیا ہے تو ملّا نے جواب دیا کہ میں پہلے ہنسا اس لیے کہ تجھے یہ بھی پتا نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ ؟ اور رویا اس لیے کہ مجھے بھی پتا نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔

ایک صاحب جب کبھی احباب کی محفل میں پہنچتے، سارے لوگ انھیں دیکھتے ہی اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لیتے۔ کئی بار یہی ہوا تو کسی نے بتایا کہ "تمھارے موزے بہت بدبودار ہیں انھیں بدل کر نئے موزے پہننا شروع کر دو"

اگلے روز وہ صاحب نئے موزے پہن کر دوستوں کی محفل میں گئے اور دوستوں نے حسب معمول ناک پر رومال رکھ لیے۔ ان صاحب کو بہت غصہ آیا۔ تقریر کے انداز میں دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے مجھے معلوم ہے تم لوگ اپنی ناکوں پر رومال کیوں رکھتے ہو مگر میں نے نئے موزے پہن لیے ہیں۔ پرانے موزے اتار دیے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو یہ دیکھ لو۔

انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور اسے لہراتے ہوئے بولے "یہ دیکھو۔ یہ رہے وہ پرانے موزے۔ خدارا اب تو اپنی ناک سے رومال ہٹالو۔

(شیخ محمد عثمان جان)

دو بچے تصویروں کی نمایش میں گئے اتنے میں ایک بچے کی نظر ایک تجریدی تصویر پر پڑی وہ کہنے لگا۔ دوست یہاں سے بھاگو ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ ہم نے یہ تصویر خراب کی۔

(شازیہ نازلی)

(۳)

استاد (لڑکے سے) پائلٹ کسے کہتے ہیں۔
لڑکا۔ آج کل کے زمانے میں رکشہ اور ویگن چلانے والے کو کیوں کہ ان کے گیٹ پر لکھا ہوتا ہے۔ "پائلٹ گیٹ"

گاہک (بیرے سے) شوربے میں مکھی تیر رہی ہے۔
بیرا۔ جناب یہ بھی تو دیکھیے کس خوبصورتی سے تیر رہی ہے۔

مریضہ (ڈاکٹر سے) جناب آپ کی دوا نے مجھ پر بہت اثر کیا ہے۔
ڈاکٹر۔ وہ کیسے۔ جناب پہلے میں اپنے شوہر کو ڈانٹ نہیں سکتی تھی اب میں اسے ہر روز ڈانٹتی ہوں۔

باپ (بیٹے سے) بیٹا کیوں رو رہے ہو
بیٹا: (روتے ہوئے) ماسٹر جی نے مارا ہے۔
باپ: وہ کیوں:
بیٹا: انھوں نے کلاس میں ایک سوال پوچھا تھا جس کا جواب میں نے دیا تھا۔
باپ: سوال کیا تھا؟

بیٹا: انھوں نے پوچھا تھا کہ میز کی دراز میں مرا ہوا چوہا کس نے ڈالا ہے میں نے کہا تھا میں نے ڈالا ہے اور سر جی نے ڈنڈے سے میری پٹائی کر دی۔

باپ: بٹیا اشرف! کمرے میں جا کر دیکھنا کلاک چل رہا ہے یا نہیں؟
اشرف: ابا جان کلاک چل تو نہیں رہا کھڑا دم ہلا رہا ہے۔

انسپکٹر: سپاہی سے! تم نے چور کو گرفتار کیا۔
سپاہی: چور گرفتار نہیں ہو سکا لیکن اس کی انگلیوں کے نشان مل گئے ہیں۔
انسپکٹر: کہاں ہیں وہ
سپاہی: جی میرے گال پر۔

دو پاگل آموں کے باغ میں سے گزر رہے تھے کہ اچانک انھیں خیال آیا کاش وہ آم ہوتے یہ سوچتے ہی وہ درخت پر چڑھ کر الٹے لٹک گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک پاگل زمین پر گر گیا تو لٹکا ہوا پاگل بولا بس تھک گئے دوسرا پاگل نہیں پک گیا ہوں۔

میزبان عورت: یہ رس گلے اور لیجیے!
مہمان عورت: جی بس میں پہلے ہی بہن کھا چکی ہوں۔
میزبان عورت: خیر کھائیے تو آپ نے گیارہ ہیں لیکن یہاں کون گن رہا ہے۔
(افروز عرف اپی)



ہم نہیں ہیں دم نہیں
شہر ہے رونق نہیں

ہم اس کے پیٹ میں
وہ ہمارے ہاتھ میں

دیکھا میں نے ایک پرندہ
کچھ پیلا کچھ سبز اور لال
پیٹ میں اس کے ایک ہڈی
کھال کے نیچے اس کے بال

ایک بلی میں نے دیکھی بیٹھی تھی وہ گم سم
جسم تھا اس کا سارا گورا ہری ہری تھی اس کی دم

جوابات

۱۔ قبرستان ۔ ۲۔ آئینہ ۔ ۳۔ آم ۔ ۴۔ مولی

مہروز اقبال



برقی بھوت

رات کا اندھیرا پھیلتا تو اس ویران اور اجاڑ مکان میں روشنی کا ایک بھوت رقص کیا کرتا تھا۔ ایک ذہین بچے نے اس راز سے پردہ اُٹھایا!

ایک خوش گوار سہ پہر میں اپنے نئے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس محلّے میں ہم چند ہی روز پہلے منتقل ہوئے تھے۔

میں ابھی گھر کے اندر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ چونک پڑا۔ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہلکی سی چپت رسید کی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا ایک ہم عمر لڑکا مسکرا رہا تھا۔

"میرا نام اسلم ہے اور میں تمھارا پڑوسی ہوں!" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"اور مجھے ناصر کہتے ہیں۔" میں نے کہا، "میرا خیال ہے میں نے تمھیں اسکول میں بھی دیکھا ہے!"

"ہاں، میں بھی اُسی اسکول میں پڑھتا ہوں۔" اس نے تائید کی۔ "میدان کے اُس پار دریا کے کنارے وہ تمھیں بڑی سی سفید عمارت نظر آ رہی ہے نا؟" اسلم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ لیکن اس میں کون سی ایسی انوکھی بات ہے؟"

"یہ مکان در اصل آسیب زدہ ہے۔" اس نے پُراسرار

طریقے سے انکشاف کیا۔

"آسیب زدہ!" میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ "لیکن اس عمارت میں تو رات کو روشنی ہوا کرتی ہے۔ اور آسیب زدہ مکانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں روشنی نہیں ہوتی۔"

"اس مکان میں دراصل ایک برقی بھوت کا بسیرا ہے۔ وہ کبھی کبھی جوش میں آ کر رقص بھی کرنے لگتا ہے۔" اسلم بولا۔

"تم مجھے کیوں بے وقوف بنا رہے ہو! آج کل تو بھوتوں کا وجود قصے کہانیوں کی کتابوں میں بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو آج رات ہی ہم اس عمارت میں چلیں گے اور میں ثابت کر دوں گا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ آج رات ٹھیک دس بجے۔ کہو چلو گے؟"

"چلوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بس تو ٹھیک دس بجے میں تمہارے پاس آؤں گا۔" اسلم نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اتنے میں ایک بڑی سیاہ کار اسلم کے مکان کے سامنے آ کر رکی۔ اُسے ایک چالیس سالہ خوش پوش شخص چلا رہا تھا۔ "یہ میرے والد ہیں۔" اسلم نے اُس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ یاد رکھنا، دس بجے اُس آسیب زدہ عمارت میں چلنا ہے۔"

یہ کہہ کر اسلم اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا اور میں اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ اسلم سے میں نے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ رات کو اس پرانی سفید عمارت میں جانے کے خیال سے ہی میری ہوا کھسک رہی تھی لیکن چونکہ اسلم سے وعدہ کر لیا تھا للہٰذا جانا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اسلم مجھے اسکول اور محلے بھر میں بزدل کہہ کر بدنام کر دیتا۔

ٹھیک دس بجے ہمارے گھر کی گھنٹی بجی۔ یہ ضرور اسلم ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اُسے کوسا اور ٹارچ لے کر مکان کے باہر آ گیا۔ وہاں واقعی اسلم کے روپ میں شیطان کھڑا تھا۔ جی میں تو آیا کہ اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دوں مگر اپنی ہتک کیسے برداشت کرتا۔ مجبوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔

جب ہم سفید عمارت کی طرف جا رہے تھے تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کہیں اسلم اور اس کے دوستوں نے مجھے ڈرانے کا پروگرام نہ بنایا ہو۔ للہٰذا میں نے اپنے آپ کو اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر لیا۔

"اس مکان میں ایک شخص تنہا رہتا تھا۔" اسلم نے مجھے بتانا شروع کیا۔ "اچانک ایک رات بجلی کے تاروں میں آگ لگنے سے اُس کی موت واقع ہو گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شخص تو بُری طرح جھلس گیا مگر عمارت کی کسی چیز کو بھی آنچ نہ آئی۔ اس وقت سے ہر چیز اپنی جگہ جوں کی توں موجود ہے۔"

"کیا تم نے یہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟" میں نے اس کی بات جھٹلانے کی کوشش کی۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔ "لیکن قصبے کے تقریباً سبھی لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اگرچہ اس مکان کی بجلی کٹ چکی ہے پھر بھی ہر رات دس بجے کے قریب اُس کمرے میں باقاعدگی سے روشنی ہو

سے جس میں یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ روشنی اس انداز سے حرکت کرتی ہے جیسے کہ برقی بھوت رقص کر رہا ہو۔"

اب ہم اس عمارت کے قریب پہنچ چکے تھے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی مجھے وحشت سی ہونے لگی لیکن میں نے اپنا خوف اسلم پر بالکل ظاہر نہ کیا۔ ٹارچ کی روشنی میں خشک اور مرجھائی ہوئی جھاڑیوں کو دیکھتے ہوئے ہم مکان میں داخل ہو گئے۔ مٹی سے اٹے ہوئے پرانے فرنیچر نے ہمارا "پرتپاک" استقبال کیا۔

"جب سے وہ شخص اس حادثے میں ہلاک ہوا ہے اس وقت سے یہاں کی ہر چیز اپنی جگہ موجود ہے۔" اسلم نے سرگوشی کی: "وہ آدمی بالائی منزل کے ایک کمرے میں جل کر ہلاک ہوا تھا۔۔ یہیں روشنی ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے چلو گے وہاں؟"

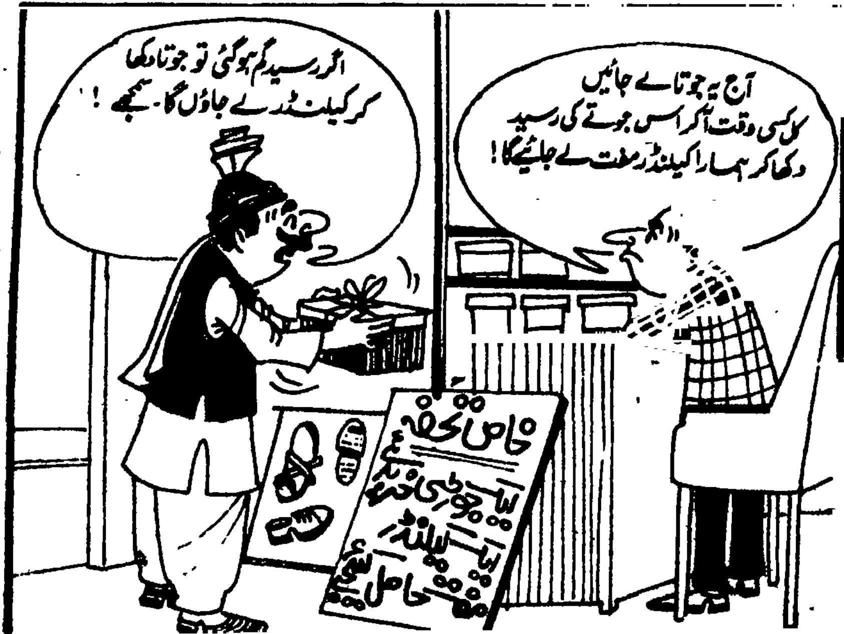
"ضرور!" میں نے جواب دیا: "آج میں برقی بھوت نامی شے سے مل کر ہی رہوں گا۔"

"ڈرو گے تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ برقی بھوت کے باپ سے بھی نہیں ڈروں گا۔"

اس کے بعد ہم دونوں اُوپر جانے کے لیے سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ اسلم کے دوست مجھے ڈرانے کے لیے کسی کونے کھدرے میں چھپے ہوں گے اور بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے ڈرائیں گے۔ میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر کسی نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تو مار مار کر اس کا بھرتا بنا دوں گا۔

"دیکھو ناصر، یہ ہے وہ کمرا!" جب ہم اُوپر پہنچے تو اسلم نے دائیں طرف تیسرے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا



کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن اندر سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے آگے قدم بڑھایا اسلم نے گڑگڑاتے ہوئے کہا: "اس کمرے کے قریب ہرگز نہ جانا ناصر!"

لیکن میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور آگے بڑھتا رہا۔ اچانک بلب نے اس انداز سے رقص کرنا شروع کر دیا جیسے واقعی کوئی آدمی ناچ رہا ہے۔ اسلم مجھے وہیں چھوڑ کر چیختا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔

"تم لوگ مجھے اس طرح نہیں ڈرا سکتے!" میں نے ڈانٹ پلائی: "میں تمہاری کسی بھی شعبدے بازی سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ ٹھہرو میں تمہاری ابھی خبر لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا اور اس کو کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہینڈل پر ہاتھ لگنا تھا کہ میری ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری اور میں خود فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا سیڑھیوں پر قلابازیاں کھا گیا۔ کئی منٹ تک پورا ہاتھ جھنجھناتا رہا۔ جب ہوش کچھ ٹھکانے لگے تو ٹارچ اٹھا کر میں نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔ نیچے گیٹ کے پاس اسلم کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے سوچا آگے چل کر یہ بڑا کامیاب اداکار بن سکتا ہے۔

"مجھے یہ بھونڈا مذاق بالکل پسند نہیں آیا!" میں غصے سے دہاڑا: "تم نے اور تمہارے دوستوں نے مل کر ہینڈل پر بجلی کا کرنٹ گزارا تھا نا؟"

"یقین کرو ناصر! میں آج سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا۔"

"تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟"

"بجلی کا بھوت ہے اور کیا! اس نے تمہیں سزا دی ہے۔ بھوتوں کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔" میں نے اسلم سے اختلاف کیا۔

"میں بھی یہی سمجھتا تھا مگر اب جبکہ تمہیں برقی بھوت کا ٹھوس ثبوت مل چکا ہے پھر بھی تمہیں یقین نہیں آتا؟"

"نہیں!" میں نے جھلا کر جواب دیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا: "اگر تم بہادروں کی طرح میرا ساتھ دو تو ہم اس نام نہاد برقی بھوت کا راز معلوم کر سکتے ہیں۔"

"میں تم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہوں لیکن ایسا نہ ہو کہ ہم بھوت کے ہاتھوں مارے جائیں۔"

"زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اور پھر اس برقی بھوت کے متعلق تم نے ہی مجھے بتایا تھا۔"

"ہاں مجھے تجسس تھا کہ یہ باتیں سچ ہیں یا جھوٹ۔ خیر یہ بتاؤ کہ اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"دیکھو بھئی! میرے پاس جدید طرز کا ایک خودکار کیمرا ہے جو مرضی کے مطابق تین مختلف اوقات کی تصویریں لے سکتا ہے۔ کل ہم اسکول کے بعد یہیں آئیں گے اور اسے فٹ کریں گے۔"

اگلے دن اسکول کے بعد ہم پھر اس ویران مکان میں داخل ہوئے۔ میرے ہاتھ میں وہ حساس کیمرا موجود تھا۔ بالائی منزل پر جا کر میں نے اس کمرے کا باہر سے اچھی طرح جائزہ لیا۔ کچھ دیر کی تلاش کے بعد مجھے کیمرا نصب کرنے کی ایک موزوں جگہ مل ہی گئی۔ میں نے اسلم سے کہا: "تم اس دیوار کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہارے کندھوں پر کھڑا

ہونا چاہتا ہوں۔"

پہلے تو اسلم ہلا ہچکچایا مگر پھر راضی ہو گیا۔ میں نے اس کے کندھوں پر چڑھ کر کیمرا روشن دان میں اس طرح فٹ کر دیا کہ وہ کمرے کے اندر کی واضح تصاویر لے سکے۔

"یہ کیمرا رات دس بجے سے ہر پندرہ منٹ بعد تین تصویریں لے گا۔" میں نے واپس آتے ہوئے اسلم کو بتایا۔ "اگر کسی نے اس کیمرے کو نہ چھیڑا تو کل تک ہم برقی بھوت کا راز معلوم کر لیں گے۔"

"تم بھروسہ رکھو، میں اس کیمرے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اسلم نے مجھے یقین دلایا۔

اگلے روز اسکول کے بعد ہم دونوں سیدھے اس ویران عمارت میں پہنچے۔ کیمرا اسی جگہ موجود تھا۔ اسے لے کر ہم پر اسرار عمارت سے باہر آ گئے۔

"آج رات میں خود ہی فلم ڈیولپ کروں گا۔ صبح تک ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ برقی بھوت کا راز کیا ہے۔"

اگلے دن ناشتے کے بعد میں چھوٹے سے بنچ پر اسٹوڈیو میں بیٹھا تھا کہ اسلم آ پہنچا اور بولا "تمہارے اس خود کار کیمرے نے کیا کامیابی حاصل کی ہے؟"

"بس چند منٹ انتظار کرو پھر تصویریں صاف اور واضح نظر آنے لگیں گی۔" میں نے جواب دیا۔

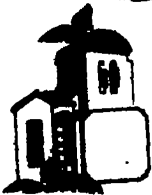
جب تصاویر پوری طرح صاف ہو گئیں تو مجھے پہلی تصویر دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ اس میں سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اسلم کی طنزیہ مسکراہٹ نے مجھے شرمندہ کر دیا لیکن دوسری تصویر نے بڑی تقویت پہنچائی۔ اس میں تین آدمی کھڑے الماریوں میں سے ڈبے اور فائلیں نکال رہے تھے جب

ہم نے تیسری تصویر دیکھی تو اس نے ہم دونوں کو بری طرح چونکا دیا۔ اس میں تین آدمی کرسیوں پر بیٹھے چند فائلوں پر جھکے ہوئے تھے۔ دو آدمیوں کی پشت دکھائی دے رہی تھی لیکن تیسرے شخص کا چہرہ کیمرے کے عین سامنے تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دونوں کو ہدایات دے رہا ہے اور سب سے تعجب خیز بات یہ تھی کہ ہدایات دینے والا اسلم کا عزیز تھا۔ میں نے وہ تصویر اسلم کو نہ دکھائی اور اسے انتظار کرنے کا کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے فون کر کے انسپکٹر کمال کو سارا واقعہ سنایا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر انسپکٹر کمال نے اسلم کے عزیز اکرم کو ہیروئن کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہونے پر گرفتار کر لیا۔ اس وقت اسلم کو میں نے اپنے ہی گھر روکنے پر مجبور تھا۔ جب انسپکٹر کمال نے مجھے مبارک باد دی اور حکومت کی طرف سے ایک بڑے انعام کا وعدہ کیا تو میں نے کہا "آدھے انعام کا مستحق اسلم بھی ہے۔"

جب سب چلے گئے تو مجھے ایک سوال پریشان کرنے لگا وہ یہ کہ ویران عمارت کی بجلی کٹ چکی تھی تو پھر اس میں روشنی کس طرح ہوتی تھی! لیکن مجھے اس کا جواب انسپکٹر کمال سے مل گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ نہ تو بجلی کا کنکشن لگا سکتے تھے اور نہ جنریٹر چلا سکتے تھے اس لیے انہوں نے پاس والے کمرے میں بڑی بڑی چند بیٹریاں چھپا رکھی تھیں اور انہی کے ذریعے روشنی کیا کرتے تھے۔





پگ ڈنڈی

سب بچے اُن کے ساتھ طرح طرح کے مذاق کیا کرتے تھے لیکن اُن کی زندگی سب کے لیے مشعلِ راہ بن گئی۔

بیگم ثاقبہ رحیم الدین

"بولو بولو — ہاں بولو اب ہم چور ہیں یا تم؟" ہم نے بچپن میں یہ بات ہزار بار بابا جی* کے منہ سے سنی تھی۔ جب وہ ہم سے کوئی شرط لگا کر جیت جاتے اور بہت اچھے موڈ میں ہوتے تو یہ جملہ کہا کرتے تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہند کو تقسیم ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا۔ ہمارا گھرانا دہلی سے کراچی آیا اور ایک ایسے پرانی وضع کے گھر میں رہنے لگا جس کا لان اور احاطہ بہت بڑا تھا۔ گھر کے لان کی دیکھ بھال کے لیے رحمت علی مالی تھا اُس کا خاندان ہمارے آنے سے پہلے دو کوارٹروں میں بسا ہوا تھا۔

یوں تو ہم سب بچوں کی رحمت علی سے دوستی تھی مگر ہمیں اُس کا باپ، جسے سب "بابا جی" کہتے تھے بہت اچھا لگتا تھا۔ رحمت علی سے تو اکثر یہ فرمائش ہوا کرتی تھی کہ اونچی ٹہنی سے امرود توڑ دو۔ جھولا ذرا کس کر باندھ دو کہ ڈھیلا نہ ہو۔ پتنگ کی ڈور خرید کر لا دو وغیرہ..... مگر وہ ان کاموں کے علاوہ کبھی بات چیت نہیں کرتا تھا۔ البتہ "بابا جی" ایسی سادہ اور پیاری ہستی تھی جن کو بچے ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔

یوں دیکھنے میں بابا جی کی شکل و صورت میں کوئی اچھائی نہ تھی۔ وہ دُبلے پتلے اور سیاہ رنگت کے بہاری تھے۔

وہ کسی زمانے میں گورنمنٹ اسکول کے ہوسٹل کے چوکیدار رہے تھے جس کی وجہ سے پنشن ملتی تھی اور ہر سال اُن کی چھوٹی سی زمین سے بیر بکا کرتے تھے۔ یعنی رحمت علی کی تنخواہ کے علاوہ یہ دونوں رقمیں بھی مقررہ وقت پر آجایا کرتی تھیں۔ وہ سال میں سات آٹھ مہینے تہمد اور بنیان میں گزارا کرتے تھے البتہ نومبر، دسمبر، جنوری اور فروری میں سفید ململ کے ایک کرتے کا اضافہ کرلیا کرتے تھے وہ ہمارے گھرانے کے نوکر نہیں تھے۔ وہ عید تہوار یا کسی خاص موقع پر ہمارے گھر آتے تو کلف دار صافہ باندھ لیا کرتے تھے۔

بابا جی میں جانے کیا بات تھی کہ گھر اور آس پاس کے علاقے کے لڑکے بالے ان کے گرد منڈلاتے رہتے تھے اور وہ باتیں کیا کرتے تھے۔ جب دیکھو اُن کی آنکھوں میں مسکراہٹ اور چمک نظر آتی تھی۔ میں نے کئی بار اُن کو یہ کہتے سُنا "رحمت بیٹے! دل صاف رکھو۔ ہمیشہ صاف رکھو" اِن کو کئی بار بھابی کو یہ سمجھاتے سُنا "بی بی اپنا جی میلا نہ کرو ہمیشہ جی صاف رکھو" میں اکثر بابا جی کا مذاق اڑاتی تھی اور اُن کے مُنہ پر کہہ دیا کرتی تھی "بابا جی! کیا آپ کو دھوبی کا کام بہت پسند ہے؟" وہ ہمیشہ مُسکرا دیتے اور مجھے سمجھانے کی قطعی کوشش نہ کرتے۔ میری ایک دوست بڑی شریر اور چُلبلی تھی۔ وہ بابا جی کے صافے کی نوک پر تیزی سے چیونگم چپکا دیتی اور ان کی ہنسی اُڑاتی "ہاں تو بابا یہ دل کوئی فیکٹری ہے، سڑک ہے، آخر کیا ہے جو آپ بروقت میل، مٹی اور کوڑا صاف کرواتے رہتے ہیں۔" غرض کہ کوئی کتنا بھی مذاق اڑاتے وہ ہنس دیا کرتے تھے۔

ایک دن بابا جی نماز پڑھ کر آئے کھانا کھا کر بامن کے درخت کے نیچے دری بچھا کر سو رہے۔ طارق اور بھی بہاں سے گذرے اُن کی ٹوپی اُتار لی اور چپل اُلٹ پلٹ کر دی۔ سیدھے پیر کی اُلٹی طرف اور اُلٹے پیر کی سیدھی طرف بیچارے سو کر اُٹھے تو گھنٹوں ٹوپی ڈھونڈتے رہے اور اُلٹ پلٹ چپل پہنے سارا دن اپنا کام کرتے رہے۔ دوسرے دن معلوم ہونے پر بھی صرف "بُری بات ہے" کہہ کر چُپ ہو رہے۔

بابا جی خاصے بوڑھے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کئی باتیں بھول جاتے ہیں۔ وہ صرف اتوار کے دن اخبار خریدتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ بقول رحمت علی اشتہار بھی ہجّے کر کے پڑھا کرتے تھے۔ جب وہ اخبار میں گُم ہوتے تو میں اور میری دوست مل کر بابا جی سے کئی اہم وعدے کروا لیتے۔ مثلاً ہمیں شام میں صنعتی نمائش میں "موت کا کنواں" دکھانے اور چوڑیوں کے اسٹال پر لے چلیں؛ کوکو بندر روڈ پر لال لال چینی کے "بڑھیا کے بال" خرید کر کھانا چاہتی تھی۔ آپا اچار اور پاپڑ منگوانا چاہتی تھیں۔ غرض کہ ہم بچوں کے بیانات جاری رہتے۔ ہم بیانات کے سلسلے میں باقاعدہ وعدے کا اصرار کرتے۔ بابا جی جانے کس دھیان میں "ہموں" یا "ہاں ہاں" کہہ دیتے۔ ممتاز وہ ڈرگز کا غذ لا کر ہر ایک کی آرزو کاغذ پر لکھ دیتی، اُس وقت صرف ہمارے بڑے بھائی اور لیڈر نوری کے پاس گھڑی تھی۔ وہ وقت درج کر دیتے کہ بابا جی نے فلاں دن اور فلاں وقت یہ وعدے کیے ہیں۔ دوسرے دن بابا جی لاکھ خدا کو گواہ بناتے کہ انھوں نے قطعی نہیں سُنا تھا اور نہ وعدہ کیا تھا۔ ہم سب اُن سے روٹھ جاتے اور ان کے کمرے میں دھرنا مار کر چُپ چاپ بیٹھ جاتے تھے

قارے

نضل علی راہی



اور پھر بابا جی دل دہلا دینے والی اس حالت میں دیکھے گئے جبکہ
کے بڑھاپے کے بال کنگھی والے کی دکان کے قریب تھے اور وہاں
دکاندار کو حالت میں پانچ بھی تولتے ہوئے پائے گئے۔

یہ تو اکثر سنا ہے کہ ہمدرد لوگ مانگنے والوں کو مایوس نہیں کرتے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت التجا کرنے پر ناخوشی سے ہی سہی مگر غریب کی مدد کر دی جاتی ہے لیکن جو کسی کا دکھ جان لے اور اس کے بنا کہے رات کے اندھیرے میں چپکے سے مدد کر دے تو وہ کیسا اعلیٰ انسان ہو گا!

ایک بار اسکول کے ٹیچر محمد حسن نے اپنی بیوی نسیم کے علاج کی خاطر کچھ رقم قرض لے لی۔ محمد حسن دن رات فکرمند رہتا کہ قرض کیسے اتاروں گا کیونکہ سود بھی بڑھ رہا تھا۔ رمضان شریف کا مہینا تھا، بابا جی سحری کے وقت محمد حسن کے گھر گئے اور کپڑے میں لپٹی ہوئی کچھ رقم دے آئے۔ محمد حسن حیران رہ گیا اور رقم قبول کرتے ہوئے کہا کہ وہ جلد ہی رقم لوٹا دے گا۔ دن گزرتے گئے محمد حسن اس احسان کو بھول گیا پھر وہ ٹال مٹول کرتا گیا اور کبھی رقم ادا کرنے کا ذکر نہ کرتا۔ بابا جی کو وہ مہینے تو توقع تھی مگر انہوں نے اُسے معاف کر دیا اور اس بات کو قطعی بھول گئے۔

ایک دفعہ ایک دوست نے بابا جی کو چند دینی کتابیں رجسٹری کر کے بھجوانے کا وعدہ کر لیا۔ جب بابا نے پوچھا تو نقلی رسیدیں بنوا کر پیش کر دیں کیونکہ اس سے گھر تبدیل کرنے کے زمانے میں کتابیں گم ہو گئی تھیں۔ رحمت علی نے ڈاک خانے سے رسیدیں چیک کروائیں تو معلوم ہوا کہ جھوٹی اور جعلی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی بابا جی نے اپنے دوست کے لیے دعا کی کہ مولا اُسے نیک بنائے اور پھر اُسے دل سے معاف کر دیا۔

ایک بار خوش قسمتی سے بابا جی کے انعامی بونڈ نکل آئے تو انھوں نے خوش ہو کر سب کو سنا دیا کہ وہ اپنی بھانجی کی شادی پر بڑا سا تحفہ دیں گے۔ دو نوجوان جو پارک میں آ کر بیٹھا کرتے تھے وہ اس بات سے واقف تھے۔ دونوں نے مل کر یکم مئی کے موقع پر بابا جی کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا۔ اُن دونوں کے دوستوں نے آخر میں نعرہ لگایا "بابا بابا حاتم طائی۔ نہیں نہیں۔ بابا کنجوس مکھی چوس"۔

اس دن واقعی بابا کا دل دکھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہفتہ بھر بعد اُن دونوں نوجوانوں کے والدین کو اس کی خبر ہوئی تو خوب ہی ڈانٹ پڑی۔ دونوں کو بھیجا گیا کہ معافی مانگیں۔ بابا جی نے ایک جملے کے سنتے ہی سچے دل سے معاف کر دیا۔ اور خدا حافظ کہہ کر اُن کے ساتھ تھوڑی سی کھجوریں بھیجیں۔ اسی طرح میری دوست سکینہ بیگم خان کی نقل کر کے سب کو ہنساتی تھی۔ وہ ہر روز بابا جی کے کھانے اور ٹھنگے سے دانت کریدنے کی نقل کرتی اور ہم سب تالیاں بجاتے تھے۔

تین چار مہینے بعد وہ تینگر سے ہوسٹل جا رہی تھی۔ چلنے سے پہلے وہ ملنے آئی تو بابا جی نے پیار سے سب کچھ معاف کر دیا اور اُسے تحفے میں ایک کاپی ایک پنسل اور سرخ رنگ کے دو ربن دیے۔

جب بابا جی نیم کے درخت تلے چارپائی بچھا کر سوتے تو ہم چارپائی کے نیچے لیٹ کر زور زور سے ٹرانسسٹر بجاتے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھتے اور کہتے جاتے "یہ سامنے ہوسٹل والا بڑا بدتمیز ہے ہر وقت فلمی گانے سُنتا ہے" وہ سلیپر گھسیٹتے ہوئے چلے جاتے۔ تب ہم نیچے سے نکل آتے اور دوڑ لیتے۔

دو چار سال بعد ایک واقعہ یہ ہوا کہ بابا کی زمین جہاں بیر جھڑا کرتے تھے دیمک سے بھر گئی۔ بابا کو نقصان بھی ہوا اور افسوس بھی۔ وہ اب بوڑھے ہو گئے تھے اور اُن کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ جنوری کے مہینے میں اُن کے دوست رمضان خان کے نواسے کا عقیقہ تھا۔ بابا بھی گئے۔ ندی پار ایک بستی تھی جہاں رمضان خان کا گھر تھا۔ یوں تو یہ ندی اکثر خشک رہتی ہے مگر اس سال لبالب تو نہیں مگر گھٹنے گھٹنے بھر پانی تھا۔ بابا پاؤں گھسیٹتے۔ لکڑی ٹیکتے۔ لہٰذا دونوں کا ڈنڈا ہاتھ میں لے چلتے رہے۔ نہ جانے ٹھنڈ لگی یا زیادہ تھک گئے تھے۔ کہ رمضان خان کے گھر سے آتے ہی بخار چڑھا۔ پہلے کھانسی ہوئی اور پھر نمونیہ ہو گیا۔ اُن کے علاج معالجہ تیمارداری میں کسر نہ چھوڑی گئی مگر بابا کا جانا ہونا تھا وہ ہو کے۔ وہ لیٹے لیٹے بھی مسکراتے رہتے۔ مجھے بھاگ دوڑ میں ہونٹ میں کیکر کا کانٹا چبھ گیا تھا۔ میرے سوجے ہوئے ہونٹ کو دیکھ کر ساری سہیلیاں ہنسا کرتی تھیں۔ بابا نے مجھے بلایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا



مالابار کے ساحل پر بعض اسفنج اتنے بڑے بڑے پائے جاتے ہیں کہ وہ ایک بڑے قد کے آدمی کو نگل سکتے ہیں۔

دی۔ "اب کانٹا تو نکل گیا ہے تکلیف بھی نہ رہے گی۔" تھوڑے دنوں میں بابا جی کا خرچ ہو گئے اُن کو رحمت علی پیچھے سے چلاتا تھا۔ ہم بچوں کا آنا جانا بند کر دیا گیا

ہم نے ایک دن دیکھا مغرب کا وقت ہے اور بابا کے کوارٹر کی بتی جل رہی ہے۔ ہمارے گھر دعوت تھی۔ رحمت علی بیرے کی مدد کر رہا تھا۔ مجھے کھڑکی سے بابا جی نظر آئے۔ میں ننگے پاؤں چلی گئی اور کھڑکی کی اوٹ سے دیکھنے لگی۔ بابا جی کچھ کہہ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے منہ سے بےساختہ نکلے جا رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں یہ سن سکی۔ "میں نے فیروز الدین کا..... پورا واقعہ لکھا ہے..... کو سال سے اس نے میرا ملک..... یا ہے..... احسان نے تین چار بار برادری کے سامنے..... ہاں ہاں بے عزتی کی ہے..... اللہ اللہ..... میرا بیچارہ بیلے قرض رقیہ اور رمضان پر ہے..... اللہ اللہ نہیں..... نہیں..... رحمت علی کی بیوی نے سینے میں مجھ پر جھوٹا الزام..... دھرے......

سلیم آباد سے گاجروں کے لیے آیا تھا اس نے جاتے جاتے میری گاجر چرا لی...... اور ہاں یہ..... بھی..... "ان بچوں جیسے جملوں کے ساتھ ہی وہ چلا گئے اور دم سادھ کر بستر پر لیٹ گئے۔ میں گھبرائی۔ روتی ہوئی گھر آئی اور اپنی امی سے کہہ کر ڈاکٹر بلوایا۔

صبح صبح جب ہم بہن بھائی اسکول جانے والے تھے تو میرا دھیان باباجی کی طرف گیا۔ دبے پاؤں میں دروازے تک گئی۔ ایک پٹ کھلا تھا۔ رحمت گل شاید بابا کے ساتھ رات بھر جاگا تھا لہٰذا اب گہری نیند سو رہا تھا۔ بابا پلنگ پہ بیٹھے تھے اور اپنے کل کے ادھورے لکھے ہوئے صفحات کو پھر سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے کمزور چہرے پر کڑکڑاہٹ پھیل رہی تھی کھڑکی سے سورج کی ترچھی سی کرن بابا کی پیشانی پہ آ کر چمکنے لگی۔ اچانک انھوں نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ بہت دھیمے سے اپنے آپ سے کہنے لگے "بھلا یہ کس سے کیا؟ تم مالک ہو۔ تمہارا کام تم جانو۔ ہم کیوں تمہیں میل کچیل دکھائیں۔ اور ہاں ہم کیوں تمہیں کوڑا کرکٹ دیں۔! تمہارا کام تم جانو"۔ اس کے بعد بابا چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں اپنی سانس سنبھال کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے تمام صفحات پھاڑنے لگے یہاں تک کہ وہ چھوٹی چھوٹی کرچیاں بن گئے۔ اتنے میں ان کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔ خود سے بولے "چلو بھئی مولا تمہیں سنتے ہیں جانے کیا کیا لکھ دیا تھا۔ پتا نہیں میں ساتھ لے جاتا یا شاید یہیں چھوڑ جاتا۔ توبہ ہے توبہ! دیکھ لے... یہ کاپی پھر صاف ہے۔ لو بالکل..." بابا کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر مجھے اب کچھ نہ سنائی دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ پلنگ پر گرے میں زور زور سے رونے لگی۔ رحمت گل جاگ اٹھا اور ہمارے دوست اور گھر والے بابا کے کوارٹر میں اکٹھے ہو گئے۔ فضاؤں میں دن چڑھا سورج چمکا۔ مگر ہمارے لاکھ آوازیں دینے پر بھی باباجی نہ مسکرائے نہ بولے۔

پھر میں اسکول چلی گئی۔ جب واپس آئی تو بابا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفنایا جا چکا تھا۔ سامنے ہری گھاس پر ہمارے پڑوس کی تین سالہ بچی بینا کھیل رہی تھی اور اس کی بڑی بہن جھولا جھول رہی تھی۔ میں بجائے گھر جانے کے بینا کے ساتھ پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بینا کے ہاتھ میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے اور وہ ان سے گھاس پر سڑک بنا رہی تھی اور اس پر چھوٹی ڈنکی کار چلاتی جاتی تھی۔ دو منٹ بعد بینا کی بہن بینا کو لے کر گھر چلی گئی مگر سفید ننھی سی سڑک وہیں رہ گئی۔ ارے ارے رے۔ یہ کیا؟ یہ کاغذ کے سفید ٹکڑے تو وہی تھے جو بابا نے پھاڑ کر پھینکے تھے۔

آج اس بات کو زمانہ گزر گیا ہے۔ جب بھی باباجی کا کوئی ذکر کرنے لگتا ہے تو میری نظروں میں ایک اجلی اور صاف ستھری سفید پگڈنڈی ابھرتی ہے۔ اللہ جانے باباجی میں اور اس چھوٹی سی پگڈنڈی میں کیوں اتنا میل ہے! شاید اس لیے کہ بینا نے ہری گھاس پر کھیلتے ہوئے سفید کاغذ کے ٹکڑوں سے راستہ بنایا تھا! میں اب تو باباجی کو بھول بھی گئی ہوں مگر پھر بھی مجھے کبھی کبھی آنکھیں موندتے ہی ایک پیاری سی سفید پگڈنڈی دکھائی دے جاتی ہے

مزاحیہ مضمون

ایک گیند پر تین وکٹیں

س۔م۔ دانش



کرکٹ میچ تو آپ نے بہت سے دیکھے اور سنے ہوں گے۔
اب اس انوکھے میچ کی روداد آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔

جمن دادا بڑی من موجی شخصیت کے مالک ہیں۔ بڑے تو بڑے بچے بھی ان کے کچھ کم دیوانے نہیں جہاں اسکول، ہوم ورک اور کھیل سے فرصت ملی یا بوریت محسوس ہوئی فوراً جمن دادا کے ڈیرے پر پہنچ گئے وہ طرح طرح کی کہانیاں سنا کر انھیں بہلانے لگتے۔

ایسی ہی ایک شام کا ذکر ہے جب گڈو، پپو، سلمی، کہکشاں، جمال اور سلمان سب دادا کے اردگرد اس طرح جمع تھے جیسے پھول کے گرد بھونرے اور شہد کے اطراف میں چیونٹیاں۔ انھوں نے پیک دان میں پان کی پیک اگلتے ہوئے اپنے گرد بیٹھے بچوں کو مسکرا کر دیکھا اور پابندی عائد کرتے ہوئے بولے "دیکھو بچو! آج یہ قصہ اس شرط پر سنائیں گے کہ قصہ پورا ہونے سے قبل کوئی بچہ درمیان میں سوال نہیں

کریں گا۔

سب بچوں نے کورس کے انداز میں اقرار کرتے ہوئے کہا: ہاں! ہاں! جشن دادا آپ قصہ شروع کریں ہم درمیان میں بالکل سوال نہیں کریں گے۔

ہمارے اس اقرار کے بعد دادا نے اُگال دان میں ایک لمبی پچکاری اور ساری کھنکار کر گلا صاف کیا اور شروع ہو گئے: یہ بچو! ہر عظیم کھلاڑی کی طرح ہمارا بھی بچپن گزرا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پانچ مہینے دو دن، تین گھنٹے، پچپن منٹ اور تیس سیکنڈ کی عمر سے ہی ہم نے کرکٹ کھیلنے کا آغاز کر دیا تھا۔ نو سال کی عمر کو پہنچے تو اس کھیل میں بڑی مہارت حاصل کر چکے تھے اور ہمارے کھیل کی شہرت اپنے محلے، شہر، ملک کی گلیوں میدانوں سے نکلتی ہوئی ساری دنیا میں سورج کی روشنی کی طرح پھیل چکی تھی اور دنیا بھر سے کرکٹ کے شائقین ہمارا کھیل دیکھنے کے لیے لیاری کے سنگھو لین نامی محلے میں آنے لگے تھے۔ لیاری کے محلے سنگھو لین میں ہمارے ہاتھوں روزانہ دنیائے کرکٹ کا کوئی نہ کوئی ریکارڈ ضرور ٹوٹ جاتا یا پھر قائم ہو جاتا۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی مجھے اس وقت اتنے آٹوگراف دینے پڑتے کہ رات کو نیم گرم پانی میں چٹکی بھر نمک ڈال کر انگلیوں کی سنکائی کرنا پڑتی۔

ادھر ہم سنگھو لین کی گلیوں میں کرکٹ کے بے مثل کھلاڑی تھے، ادھر قومی ٹیم تشکیل دی جا رہی تھی کہ ویسٹ انڈیز کے دورے میں میچ کھیلے۔ سلیکشن کمیٹی اپنے اپنے طور پر کھلاڑیوں کو نامزد کر رہی تھی۔ مگر اس بات پر سبھی متفق تھے کہ ٹیم کیپٹن کی حیثیت سے مجھے ہی نامزد کیا جائے۔ مگر جب ٹیم کا اعلان ہوا تو سبھی کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے کیونکہ پوری ٹیم کے طور پر صرف ہمارے ہی نام کا اعلان کیا گیا تھا۔

اُدھر جب ہماری ایک رکنی ٹیم کا اعلان ہوا تو ویسٹ انڈیز ٹیم کے کپتان نے یہ کہہ کر سیریز کھیلنے سے انکار کر دیا کہ ہم ایک رکنی ٹیم سے بھلا کیا میچ کھیلیں گے۔ اتنے بڑے ملک میں کیا صرف ایک ہی شخص کرکٹ کا کھلاڑی ہے؟ اس کے جواب میں ہمارے سلیکشن بورڈ نے ٹیلکس بھجوایا کہ ہمارا ایک ہی کھلاڑی آپ کی پوری ٹیم کے لیے کافی ہے۔ ہمت ہے تو آپ کی ٹیم ہمارے اس واحد کھلاڑی کا مقابلہ کر لے۔ ویسٹ انڈینز کی ٹیم نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ مقابلے کے لیے لندن کا اسٹیڈیم منتخب ہوا۔

تو بچو! بلغورستانی ٹیم کا یہ ایک کھلاڑی ویسٹ انڈیز کی ٹیم سے میچ کھیلنے لندن جا پہنچا۔ پہلا ٹیسٹ شروع ہونے والا تھا۔ اس انوکھے میچ کو دیکھنے کے لیے سارا لندن اُمنڈ آیا۔ اسٹیڈیم میں تل رکھنے کی جگہ بھی نہ رہی۔ ویسٹ انڈینز نے ٹاس جیت کر بڑی شان سے مجھے بیٹنگ کرنے کی دعوت دی اور میں بالکل ریسلنگ چیمپئن کی طرح فضا میں بیٹ لہراتا ہوا فیلڈ میں داخل ہوا اور وکٹ پہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ ہر گیند اپنی

مرضی کے مطابق کھیل ہوڑ بہادر چوکا چھکا مار دیا۔ دل نہیں چاہا تو سنگل رن پر ہی اکتفا کیا۔ مخالف ٹیم نے اپنے سارے تجربے کار بولرز میدان میں ایک ایک کر کے اتارے مگر سبھی مجھے آؤٹ کرنے سے عاجز رہے مجھے آؤٹ نہ ہونا تھا نہیں ہوا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں اچھا خاصا اسکور ہو گیا مگر میں نے لنچ کے وقفے تک پانچ سو رنز بنا کر ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے انھیں کھیلنے کی دعوت دے دی۔۔۔

لنچ کے بعد ویسٹ انڈیز کی ٹیم بیٹنگ کے لیے میدان میں اتری۔ اس کے کھلاڑی بڑے ڈرے سہمے سے لگ رہے تھے، جب کہ بعض مبصرین کا خیال تھا کہ ہمیں اب آٹے دال کے بھاؤ کا پتا چلے گا ہم نے پانچ سو رنز بنا کر انھیں کھیلنے کی دعوت دے کر ناقابلِ فراموش غلطی کی ہے۔ ان کے خیال میں تنہا باؤلنگ کرانا اور ساتھ ساتھ فیلڈنگ کرنا ناممکن تھا مگر میں نے مسکراتے ہوئے باؤلنگ شروع کرائی ہر گیند پر ایک بیٹس مین بیک ٹو پویلین ہوتا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے دس گیندوں میں پوری ٹیم ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گئی اور آؤٹ ہو کر بیٹھ گئی۔

سچ پوچھو اس میچ سے دنیائے کرکٹ میں تہلکہ مچ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم تک یہ میچ دیکھنے تشریف لائے تھے اور ہر گیند پر ایک بیٹس مین کو آؤٹ کر کے ہم نے انھیں حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے کے لیے ڈال دیا تھا۔ دوسرے تماشائی مارے حیرت کے اپنی سیٹوں سے اٹھ کر جانا بھول گئے۔ پھر وہاں کے ایک لارڈ کو میچ کے اس عبرت انگیز نتیجے پر بڑی شرم سی آئی مگر وہ جھینپ مٹانے کو بولے: میاں حسن! ایک گیند پر ایک کھلاڑی آؤٹ کرنا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ کارنامہ تو تب ہوگا جب ایک گیند پر دو وکٹیں لے کر دکھاؤ۔

میں بھلا کوئی معمولی کھلاڑی تو تھا نہیں جو کچھ کترا کر رہ جاتا، بس آ گیا موج میں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ہی کارنامہ کر دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اتنا کہہ کر حسن دادا نے بڑے فخریہ انداز میں سامنے بچوں پر نظر ڈالی پھر آگے کہنا شروع کیا: ویسٹ انڈیز کے دو نامور بیٹس مین فیلڈ میں آئے اور وکٹ پہ پہنچ کر اپنی اپنی سائیڈ پر کھڑے ہو گئے۔ لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر ہم نے باؤلنگ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد اسٹیڈیم میں موجود شائقین نے دیکھا کہ ہم نے بڑے طوفانی انداز میں اسٹارٹ لیا، دوڑے اور مقررہ جگہ پہنچ کر عجیب و غریب انداز میں ہاتھ گھماتے ہوئے بال کرائی۔ گیند کسی توپ کے گولے کی طرح دندناتی ہوئی سامنے کی وکٹوں کو اکھاڑ کر واپس پلٹی اور دوسرے سرے کی وکٹ سے ٹکرا کر ہمارے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ امپائر نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے جس کا مطلب تھا کہ دونوں کھلاڑی آؤٹ ہو گئے ہیں۔

ہم سب بڑی دیر سے ہنسی برداشت کر رہے تھے مگر سلمٰی کی ہنسی آخر ابل پڑی۔ وہ بڑی مشکلوں سے قہقہہ روکتی ہوئی بولی: "جگن دادا! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کو تو کرکٹ کے قواعد کا بھی علم نہیں۔"

ہم سب آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی اس بات کی حمایت کرنے لگے مگر جگن دادا بھلا کہاں چُوکنے والے تھے۔ اپنی گول گول آنکھیں، گھما کر بولے: "تم سے کس نے کہا تھا درمیان میں بولنے کو؟ یہ تو معاہدہ کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ میں قصہ آگے نہ سنانے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مگر چونکہ یہ پہلی غلطی ہے، اس لیے معاف کیے دے رہا ہوں، آئندہ خیال رہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے آگے سنانا شروع کیا: "ہمارے اس کارنامے پر سارے تماشائی پورے ۵ منٹ اسٹینڈ سیکنڈ تک کھڑے ہو کر پُرجوش تالیاں بجاتے رہے مگر وہ لارڈ صاحب خوش نہیں ہوتے۔ وہ ہمارا مزید امتحان لینے کے موڈ میں تھے۔ انھوں نے کہا: ویل مسٹر جگن! اگر تم ہم کو ایک بال میں تین وکٹیں لے کر دکھاؤ تو ہم تمھیں انگلینڈ کے شہری حقوق دلوا دیں گے۔"

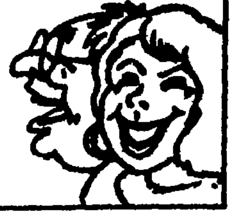
میرے لیے یہ کون سی بڑی بات تھی۔ فوراً تیار ہوگیا۔ لارڈ صاحب نے تین بہترین بیٹس مین کو ہماری گیند کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں بھجوایا۔ ہم نے پہلے ہی کی طرح پیچھے ہٹ کر طوفانی انداز اختیار کرتے ہوئے اسٹارٹ لیا اور اپنی جگہ آ کر بال کرا دی۔ گیند ہمارے ہاتھ سے اس طرح نکلی جیسے بندوق سے گولی اور زناتی ہوئی دونوں وکٹوں کو گراتی اُس طرف پہنچی جہاں پہلی وکٹ گرنے پر تیسرا کھلاڑی آن کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے بڑے بچے، تُلے اور ماہرانہ انداز میں گیند کو کھیلا اور شاندار چوکا لگایا، مگر صاحب ہم بھلا اسے چوکا کیوں کر دینے دیتے، فوراً لپکے اور اسے زمین پر گرنے سے پہلے ہی کیچ کر لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایمپائر تینوں کھلاڑیوں کو آؤٹ ہونے کا اشارہ دے رہا تھا۔"

اس بار کہکشاں چُپ نہ رہ سکی اور مسکراتے ہوئے بولی: "جگن دادا! جگن دادا، کیا آپ کے وقت میں تین ہاتھ والے ایمپائر ہُوا کرتے تھے؟"

اس کا اتنا کہنا تھا، گویا کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ جگن دادا غصے میں خشک لکڑیوں کی طرح چٹخ کر بولے: "بس، بس اب آگے قصہ نہیں سنائیں گے۔ تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں آج کی دنیا کے سچے واقعات سنائے جائیں۔ تم تو وہی جنوں، پریوں کے جھوٹے قصے پسند کرو گے۔ وہی سنو گے۔" یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اپنی کھولی میں جا کر بند ہوگئے۔ دوسرے بچے باہر کھڑے چلاّ رہے تھے: "جگن دادا، آج کی گپ تو بڑی شاندار رہی۔ خدا حافظ! ہم کل پھر سننے آئیں گے۔"



مسکراتی تحریریں



مجتبیٰ حسین

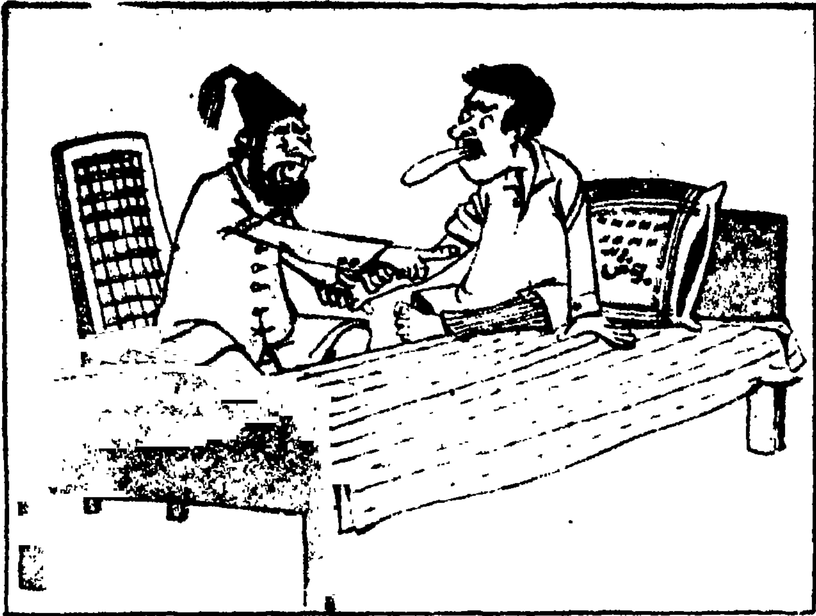
ہم اس بار ہندوستان کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مضامین کے چند دل چسپ ٹکڑے پیش کر رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا شمار اس وقت ہندوستان کے مقبول مزاح نگاروں میں ہوتا ہے اور ان کی نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام تکلف برطرف ہے۔ وہ اردو کے مشہور و مقبول مزاح نگار اور صحافی ابراہیم جلیس مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انھوں نے اپنا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرایا ہے:

مجھ سے ملیے

"مجھ سے ملیے! مجھے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں۔ مجھ سے مل کر آپ کو واقعی خوشی ہوگی یا نہیں یہ میں نہیں جانتا، لیکن چوں کہ آپ رسماً یہ جملہ کہنے کے عادی ہیں کہ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" اسی لیے مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہی ہوگی۔ میری زندگی کے دیگر احوال یہ ہیں کہ میں ۱۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو اس دنیا میں پہلی بار پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک مسلسل زندہ ہوں اور اندیشہ ہے کہ آیندہ بھی کئی برسوں تک زندہ رہوں گا۔ مجھ جیسے سنجیدہ مزاج آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمے داری میرے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر "سیاست" جناب میر عابد علی خاں پر عائد ہوتی ہے۔ انھی بزرگوں اور سرپرستوں کے حکم کی تعمیل میں میں نے ۱۲ اگست ۶۲ء کو دن کے ٹھیک ساڑھے دس بجے سے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور یہ نان اسٹاپ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ لوگ پیٹ کے لیے روتے ہیں اور میں پیٹ کے لیے ہنسنے لگا اور اب تک ہنستا جا رہا ہوں۔"

تکیے کا شعر

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو ادھورے خواب دیکھنے کی بیماری تھی۔ وہ تھوڑا سا خواب



دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی اور وہ نیند سے چونک پڑتے۔ ایک دن بولے، "بھئی عجیب بات ہے کہ مجھے ادھورے خواب نظر آتے ہیں۔ آخر پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے۔ میں خوابوں کے "ٹریلر" دیکھتے دیکھتے عاجز آگیا ہوں"۔ ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ تکیہ پر ایسا شعر لکھا ہوا ہے کہ 'بحر' سے خارج ہے۔ اس پر ہم نے کہا، "بھئی اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیے پر سوتے ہو جس پر بے بحر شعر لکھا ہوا ہے اور اس تکیے کی کرامت سے تمہارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کو بدلو تو تمہارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی"۔

یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ہمارے ایک اور دوست کا قصہ ہے کہ انھیں عرصے سے بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ بستر پر سو جاتے تو ان کا بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ جب ایلوپیتھی سے فائدہ نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ حکیم صاحب نے ان کا بہ غور معائنہ کیا۔ زبان اتنی بار باہر نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے، مگر اسی اثنا میں حکیم صاحب کی نظر تکیے پر پڑی اور وہ تکیے کی جانب لپکے، شعر کو غور سے پڑھا اور تنک کر بولے:

"اس تکیے کو ابھی یہاں سے ہٹائیے۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو تکیہ ہے۔ واہ صاحب وا!

کمال کر دیا آپ نے۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا شعر تکیے پر طبع کروا رکھا ہے۔ جانتے ہو جوش کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے۔ جوش کے شعر پر آپ سو جائیں گے تو دوران خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہو گا؟ اس تکیے کو اسی وقت یہاں سے ہٹائیے۔ خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوش کے تکیے پر سر رکھا۔ اگر شعروں پر سونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغ کے غلاف پر سو جائیے، جگر کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھیے۔ ان شعرا کا کلام آپ کے بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملے گی۔ بھوک زیادہ لگے گی۔ آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف "جوش کا غلاف" بدل دیا بلکہ اب وہ جوش کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے۔

ہم اس دھوبی کے شکر گزار ہیں جو گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا۔ ہم نے اس دھوبی کو دیکھا کہ وہ ایک کپڑا پانی سے نکالتا ہے اسے کھولتا ہے، پھر اپنی عینک آنکھوں پر لگاتا ہے۔ کپڑے پر کوئی عبارت پڑھتا ہے اور پھر اس کپڑے کو پتھر پر زور زور سے پٹخنے لگتا ہے۔ ہم نے اس کی اس حرکت کا بہ غور مشاہدہ کیا تو پتا چلا کہ وہ بعض کپڑے تو زور سے پٹختا ہے اور بعض کپڑے نہایت آہستگی اور سلیقے سے دھوتا ہے۔ ہم نے پوچھا، "بھئی! تم بعض کپڑے زور سے پٹختے ہو اور بعض نہایت آہستگی سے۔ آخر یہ کیا راز ہے؟"

وہ بولا، "صاحب! یہ دراصل تکیے کے غلاف ہیں اور میں تکیے کے ہر غلاف کو دھونے سے پہلے اسے کھولتا ہوں اور اس پر لکھا ہوا شعر پڑھتا ہوں۔ اگر شعر مجھے پسند نہ آئے تو اس غلاف کو زور زور سے پتھر پر پٹختا ہوں یعنی ادبی اصطلاح میں ہوٹنگ کرتا ہوں اور اگر اتفاق سے کوئی شعر پسند آئے تو اسے نہایت سلیقے سے دھوتا ہوں کہ اچھا شعر ساری قوم کی امانت ہوتا ہے۔"

ڈاکیا نما شاعر

راجندر سنگھ بیدی، جنھوں نے دو سال تک ڈاک خانہ میں ملازمت کی تھی اور غالباً ڈاک خانے کی اسی ملازمت نے انھیں ادیب بننے پر اکسایا تھا۔ بھئی جہاں سارے رسالے اور کتابیں

آتی ہوں، وہاں ایک آدمی ادیب نہیں بنے گا تو کیا جوہری بنے گا، مگر ہم ابھی تک اس نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں کہ لوگ ادیب بننے کے لیے ڈاک خانے میں ملازم ہوتے ہیں یا ڈاک خانے میں ملازم ہونے کی وجہ سے ادیب بن جاتے ہیں ہمیں تو موخرالذکر بات زیادہ امکانی نظر آتی ہے، کیوں کہ ہم ایک پوسٹ مین کی داستان سے شخصی طور پر واقف ہیں جو پہلے تو صرف رسالے تقسیم کیا کرتے تھے، مگر بعد میں رسالوں کی تقسیم کے ساتھ اپنی غزلیں بھی تقسیم کرنے لگے۔ چناں چہ اب وہ آتے ہیں اور ہمارا خط حوالہ کرنے سے پہلے کہتے ہیں، "اگر آپ کو اپنے خط کی ضرورت ہے تو آپ کو میری ایک تازہ غزل سماعت کرنی ہوگی" اور ہمیں اپنا خط حاصل کرنے کے لیے چار و ناچار ان کی غزل سننی پڑتی ہے۔ اگر کبھی ہمارے نام منی آرڈر آجائے تو سمجھیے کہ وہ دن ہمارے لیے روزِ قیامت سے کم نہیں ہوتا، کیوں کہ انھوں نے منی آرڈر کی رقم کے تناسب سے غزلیں سنانے کی شرح مقرر کر رکھی ہے۔ اگر دس روپے کا منی آرڈر آئے تو پانچ روپے فی غزل کی شرح سے ہمیں دو غزلیں سُننی پڑتی ہیں۔ ایک بار تو ہمیں تین سو روپے بہ ذریعہ منی آرڈر ملے تھے اور آپ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ من جملہ ۶۰ غزلوں کی سماعت تک ہماری قوتِ سماعت کا کیا حال ہوا ہوگا۔ ہم صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ جب ان پوسٹ مین نما شاعر صاحب نے غزلیں ختم کیں تو ہمارے کانوں سے خون بہہ رہا تھا اور کئی دنوں تک ہمارے کانوں میں صرف غزلوں کی گونج سُنائی دیتی رہی۔ اب تو ہم نے ان پوسٹ مین نما شاعر سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے اعزا و اقربا اور دوست احباب کو لکھا ہے کہ وہ خط نہ لکھا کریں۔ اگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر بھی دینی ہو تو اس کی اطلاع ہمارے کسی دوست کو دے دی جائے، کیوں کہ ہمیں اپنے عزیز کا بلا علم و اطلاع مرنا پسند ہے، لیکن پوسٹ مین نما شاعر کی غزلیں سننا پسند نہیں اور کسے معلوم کہ یہی غزلیں ایک دن ہماری موت کا سبب بن جائیں۔

شاعر، انڈے، لاٹھی چارج

علامہ کی سب سے بڑی خوبی، جو دراصل ایک خرابی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ شاعری کرتے تھے، لیکن مرحوم کی قوتِ ارادی کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے مرتے دم تک شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نزع کے عالم میں بھی تیمار داروں کو اپنی نامکمل غزل کا مقطع سُنا

مر گئے۔ اسے علامہ کی فرض شناسی نہ کہیں تو کیا کہیں کہ انھوں نے اپنی ایک غزل بھی مکمل نہ چھوڑی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر پائی اور انھوں نے ۸ ہزار غزلیں کہیں، جن ۸ لاکھ افراد نے ہوٹنگ کی، مگر مرحوم ایسے حوصلہ مند، نڈر اور جری انسان واقع ہوئے تھے کہ اگر ۸ کروڑ افراد نے بھی ہوٹنگ کی ہوتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ بات دراصل یہ تھی کہ علامہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے اور ہر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال جاتے تھے، مثلاً ایک مشاعرے میں جب سامعین نے ان پہ انڈے پھینکے تو انھوں نے سارے انڈے ہاتھوں میں جھیل لیے اور گھر جا کر ان انڈوں کی پڈنگ پکوائی۔ پھر جب دوسری بار مشاعرے میں شرکت کرنے گئے اور لوگوں نے ان پر انڈے نہ پھینکے تو علامہ بپھر گئے اور سامعین سے شکایت کرنے لگے، "حضرات! اگر آپ لوگوں نے انڈے نہ پھینکے تو میں غزل نہیں سناؤں گا!" اس پر منتظمین مشاعرہ نے فوراً بازار سے انڈے منگوائے اور جب دو چار انڈے پھینکے گئے تو علامہ نے غزل کا سلسلہ شروع کیا، جو صبح تک جاری رہا۔ اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جب بھی کسی مشاعرے میں جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ آج مجھ پر آلو پھینکے جائیں،



کیوں کہ آج آلو کھانے کو جی چاہ رہا ہے"۔

علامہ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ انھیں اپنا کلام سنانے کا عارضہ لاحق تھا۔ اگر کوئی نئی غزل ہوتی (جو اتفاق سے ہر روز ہو جایا کرتی تھی) تو سارے محلّے کو سنانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب علامہ گھر سے نکلتے تو سڑکوں پر بھگدڑ مچ جاتی اور لوگ گلیوں میں، بھاگ جاتے۔ دُکان دار اپنی دُکانیں بند کر دیتے اور مائیں اپنے بچّوں کو اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیتیں۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہو جایا کرتی تھی مگر علامہ کا یہ عارضہ اکثر اوقات ملک و قوم کے لیے بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا، مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مقامی کالج کے طلبہ نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ ایک مقام پر جلوس مشتعل ہو گیا اور پولیس پر سنگ باری کرنے لگا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا، مگر جلوس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب صورتِ حال بہت نازک ہو گئی تو سب انسپکٹر پولیس کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ وہ سیدھا علامہ کے گھر بھاگا اور انھیں اپنے ساتھ لے آیا۔ ادھر طلبہ کی سنگ باری بہ دستور جاری تھی کہ اچانک مائیکروفون پر اعلان ہوا:

"خواتین و حضرات! اب آپ علامہ نارسا سے ان کی تازہ غزل سماعت فرمائیے"۔

مائیکروفون پر یہ اعلان ہونا تھا کہ طلبہ اپنے سر پر پاؤں اور پاؤں پر سر رکھ کر بھاگنے لگے۔ اور ابھی علامہ نے اپنی غزل کا مطلع ہی سنایا تھا کہ مطلع صاف ہو گیا۔ طلبہ تو طلبہ پولیس کی ساری جمعیت بہ شمول سب انسپکٹر پولیس مقامِ حادثہ سے غائب تھی۔

علامہ نے زندگی بھر میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جو بحر سے خارج نہ ہو۔ ہر مصرعہ دوسرے مصرعہ سے ایک ہاتھ چھوٹا ہوتا تھا یا بڑا اور جب لوگ اس کی شکایت کرتے کہ غزل کے سارے مصرعے بحر سے خارج ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے کہ "میاں، جب انسان کے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو ایک غزل کے دس مصرعے کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ قدرت کی تخلیق خود بحر سے خارج ہے۔ خدا نے سب کو یکساں پیدا نہیں کیا"۔

دھوبی

کسی منچلے نے دھوبی کی تعریف یوں کی ہے کہ "دھوبی وہ شخص ہوتا ہے جو کپڑے کی مدد سے

پتھر کو توڑنا چاہتا ہے۔ چناں چہ جب بھی میرے کپڑے دُھل کر آتے ہیں تو یہ گمان گزرتا ہے کہ ضرور دھوبی نے میرے کپڑوں کی مدد سے کئی پتھر توڑ ڈالے ہیں۔ تب ہی تو نئے قمیض کے کالر منھ پھاڑے دیتے ہیں اور پتلون کے پائنچے جھالر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک پاجامے کے ساتھ تو میرے دھوبی نے بڑا بُرا سلوک کیا تھا۔ یعنی جب میں نے پاجامے کا بہ غور جائزہ لیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس پاجامے میں دو پائنچوں کی بجائے صرف ایک پائنچہ موجود ہے۔ میں نے پوچھا، "بھائی، میرے پاجامے میں ہمیشہ دو پائنچے ہوا کرتے تھے، اب صرف ایک پائنچہ کیوں رہ گیا ہے؟"

وہ بولا، "حضور، فکر نہ کیجیے۔ اگلی بار آپ کو دوسرا پائنچہ بھی مل جائے گا۔" لیکن آج تک مجھے دوسرا پائنچہ نہ مل سکا۔ پھر دھوبی کے ہاں سے کپڑے بھی بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ اس کے لیے باضابطہ پیروریاں کرنی پڑتی ہیں۔ تب کہیں دھوبی اپنے گدھے کے ساتھ آپ کے در دولت پر نمودار ہوتا ہے۔ پھر کپڑوں کے دیر سے دھونے کے ہزاروں بہانے دھوبی نے تراش رکھے ہیں۔ برسات کا موسم ہو تو کہتا ہے کہ بارش بہت ہو رہی ہے۔ گرمی کا موسم ہو تو کہتا ہے کہ حضور گھاٹ پر پانی نہیں ہے۔ ایک بار تو اس نے سردی کے موسم میں دیر سے کپڑے لانے کی وجہ یوں بیان کی کہ "صاحب، آپ نے اس بار گرم کپڑے دھونے کے لیے نہیں دیے۔ اس لیے میں انھیں وقت پر نہ دھو سکا۔"

میں نے پوچھا، "کپڑوں کے دیر سے دُھلنے کا گرم کپڑوں سے کیا تعلق ہے؟"

وہ بولا، "صاحب، سردی بہت ہے۔ جب تک کوئی گرم کپڑا نہ پہن لوں اس وقت تک کپڑے نہیں دھو سکتا، لہٰذا آپ آئندہ سے اس بات کا خیال رکھیں کہ سردی میں جب بھی کپڑے دھونے کے لیے دیں اُن میں گرم کپڑے ضرور شامل ہوں، ورنہ آپ کو کپڑے جلدی نہیں ملیں گے۔"

کھانا، کپڑا، مکان اور غالب

ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ، ضروریاتِ زندگی میں کون کون سی اشیا شامل ہوتی ہیں؟ انھوں نے کہا، "کھانا، کپڑا، مکان، غالب اور دیوانِ غالب!" صاف ظاہر ہے کہ یہ صاحب غالب کے طرف دار تھے اور اس حد تک طرف دار تھے کہ خود غالب کی ذات کو "دیوانِ غالب" سے جُدا

کہنے پر تُلے ہوئے تھے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ ان صاحب نے غالب سے اپنی طرف داری جتلانے کے لیے "کلیاتِ میر" پر بھی دیوانِ غالب کا ٹائیٹل چڑھا رکھا ہے اور محض ٹائیٹل کے دھوکے میں میر کے کلام کو بھی غالب کا کلام سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں قطع کلام کہنے کا کوئی موقع عنایت نہیں کرتے، کیوں کہ ان صاحب کی نظر میں اردو شاعری نے صرف ایک ہی شاعر پیدا کیا ہے اور وہ ہے غالب۔ ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ جناب ذرا اردو کے تین بڑے شعرا کے نام تو بتائیے؟ موصوف نے کہا، "غالب، مرزا غالب اور مرزا اسد اللہ خاں غالب"۔ اس پر ہم نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ آگے ان کی دال نہ گلے گی، پوچھا کہ اب لگے ہاتھوں چوتھے بڑے شاعر کا نام بھی بتائیے" تو کہنے لگے، "نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب"۔ غرض کہ غالب سے ان کا تعلق خاطر بھی "غبارِ خاطر" سے کچھ کم نہیں۔

انھی صاحب کا ذکر ہے کہ ایک بار وہ "کلیاتِ میر" میں سے جس پر "دیوانِ غالب" کا ٹائیٹل چڑھا ہوا تھا اپنے تئیں غالب کا کلام پڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی شعر پر پھڑک اُٹھے اور کہنے لگے، "واہ سبحان اللہ، کیا شعر کہا ہے غالب نے"۔ ہم نے کہا، "ہم بھی تو سُنیں کون سا شعر ہے؟" فرمانے لگے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کو سنتے ہی ہماری رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی اور ہم نے پہلے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ٹٹول کر ان کی دکھتی رگ پکڑ لی اور کہا، "جناب، یہ شعر غالب کا نہیں میر کا ہے"۔ یہ سُنتے ہی انھوں نے اپنی دکھتی رگ ہمارے ہاتھ سے چھڑالی اور تنک کر بولے، "بالکل غلط، یہ شعر کسی طرح بھی میر کا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ میر صاحب تو روتے روتے سو گئے ہیں۔ بھلا سوتے سوتے وہ کس طرح شعر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعر غالب کا ہے اور ۹۹ فی صد غالب کا ہے"۔

چار کیلو غزلیں

ادھر جب سے دنیا تجارت کے چنگل میں پھنس گئی ہے اس وقت سے ہر شے ترازو میں



تُلنے اور تجارت کے سانچے میں ڈھلنے لگی ہے۔ ہمیں اس نوجوان کی بات اب بھی یاد ہے، جس نے ایک کتب فروش کی دُکان پر کھڑے ہو کر کتب فروش سے کہا تھا:

"جناب والا، مجھے کرشن چندر کے دو کیلو افسانے، راجندر سنگھ بیدی کی ڈیڑھ کیلو کہانیاں اور فیض کی چار کیلو غزلیں دیجیے۔"

اس پر کتب فروش نے ہماری آنکھوں کے سامنے کرشن چندر اور بیدی کی کہانیوں کے مجموعے ترازو میں تول کر دیے اور فیض کی غزلوں کے بارے میں فرمایا، "حضور والا، میں آپ کو فیض احمد فیض کی چار کیلو غزلیں دینے کے موقف میں نہیں ہوں، کیوں کہ فیض کا سارا ادبی سرمایہ صرف دو کیلو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یقین نہ آئے تو "دستِ صبا، نقشِ فریادی اور زندان نامہ" کو تول کر دیکھ لیجیے۔"





(بہ شکریہ بچوں کا رسالہ)

آفتاب عالم

طاقت ور کون ؟

ایک جنگل تھا۔ اس میں طرح طرح کے جانور رہتے تھے اُن میں جنگل کا راجا شیر تھا۔ ایک شام شیر گھومنے نکلا۔ جنگل کے سبھی جانور اور پیڑ ڈر کے مارے کانپنے لگے۔ جب شیر پہاڑ کی ترائی سے ہو کر چلا تو پہاڑ بھی ہلنے لگا۔ جب وہ ندی کے کنارے پہنچا تو ندی کا پانی بھی شیر کو دیکھ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ شیر نے ندی کا پانی پیا۔ اور غرّاتا ہوا ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھمنڈ سے ہنسا اسکی غرّاہٹ ہوا میں گونجنے لگی وہ خود بول اٹھا" میں کتنا طاقت ور ہوں۔ میری کتنی دھاک ہے۔ میں کسی سے بولوں یا نہ بولوں۔ سبھی مجھے دیکھ کر کانپ جاتے ہیں۔ اتنا کہہ کر شیر دھاڑا لیکن تبھی ایک ہلکی سی گنگناہٹ سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کوئی ہنس رہا ہے۔ شیر گرجا کون ہنس رہا ہے۔" دھیمی دھیمی آواز میں مچھّر نے کہا "شیر دادا یہ میں ہوں مچھّر۔" شیر نے پوچھا کہ مچھّر یعنی .... مچھّر بول اٹھا یعنی ایک چھوٹا سا تیز جانور، جیسے لوگ اپنی چٹکی میں مسل دیتے ہیں شیر بولا۔" تم کہاں سے بول رہے ہو فوراً میرے سامنے آجاؤ۔" مچھّر بولا۔ شیر دادا "میں آپ کے ماتھے پر بیٹھا بول رہا ہوں"۔ شیر بولا تم کوئی شیطان لگتے ہو۔" میرے ماتھے پر کہاں ہو۔ میرے پر تو دور رہا کسی بھی میرے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہے یہ سُنکر مچھّر ہنس پڑا۔

شیر بولا۔ ارے بدمعاش سامنے آ۔ چھپکر کیوں ہنستا ہے مچھّر بولا۔ شیر دادا ساری دنیا آپ سے ڈرتی ہے۔ شاید اسی بات کا آپ کو گھمنڈ ہے لیکن اتنا جان لیجیے بھلے ہی ساری دنیا آپ سے ڈرتی ہو میں آپ سے قطعاً نہیں ڈرتا شیر نے گرج کر کہا۔ ارے پاجی جھوٹی بکواس بند کر اگر اتنا بہادر ہے تو میرے سامنے آ۔" مچھّر نے کہا۔ دیکھو شیر دادا اب میں تمھارے بائیں کان پر چکوٹی کاٹتا ہوں پھر تمھیں پتہ چلے گا کہ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں یا سچ۔

مچھر نے جیسے ہی بائیں کان پر کاٹا شیر نے اس پر پنجہ مارا لیکن مچھّر

شیراز ہند اردو لائبریری، مورلی۔ جون پور ۲۲۲۱۴۲

اڑ کر دوبارہ اپنے کان پر پہنچ گیا اور وہاں بھی کاٹا۔ شیر نے وہاں بھی پنجہ مارا لیکن بے سود۔ اب مچھر اڑ کر ناک پر پہنچ چکا تھا۔ ناک پر کاٹتے ہی شیر نے وہاں پنجہ مارا۔ اس طرح جہاں جہاں شیر کا نرم چمڑا تھا وہاں وہاں مچھر کاٹتا اور شیر اپنے ہی پنجے سے مار کر اپنے کو گھائل کرتا رہا۔ آخر میں تھک ہار کر کھڑا ہو گیا۔

مچھر ہنس پڑا۔ شیر دوبارہ پوری طاقت سے دھاڑا۔ مچھر نے کہا شیر دادا تم اپنی دھاڑ سے پورے جنگل کو ڈرا سکتے ہو لیکن میں چھوٹا سا مچھر بھاگ نہیں سکتا اب بتاؤ کہ طاقت ور کون ہے۔ یہ سن کر شیر کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ آج تک ان دونوں میں دوستی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جہاں مچھر رہتے ہیں وہاں شیر نہیں ٹھہرتا۔ (گجراتی کہانی سے)



بدنصیب اور بانصیب

بدنصیب وہ ہے جس نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ لیا، جس نے آداب نہ سیکھے، جس نے والدین کو ناراض کیا اور جو اپنی خواہشات کا غلام بنا۔

بانصیب وہ ہے جس نے آخرت کو اپنا گھر سمجھا، جس نے والدین کو خوش رکھا، جس نے آداب سیکھے اور جو اپنی خواہشات کا غلام نہ بنا۔

شکر ادا کرنا

شیخ سعدیؒ ایک بار دوپہر کے وقت کہیں جا رہے تھے۔ تیز دھوپ تھی۔ آپ پانو سے ننگے تھے جس کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ کاش خدا مجھے اتنی دیتا کہ میں جوتے خرید لیتا۔ ابھی تھوڑا دور گئے تھے کہ ایک شخص پر نظر پڑی جس کے دونوں پانو نہیں تھے۔ آپ نے اسی وقت شکر ادا کیا کہ اگر جوتے نہیں دیے تو کیا پانو تو ہیں۔

کمسن بوڑھا

۱۴ مارچ ۱۸۲۹ء میں انگلستان کے شہر اسٹیفرڈ میں چارلس ورتھ نامی ایک بچے نے جنم لیا۔ جب اس کی عمر ۴ سال ہوئی تو اس کی داڑھی نکل آئی۔ اس بچے کا انتقال ۷ سال کی عمر میں ہوا۔ اس عمر میں وہ ہر لحاظ سے ستر سال کے انسان کے برابر تھا۔

سید احمد داد ے

اسلامی عیدین

رسول اکرم صلعم اور صحابۂ کرام نے تیرہ سال مصیبتوں اور آزمائش میں گزارے پھر
آگیا کہ دعوت اسلامی "نظام اسلامی" کی صورت اختیار کرے آپ نے مدینہ منورہ میں یہ کام شروع
ردیا چنانچہ قبلہ کا رُخ، اذان، نماز جمعہ، صوم رمضان زکات اور صدقۂ فطر، یہ سب اسلامی
ساتی کی چیزیں ہیں ۔ یہ کام ہجرت کے پہلے دو برسوں میں پورا ہوا ۔ اسی زمانہ میں اسلامی
ہواروں پر بھی غور کیا گیا ۔ ابو داود، ترمذی اور النسائی نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اکرمؐ
مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ سال میں دو دن کھیل کود میں گزارا کرتے تھے ۔ آپ نے صحابہ
سے پوچھا یہ دن کیسے ہیں؟

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اِن دِنوں میں زمانۂ جاہلیت میں کھیلا کودا کرتے
تھے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان دِنوں کے بجائے خوشی منانے کو تمھارے واسطے دوسرے دو
ن تجویز کیے ہیں جو اُن سے بہتر ہیں وہ دن ہیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ ۔ ان دنوں سے ملت
مسلمہ کی عظمت قائم ہے اور ظاہری شان و تجمّل کے ساتھ عبادت اور آدابِ بندگی کو مِلا دیا گیا ہے
یہ دن صرف تہوار بن کر نہ رہ جائیں ۔ ان دِنوں میں ایک دن وہ ہے جب مسلمان روزوں سے
رغ ہوتے ہیں صدقۂ فطر ادا کرتے ہیں ۔ اور عیدگاہ میں جاکر عید کی نماز خلوص سے ادا کرتے ہیں ۔ اس
ں ذاتی اور قومی دونوں قسم کی خوشیاں جمع ہو جاتی ہیں ۔ ذاتی خوشی یہ کہ روزہ اور عبادت کا فرض پورا
جاتا ہے ۔ اور محتاجوں کو صدقہ مل جاتا ہے وہ بھی عید کی خوشیوں میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ یعنی
شی یہ کہ خدائے تعالیٰ نے فرض عبادت کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائی اور اہل و عیال کی خوشیوں
ساتھ اُن کو زندگی کا یہ مبارک ماہ دکھایا ۔ دوسرا خوشی کا دن وہ ہے جس دن حضرت ابراہیم علیہ
م نے اپنے نونہال (فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ اسلام) ذبح کرنیکا ارادہ کیا اور خداوند تعالیٰ نے اُن کی

ملہ مسید احمد ابن سید داد ے صاحب ہیڈ پرائمری سکول اسٹو ہمایت نگر ضلع ناندیڑ مہاراشٹرا

جان کے فدیہ میں جنت سے دُنبہ عطا فرمایا کہ اس میں ملّتِ ابراہیمی کے بزرگوں کے حالات کی یاد دہانی ہے۔ اور راہِ خداوندی میں اُن کی جاں سپاری اور انتہائی شکر گزاری کا نمونہ پیش کرتا ہے اور حجاجِ بیت اللہ کے ساتھ اور اُن کی تعظیم میں کارِ عظیم میں وہ مشغول ہیں اُس کی ترغیب ہے خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے رمضان کے فطری تقاضے مسرت کو محفوظ رکھتے ہوئے ایسے سال کے دِنوں میں اظہارِ شان و شوکت، مسرت و شادمانی کی اجازت دی، لیکن اسکی بنیاد اللہ تعالیٰ کی نیاز مندی، رضامندی فرمانبرداری اور شکر گزاری پر رکھی، اسلام نے جسم انسانی کے اس مطالبہ کو قبول کیا کہ سال میں بعض دِن اس طرح بسر کیے جائیں کہ دل تفکرات سے آزاد ہو۔ مگر اس نے روح انسانی کے اس تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا کہ خوشی کے لمحات میں اُس مالکِ حقیقی رب العزت کی یاد سے غفلت نہ ہو جس کے فضل و کرم نے یہ خوشی کے دِن دکھلائے

بقول ظفر شاہ {
ظفر آدمی اُس کو نہ سمجھ تو وہ کتنا ہی ہو صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہے جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہے

اور درحقیقت انسان کو خوشی اسوقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک جسم اور روح دونوں کا اُس میں حصہ نہ ہو شریک نہ ہو اور روحِ انسان کی خوشی اس زیادہ کیا اور کیونکر ہو سکتی اس کا سرِ نیاز محبوب حقیقی کے سامنے سر بسجود ہو یہ فخر صرف عیدین ہی کو حاصل ہے کہ ان کا مرکزی نقطہ نماز ہی ہے

اسلام نے اسلامی تہواروں کی مجلس عشرت میں لذتِ مادی کے ساغر بلوریں میں کیفِ روحانی کے بادۂ رنگین کو بھر دیا ہے سبحان اللہ والحمد للہ واللہ اکبر وللہ الحمد۔ [redacted]

"بچوں کی کوشش" کے لیے

آپ جب بھی کوئی کہانی یا مضمون لکھیں تو کاغذ کے ایک طرف اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اس طرح آپ کی کہانی جلد چھپے گی۔ ورنہ تاخیر ہوگی۔ آپ اسی کالم میں اپنے دوست کی سالگرہ، امتحان میں کامیابی، عید کی مبارک بھی دے سکتے ہیں، اپنے اسکول کے دلچسپ واقعات بھی لکھ سکتے ہیں اور اپنے سفر کی روداد بھی، دوسروں کی لکھی ہوئی دلچسپ تحریریں بھی بھیج سکتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی تحریروں میں مصنف کا نام لکھنا نہ بھولیے گا۔

قیوم :۔ قیوم نے اس سوال کا جواب دیا کہ اگر میں کھانے کا ڈبا گھر ہی بھول آیا تو اپنے دوست شاہد سے مانگ کر کھاؤں گا۔

جاوید :۔ جاوید نے کہا کہ میں روزانہ اسکول پیسے لے کر جاتا ہوں میں ہوٹل میں جا کر کھاؤں گا۔

عابد :۔ عابد نے کہا کہ میری ماں نوکر کے ہاتھ میرا کھانا بھیج دیں گی۔

ایوب :۔ ایوب نے کہا کہ ہوٹل والے سے جان پہچان ہے میں ہوٹل میں جا کر کھانا کھاؤں گا۔

تحسین :۔ تحسین نے کہا کہ ہمارے والد اس اسکول میں استاد ہیں اس لیے میں اپنے پاپا کے ساتھ جا کر کھانا کھاؤں گا۔

ریاض :۔ ریاض نے کہا کہ کھانے کا ڈبا چھوٹ جائے گا تو کیا ہوگا ایک دن بھوک برداشت کروں گا۔

اورنگ زیب :۔ اورنگ زیب نے کہا کہ اسکول میں پکوڑی بیچنے والا آتا ہے میں اس سے اُدھار لے کر کھاؤں گا۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔

افروز :۔ افروز نے کہا کہ میں اپنے دوست سے کچھ پیسے قرض لے لوں گا اور کھانا کھاؤں گا۔

شہباز :۔ شہباز نے کہا کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میرا بھائی بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے وہ روزانہ کھانا لے کر آتا ہے۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ کھاؤں گا۔

شمشیر :۔ شمشیر نے کہا کہ ہمارا گھر اسکول سے بہت قریب ہے میں سائکل سے گھر جا کر کھاؤں گا۔

ببلو :۔ ببلو نے کہا کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے کیوں کہ ہمارے اسکول کے پاس ہمارے چچا کا ہوٹل ہے اس لیے میں ہوٹل میں جا کر کھانا کھاؤں گا۔

ایس۔ ایم۔ شمشاد حیدر زمانی۔ (نالندہ)

خلیفہ ہارون رشید

(روشن علی)

ایک مرتبہ مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید کے سامنے ایک باغی کو ہتھکڑیوں میں پیش کیا ۔ یہ ایک خطرناک آدمی تھا۔

خلیفہ ہارون رشید فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے ل کر دے گا۔ قتل کا حکم صادر کرنے سے ہلے ہارون نے غضب ناک آواز میں باغی سے چھا تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

یفہ کا سوال سن کر اس آدمی نے جواب کہ وہی سلوک جو خدا آپ کے ساتھ ے گا جب آپ اس کے سامنے ئیں گے۔

ہارون کا غصہ کافور ہو گیا اس نے اپنا ندامت سے جھکا لیا۔ چند لمحوں بعد دربار لو س کی تھکی ہوئی آواز سنی اسے آزاد یا جائے۔

سپاہیوں نے ہتھکڑیاں کھول دیں باغی جھکائے دربار سے چلا گیا۔ درباریوں میں سی نے خلیفہ ہارون رشید کو مخاطب کیا اے لمومنین آپ نے باغی کا ایک ہی جملہ سن کر آزاد کر دیا یہ کبھی نہ سوچا کہ اس کی گرفتاری میں آپ کے سپاہیوں کو کتنی زحمت ہوئی تھی نیز اس کی رہائی سے شر پسندوں کو شہ مل سکتی ہے خلیفہ ہارون رشید نے بے ساختہ حکم دیا باغی آدمی کو دوبارہ گرفتار کر لیا جائے۔

باغی دوبارہ خلیفہ کے سامنے ہتھکڑیوں میں حاضر ہوا اور اس نے آتے ہی کہا حضور میرے متعلق دوسروں کی رائے پر کان نہ دھریے اگر اللہ آپ کے متعلق دوسروں کی رائے سنتا تو آپ ایک لمحہ بھی خلیفہ نہیں رہ سکتے تھے خلیفہ ہارون رشید نے اسے پھر آزاد کر دیا۔

مختلف ممالک کے مقولے

چاند ہمیشہ بدر نہیں رہتا (چین)

وقت پڑنے پر ایک سنگریزہ ایک بڑے چھکڑے کو الٹ دیتا ہے (جرمن)

نمونہ نصیحت سے بہتر ثابت ہوتا ہے (فرانس)

کیڑوں کے خوف سے کھیتی باڑی نہ کرنا حماقت ہے (جاپان)

جیسے املی خشک ہونے پر اپنی ترشی نہیں کھوتی اسی طرح انسان کی فطرت نہیں بدلتی (عرب)

کنکری سے بھی گھڑا ٹوٹتا ہے (ہندستان)

خدا شفا دیتا ہے۔ ڈاکٹر فیس لیتے ہیں۔ (فارس)

(مرسلہ: بشارت بٹ)

ذیشان بن صفدر

عید

گنگناتی مسکراتی آئی ہے عید
خوشیاں ہر سو لٹاتی آئی ہے عید

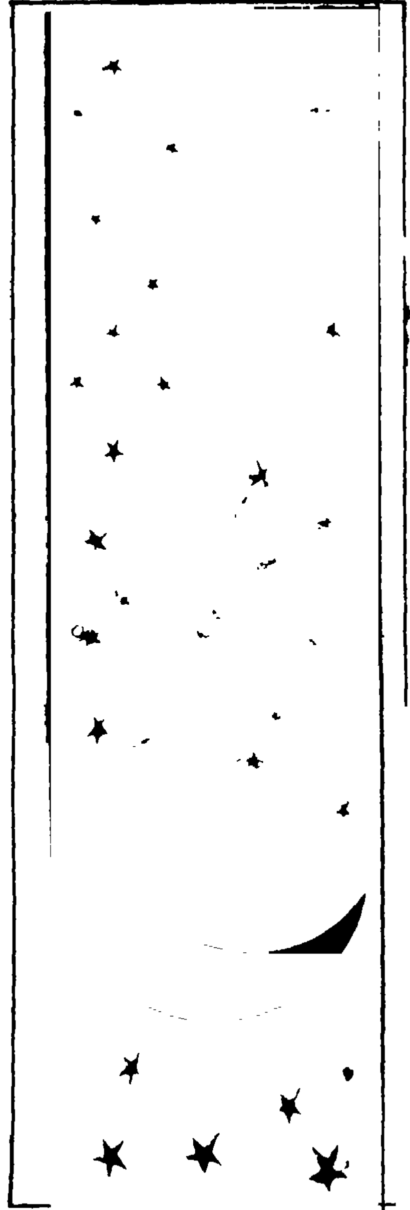
موج اڑاتے پھر رہے ہیں ہمجولی
گلے ہر اک کو لگاتی آئی ہے عید

شیر خرما، برفی پیڑے اور لڈو
چیزیں خوب کھلاتی آئی ہے عید

مل کر گلے شکوے گلے سب جاتے رہے
روٹھے ہوؤں کو مناتی آئی ہے عید

روزے داروں کے لیے انعام ہے
پیغام یہ سب کو سناتی آئی ہے عید

چلیں پڑھنے دوگانہ عید ذیشان
شکر نعمتوں کا ادا کراتی آئی ہے عید



بچوں کے لیے

نئی اور دلچسپ کتابیں

		پہاڑ کی چوٹی پر	۵/۰۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
		رنگوں کی بستی	۲/۵۰	پیارے رسول	۴/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۴/۰۰	سرخ جوتے	۲/۰۰	چار یار	۲/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۴/۰۰	سلامہ و صمصامہ	۴/۵۰	رسول پاک کے اخلاق	۲/۰۰
اندھے کا بیٹا	۲/۵۰	شرارت	۲/۰۰	بہار کی تلاش	۶/۰۰
اپاہج جاسوس	۸/۵۰	صحت کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰	بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
جنگل کی ایک رات	۴/۰۰	صحت کی الف بے	۲/۰۰	بندر اور نائی	۲/۵۰
سہانے ترانے	۴/۵۰	جدید پہیلیاں	۶/۰۰	بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
ہرن کا دل	۲/۰۰	ممبیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰	تاک دنادن تاکے سے	۱/۵۰
اچھی کہانیاں	۲/۵۰	ننھا فرشتہ	۴/۵۰	پانچ بونے	۱/۵۰
دریا کی رانی	۲/۰۰	نیلا ہیرا	۴/۵۰	ایک دیس ایک خون	۳/۰۰
گوہر شہزادی	۴/۰۰	بہار کی کھیتی	۲/۵۰	جیت کس کی؟	۲/۵۰
شریر شیرا	۳/۰۰	ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰	انعامی مقابلہ	۳/۲۵
پری رانی	۳/۰۰	سرکار کا دربار	۴/۵۰	جادو کا گھر	۱/۵۰
خطرناک سفر	۳/۵۰	دنیا کے جانور	۲/۵۰	چیونٹی رانی	۱/۵۰
اندرا گاندھی	۴/۵۰	آؤ ڈرامہ کریں	۲/۰۰	روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰	اس نے کیا کرنا جانا	۱/۲۰	لال مرغی	۱/۵۰
ننھا جیرو	۲/۵۰	خرگوش کی چال	۲/۵۰	لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۰۰	بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰	مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
پلک نہ مارو	۴/۰۰	جوہر قابل	۲/۰۰	ہیوچو	۱/۵۰
ایک کھلا راز	۲/۰۰	خرگوش کا سپنا	۵/۰۰	بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
بابا ناصح	۲/۰۰	موم کا محل	۴/۰۰	شیر خاں	۱/۵۰
بچوں کے افسر	۵/۰۰	محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰	لومڑی کے بچے	۱/۵۰



● اس بار کا پیام تعلیم تو ایک طرح سے رمضان نمبر ہوگیا۔ آپ نے مذہبی معلومات بالکل صحیح وقت میں دی، جاگو اور جگاؤ، اور السلام علیکم تو یاد رکھنے کی چیزیں ہیں۔

وسیم احمد
بھوپال

● سعید ہاشمی، کرکٹ اور ہنر مند شہزادہ ہم سب کو بے حد پسند آئے۔ السلام علیکم کا تو جواب نہیں۔ سعید ہاشمی بھی دلچسپی سے پڑھی۔

محمد اسماعیل
کٹک

● مئی کا پیام تعلیم میں نے اپنے دوست سے لے کر پڑھا، اتنی ڈھیر ساری مذہبی، سائنسی معلومات اور دلچسپ کہانیاں شائع کرنے پر مبارک باد۔

محمد حسین
چاہ خزانچیاں (رام پور)

● مئی کا شمارہ پڑھا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ کیوں کہ اس میں اچھے اچھے مضامین کے علاوہ لطیفوں کا کالم بھی بڑھا کر دیا تھا۔ اب کے تو پیام تعلیم میں اسلامیات سائنس اس کے علاوہ سبھی کالم آنے لگے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پیام تعلیم سارے جہاں میں چاند کی طرح چمکے۔

ایم شعیب
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

● مئی کا شمارہ خرید کر گھر آیا اس کے ہر ورق پر نظر ڈالی۔ جس انداز سے آپ نے اسے سنوارا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس شمارہ میں ہر چیز ملتی ہے جس کی ہم کو ضرورت ہوتی ہے۔ میری طرف سے تمام قلم کاروں کو دلی مبارک باد۔

محمد صفدر امام
بہار شریف

● مئی کے پیام تعلیم میں "روزے" جاگو اور جگاؤ" السلام علیکم" حضرت ایوب کی کہانی" ہمارے پورے خاندان کو پسند آئے۔ مضمون نگار حضرات اور آپ کو مبارک باد۔

ناظم مکرم
رام نگر نینی تال

● کرکٹ، ہنر مند شہزادہ، السلام علیکم اور بجلی کی گھنٹی کا جواب نہیں

رضوی گڈو۔ رام نگر

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

دلچسپ خبریں

روشن جوتے

امریکی سائنس دانوں نے حال ہی میں ایسے حیرت انگیز جوتے تیار کیے ہیں جن کے آگے بلب اور پیچھے پہیے لگے ہوئے ہیں۔ جوتوں کے اوپر ایک بیٹری لگی ہوئی ہے جو رات کے وقت بلب کی روشنی میں راستہ دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ جوتے پہن کر انسان تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکے گا۔

انجن والے جوتے

روس کے سائنس دانوں نے انجن سے چلنے والے جوتے تیار کیے ہیں۔ ان جوتوں کو پہن کر آدمی پندرہ کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ جوتوں میں دو چھوٹے چھوٹے انجن لگے ہیں جنھیں ایڑی کے دباؤ سے اسٹارٹ کیا جاتا ہے۔ یہ انجن ڈیزل سے چلتے ہیں۔ اگر انھیں پوری رفتار سے چلایا جائے تو ایک گھنٹے میں صرف دو اونس ڈیزل خرچ ہوتا ہے۔

شاہ کار فن کار کو کھا گیا!

ہالینڈ کے ایک مصوّر نے ایک ڈھانچے کی تصویر بنائی۔ ایک دن جب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ڈھانچا حرکت کر رہا ہے۔ خوف کی وجہ سے وہ مصوّر ہلاک ہو گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ ڈھانچے میں زلزلہ آنے کی وجہ سے حرکت ہو رہی تھی۔

مشینی معلم

آسٹریلیا کے ایک انجینیئر نے ایک ایسا روبوٹ بنایا ہے جو اسکول کے چھوٹے بچوں کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے سمجھنے میں مدد دے گا۔ یہ کاغذ پر مختلف شکلیں بنا سکتا ہے جو بچوں کو جیومیٹری اور ریاضی پڑھانے میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ یہ روبوٹ اسکول کے علاوہ یونی ورسٹی کی سطح پر بھی تحقیقی کاموں اور صنعتی اداروں میں تربیتی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا تالا

لاہور میں تالوں کے ایک تاجر شیخ محمد رفیق کے پاس ایک ایسا تالا موجود ہے جو دنیا کا سب سے بڑا تالا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تالا ڈیڑھ سینٹی میٹر موٹی دھاتی پلیٹ سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کی لمبائی ۴۵ سینٹی میٹر، چوڑائی ۳۱ سینٹی میٹر موٹائی ۱۱ سینٹی میٹر اور اس کے کنڈے کی موٹائی ۶ سینٹی میٹر ہے یہ تالا ۱۲۰ پونڈ وزنی ہے۔ اس کے ساتھ دو چابیاں ہیں جن کے بغیر اس تالے کو کھولنا ناممکن ہے۔ ہر چابی کا وزن ۵۸۷ گرام ہے۔ چابیوں کی لمبائی ساڑھے تہتر سینٹی میٹر ہے۔ اس غیر معمولی تالے میں ۲۵ لیور کام کرتے ہیں۔ شیخ محمد رفیق کے کہنے کے مطابق یہ دنیا کا سب سے بڑا اور وزنی تالا ہے، جو انھوں نے خود آرڈر دے کر بنوایا تھا۔ یہ تالا سیالکوٹ کے ایک ہنرمند نے بنایا تھا۔ اس کی نقل کرنا ناممکن ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تمام تالا ہاتھ سے بنایا گیا ہے۔



ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے

ایک بادشاہ تھا جو بہت ہی رحم دل تھا۔ رعایا سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں بڑی کا نام شہزادی غزالہ تھا اور چھوٹی کا نام شہزادی سلمیٰ تھا۔ دونوں خوبصورت اور عقل مند تھیں۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ بڑی شہزادی بہت صبر کرنے والی تھی اور کام کو سوچ سمجھ کر کرتی تھی جب کہ چھوٹی شہزادی بہت مغرور اور بڑی بہن کے بالکل برعکس تھی۔

ایک دن شہزادیاں اور ملکہ باغ میں ٹہل رہی تھیں کہ ملکہ کو ایک دم چکر آگیا اور وہ گر پڑی دونوں شہزادیاں بہت گھبرا گئیں نوکرانی نے دوڑ کر ملکہ کو اٹھایا اور لاکر بستر پر لٹا دیا شاہی طبیب کو بلوایا گیا۔ دیکھا تو ملکہ کے جسم پر سبز رنگ کے دانے نکل آئے تھے۔ بادشاہ نے محسوس کیا کہ شاہی طبیب سے کوئی علاج نہیں ہو رہا تو بہت پریشان ہوا اس نے اعلان کروایا کہ جو بھی ملکہ کا علاج کرے گا اُس کو پچاس ہزار دینار انعام میں دیے جائیں گے۔ دو ہفتے گزر گئے لیکن ملکہ کا صحیح علاج نہ ہو سکا شہزادیاں اور پریشان ہو گئیں

ایک نجومی گھومتا پھرتا اُدھر سے گزر رہا تھا شہزادیوں کو اس کے آنے کی خبر ہوئی تو انھوں نے نجومی کو محل کے اندر بلا کر ملکہ کے علاج کے بارے میں پوچھا نجومی نے حساب لگا کر بتایا کہ ملکہ کو ایسے کیڑے نے کاٹا ہے جس کا خون سبز رنگ کا ہے۔ اور اس کا علاج صرف نارنجی بیر ہیں" نارنجی بیر" شہزادیوں نے حیران ہو کر پوچھا نجومی بولا ہاں نارنجی بیر" جو دیو کی خوراک ہیں اور نارنجی بیر زمین کے نیچے پائے جاتے ہیں۔ ان تک پہنچ پانا ایک مشکل کام ہے" وہ زمین کے نیچے کہاں ملتے ہیں" غزالہ بولی۔ شمالی پہاڑوں کے قریب ملتے ہیں" شہزادیاں سوچ میں پڑ گئیں کہ وہاں کیسے جایا جائے۔ بہر حال انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بیر وہ خود تلاش کرنے جائیں گی۔ انھوں نے سفر شروع کیا اور جب وہ شمالی پہاڑوں کے قریب پہنچ گئیں تو دونوں علاحدہ علاحدہ راستوں پر بیروں

کی تلاش میں نکل گئیں تاکہ وہ گوہرِ مراد جلد حاصل کر سکیں۔

شہزادی قرۃ العین چلتے چلتے ایک جھونپڑی کے پاس آگئی۔ جس کے اندر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے جونہی شہزادی نے انھیں سلام کیا وہ بزرگ بولے "بیٹی مجھے معلوم ہے تم کیا تلاش کرنے آئی ہو۔ اگر تم کچھ شرائط منظور کرلو تو اپنا گوہر مراد پالو گی شہزادی نے کہا کیا"؟ تو بزرگ کہنے لگے پہلی شرط یہ ہے کہ تمھیں وہاں پہنچنے کے لیے چودھویں رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ اس لیے کہ چودھویں رات تمام دیو اور جن اپنے آقا کے پاس حاضری دینے جاتے ہیں۔ اس طرح تم اندر جا سکو گی اور تمھیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم کسی کو برا بھلا مت کہو اور ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤ وہ اس لیے کہ یہ دیو جن جو زمین کے نیچے رہتے ہیں بہت پُرامن اور متحد ہو کر رہتے ہیں۔ اور جب بھی ان کے قریب کسی کے لیے برائی سوچی جائے۔ یا کسی کو برا کہا جائے تو انھیں خبر ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس کو روکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن تمھیں اپنا مقصد اس طرح پورا کرنا ہے کہ تمھیں دیو نظر نہ آئیں اور نہ وہ تمھیں

بیر نہیں دیں گے۔ اچھا اب تم جاؤ! چودھویں رات کا انتظار کرو اللہ تم کو کامیاب کرے۔ شہزادی بزرگ کو سلام کر کے اٹھ گئی۔

ادھر شہزادی سلمٰی بھی چلتے چلتے بزرگ کے پاس پہنچ گئی بزرگ نے اسے بھی وہ شرطیں بتائیں لیکن شہزادی سلمٰی اپنی عادت کے مطابق چل پڑی اس نے سوچا کہ چودھویں رات سے پہلے ہی بیر تلاش کر لینے چاہییں تاکہ اپنی بہن سے سبقت لے جائے وہ راستہ تلاش کرنے لگی لیکن اس کو وہ راستہ نہ ملا۔ ایک دن وہ اسی طرح بھٹک رہی تھی کہ اس کو ایک پاگل سی عورت نظر آئی۔ سلمٰی نے اس کے نزدیک آکر حکم دینے والے انداز میں نیچے جانے والے راستے کے بارے میں پوچھا اس پر پاگل عورت اور زیادہ ہنسنے لگی سلمٰی کو بہت غصہ آیا اس نے ایک لکڑی اٹھا کر اس کو دے ماری وہ عورت غائب ہو گئی۔ شہزادی ابھی حیران ہو کر اس عورت کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس کو چکر آیا اور وہ بے ہوش ہو گئی جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اپنے بستر پر پایا ادھر شہزادی غزالہ ایک پہاڑ کے

قریب پہنچی تو اس کو بھی ایک عورت نظر آئی جو زور زور سے قہقہہ لگا رہی تھی شہزادی کو اس پر بڑا رحم آیا اس کو تھوڑا سا پانی پلایا اور سوچنے لگی کہ میں اس کو سفر سے واپسی پر اپنے محل میں لے جاؤں گی اور اس کا علاج کراؤں گی۔ چودھویں کی رات کو شہزادی نیچے جانے والا راستہ ڈھونڈنے لگی دو گھنٹوں کی مسلسل کوشش کے بعد اس نے زمین کے نیچے جانے والا راستہ تلاش کر لیا اور بیر لے کر واپس آگئی۔ ملکہ بیر کھاکر چند ہی گھنٹوں میں بالکل ٹھیک ہو گئی ادھر شہزادی سلمیٰ حیران تھی کہ وہ تو بیر حاصل نہ کر سکی پھر اس کی بہن بیر کیسے لے آئی۔ جب دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو اپنے حالات سفر بیان کیے تو سلمیٰ بہت پچھتائی اور کہنے لگی آپ درست کہتی تھیں کہ ہر کام سوچ سمجھ کر نا چاہیے اور دونوں بہنیں گلے مل گئیں اور ملکہ اور بادشاہ کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگیں۔

حسینی شاہد۔ نور نگر۔ ہاؤس نمبر ۳
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

میں نے مقابلہ کیا

میں اس اسکول میں نئی نئی داخل ہوئی تھی۔ ویسے تو میری جماعت کی تمام طالبات بہت اچھی تھیں مگر ان میں ایک لڑکی غزالہ بہت ہی ذہین اور باقاعدہ پڑھنے والی لڑکی تھی اور اپنے امتحانات میں ہمیشہ نمایاں رہتی تھی اس لیے تمام استانیاں اسے بے حد چاہتی تھیں مجھے اس اسکول میں آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ششماہی امتحانات قریب آگئے تو غزالہ نے اور زیادہ محنت اور لگن سے پڑھنا شروع کر دیا اور میں نے بھی خوب محنت کی۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ جب ہمیں ہماری محنت کا پھل ملنے والا تھا چنانچہ ہم سب اسکول آئے اور نتیجہ نکلنے کا انتظار کرنے لگے ہماری ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے نتیجہ سنایا کہ کون اوّل، دوم اور سوم آیا ہے اس بار اوّل آنے والی لڑکی غزالہ نہیں بلکہ میں تھی اور جب میرے ہاتھ میں میری رپورٹ آئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ میرے نمبر بہت ہی اچھے تھے تمام لڑکیاں مجھے مبارک باد دے رہی تھیں اور ان مبارک باد دینے والیوں میں غزالہ بھی شامل تھی میں غزالہ کی زبان سے مبارک باد سن کر حیران رہ گئی وہ تو ہر امتحان میں اوّل آتی رہی ہے اور اس بار میرے اوّل آنے سے وہ مجھ سے یقیناً جل گئی

ہوگی اس نے مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کی اس کا یہ جذبہ دیکھ کر میں کہہ اٹھی کہ واقعی غزالہ ایک عظیم لڑکی ہے پھر غزالہ نے اور زیادہ محنت سے پڑھنا شروع کر دیا وہ ششماہی امتحان میں اوّل نہیں آئی تھی مگر پھر بھی وہ نا اُمید نہیں ہوئی ہمت ہار کر نہیں بیٹھی بلکہ اس نے ایک نئے عزم اور جذبے کے ساتھ پڑھائی جاری رکھی۔ سالانہ امتحان میں میرے اور غزالہ کے تمام پرچے بہت اچھے ہوئے اس بار میں اور غزالہ دونوں اوّل آئے۔ اس دن ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور ہم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

عفت جہاں روحی ۔ اوگانواں (رنالندہ)

اس سے کہہ دوں گا

بھوپال شہر میں عجب خاں نام کا ایک شخص رہتا تھا۔ وہ بہت ہی غریب تھا۔ دو دو وقت فاقہ کرتا تھا اس کی غریبی کے سبب امیر لوگ اس کا سلام تک نہیں لیتے تھے۔

اسی حال میں کافی عرصہ گزر گیا لیکن تقدیر بدلتے کیا دیر لگتی ہے ایک دن اس کو راستے میں پڑی اشرفیوں کی تھیلی ملی۔ اور وہ امیر بن گیا اب عجب خاں کافی امیر تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی جو عمر بھر ختم نہ ہو سکتی تھی۔ اب امیر لوگ اس سے ادب سے بات چیت کرتے۔ اور دن میں سو بار جھک کر اس کو سلام کرتے تھے۔ جب وہ اس کو سلام کرتے تو سلام کے جواب پر وہ کہہ کر چپ ہو جاتا کہ بہت اچھا میں اس سے کہہ دوں گا۔ اس کے جواب پر شہر کے سارے امیر حیران تھے۔ اور دل ہی دل میں پریشان تھے کہ اسے کہہ دوں گا یہ کیا جواب ہے۔

آخر ایک دن باتوں باتوں میں ایک شخص نے عجب خاں سے پوچھا۔ اس سے کہہ دوں گا یہ کہاں کا سلام ہے۔ میں نے ہر ایک مسلمان سے پوچھا۔ مگر کوئی سمجھا نہ سکا۔ آخر یہ سلام کا نیا جواب کیا ہے۔ اس کا مطلب تم سمجھا دو۔ عجب خاں نے مسکرا کر کہا۔ میں جب غریب اور مفلس تھا۔ تو تم میرا سلام کبھی نہ لیتے تھے اس وقت تم خوش نصیب انسان بہت مغرور تھے۔ اب جب کہ اللہ نے مجھے اتنا خزانہ ملا اب تم مغرور سید ھے ہو گئے۔ اب تم کو سلام کا بہانہ ملا۔ اب جو مجھے سب سلام کر رہے ہیں تو حقیقت میں یہ سلام مجھے نہیں ہے یہ سلام میری دولت کو ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے اس لیے میں سب کے جواب میں کہتا ہوں۔ یہ پیام

...دوں گا یعنی آپ کا سلام گھر جا کر اپنی
...لت سے کہہ دوں گا۔

...ن عبدالحمید انگوٹھے
...لع۔ رتنا گری۔

مشہور اشخاص کے اصل نام

مشہور نام	اصلی نام
ذوق	شیخ محمد ابراہیم
ابوسفیان	صخر
آغا خان سوم	سلطان محمد شاہ
سودا	مرزا محمد رفیع
غالب	اسد اللہ خاں
نورجہاں	مہرالنساء
محمد بن قاسم	بہاءالدین
بوعلی سینا	حسین بن عبداللہ
لال شہباز قلندر	عثمان مروندی
شوکت تھانوی	محمد عمر
شیر شاہ سوری	فرید خاں
ٹیپو سلطان	فتح علی
صلاح الدین ایوبی	یوسف
حسرت موہانی	سید فضل الحسن
انارکلی	نادرہ بیگم

مشہور نام	اصلی نام
حافظ شیرازی	صلح الدین سعدی
ابن صفی	اسرار احمد
ابن بطوطہ	ابوعبداللہ محمد
شوق قدوائی	احمد علی
گاما پہلوان	غلام حسین رستم زماں
مہاتما بدھ	سدھارتھ
مہاتما گاندھی	موہن داس کرم چند
بھولو پہلوان	منظور حسین
چنگیز خاں	تیموچن
اے آر خاتون	اُمت الرحمٰن خاتون
مجید لاہوری	عبدالمجید چوہان
بہادر شاہ ظفر	ابوالمظفر سراج الدین
ساحر لدھیانوی	عبدالحئی
اکبر الہ آبادی	سید اکبر حسین
آتش	خواجہ حیدر علی
شیر افگن	علی قلی خاں
ابن خلدون	ولی الدین عبدالرحمٰن
شورش کاشمیری	عبدالکریم
آغا حشر کاشمیری	آغا محمد شاہ
امام شافعی	ابوعبداللہ محمد بن ادریس

از تکمیل نظر "فیضی"
۱۸۷۔ ڈی۔ آشیانہ بے آر آئی کیمپس جامعہ نگر

ہر چیز سے ہے اس کی کاریگری ٹپکتی
یہ کارخانہ تو نے کب رائیگاں بنایا
(اسمٰعیل میرٹھی)

محمد انصار ابن محمد اشرف ڈاٹا۔ جنگل

تاجر کی چالاکی

پہلے زمانے کی بات ہے کی ایک گانو میں ایک تاجر رہتا تھا۔ وہ تجارت کرنے کے لیے اپنے گانو سے دوسرے گانو جایا کرتا تھا۔ راستے میں جنگل پڑتا تھا۔ پہلے زمانے میں سونے کا سکہ چلتا تھا اور اُسی زمانہ کا عام رواج تھا کہ لوگ پیسے کو پوٹلی میں باندھ لیا کرتے تھے۔

ایک دن، تاجر جب جنگل سے گزر رہا تھا تو اچانک ایک جھاڑی سے شیر نکل کر تاجر پر جھپٹا بچارے تاجر کے پاس ہتھیار نام کا کوئی چیز نہیں تھی۔ اپنا بچاؤ کرتا تو کیسے، مگر عقلمند تھا، اس نے جھپٹ کر شیر کی دم پکڑ کر پوری طاقت سے گھومنے لگا۔ گھومتے گھومتے بچارا کافی تھک گیا یہاں تک کہ اس کی کمر میں پوٹلی بندھی ہوئی کھل گئی اور ڈھیرے ڈھیرے سونے کے سکے گرنے لگے اتفاق سے اسی جنگل سے ایک مسافر گزر



میرے پسندیدہ اشعار

اے بھولے بھالے بچو نادانو ناتوانو
سر پر بڑوں کا سایا، سایا خدا کا جانو
(حالی)

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
(اقبال)

چھپا دستِ ہمت میں زورِ قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے
(حالی)

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے
(غالب)

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
(غالب)

رہا تھا۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ مسافر کو دیکھ کر تاجر نے اپنا چہرہ مسکراتا ہوا بنالیا۔ مسافر نے تاجر سے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو تاجر بولا۔ دیکھ نہیں رہے ہو یہ جادوئی شیر ہے اس کی دم گھمانے سے سونے کے سکے گرتے ہیں

مسافر نے تاجر سے کہا اے میرے بھائی مجھے بھی تھوڑی سی جادوئی شیر کی دم گھمانے دو تو تاجر نے کہا نا بابا میں نے ناحق شیر کا راز تم کو بتا یا۔ ایک بار پھر مسافر نے تاجر سے کہا اے میرے بھائی بس تھوڑی دیر کے لیے آخر انسان تو انسان ہی کا کام آتا ہے تاجر بولا، لیکن ایک شرط پر دے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرا جتنا بھی سکہ کمایا ہوا ہے وہ تم مت لینا مسافر نے وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد تاجر نے اس آدمی کو شیر کی دم پکڑوا دی تاجر نے اپنے گرائے ہوئے سکے چن لیے اور اپنی راہ لی بیچارا بے وقوف مسافر مارا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ عقلمند آدمی ہی بیوقوف کو مصیبت میں پھنسا دیتا ہے۔

نام محمد تحسین رضوی
کیر آف۔ ڈاکٹر محمد اکرم رضوی۔ ایم۔بی۔بی۔ایس
ضلع۔ بھاگلپور۔ بہار۔



لالچی گیدڑ

کسی جنگل میں ایک گیدڑ رہتا تھا وہ بہت پیٹو اور لالچی تھا۔ درختوں سے جتنے پھل گرتے فوراً ہی اسے چٹ کر جاتا۔

ایک دن وہ آم کے درخت کے نیچے پہنچا۔ جہاں زمین پر بہت سے آم گرے ہوئے تھے۔ اتنے سارے آم دیکھ کر گیدڑ بہت خوش ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر بکھرے تمام آم چٹ کر گیا۔ لیکن پیٹ بھرنے کے باوجود اس کی نیت نہیں بھری۔ دو چار لمبی ڈکاریں لینے کے بعد وہ آم سے بھری شاخوں کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے درخت پر چڑھنے کی تدبیر میں سوچنے لگا۔ ابھی وہ پیڑ پر

چڑھنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا کہ کسی طرف سے ہاتھی صاحب تشریف لے آئے جو بہت ہی بھوکے معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے آم کے پتوں اور پھلوں سے پیٹ کی آگ بجھائی۔ پھر وہ خدا کا شکریہ ادا کر کے سستانے کے لیے زمین پر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہاتھی کو دیکھ کر گیدڑ بہت خوش ہوا۔ اس کی سمجھ میں ایک بہت ہی اچھی تدبیر آئی۔ تھوڑی دیر تک وہ ہاتھی کے سونے کا انتظار کرتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر آرام کر کے ہاتھی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے پہلے ہی گیدڑ ایک شاخ پکڑ کے پیڑ پر چڑھ گیا۔ اپنے چاروں طرف بیشمار ہرے، پیلے، لال آم دیکھ کر وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے خوب آم کھائے یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹنے لگا۔ وہ پیڑ کے تمام آم کھا جانا چاہتا تھا۔ لیکن پیٹ میں گنجائش نہیں تھی۔ وہ پریشان ہو گیا اور تمام آم کھانے کی تدبیر سوچنے لگا۔

پھر ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ ایک ایک شاخ پر جا کے آم نیچے گرانے لگا۔ یہاں تک کہ تمام آم نیچے گر گئے۔ گیدڑ بہت خوش ہوا۔ آم گرانے کے بعد اس نے اترنے کے لیے نیچے دیکھا۔ لیکن ہاتھی جا چکا تھا اب اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ آم کھانے کی لالچ میں وہ ہاتھی کا سہارا لے کر پیڑ پر چڑھ گیا تھا۔ پر یہ نہیں سوچا تھا۔ کہ ہاتھی کے بغیر اترے گا کیسے؟ اتنے اونچے پیڑ سے نہ وہ چھلانگ لگا سکتا تھا۔ اور نہ ہی موٹے تنے کے ذریعے نیچے اتر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہوا کے تیز جھونکے چلنے لگے اور پیڑ کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ اب گیدڑ بہت گھبرایا اور ایک شاخ سے لپٹ گیا۔ رفتہ رفتہ ہوا آندھی میں تبدیل ہو گئی۔ چند لمحوں تک درخت ہوا کے شدید جھونکوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ پیڑ جڑ سے اکھڑ کر زمین پر گر پڑا اور ایک وزنی شاخ کے نیچے دب کر گیدڑ کا کچومر بن گیا۔ اب ایک طرف لالچی گیدڑ مردہ پڑا تھا اور دوسری طرف زمین پر بکھرے ہوئے بہت آم۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے "لالچ بری بلا ہے"

محمد آفتاب عالم شیخانہ خورد (بہار)



عظیم فلاسفر کیسے بنا؟

بہت مدت گزری شہر خاراب میں جو ترکستان میں ہے ایک غریب لیکن نہایت محنتی لڑکا رہتا تھا۔ دن کو تو وہ اپنے استاد کے پاس جا کر پڑھ لیتا اور رات کو پڑھا ہوا سبق یاد کرنے بیٹھ جاتا اس کے سرہانے ہمیشہ ایک مٹی کا دیا جلتا تھا۔ جس کی روشنی میں وہ سبق یاد کرتا۔

ایک رات کو وہ اپنی چارپائی پر بیٹھا بڑی توجہ اور انہماک سے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ دیے کی روشنی دھیم ہونے لگی اس نے بتی کو اونچا کیا۔ روشنی تو ہوئی لیکن بڑی جلدی ختم ہو گئی۔ اب جو اس نے دیے پر نظر ڈالی یہ دیکھ کر اسے بڑا افسوس ہوا کہ دیے کا سارا تیل ختم ہو چکا ہے اب میں کیا کروں؟ اس نے دل میں سوچا۔ رات آدھی گزر چکی ہے۔ دکانیں بند ہو چکی ہیں لیکن اگر دکانیں کھلی بھی ہوتیں تو تیل خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے کہاں تھے۔ اس حالت میں تو بہتر یہی تھا کہ وہ کتاب سرہانے رکھے اور سو جائے۔ مگر ابھی تو ابھی دو گھنٹے اور پڑھنا تھا وہ ان دو گھنٹوں کو سو کر ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اپنی کوٹھری سے نکل کر دروازے پر آبیٹھا۔ رات کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا سب لوگ آرام کر رہے تھے اتنے میں دور سے روشنی کی ایک لکیر نظر آئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور روشنی کی طرف چل دیا۔ کچھ دور جا کر اس نے دیکھا کہ روشنی تو ایک قندیل سے نکل رہی تھی جو چوکیدار کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے چوکیدار کے قریب جا کر ادب سے پوچھا۔ جناب اگر آپ اجازت دیں تو قندیل کی اس روشنی میں پڑھ لوں۔؟

چوکیدار بولا۔ ہاں بیٹا پڑھ لو۔ میں تھوڑی دیر یہاں رکوں گا۔ یہاں بیٹھ جا۔ کچھ دیر بعد چوکیدار جانے کے لیے تیار ہو گیا مشکل یہ تھی کہ چوکیدار

ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ کہنے لگا اب تم گھر جاؤ مجھے آگے جانا ہے۔

آپ ضرور جائیے جناب! میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گا۔ چوکیدار آگے آگے اور لڑکا پیچھے پیچھے چلنے لگا اے مطالعہ کرتے وقت مشکل بہت پیش آئی لیکن وہ ہمت نہیں ہارا۔

دوسری رات پھر اس طرح گزر گئی تیسری رات لڑکا آیا تو چوکیدار کہنے لگا لو بیٹا یہ قندیل گھر لے جاؤ اور آرام سے بیٹھ کر پڑھو میں نئی قندیل لے آیا ہوں۔

لڑکے نے یہ سنا تو بہت خوش ہوا۔ شکریہ ادا کر کے قندیل گھر لایا اور اطمینان سے پڑھنے لگا۔

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ لڑکا جوان ہو کر استاد بن گیا۔ اب وہ علم کا ایک دریا تھا۔ اور لوگ اپنی پیاس بجھانے دور دور سے اس کے پاس آنے لگے۔ یہ لڑکا ابو نصر فارابی تھا۔ وہ اپنے وقت کا عظیم فلاسفر تھا جو ۸۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۹۵۰ء میں وفات ہوئی۔

وفات کے باوجود اس کی عزت اور شہرت میں فرق نہ آیا۔

اور یہ سب علم سے سچی لگن اور محنت کی بدولت ہوا۔

(شکیل احمد ابن فطرت۔ کلکل (کرناٹک)

کیا چیز کس کو کھا جاتی ہے

صدقہ ــــ بلا کو کھا جاتا ہے
غصہ ــــ عقل کو کھا جاتا ہے
عدل ــــ ظلم کو کھا جاتا ہے

تکبر ــــ علم کو کھا جاتا ہے
جھوٹ ــــ رزق کو کھا جاتا ہے
فکر ــــ عمر کو کھا جاتی ہے
رشوت ــــ انصاف کو کھا جاتی ہے
توبہ ــــ گناہ کو کھا جاتی ہے
غیبت ــــ عمل کو کھا جاتی ہے
نیکی ــــ بدی کو کھا جاتی ہے

(شبنم اوگانوی عنبری خاتون۔ اوگانواں نالندہ)

ڈھول بجاؤ

کسی گاؤں میں نٹوں کا ایک گروپ اپنے کرتب دکھا رہا تھا۔ ڈھول کی ڈھم ڈھم کی نئے پرانگاروں کے

ادھر چلتا پھرتے گھیرے کے بیچ سے چھلانگ لگاتا وغیرہ اس طرح کے کھیل تماشوں کو لوگ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

تماشا دیکھنے والوں میں چوروں کا ایک سردار بھی تھا۔ اس نے دیکھا ڈھول کی زوردار آواز کے ساتھ ایک لاکلوٹا نٹ قلابازی کھاتا ہوا اونچے مکان جتنے لمبے بانس پر جا چڑھا۔ اس کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ گئی وہ پاس کھڑے اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ دیکھو کتنے کام کا آدمی ہے! اسے اپنے ساتھ رکھ کر ہم آسانی سے گھروں میں گھس کر چوری کر سکتے ہیں۔

"ہاں سردار میرا بھی یہی خیال ہے" اس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

تماشا ختم ہونے کے بعد اسے میرے پاس لانا سردار نے کہا اس کے بعد وہ آکر تب دیکھنے میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھیل ختم ہوا تو نٹ اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ تبھی چور کا یے نٹ کے پاس جا پہنچا اس نے اچھا کھیل دکھانے کے لیے شاباشی دی پھر اپنے سردار سے ملنے کو کہا۔ نٹ چور کے ساتھ سردار کے پاس آیا۔ اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے سردار بولا بھائی تم کمال کے کلاکار ہو کتنی کمائی کر لیتے ہو اس دھندے میں"؟

"مشکل سے گزر بسر ہو پاتی ہے مالک" اس نے جواب دیا۔ سردار نے بڑی چالاکی سے جال پھینکا "تم میرے ساتھ کام کرو تو مالا مال ہو سکتے ہو"۔

نٹ راضی ہو گیا۔ رات کو سردار اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُسے لے کر ایک اونچی عمارت کے پیچھے پہنچا اور کہا کیا تم اُچھل کر اس مکان کی چھت پر پہنچ سکتے ہو"؟

"بڑے آرام سے مالک"۔

"پھر جاؤ اور آنگن میں اتر کر چپکے سے باہر کا دروازہ کھول دو" سردار نے کہا۔ نٹ کھڑا رہا تو سردار نے اس کا کندھا ہلایا "تو نے سنا نہیں کیا"؟

"سُنا مالک"۔

"تب جاتا کیوں نہیں"؟ سردار نے غصہ ہو کر کہا۔ نٹ گھبرا گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "مالک پہلے ڈھول تو بجاؤ۔ اس کے بغیر میرے ہاتھ پیر حرکت ہی نہیں کرتے"۔ سردار غصے کے گھونٹ پیتا کھڑے نٹ کو گھورتا رہ گیا اور بولا "اب چوری کرنے کے لیے بھی ڈھول بجانا ہو گا"۔

(ہندی سے ترجمہ) فیروز جامی
۴۵۰۰ ٹیلہ ہاؤس نئی دہلی ۲۵

جواہر پارے

- باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔
- اُستاد کی ڈانٹ ماں باپ کے پیار سے بہتر ہے۔
- قرض محبت کی قینچی ہے۔
- صفائی ایمان کی علامت ہے۔
- جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔
- سانچ کو آنچ نہیں۔
- وقت دولت ہے۔
- علم خدا کا نور ہے۔
- کتاب انسان کا بہترین دوست ہے۔
- کاغذ کے پھولوں سے کبھی خوشبو نہیں آتی۔
- خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔
- حسد، نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔
- انسان کی زبان سب برائیوں کی جڑ ہے۔ اور ساری نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔

محمد اسماعیل نعیم اکرمی۔ بجھنگل ۔ ۸

عید الفطر کی فضیلت

حضرت سعد بن اوس انصاری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وصلعم نے فرمایا کہ عید الفطر کے دن فرشتے گلی کوچوں کے نکڑ پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آواز لگاتے ہیں مسلمانوں! مولائے کریم کی طرف سویرے سے جاؤ۔ تمہارا رب تھوڑی سی عبادت کو قبول کر لیتا ہے اور بہت سا ثواب دیتا ہے تم کو روزہ کا حکم ہوا تھا۔ روزے پورے کر دیئے تم نے راتوں کو قیام بھی کیا۔ جاؤ اپنی عبادت کا صلہ لے لو۔ جب لوگ نماز سے فارغ ہو جاتے ہیں تو ایک منادی ندا دیتا ہے کہ تمہارے رب نے تم کو بخش دیا۔ جاؤ اپنے گھروں کو مغفور ہو کر لوٹ جاؤ۔ تمہارے روزے اور تمہاری نمازیں قبول کر لی گئیں تم سے تمہاری حاجتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ یہ دن جائزہ کا ہے۔ خدا ہمیں اور سب کو عید الفطر کی نماز ادا کرنے کی توفیق دے (آمین)

فقط: شفاعت کوثر۔ نیلوفر شاہی لاہور

بچوں کی باتیں

یہ بات ہر اپریل کی ہے ... آپ ...
دلی شاہ جہاں پوری غسل کرنے کے بعد باہر نکلتے ہی
گرے کہ خود اٹھ بھی نہیں سکے۔ دفتر کے ساتھی خبر سنتے ہی
ان کے گھر پہنچے اور فوراً ہی اسپتال لے گئے جہاں ...
ایکسرے ہوا تو پتا چلا کہ ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی
ہے۔ ڈاکٹر نے ضعیفی کی وجہ سے بغیر آپریشن کیے دواؤں
سے ہڈی جوڑنے کا فیصلہ کیا۔ علاج شروع کر دیا گیا۔ ... دن
اسپتال میں پڑے رہے، پھر گھر پر علاج ہوا۔ ... دن
کے بعد ایکسرے کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ ہڈی جڑ
گئی۔ تھوڑا بہت اٹھنے، بیٹھنے کے لائق ہو گئے۔ عیادت
کے لیے آنے والوں سے خوب خوب باتیں کرتے،
پیام تعلیم اور کتاب نما کے مضامین دیکھتے۔ ۱۸ مئی
کو کچھ سانس کی تکلیف بتائی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا، دوا دی
گئی، سانس کی تکلیف بھی کچھ کم ہو گئی۔ ۱۹ مئی کی شب میں
بھی ٹھیک تھے لیکن بار بار آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ گھر
کے لوگ سمجھے، نیند آ رہی ہے۔ بستر ٹھیک کر کے سلا دیا گیا۔
صبح جب ان کو منہ دھلانے کے لیے اٹھایا گیا تو پتا چلا کہ
وہ ہم سب سے دور جا چکے ہیں۔ بہت دور جہاں سے کوئی واپس
نہیں آتا اور جہاں ایک نہ ایک دن سب کو جانا ہے۔

—— باقی آئندہ ——

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰۲۵

جولائی ۱۹۸۷ء جلد ۶۵ شمارہ ۷

اور دیگر مستقل کالم

قیمت فی پرچہ: 3/50 سالانہ: 30/=
غیر ممالک سے: نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز: بارہ ڈالر
فی پرچہ: ایک ڈالر

اڈیٹر: شاہد علی خاں

پرنٹر پبلشر سید احمد صدیقی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

مظہر حنفی
۲۵۸، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵



برسات اور فٹ بال

اور نہ مانو بڑوں کا کہنا
کیچڑ ہی میں لیٹے رہنا
ہم نے منع کیا تھا، مُنّے
مَت کھیلو فٹ بال
کیسا چھل گیا سارا گال

لیکن تم ہو ایک ہی نٹ کھٹ
پہنے جوتے، کرتے کھٹ پٹ
بھاگے اس فٹ بال کو لے کر
سب کی بات کو ٹال
کیسا چھل گیا سارا گال

اب یہ ہے برسات کا موسم
آنگن میں کیا کیچڑ تھا کم
پھسلا پیر تو سارے کپڑے
ہو گئے خون سے لال
کیسا چھل گیا سارا گال

اس میں ہے اپنی ہی بھلائی
کہنا بڑوں کا مانو بھائی
مرہم لگوالو اور جا کر
لیٹو اوڑھ کے شال
کیسا چھل گیا سارا گال

سطوت رسول
ذاکر حسین لائبریری، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مٹے نقطوں کی تحریر

وہ لڑکا کتنا پیارا تھا
جو گھر کا راج دُلارا تھا
وہ لڑکا اب بھی ہنستا ہے
پھولوں میں
گلدانوں میں
کمرے کے آتش دانوں میں
ننھی سی پھلواری میں
چھوٹی سی اپنی کیاری میں
تصویروں کی الماری میں
کپڑے کے گُل بوٹوں میں
اور اپنے ننھے سوٹوں میں
وہ ہنستا ہے
یہ دُنیا کیسی دُنیا ہے
یہ کیسا رشتہ ناتا ہے

اک آتا ہے اک جاتا ہے
وہ لڑکا اب بھی ہنستا ہے
وہ لفظ جو آڑے ترچھے تھے
جو لکھے لکھے
جو مٹے مٹے
گڈمڈ نقطے
سب بے معنی
بے ربطی کی سب تحریریں
جو اپنے لفظوں کے جملوں کی صدا میں گُم
اُلجھی اُلجھی مبہم مبہم
وہ لڑکا کتنا پیارا تھا
جو گھر کا راج دُلارا تھا
وہ سُندر روپ انوکھا تھا
اک دھوکا تھا۔

(چھوٹے بیٹے مظہر الاسلام کے سانحۂ ارتحال پر)

یوسف ناظم

کچھ ڈبّوں کے بارے میں

اب سارے ڈبّوں کے بارے میں تو ہم لکھنے سے رہے کیونکہ ہم سب کی زندگی میں ڈبّے اتنے سارے ہیں اور ہم ڈبّوں کے اتنے مارے ہیں کہ ان کی داستان ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہ آئے۔ ہر آدمی بچّہ ہو یا نوجوان، جوان ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت، کسی نہ کسی ڈبّے کے ساتھ منسلک ہوا ہے۔ زیور کا ڈبّا، سوئی تاگے کا ڈبّا، کھانے کا ڈبّا، اوزار کا ڈبّا، آزار کا ڈبّا غرض کہ کوئی نہ کوئی ڈبّا ہماری جان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تم پوچھوگے یہ آزار کا ڈبّا کیا ہوتا ہے۔ جی ہاں یہ ہوتا ہے اور بہت بڑا ہوتا ہے لیکن پہلے کچھ چھوٹے موٹے ڈبّوں کے بارے میں سُن لو۔ بڑے ڈبّے کے بارے میں کہنے سننے کی باری بعد میں آئے گی۔ یہ ڈبّا بار بار ہماری زندگی میں آتا ہے کیونکہ یہ ریل کا ڈبّا ہوتا ہے جو ہمیشہ ہی بھرا ہوتا ہے اور چھٹیوں کے دن میں جیسے ساری دنیا اسی ریل کے ڈبّے میں سما جاتی ہے ــــ ویسے جن ڈبّوں کا ہم ذکر کرنا چاہ رہے ہیں اُن میں پہلے نمبر پر آتا ہے دودھ کا ڈبّا ــــ دودھ کا ڈبّا :۔ اب بچّے دودھ تو پیتے ہیں لیکن یہ ڈبّے کا دودھ ہوتا ہے۔ جب ہم خود بچّے تھے (اب بھی ہم ایسے کون سے بڑے ہیں اور ویسے بھی آدمی جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی بچہ بنتا جاتا ہے) اور ڈبّے کی بات سنتے تھے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ڈبّا نام کا کون سا جانور ہے جو دودھ دیا کرتا ہے لیکن جب ہم یہ دودھ پی کر کچھ بڑے ہوئے تو ہمیں سمجھایا گیا (کبھی پیار سے اور کبھی مار کر) کہ ڈبّے کا دودھ اس دودھ کو کہتے ہیں جو سفوف کی شکل

۱۹-الہلال ۱۳۰- باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۵۰

میں ہوتا ہے۔ میدے کی طرح نرم اور یہ بھی دودھ ہوتا ہے۔ (یہ بات بہت دنوں بعد ہماری سمجھ میں آئی۔ تم بھی تھوڑا انتظار کرو) سفوف کی شکل کے دودھ کے دو تین چمچے گرم پانی میں چلا کر اچھی طرح ہلا کر اور بچّے کو گود میں لٹا کر بچّے کو پلائے جاتے ہیں۔ جس بوتل سے یہ دودھ بچّے کو پلانے کی کوشش کی جاتی ہے اس پر ایک رومال لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ بچّہ کہیں دیکھ نہ لے کہ اسے کیا پلایا جا رہا ہے۔ اس دودھ کے پینے کے بعد سمجھ دار بچے اور زیادہ رونے لگتے ہیں اور اگر سمجھ دار نہیں ہوتے تو سونے لگتے ہیں۔ ماں اپنے بچّے کو نیند کی طرف مائل دیکھ کر خوش ہوتی ہے اور اسے آہستہ آہستہ تھپکنے لگتی ہے۔ کچھ مائیں تو کسی نئی قسم کا کوئی گانا (لوری سمجھ کر) گانے بھی لگتی ہیں۔ اور اگر بچّہ سونے کی بجائے رونے پر آمادہ نظر آتا ہے اور کسی طرح سونے پر راضی نہیں ہوتا تو ماں اسے تھپکتی تو ہے لیکن تھپکنے کا انداز بدل جاتا ہے وہ اس تھپکنے میں تھوڑی بہت طاقت استعمال کرنے لگتی ہے جو اس کے حق میں اچھی نہیں ہوتی کیونکہ بچّے کی رونے کی آواز اور زیادہ اونچی ہو جاتی ہے۔ ایک تو ڈبے کا دودھ اس پر ماں کا غصّہ۔ غصّہ تو بچّے کو آنا چاہیے۔

ڈبے کا دودھ جس ڈبے میں رکھ کر بند کر کے دکانوں میں بیچنے کی غرض سے رکھا جاتا ہے وہ ڈبا مضبوط تو ہوتا ہی ہے خوبصورت بھی ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی اسے خرید لینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے لیبل پر ایک بہت ہی تندرست بچّے کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ یہ تصویر ڈبے کا دودھ پینے سے پہلے کی ہوتی ہے۔ لیبل پر بچّے کی تصویر اس لیے بھی بنائی جاتی ہے کہ بڑی عمر کے لوگ یہ دودھ نہ پی لیں۔ بڑی عمر کے لوگوں کو روکنے والا کون ہوتا ہے۔ وہ بھی دودھ پی لیتے لیکن نپل والی بوتل سے نہیں بلکہ گلاس یا پیالی سے — کبھی کبھی صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لیے یہ دودھ پی لیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر بڑی عمر کے لوگ مسلسل اور بلا ناغہ یہی دودھ پیتے رہیں تو تھوڑے ہی دنوں میں یہ بچّے بن جاتے ہیں اس لیے تم نے خود اپنے گھر میں یا اپنے کسی دوست کے گھر میں دیکھا ہوگا وہ بڑے بوڑھے کیسے بچّوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ دن بھر اپنی چیزیں ڈھونڈا کرتے ہیں قلم کان پر اور عینک پیشانی پر لگائے رکھتے ہیں اور گھر بھر میں انھیں تلاش کرتے

رہتے ہیں یہ سب ڈبے کا دودھ پینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بچوں کو بھی اپنا سبق یاد کرنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

دودھ کے ڈبے پر بچے کی تصویر تو ہوتی ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی لیبل پر بہت کچھ لکھا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تو سمجھتے ہیں یہ بچوں کا اخبار ہے۔ اصل میں یہ حساب کتاب ہوتا ہے یعنی اس پاوڈر سے دودھ کیسے برآمد کیا جائے اس کی ترکیب لکھی ہوتی ہے پھر یہ لکھا ہوتا ہے کہ کتنے مہینے یا کتنے سال کے بچے کو کتنے چمچے پاوڈر دن میں اور رات میں کتنی مرتبہ دیا جائے اور ایک دودھ اور دوسرے دودھ کے درمیان کتنے گھنٹے کا وقفہ برائے آرام ہو۔ اس کا ایک چارٹ چھپا ہوتا ہے لیکن کوئی بھی ماں اس چارٹ کی پابندی نہیں کرتی کیونکہ ماں کا لاڈلا اس چارٹ کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ پابند ہوتا ہے اپنی بھوک کا اپنی خواہش کا اور اپنی مرضی کا اور اسی سلسلے میں وہ کئی چمچے زیادہ پی لیتا ہے اور ماں اس کی بھالیاں بدلتے بدلتے تھک جاتی ہے۔ اتنا تھک جاتی ہے کہ کچن میں جا کر خود ایک گلاس دودھ پی لیتی ہے لیکن بھینس کا دودھ ہوتا ہے۔ ماں اس دودھ میں ہارلکس بھی گھول لیتی ہے کیونکہ اس کے فیملی ڈاکٹر نے اسے ہارلکس پینے کے لیے کہا ہے (اس مشورے کی فیس بھی لی ہے)

دودھ کا ڈبا ہر گھر میں پایا جاتا ہے کیونکہ ہر گھر میں ایک نہ ایک بچہ تو پایا ہی جاتا ہے۔ جس گھر میں بچہ نہیں بھی ہوتا ہے تو تب بھی دودھ کا ڈبا ضرور موجود ہوتا ہے کیونکہ معلوم نہیں کس وقت دودھ کی ضرورت پڑ جائے۔ چائے پینے کو جی چاہے اور گھر میں دودھ نہ ہو تو کتنی پریشانی ہوتی ہے۔ تمھیں کیا معلوم کتنی پریشانی ہوتی ہے تم تو ڈبے کا دودھ پیتے بچے ہو۔ جو لوگ رات میں دوردرشن کا پروگرام ختم ہونے کے بعد کہانیاں لکھتے ہیں یا بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کے لیے بیٹھتے ہیں انھیں چائے تو چاہئے ہی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے بھی دودھ کا ڈبا کام آتا ہے۔ صبح جو دودھ گوالے سے یا بلک بوتھ سے لیا تھا وہ تو ختم ہو چکا۔ اور جو بچا تھا وہ پھٹ گیا۔

کچھ دودھ کے ڈبے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں دودھ کا سفوف نہیں، خود دودھ موجود ہوتا ہے۔ اس میں شکر بھی ملی ہوتی ہے۔ گاڑھا بھی ہوتا ہے۔ اتنا

آسان دودھ گھر میں موجود ہو تو کسی کا جی چائے پینے کو نہیں چاہے گا۔ دودھ کا یہ ڈبا اتنا بڑا تو نہیں ہوتا جتنا سفوفی دودھ کا ڈبا ہوتا ہے نہ اس پر کوئی چارٹ بنا ہوتا ہے اس کے لیبل پر بچے کی نہیں گائے کی تصویر ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ دودھ بھی گائے کے لیے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اس دودھ کے استعمال سے آدمی کے جسم میں خوب طاقت آتی ہے۔ یقیناً آتی ہوگی جبھی تو بچوں کے رسالے میں اتنی اچھی اچھی نظمیں چھپتی رہتی ہیں۔

کھانے کا ڈبا: یہ ڈبا بھی آج کل سب کی قسمت میں ہے۔ بچے اسکول اس وقت جاتے ہیں جب کھانے کا ڈبا اُن کے ساتھ دیا جائے۔ اُن کے بستے میں کاپیاں اور کتابیں اتنی بہت سی ہوتی ہیں کہ کوئی چیز رکھنے کی جگہ ہی نہیں ہوتی لیکن کھانے کا ڈبا کسی نہ کسی طرح رکھنا ہی پڑتا ہے۔ بہت سے بچے اسکول پہنچ کر سب سے پہلے یہی ڈبا صاف کرتے ہیں۔ کھانے کے وقفے میں تو وہ مونگ پھلی چنے، امرود، چارٹ اور آئس کریم کھاتے ہیں۔ یا پھر اسکول کے کمپاونڈ میں گرتے پڑتے رہتے ہیں اور سہ پہر میں جب گھر واپس ہوتے ہیں تو سب سے پہلے کھانا مانگتے ہیں کیونکہ دوپہر میں تو انھوں نے کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ لیکن سبھی بچے ایسا نہیں کرتے۔ اپنے کھانے کا ڈبا لنچ کے وقت ہی کھولتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے ڈبوں میں جھانک کر دیکھتے ہیں کہ وہ مچھلی لائے ہیں یا کباب۔ گھر واپس جاکر ماں سے کہتے ہیں کیا ممی آپ روزانہ وہی آلو میرے ڈبے میں رکھ دیتی ہیں کیا بازار میں کوئی دوسری چیز ملتی ہی نہیں ہے۔

صرف بچوں ہی کا نہیں بڑوں کا بھی کھانے کا ڈبا ہوتا ہے اور اتنا ہی بڑا ہوتا ہے جتنے بڑے وہ ہوتے ہیں کچھ لوگ تو دفتر یا کارخانے جاتے ہوئے اپنا ڈبا ساتھ لے جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ڈبا، ڈبے والے لے جایا کرتے ہیں۔ بڑے شہروں میں ڈبا لانے لے جانے والے الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ گھر گھر سے کھانے کے ڈبے جمع کرتے ہیں اور انھیں ساتھ لے کر ٹرین سے سفر کرتے ہیں جس کمپارٹمنٹ میں یہ ڈبے والے سفر کر رہے ہوں اس میں کسی کے ہلنے جلنے کی جگہ نہیں رہتی۔ ایک آدمی کم سے کم ۵۰ ڈبے ساتھ لے کر سفر

کرتا ہے۔ اس کی بھی ایک ترکیب ہے وہ ان ڈبوں کے لیے ایک ڈولہ بنواتا ہے تم اسے تابوت بھی کہہ سکتے ہو لیکن یہ کھلا رہتا ہے۔ یہ ڈولہ ۸ فٹ لمبا اور ۴ فٹ چوڑا ہوتا ہے اور جب آدمی اسے سر پر رکھ کر چلتا ہے تو دو چار آدمی ضرور زخمی ہوتے ہیں۔ یہ ڈبے والا شخص اپنے تمام ڈبوں کو اسی طرح پہچانتا ہے جس طرح ایک چرواہا اپنی بکریوں کو پہچانتا ہے۔ کوئی غلطی نہیں کرتا۔ ہر ڈبے پر ایک نئی وضع کا نشان بنا ہوتا ہے۔ جو دھوبی کے نشان کی طرح ہوتا ہے لیکن ذرا بڑا ہوتا ہے۔ یہ کھانے کے ڈبے کھانے کے ڈبوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ انھیں ہاٹ کیس کہا جاتا ہے اور مشہور یہ ہے کہ ان میں رکھا ہوا کھانا کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ یہ ہاٹ کیس صبح ہی صبح تیار کر دینا پڑتا ہے اور صاحب کے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی ان کا ہاٹ کیس روانہ ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ کھانے کا ڈبا پہلے ہی چلا جاتا ہے اس لیے انھیں بھی مجبوراً کام پر جانا ہی پڑتا ہے۔ جو شخص ڈبا لے جاتا ہے وہی اسے واپس بھی لاتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ مقررہ وقت پر اور مقررہ جگہ پر رکھا ہوا ملنا چاہیے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھانے کا ڈبا جیسا گیا تھا ویسے کا ویسا ہی واپس آجاتا ہے۔ پھر اگر میاں اس کی وجہ سمجھاتے سمجھاتے تھک جاتا ہے لیکن بیوی کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ میاں کو یہی کھانا رات میں کھانا پڑتا ہے۔

اوزار کا ڈبا : کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ ڈبا ہر گھر میں ہو لیکن ہر گھر میں کچھ نہ کچھ اوزار ضرور ہوتے ہیں جیسے اسکرو ڈرائیور، ہتھوڑی (چھوٹی سی زیادہ وزنی نہیں)۔ کچھ کیلیں، کچھ اسکرو، قینچی، نیل کٹر (ناخن تراش) اور پاجامے میں ازار بند ڈالنے کے لیے ایک کاڑی (جو ہمیشہ گم جاتی ہو) جن لوگوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے وہ یہ سب ڈبے میں رکھتے ہیں جن کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے وہ ڈبا نہیں رکھتے۔ جس چیز کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اسے گھنٹوں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ہتھوڑی نہیں ملتی ہے تو مسالا پیسنے کے بٹے سے کیل ٹھوکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنا انگوٹھا مسلتے رہ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اچھی خاصی مرہم پٹی کرنی پڑتی ہے۔ بہت زیادہ عقلمند لوگ تو اسی اوزار کے ڈبے میں سوئی تاگا بھی رکھ چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ انھیں سوئی میں تاگا ڈالنا آتا نہیں ہے۔ ایک مددگار کو بلانا پڑتا ہے۔

ہو رہے ہیں۔ یہی اوزار کے ڈبّے میں سوئی بھی کوئی رکھنے کی چیز ہے۔ سوئی کو اوزار سمجھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اسکو تو تکیے میں رکھنا چاہیے اور بقچہ ایک دوسرے ڈبے ہیں۔ کچھ گھروں میں تاگوں کا ڈبّا بھی رکھا جاتا ہے اس ڈبے میں ہر رنگ کے تاگے کی ریل ہوتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ جس رنگ کا تاگا درکار ہوتا ہے۔ اسی رنگ کا تاگہ ڈبّے میں نہیں ہوتا اور سوئی تو پہلے ہی کوئی لڑکی گما دیتی ہے۔

آزار کا ڈبا : ہم نے تمھیں بتایا تھا کہ ریل کے ڈبّے کو آزار کا ڈبّا کہا جاتا ہے۔ اس ڈبے میں داخل ہونے کے لیے جتنا زور لگانا پڑتا ہے اتنا ہی زور اس سے باہر آنے کے لیے لگانا پڑتا ہے۔ جس حالت میں آپ اس ڈبّے سے باہر نکلتے ہیں اس حالت میں آپ کے رشتہ دار آپ کو نہیں پہچان سکتے۔ آپ کو لینے اسٹیشن تو آتے ہیں لیکن خالی ہاتھ واپس گھر پہنچتے ہیں اور آپ ایک گھنٹہ بعد کتنے جھجکتے ان کے گھر میں داخل ہوتے ہیں اپنا تعارف کراتے ہیں اس طرح جیسے آپ کسی کمپنی کے سیلز مین ہیں لیکن سیلز مین کا حلیہ ایسا نہیں ہوتا اس لیے یہ مثال غلط ہوگی اور اس لیے غلط ہوگئی کہ ریل کا ڈبّا ہوتا ہی سرے سے غلط ہے۔ سنا گیا ہے کہ جس طرح ان دنوں ہاکی فٹ بال کھیلنے، سوئمنگ کی دوڑ دوڑنے تیراکی کرنے اور اس قسم کے دوسرے کاموں میں حصّہ لینے کے لیے چھوٹی عمر سے مشق کرنی پڑتی ہے اسی طرح اب ریل کا سفر کرنے کے لیے بھی کوچنگ کلاس شروع کیے جانے والے ہیں۔ اس کوچنگ کا پہلا سنٹر بمبئی میں قائم ہوگا۔ ●●

سلام بن رزاق

بادل کی آپ بیتی



بادل اپنی کہانی یوں بیان کر رہا ہے۔ میں بادل ہوں۔ میرے بہت سارے نام ہیں۔ بادل، گھٹا، ابر وغیرہ۔ میں سمندر کا بیٹا ہوں۔ یعنی میرا جنم سمندر کے سینے سے ہوا ہے۔ جب سورج مہاراج اپنی چمکیلی آنکھوں سے سمندر کی طرف دیکھتے ہیں تو سمندر بھی مارے غصّے کے گرم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے منہ سے دھواں سا نکلنے لگتا ہے۔ جسے بھاپ بھی کہتے ہیں۔ یہ بھاپ چونکہ ہلکی ہوتی ہے۔ اس لیے ہواؤں کے گھوڑوں پر سوار ہو کر آسمان کی طرف اڑنے لگتی ہے۔ اس بھاپ میں پانی کے کروڑوں قطرے چھپے ہوتے ہیں۔ ادھر سورج کرنوں کے نیزوں سے سمندر پر حملہ کرتا ہے۔ اور ادھر سمندر بھاپ کی شکل میں بادلوں کی فوج روانہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ سورج مہاراج کو چاروں طرف سے گھیر لیں۔

ہم سمندر کے بیٹے چھوٹی چھوٹی بادل کی ٹکڑیاں بنا کر آسمان پر قبضہ کرنا شروع کرتے ہیں۔ یہ جنگ مارچ اپریل کے مہینے میں شروع ہو جاتی ہے اور مئی جون یعنی مسلسل چار مہینے تک چلتی رہتی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ دو کے جھگڑے میں ہمیشہ تیسرے کا فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سورج اور سمندر کی اس لڑائی میں زمین والوں کا فائدہ ہوتا ہے۔

جب ہم بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان میں اوپر اور اوپر بڑھتی چلی جاتی ہیں تب سورج مہاراج کو یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ بادل بڑھتے بڑھتے

۱۱/۹-ایل، آئی/جی۔ ڈی، بھاوے نگر، کرلا (ویسٹ) بمبئی ۷۰

اس کی سلطنت پر قبضہ نہ کریں۔ تب وہ سرد ہواؤں کی فوجوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ہمیں روکیں۔ سرد ہواؤں سے ہم بادلوں کو بہت ڈر لگتا ہے۔ سرد ہوائیں ہم پر اپنے سرد زہریلے تیر پھینکتی ہیں اور ہم بادلوں کے جسم زخموں سے چور چور ہو جاتے ہیں اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر زمین پر گرتے ہیں۔ جسے آپ لوگ برسات کہتے ہیں۔ جب سرد ہوائیں ہم پر اپنے زہریلے تیروں سے حملہ کرتی ہیں تب ہم بیچارے صدمے کے گرجنے لگتے ہیں۔ اور جہاں موقع ملتا ہے۔ ہواؤں کو اپنی مٹھیوں میں پکڑ کر بھینچ لیتے ہیں۔ اُن کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی لمبی لمبی زبانیں ان کے منہ سے باہر نکل آتی ہیں۔ ہواؤں کی انھیں لپلپاتی زبانوں کو آپ لوگ بجلی کہتے ہیں بادل اور ہواؤں کی یہ جنگ چار مہینوں تک چلتی رہتی ہے۔ ہوائیں بادلوں کو ڈھکیلتی ہیں۔ اور بادل ہواؤں کو رگڑتے بھینچتے ہیں اس دوران ہم بادلوں کا پسینا بارش کے قطروں کی شکل میں زمین پر برابر ٹپکتا رہتا ہے۔ اور پیاسی دھرتی کے پیاسے باسی اپنی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ ہم جنگ کرتے ہیں۔ زخمی ہوتے ہیں اور گھل گھل کر ایک دن ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کا ہمیں افسوس نہیں۔ کیونکہ ہم دوسروں کے فائدہ کے لیے اپنے آپ کو مٹا دیتے ہیں۔ ہماری زندگی کا مقصد دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے سوا کچھ نہیں۔

ہم سمندر کے پانی سے بھاپ، بھاپ سے بادل اور بادل سے پھر پانی کے قطروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہم جو اتنے روپ بدلتے ہیں۔ اتنی تکلیفیں اٹھاتے ہیں وہ محض دوسروں کو زندگی دینے کے لیے۔ ہمارے پسینے سے پودوں اور درختوں کو نئی زندگی ملتی ہے۔ کنویں اور تالاب بھر جاتے ہیں۔ سوکھی کھیتی میں جان پڑ جاتی ہے۔ جانور اور انسان اپنی پیاس بجھاتے ہیں یاد رکھیے ہم جس پر مہربان ہو جائیں۔ اس کے لیے بہار ہی بہار ہے۔ اگر ہم کسی سے ناراض ہو جائیں تو وہاں قحط اور سوکھا پڑ جاتا ہے۔

ہماری زندگی سے آپ کو بھی ایک سبق سیکھنا ہے۔ وہ یہ کہ اپنی ذات سے ہمیشہ دوسروں کو فائدہ پہنچایئے۔ یہی زندگی ہے۔ اسی میں زندگی کا صحیح لطف ہے۔

امان اللہ خاں شیروانی



حجّا بوا

کچھ سال پہلے ایک بہت ہی بزرگ، شریف اور نیک بڑی بی تھیں۔ اُن کی عمر کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ان کے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے۔ ہر ایک یہی کہتا تھا کہ "ہم نے انھیں ایسا ہی دیکھا ہے" بینائی کمزور اور کان بالکل بند تھے۔ کان کے پاس منہ لے جا کر بڑے زور سے بولنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے مکان کے دروازے پر چارپائی بچھائے بیٹھی رہتی تھیں۔ ان کی دوستی زیادہ تر بچوں سے تھی۔ ان کے اپنے گھر کے بچوں کے علاوہ دوسرے گھروں اور محلّے کے بچّے بھی ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ بچوں کے لیے ان میں سب سے بڑی کشش کہانیاں سنانے کی تھی۔ کہانی سناتے ہوئے بیچ بیچ میں بچوں کی لڑائی جھگڑوں کا بھی فیصلہ کرتی رہتی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کے فیصلے سب ہی بچّے مان جایا کرتے تھے۔

بوا اپنی جوانی ہی میں حج کر آئی تھیں اور اپنے سفر اور حج کے قصّے بڑے پیارے انداز سے سناتی تھیں کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ وہ جغرافیہ کا سبق پڑھا رہی ہیں۔ ان کی باتیں سُن کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھیں اس طرح وہ ایک اچھی ٹیچر بھی تھیں۔ تعلیم یافتہ ہوتیں تو یقیناً وہ بہت اچھی اسکول ٹیچر ہوتیں۔ جن بچوں کے والدین بوا کی اس خوبی سے واقف تھے، اپنے بچوں کو اُن کے پاس آنے سے کبھی نہیں روکتے تھے مگر کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو اپنے بچوں کو اُن کے پاس جانے سے منع کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بوا نہ صرف گندی رہتی ہیں بلکہ بچوں کی عادتیں بھی بگاڑتی ہیں۔

حجّا بوا کے پاس ایک تھیلا رکھا رہتا تھا اور بہت سے بچّے اپنے گھر سے لائی ہوئی کھانے کی چیزیں اس تھیلے میں رکھ دیتے تھے۔ بوا کبھی کبھی روتے بلکتے اور بھوک کے مارے بچوں کو اس میں

پرنسپل اسلامیہ کالج، اٹاوہ۔ (یوپی)

بے ٹٹول ٹٹول کر کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں۔ کچھ بچوں کے لیے تو یہ ایک نعمت ہوتی تھی اچھے گھر کے بچے بھی ان چیزوں کو بڑے شوق سے لینے کی کوشش کرتے تھے۔ بچپن میں میں نے بھی اس تھیلے سے کچھ چیزیں کھائی تھیں اور ان کا چٹخارا آج تک زبان کو یاد ہے۔ میں سمجھتا ہوں، جن کے پاس ہے ان سے لے کر جن کے پاس نہیں ہے ان کو دینے کا یہ اصول کیسا انوکھا تھا۔

بوا اکثر کہانی سناتے وقت یا کسی بچے کو بہلاتے وقت اپنا منہ ایسا بناتی تھیں کہ روتوں کو بھی ہنسی آجائے۔ بچوں کو بڑا مزہ آتا تھا اور وہ خوب خوب ہنستے تھے۔ بوا خود بھی قہقہہ لگاتی تھیں اور بچوں کو قہقہے لگاتے دیکھ کر بائیں کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی کہانی کی کسی المناک بات پر رو بھی لیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہنسنا اور رونا ان کے اپنے قبضے میں تھے جب دل چاہا ہنس لیں اور جب دل چاہا رو لیں۔ آج ٹی۔وی دیکھنے میں وہ مزہ نہیں آتا جو ان سے کہانیاں اور ان کی باتیں سننے میں آتا تھا۔

ایک بڑے مزے کی بات تھی بوا انڈے کے نام سے چڑتی تھیں۔ انڈے کو بری چیز کہتی تھیں۔ جہاں کسی نے کہا "بوا ہم نے آج بری چیز کھائی تھی" فوراً کہتیں "دور رہنا مجھے بدبو لگے گی"۔ کوئی پوچھ لیتا "بوا تم کھاؤ گی؟" منہ بنا کر کہتیں "اے توبہ! میں کیا بری ہوں جو بری چیز کھاؤں گی"۔ لیکن مزے دار بات یہ تھی کہ اگر کوئی بسکٹ یا کیک میں انڈا انھیں دیتا تو خوب مزے سے کھا جاتیں۔ بعد میں کوئی چھیڑتا تو کہہ دیتیں "اے ہے مجھے کیا معلوم، کیسے شریر بچے ہیں مجھے بری چیز کھلا دی۔ لاؤ پانی لاؤ کلی کروں گی"۔ پھر ابکائیاں لیتی جاتیں اور کلی غرارہ کرتی رہتیں۔ بچوں کو بڑا لطف آتا تھا۔

بوا کو جوؤں سے بھی بڑی چڑ تھی۔ اکثر کہتی رہتی تھیں "جس کے سر میں جوئیں ہوں وہ میرے پاس نہ آئے۔ پہلے جوئیں صاف کروا آئے"۔ حیرت یہ تھی کہ خود ان کے سر میں ڈھیروں جوئیں بھری رہتی تھیں۔

ان کی کہانیوں کی شہزادیاں اور پریاں بڑی خوبصورت ہوتی تھیں، شہزادے بڑے بہادر ہوتے تھے، دیو بڑے ظالم ہوتے تھے، بادشاہ بہت رحمدل اور سیدھے ہوتے تھے لیکن وزیر بڑے چالاک اور عقل مند، جانوروں کی کہانیوں میں لومڑی بڑی چالاک، بلی بڑی حرافہ، ہرن بڑا سیدھا اور بھولا، گیدڑ بڑا کائیاں، بھیڑیا بڑا خوفناک اور ہاتھی بڑا مست ہوتا تھا۔ غرض یہ کہ ان عادات و اطوار سے وہ بہت کچھ سبق دے دیا کرتی تھیں۔ آج کل کے بزرگوں کی طرح بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ، لیکچر نصیحتیں بالکل نہیں کرتی تھیں، سمجھانے کا ان کا انداز اور ان کا ڈھنگ بڑا انوکھا ہوتا تھا۔

وہ کھیل کھیل میں بچوں کو حساب بھی خوب پڑھا دیتی تھیں۔ چھوٹے بچوں کو تک بندی کر کے

ایسے ایسے گیت سناتی تھیں جن سے گنتی اور پہاڑے اچھی طرح یاد ہو جائیں ان میں سے ایک تک بندی یوں تھی،

ایک دو تین   بجا لو بیٹا بین
دو اور دو چار   گلے میں پہنا ہار
دو اور تین پانچ   سانچ کو نہیں آنچ
تین اور چار سات   بچے کھائیں بھات
تین اور پانچ آٹھ   دور سے آئے لاٹ
چار اور پانچ نو   گانو میں آئی رو
چار اور چھے دس   بٹیا کرو بس

غرض یہ کہ بوا بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)





عبدالرؤف

والدین کا احترام اور ان کی خدمت



جنت ماں کے قدموں میں ہے

حضرت معاویہ بن جاہمہؓ کہتے ہیں کہ جاہمہؓ نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، اے رسول اللہ! میں نے جہاد پر جانے کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ لینے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں تو آپ نے فرمایا: اس کی خدمت کر کیوں کہ جنت اس کے قدموں میں ہے۔ (احمد، نسائی اور بیہقی)

حضرت ابی طفیلؓ کا بیان ہے کہ میں نے جعرانہ کے مقام پر نبی اکرمؐ کو گوشت تقسیم کرتے دیکھا۔ اتنے میں ایک عورت آئی اور آنحضورؐ کے قریب پہنچ گئی۔ آپ نے اس کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے (لوگوں سے) پوچھا یہ عورت کون ہے۔ انھوں نے کہا: یہ آپ کی وہ ماں ہیں جنھوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔

(ابو داؤد)

ماں اور باپ کا مقام

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میری صحبت کے لیے کون زیادہ مناسب ہے۔ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد کون (زیادہ مناسب ہے) آپ نے فرمایا تیری ماں۔ اس نے پھر عرض کیا، اس کے بعد کون۔ آپ نے فرمایا۔ تیری ماں، اس نے عرض کیا اس کے بعد کون آپ نے فرمایا، تیرا باپ۔

(بخاری اور مسلم)

حضرت بہز بن حکیمؓ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں کس کے ساتھ بھلائی کروں؟ آپ نے فرمایا، اپنی ماں کے ساتھ۔ میں نے پھر پوچھا اس کے بعد کس کے ساتھ۔ آپ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ۔ میں نے پھر عرض کیا، اس کے بعد کس کے ساتھ۔ آپ نے فرمایا، اپنی ماں سے۔ میں نے پھر عرض

کیا پھر کس سے آپ نے فرمایا اپنے باپ سے پھر قریب تر عزیز کے ساتھ اور پھر اس سے قریب تر عزیز کے ساتھ۔

(ترمذی اور ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ پروردگار کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور پروردگار کی ناخوشی باپ کی ناخوشی میں ہے

(ترمذی)

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں، رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو نیک بیٹا ماں باپ کی طرف رحمت وشفقت کی نظر سے دیکھے اللہ اس کے حساب میں ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے۔

(بیہقی)

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ کسی شخص کا اپنے باپ کی موت کے بعد اس کے دوستوں سے احسان اور سلوک کرنا بہترین نیکی ہے۔

(مسلم)

والدین سے گالی گلوج اور ان کی نافرمانی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینا بڑے گناہوں میں سے ہے (صحابہؓ نے) عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا کوئی آدمی اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے آپؐ نے فرمایا۔ ہاں۔ کوئی شخص کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور کوئی کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔

(بخاری اور مسلم)

حضرت ابی بکرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ ہر گناہ میں سے جس قدر چاہے بخش دیتا ہے۔ سوائے ماں باپ کی نافرمانی کے بلکہ خدا اس (گناہ) کے کرنے والے کو اس کی زندگی میں موت سے پہلے سزا دے دیتا ہے۔ (بیہقی)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ بہت زیادہ احسان جتانے والا والدین کی نافرمانی کرنے والا اور شراب کا عادی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (نسائیؒ اور دارمیؒ)

جاگو جگاؤ

✿ کسی کمزور پر طاقت آزمانا بزدلی ہے۔
✿ بچوں اور عورتوں کو مارنا پیٹنا کم زوری اور بے وقوفی ہے۔
✿ کسی کا مال لوٹنا اور کسی کو بے روزگار کرنا بڑی بے دردی ہے۔
✿ کسی کا گھر تباہ کرنا بد توفیقی ہے۔
✿ افواہوں پر بغیر سوچے سمجھے اور بغیر تصدیق کیے یقین کر لینا تباہی کی علامت ہے۔
✿ کسی کے متعلق بُری بات تحقیق کے بغیر مان لینا نادانی ہے۔
✿ کسی کی غلطی کا بدلا اس کے بھائی بیٹے سے لینا ظلم اور نا انصافی ہے۔

اِس کے برخلاف

✿ بُرائی کا جواب بھلائی سے دینا شرافت ہے۔
✿ کسی سے غلطی ہو جائے تو اس کو ہمدردی سے سمجھانا اور اصلاح کرنا کردار کی بلندی ہے۔
✿ ایک دوسرے کے کام آنا بہت بڑی خوبی ہے۔
✿ ایک دوسرے کو معاف کر دینا بہت بڑی بڑائی ہے۔
✿ ایک دوسرے کو اذیت اور تکلیف سے بچانا بہت بڑا ثواب ہے۔
✿ غصّے کو پی جانا بہت بڑی بہادری ہے۔
✿ لڑائی نہ کرنا، اور لڑائی ہو جائے تو اس کو ختم کر کے صلح صفائی کی کوشش کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔
✿ کسی کے عیب چھپانا بہت بڑے درجے کی ہمدردی ہے۔

جب بھائی بھائی

آپس میں جھگڑتے ہیں تو دونوں نقصان اٹھاتے ہیں اور دشمن خوش ہوتے ہیں۔

امن بہت بڑی نعمت ہے۔ آپس میں مل جل کر پیار محبّت سے رہنے میں بڑا مزہ ہے۔

تمھارا دوست اور ہمدرد حکیم محمد سعید


"تم اپنی صفائی میں کیا کہتے ہو؟"
"جناب والا! تین ماہ سے جیل میں پانی نہیں آرہا ہے۔ ایسی صورت میں میں اپنی صفائی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"


"..... اور ڈاکٹر صاحب! مجھے بھوک بھی نہیں لگتی۔ جس کی وجہ سے....."
"ارے بابو جی! اتنی سی بات کے لیے آپ ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے آئے۔ مجھے اپنا گھر بتادیں، میں آپ کے حصے کا کھانا ضائع نہیں ہونے دوں گا۔"

عظیم ادیب اور موجد

عبدالرحیم

بوسٹن سے بحری جہاز کے اپنے پہلے سفر کے دوران ایک لڑکے نے دیکھا کہ جہاز کے لوگ مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ اس نے گوشت کھانا چھوڑ رکھا تھا، کیوں کہ یہ اس کے نزدیک جان داروں کے غیر ضروری قتل کے برابر تھا، کیوں کہ کسی مچھلی نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا ہے، پھر ہم انھیں کیوں ماریں۔ کسی زمانے میں مچھلیاں بہت پسند تھیں، خاص طور پر کڑھائی سے نکلی ہوئی گرم گرم مچھلیاں، لیکن اس لڑکے کی عمر جب ۱۶ برس کی تھی تو اس نے ایک کتاب پڑھی جس میں گوشت نہ کھانے کے فائدے درج تھے۔ اسی دن سے اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا اور ساتھ ہی اس نے اپنے لیے سبزیاں تیار کرنی سیکھ لیں۔ اس طریقے سے وہ رقم بچاتا اور یہ رقم کتابیں خریدنے پر خرچ کرتا اور اسے مطالعے کے لیے زیادہ وقت بھی مل جاتا، کیوں کہ اس کا کھانا ہلکا ہوتا، یعنی روٹی یا پھل اور پانی کا ایک گلاس۔ ہلکے کھانے کی وجہ سے وہ زیادہ سوچ سکتا تھا۔ خوب پیٹ بھرا ہوا یا بالکل خالی ہو، دونوں صورتوں میں انسان اچھی طرح کام یا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

بات یہ تھی جب اس کی عمر دس برس کی ہوئی تو اسے اسکول سے اُٹھا لیا گیا۔ اس کے باپ کی دو بیویاں تھیں جن سے ۱۷ بچے تھے۔ اس کا باپ اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنے اس لڑکے کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا، لیکن یہ لڑکا تمام زندگی علم حاصل کرتا رہا۔ اس کو کتابوں سے بڑی محبت تھی۔ کتابیں کام یاب اور خوش گوار زندگی گزارنے کی کنجی ہیں۔ کتابوں سے نوعمر لڑکے نے لکھنا سیکھا اور دلائل دینے سیکھے، جو بعد کی زندگی میں اس کے بہت کام آئے۔ مطالعے کی وجہ سے وہ اپنا مُدّعا بہت اچھے طریقے سے بیان کر سکتا تھا۔

اس کے باپ کا یہ معمول تھا کہ جہاں تک ممکن ہوتا شام کے کھانے پر کسی دوست یا پڑوسی کو ضرور بُلاتا اور کوئی مفید بات چیت شروع کر دیتا جو اس کے بچوں کے ذہنوں کو جلا دے سکے۔ اس طرح اس لڑکے کی توجہ ہونے والی گفت گو پر زیادہ رہتی اور کھانے کی طرف کم۔ اس طرح

اس کی کھانے کی طرف دھیان دینے کی عادت ہی نہیں رہی، یہاں تک کہ چند گھنٹے پہلے کھائی ہوئی چیز بھی اسے یاد نہ رہتی۔ اس کی یہ عادت سفر کے دوران بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی۔ اس زمانے میں سفر کے دوران کھانے کے سلسلے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔

ایک بار جہاز پر سوار لوگ مچھلیاں پکڑ پکڑ کر بھون رہے تھے۔ گرم گرم مچھلیوں کی خوش بُو اسے بہت اچھی لگی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ وہ مچھلی کھا کر اپنی خواہش پوری کرے یا اپنے گوشت نہ کھانے کے ارادے پر قائم رہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ جب مچھلیوں کو چیرا گیا تھا تو ان کے پیٹوں میں سے چھوٹی مچھلیاں برآمد ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے دل میں مچھلیوں سے کہا:

"اگر تم ایک دوسرے کو کھاتی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہم تمھیں نہ کھائیں۔"

پھر اس نے پیٹ بھر کر مچھلی کھائی۔ بعد کے سفروں کے دوران وہ سب لوگوں کی طرح مچھلیاں کھاتا رہا۔ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ جواز ڈھونڈنا آسان ہے، یعنی آدمی جو کرنا چاہتا ہے اُس کو جائز قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہ اس نے اپنی تعریف نہیں کی ہے بلکہ انسان کی کم زوریوں پر نظر ڈالی ہے۔ تاہم کھانے میں اعتدال کے اصول پر وہ ساری عمر کاربند رہا۔

اس کا شمار امریکا کے چوٹی کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ اٹھارھویں صدی کے شروع میں امریکا کی ریاست میساچوسٹس کے شہر بوسٹن میں پیدا ہوا تھا۔ اُس وقت امریکا پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ وہ بہ یک وقت ادیب بھی تھا اور موجد بھی، سیاست داں بھی تھا اور مزاح نگار بھی۔ وہ غریب پیدا ہوا، لیکن سخت محنت اور کھانے پینے میں اعتدال کی بنا پر بڑے بڑے عہدوں تک جا پہنچا۔

اس کا ذہن موجد کا ذہن تھا۔ اگر وہ سمجھتا کہ کوئی چیز عام طریقے کے بجائے کسی اور طریقے سے زیادہ اچھی کارکردگی دکھا سکتی ہے تو وہ اس کا ڈیزائن تیار کرتا۔ اسی نے امریکا میں جدید اسٹریٹ لیمپ کا آغاز کیا اور ایسے اسٹوو (چولھے) بنائے جو زیادہ حرارت پہنچاتے تھے۔ یہ تصوّر بھی اُس نے ہی دیا کہ ایک بڑھتی ہوئی آبادی میں پولیس اور آگ بجھانے کے محکمے ہونے چاہییں اور ایک پبلک لائبریری ہونی چاہیے۔ اس نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جس میں بہت اچھی باتیں لکھی ہیں، لیکن دل چسپ اور پُر مذاق انداز میں۔

معلوم ہے یہ بڑا ادیب اور موجد کون ہے۔ اس کا نام آپ نے یقیناً سُنا ہوگا: فرینکلن۔

چار دوست

کسی زمانے میں ایک کوّے، ایک گیدڑ، ایک لکڑ بگھے اور ایک اونٹ کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ سب جمع ہو کر غذا حاصل کیا کریں گے۔ اونٹ نے کوّے سے کہا "دوست، تم اُڑ سکتے ہو، لہٰذا تم جاؤ اور چاروں طرف چکّر لگا کر دیکھو۔"

کوّا ایک درخت سے دوسرے درخت پر اُڑتے اُڑاتے ایک ایسے کھیت میں پہنچ گیا جہاں بڑے بڑے عمدہ خربوزے لگے ہوئے تھے۔ اس نے آکر اپنے دوستوں کو بتایا اور اونٹ سے کہا "تم اس کے پتّے کھانا اور ہم اس کے پھل کھائیں گے۔"

جب رات ہو گئی تو یہ چاروں دوست اس کھیت پر پہنچے اور خوب پیٹ بھر کر کھانے لگے۔ اتنے میں اچانک کھیت کا مالک جاگ اُٹھا اور آ گیا۔ کوّا، گیدڑ اور لکڑ بگھا تو بھاگ گئے مگر اونٹ پکڑا گیا اور کسان نے اسے خوب ڈنڈوں سے مارا۔ بعد میں جب اونٹ اپنے دوستوں کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "تم لوگ کیسے دوست ہو کہ مجھ کو مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

یہ سُن کر گیدڑ بولا "ارے بھئی، ہم گھبرا گئے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں آج رات ہم تمھارے ساتھ رہیں گے اور تم کو مار کھانے نہ دیں گے۔"

دوسرے دن کسان نے اپنے کھیت کو بچانے کے لیے وہاں جال لگا دیے۔ آدھی رات کے قریب یہ چاروں دوست پھر وہاں پہنچے اور خربوزے کھانے لگے۔ کوّے، گیدڑ اور لکڑ بگھے نے تو جلدی جلدی اپنا پیٹ بھر لیا مگر اونٹ کا پیٹ ابھی ذرا بھی نہیں بھرا تھا کہ اتنے میں گیدڑ بولا "بھائی اونٹ، میرا دل چاہتا ہے کہ چلّاؤں۔" اونٹ نے جلدی سے کہا "ارے ایسا غضب نہ کرنا، مالک آجائے گا۔ تم لوگ تو بھاگ جاؤ گے مگر میری پٹائی ہو جائے گی۔" لیکن گیدڑ نہ مانا اور چیخنے لگا۔ اس کی آواز سُن کر مالک آپہنچا۔ لیکن

اتفاق سے ایسا ہوا کہ اونٹ، کوّا اور گیدڑ تو بھاگنے میں کام یاب ہو گئے، مگر بے وقوف لکڑ بگھا جال میں پھنس گیا۔ وہ چلّانے لگا "دوستو! دوستو! کیا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟ میں مار ڈالا جاؤں گا!" یہ سُن کر کوّا چلّایا، "میری ہدایت پر عمل کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں کیا کروں؟" لکڑ بگھا چلّایا۔

"لیٹ جاؤ اور ایسے بن جاؤ کہ جیسے مر گئے ہو۔ کھیت کا مالک تم کو پھینک دے گا۔ اس کے بعد تم دوڑ کر بھاگ آنا۔" کوّا بولا۔

اتنے میں مالک آگیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لکڑ بگھا پڑا ہے۔ وہ سمجھا کہ یہ مر گیا ہے، چناں چہ اس نے لکڑ بگھے کی پچھلی ٹانگیں پکڑ کر اسے گھسیٹا اور کھیت کے باہر پھینک دیا۔ باہر پہنچتے ہی لکڑ بگھا اُٹھ کر تیزی سے بھاگ گیا۔ کسان نے جو یہ دیکھا تو اس کو بڑا غصّہ آیا۔ کہنے لگا "ارے! یہ فریبی تو زندہ تھا!"

اس کے بعد جب یہ چاروں دوست پھر اکھٹے ہوئے تو اونٹ نے گیدڑ سے کہا، "تمھارے چیخنے کی وجہ سے میری پھر پٹائی ہو گئی ہوتی۔ بہرحال خیر سے گزر گئی، لیکن یاد رکھو۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ آج تمھاری جیت ہے تو کل ہماری بھی ہو سکتی ہے۔" کچھ دنوں کے بعد اونٹ نے گیدڑ سے کہا، "میں ذرا ٹہلنے جا رہا ہوں، اگر تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ تو میں تم کو بھی سیر کرا دوں گا۔ اس طرح سے تم دنیا دیکھ لو گے۔" گیدڑ راضی ہو گیا۔ اونٹ جھک گیا اور گیدڑ اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ چلتے چلتے یہ دونوں ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہاں کتّوں نے جو گیدڑ کو اونٹ کی پیٹھ پر دیکھا تو وہ بھونکنے لگے۔ اتنے میں اونٹ نے گیدڑ سے کہا، "میرا دل چاہتا ہے کہ ذرا زمین پر لوٹ لگا لوں۔"

"ارے ایسا غضب نہ کرنا۔" گیدڑ چلّایا۔ اس پر اونٹ بولا، "نہیں دوست، میں تو لوٹ ضرور لگاؤں گا۔" یہ کہہ کر اونٹ زمین پر لیٹ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ گاؤں کے تمام کتّوں نے گیدڑ پر حملہ کر کے اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں۔ اس کے بعد اونٹ نے آ کر اپنے دوستوں کو بتا دیا کہ ان کے غدار ساتھی کا کیا انجام ہوا۔ سب نے گیدڑ کے انجام کو درست قرار دیا۔

ہاشو اور کریم کا کارنامہ

مناظر صدیقی

ہاشو اور کریم دونوں بھائی تھے۔ ہاشو بمبئی کے پاس ہی مچھیروں کی ایک بستی میں رہتا تھا۔ اس کے ابا اس بستی کے سردار تھے۔ ساری بستی والے ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کے پاس مچھلیاں پکڑنے کی کئی کشتیاں تھیں۔ ان میں سے دو ایک کشتیاں ایسی بھی تھیں جن میں موٹر لگی ہوئی تھی، یعنی یہ موٹر بوٹ تھیں۔ ہاشو موٹر بوٹ چلانا اچھی طرح جانتا تھا۔ کبھی کبھی وہ موٹر بوٹ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کو نکل جاتا۔ اُسے سمندر کی اونچی نیچی لہروں میں موٹر بوٹ چلانا بہت اچھا لگتا تھا۔ یوں بھی بڑے ہو کر اسے اپنے ابا کی جگہ لینی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ابا بھی تو بستی کے سردار ہونے کے باوجود مچھلیاں پکڑنے کے لیے اکثر بستی کے دوسرے لوگوں کے ساتھ سمندر میں



جاتے ہیں۔ کریم، ہاشو کے چچا کا بیٹا تھا۔ اس کے ابا کا شہر میں کاروبار تھا۔ جمعے کی چھٹی کے دن یا تو کریم ہاشو کے پاس چلا جاتا یا ہاشو کریم کے پاس شہر آجاتا۔ اس روز کریم ہاشو کے پاس شہر آیا ہوا تھا۔ کریم کی فرمائش پر ہاشو نے موٹر بوٹ نکال لی تھی اور دونوں سمندر کی سیر کر رہے تھے۔

ہاشو موٹر بوٹ چلا رہا تھا اور کریم اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھانے لگے تھے۔ بادلوں کو دیکھ کر ہاشو نے موٹر بوٹ کا رُخ ساحل کی طرف موڑ لیا۔ کریم بادلوں کو دیکھ رہا تھا اچانک اسے ایک پرندہ اُڑتا ہوا نظر آیا۔ یہ پرندہ سمندر میں اُڑنے والے پرندوں سے مختلف تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور پرندہ نظر آیا۔ وہ تیزی سے اُڑتا ہوا پہلے پرندے کی طرف آرہا تھا، جیسے اس پر حملہ کرنا چاہتا ہو۔ پھر واقعی اس نے پہلے پرندے پر حملہ کر دیا۔ پہلا پرندہ ہوا میں غوطہ لگا کر اس حملے سے بچ گیا۔ اس پرندے نے حملے سے بچنے کے لیے جس طرح ہوا میں غوطہ لگایا تھا۔ اُس سے ہاشو اور کریم کو اندازہ ہو گیا کہ جو پرندہ انھیں پہلے نظر آیا تھا وہ کوئی کبوتر ہے اور اس پر حملہ کرنے والا پرندہ شکرا ہے۔ شکرا شکاری پرندہ ہوتا ہے۔ اُڑتے ہوئے پرندوں کا شکار کر کے ان کا گوشت کھا جاتا ہے۔ شکرے کے پہلے حملے سے تو کبوتر نے خود کو بچا لیا، لیکن دوسری بار جب اُس نے کبوتر پر حملہ کیا تو کبوتر خود کو نہ بچا سکا۔ شکرا کبوتر کو اپنے پنجوں میں دبا کر ساحل کی طرف جانے لگا۔ ہاشو اور کریم کو بے چارے کبوتر پر بڑا ترس آیا۔ کریم نے ہاشو سے تیز چلنے کی فرمائش کی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ دونوں خشکی پر پہنچ جانے کے بعد کبوتر کو بچا سکیں۔ ہاشو نے کشتی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ دونوں شکرے کو ڈرانے کے لیے ساتھ ساتھ شور بھی مچا رہے تھے۔

نہ جانے یہ ہاشو اور کریم کے شور مچانے کا اثر تھا یا موٹر بوٹ کی مسلسل چک چک کی آواز تھی یا کوئی اور ہی سبب تھا کہ خشکی پر پہنچتے ہی شکرے نے کبوتر کو چھوڑ دیا اور خود اُڑتا ہوا دُور نکل گیا۔ اتنی دیر میں ان کی موٹر بوٹ بھی ساحل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہاشو تو موٹر بوٹ کو ایک جگہ روکنے کے لیے لنگر ڈالنے لگا، لیکن کریم نے فوراً ہی کشتی سے چھلانگ لگا دی اور تیز تیز چلتا ہوا خشکی کی طرف بڑھنے لگا۔ خشکی پر پہنچنے کے بعد کریم تیزی سے دوڑتا ہوا اُس جگہ پہنچا جہاں اس کے اندازے کے مطابق کبوتر گرا تھا۔ جلد ہی اسے کبوتر نظر آگیا۔ اس نے لپک کر کبوتر اُٹھا لیا۔ اتنی دیر میں ہاشو بھی پہنچ گیا تھا۔ دونوں نے کبوتر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، لیکن کبوتر مر چکا تھا۔

انھیں بڑا افسوس ہوا کہ ان کی یہ بھاگ دوڑ کسی کام نہیں آئی۔ کبوتر کو دیکھتے وقت انھیں کبوتر کی ایک ٹانگ سے بندھی ہوئی ایک نلکی نظر آئی۔ یہ نلکی ایسے کاغذ سے بنی ہوئی تھی جس پر پانی کا اثر نہیں ہوتا۔ دونوں نے یہ نلکی کھول لی۔ کریم نے کہا،

"یہ پیغام رساں کبوتر ہے۔ اس کے پیر سے شاید کسی کا کوئی پیغام بندھا ہوا ہے۔"

"پھر تو ہمیں اسے کھول کر پڑھنا چاہیے، شاید اس میں پتا اور نام لکھا ہو۔ ہم یہ پیغام اس شخص کو پہنچادیں گے۔" ہاشو نے کہا اور اپنی جیب سے چھوٹا سا چاقو نکال کر نلکی کو چیر دیا۔ نلکی کھلتے ہی اس میں سے تین چمک دار شیشے جیسے پتھر نکل کر اُس کی ہتھیلی پر آ گئے۔

"ارے، یہ تو ہیرے ہیں!" کریم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، یہ ہیرے ہی ہیں!" ہاشو نے تائید کی۔

"کیا ان کے ساتھ کوئی پتا بھی ہے؟" کریم نے پوچھا۔

"نہیں، کوئی پتا نہیں ہے۔" ہاشو نے جواب دیا۔

"پھر ہم ان ہیروں کا کیا کریں گے۔ ہیرے کس کو پہنچائیں گے؟" کریم نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم انھیں پولیس کے حوالے کر دیں!" ہاشو نے مشورہ دیا۔

"یہی ٹھیک ہے!" کریم نے مشورہ پسند کیا۔

"بس پھر جلدی چل پڑو۔ رات ہونے والی ہے۔ ہمیں کشتی کھڑی کرنے کے لیے کھاڑی تک پہنچنے میں بھی کافی دیر لگ جائے گی۔ پھر وہ دونوں بھاگتے ہوئے اپنی کشتی تک پہنچے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ اُس کھاڑی تک پہنچے جہاں ہاشو کی کشتیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ یہاں ایک ٹین کا شیڈ بنا ہوا تھا، جس کے نیچے کشتیوں کو باندھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ دونوں بھائیوں نے مل کر اپنی کشتی باندھ دی۔ پھر وہ اس شیڈ سے باہر نکلے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ابھی ان کا گاؤں تقریباً ایک میل دُور تھا انھیں جلد ہی اپنے گاؤں تک پہنچنا تھا، لیکن جیسے ہی وہ شیڈ سے باہر نکلے کسی نے پیچھے سے کریم کی گردن پکڑ لی۔ اس اچانک حملے سے کریم کی چیخ نکل گئی۔ کریم کی چیخ پر ہاشو نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ سر کے بال کندھوں تک تھے۔ چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہاشو نے کہا،

"ارے آپ بابا؟" ہاشو انھیں دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ اس لیے وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

بابا اس کے گاؤں سے کچھ دُور ایک پہاڑی غار میں رہتا تھا۔ سمندر کے کنارے پانی کے کٹاؤ سے ہاشو کے گاؤں کے قریب اونچی اونچی پہاڑیاں سی بن گئی تھیں۔ اُن میں کئی غار بھی بن گئے تھے۔ انھی غاروں میں سے ایک میں یہ بابا رہتا تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ بابا کے پاس کھانے پینے کے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ کبھی کبھی جمعرات کے دن لمبی لمبی چمک دار موٹریں اس کے غار کے پاس آتیں۔ گاؤں والے بے چارے پڑھے لکھے تو تھے نہیں اس لیے وہ اسے کوئی بزرگ سمجھنے لگے تھے۔ گاؤں میں کسی کو بھی اس کا نام نہیں معلوم تھا اس لیے لوگ اسے بابا کہنے لگے تھے۔

اسی لیے اُسے یہاں کریم کا گریبان پکڑے دیکھ کر ہاشو کو حیرت ہو رہی تھی۔

"میں نے تمھیں کبوتر کو اُٹھا کر دیکھتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اس کبوتر کے پاس سے تمھیں جو کچھ ملا ہے وہ میرے حوالے کر دو۔" بابا نے کہا۔ اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"ہمیں اس کے پاس سے کوئی چیز نہیں ملی۔" کریم نے ہمت کر کے کہا۔

بابا نے گرج دار آواز سے کریم کو ڈانٹا، "بکو مت! کبوتر کے پاس سے تمھیں ایک نلکی میں ہیرے ملے ہوں گے۔ انھیں میرے حوالے کر دو، ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔" یہ کہہ کر بابا نے کریم کی کلائی پکڑ کر مروڑ



دی۔ کریم کی ایک اور چیخ نکل گئی۔

ہاشو اب حیران کھڑا بابا کی باتیں سُن رہا تھا، لیکن جب اس نے کریم کی کلائی مروڑی تو ہاشو سے چپ نہ رہا گیا۔ اس نے اچھل کر پوری قوت سے بابا کی پنڈلی پر لات رسید کی۔ بابا کو شاید امید نہیں تھی کہ ہاشو اس طرح اچانک حملہ کر بیٹھے گا۔ ہاشو کے موٹے جوتوں سے اس کی پنڈلی پر بڑے زور کی چوٹ لگی تھی۔ وہ یہ چوٹ برداشت نہیں کر سکا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس طرح اس کے ہاتھ سے کریم کی کلائی بھی چھوٹ گئی۔ دونوں بھائیوں کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُن کا رُخ گاؤں ہی کی طرف تھا، لیکن ہاشو کی لات اتنی زوردار تو تھی نہیں کہ بابا ہمیشہ کے لیے بے کار ہو جاتا۔ وہ بھی جلد ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں کا پیچھا کرنے لگا، لیکن اتنا لمبا چوڑا تھا کہ اپنے وزن کی وجہ سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ پھر بھی اُس نے دونوں بھائیوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ایک جگہ سمندری کائی پر سے کریم کا پیر پھسل گیا۔ اس نے فوراً ہی اُٹھ کر دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی، لیکن اس کے پیر میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے ہاشو سے کہا، "مجھے کچھ دیر سستانا پڑے گا۔"

"نہیں، نہیں، ہمت سے کام لو۔ اگر اس نے تمھیں دوبارہ پکڑ لیا تو وہ نہ جانے کیا کرے گا۔ جلدی کرو ہم سامنے والے سائبان کے نیچے چھپ جائیں گے۔" ہاشو نے سمجھایا۔

دونوں بھائی بھاگ کر سائبان تک پہنچے، لیکن اندھیرے میں انھیں مچھلیاں پکڑنے والا وہ جال نظر نہیں آیا جو دن میں کسی نے سوکھنے کے لیے سائبان پر ڈال دیا تھا۔ اس جال سے ٹکرا کر پہلے ہاشم گرا، پھر کریم، لیکن دونوں جلد ہی سنبھل گئے اور جال کے پیچھے چھپ گئے۔ اس وقت کریم کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ اس نے جلدی جلدی وہ ترکیب ہاشو کو بھی سمجھا دی۔

جال باریک تاروں سے باندھ کر لٹکایا گیا تھا۔ دونوں نے بڑی جلدی میں جال کا دوسرا سرا تلاش کیا تاکہ اس سرے پر جو تار بندھے ہوئے ہیں انھیں کھول دیں۔ آخر انھیں دوسرا سرا مل ہی گیا۔ دونوں نے تار کھول کر جال ہاتھوں میں تھام لیا، لیکن جال بہت وزنی تھا۔ ہاشو تو خیر اپنے گاؤں کے لوگوں کے ساتھ جال پکڑنے اور اُسے اٹھانے کا عادی تھا پھر بھی وہ اکیلا تو جال نہیں اُٹھاتا تھا، اس لیے جال اُس کے لیے بھی وزنی تھا، لیکن کریم کے لیے جال کو سنبھالے رکھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ایک آدھ بار ہاشو سے کہا بھی کہ اس کے ہاتھ سے جال چھوٹا جا رہا ہے، لیکن ہاشو

نے اس کی ہمت بندھائی، کیوں کہ وہ بابا کے پیروں کی چاپ بھی سُن رہا تھا۔ ہاشو کے کہنے پر کریم نے مضبوطی سے تار پکڑ لیے۔ پھر بھی وزنی جال اس کے ہاتھ سے پھسلتا جا رہا تھا، خیر اس سے پہلے کہ جال اس کے ہاتھ سے نکل جاتا بابا ان کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں بھائیوں نے کوشش کر کے بڑی پھرتی سے وہ جال بابا پر اُچھال دیا۔ جال ٹھیک بابا کے اوپر گرا، جس سے وہ لڑھک کر زمین پر گر پڑا۔ پھر ہاشو اور کریم نے جال کو اس طرح کھینچا کہ بابا بالکل اس میں اُلجھ اور پھنس کر رہ گیا۔

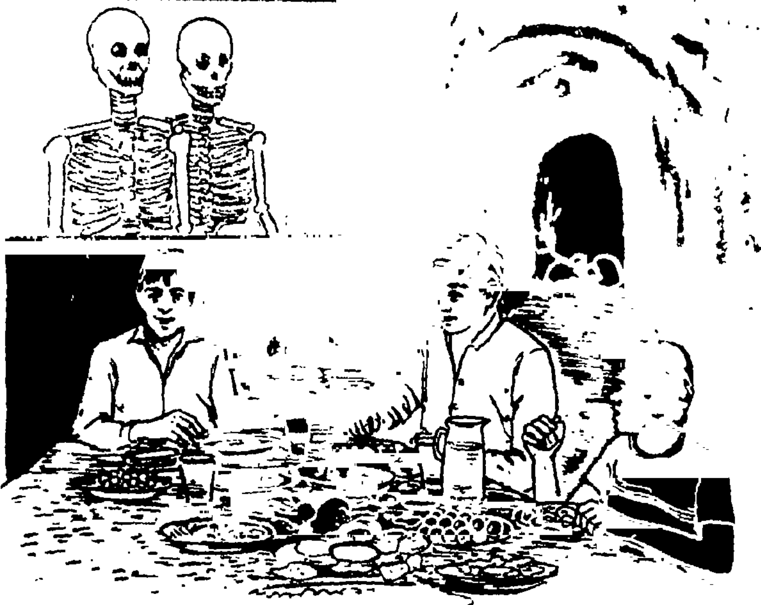
"بھاگو کریم بھاگو"، ہاشو نے کہا۔

دونوں بھائی بھاگتے ہوئے جلد سے جلد گاؤں پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ اُدھر بابا جال سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ جتنے ہاتھ پیر چلاتا اتنا ہی پھنستا جاتا۔ ہاشو اور کریم گاؤں میں داخل ہوئے ہی تھے کہ انھیں ایک سائکل سوار نظر آیا۔ ہاشو نے اُسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ بچّل کھوسو تھا۔ پولیس کانسٹیبل بچّل کھوسو ان کے مکان کے قریب ہی رہتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی بھی اسی علاقے کے تھانے میں تھی۔ دونوں نے بچّل کھوسو کو روک کر سارا قصّہ سُنا دیا۔ کریم نے اپنی جیب سے وہ ہیرے بھی نکال کر دے دیے۔ بچّل وقت ضائع کیے بغیر اُس جگہ پہنچا جہاں بابا جال میں اُلجھا ہوا پڑا تھا۔ بابا گرفتار کر لیا گیا۔

یہ کہانی اخبارات میں چھپی تو ہاشو کے گاؤں کا وہ ایک دن تک بڑا چرچا رہا۔ اخباروں کے کئی فوٹو گرافر ہاشو اور کریم کی تصویریں لینے کے لیے آئے اور ان کو بھی بڑی شہرت ملی، ایسی شہرت جس میں عزّت بھی شامل تھی۔

تن درستی

تن درستی کے معنی ہیں تن یعنی جسم کا درست یا صحیح ہونا، اس لیے تن درستی کو عام طور پر صحت کے معنی میں بولتے یا لکھتے ہیں، لیکن غور کیا جائے تو صحت کا مطلب زیادہ وسیع ہے۔ صحت صرف جسم یا تن کے درست ہونے کو ہی نہیں کہتے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جو آدمی بیمار نہیں ہے وہ تن درست یا صحت مند ہے لیکن صحت اس سے بھی بڑھ کر ایک حالت یا کیفیت ہے۔ صحت ایک ایسی حالت کو کہہ سکتے ہیں جس میں انسان جسمانی، ذہنی اور سماجی لحاظ سے صحیح حالت میں ہو۔



ڈسکو بھوت

شام کا وقت تھا۔ جنگل میں دھیرے دھیرے اندھیرے کی حکمرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ تین لڑکے سائیکلوں پر سوار منزل کی جانب رواں دواں جلد از جلد جنگل پار کر لینے کی دُھن میں مگن چلے جا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے کسی جنگلی جانور کی آواز دل کی دھڑکن تیز کر جاتی، وہ اور تیزی سے پیڈل مارتے ہوئے جنگل پار کر لینے کی کوشش کرنے لگتے۔

اچانک ایک جگہ پہنچ کر ان تینوں کے چہرے فق ہو گئے رنگ پیلا پڑ گیا کیونکہ ایک برگد کے قریب پہنچ کر انھوں نے کسی کے کراہنے کی آواز سُنی تھی۔

ابھی وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ اُسی درخت کے نیچے سے ایک بھاری بھرکم آواز سُنائی دی "لڑکو! اگر تم لوگ میرے کہنے کے مطابق عمل کرو گے تو میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

دانش نے جو اپنے ساتھیوں میں سب سے بڑا

اور بہلول سقا اپنے حواس برقرار رکھتے ہوئے کہا "آپ کون ہیں؟ کہاں سے بول رہے ہیں؟ اور ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ہم کس طرح آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟"

"میں بتن دودھ والے کی بھٹکتی ہوئی روح ہوں۔ تمھیں یاد ہوگا مجھے گزشتہ ماہ کی پندرہ تاریخ کو اسی جگہ سے دودھ بھرے ڈبے لے جاتے ہوئے ڈاکوؤں نے لوٹ کر قتل کر دیا تھا۔ تب سے ہی میری روح بھٹکتی پھر رہی ہے۔ اگر تم لوگ میری مدد کرو تو میری بھٹکتی ہوئی روح کو سکون مل جائے گا۔" آواز نے کہا۔

تینوں لڑکوں کے ذہن میں گزشتہ ماہ قتل ہونے والے بتن دودھ والے کے قتل کا واقعہ گھوم گیا اُن کے ذہن سائیں سائیں کرنے لگے، دلوں کی دھڑکن تیز ہوگئی اور ہاتھ پیروں کے رونگٹے انجانے خوف سے کھڑے ہو گئے۔ اس قتل کی اخبارات میں بڑی شہرت ہوئی تھی۔ کئی دن بعد مسخ شدہ پھولی ہوئی لاش ملی تھی بتن دودھ والے کی۔ اور قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ اب تک۔

لڑکے درخت کی سمت آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تینوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ادھر مت گزرو.... اس درخت پر بھوتوں کا بسیرا ہے"۔ انور نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ وقت بحث کا نہیں۔ یہ سوچو کہ اب کیا کیا جائے؟" ارسلان دھیرے سے بولا۔

"گھبراؤ نہیں... لڑکو!" آواز درخت کے نیچے سے پھر ابھری۔

"دانش یہاں سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر نیم کے درختوں کے جھنڈ میں پرانی بارہ دری کا ایک کھنڈر ہے۔ تم لوگ وہاں پہنچو پھر میں تمھیں اپنی روح کے سکون کے متعلق وہیں بتاؤں گا۔" اس بھوت نے ہدایت دی۔

انور تھوک نگلتے ہوئے گھبرا کر بولا: "اسے تو ہمارے نام بھی معلوم ہیں۔ اب تو باقاعدہ نام لے کر ہدایت دی ہے۔" پھر وہ بولا "مگر ہماری سائیکلیں؟"

آواز آئی "ان کی فکر مت کرو لڑکو۔ انھیں یہیں چھوڑ دو... واپسی میں تمھیں یہیں مل جائیں گی۔"

تینوں ساتھی اور بھی زیادہ سہم گئے مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مجبوراً اپنی سائیکلیں وہیں چھوڑ کر ڈرتے، لرزتے سہمتے اُس کھنڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جس کی نشان دہی بتن دودھ والے کی بھٹکتی ہوئی روح نے کی تھی۔

تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑ لیے اور دھڑکتے ہوئے دلوں کے

ساتھ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے بارہ دری کے
کھنڈر میں داخل ہو گئے۔ انھیں یہ جگہ بڑی پرسکون
لگ رہی تھی۔ کچھ دور چل کر انھیں ایک سمت میں
ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ وہ ہاتھ پکڑے ہوئے
اسی سمت بڑھ گئے۔

قریب پہنچ کر انھوں نے جو منظر دیکھا اُس سے
ہزار ضبط کے باوجود اُن کی چیخ نکل گئی۔ وہاں
چاروں کونوں میں چار خوفناک ڈھانچے کھڑے
تھے اور چاروں بڑے اسٹائل سے سگریٹ پینے
میں مصروف تھے۔ پھر تینوں ساتھی ہمت کر کے
ندر داخل ہو گئے۔ وہاں ایک اور منظر انھیں
یرت زدہ کرنے کے لیے موجود تھا۔ ایک بڑی
س ڈائیننگ ٹیبل پر انا مٹھائیاں اور لذیذ گرما گرم
ھانے بڑے قرینے سے چنے ہوئے تھے۔

دانش نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اُس
ت آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے ڈر اور
کے باوجود انھیں بھوک ستانے لگی تھی اور
نوں کی خوشبو سے تو یہ بھوک اور بھی چمک گئی
س۔ انور نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یار کوئی
صیبت نہ آجائے کھانا کھانے سے کچھ صبر کر لو۔"

مگر دانش اُس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے
"ساتھیو، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا بہتر
ہے کفرانِ نعمت نہ کیا جائے اور میز پر تازہ کھانا
بد ہمارے ہی لیے ہے، چلو بسم اللہ کریں۔" یہ
کہہ کر وہ میز کے گرد کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

ابھی انھیں کھانا شروع کیے پانچ سات منٹ
ہی گزرے تھے کہ انھیں اپنے سر گھومتے ہوئے
محسوس ہونے لگے۔ دانش نے فوراً کھانے سے
اپنا ہاتھ روک لیا۔ ارسلان نے بڑی مشکل سے
کہا "اگر انور کا مشورہ مان لیتے تو..." اور اس کے
بعد آگے ایک حرف نہ کہہ سکا۔.. انور یہ کہتے
ہوئے کہ مجھے نیند آ رہی ہے وہیں میز پر ڈھیر ہو گیا۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا اور چڑیوں کی چہچہاہٹ
سے دانش کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پہلے آنکھیں
مَلیں، ایک طویل انگڑائی لی اور اُٹھ بیٹھا...." ارے
یہ کیا؟"

وہ پھر حیرت میں تھا۔ دونوں ساتھی اور وہ
خود اُسی برگد کے درخت کے نیچے پڑے ہوئے
تھے جہاں جن دودھ والے کی بے چین روح نے
انھیں گھیرا تھا۔ پھر اُس نے اپنے دونوں ساتھیوں
کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ تینوں نے اپنا جائزہ لیا تو
ان کی گھڑیاں، جیبوں کی نقدی اور سائیکلیں، سبھی
کچھ غائب تھا۔ وہاں بہت سے جوتوں کے نشان
تھے جس سے اندازہ ہوا کہ وہ کئی آدمی تھے۔

"ارے یہ کیا؟" دانش نے جوتوں کے نشان کو
غور سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو ڈسکو جوتوں کے نشان ہیں۔"
انور بولا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس برگد
کے بھوت ڈسکو کے شوقین بھی ہیں۔"

"ہاں انور! ان جوتوں کے نشانوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ بھوت عام بھوت نہیں بلکہ ڈسکو بھوت ہیں۔"

دانش کا دماغ اب پوری طرح سوچنے سمجھنے کے قابل ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا یہ بھوت ووت کچھ نہیں یقیناً ہم کسی فراڈ کا شکار ہوئے ہیں۔

پھر وہ بڑے مزے میں منہ سے سیٹی بجانے لگا جیسے وہ ساری بات سمجھ گیا ہو۔ پھر ساتھیوں سے بولا "تم دونوں یہیں میرا انتظار کرو میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

"لیکن تم اکیلے کہاں جا رہے ہو؟" انور نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔

"میں بھوت کو پکڑنے کے لیے عامل کو بلانے جا رہا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ شہر جانے والے راستے کی طرف دوڑ پڑا۔

دو گھنٹے کے بعد وہ ایک قریبی پولیس اسٹیشن سے انسپکٹر اور پولیس پارٹی کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا اور وہاں سے انھیں لے کر کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ دانش نے اپنے ساتھ صرف انسپکٹر جعفری اور اپنے دونوں ساتھیوں کو لیا بقیہ پولیس پارٹی نے نہایت خاموشی سے بارہ دری کے گرد پھیل کر اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

جب وہ چاروں اندر داخل ہوئے تو انھوں نے کسی آدمی کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا "رفیق... دیکھا تم نے کتنا عمدہ اور سائنٹیفک طریقہ سوچا ہے میں نے۔ پولیس تو عمر بھر بھی ہم پر شک نہیں کر سکتی۔ بھوتوں کا ہی نام لیں گے اور بھوتوں پر پولیس کے پاس کوئی دفعہ نہیں ہے کہ گرفتار کر سکے۔"

دوسری آواز آئی "مان گیا استاد بڑی دور کی سوجھی ہے تمھیں۔"

عین اسی وقت انسپکٹر جعفری نے بڑھ کر "ہینڈز اپ" کا حکم دیتے ہوئے کہا "اور استاد کے چیلے! اب بھوت بن کر کوئی نہیں چھوٹ سکتے۔ خاموشی سے خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ بھاگنے کی کوشش بے کار ہے پوری بارہ دری ہمارے گھیرے میں ہے۔"

پھر دانش نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو باری باری ہتھکڑی پہنا دی۔

انسپکٹر جعفری، مجرموں کو باہر لے جاتے ہوئے دانش سے کہہ رہا تھا "بھئی ان ڈسکو بھوتوں کو پکڑوایا تم نے۔"

دانش بولا "انسپکٹر صاحب میں نے نہیں ان کے ڈسکو جوتوں نے انھیں گرفتار کرایا۔" پھر استاد کو مخاطب کر کے بولا "میاں ڈسکو! اگر تم سائنٹیفک طریقۂ واردات کا سوچ سکتے ہو تو ہم بھی..."

اور اس نے شرمندگی سے اپنی گردن جھکا لی۔





● استاد: (شاگرد سے) سعید بتاؤ، خلوص، محبت اور مروت میں کیا بات مشترک ہے؟

شاگرد: جناب یہ تینوں چیزیں صرف کتابوں میں ملتی ہیں۔

مرسلہ: شہداد الحسن انصاری

● ایک ڈاکٹر کامیابی کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر کی کامیابی میں اس کی فیس کا بہت دخل ہے۔ میری ہی مثال لیجیے اگر میں کسی مریض کو دیکھنے جاؤں تو پچاس روپے لیتا ہوں اگر مریض میرے مطب میں آئے تو بیس روپے دینے پڑتے ہیں اور اگر کوئی شخص ٹیلیفون پر طبی مشورہ کرے تو میری فیس دس روپے ہوتی ہے۔"

اچانک ایک کونے سے آواز آئی "ڈاکٹر صاحب، اگر آپ کسی مریض کے قریب سے گزریں تو آپ کی فیس کتنی ہو گی؟"

مرسلہ: نبی بخش گشکوری

● استانی نے بچے سے انتہائی غضبناک ہو کر کہا، "تم نے اس قدر خراب مضمون لکھا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تمھارے والد کو دکھانے کے لیے بھیج دوں۔"

بچے نے معصومیت سے کہا "مس انھیں دکھانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ انھوں نے ہی یہ مضمون لکھ کر دیا ہے۔"

مرسلہ: سید امتیاز علی زیدی

● پوتا: دادا جان، کیا آپ کے منہ میں دانت ہیں؟

دادا جان: نہیں بیٹا، کیا کام ہے؟

پوتا: ذرا میرے اخروٹ رکھ لیجیے میں ابھی آیا۔

● ایک پادری نے وعظ کرتے کرتے سامعین سے کہا "بتاؤ دنیاوی خوشی کی کیا قیمت ہے؟" ایک سوداگر جو اونگھ رہا تھا چونک کر بولا:

"چار آنے درجن!"

مرسلہ: عظمیٰ احمد

● خاوند قمیص کا بٹن ٹانک رہا تھا۔ بیوی نے کہا، "سوئی غلط ہاتھ میں ہے۔"

خاوند نے کہا "ہاں، اسے تمھارے ہاتھ میں ہونا چاہیے تھا۔"

مرسلہ: سجاد احمد

● استاد: پہاڑوں کے بال کیوں جھڑے ہوئے ہیں؟
شاگرد: اس لیے کہ جنگل میں کوئی حجامت کرنے والا نہیں ہوتا۔

● لڑکا: ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس درد کی دوا ہے؟
ڈاکٹر: درد کہاں ہو رہا ہے؟"
لڑکا: ابھی درد نہیں ہوا۔ ٹھیر کر ہوگا۔ ابا جان امتحان کا نتیجہ دیکھ کر آنے ہی والے ہیں۔

مرسلہ: محمد جاوید حسین

● ایک چھوٹی سی بچی کی اپنی سہیلی سے زور دار لڑائی ہوگئی۔ بچی کی ماں اُسے سمجھانے لگی:
"یاد رکھو، سہیلی کے بال کھسوٹنے پر تمھیں شیطان نے اُکسایا تھا!"
بچی بولی: "ایسا ہی ہوگا، مگر اس کے لات جمانے کا خیال میرا اپنا تھا۔"

مرسلہ: شاد ایم منیر فاضل

● ایک آدمی کو یہ وہم ہوگیا کہ اس کے پیٹ میں بلی ہے۔ کئی سال ہوگئے، مگر ڈاکٹروں کے سمجھانے کے باوجود اس کے دل سے یہ وہم نہیں نکلا۔ اتفاق سے اس کی آنت کا منہ بڑھ گیا اور اپریشن کرنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے سوچا یہ اچھا موقع ہے۔ انھوں نے اپریشن کے بعد اس کو ایک کالی بلی دکھا کر کہا کہ آخر ہم نے تمھارے پیٹ میں سے بلی نکال دی۔
مریض نے بلی کو دیکھا اور غصے سے چیخا: "غلط، وہ سفید بلی تھی!"

مرسلہ: صالحہ مسعود بیرکانی

● کتاب بیچنے والا: "تم ہر روز آتے ہو، کتابیں اُلٹ پلٹ کر چلے جاتے ہو، خریدتے کچھ نہیں!"
لڑکا: "واہ، میں ہر روز وہ کتاب دیکھنے آتا ہوں، اگر آپ کو پتا نہ چلے تو میں کیا کروں۔"

● پہلا بیوقوف: تمھیں معلوم ہے قیامت کے دوسرے دن اخبار میں کیا خبر چھپے گی؟"
دوسرا بیوقوف: مجھے تم اتنا بےوقوف نہ سمجھو۔ ہر خاص دن کے بعد اگلے روز اخبار کی چھٹی ہوتی ہے!"

مرسلہ: عبدالستار

● ماں نے بیٹے کو اخبار سے خبر سناتے ہوئے کہا: "بھینس نے اسکول ماسٹر پر حملہ کر دیا!"
منا کہنے لگا: "مگر امی اس کو کیسے پتا چلا کہ یہ اسکول ماسٹر ہیں؟"

● نازیہ: امی! آج میں نے عجیب منظر دیکھا۔
ماں: وہ کیا؟"
نازیہ: آج ہماری بس ہنس رہی تھیں۔

مرسلہ: ثمینہ اقبال

● دوست (دوسرے دوست سے) تمھاری کار کی رفتار بتانے والا آلہ کہاں گیا؟
دوسرا دوست: مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے فروخت کر دیا۔
پہلا دوست: اب تم کار کی رفتار کا اندازہ کیسے

چلتے ہو؟

دوسرا دوست: بڑی آسانی سے، بیس میل کی رفتار پر گاڑی کا پچھلا حصہ لرزنے لگتا ہے۔ تیس میل پر دروازے بھی لرزنے لگتے ہیں۔ چالیس میل پر پوری گاڑی لرزتی ہے اور پچاس میل پر میں لرزنے لگتا ہوں۔

● ایک باپ بڑی توجہ اور شفقت سے اپنے ذہین اور شریر بچے کو اخلاق کا درس دے رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد باپ نے بچے سے سوال کیا:

"بیٹا اگر تمھارے سامنے کوئی شخص اپنے گدھے کو پیٹ رہا ہو اور تم جاکر اس شخص کو یہ ظلم کرنے سے باز رکھو تو تمھارے اس عمل کو کیا کہا جائے گا؟"

بچے نے فوراً جواب دیا "برادرانہ محبت۔"

مرسلہ: مشتاق رحمت اللہ

● ایک آدمی لائبریری سے صرف حالی کی کتابیں لیا کرتا تھا۔ ایک بار لائبریرین نے ہنس کر کہا، "آپ ہر بار حالی کی کتابیں لے کر جاتے ہیں شاید آپ کو ان کی کتابیں بہت پسند ہیں۔"

وہ آدمی بولا، "ایسی کوئی بات نہیں، دراصل مجھے ایک دفعہ حالی کی ایک کتاب سے ۱۰ روپے کا نوٹ ملا تھا۔"

● ایک صاحب ہندوستان سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دن انار کلی بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک دکان پر ایک خوب صورت سی تھرمس دیکھی۔ انھیں کسی نے بتایا تھا کہ لاہور کے دکان دار ہر چیز کی دگنی قیمت بتاتے ہیں اور پھر آدھی قیمت میں دے دیتے ہیں۔ ان صاحب نے دکان دار سے قیمت پوچھی تو اس نے کہا "بیس روپے۔"

وہ صاحب بولے "دس روپے دوں گا۔"

دکان دار نے کہا "بابو جی یہ تو بہت کم ہے اچھا چلیے پندرہ روپے دے دیں۔"

وہ صاحب بولے "ساڑھے سات دوں گا۔"

دکان دار بڑا حیران ہوا، بولا "دس روپے کی تو میں نے خریدی ہے۔ اچھا چلیں آپ دس روپے ہی دے دیں۔"

وہ صاحب بولے "پانچ روپے دوں گا۔"

دکان دار نے عاجز آکر کہا "آپ ہمارے مہمان ہیں آپ سے کیا پیسے لوں آپ مفت لے لیں۔"

ان صاحب نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولے "دو لوں گا۔"

مرسلہ: ظہیر حسن

● جج: "یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ چیزیں تم نے ہی چرائی تھیں، کیوں کہ ان پر تمھاری انگلیوں کے نشان موجود ہیں۔"

ملزم: میری انگلیوں کے نشان؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کیوں کہ اس وقت تو میں دستانے پہنے ہوئے تھا۔

مرسلہ: محمد حسیب القادر نیدالفو

● وکیل نے اپنے منشی سے پوچھا، "کیا تم نے موکل کو تمام حساب سمجھا دیا؟" "جی ہاں، میں نے سارا حساب اُسے سمجھا دیا۔" "پھر اس نے کیا کہا؟" وکیل نے پوچھا۔ "حساب دیکھ کر اس نے کہا، جہنم میں جاؤ! بس میں آپ کے کمرے میں چلا آیا۔" منشی نے جواب دیا۔

مرسلہ: حافظ سلمان بابر



س : بجلی آسمان پر کس وجہ سے چمکتی ہے؟ محمد بصیر الزماں،

ج : آسمان پر جو بادل آپ کو نظر آتے ہیں، وہ نمی اور بے شمار ذرات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ مسلسل رگڑ کی وجہ سے یہ ذرات چارج ہو جاتے ہیں اور کسی بادل پر مثبت اور کسی پر منفی برقی چارج پیدا ہو جاتا ہے، چوں کہ مخالف چارج ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں اور آپس میں ملنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے جیسے ہی مخالف چارج والے دو بادل ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں منفی چارج مثبت چارج کی طرف دوڑتا ہے۔ اُس وقت آپ کو آسمان پر شرارہ نظر آتا ہے اور آپ اسے آسمانی بجلی کہتے ہیں۔ درمیان میں ہوا اس عمل میں مزاحمت کرتی ہے، جسے یہ چارج توڑ دیتا ہے اُس وقت زبردست کڑاکا سنائی دیتا ہے۔ جسے عام زبان میں گرج کہتے ہیں۔

س : ٹرانسمیٹر کیا ہوتا ہے؟ یہ اپنا کام کس طرح کرتا ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں؟
محمد سہیل محمد یوسف

ج : ٹرانسمیٹر کے انگریزی میں معنی ہیں بھیجنے والا، لہٰذا کوئی بھی ایسا انتظام جس کے تحت سگنل یا پیغامات نشر کیے جاتے ہوں یا بھیجے جاتے ہوں ٹرانسمیٹر کہلائے گا۔ یہ مشین چھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور بڑی بھی۔ ریڈیو اسٹیشن کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک تو اسٹوڈیو جو شہر میں کہیں واقع ہوتے ہیں اور جن میں پروگرام کیے جاتے ہیں۔ دوسرے ٹرانسمیٹر جو شہر کے

باہر واقع ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ اونچے اونچے کھمبے لگے ہوتے ہیں۔ اسٹوڈیو سے آنے والے سگنل اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے نشر کیے جاتے ہیں جو آپ کے ریڈیو سیٹ میں داخل ہو کر آپ کو وہ پروگرام سُنا دیتے ہیں۔ اس طرح ٹیلی فون کا وہ حصہ بھی ٹرانسمیٹر کہلاتا ہے جس میں آپ بولتے ہیں، کیوں کہ وہ آپ کی آواز کی لہروں کو برقی ارتعاشات میں تبدیل کر کے آگے بھیجتا ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو ہم ٹیلی فون پر گفت گو نہیں کر سکتے۔

س: جب ٹھوس، مائع اور گیس کو اُبالا جاتا ہے تو وہ پھیل جاتے ہیں۔ اگر انڈے کو اُبالا جاتا ہے تو وہ جم کیوں جاتا ہے؟ محمد عرفان،

ج: یہ صحیح ہے کہ چیزیں گرم ہو کر بالعموم پھیلتی ہیں۔ انڈے کی زردی سفیدی ایک خول میں بند ہوتی ہے۔ انھیں جب اُبالا جاتا ہے تو اپنی بناوٹ کی وجہ سے وہ جم جاتی ہیں، لیکن بعض اوقات پھیل بھی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ زیادہ دیر اُبالا جائے تو انڈے کا چھلکا پھٹ جاتا ہے اور زردی سفیدی باہر نکل آتی ہیں۔ یہ پھیلنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

س: ہم نے پڑھا ہے کہ بجلی خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے، لیکن آسمانی بجلی ہمیں ٹیڑھے راستوں پر نظر آتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ محمد قیصر فہیم،

ج: جب مخالف چارج یعنی مثبت اور منفی چارج سے بھرے ہوئے دو بادل ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو منفی چارج مثبت چارج کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے۔ درمیان میں ہوا ہوتی ہے جو اس عمل میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ چارج اس رکاوٹ یا مزاحمت سے بچنے کے لیے ٹیڑھا میڑھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اس راستے سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں مزاحمت کم سے کم ہو۔

س: مقناطیسیت چیزوں کو اپنی طرف کیسے کھینچتی ہے؟ رضوان روشن علی،

ج: مقناطیسیت ایک طرح کی قوت ہے جو بعض چیزوں میں اُن کے ذرات کے ایک خاص طرح ترتیب پانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جب آپ کسی مقناطیس کو لوہے کے ذرات

کے قریب لاتے ہیں تو یہ ذرات اس سے چپک جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقناطیس اپنے اثر سے قریب کی چیز پر مخالف قطب پیدا کر لیتا ہے اور چونکہ مخالف قطبین ایک دوسرے کو کھینچتے یا کشش کرتے ہیں اس لیے وہ چیز مقناطیس کی طرف کھنچ آتی ہے۔

س: دنیا کی سب سے پہلی ایجاد کون سی ہے؟ خالد محمود قریشی،

ج: کام کی چیز جو انسان نے سب سے پہلے ایجاد کی اور جسے مشنری کا باوا آدم کہا جاسکتا ہے پہیا ہے۔

س: رنگ کیا ہیں؟ ہم انہیں کیسے محسوس کرتے ہیں؟ ملک فیاض محمد اعوان،

ج: سفید روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ بنفشی، کاہی، نیلا، سبز، زرد، نارنجی اور سرخ۔ یہ سب رنگ مل کر سفیدی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں میں قدرتی طور پر رنگوں کو محسوس کرنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ گلاب کا پھول سرخ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھول سرخ شعاعوں کے علاوہ باقی چھے رنگوں کی شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے۔ صرف سرخ رنگ کی شعاعوں کو واپس ہماری طرف بھیج رہا ہے اور ہماری آنکھ سرخ رنگ سے متاثر ہو رہی ہے۔ یہی صورت دوسرے رنگوں کی ہے۔ جب کوئی بھی رنگ واپس نہ آئے تو وہ چیز سیاہ نظر آتی ہے۔

س: ایئر کنڈیشنر کس طرح کمرے کو ٹھنڈا کرتا ہے؟ عیسیٰ علی خاں،

ج: ایئر کنڈیشنر میں اندر کی گرم ہوا باہر پھینکنے اور باہر کی ہوا کمرے میں لانے کا انتظام ہوتا ہے۔ اندر آنے والی ہوا ایک گیس کی نالیوں میں ہوتی ہوئی آتی ہے جو بہت ٹھنڈی ہوتی ہے۔ یہ گیس ہی کمرے میں خنکی پیدا کرنے کی ذمے دار ہے۔ باہر سے اندر آنے والی ہوا گیس کی نالیوں کو چھو کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور کمرے کا درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔





میں ایک مشینی آدمی یعنی روبوٹ ہوں!

میرا کام آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کرنا ہے۔ میں خاص طور پر خلا میں اپنے اطراف بکھرے ہوئے بہت سے مُردہ سیاروں پر کھدائی کے ذریعے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیا انسان ہم روبوٹس (ROBOTS) سے مختلف ہوتے تھے؟ کیا واقعی ان میں اور ہم میں فرق ہوتا تھا؟ میں آپ کو بتاؤں کہ صرف ایک مرتبہ میرا اور ایک انسان کا ساتھ ہوا تھا۔ میں نے اس انسان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ انسان اور اس کا نظام اتنا سیدھا سادہ نہیں ہوتا جتنا ہمیں اسکول میں بتایا جاتا تھا۔

ہمارے پاس انسانوں کے متعلق بہت تھوڑی معلومات تھیں۔ یہ معلومات ہمیں اس طرح ملی تھیں کہ ان میں بہت سی باتیں بیچ میں سے غائب تھیں اور ہم روبوٹس کو خود کوشش کر کے یہ خالی جگہیں پُر کرنی پڑتی تھیں، لیکن اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس کوشش سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا، یعنی ہم کوئی خاص نتیجہ نہیں نکال سکے۔ ہمیں معلوم ہے اور تاریخ جاننے والے روبوٹس بھی یہی کہتے ہیں کہ انسان زمین نامی ایک سیارے سے آئے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انسانوں نے بڑی بہادری سے ایک سیارے سے دوسرے سیاروں کا سفر کیا تھا۔ وہ جس سیارے پر بھی پہنچے انھوں نے وہاں اپنی نوآبادیاں بنا لیں یعنی ان سیاروں پر انسانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ کبھی وہاں صرف انسان رہتے اور کبھی روبوٹس اور کبھی دونوں۔ بہرحال وہ جہاں گئے وہاں سے واپس نہیں ہوئے۔

ہمارے سائنس دانوں نے ہمیں بتایا تھا کہ انسانوں میں بھی ایک ڈھانچا ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کو یقین ہے کہ انسانوں کا ڈھانچا ہم روبوٹس کے ڈھانچے سے مختلف نہیں ہوتا تھا، یعنی ان کا ڈھانچا ہماری طرح کا ہی ہوتا تھا۔ بس اتنا سا فرق ہوتا کہ انسانوں کا ڈھانچا کیلشیم کے ایک

مرکب سے بنا ہوتا تھا، جب کہ ہمارا ڈھانچا ٹیٹانیم دھات کا ہوتا ہے۔ بناوٹ میں کچھ معمولی فرق ہوتا تھا۔

میں نے کہا تھا کہ ایک انسان سے صرف ایک مرتبہ میرا واسطہ پڑا ہے۔ ہوا یہ کہ اپنے کام کے لیے مختلف سیاروں پر جانے کا جو پروگرام مجھے بتایا گیا تھا اس پروگرام کے مطابق صرف چند سیارے رہ گئے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ آخری سیارہ رہ گیا تھا۔ یہ سیارہ ہمارے سیاروں کے نظام میں اندرونی طرف تھا۔ اس سیارے پر پہنچنے کے بعد اس آدمی سے میری ملاقات ہوئی تھی وہ اس سیارے پر بہت دنوں سے رہ رہا تھا۔ وہ شاید انسانوں کی نسل میں سے آخری انسان تھا۔ اس سیارے پر رہتے ہوئے اُسے کتنے دن ہوئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہت دنوں تک تنہا رہنے کی وجہ سے، چوں کہ اُسے کسی سے بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اس لیے وہ بات کرنا ہی بھول گیا تھا۔ مجھے اس آدمی کو اپنی زبان سکھانی پڑی۔ پھر جب اُس نے ہماری زبان سیکھ لی تو اس کے ساتھ اچھا وقت گزرنے لگا۔ میں سوچتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ اپنے سیارے پر لے آؤں گا، لیکن میرا ارادہ پورا نہیں ہو سکا، کیوں کہ اسے کچھ ہو گیا تھا جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔

ایک دن کیا ہوا کہ اس آدمی نے اچانک گرمی کی شکایت کی۔ میں نے اس کا ٹمپریچر دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس آدمی کے اندر حرارت کی پیمائش کرنے والے آلے میں خرابی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے تار جل گئے ہوں۔ میرے پاس فاضل پرزوں کا تھیلا موجود تھا۔ یہ تھیلا سفر کے دوران ہر وقت میرے پاس رہتا تھا، تاکہ کوئی پرزہ خراب ہو جائے تو میں خود ہی اس پرزے کو بدل لوں۔ اس آدمی میں خرابی پیدا ہو ہی گئی تھی، چناں چہ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا خراب پرزہ بدل دوں۔

میں دیر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ اس آدمی کا مشینی نظام بند کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اپنی سوئی اس کی گردن میں داخل کی تاکہ حرارت کی پیمائش رکھنے والے آلے کا سوئچ کھول کر نکال لوں۔ جیسے ہی اپنی سوئی اس کی گردن میں داخل ہوئی اس آدمی کی حرکت بالکل بند ہو گئی یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، کیوں کہ ہم روبوٹس کی حرکت بھی اسی طرح بند ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد میں نے اس آدمی کا بدن کھول دیا۔

لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بدن کے اندر انسانوں کا سارا نظام ہم روبوٹس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ میرے پاس جو فاصلہ پر تو تھا وہ اس آدمی میں نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس آدمی کا جسم دوبارہ بند کر دیا جائے، کیوں کہ اس کے جس پرزے میں خرابی تھی اُس سے صرف اس کا جسم زیادہ گرم ہو رہا تھا۔ باقی تمام چیزیں ٹھیک تھیں، لیکن جب میں نے اس کا جسم دوبارہ جوڑ کر بند کر دیا تو بھی اس نے معمول کے مطابق حرکت نہیں کی۔ میں نے اُسے دوبارہ چلانے کی بہت کوشش کی، لیکن مجھے کامیابی نہیں ہو سکی۔ مجھے اپنے مرکز پر واپس پہنچنا تھا، کیوں کہ جو پروگرام مجھے دیا گیا تھا اس کے مطابق اس سیارے پر رُکنے کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ میں اپنے مرکز پر واپس آگیا۔ پھر تقریباً ایک سال بعد مجھے اُس سیارے پر دوبارہ جانا پڑا۔ میں جب اُس جگہ پہنچا جہاں میں نے اس آدمی کو چھوڑا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں اس آدمی کی ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے یقین آگیا کہ آدمی واقعی ہم روبوٹس سے مختلف ہوتے تھے۔





شمع راہ

کسی نے ایک بچے سے سوال کیا: "آدمی اور جانور میں کیا فرق ہے؟"

بچے نے جواب دیا: "آدمی کو ہنسنا آتا ہے۔ جانور کو ہنسنا نہیں آتا۔"

"لیکن آدمی اور جانور میں ایک یہی فرق تو نہیں" سوال کرنے والے نے بچے کی ذہانت پر مسکراتے ہوئے کہا: "آدمی کے پاس ذہن ہے جس سے وہ سوچتا ہے منصوبے بناتا ہے۔ ہاتھ ہیں جن سے وہ ہر طرح کے کام کرتا ہے، اوزار بناتا ہے اور ان سے ایسے کام لیتا ہے جنہیں ہاتھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس دنیا میں آپ کو قدم قدم پر آدمی کی محنت اور ذہانت کی نشانیاں مل جائیں گی۔ محنت کے بغیر آدمی خوش نہیں رہ سکتا۔"

اب سنو حضرت موسیٰؑ کا قصہ، جب آپ اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کو لے کر صحرا میں بھٹک رہے تھے۔ وہ سب بھوکے پیاسے تھے، تب حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب سے دعا کی اور آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر من و سلویٰ اتارا۔ یہ ایک نفیس اور شیریں غذا تھی، جسے سب ذوق و شوق سے کھاتے اور اللہ کا شکر بجالاتے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے ساتھی بہت جلد اس لذیذ کھانے سے اکتا گئے۔ سب نے اللہ کے نبی سے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے سے اکتا گئے۔ اپنے خدا سے کہیے کہ اللہ ساگ، ترکاری، گیہوں، پیاز اور دال وغیرہ پیدا کرے۔"

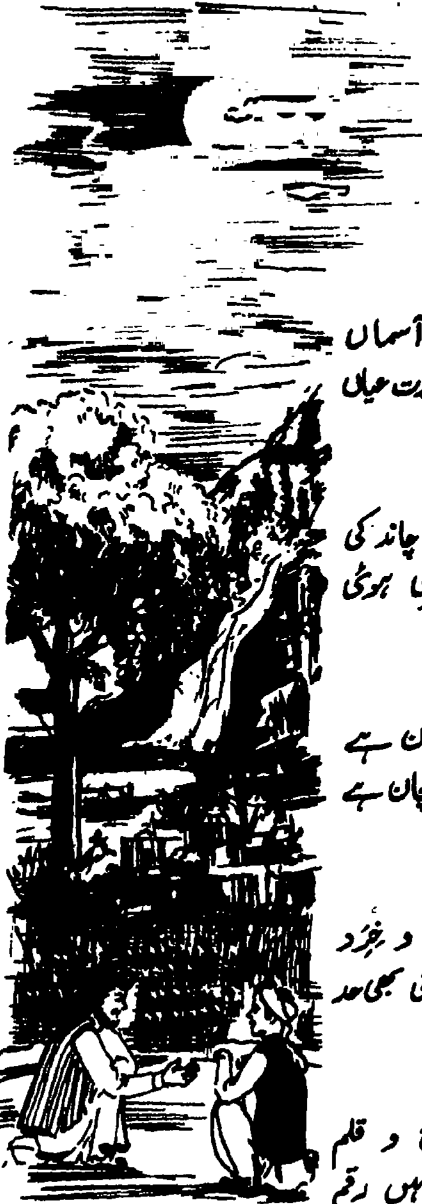
حضرت موسیٰؑ یہ سن کر حیران ہوئے۔ من و سلویٰ جیسے مزیدار کھانے کو چھوڑ کر یہ لوگ مانگ رہے ہیں۔ دراصل اس واقعے میں ایک سبق ہے۔ وہ لوگ محنت کر کے اپنے لیے اناج پیدا کرتے تھے۔ اب ان کے لیے ایسے کھانے میں کوئی کشش نہ تھی جو انہیں مفت مل رہا تھا۔

مفت خوری آدمی کو کاہل بنا دیتی ہے۔ کام کاج کرنے کے لائق نہیں رہتا بلکہ اپاہج بن جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی ساری طاقت اور ذہانت ختم ہو جاتی ہے پھر غیرت بھی جاتی رہتی ہے۔

محنت اور ریاضت پیغمبروں کی میراث۔ جتنے پیغمبر گزرے ہیں وہ سب اللہ کے نام کو اور اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے تھے، لیکن اپنی گزراوقات کے لیے بھیڑ بکریاں چراتے تھے، کھیتی باڑی کرتے، کوئی اور خدمت انجام دیتے۔ بہرحال محنت کے بغیر کبھی نوالہ نہیں توڑتے تھے کہ اس دنیا میں نعمت ہے وہ اللہ کے کرم سے اور اللہ کے بندوں کی محنت سے ہے۔

اللہ کی قدرت

قمر ہاشمی



پھل دار پیڑوں کی زمیں
لگتی ہے کیسی دل نشیں

یہ لاجوردی آسماں
جس سے تری قدرت عیاں

پھولوں میں کیسی ہے مہک
تاروں میں کتنی ہے چمک

راتوں میں چاندی چاند کی
ہر سمت ہے بکھری ہوئی

یہ شہر یہ جنگل ہرے
آباد ہیں مخلوق سے

آفاق ہے، انسان ہے
ان سے تری پہچان ہے

کھیتوں کے اندر بالیاں
میوے کی اونچی ڈالیاں

انسان کی عقل و خرد
جن کی نہیں کوئی بھی حد

یہ بحر و بر یہ جوئبار
تو نے بنائے کردگار

یہ ہاتھ یہ لوح و قلم
تعریف کرتے ہیں رقم

خیال کے پھول



■ حضرت علیؓ

کسی کے ساتھ احسان کرو تو اسے چھپاؤ لیکن جب تمہارے ساتھ کوئی احسان کرے تو اسے مت چھپاؤ۔

مرسلہ: ایم اسلم خان راہی،

■ حضرت ابوبکر صدیقؓ

خلوص یہ ہے کہ آدمی اعمال کا بدلا نہ چاہے۔

مرسلہ: حافظ احمد ولی اللہ،

■ حضرت عثمانؓ

انسان کو ہر حال میں صبر سے کام لینا چاہیے، ورنہ ذلت کا سامنا ہوگا۔ مرسلہ: عبدالمتین،

■ حضرت لقمانؑ

کوئی شے اتنی زیادہ نقصان دہ نہیں جتنا وقت ضائع کرنا۔

■ حضرت خواجہ فریدؒ

غرور اور تکبر ہر انسان کو لے ڈوبتا ہے۔

مرسلہ: ذوالفقار علی معتوؔ،

■ حضرت جنیدؒ

محبت اُن سے رکھو جو نیکی کرکے بھول جاتے ہیں اور قصور معاف کر دیتے ہیں۔ مرسلہ: سید جاوید انور رضوی،

■ امام غزالیؒ

کلام میں نرمی اختیار کرو، لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔ مرسلہ: محمد عمر،

■ افلاطون

جس طرح مکھی سارے جسم کو چھوڑ کر زخم پر بیٹھتی ہے اسی طرح بُرے آدمی اچھی چیز میں بھی بُرائی دیکھتے ہیں۔

مرسلہ: سید جاوید انور رضوی،

■ سقراط

تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان۔

مرسلہ: عنبر انیس،

■ راجر بیکن

مطالعے سے خلوت میں خوشی، تقریر میں حُسن، تجویز ترتیب میں استعداد اور تجربے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مرسلہ: محسن رجب علی، نواب شاہ

■ حکیم محمد سعید

جو دوسروں کے کام نہیں آتے وہ مقبول نہیں ہوتے اور جب ان کو ضرورت ہوتی ہے ان کے بھی کوئی کام نہیں آتا۔

مرسلہ: عبیداللہ شاد،

دوست

وقار محسن

گرمیوں کی اس دوپہر میں جب کہ چیل کے انڈا چھوڑنے کے کافی روشن امکانات تھے اور ننھے فیصل، ثانیہ اور ان کے دوستوں کا املی کے درخت کے نیچے جمع ہونا بہت مشکل تھا، لیکن جیسے ہی دادی اماں کی آنکھ لگی فیصل اور ثانیہ چپکے سے نکل بھاگے۔ ان کا جھبرا کتا موتی اور سفید بالوں والی بلی ریشم ان دونوں کے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔ چاروں پنجوں کے بل چلتے ہوئے دالان کی چق اٹھا کر نکلے اور ایک ہی چوکڑی میں املی کے درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ اس ایمرجنسی میٹنگ کی وجہ یہ تھی کہ دادا ابا نے کوٹھی کے سامنے والا پلاٹ بیچنے کا ارادہ کر لیا تھا جس میں یہ املی کا لدا پھندا درخت کوٹھی پر سایہ کیے برسوں سے کھڑا تھا۔ جن صاحب نے اس پلاٹ کو خریدنے کا سودا



کیا تھا وہ اس درخت کو کٹوا کر تعمیر کا کام شروع کروانا چاہتے تھے۔ جس دن سے تانیہ اور فیصل نے یہ خبر سنی تھی وہ بے چین تھے۔ کل اس پلاٹ کا سودا ہو جائے گا اور پھر املی کا یہ درخت جس کے سائے میں ان کا بچپن بکھرا ہوا تھا کاٹ دیا جائے گا۔ اس خیال سے ان دونوں کے دل کانپ رہے تھے۔ موتی نے درخت کی جڑ میں کھود کر پنجوں سے ٹھنڈی ریت نکالی اور اس پر گردن رکھ کر کہنے لگا:

"ننھے فیصل! میں کل ان توند والے انکل کی ٹانگ چبا ڈالوں گا جو ہمارے پیارے درخت کو کاٹنا چاہتے ہیں۔"

ریشم نے موتی کو ڈانٹا "تمہاری عقل تو دُم میں ہے۔ ہر وقت انسانوں کی طرح غرّانا ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی جانوروں کی عقل سے بھی کام لے لیا کرو۔ ہمیں جوش سے نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے کوئی معقول تجویز سوچنی ہوگی۔"

"ریشم! میرا خیال ہے کہ ہم ان توند والے انکل سے کہیں کہ اس درخت پر بھوتوں کا سایہ ہے۔ شاید وہ ڈر کر اس پلاٹ کو لینے کا ارادہ بدل دیں۔" تانی نے اپنی فراک سے مٹی جھاڑتے ہوئے مشورہ دیا۔

فیصل جو خاموشی سے گیلی ریت میں پیر ڈال کر گھروندا بنانے میں مشغول تھے آہستہ سے اپنا پیر نکالتے ہوئے بولے "تانی بہن! بھوت کو ہم بھوت سے کیا ڈرائیں گے۔ انکل بُل ڈوزر بھی تیار ہیں پلاٹ لینے کے لیے۔"

بوڑھا درخت خاموشی سے بچّوں کے پریشان چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی شاخیں بھی اُداسی سے آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے دادا ابّا نے اس کو اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اتنے لمبے عرصے سے یہ درخت سپاہی کی طرح سہمنا نانے کوٹھی کے سامنے والے احاطے میں کھڑا تھا۔ کتنے موسم بیت گئے۔ اس کے دامن میں کھیلتے کھیلتے بچّے جوان ہوئے اور اب ان کے بچّے اس کی آغوش میں تھے۔ برسات میں جب اس کے بازوؤں میں جھولے پڑتے اور پینگ بڑھاتے ہوئے بچّوں کے خوشی سے دمکتے چہرے چاروں طرف بکھرے ہوتے تو بوڑھے درخت کا ایک ایک پتّا خوشی سے جھومنے لگتا۔ امتحان کے دنوں میں اس کے مختلف گوشوں میں بچّے سر جھکائے پڑھنے میں مصروف ہوتے تو اس کی کوشش ہوتی کہ سورج کی کوئی گرم کرن ا

تک نہ پہنچے۔ فیصل میاں پر جب بھی ڈانٹ پڑتی وہ ہمیشہ دوڑ کر اس درخت کے نیچے آکر بیٹھ جاتے۔ دادی اکثر چلاتیں:

"ارے چندا! مغرب کے بعد پیڑ تلے نہ جاؤ۔ اثر ہو جاتا ہے۔"

اور فیصل میاں پر تو واقعی اس درخت کی محبت کا ایسا اثر ہوا تھا کہ اس کے نیچے جاکر ان کو ایسا سکون ملتا جیسے سردیوں کی راتوں میں دادی اماں سے لپٹ کر سونے میں۔

بہرحال اس وقت چاروں دوست بہت رنجیدہ تھے اور سر جوڑ کر ایسی تدبیر کی تلاش میں تھے جس سے ان کا یہ شفیق دوست ان سے جدا نہ ہو۔ درخت کے کٹنے کے تصور سے ہی وہ لرز رہے تھے۔ اچانک موتی نے دُم تان لی۔ جس کا مطلب تھا کہ کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا ہے۔

"ریشم! دادا جان پیسوں کے لیے یہ پلاٹ بیچ رہے ہیں۔ اگر ہم ان کو پیسے دے دیں تو؟"

"موتی! تم جب بولو گے بے تکی بات بولو گے۔ جھوٹی ہڈیوں کے علاوہ تمہارے پاس ہے ہی کیا؟" ریشم نے کہا۔

"میرے پاس پچھلی عید کے تیس روپے گولک میں جمع ہیں۔" ننھے فیصل غم زدہ لہجے میں بولے۔

"میں نے جو گڑیا کی شادی کے لیے دس روپے رکھے ہیں وہ دے دوں گی۔" تانیہ نے بے بسی سے کہا۔

"یعنی چالیس روپے اور دو جھوٹی ہڈیاں اور لینے چلے ہیں دو لاکھ کا پلاٹ۔" ریشم نے طنزیہ کہا۔

چاروں دوستوں کے چہرے پھر مایوسی سے لٹک گئے۔ بہت غور و فکر کے بعد یہ طے ہوا کہ آج رات کو دادا ابا کا موڈ ٹھیک ہو تو ان سے اس معاملے پر بات کی جائے۔

رات کو جب کھانے سے فارغ ہو کر دادا ابا اپنا حقہ لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو تانیہ اور فیصل چپکے چپکے کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے پاؤں دبانے لگے۔ دادا ابا نے مسکرا کر کہا:

"ارے آج ہمارے بیٹے اتنے خاموش کیوں ہیں۔ کیا پکنک پر جانے کی اجازت چاہیے؟"

تانیہ نے اپنی گولک دادا کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "دادا جان! اس میں دس روپے ہیں۔ یہ سب آپ لے لیں۔ اب میں کبھی پیسے نہیں مانگوں گی، عید پر بھی نہیں۔"

فیصل بھی بسورتے ہوئے بولے، "دادا جان! میرے تیس روپے بھی لے لیں۔ اب میں کوئی پیسہ خرچ نہیں کروں گا۔ جمع کر کے آپ کو دیتا رہوں گا۔"

دادا ابّا نے تانیہ اور فیصل کو گود میں بٹھاتے ہوئے کہا، "ارے بھئی! آج تو ہمارے بیٹا لوگ بڑے سنجیدہ ہیں۔ خیر تو ہے؟"

تانیہ نے سسکی لیتے ہوئے کہا، "دادا جان ہمارے پیارے دوست املی کے درخت کو بچا لیں۔ ہم اس کے بغیر کیسے رہیں گے۔"

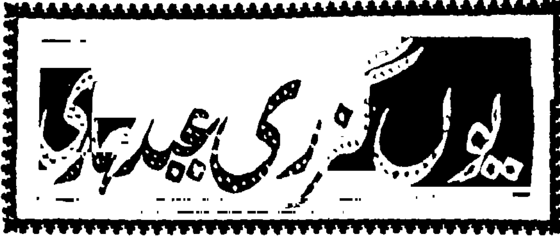
"ارے بھئی اتنی سی بات کے لیے اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھے خود اس درخت سے بہت لگاؤ ہے۔ اس کی چھاؤں میں تمھارے پاپا اور پھپھو نے اپنے بچپن گزارے ہیں۔ بہت سے دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا، لیکن اس پرانے دوست نے ہر اچھے بُرے وقت میں اپنا مہربان سایہ میرے اور میرے بچّوں پر قائم رکھا۔"

اگلے دن چھٹی تھی۔ صبح ہی سے کالے کالے بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ پرجیس پھپھو اپنے بچّوں کے ساتھ رات ہی آگئی تھیں۔ تانیہ نے بھی اپنے اسکول کی دوستوں کو بُلایا ہوا تھا۔ اسی درخت کے نیچے دادی نے اینٹوں کا چولہا بنا کر پوریاں تلنے کا انتظام کیا تھا۔ مالی رحیم داد نے سرخ رسّی کا جھولا املی کے درخت میں ڈال دیا تھا۔ کچھ دیر بعد بادل پھٹ پڑے اور چاروں طرف پانی کی چادر سی تن گئی۔ جھولے پر پینگ بڑھاتے ہوئے بچّوں کے قہقہے، دوسری طرف کوڑا جمال شاہی کھیلتی ٹولی کا شور اور پتّوں پر ٹپ ٹپ کرتے بارش کے قطروں کی موسیقی نے دلوں کو خوشی سے بھر دیا تھا۔

دوسری منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی کے شیشے سے دادا جان اپنے خاندان کے ستاروں کو دمکتا دیکھ رہے تھے۔ املی کا بوڑھا درخت اپنے وسیع دامن میں لہلہاتے ان پھولوں کو دیکھ کر خوشی سے جھوم رہا تھا۔



سیدہ غزالہ نثار شاہ



ابھی ہمیں سوئے ہوئے ایک ہی منٹ گزرا ہوگا (یہ ہمارا خیال ہے) کہ ہمیں محسوس ہوا کہ اچانک زلزلہ آگیا ہے مگر اگلے ہی لمحے ہمیں پتا چلا کہ زلزلہ نہیں آیا بلکہ امّی ہمیں جھنجھوڑ رہی ہیں کہ "غزالہ بٹیا اٹھو" ہم نے نیم وا آنکھوں سے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی تو تارے چمک رہے تھے "امّی ابھی تو رات ہے" ہم نے ٹھنک کر کہا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

امّی دوبارہ ہمیں اٹھاتے ہوئے گویا ہوئیں "ارے بھئی اٹھو نا آج عید ہے اور پانچ بج چکے ہیں صبح کے" "ارے عید" ہم چھلانگ لگا کر بستر سے اترے اور فٹافٹ امّی سے عید ملنے لگے "اوہو" امّی ہمیں پیچھے کرتے ہوئے بولیں "بس کرو چلو گھر میں کافی کام ہے" کام! کام سے تو ہماری روح فنا ہوتی ہے" ساتھ ہم جب بھی کوئی کام کرتے ہیں تو ہمیں پتا نہیں کیوں نیند آنے لگتی ہے۔ خیر مرتے کیا نہ کرتے، ہمیں کام کرنے پڑے۔

کوئی ڈھائی گھنٹے میں گھر شیشے کی طرح چمک اٹھا۔ مگر ہم! ہم کسی الف لیلےٰ کے جن کا منظر پیش کر رہے تھے (کیوں کہ ہم بہت ہی میلے ہو رہے تھے) چچا گزرے اور ایک نظر ہم پر پڑی تو مسکرا اٹھے۔ امّی سے کہنے لگے کہ "بھابھی ایک واشنگ پاؤڈر کا ڈبا مشین میں ڈال کر ذرا غزالہ کو بھی دھو دیں۔ ورنہ بچے ڈر جائیں گے" اور ہم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

سویّاں دینے دلانے اور کھانے کے بعد ہم اپنی سہیلیوں کے انتظار میں لگ گئے مگر شومئ قسمت تھوڑی ہی دیر بعد ہماری چھوٹی بہنوں ارم اور شازیہ کی سہیلیاں آدھمکیں اور یوں محسوس ہوا کہ ایک طوفان بدتمیزی چلا آیا ہے۔ اب خاطر تواضع تو ہم کو ہی کرنی پڑی۔

وہ سموسے پکوڑے چاٹ اور سویّاں وغیرہ کھا بھی رہی تھیں اور گرا بھی رہی تھیں۔ ہم

لڑکی کے پیچھے پیچھے کھڑے تھے اور بکرے کی حالت زار دیکھ کر ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ہم نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ شاید ارم اور شازیہ صفائی کریں مگر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جا رہی ہیں (ظاہر ہے کہ ہم انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے) تو مجبوراً ہم نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں ہنستے مسکراتے ہوئے رخصت کیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ان سب کا خون پی لیں مگر ہم ڈریکولا نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنے آپ کو کوستے ہوئے دوبارہ صفائی پر آدھا گھنٹہ برباد کیا۔

ابھی ہم نہانے کا قصد کر ہی رہے تھے کہ ڈرائنگ روم سے چچا صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ "میرے اور کاشف کے دوست آئے ہیں۔ جلدی سے چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔" وہ تو یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مگر ہم خوب سمجھتے تھے کہ چائے کے ساتھ وغیرہ کا کیا مطلب ہے۔ خیر ہم نے تمام لوازمات کے ساتھ چائے بھجوا دی اور غسل خانے کی طرف بڑھتے ہوئے سکھ کی سانس لینے کا ارادہ کیا مگر ابھی سکھ کا سانس آدھا ہی لیا تھا کہ ساتھ والی خالہ اپنے درجن بھر بچوں سمیت عید کی مبارک باد دینے آ گئیں دوسری طرف امی آتی دکھائی دیں۔ بس ہم کھسکنے ہی والے تھے کہ خالہ کے بچوں نے کورس کے انداز میں کہنا شروع کر دیا "ہم سویاں کھائیں گے" "ہم سویاں کھائیں گے" خالہ نے کہا "ارے ہے۔ جاؤ بیٹیا باجی سے لو۔" اس نئی افتاد سے ہم بہت گھبرائے اور یوں محسوس ہوا کہ ہمارا دل سینے سے پیٹ کی طرف ہجرت کر رہا ہے۔ مگر ہم نے کمال ہمت سے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کچن کی طرف چلنے لگے۔ تاکہ ان عفریتوں سے جلد از جلد نجات حاصل کر لیں۔

ابھی بچوں نے سویاں ختم ہی کیں کہ خلاف توقع خالہ مسکراتی ہوئی آ گئیں اور بچوں کو ساتھ لے کر چلتی بنیں۔ ہم نے آسمان کی طرف منہ کر کے حیرت سے کہا "یا اللہ یہ کیسا معجزہ ہوا ہے جو خالہ آدھے گھنٹے ہی میں چلی گئیں اور ہم یہ کہتے ہوئے نہانے کے لیے چل دیے مگر نہانا ہماری قسمت میں کہاں۔ کیوں کہ ہماری آدھی درجن سہیلیاں خراماں خراماں گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہم فوراً غسل خانے کی طرف لپکے کہ چلو منہ ہی دھو لیں۔ مگر جب ہم نے نلکا کھولا تو ہماری سانس ہی رک گئی کیوں کہ پانی ندارد۔ پانی والوں کو برا بھلا کہتے ہوئے ہم باہر آ گئے۔ اتنی دیر میں وہ سب کی سب ہم تک پہنچ

چکی تھیں وہ ہمیں دیکھ ذرا سا رکیں ان میں سے زیبا نے کہا" بی بی ذرا غزالہ کو اطلاع کر دیا کہ اس کی سہیلیاں اس سے ملنے آئی ہیں"

"اوہ" ہمیں ایسا لگا کہ زمین ہمارے پیروں تلے سے کھسک رہی ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیں کوئی ملازمہ سمجھی تھیں۔ ابھی ہم شرمندہ ہو ہی رہے تھے کہ شاہدہ نے ہمارے چاند سے چہرے کو تھوڑی سے پکڑ کر اونچا کرتے ہوئے کہا "محترمہ آپ ہی مس غزالہ ہیں" اور شاید تارکول کے ڈرم میں ڈبکی لگا کر آئی ہیں" فرحانہ نے ٹکڑا لگایا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ان سب سے گپ شپ میں دو تین گھنٹے چٹکی بجاتے گذر گئے اور ہمیں احساس ہی نہ ہوا۔

پانچ بجے ان کی رخصتی ہوئی اور ابو کے دوستوں کی آمدرات دس بجے خدا خدا کر کے ہم فارغ ہوئے۔ ٹی وی کے سارے اچھے پروگرام نکل چکے تھے۔ ہم نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو ہم غزالہ کم اور معجون زیادہ دکھائی دیئے۔ ہم بری طرح تھک چکے تھے پھر ہم اپنے تمام اعضائے ناتواں سمیٹتے ہوئے بستر پر دراز ہو گئے اور عید کے نئے کپڑے جو ہم نے بڑے چاؤ سے اپنے لیے بنوائے تھے انھیں پہننے کی حسرت دل میں لیے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں ہم خوابوں کی دنیا میں کھو گئے۔



"بچوں کی کوشش" کے لیے

آپ جب بھی کوئی کہانی یا مضمون لکھیں تو کاغذ کے ایک طرف اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اس طرح آپ کی کہانی جلد چھپے گی۔ ورنہ تاخیر ہوگی۔ آپ اسی کالم میں اپنے دوست کی سالگرہ، امتحان میں کامیابی، عید کی مبارک بھی دے سکتے ہیں، اپنے اسکول کے دلچسپ واقعات بھی لکھ سکتے ہیں اور اپنے سفر کی روداد بھی، دوسروں کی لکھی ہوئی دلچسپ تحریریں بھی بھیج سکتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی تحریروں میں مصنف کا نام لکھنا نہ بھولیے گا۔

معلومات کی دنیا

● دنیا کا سب سے طویل برقی ریلوے نظام روس میں ہے۔

● دنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر نیویارک امریکہ میں ہے۔

● دنیا کا سب سے بڑا پارک کینڈا کا نیشنل پارک ہے رقبہ ۱۷۳۰۰ مربع میل

● دنیا کی سب سے بڑی مسجد دمشق میں ہے۔

● جب گواسکر نے کانپور میں لنکا کے خلاف کھیلتے ہوئے اپنی ۳۴ سنچری بنائی تو وہ ہر ملک کے ہر کرکٹ گراؤنڈ پر جہاں کرکٹ کھیلی جاتی ہے سنچری بنانے والے پہلے کھلاڑی ہو گئے۔

● قرآن مجید میں سورۂ توبہ واحد سورہ ہے جس سے قبل بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہے اور سورۂ کوثر واحد سورہ ہے جس میں حرف "م" نہیں ہے۔

● ہم ایک وقت میں آسمان پر

ہیں۔

● بھاپ کے انجن کا موجد اسٹیفن تھا۔

● ٹیلیفون کے موجد کا نام گراہم بل تھا۔

● انسان کے جسم میں کل ۲۰۶ ہڈیاں ہوتی ہیں۔

● دنیا کی سب سے قیمتی کرسی اٹلی کے پوپ پال کی ہے۔ جس کی مالیت ۲۷ لاکھ پونڈ ہے۔

● دنیا کا سب سے بڑا پھول انڈونیشیا میں کھلتا ہے جس کا وزن $8\frac{1}{2}$ سیر ہوتا ہے۔

● ڈومینکا جزیرے میں مردوں کی بولی الگ عورتوں کی الگ ہے۔

● جسم میں خون کی رفتار ۱۲ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

● آواز کی رفتار گیارہ سو فٹ فی سکنڈ ہوتی ہے

● کرکٹ کا کھیل اہل مصر نے ایجاد کیا۔

● ۱۸۱۶ء کا واقعہ ہے کہ فرانس میں ایک بلی نے چوہے کا بچہ پال پوس کر بڑا کیا۔

● ٹامس شرائی گر نامی جرمن مصور ہاتھوں سے معذور اور فالج کا شکار تھا۔ پیروں سے قلم اور برش پکڑ کر تصویر بناتا تھا۔

● انسان نے چاند پر ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء میں

شکاری پرندوں کی پہچان

خم دار چونچ اور تیز ناخن ہیں

(دانش ور عمر پراچہ)

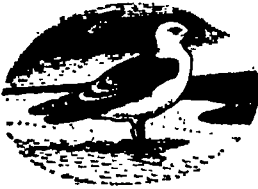
زمین کی تہوں میں کچھ پرندوں کے ڈھانچے پائے گئے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پرندے اپنی موجودہ ہیئت میں زمین پر



تقریباً دس لاکھ برس سے موجود ہیں پرندوں کی کئی قسمیں ختم ہو چکی ہیں مثلاً ڈوڈو، عظیم آک اور مسافر کبوتر جیسے جیسے انسان نے ترقی



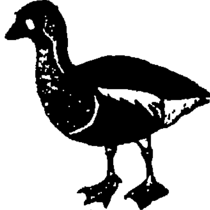
کی پرندوں کی رہائش پر گہرا اثر پڑا، شہر بڑھتے گئے۔ کیڑے مارنے کی دواؤں سے پرندوں کی غذا کو مہلک بنایا گیا۔ انسان نے پرندوں سے کئی کام لیے ہیں۔ گوشت اور انڈے کو اپنی خوراک میں شامل کیا ہے۔ ایشیا میں بعض پرندوں کے گھونسلوں کا سوپ بنایا جاتا ہے۔ کئی کو پالا جاتا ہے۔



ابتدا میں انسان نے پرندوں سے اپنے جسم کی آرائش کی۔ مغربی نسوانی لباس میں بھی پروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ پرندوں کو پنجروں میں رکھا گیا۔ بعض کی آواز بہت سریلی



ہوتی ہے۔ بعض بات چیت کرنا بھی سیکھ جاتے ہیں راج ہنس کو تالاب میں رکھا جاتا ہے باز شکرہ



اور عقاب سے چھوٹے جانوروں اور پرندوں کا شکار کیا جاتا ہے۔ پرندوں کے ذریعے پیغام

بھی بھیجے گئے ہیں۔ پرندوں کے خاندان الگ الگ جداگانہ ہیں۔ شتر مرغ رہی۔ ایمو اور کیوی اڑ نہیں سکتے۔ پنگوئن کے پر اڑنے کے لیے بیکار ہیں لیکن تیرنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔

ٹینا مو۔ گریب اور لون سب پانی کے پرندے ہیں۔ قارورس۔ سطح آب اور پیٹرل ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ لیکن سب کی چونچ نلکی کی طرح ہوتی ہے۔ ایک اور قسم کے پرندوں کے جال نما پنجے سامنے کی طرف ہوتے ہیں یہ حواصل، بوبی، گینیٹ اور فریگیٹ چڑیا ہیں بگلا، آئبس، سارس اور لم ڈھینگ پایاب پانی کے پرندے ہیں۔ شکاری پرندوں کی پہچان ان کی خم دار چونچ اور تیز ناخن سے کی جاسکتی ہے۔ عقاب، باز، منشی چڑیا اور کونڈر سان کے چند نمونے ہیں۔ مرغ خاندان کے پرندوں کے پنجے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ ان سے یہ زمین کریدتے رہتے ہیں۔ تیتر، گراؤس گنی فول اور مور اسی خاندان کے ہیں۔

ڈھومرا اور آک ساحلی پرندے ہیں جو تقریباً ہر علاقے میں ملتے ہیں۔ کبوتر خاندان کے پرندے خشکی پر رہنے والے ہیں۔ یہ سر اٹھائے بغیر پانی پی سکتے ہیں۔ توتے کے خاندان میں طرح طرح کی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ کوکوٹو، میکو، لوری اور پیارٹ چڑیا خط استوا کے رہنے والے ہیں۔ ان کے پیر کی دو انگلیاں آگے اور دو دو پیچھے ہوتی ہیں ان کے پیر رنگ برنگ کے ہوتے ہیں گکو اور رولر کو ایک اور خاندان ہے۔

الورت کا شکاری پرندہ ہے۔ رات بکار اور مینڈک منہ رات کے پرندے ہیں۔ ابابیل اور غنغناقی چڑیا کی اڑان بہت اچھی ہوتی ہے۔ چھوٹے پرندوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ان کو پر چنگ چڑیا کہتے ہیں۔ یہ گوریا، روبن جنڈول اور بلبل ہیں۔ بہشتی چڑیا کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان کے پر لاجواب ہوتے ہیں۔ موٹ موٹ اور شاہ مچھیرا کے پر شوخ اور چونچ نرالی ہوتی ہے۔ ہدہد اور ٹوکون ایک اور خاندان ہے۔ ان کی ٹانگیں بہت ہی مضبوط ہوتی ہیں۔ ٹروگن خاندان کا ایک پرندہ کوئے زل ہے جس کی دم سبز اور بہت لمبی ہوتی ہے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں؟

سوال۔ دنیا کے کسی ایسے ملک کا نام بتایئے جو کسی بھی بین الاقوامی دفاعی معاہدے میں شریک نہ ہو نہ ہی اس کا کسی کے ساتھ جھگڑا ہوا اور نہ ہی اقوام متحدہ کا ممبر ہو!

جواب۔ سوئٹزرلینڈ۔

سوال۔ انگولا پر پرتگالیوں نے کب قبضہ کیا؟

جواب۔ ۱۵۷۴ء میں۔

سوال۔ انگولا کا رقبہ اور آبادی کتنی ہے؟

جواب۔ رقبہ ۲۴۶،۱ ملین مربع کلومیٹر (ایک ملین دس لاکھ) آبادی ۹۶ء۵ ملین۔

سوال۔ افریقہ کے مغربی ساحل کی کسی ایک بڑی بندرگاہ کا نام بتایئے؟

جواب۔ لوآنڈا۔

سوال۔ مالٹا نے جمہوریہ بننے کا اعلان کب کیا؟

جواب۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو۔

سوال۔ دنیا کے کسی ایسے شہر کا نام بتایئے جس کے عوام دن بھر کشتیوں میں سفر کرتے ہیں؟

جواب۔ وینس۔

سوال۔ قطب شمالی میں ایک سال میں صرف ایک بار سورج طلوع اور ایک ہی بار غروب ہوتا ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہاں کن تاریخوں میں سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے؟

جواب۔ طلوع ۲۱ر مارچ اور غروب ۲۱ر ستمبر۔

سوال۔ کرزن لائن کن دو ممالک کے مابین واقع ہے؟

جواب۔ روس اور پولینڈ کے مابین جو نکہ اس کی تجویز کا سہرا برطانیہ کے وزیر خارجہ

لارڈ کرزن کے سر ہے اس لیے اس کو کرزن لائن کہا جاتا ہے۔

سوال۔ فرانس کی دلھن اور سات پہاڑیوں کا شہر کن شہروں کو کہا گیا ہے؟

جواب۔ پیرس اور روم کو۔

سوال۔ ہاٹ لائن سے کیا مراد ہے؟

جواب۔ روس اور امریکہ کے مابین مواصلاتی رابطہ کو ہاٹ لائن کا نام دیا گیا ہے۔ یہ لائن ۱۹۶۳ء میں معاہدہ جنیوا کے تحت قائم کی گئی اسس لائن کے ذریعے امریکہ کے صدر اور روس کے وزیر اعظم دنیا کے کسی ایسے مسئلہ پر گفت وشنید کرتے ہیں جو امن کے لیے خطرے کا باعث بن رہا ہو۔

سوال۔ ۱۰ء بارش کا مطلب کیا ہے؟

جواب۔ ایک انچ بارش کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایکڑ رقبہ میں ایک سو ٹن (۲۸ سومن) پانی جمع ہوا ہے۔

سوال۔ برطانیہ کا شہر کارڈیف کیوں مشہور ہے؟

جواب۔ اس لیے کہ یہ کوئلہ کی بندرگاہ کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔

سوال۔ دنیا کی سب سے چھوٹی خود مختار ریاست کا نام بتائیے؟

جواب۔ واٹیکن سٹی سٹیٹ۔

سوال۔ رود بار انگلستان کتنی چوڑی ہے؟

جواب۔ ۳۲ کلومیٹر تنگ ترین جگہ سے۔

سوال۔ انگلستان کا ایک ضلع بلیک کنٹری کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے کیا آپ اس کی وجہ تسمیہ بتا سکتے ہیں؟

جواب۔ یہ گرد و غبار اور کوئلہ کی وجہ سے کہلاتا ہے اس علاقہ میں کوئلے اور لوہے کی کانیں ہیں۔

سوال۔ ایسے جغرافیائی نام بتائیے جن کے ناموں کے ساتھ رنگوں کے نام بھی ظاہر ہوتے ہیں؟

جواب۔ گرین لینڈ، بحیرہ احمر، سفید نیل، نیلا نیل، زرد دریا، زرد سمندر ●●

ماں کی نصیحت

عبدالغنی شمس

یہ سچ ہے بُروں سے بُرائی ملے گی
کہاں کی دفا بے وفائی ملے گی
بہت سی تمھیں جگ ہنسائی ملے گی
یہ ماں کی نصیحت سدا یاد رکھنا

سبھی سے تم اخلاق سے پیش آنا
غریبوں کو اپنے گلے سے لگانا
ہمیشہ یہاں امن کے گیت گانا
یہ ماں کی نصیحت سدا یاد رکھنا

ہمیشہ بُرائی سے دامن بچانا
کسی کو جہاں میں نہ ہرگز ستانا
زمانے سے ظلم و ستم کو مٹانا
یہ ماں کی نصیحت سدا یاد رکھنا

کبھی بھول کر بھی عداوت نہ کرنا
کسی سے زمانے میں نفرت نہ کرنا
دکھاوے کی ہرگز محبت نہ کرنا
یہ ماں کی نصیحت سدا یاد رکھنا

دکھی جو بھی ہوں ان کے تم کام آنا
جو بھوکے ہوں ان کو کھلا کر ہی کھانا
جو روتے رہے ہیں انھیں تم ہنسانا
یہ ماں کی نصیحت سدا یاد رکھنا

خبردار انصاف پر چلتے رہنا
جو دُکھ پہنچے اِس راہ میں اس کو سہنا
جو سچ ہو وہی بات بے خوف کہنا
یہ ماں کی نصیحت سدا یاد رکھنا

بُروں کو نہ دوست اپنا ہرگز بنانا
کبھی ان کی چاہت سے دھوکا نہ کھانا
کبھی ان کی محفل میں پیارے نہ جانا
یہ ماں کی نصیحت سدا یاد رکھنا

ایک برتن
کُکر

افق دہلوی

اتنا دباؤ بڑھ جاتا ہے
سٹو سے اوپر چڑھ جاتا ہے
پڑتا ہے جو اثر باہر کا
پڑے ہے کھولاؤ اندر کا
چیزیں اس سے گل جاتی ہیں
حفظِ وٹامن بھی کرتی ہیں
مرتے ہیں جرثومے اس سے
افق فوائد ہیں یہ کُکر کے
برتن ایک کُکر ہے ایسا
لگتا ہے جو ہنڈیا جیسا

بچّوں کی مذہبی کتابیں

حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/-	ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۴/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل)	۴/۰
حضرت فریدالدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیرالبحر	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/۰
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	-/۴۰	ارکانِ اسلام	۲/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	عقائدِ اسلام	۳/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	چار یار	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا اوّل	۴/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	خلفائے اربعہ	۹/۵۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	نبیوں کے قصے	۵/
اللہ کے صفی	۲/۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
قاعدہ یسّرنا القرآن	۲/۲۵	سرکارِ دوعالمؐ	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

[illegible] پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریاگنج، نئی دہلی

SANCTUARY'S WONDERWORLD

تصویریں: غلام حسین

ریچھوں کی اس صلاحیت سے تو ہم سب واقف ہیں کہ جب سرما کے موسم میں غذا کی قلت ہوتی ہے تو اپنے METABOLIC نظام کو سست کر کے [illegible] کئی ماہ تک گوشے میں پڑے رہتے ہیں۔ حال ہی میں سائنسدانوں نے ان کی ایک نئی خوبی کا پتہ چلایا ہے جو انسان کی بقا کے لیے بہت کارآمد ہے [illegible] کہ اس دوران یعنی سرما کے موسم میں طویل نیند کے دوران ان کے جسم [illegible] کو قابل استعمال [illegible]

سائنسدان [illegible] کی کوشش [illegible] CHOLESTROL [illegible]

[illegible]

اورکس (ORYX GAZELLA) اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے کسی مقابلہ آرائی نہیں کرتا۔ لیکن اپنی مادہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لڑائی ضرور کرتا ہے۔ لیکن اس جنگ کے دوران بھی وہ بڑی شائستگی کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے سینگ تلوار کی [illegible] لیکن وہ اپنے سینگوں کو اس طرح سے ترچھا کر کے اپنے حریف پر [illegible] بلکہ وہ اورکس اپنے سینگوں کو [illegible] نیچے کی تصویر میں بتایا گیا ہے [illegible]

بچوں کے لیے

نئی اور دلچسپ کتابیں

		پہاڑی کی چوٹی پر	۵/۰۰	مسلمان پہیلیاں	۴/۰۰
		رنگوں کی بستی	۲/۵۰	پیارے رسول	۴/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/۰۰	سرخ جوتے	۲/۰۰	چار یار	۴/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۶/۰۰	سلام و مصافحہ	۴/۵۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰۰
اندھے کا بیٹا	۲/۵۰	شرارت	۲/۰۰	ہار کی تلاش	۶/۰۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰	صحت کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰	بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
جنگل کی ایک رات	۴/۰۰	صحت کی الف بے	۳/۰۰	بندر اور نائی	۲/۵۰
سہانے ترانے	۴/۵۰	جدید پہیلیاں	۶/۰۰	بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
ہرن کا دل	۲/۰۰	سپیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰	تاک دنادن تاک کے سے	۱/۵۰
اچھی کہانیاں	۲/۵۰	ننھا فرشتہ	۴/۵۰	پانچ بونے	۱/۵۰
دریا کی رانی	۲/۰۰	نیلا ہیرا	۴/۵۰	ایک دیس ایک خون	۳/۰۰
گوہر شہزادی	۳/۰۰	ماں کی کھیتی	۲/۵۰	جیت کس کی؟	۲/۵۰
شریر شیرا	۳/۰۰	ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰	انعامی مقابلہ	۳/۲۵
پری رانی	۳/۰۰	سرکار کا دربار	۴/۵۰	جادو کا گھر	۱/۵۰
خطرناک سفر	۳/۵۰	دنیا کے جانور	۲/۵۰	چیونٹی رانی	/۵۰
اندرا گاندھی	۴/۵۰	آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰	روٹی کس نے پکائی	/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰	اس نے کیا کرنہ جانا	۱/۲۰	لال مرغی	/۵۰
ننھا ہیرو	۲/۵۰	خرگوش کی چال	۲/۵۰	لومڑی کا گھر	/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۰۰	طوطوں کا جہاز	۶/۰۰	مدورانا پردیس چلے	/۵۰
پلک نہ مارو	۴/۰۰	جوہر قابل	۲/۰۰	ہیپو چیو	۵۰
ایک کھلا راز	۳/۰۰	خرگوش کا سپنا	۵/۰۰	بھیڑیے کے بچے	۰
بابا نامع	۲/۰۰	موم کا محل	۴/۰۰	شیر خاں	۰
بچوں کے افسر	۵/۰۰	محمد شفیع الدین نیّر	۷/۵۰	لومڑی کے بچے	۰

دلچسپ خبریں

ربڑ نما شخص

نیویارک کے ایک شخص جیمس مارس کی جلد بے حد لچک دار تھی جو ایک فٹ سے زیادہ کھینچی جا سکتی تھی۔ جیمس مارس نے کئی برسوں تک بازیل کے سرکس کے ساتھ سفر کیا۔ مارس جولائی ۱۸۵۹ء میں نیویارک میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک حجام کی حیثیت سے شروع کی۔ ۱۸۸۲ء میں اس نے سرکس کمپنی کے ساتھ امریکہ اور یورپ کا دورہ کیا اور اپنے سینے کی جلد کو سر کے اوپر تک کھینچ سکتا تھا اور اپنی ایک ٹانگ کی جلد دوسری ٹانگ کے گرد لپیٹ سکتا تھا۔ اس کے باوجود اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کتوں کا ٹیکس

فرانس میں ایک ایسا علاقہ ہے جس میں کوئی بھی ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا۔ سوائے ایک ٹیکس کے اور وہ ٹیکس کتوں کا ہے۔

لمبی سزا

بعض ملکوں میں مجرموں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی لمبی عمر پاتے ہیں اور شاید اسی لیے انھیں بڑی بڑی طویل قید کی سزائیں دی جاتی رہیں۔ اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ کی بات ہے کہ ایک آدمی نے دو سو ستر جعلی دستاویزیں بنائیں وہاں اس قسم کے ایک جرم کی سزا چودہ سال قید ہے۔ چنانچہ اس شخص کو کل ۳۸۰۲ سال کی سزا کا حکم سنایا گیا۔

(ساجد کھالوی)

اقوال زریں

- خدا کا نام سب سے عظیم ہے۔
- دنیا کی سب سے عظیم ہستی ماں ہے۔
- دنیا کی سب سے عظیم کتاب قرآن مجید ہے۔
- دنیا کا سب سے عظیم مذہب اسلام ہے۔
- دنیا کی سب سے عظیم قوم مسلمان ہے۔
- دنیا کی سب سے عظیم دعوت اذان ہے۔
- دنیا کی سب سے عظیم زبان عربی ہے۔
- دنیا کا سب سے عظیم اجتماع حج مبارک کا ہے۔
- دنیا کا سب سے عظیم شہر مکہ مکرمہ ہے۔

(مرسلہ سعید احمد ساگر)

بچوں کی گوشۂ



راہ خدا

حضرت موسیٰ علیہ اسلام سے ایک شخص نے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے میری تمام زندگی کا جو رزق متعیّن فرمایا ہے اور جو مجھ کو موت آنے تک ملتا رہے گا۔ اب میری خواہش ہے کہ وہ تمام مجھ کو ایک ساتھ دے دیا جائے۔ تاکہ میں روز روز کی فکر کو ختم کر سکوں۔" حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے جواب دیا۔ "تم اس کو موت سے پہلے ہی ختم کر دو گے۔ کیونکہ اللہ کی تقسیم کے مطابق تم تقسیم نہیں کر سکتے" ۔اس نے عرض کیا۔" خدا کو تو آخر دینا ہی ہے۔ اگر میں برباد کر دوں گا تو اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔" موسیٰ علیہ اسلام نے سفارش کر دی اور اللہ تعالیٰ نے باقی تمام زندگی کا رزق اس کو ایک دن میں عطا کر دیا۔

اس شخص نے شہر میں اعلان کر دیا کہ جس شخص کو جس چیز کی ضرورت ہو بے قیمت میرے گھر سے اللہ کے واسطے لے جائے۔ شہر کے لوگوں نے دم بھر میں اس کا مکان خالی کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے پوچھا" اب باقی زندگی تم کیسے گزارو گے اس لیے کہ اب دنیا میں تمہاری قسمت کی کوئی چیز نہ رہی" اس نے جواب دیا" مجھ کو اس بات سے خوشی ہے کہ میری زندگی کا سرمایا میرے سامنے اللہ کے واسطے دوسروں نے کھایا"

دوسرے دن اس شخص کے مکان پر ہر چیز دس گنا موجود تھی۔ وہ بھی اس نے اسی طرح لٹا دی حضرت موسیٰ نے خداوند کریم سے عرض کیا" اس کی قسمت کا سارا حصہ پہلے دن مل چکا تھا دوسرے دن اس سے زیادہ عطا ہوا! جب کہ قسمت سے زیادہ نہ ملنا چاہیئے تھا۔" حکم ہوا موسیٰ (علیہ السلام)

پہلے دن اس کی قسمت کا حصہ تھا جو اس نے ہمارے ہاتھ فروخت کر دیا میں نے دوسرے دن مع منافع کے واپس کر دیا۔ دوسرے دن والے مال کا تعلق قسمت سے نہیں تجارت سے ہے۔ جو میرے ساتھ کی گئی

اللہ تعالیٰ غیور ہے کریم ہے سخی ہے کوئی اس کے نام سے دے اور وہ اس کا بدلہ نہ دے یہ ناممکن ہے جس شخص نے اپنی کمائی کا حصہ دوسرے طریقے سے صرف کیا وہ ضائع گیا لیکن جس نے اللہ کے نام پر دیا وہ ایسے بینک میں جمع ہو گیا جس کا نفع دس گنا دنیا میں ملے گا اور ستر گنا آخرت کے لیے محفوظ ہو گیا

افسوس ہم خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کوتاہی کرتے ہیں جب کہ یہ ایسا بینک ہے جس سے بہتر دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

جب حشر کے دن اس بینک کا حساب کیا جائے گا۔ جس میں ہم آپ نے کبھی کبھی دو چار پیسے جمع کیے ہیں تو افسوس ہوگا کہ ہم نے اپنی کمائی کا بیشتر حصہ کیوں نہ جمع کیا جس کا معاوضہ آج اسقدر ہوتا کہ ہم سے سمیٹتے نہ بنتا۔

محمد اعظم مرزا اتر پردیش

"محنت کا پھل"

تبسم اور ترنم دونوں شاہد کی بھتیجیاں تھیں۔ دو سال سے دونوں مدرسہ جا رہی تھیں۔ مگر اب تک ان سے الف ب، کی کتاب ختم نہیں ہوئی تھی۔ شاہد انھیں روز دھیان سے پڑھنے کی تاکید کرتا۔ اور جب بھی اسے پتہ چلتا کہ دونوں بہنیں پڑھنے سے کتراتی ہیں تو وہ بہت غصہ ہوتا۔ اور اپنا سارا غصہ بھابی پر اتارتا۔ اس کی بھابی دیہات کی تھیں اور ان پڑھ بھی!۔ اسی لیے وہ بچوں کی تعلیم پر حسب ضرورت توجہ نہ دیتی تھیں۔ شاہد اور اس کے بھائی کے لاکھ سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ بچوں پر خاطر خواہ دھیان نہ دے پاتیں۔ جس کی وجہ سے بچے شریر اور پڑھائی کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے تھے۔ شاہد کی بڑی خواہش ہوتی کہ دوسرے بچوں کی طرح اس کی

بھتیجیاں بھی اسے انکل کہیں اور اس کے ساتھ ادب و تمیز سے پیش آئیں۔ وہ انھیں بہت سمجھاتا۔ بات چیت کرنے کے طور طریقے بتاتا۔ اٹھنے بیٹھنے کے ڈھنگ سکھاتا بڑوں کو سلام کرنے اور ان کے ساتھ ادب سے پیش آنے کی ہدایت دیتا۔ مگر اس کی ساری کوششیں رائیگاں جاتیں بچوں کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ بہت پریشان ہوجاتا اور جب اسے حد سے زیادہ کوفت ہوتی تو انھیں بری طرح پیٹ دیتا۔ مگر بچے تو جیسے مار کھانے کے عادی ہو گئے تھے گھر میں ماں اور شاہد بری طرح پیٹتے اور مدرسہ میں مولوی صاحب۔

جب شاہد یہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ تبسم اور ترنم کی پڑھائی کے سلسلے میں اسے ہی کچھ کرنا ہوگا تو اس نے ان کی پڑھائی کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ اب وہ روزانہ خود ہی دونوں بہنوں کو پڑھانے لگا۔ شروع شروع میں اسے بڑی تکلیف ہوئی۔ اسے بڑا غصہ آتا مگر وہ ضبط کر جاتا۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ مارنے سے بچے ڈر جاتے ہیں اور ڈر کے مارے جو یاد رہتا ہے بھی بھول جاتے ہیں۔ اس لیے اس نے پیار سے پڑھانا شروع کیا۔ دونوں کی کوشش سے اسے یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ اب دونوں بہنیں پڑھائی میں پورا دھیان دے رہی تھیں۔ وہ پڑھنے بلائے حاضر ہوجاتیں اور سبق بھی روزانہ یاد رکھتیں۔ شاہد انھیں مارنے کے بجائے پیار سے سمجھاتا۔ انھیں چاکلیٹ اور مٹھائیاں دیتا۔ کبھی کبھی ہلکی پھلکی ڈانٹ پلا دیتا۔ بچے بھی اس سے بہت مانوس ہو گئے۔ جب وہ باہر سے آتا تو دونوں انکل کہہ کر اس سے لپٹ جاتیں۔ اب بچے اس کی ہر بات مانتے اور غور سے اس کی باتیں سنتے۔ اس پر عمل بھی کرتے۔ وہ ہفتہ میں ایک دن انھیں سیر کے لیے لے جاتا اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ اب شاہد نے محسوس کیا کہ بچوں میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ اب وہ بات چیت کرنے کے طور طریقے بھی سیکھ گئے تھے۔ جو بھی شخص گھر میں آتا اسے فوراً سلام کرتے۔ شاہد کو اپنی محنت کا صلہ مل گیا تھا جو کام غصے سے نہیں ہوتا وہ محنت اور پیار سے ہوجاتا ہے۔

جمیل ارشد ۲ ترہٹہ بازار

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

اگست ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۸

قیمت فی پرچہ : 3/50 سالانہ =/30

غیر ممالک سے : نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز : بارہ ڈالر

فی پرچہ : ایک ڈالر

اڈیٹر : شاہد علی خاں

صدر دفتر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ اُردو بازار ۔ دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۱

بچّوں سے باتیں

(گذشتہ سے پیوستہ)

دفتر میں آپ کے اڈیٹر صاحب کی حیثیت ایک بزرگ کی تھی لیکن ایسے بزرگ کی نہیں، جس سے بات کرتے وقت، زبان لڑکھڑانے لگے، جسم کانپنے لگے بلکہ ان سے بات کرنے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنے کسی بے تکلف دوست سے بات کر رہا ہے۔ ایسے بزرگ دوست اب مشکل ہی سے ملیں گے۔

شاید یہ بات آپ کے علم میں نہ ہو کہ ولی صاحب کے ذمّے صرف پیام تعلیم اور کتاب نما کا کام ہی نہیں بلکہ دفتر کا پورا انتظام انھیں کے ہاتھ میں تھا۔ اور یہ سارے کام وہ اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے کہ سب کو حیرت ہوتی تھی۔

ولی صاحب کا انتقال کیا ہوا، جیسے ادیبوں، صحافیوں کی لائن لگ گئی۔ ممتاز صحافی اور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس گئے۔ مہدی نظمی اور قمر مرادآبادی گئے۔ اس کے بعد جامعہ کے پُرانے استاد قیصر زیدی اور اب خبر ملی کہ مبشر علی صدیقی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان سب کے اہم ادبی کارناموں سے ہم آپ کو جلد ہی روشناس کرائیں گے۔

عید الفطر تو فسادات اور کرفیو کی نذر ہو گئی۔ خدا کرے اب ملک میں امن و امان رہے۔ ہماری طرف سے عید الاضحیٰ اور یوم آزادی کی پیشگی مبارک باد قبول کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

غنی دہلوی

پندرہ اگست



آزادی کا دن ہے بچو
آج خوشی کا دن ہے بچو

آزادی کا جشن منائیں
سازِ وطن پر نغمے گائیں
گونجیں جن سے پاک فضائیں

آزادی کا دن ہے بچو
آج خوشی کا دن ہے بچو

آزادی کا علم اٹھاؤ
اپنے وطن کی یاد مناؤ
دھرتی دھرتی گلشن تجاؤ

آزادی کا دن ہے بچو
آج خوشی کا دن ہے بچو

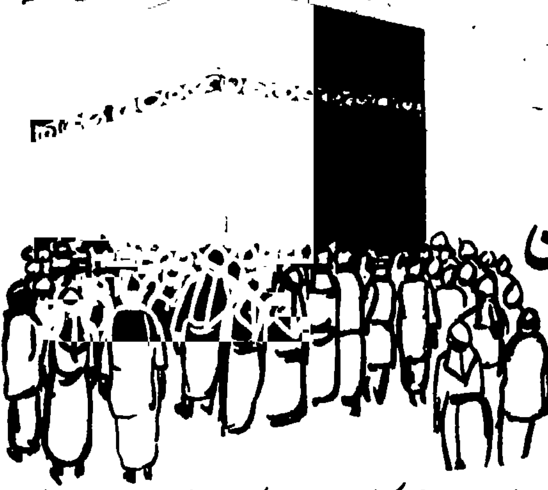
بام و دَر ہیں روشن روشن
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
بھر لو خوشی سے اپنا دامن

آزادی کا دن ہے بچو
آج خوشی کا دن ہے بچو

اپنی اُمنگیں اپنے جذبے
اپنے پھول اور اپنے غنچے
مہکے مہکے سارے رستے

آزادی کا دن ہے بچو
آج خوشی کا دن ہے بچو

شاہانہ الیاس



اسلام کا پانچواں رکن

حج

حج اسلام کا پانچواں اہم رکن ہے یہ سنہ ۹ ہجری کو فرض ہوا حج کے معنی مقصد اور ارادے کے ہیں۔ ہر سال لاکھوں فرزندانِ توحید حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ حج ہر مسلمان پر جو صاحب استطاعت ہو زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک ہی مرتبہ حج ادا فرمایا تھا۔ حج اور قربانی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد اور معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظیم یادگار ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ ہر وہ شخص بیت اللہ کا حج کرے جو زادِ راہ کی طاقت رکھتا ہو اور جس نے اللہ کی دی ہوئی استطاعت کے باوجود حج نہ کیا اور کفر کیا تو بلاشبہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔"

(سورۃ آلِ عمران آیت نمبر ۹۷)

جس طرح مسلمانوں پر نماز روزہ زکوٰۃ فرض ہے اسی طرح ساری زندگی میں مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے ایک بار حج فرض کیا۔ حج میں تمام عبادتیں اپنی اسی شکل اور روحانیت کے ساتھ یکجا ہوئی ہیں اس میں نماز بھی ہے۔ اگرچہ حاجی کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب عبادت میں شامل ہوتا ہے لیکن جو سکون نماز میں ملتا ہے وہ کسی چیز میں نہیں ملتا حاجی حج سے پہلے یا حج کے بعد مدینہ منورہ بھی جاتے ہیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت کرتے ہیں اور چالیس نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

حج میں زکوٰۃ سے بڑھ کر مالی قربانی بھی ہے اس کے بغیر حاجی حج کر ہی نہیں سکتا۔ حج کا اہم ترین

فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس عبادت کو کما حقہ ادا کرے اور اس کے تمام ارکان اور آداب کو ملحوظ رکھ سکے اخلاص اور قربیت اسے نصیب ہو جائے تو اس کے فیض اور برکت سے وہ شخص گناہوں سے مکمل طور پر پاک ہو جاتا ہے۔

حج کے دوران حاجیوں کے چہرے پر خدا کا نور ہی نور ہوتا ہے ان میں ایک نیا جوش جذبہ ہوتا ہے ان کے چہرے خوشی سے چمک رہے ہوتے ہیں ساری دنیا کے لوگ بیت اللہ حج کرنے آتے ہیں اس وقت نہ کوئی گورا ہوتا ہے نہ کوئی کالا نہ امیر اور نہ غریب نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا بلکہ سب خدا کے بندے اس وقت برابر ہوتے ہیں۔ اور سب فرزندانِ توحید سچے دل اور پورے خلوص کے ساتھ خدا کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ اور موقع بہ موقع یہ صدا بلند کرتے ہیں۔ حاضر ہوں اے اللہ۔ اے اللہ میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں اور دربار شاہی تیرے لیے ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلے حاجی خانہ کعبہ جاتے ہیں۔ خانہ کعبہ میں ایک پتھر لگا ہوا ہے جسے حجرِ اسود کہتے ہیں یہ جنت سے آیا ہوا پتھر ہے اس جگہ سے حاجی خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگاتے ہیں سات چکروں کا یہ مجموعہ طواف کہلاتا ہے خانہ کعبہ کے گرد کی مسجد کو مسجدِ حرام کہتے ہیں۔ حاجی طواف سے فارغ ہو کر مسجدِ حرام میں دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔

مسجدِ حرام سے باہر نکلتے ہی "صفا" اور "مروہ" کے درمیان دوڑتے ہیں یہ دوڑ "سعی" کہلاتی ہے سعی سے فارغ ہو کر حاجی مکے میں قیام کرتے ہیں۔ اور جب کبھی موقع ملتا ہے طواف کر کے ثواب کماتے ہیں ۸ ذی الحجہ کو مکہ چھوڑ کر منیٰ کے میدان میں چلے جاتے ہیں۔ رات وہاں گزارتے ہیں۔ دوسرے دن ۹ ذی الحجہ کو ظہر کی نماز سے پہلے "عرفات" کے میدان میں جاتے ہیں جہاں ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ عرفات کے بعد حاجی "مزدلفہ" جاتے ہیں جہاں حاجی مغرب اور عشاء کی نماز ساتھ پڑھتے ہیں۔

رات وہاں گزار کر حاجی منیٰ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور وہاں شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں یہ جو شیطان کو کنکریاں اس لیے ماری جاتی ہیں کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی تھی جس پر آپ نے اسے کنکریاں پھینک کر ماری تھیں اس لیے حاجی ان کی سنت کو ادا کرنے کے لیے منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ قربانی کرتے ہیں اور یہ قربانی حضرت ابراہیم کی سنت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک رات خواب میں دیکھا تھا کہ آپ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے پیارے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کی راہ میں قربان کر رہے ہیں اور آپ نے یہ خواب سچ کر دکھایا خدا کو آپ کی یہ قربانی بہت پسند آئی اس سے پہلے کہ آپ اپنے بیٹے پر چھری چلاتے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ ایک دنبہ بھیجا اور آپ نے اللہ کے حکم سے دنبے کی قربانی کی اسی دن سے لے کر آج تک تمام عالم مسلمان عید قرباں پر قربانی کرتے ہیں اور حاجی بھی اس کے بعد خانۂ کعبہ جاتے ہیں جہاں وہ طوافِ زیارت کرتے ہیں اور پھر وہاں سے آبِ زم زم اور کھجوریں تبرک کے طور پر اپنے ساتھ لاتے ہیں تاکہ دوسرے لوگوں کو وہاں کا تبرک پیش کر سکیں۔ خدا ہم سب کو بھی حج کی سعادت نصیب فرمائے۔ (آمین)

اندر سے

ہم اپنی اور اپنے پیامیوں
کی طرف سے

عظمت مآب جناب وینکٹ رمن صاحب

کو

آٹھویں صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر
دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں

اور

دعا کرتے ہیں کہ ان کا دورِ صدارت
ملک کی تاریخ میں زریں دور سے تعبیر
کیا جائے



محمد فرید خاں



چندا ماموں دور کے

چندا ماما دور کے
بڑے پکائیں بور کے

آپ سب بچوں نے یہ گیت یقیناً سنا ہوگا بلکہ یہ گیت ضرور گایا ہوگا۔

"دادی اماں کہتی ہیں چاند میں پریاں رہتی ہیں"

اس کے علاوہ دادی اماں نے آپ کو بھی بتایا ہوگا کہ چاند میں جو ہلکا سا عکس نظر آتا ہے وہ اس بڑھیا کا ہے جو اپنا چرخہ کات رہی ہے چاند بچوں اور بڑوں سبھی کے لیے ہمیشہ سے دلکشی کا موجب رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی چاند اور چاندنی پر بے شمار مضمون باندھے ہیں۔ ہماری شاعری بھی چاند کے ذکر سے بھری پڑی ہے لیکن محمد فرید خاں نے اپنے اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں چاند کیا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ۔

چاند کے بارے میں جو معلومات ہم پہنچائی جارہی ہیں وہ دنیا کے عظیم سائنس دانوں کی تحقیق اور تجسس کا نتیجہ ہیں سائنس دانوں نے اب سے کافی پہلے بڑی بڑی دوربینیں بنائی تھیں جن کی مدد سے وہ چاند کا مطالعہ کرتے تھے لیکن اب چاند ہم سے دور نہیں رہا بلکہ انسان کے بڑھتے ہوئے قدم چاند کی سرزمین تک پہنچ چکے ہیں۔

بچو! جس طرح نیلے آسمان پر بے شمار ستارے جھلملاتے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح چاند بھی روشن ہوتا ہے دراصل جھیل کی طرح چاند بھی ایک ستارہ ہے لیکن بہت بڑا ہے ہندا ستارہ کہلاتا ہے چاند ہماری زمین سے قریب ترین سیارہ ہے مگر پھر بھی زمین ...

فاصلہ دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے چاند کی زمین کا بیشتر حصہ پہاڑوں سے ڈھکا ہوا ہے کہیں کہیں ان پہاڑوں کی بلندی ۲۶ ہزار فٹ تک ہے چاند پر ہمیں جو دھبے نظر آتے ہیں وہ ان ہی پہاڑ کی پرچھائیاں ہیں ایک اندازہ کے مطابق وہاں تقریباً دس پہاڑی سلسلے ہیں سائنس دانوں نے ان پہاڑوں کے نام بھی ہماری زمین پر موجود پہاڑوں جیسے رکھے ہیں مثلاً ایک سلسلہ کوہ کا نام "ایلپس" رکھا گیا ہے اور ظاہر ہے جب پہاڑ ہیں، تو پھر وادیاں بھی ضرور ہوں گی چنانچہ ایک وادی بھی ہے جس کی چوڑائی اسی میل کے لگ بھگ ہے۔

چاند پر پائے جانے والے بیشتر پہاڑ آتش فشاں ہیں ان پہاڑوں کے دہانے بہت بڑے بڑے ہیں مثلاً کچھ دہانوں کا قطر اسی میل تک ہے ایک اندازہ کے مطابق ان آتش فشاں پہاڑوں کی تعداد تیس ہزار تک ہے یہاں بھی کئی بڑے بڑے میدان ہیں ایک میدان جس کا نام "میرامبریم" رکھا گیا ہے سات سو اسی میل لمبا اور ساٹھ سو میل چوڑا ہے۔

چاند کی سطح جو ہمیں زمین سے چکنی نظر آتی ہے دراصل چکنی نہیں ہے بلکہ کھردری، ناہموار اور پھر پھری سی ہے چاند پر ہوا بالکل نہیں ہے وہاں ہمارے جیسے موسم بھی نہیں ہوتے وہ قطعی پر سکون اور بے آواز سیارہ ہے چاند پر درخت اور پودے بھی نہیں ہیں۔

چاند کی سطح سے زمین کا منظر

چاند کی اپنی کوئی روشنی بھی نہیں ہوتی بلکہ یہ سورج کی روشنی سے جگمگاتا ہے چاند سورج سے جس قدر روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کا دس فی صد زمین پر پھینکتا مگر چاند ہمیں اس لیے زیادہ روشن نظر آتا ہے کیونکہ یہ زمین سے بہت قریب ہے چاند زمین سے چھوٹا ہے یعنی زمین بڑی ہے۔ جن سائنس دانوں نے چاند سے زمین کو دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ زمین چاند سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے کیونکہ یہ چاند کی نسبت بڑی بھی دکھائی دیتی ہے اور اس میں کتنے ہی رنگ بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔

سید کاشان جعفری

یتیمِ عراق



ہماری اسلامی تاریخ میں کیسے کیسے لوگ گزرے ہیں ؟
اس کہانی میں ایسے ہی ایک بزرگ کے بارے میں پڑھئے

ساتھیو! آپ نے بغداد کا نام تو ضرور ہی سنا ہوگا۔ وہی بغداد جس کا نام الف لیلوی کہانیوں میں آتا ہے وہی بغداد جو عراق کا پایۂ تخت یعنی دارالحکومت ہے۔ اسی بغداد سے یہ کہانی بھی متعلق ہے۔ مگر اس کے کردار الف لیلوی کہانیوں کی طرح فرضی نہیں نہ ہی اس کہانی کا واقعہ من گھڑت ہے۔ آج سے سیکڑوں سال پرانی بات ہے اس وقت عراقی حکمران صدر نہیں۔ خلیفہ کہلواتے تھے۔ خلیفہ کے معنی ہیں نائب یہ تو آپ کے علم میں ہوگا ہی کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں اپنا نائب اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ بس اس دور کے حکمران اپنے آپ کو خلیفہ کہلواتے تھے۔ حکومت اللہ کی ہوا کرتی تھی اور وہ خود اس کی نیابت کا فریضہ انجام دیتے۔ اپنے عوام کی بھلائی اور فلاح و بہتری کے لیے مفید اور کارآمد منصوبے عمل میں لاتے۔ اور جب امور سلطنت کی انجام دہی سے تھک جاتے تو

دل بہلانے کے لیے تفریحی مشاغل میں بھی حصّہ لیتے اُن کے تفریحی مشاغل میں جہاں ان کے لیے اپنی دلچسپی کا سامان ہوتا وہیں عوامی دلچسپی اور فلاح کا بھی خیال رکھتے۔ اُس وقت کے خلیفہ کو کشتیوں کا بہت شوق تھا۔ آج بھی کشتیاں بڑے ذوق وشوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ عالمی ریسلنگ کے مقابلے ہوتے ہیں اور ان مقابلوں میں ورلڈ چیمپین کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا اس قدر نہیں پھیلی تھی۔ پھر بھی بغداد کے دربار سے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان وابستہ تھے۔ ان پہلوانوں میں ایک پہلوان کو رستمِ عراق ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

ایک دفعہ جب رستمِ عراق کا انتخاب ہو چکا اور دوسرے تیسرے، چوتھے نمبر پر آنے والے پہلوان اپنے اپنے گھر واپس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ تب ہی خلیفۂ وقت نے ڈھنڈورچیوں کے ذریعے بغداد بھر میں ایک اعلان کرایا۔ آج کی کشتیوں کے مقابلے میں جو عراق کے نامور پہلوانوں کے درمیان نہایت منصفانہ طریقے سے ہوئے ہم نے رستمِ عراق منتخب کر لیا ہے۔ تاہم اب بھی کسی کو مقابلہ کرنے کی آرزو ہو، اور وہ اپنے آپ کو رستمِ عراق سے اچھا پہلوان سمجھتا ہو تو وہ چیلنج مقابلہ کر سکتا ہے۔ ڈھنڈورچیوں کے ساتھ ساتھ رستمِ عراق بھی ایک خوبصورت گھوڑا گاڑی پر سوار تھے۔ لوگ جوق در جوق اعلان سننے کے لیے جمع ہوتے رستمِ عراق کو دیکھتے اس سے مصافحہ کرتے گلے میں پھولوں کے ہار پہناتے اور حسبِ حیثیت تحفے تحائف بھی دیتے۔

اب ڈھنڈورچی بغداد کی ایک غریب بستی میں سے گذر رہے تھے شائقین کی ایک بڑی تعداد ان کے ہمراہ پیچھے پیچھے چل رہی تھی تب ہی ایک پتلی سی گلی سے ایک شخص نکل کر سڑک پر آیا اور خاموشی سے رستمِ عراق کی گاڑی پر چڑھ گیا لوگوں نے سمجھا وہ شخص بھی مصافحہ کرے گا۔ رستمِ عراق کو ہار پہنائے گا یا کوئی تحفہ پیش کرے گا مگر وہ تو ہاتھ ملانے کے بعد چپکے چپکے سرگوشیوں میں عراق کے قابلِ فخر، نامور فرزند سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر دلآویز مسکراہٹ کی کلیاں بھی چٹک رہی تھیں۔ اور خود رستمِ عراق بڑی توجہ اور محبت سے اس شخص کی باتوں کو سر جھکائے سُن رہا تھا۔

اچھا......... اچھا............ ٹھیک ہے۔ مجھے تمہارا چیلنج منظور ہے

رستم عراق نے خندہ پیشانی سے دوبارہ مصافحہ کرتے ہوتے اس گمنام غریب شخص کو جواب دیا۔ جلد ہی لوگوں کو پتہ چل گیا کہ پتلی سی گلی سے نکل کر آنے والے اس غریب سے معمولی شخص نے رستم عراق کو اپنے ساتھ کشتی لڑنے کا چیلنج دیا تھا۔ سب اس بات پر ہنسنے لگے۔ بچوں نے تو باقاعدہ تالیاں بجاکر شور مچاتے ہوتے اس شخص کا مذاق اڑانا شروع کردیا۔ کسی بڑی عمر کے شخص نے پھبتی کسی............ "میاں کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ آئینہ دیکھا ہے کبھی" ایک اور آواز آئی۔ "خودکشی کا ارادہ ہی کرلیا ہے تو شریف پہلوان کو کیوں بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو............" الغرض جتنے منہ اتنی باتیں ہر کوئی چیلنج کرنے والے پہلوان کا مذاق اڑا رہا تھا۔

آن کی آن میں سارے بغداد میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ رستم عراق کو ایک غریب کمزور اور گمنام شخص نے مقابلہ کرنے کا چیلنج کیا ہے۔ خبر سن کر وہ پہلوان بھی رک گئے............ جو رستم عراق سے ہار جانے کے بعد اپنے اپنے شہروں کو واپس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا بندھا ہوا سامان دوبارہ کھلوادیا۔ خود خلیفۂ وقت بھی اس انوکھے چیلنج پر حیران تھے۔ آخر کشتی کا مقررہ دن آپہنچا۔ اسٹیڈیم میں اتنا رش اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سارا بغداد سمٹ کر اسٹیڈیم ہی میں جمع ہوگیا ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں سب ہی اس انوکھی کشتی کو دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل کر وہاں پہنچ گئے تھے۔

نقارے پر چوٹ پڑی یہ پروگرام کے آغاز کا اعلان تھا۔ سب لوگ یک دم خاموش ہوگئے۔ ایک طرف سے شاہی پہلوان رستم عراق اپنے گینڈے جیسے مضبوط اور خوبصورت جسم کے ساتھ اکھاڑے میں داخل ہوا۔ تو دوسری طرف سے وہ گمنام پہلوان۔

جب اکھاڑے میں آکر اس شخص نے کشتی لڑنے کے لیے اپنے کپڑے اتارے تو بے ساختہ سارا اسٹیڈیم قہقہوں سے گونج اٹھا۔ گمنام پہلوان اس قدر کمزور تھا کہ اس کی پسلیاں تک صاف گنی جاسکتی تھیں دوسری بار نقارے پر چوٹ پڑی۔ گویا کشتی شروع ہونے کا اعلان تھا۔

دونوں پہلوان اچھلتے، کودتے اکھاڑے کے درمیان میں پہنچے، دونوں نے

ہاتھ ملایا اور پھر زور آزمائی کرنے لگے .... کبھی شاہی پہلوان گمنام شخص کو دھکیلتے ہوئے پیچھے لے جاتا۔ اور کبھی وہ دبلا پتلا شخص رگیدتا ہوا شاہی پہلوان کو پیچھے دھکیلنے لگتا شاہی پہلوان نے کئی بار داؤ لگانے کی کوشش کی مگر گمنام شخص نے بڑی پھرتی اور مہارت سے اس کے ہر داؤ کو ناکام بنا دیا۔ جوں جوں وقت گذر رہا تھا۔ لوگوں کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنا بڑا ہجوم اس طرح خاموش تھا کہ ان کے سانسوں کی آواز بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ خود خلیفۂ وقت مجسم تصویر بنے حیرت سے پلک جھپکائے بغیر اس مقابلے کو دیکھ رہے تھے۔

اچانک گمنام شخص نے ایک داؤ لگایا اور رستم عراق کو چت کر کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ وہ دو منٹ تک اس کے سینے پر سوار رہا۔ اور شاہی اعزاز یافتہ پہلوان کو اٹھنے نہیں دیا۔ جب ریفری نے آگے بڑھ کر گمنام شخص کا ہاتھ بلند کرتے ہوئے اس کی فتح کا اعلان کیا تو اسٹیڈیم تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے دیر تک گونجتا رہا۔ مگر لوگ اب بھی حیران تھے۔

خلیفۂ وقت نے جیتنے والے پہلوان کو انعام و اعزاز سے نوازا امراء و وزراء نے بھی اپنی طرف سے اس شخص کو تحائف دیئے یوں مقابلہ ختم ہونے کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔

خلیفہ رستم عراق کی اس شکست پر بے حد افسردہ تھا۔ اس کا دماغ ابھی تک اس کشتی کے فیصلے کو قبول کر لینے پر آمادہ نہ ہوا تھا۔ آخر اس نے اپنے پہلوان کو قریب بلا کر سوال کیا کہ یہ کیا راز ہے کہ تم اس دبلے پتلے گمنام اور معمولی شخص سے ہار گئے۔ تمہارا کوئی داؤ اس پر چل نہ سکا اور اس نے تمہیں چت کر کے رکھ دیا۔

شاہی پہلوان نے سر جھکا کر ادب سے جواب دیا " جناب والا میں کیا کہہ سکتا ہوں یہ ایک کھلا مقابلہ تھا۔

آپ سب نے دیکھا کہ میں نے اس مقابلے کو جیتنے کے لیے اپنے تمام حربے استعمال کیے مگر خدا اس شخص کے ساتھ تھا۔ وہ جیت گیا " خلیفہ نے پھر سوال کیا......

" یہی تو میرے ذہن کی الجھن ہے۔ آخر ایسا کیوں کر ممکن ہو سکا۔؟

شاہی پہلوان نے کہا " حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں " خلیفہ نے جست

سے پہلوان کو دیکھا، پھر سوچتے ہوئے کہا ٹھیک ہے تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ تم بلا خوف و خطر بات کرو"۔

شاہی پہلوان نے کہا "جناب وہ شخص بے حد غریب تھا۔ اس کی چار، جوان بیٹیاں شادی کے لیے بیٹھی ہیں۔ رشتے مل چکے تھے۔ مگر غربت کی وجہ سے مجبور تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس سے کشتی لڑوں وہ جیت جائے گا تو انعام و تحائف میں ملنے والی رقم سے بیٹیوں کی شادی کر دے گا۔ خلیفہ نے یہ سن کر کہا" مگر تم اس کی مدد اپنے طور پر رقم سے بھی تو کر سکتے تھے۔ رستم عراق کے اعزاز کو داؤ پر کیوں لگا دیا۔" پہلوان کا سر مزید جھک گیا۔ وہ دھیرے سے بولا" عالی جاہ ...... میرے پاس اپنی رقم رہتی ہی کہاں ہے۔ جو کچھ بھی مجھے انعام، اعزاز اور تحائف میں ملتا ہے۔ سب غریبوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس غریب شخص کی مشکل حل کرنے کے لیے اُس سے چلینج کشتی لڑوں اور پھر ہار جاؤں بس میں نے اسی پر عمل کیا۔"

خلیفہ یہ جواب سُن کر اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر پہلوان کو سینے سے لگا لیا اور پھر اپنے گلے سے قیمتی ہار اتار کر اُس کے گلے میں پہناتے ہوئے کہا" آج سے تم مجھے اور بھی عزیز ہو گئے ہو ......"

ساتھیو! جانتے ہو یہ رستم عراق عظیم پہلوان کون تھے یہ تھے ہمارے عظیم بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ ...... جو بزرگی حاصل ہونے سے پہلے ایک نامور پہلوان بھی تھے۔

جمیل نقوی

اقبال کا ایک شعر

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

مشکل الفاظ . . . . وابستہ = بندھا ہوا، منسلک، زیرِ گردوں = آسمان کے نیچے اس دنیا میں، کمال = خوبی، انتہائی ترقی، کاری گری

اس شعر کا سادہ سا مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کسی کارنامے کو انجام دینے کے لیے سکندر جیسی شان و شوکت کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتیں عطا کر کے دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ محنت اور جد و جہد کے ذریعہ بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

آئینے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے سکندر نے آئینہ بنایا تھا۔ سکندر دنیا کے عظیم فاتحین میں سے گزرا ہے وہ بڑی شان و شوکت والا بادشاہ تھا اور آئینہ سازی بھی اس کا ایک کارنامہ ہے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ ایسے کارنامے انجام دینے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ سکندر جیسی شان و شوکت ہی موجود ہو کسی قسم کی شان و شوکت یا دنیاوی ذرائع کی موجودگی کے بغیر بھی انسان بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے قابل ہو سکتا ہے دراصل انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر زیادہ کمالات کا خزینہ بنایا ہے کہ اگر وہ ان سے کام لے تو دنیا میں بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ اقبال دراصل یہ دعوت دے رہے ہیں کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں پر بھروسا کرنا چاہیے ان سے کام لینا چاہیے دنیاوی اسباب پر بھروسا کیے بغیر بڑے کارنامے انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور اسی طرح با مقصد زندگی گزارنی چاہیے۔

خواجہ عابد نظامی

قرآن پاک کی باتیں

غصّہ

پیارے بچو!

قرآن پاک میں ایمان والوں کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ "جب ان کو غصہ آتا ہے" تو (وہ) معاف کر دیتے ہیں۔ (شوریٰ ۴)

انسان کو اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات سن کر یا اپنی طبیعت کے خلاف کوئی کام دیکھ کر غصہ آجاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر قرآن پاک کا حکم یہ ہے کہ صبر اور برداشت سے کام لیا جائے اور غصہ میں کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس کے نتیجے میں خود اپنے آپ کو یا دوسرے کو کوئی نقصان پہنچے۔

غصہ پر قابو پانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

اللہ کے پیارے رسولؐ نے غصہ کو شیطانی کام بتایا ہے۔ اور تاکید فرمائی ہے کہ اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ حضورؐ نے غصہ سے بچنے کے تین طریقے بتائے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان تینوں طریقوں کو یاد رکھیں اور جب غصہ آئے ان طریقوں پر عمل کر کے غصہ جیسے شیطانی کام سے بچیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

(۱) غصہ شیطان (کی طرف) سے ہے۔ شیطان آگ سے بنایا گیا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے۔ تو جس کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ وضو کر لے۔

(۲) جس کو غصہ آئے وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے بیٹھنے سے بھی غصہ کم نہ ہو۔ تو لیٹ جائے۔

(۳) اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنے سے غصہ جاتا رہتا ہے۔

کیوں بچو! کتنا اچھا ہے یہ نسخہ! اسے خود بھی یاد رکھیں اور دوسرے دوستوں کو بھی بتائیں۔

قرآن پاک میں

حضور علیہ السلام کے ایک چچا کا نام قرآن پاک میں آیا ہے جس کا نام ابولہب تھا۔

حضور علیہ السلام کے ایک صحابی کا نام قرآن پاک

میں آیا ہے ان کا نام حضرت زید بن حارث رضی اللہ عنہ ہے۔

آتش نمرود کے گلزار ہو جانے کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ الانبیا کی آیت نمبر ۶۹ میں آیا ہے۔

قارون کا نام قرآن پاک میں پانچ دفعہ آیا ہے۔

"تخت بلقیس" جو ۸۰ گز لمبا، ۴۰ گز چوڑا اور ۳۰ گز اونچا تھا اس کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ النمل میں آیا ہے۔

یمن کے حاکم ابرہہ کا واقعہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ جس نے مکہ پر حملہ کیا تھا اور جن پرندوں نے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کرنے کے لیے کنکریاں پھینکی ان کا نام ابابیل ہے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کا شرعی طریقہ سورۃ الانفال میں بیان کیا گیا ہے۔

سلیمانی لشکر اور چیونٹی کا واقعہ قرآن پاک کی سورۃ النمل میں آیا ہے۔

یوم الفرقان یہ نام قرآن مجید میں جنگ بدر کے دن کو، ۱۷ رمضان ۲ھ کو دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ۲۶ انبیاء کرام کا ذکر ہے۔

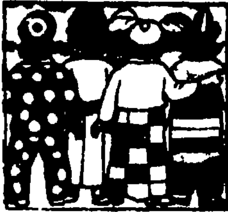
سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ۳۴ مرتبہ ذکر آیا ہے۔

قرآن پاک کی سورۂ لہب میں ابولہب کی جس بیوی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا نام ام جمیل تھا۔

قرآن مجید میں سب سے زیادہ سورتوں میں نام نوح علیہ السلام کا آیا ہے یہ نام ۲۸ سورتوں میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیم کا ذکرہ ۲۵ سورتوں میں آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں ۱۳۴ مرتبہ آیا ہے۔



الفاظ کا کھیل

بچو! ذیل کے ہر جملے میں دو خالی جگہیں چھوڑی گئی ہیں۔ آپ ان میں تین حروف پر مشتمل مناسب الفاظ اس طرح لکھیں کہ دوسری خالی جگہ میں آنے والا لفظ پہلی جگہ میں لکھے گئے لفظ کا حروف کی ترتیب کے لحاظ سے الٹ ہو۔

(۱) آج — تو ہمارے ہاں — کی دال پکے گی۔

(۲) ڈاکٹر رحیم — اور — کی بیماریوں کی سپیشلسٹ ہیں

(۳) قاسم — گیا تو اپنے پالتو — بھی لے گیا۔

(۴) — روپے کے تیس — ملیں گے۔

جوابات

(۱) شام، ماش (۲) ناک، کان (۳) روم، مور (۴) بیس، سیب۔

عالمِ حیوانات

لفظ بھیڑیا کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں ظالم، وحشی، خون آشام اور اسی قبیل کے دیگر الفاظ گردش کرنے لگتے ہیں۔ انسان کے ذہن میں شروع ہی سے اس جانور کے لیے نفرت کے جذبات پرورش پاتے رہے ہیں اور جہاں کبھی دونوں کا آمنا سامنا ہوا ہے اسے شکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ گزشتہ چند دہائیوں کی بات ہے کہ ہمیں اس بات کا احساس ہوا ہے کہ کتنا ذہین ہے اور اعلا سماجی برتاؤ اور شکار کی شاطرانہ تکنیک کا حامل ہے۔ کتے کی نسل سے تعلق رکھنے والا سب سے بڑے قبیلے کا یہ رکن سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے

ہندستان میں کھلے علاقوں میں یہ آزادانہ گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اکثر انسانی بستیوں کے پاس رہنے کو یہ ترجیح دیتے ہیں اور ہمیشہ چرتے ہوئے مویشیوں اور جانوروں پر ان کی نظر لگی رہتی ہے۔ اس ملک میں اور دیگر ممالک میں عام طور سے یہ سمجھا جاتا رہا کہ بھیڑیے چھوٹے بچے اٹھا لے جاتے ہیں۔ تاہم بعض ایسے واقعات کا ریکارڈ بھی ملتا ہے کہ بھیڑیے بچوں کو اٹھا لے گئے۔

(بشکریہ انقلاب)



ہمارے پیارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زندگی کا صحیح راستہ بتایا، اندھیرے سے روشنی میں لائے۔ آپؐ کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ کم لفظوں میں آپؐ بہت گہری اور اہم باتیں بیان فرمادیتے تھے۔ ایک بار جب آپؐ کے ساتھیوں نے آپؐ سے قربانی کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا ہے، تو آپ نے فرمایا:

"یہ تمھارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے دوست (خلیل اللہ) حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کے لیے ان کو اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان کر دینے کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیمؑ فوراً حکمِ الٰہی پر عمل کرنے کو تیار ہو گئے۔ عیدالاضحیٰ کا دن اسی "ذبحِ عظیم" کی یاد میں ہر سال منایا جاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جانور کی قربانی دینا اصل میں ایک علامت ہے، ایک مشق ہے۔ یہ قربانی ظاہر میں تو کسی جانور کی ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں اپنے جذبات کی، اپنی خواہشوں کی قربانی ہوتی ہے۔ اللہ کے حکم کے آگے اپنی مرضی، اپنی خواہش، اپنے ارادے کو قربان کر دینے کا نام ہی اسلام ہے۔ جانور کو قربان کرنا اس بات کی علامت یا نشانی ہے کہ بندہ اپنے آقا کی خوشی اور رضامندی کے لیے اپنی عزیز ترین چیز جان بھی قربان کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ جذبہ ہی اصل چیز ہے۔ ہم جانور قربان کر دیں، مگر قربانی کا صحیح جذبہ پیدا نہ کریں تو کیا فائدہ! اللہ تعالیٰ کو کسی جانور کی یا کسی مال کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہم میں وہ جذبہ دیکھنا چاہتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کو اپنی اولاد قربان کر دینے پر تیار کر دیتا ہے۔ نمائش یا دکھاوے کے لیے مہنگے مہنگے جانور خریدنا اور ان کو حلال کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اچھا فعل نہیں ہے۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید



اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ آپ اس کو چاہے دائیں سے بائیں یعنی اردو کی طرح پڑھیں یا انگریزی کی طرح بائیں سے دائیں پڑھیں۔ اس کے تسلسل اور مطلب میں فرق نہیں آئے گا۔ نظم کے آخر میں مثال کے طور پر ایک شعر اُلٹ کر لکھ دیا گیا ہے۔ آپ پوری نظم اسی طرح اُلٹ کر پڑھیں اور لطف لیں۔

میری گڑیا کیسی پیاری جسکی جھلمل جھلمل ساری
چوٹی اسکی پوری کالی اسکی صورت بھولی بھولی
پہنے کپڑے پیارے پیارے گہنے جگمگ جگمگ سارے
اعلا اسکا سارا زیور عمدہ ٹیکا اچھا جھومر
سچے موتی، مالے اسکے ہیرے گویا بُندے جھمکے
کشور کشور کہتی ہوں میں اکثر ملکہ رہتی ہوں میں
دیکھو وہ ہے گڑیا میری
جو ہے گھونگٹ ڈالے بیٹھی

(اُلٹ کر پڑھیے)
پیاری کیسی گڑیا میری ساری جھلمل جھلمل جسکی

19

خطرناک سمندری سفر

مناظر صدیقی

بحرالکاہل دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے گہرا سمندر ہے۔ اس سمندر میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ ان جزیروں میں جو لوگ رہتے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں وہ دنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح مہذب تھے۔ ان جزیروں میں ایک الگ تہذیب تھی۔ زبان بھی الگ ہی ہے۔ یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسے پودوں کی کاشت کرتے ہیں جو کسی اور جگہ قدرتی طور پر پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان لوگوں کو پولی نیشیائی کہا جاتا ہے۔ ان تمام جزیروں کو جو جنوبی بحرالکاہل میں پھیلے ہوئے ہیں پولی نیشیا کہا جاتا ہے۔ یہ جزیرے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں بعض تو اتنے چھوٹے ہیں کہ اٹلس میں انھیں چھوٹے چھوٹے نقطوں ہی کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ پولی نیشیائی لوگوں کے متعلق یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ وہ کن ملکوں سے آکر ان جزیروں پر آباد ہوئے۔ بہت سے لوگ اور خاص طور پر سائنس داں یہ معما حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان ہی سائنس دانوں میں سے ایک تھور ہیرڈل بھی تھا۔ وہ ناروے کا رہنے والا تھا۔

تھور ہیرڈل پولی نیشیا کے ایک چھوٹے سے جزیرے فاٹو ہیوا میں پائے جانے والے جانوروں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک دن اُس نے ایک بہت بوڑھے آدمی کو کہتے سُنا، "کون ٹکی ہمارا سردار بھی تھا اور دیوتا بھی۔ اُسی نے ہم لوگوں کو سمندر پار سے لاکر یہاں آباد کیا۔"

ٹکی کا نام سنتے ہی ہیرڈل کو خیال آیا کہ اُس نے ٹکی کا بُت اسی جزیرے کے جنگل میں دیکھا تھا۔ یہ بُت بالکل ویسا ہی تھا جیسے بُت اس نے جنوبی امریکا میں دیکھے تھے۔ جنوبی امریکا میں انگریزوں اور یورپ والوں کے پہنچنے سے پہلے جو لوگ رہتے تھے اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن کی اپنی ایک الگ تہذیب تھی۔ اس تہذیب میں بھی بتوں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ ہیرڈل نے سوچا کہ اس جزیرے میں رہنے والوں کا تعلق ضرور جنوبی امریکا سے ہوگا۔ اسی خیال کے مطابق ہیرڈل نے ایک خیالی کہانی بنائی، جسے اس نے اپنا نظریہ کہنا شروع کیا۔

ہیرڈل نے تکی کے بُت کو دیکھ کر ان جزیروں میں رہنے والوں کے متعلق جو خیال پیش کیا تھا وہ یہ تھا کہ دو ہزار سال سے بھی پہلے داڑھیوں والے گورے آدمی کسی طرح امریکا پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں نے امریکا کے پرانے باشندوں کو جنھیں کولمبس کے امریکا پہنچنے کے بعد ہندی یا سُرخ ہندی (ریڈ انڈین) کہا جانے لگا تھا، مل جُل کر ساتھ رہنا سکھایا۔ جب سمندر کے قریب رہنے والے ہندی گوروں کے طریقے سیکھ گئے تو یہ گورے امریکا کے وسطی علاقوں کی طرف گئے۔ وہاں بھی انھوں نے لوگوں کو یہی تعلیم دی اور اپنے نشان چھوڑ گئے۔ آخر میں وہ لوگ پیرو پہنچے۔ پیرو براعظم جنوبی امریکا کے مغربی ساحل پر واقع ایک بڑا ملک ہے۔ پیرو سے یہ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کا رُخ کر کے آگے بڑھے تو بحرالکاہل کے ان جزیروں میں پہنچ گئے جنھیں اب پولی نیشیا کہا جاتا ہے، لیکن اُس وقت کے دوسرے سائنس دانوں نے ہیرڈل کا یہ خیال تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان سائنس دانوں کا کہنا تھا کہ پرانے زمانے میں امریکا کے باشندے جو کشتیاں استعمال کرتے تھے وہ اس قابل ہی نہیں ہوتی تھیں کہ اُن پر بیٹھ کر بحرالکاہل جیسا بڑا سمندر پار کیا جائے، لیکن ہیرڈل کو یقین تھا کہ پرانے زمانے کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر بحرالکاہل پار کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ خود پولی



نیشیائی باشندوں کے متعلق جو سمجھ رہا ہے وہی ٹھیک ہے۔

ہیرڈل نے یورپ سے امریکا پہنچنے والے بہت سے بہادر سیاحوں کے لکھے ہوئے واقعات پڑھے تھے۔ ان سیاحوں نے اپنی کہانیوں میں لکھا تھا کہ انھیں امریکا کے رہنے والوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ کشتیاں ایک خاص قسم کے درخت "بلساں" کے موٹے موٹے لٹھوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ان کشتیوں کو امریکا کے پرانے اور اصلی باشندے بحری جہازوں کی طرح دُور تک کھلے سمندر میں لے جاتے ہیں۔ سمندر میں جاتے وقت ان کشتیوں میں بادبان بھی لگا دیے جاتے تھے۔

ہیرڈل نے یہ تمام واقعات پڑھے تو اُسے خیال آیا کہ اُسے بھی پرانے زمانے کی کشتیوں کی طرح ایک کشتی بنا کر پیرو سے پولی نیشیا تک سمندری سفر کرنا چاہیے۔ اس کے بعد کسی بھی شخص میں اُسے جھٹلانے یا اس کے خیال کو غلط کہنے کی ہمت نہیں ہوگی۔

ہیرڈل کا یہ خیال جب دوسروں کو معلوم ہوا تو بہت سے لوگوں نے اس کی مدد کی۔ ہیرڈل نے اپنے کئی ساتھیوں کو اپنی مہم میں شامل کر لیا۔ ان میں ہرمین واٹزینگر، ایرک ہیزل برگ، اور نٹ ہاکلینڈ شامل تھے۔ یہ سب لوگ بھی ناروے ہی کے رہنے والے تھے۔ ان میں سے نٹ ہاکلینڈ نے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں نازی جرمنی کے ایٹمی کارخانے کو تباہ کرنے میں بھی حصّہ لیا تھا۔ ان کے علاوہ ٹارسٹین ربی بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ناروے سے وائرلیس کے ذریعہ سے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں برطانیہ کو ایسی خبریں بھیجی تھیں جن کی وجہ سے برطانیہ کو جرمنی کے جہاز ٹیرپیز پر بمباری کرنے میں آسانی ہوئی تھی۔ غرض ہیرڈل کے تمام ساتھی بہادر تھے۔ یہ سب لوگ ہر قسم کی مصیبت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

ہیرڈل اور اس کے چاروں ساتھیوں نے مل کر جنگل سے بلساں کے بڑے بڑے درخت کاٹے۔ ان درختوں سے انھوں نے بالکل ویسی ہی کشتی بنانی شروع کی جیسی کشتیوں کے متعلق کتابوں میں انھوں نے پڑھا تھا کہ پرانے زمانے میں امریکا کے رہنے والے ان میں سوار ہو کر دُور دُور سفر کرتے تھے۔ یہ پانچوں ساتھی جب پیرو پہنچے تو بنٹ ڈینیئل سن نامی ایک شخص بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ یہ چھے ساتھی ہو گئے تھے۔ سب نے مل کر کشتی مکمل کر لی۔ اس کشتی کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں لوہے کی کوئی کیل یا کسی دوسری دھات سے بنا ہوا پیچ تک استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ تمام لٹھوں کو صرف موٹے موٹے رسّوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ ہیرڈل نے اسے بالکل پرانے زمانے کی کشتی بنا دیا تھا۔

بلسان کے درختوں کے لمبے لمبے اور موٹے لٹھوں کو جوڑ کر جو کشتی انھوں نے بنائی تھی وہ آج کل کی کشتیوں سے بالکل علاحدہ تھی۔ یہ تو ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے لکڑی کے بڑے لٹھوں کو رسّوں سے باندھ کر ایک پلیٹ فارم بنا دیا گیا ہو۔ اس کشتی کے بالکل بیچ میں ہیئرڈل نے کرنا کی لکڑی سے ایک جھونپڑی سی بنائی۔ کرنا دراصل ایک درخت ہوتا ہے جو عام طور پر گرم علاقوں میں دریاؤں کے کنارے پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی لکڑی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ اسی لکڑی سے انھوں نے کشتی کھینے کے لیے بہت بڑا چپو بنا لیا تھا۔ جس کسی نے بھی ہیئرڈل کی بنائی ہوئی اس کشتی کو دیکھا، اُس نے ہیئرڈل کو یہی سمجھایا کہ اس کشتی میں سفر کرنا ٹھیک نہیں، لیکن ہیئرڈل کو یقین تھا کہ وہ اپنے ارادے میں ضرور کام یاب ہوگا، کیوں کہ اس نے یہ کشتی پرانے زمانے کی کشتیوں کی سی بنائی ہے۔ بہرحال تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ہیئرڈل اور اس کے پانچوں ساتھی پیرو کی بندرگاہ کیلاؤ سے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان چھے آدمیوں کے علاوہ کشتی میں ایک توتا بھی تھا۔

ہیئرڈل اور اُس کے ساتھی لکڑی کے لٹھوں پر سمندر میں پہنچ تو گئے تھے، لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ پرانے زمانے کے لوگ باقاعدہ کشتیوں میں سفر کرنے کے بجائے اس طرح کے لٹھوں پر سفر کیوں کرتے تھے؟ ان لوگوں کو بیچ سمندر میں پہنچے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مصیبتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے تو وہ مغرب کی طرف سے چلنے والی تیز سمندری ہواؤں میں پھنس گئے جنھیں تجارتی ہوائیں کہا جاتا ہے۔ ان ہواؤں میں لٹھوں کی کشتی کھینا بہت مشکل کام تھا۔ چپو چلانے اور کشتی کا رُخ ٹھیک سمت میں رکھنے کے لیے انھیں بہت طاقت صَرف کرنی پڑتی۔ ان ہواؤں سے نجات ملی تو سمندر کے طاقت ور اور تیز دھارے میں پھنس گئے۔ قطب جنوبی کا علاقہ تو قریب نہیں تھا پھر بھی سردی بہت سخت تھی۔ اس سخت سردی میں سمندری دھارا رات کے وقت انھیں بہت پریشان کرتا۔ بڑی بڑی سمندری لہریں خوف ناک آوازوں کے ساتھ اُن کی کشتی سے ٹکراتیں۔ تو لٹھے کی یہ کشتی لہروں کے زور سے کئی کئی فیٹ اُوپر اُٹھ جاتی۔ اُسی وقت کوئی دوسری بہت بڑی لہر اُوپر آ کر ان کی کشتی پر گر پڑتی۔ پھر سمندر کے پانی میں مل جاتی۔ ان بڑی لہروں کی وجہ سے ہیئرڈل کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ پرانے زمانے کے لوگ لٹھوں کی پلیٹ فارم جیسی کشتیوں میں کیوں سفر کرتے تھے۔ اگر وہ عام کشتیوں میں سفر کرتے تو اوپر سے آ کر گرنے والی لہروں سے کشتی میں پانی بھر جاتا اور کشتی ڈوب جاتی، لیکن ان لٹھوں کے بیچ میں تو اتنی جگہ ہوتی

ہے کہ پانی بہ جاتا ہے، کشتی محفوظ رہتی ہے۔

اس سفر میں ہیرڈل اور اس کے ساتھیوں کو کھانے کے معاملے میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اس سمندر میں چھوٹی بڑی مچھلیاں بہت تھیں۔ انھیں تو مچھلیاں پکڑنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ اکثر اُڑنے والی مچھلیاں خود ہی کشتی میں آ گرتیں۔ کبھی کبھی تو ان اُڑنے والی مچھلیوں سے ہیرڈل کے کسی ساتھی کو چوٹ بھی لگ جاتی۔ چھوٹی مچھلیوں کے ساتھ ساتھ کبھی شارک مچھلی بھی اُن کے قریب آجاتی، لیکن اس مچھلی سے انھیں کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا، کیوں کہ یہ عام طور پر چھوٹی مچھلیوں اور جھینگوں پر گزارا کرتی ہے۔ کبھی کبھی انھیں اصلی وھیل بھی مل جاتی۔ انھوں نے کشتی پر دو چھوٹی شارک مچھلیاں پکڑ لیں۔ جب یہ مچھلیاں کشتی پر آجاتیں اور تمام ساتھی مچھلیاں پکڑنے لگتے تو توتا بہت خوش ہوتا اور آدمیوں کی طرح قہقہے لگاتا، لیکن ایک دن ایک بہت بڑی لہر اس توتے کو اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ اس کے بعد تو وہ سب لوگ بڑی احتیاط برتنے لگے، کیوں کہ توتے کے بجائے ان کا کوئی ساتھی اس طرح کم ہو سکتا تھا۔

لٹھوں سے بنی ہوئی اس کشتی میں انھوں نے ایک چھوٹی سی کشتی بھی ساتھ رکھ لی تھی جسے



عام طور پر ڈونگی کہتے ہیں۔ ایک دن ہیرلڈ اور اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ اگر اس سمندر میں اتفاق سے کوئی شخص گر جائے تو کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں کوئی تجربہ کرنا چاہیے۔ چناں چہ دو آدمی اس ڈونگی میں بیٹھ کر لٹھوں کی کشتی سے سمندر میں اُتر گئے۔ لٹھوں کی کشتی کچھ آگے بڑھ گئی تو اُن دونوں نے کوشش کی کہ چپّو چلا کر کشتی تک پہنچ جائیں۔ اُسی وقت ہوا کے ایک تیز جھکڑ نے لٹھوں کی کشتی کو اتنی تیزی سے آگے بڑھا دیا کہ سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ ڈونگی میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمی بہت پریشان ہوئے کہ اب باقی ساتھیوں تک کیسے پہنچیں۔ انھیں بڑی محنت سے چپّو چلانے پڑے۔ خدا خدا کر کے وہ لوگ اپنے ساتھیوں سے مل ہی گئے۔ کئی مرتبہ وہ سمندری طوفان میں پھنس گئے۔ تیز ہواؤں اور بارش سے اُن کا بُرا حال ہو جاتا۔ طوفانی لہریں ان کی کشتی اور اس پر بنے ہوئے جھونپڑے سے ٹکراتیں تو انھیں ایسا معلوم ہوتا جیسے اب یہ سب چیزیں تنکوں کی طرح اُڑ جائیں گی۔ جب پانی لٹھوں کی درزوں میں سے گزر کر سمندر کے پانی میں مل جاتا تو اُن کی جان میں جان آتی۔

ان سب نے سونے کے لیے خاص قسم کے تھیلے بنا رکھے تھے جن کے اندر پانی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ ایک بڑی سی لہر سے ربیبی کا تھیلا بہ گیا۔ ہرمین نے اسے بہتے ہوئے دیکھا تو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن اس کوشش میں خود ہرمین بھی سمندر میں گر گیا۔ گرتے وقت ہرمین کی چیخ نکل گئی۔ ٹارسٹین ربیبی نے جلدی سے ڈونگی میں بندھی ہوئی رسّی کھول کر ایک لچھا بنایا اور اسے ہرمین کی طرف پھینکا۔ ہرمین اُس وقت پوری طاقت سے تیرتے ہوئے کشتی کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن کشتی سے اس کا فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نٹ اور ایرک نے ہرمین کی طرف لائف بیلٹ پھینکنے کی کوشش کی، لیکن ہوا کے زور سے لائف بیلٹ ہرمین کی طرف جانے کے بجائے لوٹ کر انھی سے ٹکرا گئی۔ نٹ نے فوراً ہی لائف بیلٹ پکڑ لی اور دوبارہ پھینکنے کے بجائے اسے لے کر خود ہی سمندر میں کود گیا۔ پھر وہ ہرمین کی طرف بڑھنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ ہرمین کے قریب پہنچا تو ہرمین نے لائف بیلٹ پکڑ لی۔ کشتی پر سے دوسرے ساتھیوں نے لائف بیلٹ میں بندھے ہوئے رسّے کو کھینچنا شروع کیا۔ اس طرح وہ دونوں بڑی مشکل سے کشتی تک پہنچے۔ کشتی پر پہنچنے کے بعد انھیں پتا چلا کہ وہ ایک خوف ناک شارک مچھلی سے بال بال بچے ہیں۔ اس تمام کوشش میں ربیبی کے سونے کے تھیلے میں، ہوا بھر گئی تھی۔ وہ بھول چکا تھا۔ اسی وقت

کوئی چیز سمندر سے نکلی اور اُس نے تھیلے کو سمندر میں گھسیٹ لیا۔ اس چیز کو تمام ساتھی اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکے۔

ان مصیبتوں کے ختم ہونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سمندری طوفان میں گھر گئے۔ اس مرتبہ تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اُن کی لٹھوں کی کشتی بس ٹوٹنے ہی والی ہے، لیکن وہ رسّے جن سے انھوں نے یہ لٹھے باندھے تھے پانی میں بھیگ کر اور مضبوط ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی کشتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ دوسرے دن انھیں وہ پرندے نظر آئے جو عام طور پر سمندر میں ساحل کے قریب ہی اُڑتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں ایک جزیرہ بھی نظر آ گیا جس کے ساحل پر کھجور کے درخت لگے ہوئے تھے، لیکن اس وقت ہوا تیز ہو گئی۔ اس کا رُخ بھی بدل گیا جس کی وجہ سے ان کی کشتی جزیرے کی طرف جانے کے بجائے آگے بڑھ گئی۔ اب وہ پھر مغرب کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔

کچھ دنوں بعد انھیں ایک اور جزیرہ نظر آیا، لیکن اس جزیرے کے قریب سمندری چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ اس جزیرے پر رہنے والوں نے شاید انھیں دیکھ لیا تھا، اس لیے دو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اس جزیرے کے آدمی ان کی طرف آنے لگے، لیکن ان کی کشتی بیچ سمندر میں تھی۔ سمندر کی تیز ہوا نے ان کی کشتی کی رفتار بڑھا دی اور مقامی آدمی ان تک پہنچ نہیں سکے۔ اب انھیں پھر کسی نئے جزیرے کی تلاش تھی۔ آخر انھیں ایک اور جزیرہ نظر آ ہی گیا۔ اس جزیرے کے قریب بھی بڑی دور تک پتھریلا ساحل تھا۔ سمندر کی چٹانیں دُور سے نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے ان چٹانوں کے بیچ میں سے گزر کر جزیرے تک پہنچنے کی کوشش کی، لیکن ایک بڑی سی لہر نے ان کی کشتی کو ایک چٹان سے ٹکرا دیا۔ کشتی ٹوٹ گئی اور اس طرح ان کا یہ لمبا سفر ختم ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس جزیرے کے لوگ اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر ان کے قریب پہنچ گئے۔ ان مقامی آدمیوں میں کچھ بوڑھے بھی تھے جنھوں نے اپنے پرانے دیوتا کون ٹکی کی کہانیاں سُن رکھی تھیں۔ وہ لوگ ہیرڈل اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ان سب کو انھوں نے پھولوں کے ہار پہنائے اور اپنے جزیرے کے رواج کے مطابق خوب جشن منایا، کیوں کہ سفید داڑھیوں والے یہ گورے اُن کے دیوتا "کون ٹکی" ہی کی طرح اُن کے جزیرے پر پہنچے تھے۔ یوں ہیرڈل نے ثابت کر دیا کہ دنیا کے اس سب سے بڑے سمندر میں ساڑھے چار ہزار میل کا سفر لٹھوں کی کشتی کے ذریعے کیا جا سکتا ہے اور پولی نیشیا میں "کون ٹکی" کی جو کہانیاں مشہور ہیں وہ سچ ہو سکتی ہیں۔

(تھور ہیرڈل کی کتاب "کون ٹکی ایڈونچر" کا خلاصہ)

گندی بچّی

عینیہ فرح



امّی کی اِک بیٹی ہے منھ پُھلائے رہتی ہے
کھاتی رہتی ہے بادام چُرتی ہے وہ صبح و شام
سب کو رکھے وہ حیران

کہتی ہے پکچر دیکھوں روتی ہے گھر گھر دیکھوں
باغوں میں ہر دم کھیلوں موٹر میں باہر گھوموں
سیر سپاٹا اس کی جان

یہ بھی کھاؤں وہ بھی کھاؤں دودھ ملائی ربڑی کھاؤں
کبھی نہ دے منھ کو آرام کھانے میں ہے وہ بدنام
پان بھی کھائے وہ نادان

جب بھی لو اسکول کا نام یا پھر کہہ دو کوئی کام
کیسا شور مچاتی ہے سب کے ہوش اُڑاتی ہے
پھر بنتی ہے وہ انجان

غسل کرے تو بھاگے دُور ہوگئیں امی تھک کر چور
کپڑے میلے جوتے گندے دن بھر رکھے پاؤں ننگے
نہیں نہانے کا امکان

ساری بستی کہتی ہے وہ اِک گندی بچّی ہے
رہو مہذب پیارے بچّو! ہنسی خوشی سے جینا سیکھو
تم سے ہے دنیا کی شان
تم سے چمکے گا انسان



اُڑنے والا گھوڑا

سید شاہد میر

وہ نوجوان ایک بھیانک درندے کو ہلاک کرنے نکلا تھا۔ اس درندے کے تین منہ تھے۔ پھر اُڑنے والے گھوڑے کی مدد سے وہ درندہ اپنے انجام کو پہنچا۔

یہ بہت پُرانے زمانے کی کہانی ہے۔ مُلک ونان میں ٹھنڈے پانی کے ایک چشمے پر ایک ورت اور ایک نوجوان پانی بھر رہے تھے۔ اُنھوں یکھا کہ ایک خوب صورت اور طاقت ور نوجوان اتھ میں سونے کی لگام پکڑے آیا اور اس نے ورت سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ عورت نے ں اجنبی کو، جس کا نام بیلیرافن تھا، پانی پلایا۔ نی پی کر بیلیرافن نے پوچھا "کیا نام ہے اس چشمے ہ میں نے آج تک اتنا ٹھنڈا اور میٹھا پانی کہیں یں پیا"

عورت نے جواب دیا "اس چشمے کو پائیرینی کہتے ہیں۔ پائیرینی اصل میں ایک عورت تھی۔ میری دادی نے مجھے بتایا ہے کہ پائیرینی کا ایک بیٹا تھا جو شکاریوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور پائیرینی اس کی موت پر اتنا روئی تھی کہ خود پانی ہو گئی تھی اور یہ چشمہ جاری ہوا تھا"

بیلیرافن یہ سن کر خوشی سے بولا "اوہ! تو یہ پائیرینی ہے۔ میں تو بہت عرصے سے اس چشمے کی تلاش میں تھا"

چشمے پر موجود مرد یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بیلیرافن سے کہا "یہ تمھارے ہاتھ میں سونے کی لگام کیوں ہے۔ کیا تمھارا گھوڑا بھاگ

گیا ہے؟"

بیلیرافن نے جواب دیا: "نہیں۔ میرا کوئی گھوڑا نہیں بھاگا بلکہ میں ایک عجیب و غریب گھوڑے کی تلاش میں یہاں تک آیا ہوں۔ اس گھوڑے کا نام "پیگاسس" ہے اور وہ اُڑنے والا گھوڑا ہے۔ مجھے لوگوں نے بتایا تھا کہ وہ اس چشمے پر پانی پینے اُتر آتا ہے۔ مجھے اسی لیے اس چشمے کی تلاش تھی۔ کیا آپ لوگوں نے کبھی اس گھوڑے کو یہاں دیکھا ہے؟"

"میرا خیال ہے، میں نے ایک ایسی کوئی چیز دیکھی ضرور ہے" آدمی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں یقین سے نہیں کہہ وہ پیگاسس گھوڑا ہی تھا یا کوئی بہت بڑا پرندہ۔"

عورت بولی: "اگر پیگاسس وہی ہے تو میں بھی اسے دیکھ چکی ہوں۔"

"اچھا!" بیلیرافن نے خوش ہو کر پوچھا: "یہ بتاؤ۔ تم نے کیا دیکھا تھا؟"

"میں یہاں پانی بھرنے آتی ہوں۔ مجھے اس کا عکس چشمے کے پانی میں نظر آیا اور میرے دل میں خواہش اُبھری کہ کاش! میں اس گھوڑے کی سواری کرسکوں اور ہوا میں اُڑتے ہوئے دُور دراز ملکوں کی سیر کروں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ اُڑ گیا۔ وہ بہت خوب صورت، سفید، بڑے بڑے پروں والا گھوڑا ہے" عورت نے بتایا۔

بیلیرافن بہت شوق سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا: "اور... اور تم اس کے متعلق کیا جانتی ہو؟"

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کی رفتار بہت تیز ہے اور وہ گرمیوں کے موسم میں پانی پینے یہاں پائیرینی پر آتا ہے۔ وہ ہیلیکن پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہے اور وہاں سے اُڑ کر یہاں تک آتا ہے۔"

یہ سب کچھ بتا کر وہ عورت اور مرد وہاں سے چلے گئے۔ بیلیرافن، پیگاسس کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں بیٹھے اسے کئی روز گزر گئے۔ وہ کبھی چشمے پر جاتا اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتا۔ لوگ اسے دیوانہ سمجھتے تھے لیکن وہ عورت جس نے پیگاسس کو دیکھا تھا، جب بھی آتی، اس کی دلجوئی کرتی۔ وہ اکثر وہاں بیٹھ کر اس سے باتیں کرتی رہتی اور ہمت بڑھاتی۔

اصل میں بیلیرافن اس گھوڑے کو اس لیے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ایشیا کے ایک ملک میں ایک عجیب و غریب خوں خوار پرندہ رہتا تھا جس کا نام "عُنقا" تھا۔ وہ بہت شریر پرندہ تھا اور لوگ اس کی حرکتوں سے پریشان رہتے تھے۔ اس کی دُم اژدھے کی طرح تھی اور تین سر تھے۔ ایک بکرے ایسا، دُوسرا شیر کا، اور تیسرا سانپ کے مانند اور ان تینوں میں سے آگ نکلتی تھی۔ اس ملک کے بادشاہ کی خواہش تھی کہ وہ عُنقا کو ختم کردے۔ اتفاق سے بیلیرافن اسی بادشاہ کے پاس ملازم تھا۔ اس کی بہادری اور حوصلہ مندی سے بادشاہ

واقف تھا چنانچہ اس نے عنقا کو ہلاک کرنے کی ذمہ داری اسے سونپ دی اور بہت انعام دینے کا وعدہ کیا۔

بیلیرافن نے اسے ہلاک کرنے کی بہت سی ترکیبیں سوچیں لیکن آخرکار اس نتیجے پر پہنچا کہ اُڑنے والے گھوڑے کی مدد کے بغیر یہ کام ناممکن ہے۔ لوگوں سے وہ اس گھوڑے اور اس کی خصوصیات کے بارے میں بہت کچھ سُن چکا تھا۔ اس کے پاس سونے کی جو لگام تھی، وہ درحقیقت طلسمی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کسی بھی گھوڑے پر ڈال دی جائے تو وہ فرماں بردار ہو جاتا تھا۔ تو یوں بیلیرافن، پیگاس کی تلاش میں نکلا تھا اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز عورت نے اسے خوش خبری سنائی کہ گھوڑے کا عکس چشمے کے پانی میں نظر آرہا ہے۔ یہ سُن کر بیلیرافن پھرتی سے اٹھا اور عورت کے ساتھ درختوں میں چھپ کر گھوڑے کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اس نے دیکھا کہ سفید رنگ کا ایک بہت بڑا اور خوب صورت گھوڑا چشمے کے قریب اُترا ہے۔ اس نے پانی پیا اور اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ گھومتے گھومتے وہ اس طرف چلا آیا جہاں بیلیرافن اور عورت چھپے ہوئے تھے۔ ابھی وہ اُڑنا ہی چاہتا تھا کہ بیلیرافن نے چھلانگ لگائی اور اس کی پُشت پر سوار ہو گیا۔ پیگاس نے پہلی بار کسی کو اپنی پُشت پر بیٹھا پا کر بہت ناراضگی کا اظہار کیا۔ اُڑتا ہوا بلندی پر جا پہنچا اور پھر ایک دم نیچے غوطہ لگایا۔ وہ بیلیرافن کو نیچے گرا دینا چاہتا تھا جہاں پہاڑ تھے۔ وہ کبھی کبھی گردن موڑ کر دانتوں سے اسے کاٹنے کی کوشش بھی کرتا۔ بیلیرافن بہت ہوشیار تھا۔ وہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ جب ایک بار کاٹنے کے لیے اس نے گردن گھما کر مُنہ کھولا تو بیلیرافن نے جلدی سے اس کے مُنہ میں طلسمی لگام ڈال دی۔ گھوڑا ایک دم پُرسکون ہو گیا اور سیدھا اُڑنے لگا۔ بیلیرافن نے پیار سے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ اُڑتے اُڑتے کافی دُور جا کر وہ ایک پہاڑ پر اُتر گیا۔ بیلیرافن اس کی پشت سے اُتر گیا مگر اس کی لگام نہ چھوڑی۔ پیگاس مُنہ میں لگام پڑی ہونے کی وجہ سے رونے لگا۔ بیلیرافن کو اس پر رحم آگیا اور اس نے گھوڑے کے مُنہ سے لگام نکال دی۔ آزاد ہوتے ہی پیگاس اُڑ گیا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔

بیلیرافن کو اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے پیگاس آتا دکھائی دیا۔ اس نے گھوڑے کو پیار کیا، مالش کی اور ہری ہری گھاس کھلائی۔ پھر وہ کچھ دن وہیں ٹھہرا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب گھوڑا پوری طرح اس کے بس میں ہے تو وہ عنقا سے نمٹنے کے لیے تیاری کرنے لگا۔

ایک روز وہ صبح کو گھوڑے پر سوار ہو کر ان پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا جہاں عنقا رہتا تھا۔ ایک جگہ پہنچ

گراس نے دیکھا کہ پہاڑوں میں دُور دُور تک انسانوں اور جانوروں کی لاشیں بکھری پڑی ہیں اور درختوں سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ بیلیرا فن کو یہ سب کچھ دیکھ کر یقین ہوگیا کہ عنقا یہیں کہیں رہتا ہے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ کافی دیر بعد اسے ایک غار نظر آیا۔ قریب پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ایک جانور لیٹا ہوا ہے مگر دیکھنے میں یوں لگتا ہے جیسے تین جانور ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہوں۔ ایک شیر، ایک بکری اور ایک سانپ۔ شیر اور بکری کی آنکھیں بند تھیں مگر سانپ جاگ رہا تھا۔ بیلیرا فن نے گھوڑے کو زمین پر نہ اُتارا بلکہ کچھ بلندی پر ہی روک لیا۔ گھوڑے کی ہنہناہٹ سُن کر عنقا جاگ گیا اور تینوں سروں کے ساتھ مُنہ سے آگ اُگلنے لگا۔ پیگاس نے یہ دیکھا تو اور بلند ہوگیا۔ جلد ہی بیلیرا فن نے پیگاس کو نیچے اُتارا اور تلوار نکال کر عنقا پر زبردست وار کیا، پھر جلدی سے اُوپر اُڑ گیا۔ اس نے دیکھا کہ عنقا کے بکری والا سر کٹ کر جُدا ہو چکا ہے مگر شیر اور سانپ کے مُنہ غصّے سے آگ اُگل رہے ہیں۔ ایک بار پھر وہ نیچے آیا اور پھُرتی سے وار کیا۔ اس بار شیر والا سر کٹ کر علیحدہ ہو گیا لیکن اس کا کندھا اور پیگاس کی ایک ٹانگ آگ سے جھلس گئی۔

جب وہ تیسرا وار کرنے نیچے آیا تو سانپ اس سے لپٹ گیا لیکن بیلیرا فن نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے تلوار اس کے مُنہ میں ڈال دی، جس سے وہ مر گیا۔ اس وقت چاروں طرف خوف ناک اندھیرا پھیل گیا اور عنقا کے مُردہ جسم کو خود بخود آگ لگ گئی۔

بیلیرا فن نے یہ دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ بادشاہ کے پاس جا کر اطلاع دی کہ عنقا مر چکا ہے۔ بادشاہ نے خود آکر دیکھا کہ وہ شیطانی بلا مر گئی ہے اور بیلیرا فن کو بہت اِنعام و اکرام دیا۔

بیلیرا فن وہاں سے یونان آیا اور پائیرینی چشمے پر پہنچ کر اس عورت سے ملا جس نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اپنی مہم میں کامیاب ہوگیا ہے اور اس کا شکریہ اَدا کیا۔ پھر اس نے پیگاس کے مُنہ سے لگام نکالتے ہوئے کہا: "اچھے پیگاس! تمھارا بھی بہت شکریہ! تم نے میری بہت مدد کی، جسے میں کبھی نہ بھول پاؤں گا۔ اب تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

مگر پیگاس وہیں کھڑا رہا۔ اسے بیلیرا فن کے اچھے رویّے اور سلوک کی وجہ سے اس سے محبت ہوگئی تھی اس لیے اب وہ اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا۔

بیلیرا فن نے اپنے اِنعام میں سے کچھ چیزیں عورت کو دیں اور پیگاس پر سوار ہو کر اپنے ملک آ گیا۔ --



موت کا پُل

مہروز اقبال

شام ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے،لیکن اندھیرے نے زبردستی اپنی کالی چادر کھیت پر پھیلا دی تھی۔ ہوا چلنی بند ہو گئی تھی۔ شاید اندھیرے میں اختر کو راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔چمکتے ہوئے سورج کو شکست دے کر سارے آسمان پر کالی گھٹاؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ البتہ کبھی کبھی آسمانی بجلی اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی تھی۔

اختر نے جلدی جلدی تمام مرغیوں کو دڑبے میں اور گایوں اور بکریوں کو باڑے میں بند کر کے ان کے قریب کافی گھاس ڈال دی اور لکڑی کا سہارا لیتا ہوا گھر کی طرف چلنے کا ارادہ کیا۔جانے سے پہلے اس نے ایک بار جانوروں پر نظر ڈالی ایک موٹی کالی بکری غیر حاضر تھی۔ وہ اسے موٹی خالہ کہتا تھا۔ موٹی خالہ بڑی چنچل تھی۔ اختر کو خوب ستاتی۔ موقع ملتے ہی اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ ریوڑ میں سے کھسک جاتی اور دُور کسی نیچی جھاڑی کے نرم نرم پتّے کھانے لگتی اور جب اختر موٹی خالہ موٹی خالہ پکارتا ہوا اس کے قریب پہنچتا تو وہ شرارت سے جھاڑی کے دوسری طرف چھپ جاتی۔جب اختر وہاں پہنچتا تو وہ اپنی پہلی جگہ بھاگ آتی۔ جب آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے موٹی خالہ کا جی بھر جاتا تو وہ بڑی شرافت سے خود بہ خود اختر کے پاس آتی اور اپنا سر اُس کے جسم سے رگڑنے لگتی،لیکن آج موٹی خالہ کو غائب پا کر گھبراہٹ اور خوف سے اختر پیپل کے خشک پتّے کی طرح کانپنے لگا۔

بارش کے آثار تھے۔ اگر موٹی خالہ کو کچھ ہو گیا تو اختر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ سوتیلی ماں اُسے کچا چبا جائے گی۔ پچھلے چند برسوں میں اختر کی زندگی میں کئی ہولناک طوفان آئے، جو اپنے ساتھ اس کی خوشی اور سکون کو بہا لے گئے۔ پہلے اس کی اماں بیمار ہوئیں اور جلد ہی اللہ میاں کو پیاری ہو گئیں۔ اس کے ابا نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے اسے ماں کا پیار نہ دیا بلکہ اسے طرح طرح سے پریشان کرنے لگی۔ وہ کبھی کبھی ابا سے جھوٹی

شکایتیں جڑ دیتی تھی لیکن ابا نے کبھی ان پر کان نہ دھرا۔ وہ اور پیار سے اختر کے سر پر ہاتھ پھیر دیتے۔ ماں جل بھن کر راکھ ہو جاتی۔ ابا کے باہر جانے کے بعد ذرا ذرا سی غلطی پر شارک مچھلی کی طرح اچانک اس پر حملہ آور ہوتی اور مکّوں کی بارش کر دیتی۔ اختر نے اسی لیے اس کا نام شارک رکھ دیا تھا۔

ایک دن جب اختر اسکول سے گھر آ رہا تھا تو اس نے ایک بوڑھے نابینا کو ایک گہرے گڑھے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ بستہ پھینک کر وہ چیختا چلاتا نابینا کو خطرے سے خبردار کرنے کے لیے بے تحاشا بھاگا۔ نابینا تو اس کا شور سُن کر رُک گیا، لیکن اختر کا پاؤں ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا اور وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا دھڑام سے ایک اور گڑھے میں جا گرا، جہاں کئی بڑے بڑے نوکیلے پتھر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جسم زخموں سے چُور چُور ہو گیا۔ لوگوں نے اسے اُٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا۔ دو ہفتہ بعد اس کے زخم تو بھر گئے لیکن وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو گیا۔ لنگڑا کر چلنے کے لیے بھی اُسے لاٹھی کا سہارا لینا پڑا۔ لڑکے اسے چھیڑتے اور لنگڑا کہہ کر مذاق اُڑاتے۔ اختر بےچارہ بے بسی اور غصّے سے تلملا کر رہ جاتا۔ سوائے اس کے وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک اور خوف ناک طوفان نے اختر کے آخری سہارے کو اپنے بے رحم پاؤں تلے کچل ڈالا۔ اس کے ابا جو ریلوے اسٹیشن پر ملازم تھے ریل کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ اب سوتیلی ماں اور سوتیلا بھائی اسلم اس پر اور زیادہ سختیاں کرنے لگے۔ اسلم سوتیلی ماں کے پہلے شوہر کا بیٹا تھا۔ صبح سے شام تک اس سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا۔ کھانے کو روکھی سوکھی ملتی۔ بات بات پر جوتیاں پڑتیں۔ اگر کبھی کسی کام میں ذرا بھی خرابی ہو جاتی تو ماں کا ڈنڈا اس کی پیٹھ پر تڑاق سے پڑتا۔

اختر ابھی اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ ایک آہٹ سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہے کہ موٹی خالہ خراماں خراماں بڑی شان سے کھلیان میں داخل ہو رہی ہے۔ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ کھلیان کا دروازہ بند کر کے اختر لنگڑاتا ہوا گھر کی طرف بھاگا۔ زور کا بادل گرجا اور پانی کی موٹی موٹی بوندیں اختر کی کھوپڑی پر پٹ پٹ پڑنے لگیں۔ گھر میں گھستے ہی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ جیسے ہی وہ اپنی گیلی قمیص اُتار کر پھینکنے لگا اس کا سوتیلا بھائی

اسلم وہاں آگیا اور قیمہ اس کے منہ پر تھوپ دیں بھر کیا تھا۔ اس نے بھدی آواز کے ساتھ اپنا لاؤڈ اسپیکر کھول دیا۔ آتی ملنگ نے میرے منہ پر قیمہ مار دی۔ ایک ٹانگ والا لنگور کا منہ کالا، لنگور نے ماری دم لنگڑا گیا گم۔

اپنے لاڈلے کی آواز سن کر شالک آنکھیں چڑھائے ہوئے جھاڑو لہراتی آئی اور ٹانگ دیے بغیر اختر کی دھنائی شروع کر دی۔ سر، پیٹھ، بازو، پاؤں غرض اختر کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہ چھوٹا جہاں جھاڑو نہ پڑی ہو۔ اختر بڑی بہادری سے جھاڑو کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار شالک نے ہار مان لی۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ ہاتھ درد کرنے لگا۔ مجبوراً اسے ہاتھ روکنا پڑا۔

اختر وہیں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے اپنے ماں باپ بہت یاد آئے۔ وہ خوب جی بھر کر رو دیا۔ سوچ رہا تھا کہ آخر اسے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ موسلادھار بارش کے شور سے وہ اسلم اور شالک کی آواز آہٹ تو نہیں سن سکتا تھا، لیکن اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ دونوں پلاؤ اڑا رہے ہیں۔ اس خیال آتے ہی پلاؤ کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ جب کبھی شالک اختر سے ناراض ہو جاتی اسے بھوکا ہی رہنا پڑتا۔

اختر نے عشا کی نماز پڑھی اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ ابھی وہ مشکل سے آدھا گھنٹہ سویا ہو گا کہ اچانک انجن کی زوردار سیٹی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ وہ کھڑکی کھول کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ گہرے بادل ابھی تک چھائے ہوئے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کا ایک آدھ جھونکا بھی آ جاتا۔ بارش کا پانی جگہ جگہ کھڑا تھا۔ بستی سے تھوڑے فاصلے پر دو ندیاں بہتی تھیں۔ ایک ندی بڑی تھی اور دوسری چھوٹی۔ ان دونوں ندیوں پر ریل کے پل تھے، جن پر سے ریل گاڑیاں گزرا کرتی تھیں۔ اختر جب کبھی انجن کی سیٹی سنتا۔ ذرا سی دیر کو اپنا کام چھوڑ کر ریل کے انتظار میں کھڑا ہو جاتا۔ اسے گزرتا دیکھ کر خوب لطف اندوز ہوتا۔ انجن کی سیٹی پھر سنائی دی۔ اس بار سیٹی کی آواز قریب سے آئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی نے بڑی ندی کو پار کر لیا ہے۔ اتنے میں دور سے انجن کی روشنی نظر آئی اور تھوڑی دیر میں چھک چھک کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ اچانک بجلی کڑکی۔ اختر نے دیکھا کہ یہ گاڑی نہیں صرف انجن ہے جو کھیت کے سامنے سے گزرتا ہوا چھوٹی

[illegible] ۔ جیسے ہی وہ چھوٹی ندی کے پُل پر پہنچا اچانک ایک آواز پیدا ہوئی [illegible] اسی وقت بجلی چمکی۔ اختر نے دیکھا کہ پُل ٹوٹ گیا ہے اور انجن ندی میں گر چکا ہے۔ اختر سے دیکھا نہ گیا۔ اس نے سوچا کہ اسے وہاں ضرور پہنچنا چاہیے۔ شاید وہ ڈوبتے ہوئے انجن ڈرائیور کی کچھ مدد کر سکے۔ یہ سوچتے ہی اس نے اپنے ابا کی لالٹین اٹھائی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اسلم اور اس کی ماں کے خراٹوں کی آواز دُور تک سُنائی دے رہی تھی۔ چھوٹی ندی زیادہ دُور نہیں تھی اس لیے اختر کو وہاں پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ اختر نے دیکھا کہ انجن ندی میں تقریباً ڈوب چکا تھا۔ اب وہ سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتا تھا۔

اچانک اسے اس مسافر ٹرین کا خیال آیا جو ایک گھنٹے بعد وہاں سے گزرنے والی تھی۔ وہ بھی ندی میں گر جائے گی اور اس میں سوار تمام مسافر ڈوب جائیں گے۔ ان کی جان بچانے کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس نے اسٹیشن جا کر پُل ٹوٹنے کی خبر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی پھر شروع ہو گئی تھی۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو رہی تھی۔ راستہ بہت خراب تھا۔ کئی مرتبہ اس کا پاؤں پتھروں سے ٹکرا گیا۔ ایک دو مرتبہ تو وہ پانی کے ایک گڑھے میں گرتے گرتے بچا، لیکن سب سے زیادہ مشکل مرحلہ اُس وقت آیا جب وہ بڑی ندی کے پُل پر پہنچا۔ یہ خاصا لمبا پُل اسے طے کرنا تھا۔ اللہ کا نام لے کر اس نے پل پر قدم رکھ دیا۔ ندی بڑی تیزی سے بہ رہی تھی۔ پانی کی سطح پُل سے ذرا ہی نیچے تھی۔ ابھی اسے پل پر کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ وہ لڑکھڑایا۔ خود تو گرنے سے بچ گیا، لیکن لالٹین ہاتھ سے چھوٹ کر غراتی ہوئی لہروں میں غائب ہو گئی۔ اب گھور اندھیرا تھا اور دریا کا خوف ناک شور۔ اختر پُل کا کنارہ پکڑ کر بڑی مشکل سے کھڑا ہوا، لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ چل کر پُل پر سے نہیں گزر سکتا۔ ہوا کے تیز تھپیڑے اسے ندی کی خون خوار لہروں کے آگے ڈال دیں گے۔ اب وہ کیا کرے؟ وقت تھا کہ اپنی پوری رفتار سے بھاگا جا رہا تھا۔ اس نے ہمّت نہیں ہاری۔ وہ پُل پر اوندھا لیٹ گیا۔ چھڑی ہاتھ میں تھامے رہا اور سانپ کی طرح رینگنے لگا۔ اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ اسٹیشن پہنچنے سے پہلے گاڑی نہ آجائے ورنہ ذرا سی دیر میں کتنی بہت سی انسانی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اس نے اور تیز رینگنا

شروع کر دیا۔ اچانک اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کا گھٹنا ایک بڑی کیل سے لگ گیا تھا۔ تکلیف بڑی شدید تھی۔ گھٹنے پر ہاتھ رکھا تو وہ سارا خون میں بھر گیا۔ کچھ دیر مضبوطی سے گھٹنا تھامے وہیں بیٹھا رہا۔ اتنے میں بجلی چمکی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس وقت وہ پُل پر ٹھیک ندی کے بیچ میں تھا، لیکن اختر پھر اللہ کا نام لے کر اپنی منزل کی طرف رینگنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جب اسے اسٹیشن کی روشنی نظر آئی تو اسے ایسی خوشی ہوئی جیسے لذیذ کھانوں کا تھال کسی نے اس کے آگے رکھ دیا ہو۔ پُل ختم ہوا تو وہ چھڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ گھٹنے میں اب بھی سخت درد تھا، لیکن ریل کو حادثے سے بچانے کے شوق میں اس نے تکلیف کی بالکل پروا نہ کی، بلکہ اب وہ تیز چلنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ انجن کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ ٹرین اسٹیشن سے موت کے پُل کی طرف روانہ ہونے ہی کو تھی۔ اختر نے لنگڑاتے ہوئے دوڑ لگا دی۔ دوسری سیٹی تاریک اور خاموش فضا میں چنگھاڑی اور اختر نے اور تیز دوڑنا شروع کر دیا۔ ٹھوکر کھائی، گرا، سنبھلا اور پھر دوڑ لگانے لگا۔

گاڑی اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔ اختر اور ریل کا فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پٹڑی کے بیچوں بیچ دوڑ رہا تھا۔ اس نے زور سے چلانا شروع کر دیا:

"رُک جاؤ! آگے خطرہ ہے۔ دریا کا پُل ٹوٹ گیا ہے۔"

شور میں اختر کی آواز بڑی مشکل سے ڈرائیور تک پہنچی۔ اب ریل بالکل قریب تک پہنچ چکی تھی۔ اختر نے گھبرا کر پٹڑی کے باہر چھلانگ لگائی۔ ڈرائیور نے بریک لگا کر گاڑی کو روکنے کی کوشش کی، لیکن وقت گزر چکا تھا۔ اختر کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں، لیکن گاڑی رک گئی اور اختر کا مقصد پورا ہو گیا۔ اختر کو ہسپتال میں ہوش آیا تو درد کی شدت کے باوجود وہ خوش تھا کہ اتنی جانیں بچ گئیں۔

اختر کو حکومت نے انعام دیا اور لوگوں نے عزت سے نوازا اور خود اس نے اپنی ہمت کا دامن نہ چھوڑا۔ انعام کی رقم سے اس نے مصوری سیکھی اور بہت جلد مہارت حاصل کر کے شہرت اور عزت حاصل کی۔


لکھ کر ڈال دیا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ آپ
ارے بھائی وہ واپس کہاں سے
آئیں گی وہ تو اب تک اپنے پانچ گھروں میں


فکر مند نہ ہوں۔ دراصل بڑھاپے کی وجہ سے
آپ کی اس ٹانگ میں درد رہتا ہے۔
مگر ڈاکٹر صاحب دوسری ٹانگ
کی بھی اتنی ہی عمر ہے، لیکن اس میں کوئی
تکلیف نہیں ہے۔

باورچی خانے میں

کسٹرڈ پاؤڈر کیسے بنتا ہے

سید رشید الدین احمد

کسٹرڈ پاؤڈر ہر جگہ ملتا ہے اور تقریباً سبھی اسے تیار کرنے کی ترکیب جانتے ہیں جو بہت شوق سے کھایا جاتا ہے گرم ہو یا ٹھنڈا، سب اسے پسند کرتے ہیں۔ ویسے یہ زیادہ تر ٹھنڈا کر کے کھایا جاتا ہے۔ پیالیوں میں ڈال کر ریفریجریٹر میں یا برف پر رکھنے سے یہ خوب ٹھنڈا ہو کر بہت مزے دار ہو جاتا ہے۔ اس میں دو تین قسم کے میوے یا پھل شامل کر لیے جائیں تو اس کا مزہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ آپ اسے کیسے پکاتے اور جماتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خود یہ پاوڈر کیا ہے اور کیسے بنتا ہے؟

کسٹرڈ زیادہ تر مکئی سے بنتا ہے۔ ہاں، یہی مکئی جس کے بھٹے اور پاپ کارن آپ مزے لے کر کھاتے ہیں۔ آپ شاید جانتے ہوں کہ مکئی کے ان دانوں سے اب تیل بھی نکالا جاتا ہے جو کارن آئل کہلاتا ہے۔ یہ تیل صحت کے لیے بہت مفید سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کھانے سے انسان کے خون میں روغنی مادّہ یعنی کولسٹرول نہیں بنتا جس سے بلڈ پریشر اور دل کی بہت سی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مکئی سے جو میدہ یا سفید آٹا الگ کرتے ہیں اُسے کارن فلور یا مکئی کا آٹا کہتے ہیں۔ گندم کے میدے کی طرح اس میں بھی کسی قسم کی بُو نہیں ہوتی۔ مکئی کا یہ میدہ کئی چیزوں کی تیاری میں کام آتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں تو یہ استعمال ہوتا ہی ہے، لیکن صنعتی مقاصد کے لیے بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ گھروں اور ہوٹلوں میں اسے عام طور پر شوربے اور دودھ وغیرہ کو گاڑھا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مشہور چینی شوربے "چکن کارن سوپ" میں یہ ضرور استعمال ہوتا ہے۔

مکئی کے اسی سادے آٹے میں خوشبو اور رنگ کا اضافہ کر کے جو چیز تیار کی جاتی ہے وہ کسٹرڈ پاوڈر کہلاتی ہے۔ مثلاً اس میں زرد رنگ اور ونیلا کی

خوشبو ملانے سے ونیلا ذائقے کا کسٹرڈ پاؤڈر بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس میں رس بھری، گلاب یا چاکلیٹ وغیرہ کا رنگ اور خوشبو بھی ملائی جاتی ہے۔ عام طور پر ونیلا کی خوشبو والا کسٹرڈ پاوڈر زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دودھ میں کسٹرڈ پاوڈر ملا کر پکانے سے دودھ گاڑھا ہو جاتا ہے جیسے آپ اپنی مرضی کے مطابق کھا سکتے ہیں، سادہ بھی اور پھل وغیرہ ملا کر بھی۔ کسٹرڈ ایک طاقت دینے والی غذا ہے۔ کم زور نظام ہضم کے مریض اسے جلد اور آسانی سے ہضم کر لیتے ہیں۔ دسترخوان کو سجانے اور مہمانوں کی خاطر کے لیے کسٹرڈ ایک خوش نما اور لذیذ ڈش ہے۔

کسٹرڈ میں کیک ملا کر تیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ۲۲۵ گرام سادہ کیک، ۷۵ گرام بالائی، ایک کیلو گرام دودھ، ۲۰ گرام شکر، تین بڑے چمچے کسٹرڈ یا مکئی کا آٹا اور ۱۲۵ گرام کریم لیں۔ کیک کو ڈبل روٹی کی سلائس کی طرح کاٹ لیں۔ آدھ پاؤ دودھ میں بالائی ملا کر کیک کے ٹکڑوں کو اس میں بھگو دیں۔ باقی دودھ گرم کریں۔ جب خوب ابل جائے تو شکر ملا دیں۔ اب تھوڑے سے دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر کو گھول کر پورے دودھ میں ملا کر گرم کرتی رہیں، چمچہ چلاتی رہیں۔ گاڑھا ہوتے ہی چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے دیں، لیکن اب بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد چمچہ چلا کر جمنے نہ دیں۔ جب پورا ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں کیک کے ٹکڑے ملا دیں اور خوب صورت ڈش میں رکھ کر میز پر سجا دیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے؟

مرسلہ: منور حبیب، گلشن وسیم کراچی

- ہاکی کا پہلا اولمپک چیمپئن برطانیہ تھا۔
- ہیر کے خالق وارث شاہ کو پنجابی زبان کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے۔
- کنگ آف کرکٹ پاکستان کے مایۂ ناز کرکٹر حنیف محمد کو کہا جاتا ہے۔

پیامیوں کے لیے خوش خبری

اب ہر ماہ "بچوں کی کوششیں" کے صفحات میں مضمون نگار کا فوٹو بھی شائع ہوگا۔ اپنے مضمون کے ساتھ اپنا پاسپورٹ سائز فوٹو بھی بھیجیے۔

سوال وجواب

حکیم محمد سعید

طب کی روشنی میں

کان میں مسّا

س : عمر ۱۶ سال۔ میرے کان میں مسّا نکلا ہے۔ برائے مہربانی کوئی علاج بتائیں ؟ اظہر علی

ج : کان تو بڑی چیز ہے۔ بیرونِ کان مسّا ہے یا کان کے درمیانی یا اندرونی حصے میں ہے ؟ دیکھے بغیر صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ بہ ظاہر اس کے لیے جراحت (سرجری) کا سہارا لینا چاہیے۔

بلغم آتا ہے

س : عمر ۱۴ سال ہے۔ مجھے بلغم بہت آتا ہے، میں جب بھی کوئی میٹھی چیز کھاتا ہوں تو بلغم آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ازراہِ کرم علاج تجویز فرمائیے۔ ع۔م بشری پاک

ج : بھئی کس حکیم نے آپ کو میٹھی چیزیں زیادہ کھانے کو بتایا ہے۔ یہ حلوائیوں کی مٹھائیاں کھانا کوئی اچھی عادت نہیں ہے۔ ہماری قدرتی غذاؤں میں اس قدر مٹھاس تو ہوتی ہے کہ جسم کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ دراصل یہ حلوے، مٹھائیاں، کیک پیسٹری وغیرہ اضافی شکر ہے جو جسم کی ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے، مگر ایک فیشن ہو گیا ہے۔ لوگ دبا کر کھائے چلے جا رہے ہیں۔ بیمار پڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہسپتال چلے جا رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ توبہ!

سُوکھے کی بیماری

س : ازراہِ کرم یہ بتائیں کہ سوکھا پن کیوں ہوتا ہے اور اس کا علاج کیا ہے ؟

محمد الیاس تنویر

ج : غالباً آپ بچوں کے سُوکھے کے مرض کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہو تو ماں کی غذا قابلِ اطمینان نہ ہو۔ وہ غذا بچے کے نشوونما کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو۔ پھر جب بچہ پیدا ہو جائے تو اس کے نشوونما کے لیے حیاتین اُسے میسر نہ آئیں۔

دراصل سُوکھا تو حیاتین کی کمی کا مرض ہے۔ یہ بات تو ننھے بچے کی ہوئی۔ اب اگر آپ نے بات بڑے سوکھے کی کی ہے تو ایک کہاوت ہے، "کھائے بکری کی طرح، سوکھے لکڑی کی طرح" بعض لوگ زیادہ کھا کر بھی سوکھ جاتے ہیں۔

کمر میں درد

س : والدہ محترمہ کی عمر ۳۰ سال ہے۔ کمر میں درد رہتا ہے۔ از راہ کرم کوئی علاج بتائیں۔

محمد بابر۔ اظہار احمد،

ج : محترمہ والدہ صاحبہ کو چاہیے کہ وہ کسی اچھے معالج سے مشورہ فرمائیں۔ دردِ کمر کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سطری سوال سے بتائیے میں کیسے سمجھوں؟

جلد پر سفید دھبے

س : مچھلی کھا کر دودھ پینے سے جلد پر سفید دھبے کیوں پڑ جاتے ہیں اور جُذام کی طرح پھیلتے رہتے ہیں اور پورے جسم کی جلد سفید کیوں ہو جاتی ہے؟

روبینہ فرید،

ج : اب تک یہ بھی یقین نہیں ہے کہ کون سی مچھلی دودھ کے ساتھ مل کر سفید دھبوں (برص) کا سبب بن جاتی ہے اور نہ اب تک یہ تحقیق ہوتی ہے کہ خون میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں کہ جلد کا رنگ خراب ہو جاتا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ مچھلی اور دودھ کو ایک ساتھ معدے میں جمع نہ کیا جائے۔

پسلی میں درد

س : عمر ۱۷ سال ہے۔ میری پسلی میں درد ہوتا ہے۔ کافی علاج کرایا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کبھی کبھی اچانک درد شروع ہو جاتا ہے۔ آپ از راہِ کرم اس مرض کا علاج بتائیے۔

عبدالرحیم،

ج : میرے بچے! اتنا تو لکھ دیا ہوتا کہ کون سی پسلی؟ دائیں یا بائیں؟ دائیں جانب تو جگر ہوتا ہے اور بائیں جانب تلی۔ اب اگر پسلی کا درد اوپر سینے میں ہے تو یہ پھیپھڑے کا درد بھی ہو سکتا ہے اور یہ مسئلہ قلب کا بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا ہے کہ آپ کسی اچھے معالج کو دکھا دیجیے۔

ناک سے خون آتا ہے

س : مجھے کافی گرمی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ گرمی کی وجہ سے رات کے وقت، یعنی نیند میں ناک سے خون (نکسیر) بہنے لگتا ہے۔ از راہ کرم کوئی علاج بتائیں۔

محمد اجمل نعیم،

ج : حالات سے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ نے کسی نانبائی سے دوستی کر لی ہے اور تنور میں روٹیاں ڈال دی

[illegible]

[illegible] کی بات کہنے [illegible]

[illegible] آپ کو دوا [illegible]

[illegible] ایک عدد، شربت انجبار ۲۳ گرام۔ دونوں میں کھا کر اوپر سے شربت پانی میں گھول کر پی لیں۔ ۱۵۔۲۰ دن کھائیے آرام آ جائے گا۔

ہاتھ پاؤں جلتے ہیں

س: عمر ۲۷ سال ہے۔ ہر وقت ہاتھ اور پاؤں جلتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے، جیسے ہاتھ اور پاؤں سے آگ نکل رہی ہو۔ ہر وقت ٹھنڈی چیزیں، یعنی آئس کریم اور برف کھانے کو جی چاہتا ہے۔ پاؤں کے بل پر بیٹھتا ہوں تو بھی ایسا لگتا ہے جیسے آگ نکل رہی ہے۔ کھلا یا بند جوتا بھی پہنا نہیں جاتا۔ مہربانی فرما کر علاج تجویز کیجیے۔

زبیر احمد شاہد،

ج: مزاج کی بے اعتدالی ہے۔ آپ خشک آلو بخارا چار دانے رات کو پون گلاس پانی میں بھگو کر صبح مَل کر چھان لیں، گٹھلیاں الگ ہو جائیں گی۔ انھیں پھینک دیں اور پانی پی لیں اس سے یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔

بال گر رہے ہیں

س: عمر ۱۵ سال ہے۔ میرے بال بہت گر رہے ہیں۔ بتائیے میں کیا کروں جس سے میرے بال گرنا بند ہو جائیں۔

صائمہ محبوب،

ج: سر کی صفائی پر زیادہ توجہ دے۔ اگر نہ کی جائے تو جلد خراب ہو جاتی ہے اور پھر اس میں خشکی یا سیکری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بھوسی جمنے اور جھڑنے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں بالوں کی جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں اور بال گرنے لگتے ہیں۔ اگر خشکی ہے تو پھر اسے دور کرنا چاہیے۔ ہمدرد سے دوائے خارش ۶ گرام، روغن کیلا ۶۰ گرام لے لیں۔ دونوں کو ملا لیں۔ رات سوتے وقت یہ تیل پورے سر میں لگائیں، صبح سر دھو لیں۔ ایک دو ہفتے میں اس سے فائدہ ہو جائے گا۔



[illegible]

★ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم — سب کو سلام کیا کرو۔

★ حضرت ابو بکر صدیقؓ — سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے پہلے سلام کرے۔

★ حضرت عثمانؓ — وہ علم بے کار ہے جس پر عمل نہ کیا جائے۔

★ حضرت علیؓ — آدمی کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔

★ حضرت حسن بصریؒ — عقل مند سوچ کر بولتا ہے اور بے وقوف بول کر سوچتا ہے۔

★ فیثا غورث — دولت میں [illegible] بہتر ہے۔

★ سقراط — اللہ نے دو کان دیے ہیں اور ایک زبان، مگر انسان جتنا [illegible] اس سے زیادہ [illegible] ہے۔

★ افلاطون — سب سے طاقتور شخص وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پا لے اور سب سے کمزور شخص وہ ہے جو اپنے راز نہ چھپا سکے۔

★ شیخ سعدی — علم کے حصول کے لیے شمع کی طرح پگھلنا چاہیے۔ علم کے بغیر تم اللہ کو نہیں پہچان سکتے۔

★ لاک — دولت محنت کا ثمر ہوتی ہے۔

★ جبران خلیل جبران — محبت ایک جذبہ ہے جس کی طاقت آسمان اور زمین کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

★ مولانا محمد علی جوہر — جو شخص حصول علم کی مشکلات برداشت نہیں کر سکتا اسے جہل کی سختیاں عمر بھر جھیلنی پڑتی ہیں۔

★ شیکسپیئر — [illegible]

★ [illegible]



حضرت آدم علیہ السّلام

منوّرہ نوری خلیق

پیارے بچو!

اللہ تعالیٰ سب کا خالق و مالک ہے، محافظ ہے، رزق عطا فرمانے اور رحم کرنے والا ہے۔ وہ دیکھنے والا، سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ ہر عیب، ہر نقص اور ہر کمزوری سے پاک اور اِس قدر صفات کا مالک ہے کہ اگر انسان ہزار بار پیدا ہو کر تمام عمر اُس کی صفات کا احاطہ کرنا چاہے تو بھی ناکام ہی رہے گا۔ انسان اِس قادرِ مطلق کو دیکھ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی صفات کی تعریف کر سکتا ہے لیکن خدا ہر وقت، ہر لمحے سب کو دیکھتا ہے، سب کی سُنتا ہے اور دلوں کے بھید جانتا ہے۔

پیارے بچو! دنیا کی کسی بھی زبان میں لفظ اللہ کی جمع نہیں اور نہ ہی دنیا کی کسی بھی زبان میں اِس لفظ کی تانیث (مؤنث) ہے۔ اللہ تعالیٰ واحد و لاشریک ہے۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ انسان اُسے بہت سے ناموں سے پکارتا اور یاد کرتا ہے اور زمین و آسمان کی ہر شے اُسی کی تسبیح و عبادت کرتی ہے۔ بہرکیف جب خداوند تعالیٰ جو ساری کائنات کا مالک و خالق ہے، اپنی اِس مملکت کے اُس خطے کو ظہور میں لایا جسے زمین کہتے ہیں تو اُس نے انسان کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔

انسان کی پیدائش سے قبل زمین پر اُس کی جو مخلوق آباد تھی، اُسے "جن" کہا جاتا ہے، جنھیں آگ سے پیدا کر کے خالقِ کائنات نے اپنی عبادت کا طریقہ بتلایا تھا۔ مدتوں یہ مخلوق اُس کے احکامات پر چلتی رہی پھر سرکشی پر اُتر آئی۔ تب خداوندِ عالم نے انھیں اُن کی مسلسل سرکشی کے باعث سزا دینے کا فیصلہ کیا اور حضرت عزرائیل علیہ السلام کو فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ زمین پر بھیجا جنھوں نے کرۂ ارض کو جنّوں کے فتنے سے پاک کر دیا۔ اُس وقت ایک جن ایسا بھی تھا جو مسلسل عبادتِ الٰہی کرتا تھا اور چپکے چپکے اپنی عبادت پر مغرور تھا لیکن فرشتوں کو علم نہ تھا لہٰذا اُسے عبادت کرتا دیکھ کر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اجازت لی اور اِس عبادت گزار

جن کو آسمانوں پہ لے گئے جہاں وہ فرشتوں کے ساتھ شامل ہو کر حمد و ثنا کرنے لگا لیکن اِس اعزاز پر اُس کا غرور بہت بڑھ گیا۔ اِس جن کا نام ابلیس تھا۔

یہی زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ نے اِس زمین کو اپنی قدرتِ کاملہ سے بہت حُسن عطا فرمایا، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، ستاروں سے آراستہ کیا اور معتدل رکھنے کے لیے ہوا کو چلتے رہنے کا حکم صادر فرمایا۔ اِس کے بعد انسان کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس موقع کے لیے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر وضاحت کی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا: "پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں، انھوں نے کہا: کیا آپ زمین پر کسی ایسے کو پیدا کرنے والے ہیں جو اُس کے انتظام کو بگاڑے گا اور خون ریزیاں کرے گا جبکہ آپ کی حمد و ثنا اور تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳۰)

اللہ تعالیٰ نے اُن سب کو جواب دیا: "جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔" (سورۃ البقرہ آیت ۳۰)

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا کے سب سے پہلے انسان کو بنایا۔ وہ اِس طرح کہ اسی زمین سے ہر رنگ اور ہر خاصیت کی مٹی منگائی جس سے ایک انسان کا پتلا تیار کیا اور رُوح کو حکم دیا: "اِس پتلے میں داخل ہو جا۔" رُوح آگے بڑھی لیکن اِس تیرہ غار میں داخل ہونے سے گھبرانے لگی۔ اُس وقت فرمایا گیا: "گھبرا مت، تھوڑے عرصے کے بعد ہم تجھے اِس پتلے سے کھینچ لیں گے۔" یہ سنتے ہی رُوح اندر داخل ہو گئی۔

رُوح کیا چیز تھی؟ اِس سوال کا جواب یہی ہے کہ رُوح زندگی ہے، قدرت ہے، قوت ہے، ادراک ہے، ارادہ و اختیار ہے، علم و دانش ہے اور صفاتِ الٰہی کا پرتو ہے۔ بہرحال خدا کے حکم پر جوں ہی رُوح اِس خاک کے پتلے میں داخل ہوئی، اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اُسی لمحے فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ دنیا کے اِس پہلے انسان کو سجدۂ تعظیم بجا لائیں۔ قرآن مجید میں اِس وقت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"ہم نے انسان کو بجنے والی مٹی سے بنایا۔ اِس سے پہلے ہم جنوں کو آگ سے پیدا کر چکے تھے۔ پھر یاد کرو وہ موقع جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں کھنکتی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اِس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اُس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ (سورۃ الحجر آیت نمبر ۲۹)

الغرض اللہ تعالیٰ کا حکم سننا تھا کہ تمام فرشتے سجدے میں گر گئے لیکن "ابلیس" جو اپنی عبادات اور آسمانوں تک پہنچ جانے پر بری طرح سے نازاں تھا، اُن فرشتوں میں شامل نہ ہوا بلکہ اُس نے برملا خاک سے بنے ہوئے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ انکار اور تکبر دونوں باتوں سے اللہ تعالیٰ کو شدید نفرت ہے۔ یہ دونوں برائیاں اِس جن میں آ گئی تھیں، اُس

نے کہا: "میں آگ سے بنایا گیا ہوں اور یہ خاک سے، پھر بھلا میں اسے سجدہ کیوں کروں؟"

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

(خدا نے حکم دیا تو) تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اُس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: 'اے ابلیس! تجھے کیا چیز مانع تھی جو تُو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟' اُس نے جواب دیا: 'میرا یہ کام نہیں کہ میں اُس بشر کو سجدہ کروں جسے تُو نے سڑی ہوئی مٹی کے سُوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔' (سورۃ الحجر آیت نمبر ۳۳)

اس سرکشی، غرور اور انکار پر جلالِ خداوندی بھڑکا اور خداوندِ عالم نے ابلیس کو مردود اور راندۂ درگاہ قرار دے کر طوقِ لعنت اُس کے گلے میں ڈال دیا اور اُسے آسمانوں کی بلندیوں اور فرشتوں کی صفوں سے نکال دیا۔ تب یہ ابلیس، یہ شیطان بڑی رسوائی اور ذلت کے ساتھ دل میں انتقام کی آگ لیے وہاں سے رخصت ہو گیا مگر اُس نے انتقام لینے کا برملا اظہار بھی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ناراض ہو کر فرمایا۔

'اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تُو مردود ہے۔ اور روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔' تب اُس نے عرض کیا: 'میرے رَبّ! اگر یہ بات ہے تو مجھے اُس روز تک کے لیے مہلت دیجیے جب انسان دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔' فرمایا: 'اچھا تجھے مہلت ہے اُس دن تک کے لیے جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔' (سورۃ الحجر آیت نمبر ۳۸)

بہرکیف شیطان مہلت لے کر رخصت ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اِس انسان کو بہشتی لباس پہنا کر جنّت میں گھومنے پھرنے اور رہنے کا حکم صادر فرمایا۔ یُوں یہ انسان، یہ مسجودِ ملائک آدم، جنّت میں رہنے لگے لیکن چند دن ہی گزرے تھے کہ اُنھیں تنہائی محسوس ہوئی کیونکہ ساتھی کی ضرورت انسانی فطرت تھی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی یہ ضرورت اور خواہش محسوس کی اور اُنھی کی پسلی سے ایک نرم و نازک اور خوبصورت ساتھی پیدا کی جن کا نام حوّا تھا۔ قرآن مجید میں اُن کی پیدائش کے بارے میں بس اتنا ہی کہا گیا۔

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک شخص سے پیدا کیا۔ اُس سے اُس کا جوڑا بنایا پھر اُن دونوں سے کثرت کے ساتھ مرد و عورت پیدا کر کے روئے زمین پر پھیلا دیے۔ (سورۃ النساء آیت ۱)

بہرحال آدم علیہ السلام اور بی بی حوّا کو بنانے کے بعد انھیں جنّت میں رہنے سہنے اور فراغت کے ساتھ وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دی لیکن اِس کے ساتھ ہی ایک درخت کے بارے میں حکم دیتے ہوئے فرمایا: "اے آدم! اِس درخت کے نزدیک مت جانا اور نہ اِس کا پھل کھانا ورنہ حکم عدولی کی صورت میں نافرمانوں میں شامل کر دیے جاؤ گے۔"

حضرت آدم علیہ السلام نے اِس حکم پر سرِ تسلیم خم کیا اور بی بی حوّا کے ساتھ جنّت میں رہنے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے لگے۔ اُس وقت دنیا کے یہ پہلے انسان اور اُن کی ساتھی دونوں جنّت کا لباس پہنے رہتے تھے۔ گھومتے پھرتے تھے خدا کی قدرت پر غور کرتے تھے اور ہر لمحے اُس کی عظمت کی تعریفیں کرتے تھے۔ الغرض زندگی بڑی پُر سکون مسرّت اور آرام کے ساتھ گزر رہی تھی مگر شیطان جو اُنھیں سجدہ نہ کرنے کے باعث ذلیل و خوار کر کے جنّت سے نکالا گیا تھا اُب بدلہ لینے کے لیے موقع دیکھ رہا تھا لیکن جنّت سے نکالا گیا تھا لہٰذا وہاں پھر داخل ہونا آسان بات تو نہ تھی۔ کچھ وقت یوں ہی گزر گیا۔ پھر ایک روایت کے مطابق مور کی مدد سے سانپ کا رُوپ دھار کر جنّت میں پہنچا اور ان دونوں کو شجرِ ممنوعہ کھانے کی ترغیب دینے لگا۔ اِس موقع کے لیے ارشادِ خداوندی ہے،

"ہم نے کہا، اے آدم! تم اور تمھاری بیوی بہشت میں رہو اور جہاں سے چاہو بے روک ٹوک کھاؤ لیکن اِس درخت کے پاس مت جانا ورنہ ظالموں میں شمار کیے جاؤ گے، پھر شیطان نے اُن دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا جہاں وہ تھے۔ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳۵)

بس یہی وہ وقت تھا جب انسان پہلی بار شیطان کے دھوکے میں آیا اور اُن دونوں نے اُس درخت کا پھل کھا لیا۔ کہا جاتا ہے وہ گندم کا دانہ تھا جو اُن دونوں کے معدوں میں پہنچا تو اُن کے جسموں سے بہشتی لباس اُتر گئے اور وہ برہنہ ہو گئے۔ اُس وقت اُنھیں غم بھی تھا شرمندگی بھی اور وہ خود کو چھپانا چاہتے تھے۔ فرمایا گیا ہے۔ شیطان نے دھوکا دے کر اُنھیں معصیت کی طرف کھینچ لیا۔ جب اُنھوں نے اُس درخت کا پھل کھا لیا تو اُن کی پوشیدہ چیزیں کھل گئیں۔ تب وہ بہشت کے درختوں سے پتے لے کر اپنا جسم چھپانے لگے۔ اُس وقت اُن کے پروردگار نے کہا، 'کیا میں نے تمھیں اُس درخت کے پاس جانے سے منع نہیں کیا تھا اور جتا نہیں دیا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟' وہ دونوں عرض کرنے لگے۔ "اے پروردگار! بے شک ہم نے خود پر ظلم کیا۔ اب اگر تو ہمیں بخشش نہیں دے گا اور رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

(سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۳)

اِسی طرح خطا سرزد ہوتے ہی حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوّا شرمندہ ہو گئے اور خدا سے معافی طلب کرنے لگے لیکن وہ نافرمانی کر چکے تھے اور اللہ تعالیٰ اُن کے لیے فیصلہ کر چکا تھا لہٰذا اُنھیں بھی جنّت سے چلے جانے کا حکم دے دیا گیا اور فرمایا گیا،

"تم (دونوں) بہشت سے چلے جاؤ۔ اب سے تم ایک دوسرے (انسان اور شیطان) کے دشمن ہو اور تمھارے لیے ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھکانا مقرر کر دیا گیا ہے۔ اسی میں تمھارا مرنا جینا ہو گا اور اِسی سے تم (قیامت کے دن) زندہ کر کے نکالے

جائیں گے۔ (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۵)

اس فرمان کے ساتھ ہی آدم علیہ السلام کو سراندیپ میں اور بی بی حوّا کو جدّہ میں پھینک دیا گیا اور اُس وقت شیطان کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیا گیا لیکن انسان اور شیطان کی فطرت جُدا جُدا تھی۔ انسان خلیفۃ اللہ تھا۔ تمام مخلوق میں افضل ترین تھا لہٰذا خطا محسوس کرکے مالکِ حقیقی سے شرمندہ تھا۔ اُسے اپنا کھویا ہوا مقام پانے سے زیادہ اپنے مالکِ حقیقی کی خفگی کا احساس تھا جسے منانے کے لیے زمین پر آتے ہی اُس نے توبہ استغفار شروع کر دی۔ گویا انسان نے پہلی عبادت توبہ کی صُورت میں کی لیکن شیطان اپنی خطا کو محسوس کرنے کا عادی نہ تھا لہٰذا گناہ سے توبہ کرنے کی بجائے وہ ضد میں آ گیا اور اللہ تعالیٰ سے مہلت تو لے ہی چکا تھا، اب آدم علیہ السلام کو بھٹکانے اور ورغلانے نافرمان کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔

تین سو برس گزر گئے حضرت آدم علیہ السلام اپنی خطا پر شرمندہ تھے۔ وہ مسلسل گریہ وزاری کرتے رہے، توبہ کرتے رہے اور بار بار خدا کی عظمت و وحدانیت اور بڑائی کا اقرار کرتے رہے یہاں تک کہ رحمتِ الٰہی جوش میں آ گئی۔ اُن کی توبہ قبول کی گئی اور گناہ معاف کر دیا گیا۔ اُنھیں اُن کی بچھڑی ہوئی ساتھی سے ملوایا گیا، کھویا ہوا حسن لوٹایا گیا اور زمین پر رہنے بسنے اور زندگی گزارنے کی ہدایت دی گئی لیکن شرط اب بھی وہی تھی۔ ارشاد ہوا:

پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے (معافی مانگی) تب اُس نے اُن کا قصور معاف کر دیا۔ بے شک وہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ پھر ہم نے فرمایا جاؤ جب تمھارے پاس میری جانب سے ہدایت پہنچے تو (پیروی کرنا) جس نے بھی میری ہدایت کی پیروی کی اُسے نہ کچھ غم ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنھوں نے قبول نہ کیا، ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے، ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

(سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳۹)

گویا جوں ہی دنیا کے اوّلین انسان کو دنیا میں رہنے اور زندگی گزارنے کی ہدایت ہوئی تو اُس کے ساتھ ہی خدا کی طرف سے ہدایت آنے اور پیروی کرنے کا حکم بھی دے دیا گیا اور اس بار حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوّا نے تہ دل سے عہد کیا پھر زمین پر آنے کے بعد اُنھیں کھیتی باڑی کے اصول سمجھائے گئے، عبادت کا طریقہ بتایا گیا۔ ان سب کو حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کا بہت بڑا انعام تصور کیا۔ پھر حکم نازل ہوتے گئے اور وہ تعمیل کرتے رہے۔ کھیتی باڑی شروع کی اور زمین سے غذا حاصل کرنے کا فن سیکھا حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے دنیا کو آباد کرنے کی جدوجہد اور کرۂ ارض پر انسان کی آبادی کا سلسلہ شروع کیا۔

(باقی آئندہ)

مقناطیس ــــ قدرتی اور مصنوعی

دُنیا مقناطیس اور مقناطیسیت سے اُس وقت تک واقف نہ ہوسکی جب تک یہ معلوم نہ ہوگیا کہ کچے لوہے کی ایک قسم میں یہ صفت پائی جاتی ہے کہ اگر اُسے کسی دھاگے کی مدد سے لٹکا دیا جائے تو اس کا ایک سرا قطب تارے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شروع زمانے میں ناروے کے جہاز راں اس لوہے کو سمندر پر سمت معلوم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن چینی اس راز سے اُن سے بھی بہت پہلے واقف تھے۔ وہ اسے سمت معلوم کرنے کے لیے ۲۱۸ء کے آس پاس استعمال کرتے تھے۔

اُس زمانے میں لوہے کی یہ قسم "لوڈ اسٹون" یا "لیڈنگ اسٹون" یعنی "رہنمائی کرنے والا پتھر" کہلاتی تھی۔ اب ہم اُسے "میگنیٹائٹ" کہتے ہیں۔ جب لوڈ اسٹون کی بہترین قسم ایشیائے کوچک کے شہر میگنیشیا میں دستیاب ہوئی تو اُسے "میگنیٹ" کہا جانے لگا اور ہم اسے مقناطیس کہتے ہیں۔ یونان کے باشندے اُس سے حضرت مسیحؑ سے ۵۸۵ سال پہلے واقف تھے۔ لوڈ اسٹون والے مقناطیس قدرتی مقناطیس کہلاتے ہیں، کیوں کہ وہ زمین سے نکلتے ہیں۔ ہم جو مقناطیس بناتے ہیں وہ مصنوعی مقناطیس کہلاتے ہیں اور انھیں بنانے کے کئی طریقے ہیں۔

اگر آپ فولاد کے ایک ٹکڑے پر کسی قدرتی مقناطیس کو ایک ہی سمت میں بار بار رگڑتے رہیں تو آپ تھوڑی دیر بعد دیکھیں گے کہ وہ فولادی ٹکڑا ابھی مقناطیس بن گیا ہے۔ اگر آپ اُسے ایک دھاگے کی مدد سے سیدھا لٹکائیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ شمالاً جنوباً اشارہ کر رہا ہے۔ ایک صحیح مقناطیس میں یہی صفت ہونی چاہیئے۔

اگر آپ اس مصنوعی مقناطیس کو لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں یا کیلوں کے قریب لے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ٹکڑے مقناطیس کے دونوں سروں پر بڑی تعداد میں چپک گئے ہیں۔ یہ سرے جہاں پر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے زیادہ تعداد میں چپکتے ہیں، مقناطیس کے قطبین کہلاتے ہیں۔ ایک شمالی قطب اور دوسرا جنوبی قطب۔



• ماسٹر عبدالغفور رات کو چلّہ بھرنے قبرستان جایا کرتے تھے ایک دن تمام شاگرد وقت سے پہلے اکٹھے ہو کر قبرستان میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئے۔ کوئی دس منٹ بعد عبدالغفور صاحب تشریف لائے اور آتے ہی آواز لگائی۔

"اسلام علیکم یا اہل القبور" تمام لڑکوں نے بیک وقت جواب دیا "وعلیکم السلام یا ماسٹر غفور" ماسٹر غفور صاحب نے یہ آواز سُنی تو قبرستان سے ایسے بھاگے کہ جوتیاں بھی وہیں رہ گئیں۔

کے۔ این۔ نیلوفر شاہی (آمبور)

• ڈاکٹر:۔ دیکھو ایک گولی صبح اور دوسری شام کو کھا لینا۔

مریض:۔ اگر گولیاں ہی کھانی ہوتی، تو فوج میں بھرتی نہیں ہو جاتا۔

• جج:۔ تم نے سیٹھ جی کی تجوری کا تالا کیوں توڑا؟

ملزم:۔ کیا کرتا مجبور میرے پاس تالے کی چابی نہیں تھی۔

• ایک شخص:۔ کیا میرا کوئی خط آیا ہے؟

پوسٹ مین:۔ آپ کا نام؟

شخص:۔ اُسی پر لکھا ہوگا۔

محمد آفتاب عالم۔ شیخانہ خرد (نالندہ)

• ایک بدصورت آدمی کہیں جا رہا تھا چلتے چلتے اس نے راستے میں ایک آئینہ پڑا دیکھا اُس نے آئینہ اٹھا لیا اور اپنی صورت دیکھنے لگا آئینہ میں اس نے ایک بدصورت چہرہ دیکھا تو اسے بڑا غصہ آگیا اس نے آئینہ کو وہیں راستے میں پٹخ دیا اور کہا "اگر ایسے نہ ہوتے تو یہاں کیوں پڑے رہتے"

عنبری خاتون۔ اوگانواں

• گاہک:۔ دکاندار سے: آپ کے پاس چوہے مارنے کی دوا ہے۔

دکاندار:۔ جی ہاں کیا آپ خود لے جائیں گے

گاہک:۔ جی نہیں، میں چوہوں کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

• استاد (شاگرد سے):۔ یہ بتاؤ کہ برسات کے دنوں میں بجلی پہلے دکھائی دیتی ہے اور آواز بعد میں آتی ہے۔ کیوں؟

شاگرد:۔ اس لیے کہ آنکھیں آگے اور کان پیچھے رہتے ہیں۔

تبسم بشیر احمد۔ بمبئی ۹۵

● استاد:۔ انور کل تم اسکول کیوں نہیں آئے۔

انور :۔ کل آندھی اور بارش ہو رہی تھی اس لیے ماں نے نہیں بھیجا۔

استاد :۔ پھر دوسرے کیسے آ گئے؟

انور :۔ جناب ان کی سوتیلی مائیں ہوں گی۔

● فرخندہ :۔ (رخشندہ سے) اب دو ماہ کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ میں تمھیں خط لکھوں گی۔ لیکن میرا خط کسی کو نہ دکھانا۔

رخشندہ:۔ میں اپنی باجی کو ضرور دکھاؤں گی۔

فرخندہ :۔ اچھا میرا خط دکھا دینا لیکن میری لکھائی بالکل نہ دکھانا۔

جہاں آرا بیگم۔ اوکھلا

● خدمت گار:۔ حضور آپ اللہ کے فضل سے لکھ پتی ہیں مگر مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے۔ جب آپ کے پاؤں میں جوتا تک نہیں تھا۔

امیر مالک:۔ (غصہ میں) وہ کب؟

خدمت گار:۔ جب آپ غسل خانے میں تھے۔

● شاہد۔ (زاہد سے) اگر تمھیں اچانک کسی جگہ سے پانچ لاکھ روپے مل جائیں تو تم ان کا کیا کرو گے؟

زاہد۔ اگر وہ روپے کسی غریب شخص کے ہوئے تو میں انھیں فوراً واپس کر دوں گا۔

جاوید رؤف

● حبیب۔ تم نے لفظ غلط کو "ت" سے کیوں لکھا ہے؟

انور۔ اس لیے کہ غلط کو ہمیشہ غلط ہی لکھنا چاہیے۔

● ڈاکٹر۔ (مریض کو دوا دیتے ہوئے) دو چمچے صبح دو چمچے دوپہر دو چمچے شام اور دو چمچے رات کو کھائیں۔

مریض۔ جناب کوئی بیوہ دادیں میں غریب آدمی ہوں میرے گھر میں اتنے چمچے نہیں ہیں۔

دیوان ہمدرد

● مجسٹریٹ (ملزم سے) تم نے ہوٹل کی تجوری کیوں توڑی۔

چور۔ جناب میں بھوکا تھا۔

مجسٹریٹ بھوکے تھے تو وہاں سے کھانے کی کوئی چیز اٹھاتے تجوری توڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

چور۔ جناب میں غیرت مند ہوں اور بغیر پیسے دیے کوئی چیز نہیں لیتا۔

● عارف۔ تمھاری کھوئی اٹھنی ملی یا نہیں؟

زاہد۔ وہ تو میرے چھوٹے بھائی کو مل گئی تھی۔

عارف۔ تو اب کسے ڈھونڈ رہے ہو؟

زاہد۔ اپنے چھوٹے بھائی کو۔

● استاد نے کلاس میں ایک طالب علم سے پوچھا بتاؤ انگریزوں نے ہندستان میں پہلا قدم رکھنے کے بعد کیا کیا؟

شاگرد:۔ جناب انھوں نے دوسرا قدم رکھا۔

محمد علی

بچّوں کی کوششیں



فضائل سورۃ البقرہ

● آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سورۂ بقرہ قرآن پاک کی ترازو ہے اس کو سیکھو اس کا سیکھنا باعث برکت ہے اور نہ سیکھنا وجہ حسرت!

● آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص سورۃ البقرہ تلاوت کرے گا جنت میں تاج پہنایا جائے گا۔

● آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر چیز کا ایک بلند حصہ ہوتا ہے قرآن پاک کی بلندی سورۃ البقرہ ہے جو شخص اس کی تلاوت دن میں اپنے گھر میں کرے گا اس میں تین دن تک شیطان نہیں جائے گا اور جو شخص رات میں کرے گا تو وہ گھر تین رات شیطان کے اثر سے محفوظ رہے گا۔

● حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو شخص رات میں سورۂ بقرہ اور آلِ عمران کی تلاوت کرے گا اس کا شمار اس رات میں بہت عمدہ عبادت کرنے والوں میں ہوگا۔

● ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں جہاں اور چیزوں سے مشرف فرمایا گیا ہے وہیں آپ کو سورۃ البقرہ کی آخری آیات بھی عطا ہوئیں۔

● آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص رات میں سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھے گا رات بھر کے لیے اس کو کافی ہوں گی۔

● آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہی دو آیتیں قیامت کے دن شفاعت کریں گی اور انھیں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

● اگر کوئی شخص رات کو سوتے وقت سورۃ البقرہ کی مندرجہ ذیل دس آیتیں ہمیشہ پڑھتا رہے تو انشاء اللہ تعالیٰ قرآن پاک نہیں بھولے گا پانچ آیات شروع کی، اور آیت الکرسی اور اس کے بعد والی آیت اور تین آیت آخری سورۃ کی۔

عظمیٰ بیگم۔ کدورہ۔ جالون

"اچھی باتیں"

● دنیا کا سب سے بڑھیا زیور آپ کی اپنی شرافت ہے۔

- دنیا کا سب سے بڑھیا مددگار آپ کا اپنا ہی ہاتھ ہے۔
- دنیا کا سب سے بڑھیا مکان آپ کا اپنا ہی جسم ہے۔
- ہمیشہ سچ بولیے چاہے تکلیف ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔
- جھوٹ تمام عیبوں کی جڑ ہے۔
- احسان کر کے جتانے سے احسان نہ کرنا بہتر ہے۔
- حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے، جس طرح دیمک لکڑی کو۔
- انسان کا کردار ایک ایسی مالا ہے جس کی گرہ کھل جانے سے تمام موتی بکھر جاتے ہیں۔
- عقل مند کی پہچان غصہ کے وقت ہوتی ہے۔
- خدا سے ڈرنے والا کسی سے نہیں ڈرتا۔

شبنم اوگانوی، اوگانواں (نالندہ)

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ فرانس ایک ایسا ملک ہے جہاں مچھر نہیں پایا جاتا ہے۔

۲۔ اسپین ایک ایسا ملک ہے جہاں کپڑے پر اخبار نکلتا ہے۔

۳۔ دنیا میں کل ۲۱۶ ملک ہیں۔

۴۔ جھوٹ پکڑنے والی مشین نیویارک امریکہ میں ہے۔ اس مشین کا نام "لائی ڈیٹیکٹر" ہے۔

۵۔ نقشا سب سے پہلے جاپان میں ۱۸۹۶ء میں استعمال کیا گیا تھا۔

۶۔ ''مگرنائی'' مچھلی جو پانی میں تیرتی ہے زمین پر بھی چلتی ہے۔ اور ہوا میں بھی اڑتی ہے۔

۷۔ ''سنڈی'' ایک لال مرغی ہے جو ہرا انڈا دیتی ہے

۸۔ فرانسیسی سینا کے جنرل ولیپٹیر ے ڈی مانٹ ماڈین کو جنگ میں پانچ بار مردہ مان لیا گیا تھا۔ لیکن دفن کرتے وقت ہر بار وہ زندہ ہو اٹھے۔ ان کی موت ۷۵ برس کی عمر میں ہوئی۔

محمد آفتاب عالم
محلہ: شیخانہ خرد، بہار شریف (نالندہ)

جواہر ریزے

- قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے لیکن قبروں کو چومنا اور بوسہ دینا غیر اسلامی فعل ہی نہیں بلکہ یہودیوں کا عمل ہے۔
- وہ گھر جس میں کتابیں نہ ہوں اس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو۔
- جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھنی ہے وہ

بات اپنے دوست سے بھی پوشیدہ رکھو۔

- نفرت ایک ایسا پھول ہے کہ دل میں کھل جائے تو تمام عمر کے لیے سسکنا پڑتا ہے۔
- سچ بولنا بھی عبادت ہے۔
- نفرت کو صرف محبت سے جیتا جاسکتا ہے۔
- برکت، حریص اور لالچی انسان سے دور بھاگتی ہے۔

فیاض ابراہیم پرکار
پیوال۔ منڈنگڈہ۔ رتناگیری

"بے وقوف شاعر"

ایک شاعر ایک دولت مند شخص کے پاس گیا۔ اور اس کی خوب خوب تعریفیں کیں۔ اس امیر آدمی نے خوش ہوکر کہا "کہ اس وقت میرے پاس روپیا تو نہیں ہے۔ ہاں غلّہ بہت کچھ ہے اگر تم کل آؤ تو تمھیں کچھ غلہ دوں گا۔" شاعر گھر چلا گیا دوسرے روز صبح سویرے اس مالدار کے گھر آموجود ہوا۔ مالدار نے پوچھا "کیا آئے؟" اس نے جواب دیا "آپ نے کل کچھ غلّہ دینے کا وعدہ کیا تھا اس غرض سے میں اس وقت آیا ہوں" دولت مند نے جواب دیا "تم تو احمق ہو۔ تم نے مجھے باتوں سے خوش کیا تھا میں نے بھی تمھیں باتوں سے خوش کر دیا۔ اب غلّہ تمھیں میں کیوں دوں"! شاعر اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔

محمد کلیم الدین انصاری
آر/۵۰ گارڈن ریچ روڈ۔ کلکتہ

تین چیزیں

۱۔ تین چیزیں صحت کے لیے مضر ہیں۔
(زیادہ غم کرنا، زیادہ کھانا، زیادہ سونا)
۲۔ تین چیزیں کمال عقل کی دلیل ہیں۔
(کم کھانا، کم بولنا، کم سونا)
۳۔ تین چیزوں سے دور بھاگنا چاہیے۔
(گناہ سے۔ قرض سے۔ بُرے ساتھی سے)
۴۔ تین چیزوں سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔
(موت سے۔ دشمن سے۔ رفتارِ زمانہ سے)
۵۔ تین چیزیں منافق کی علامات ہیں۔
(جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت، وعدہ خلافی)
۶۔ تین چیزوں کو قابو میں رکھنا چاہیے۔
(زبان، غصہ، نفس)
۷۔ تین چیزوں سے محبت کرنی چاہیے۔
(اچھے دوست سے، اچھی کتاب سے، اچھی عادت سے)
۸۔ تین چیزوں کو پابندی کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔
(اسکول میں حاضری، ہوم ورک، اسباق کا اعادہ)
۹۔ تین چیزوں سے بچنا چاہیے۔

(جھوٹ، چغلی، حسد)

۱- تین چیزوں کو کوئی دوسرا چرا نہیں سکتا۔
(عقل، علم، ہنر)

محمد اسمٰعیل نعیم ابن محی الدین اکرمی بجنگل

ظلم کا بدلہ

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ ایک چڑیا روزانہ صبح سویرے اپنے بچوں کو گھونسلے میں چھوڑ کر ان کے لیے دانہ چگنے نکل جاتی اور جب وہ دانہ چگ کر شام کو اپنے گھونسلے میں واپس آتی تو اپنا ایک بچہ کم پاتی۔

اسی طرح جب اس کے تمام بچے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے تو اسے بہت صدمہ پہنچا۔ اس صدمے سے نڈھال وہ چپ چاپ ایک درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی ایک سہیلی چڑیا وہاں پہنچی۔ اس نے چڑیا کو اُداس دیکھ کر اُداسی کی وجہ دریافت کی۔ چڑیا نے رو رو کر پوری کہانی اسے سنا ڈالی۔ دوسری چڑیا کو بہت افسوس ہوا لیکن وہ خود بھی اسی غم میں مبتلا تھی۔ وہ جب جب انڈے دیتی انھیں بڑی محنت سے سیتی اور جب بچے ان انڈوں سے 'چوں چوں' کر کے نکلتے تو روزانہ وہ صبح سویرے ان کے لیے غذا کی تلاش میں نکل جاتی اور شام کو واپس آتی۔

اس بیچ اس کے گھونسلے میں الّو آکر اس کے ننھے ننھے بچوں کو اٹھا لے جاتے۔ جب وہ شام کو واپس گھونسلے میں پہنچتی تو ایک نہ ایک بچہ غائب پاتی۔ بیچاری اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ حرکت جنگل میں بسنے والے الوؤں کی ہے لیکن وہ مجبور تھی۔ ننھی سی چڑیا الوؤں سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

جب پہلی چڑیا نے اپنا قصہ سنایا تو دوسری چڑیا کو بھی اپنا دکھ یاد آیا اس نے بھی رو رو کر اپنی کہانی پہلی چڑیا کو سنا ڈالی۔ دونوں نے طے کیا کہ کیوں نہ وہ چل کر اس جنگل میں بسنے والی اپنی ذات کی دوسری چڑیوں سے صلاح کریں۔ وہ دونوں ایک ایک کر کے تمام چڑیوں سے ملنے گئیں انھیں معلوم ہوا کہ تمام چڑیوں کو بھی یہی دکھ تھا گویا سب کی سب ایک ہی ناؤ میں سوار تھیں۔ آخر میں ان چڑیوں نے صلاح و مشورہ کر کے اپنی ایک کمیٹی بنائی۔ کمیٹی کی میٹنگ میں یہ ریزولیوشن پاس ہوا کہ تمام چڑیاں اللہ تعالیٰ کے حضور میں جا کر فریاد کریں۔ وہ سارے جہاں کا پالنے والا ہے۔ وہی تمام جانداروں کو رزق دیتا ہے۔ انھیں زندگی اور موت دیتا ہے۔ وہی سب کی سنتا ہے۔ بے بس چڑیوں کی بھی سنے گا۔

چنانچہ ایک دن پڑ پڑھتے چڑیوں کا وفد اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچا اور رو رو کر انھیں اپنی داستان سنائی۔

ان ننھی منی چڑیوں کی پیاس بجھ کر اللہ تعالیٰ نے چڑیوں سے کہا" اے میری ننھی منی مخلوق! تم سب اپنے اپنے گھونسلوں میں واپس جاؤ۔ آج سے جو بھی تمھاری غیر موجودگی میں تمھارے بچوں کو کھانے آئے گا وہ ہمیشہ دن کے وقت اندھا ہو جایا کرے گا تاکہ تم آزادی کے ساتھ اپنے بچوں کے لیے غذا فراہم کرسکو اور شام کو جب واپس اپنے گھونسلوں میں آؤ، تو وہ تم کو بخیر و خوبی مل جائیں۔" تمام چڑیاں خوشی خوشی اپنے گھونسلوں میں واپس آئیں انھوں نے اپنے اپنے گھونسلوں پر الوؤں کو دیکھا۔ پہلے تو وہ بہت پریشان ہوئیں لیکن پھر انھیں اللہ تعالیٰ کی بات یاد آئی۔ وہ ہمت کرکے الوؤں کے قریب آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ سچ مچ وہ الو اندھے ہو چکے تھے۔ ان چڑیوں نے چونچ مار مار کر الوؤں کو بھگا دیا اور خوشی خوشی خدائے پاک کی حمد و تعریف میں مشغول ہو گئیں اور آج تک کرتی آ رہی ہیں اور ہمیشہ کرتی رہیں گی۔ اور تبھی سے روزانہ دن میں الو کی آنکھوں کی روشنی چلی جاتی ہے اور وہ اندھا ہو جایا کرتا ہے۔

جمیل الدین احمد گلزار

کلکتہ۔ ۳۷

چاہتے ہو تو...

- لینا چاہتے ہو تو والدین کی دعائیں لو۔
- دینا چاہتے ہو تو راہِ خدا میں دو۔
- لڑنا چاہتے ہو تو اسلام کی خاطر لڑو۔
- بیٹھنا چاہتے ہو تو اچھوں کی صحبت میں بیٹھو۔
- ہنسنا چاہتے ہو تو اپنی تقدیر پر ہنسو۔
- رونا چاہتے ہو تو اپنے اعمال پر رو۔
- جانا چاہتے ہو تو مقدس مقامات کی سیر کو جاؤ۔
- آنا چاہتے ہو تو غریب کی مدد کو آؤ۔
- پینا چاہتے ہو تو غصہ کو پیو۔
- تکلیف کو صبر سے دور کرو اور نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

کے۔ شگفتہ بانو۔ آمبور

میرے پسندیدہ اشعار

ان کی اک چشمِ عنایت کے لیے اے تسنیم
حال کیوں تو نے اپنا فقیرانہ بنا رکھا ہے
تسنیم صدیقی

کوئی بچنے کا نہیں سب کا پتا جانتی ہے
کدھر آگ لگانا ہے ہوا جانتی ہے
منظر بھوپالی

مرسلہ: ایم۔ شاہنواز شمسی۔ دربہ پان۔ رام پور

پسندیدہ اشعار

اسلام کے شیروں کو مت چھیڑو نہ ہم ورنہ
تکبیر کے نعروں سے دنیا کو ہلا دیں گے
مسلم کو حقیقت میں کمزور نہ تم سمجھو
یہ مٹتے مٹاتے بھی دنیا کو مٹا دیں گے

(علامہ اقبال)

عبدالغنی آئی۔ الور

(۱) علم سب سے بڑی دولت ہے۔
(۲) تندرستی سب سے بڑی نعمت ہے۔
(۳) اتفاق سب سے بڑی طاقت ہے۔
(۴) معاف کرنا سب سے بڑی سخاوت ہے
(۵) نیکی کمانا سب سے بڑی تجارت ہے
(۶) خودداری سے جینا سب سے بڑی عزت ہے۔
(۷) دشمنوں سے نیک سلوک کرنا سب سے بڑی حکمت ہے۔
(۸) خلقِ خدا کی خدمت سب سے بڑی عبادت ہے۔
(۹) بداخلاق پڑوسی سب سے بڑی آفت ہے۔

شارق علی جلال الدین۔ بی بھٹکل

کیا آپ جانتے ہیں

(۱) دنیا کی سب سے شیریں زبان عربی ہے۔
(۲) جھینگر بغیر غذا اور پانی کے قریب دو ماہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔
(۳) انسان کے جسم میں اتنی بجلی ہوتی ہے کہ ۲۵ واٹ کے بلب کو کئی منٹ تک جلا جا سکتا ہے۔
(۴) کھٹمل ایک دن میں ۱۰ مرتبہ انڈا دیتا ہے
(۵) سانپ کے کان نہیں ہوتے وہ زبان سے سنتا ہے
(۶) دنیا میں ۳۵۶۴ زبانیں بولی جاتی ہیں۔
(۷) اتوار کے دن چھٹی منانے کا رواج ۳۲۱ میں شہنشاہ اسٹائن نے شروع کیا۔
(۸) پہلا کرکٹ ٹیسٹ میچ ۱۸۷۷ء میں انگلینڈ اور آسٹریلیا کے درمیان کھیلا گیا تھا۔

شکیل احمد۔ بھٹکل

بوڑھا فقیر

ایک آدمی تھا بڑا ہی امیر، اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن وہ کبھی بھی اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے سے زیادہ امیر آدمی کو دیکھتا تو کہتا تھا کہ دیکھو یہ کس قدر عیش کر رہا ہے۔ ایک دن اس کے دروازے پر ایک بوڑھا فقیر آیا اور اس نے صدا لگائی "اللہ کے نام پر کچھ دے دو" اس آدمی نے سوچا کہ اس کو کچھ دیا جائے اس نے اس فقیر کو تھوڑا کھانا دیا جب وہ بوڑھا فقیر کھانا کھا چکا تو اس نے کہا "اللہ تیرا شکر" اور چلا گیا اس آدمی نے سوچا کہ میں نے اس کو ایک وقت کا کھانا دیا تو اس

نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک میں ہوں کہ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور پھر بھی میں کبھی اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا ہوں اور اس دن سے پھر اس نے کسی چیز کی بھی خواہش نہیں کی اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

رضوان عالم فاروقی۔ شاہجہاں پور

ممالک اور ان کی راجدھانی



ملک	راجدھانی
۱۔ ہندستان	دہلی
۲۔ پاکستان	اسلام آباد
۳۔ جاپان	ٹوکیو
۴۔ افغانستان	کابل
۵۔ ایران	طہران
۶۔ عراق	بغداد
۷۔ بنگلہ دیش	ڈھاکہ
۸۔ روس	ماسکو
۹۔ اٹلی	روم
۱۰۔ برطانیہ	لندن
۱۱۔ برما	رنگون
۱۲۔ چین	پیکنگ
۱۳۔ سعودی عرب	ریاض
۱۴۔ نیپال	کھٹمنڈو
۱۵۔ فرانس	پیرس
۱۶۔ انڈونیشیا	جکارتہ
۱۷۔ ترکی	انقرہ

شیخ اسرار احمد۔ بھساول

پسندیدہ اشعار

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

(نامعلوم)

یہ سنگ گراں جو حائل رستے سے ہٹا کر دم لیں گے
ہم راہ وفا کے رہرو ہیں منزل ہی پہ جاکر دم لیں گے

(نامعلوم)

ایم شعیب۔ ۱۴۷ بٹلہ ہاؤس (دہلی)



وہ شخص اس دکان کا پرانا گاہک تھا۔ دکاندار حیران تھا کہ وہ آخر بے ہوش کیوں ہو گیا۔ پیسے تو وہ بعد میں بھی دے سکتا تھا۔ پھر اس پر

اس کھوٹے سکّے کا اتنا اثر کیوں ہوا؟ ہوا یہ تھا کہ سامان خریدنے کے بعد جب اس نے پیسے دیے تو دکاندار نے ایک سکّہ لوٹاتے ہوئے کہا کہ یہ سکّہ کھوٹا ہے۔ یہ بات سنتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔ لوگ جمع ہوگئے۔ ہر شخص حیران تھا کہ ایک سکّے کی وجہ سے اس شخص پر اتنا گہرا اثر کیوں پڑا؟ کچھ دیر کے بعد اس شخص کو ہوش آیا لوگوں نے دریافت کیا تو پتا چلا کہ اس کے پاس اور بھی سکّے موجود تھے۔ پھر بیہوشی کے معنی؟ لوگوں کے پوچھنے پر اس شخص نے جواب دیا۔ اگر یہاں کوئی سکّہ کھوٹا ہوا تو دوسرا مل سکتا ہے۔ دکاندار سے سامان اُدھار لیا جا سکتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد اگر سکّہ کھوٹا ہوا تو؟ دوسرا سکّہ کہاں سے آئے گا؟ مہلت کون دے گا؟

عارف احمد عثمانی۔ جامنیر ضلع جلگاؤں

ہماری عید کیسے گزری...؟

صبح سے گھر میں عید کی بڑی زور و شور سے تیاری جاری تھی۔ گھر میں سوّیاں، شیر خرما اور دوسرے میٹھے کھانے پک رہے تھے۔ [illegible]نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہن لیے۔ اور ہم [illegible]بّاجان کے ساتھ عیدگاہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ [illegible]یدگاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جیسے تیسے ہمیں جگہ مل گئی۔ عید کی نماز اور خطبے سے فارغ ہو کر ہم گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر آنے کے بعد سبھوں سے عیدی وصول بھی نہ کر پائے تھے کہ چھوٹے بھائی نے اطلاع دی کہ آپ کے دوست باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم سب کام چھوڑ کر باہر آگئے۔ جہاں ہمارے دوست ہمارے منتظر تھے۔ ہم سبھی دوستوں نے آپس میں طے کیا کہ آج شام تفریح کے لیے چلے جائیں گے۔ سبھی دوستوں نے دس دس روپے نکالے اور عید کی خوشیوں کو دوبالا کرنے کے لیے "ٹیکری" پر پہنچے۔ ٹیکری پہاڑ کا وہ مقام تھا جو سب سے اونچائی پر تھا۔ سبھی دوستوں نے پہاڑ (ٹیکری) پر مٹھائی اور پھل کھائے اور اِدھر اُدھر کے گپ ہانکنے لگے اسی اثنا میں مؤذن نے مغرب کی اذان دی۔ اذان کی آواز سن کر ہم سبھی دوستوں پر وحشت طاری ہوگئی کیونکہ گاؤں کے سبھی لوگ اور ہمارے دادا، دادی وغیرہ کہتے تھے کہ اکثر مغرب کی آذان کے بعد ٹیکری کی طرف آدم خور شیر نکل آتا ہے۔ ہمارا خوف سے بُرا حال تھا کہ کاٹو تو خون نہیں۔ جیسے تیسے ہم سبھی نیچے آگئے۔ اب ہماری جان میں جان آگئی۔ خدا کا شکر ادا کر کے ہم سبھی دوست اپنے اپنے گھر روانہ ہوئے۔ جب ہم گھر پہنچے تو والد صاحب سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں

گھور کر دیکھ رہے تھے۔ والد صاحب کا یہ تیور دیکھ کر ہم خوف سے تھرا گئے۔ پھر والد صاحب نے ہم سے پوچھا۔ "بتاؤ کہاں گئے تھے؟" ہم خاموش مٹی کا پیکر بنے ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں ہمارے چھوٹے بھائی بھی آ گئے۔ اور ہمارا سارا پروگرام والد صاحب کو بتا دیا۔ پھر بھی ہم ایسے پیٹے گئے کہ ہمیں چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ جب کبھی مجھے اُس عید کے بارے میں یا مار کے بارے میں خیال آتا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کاش! ہم ٹیکری پر نہ جاتے تو نہ پٹتے مگر قضا کو رضا نہیں ہوتی۔ تو یہی ایسی تھی ہماری عید۔

آصف ابراہیم پرکار
بیوال، منڈنگڈھ، رتنا گیری

رحمو کی ذہانت

عجیب قسم کی آوازیں سن کر بوڑھے رحمو کی آنکھ کھل گئی۔ آواز سے پتا چلتا تھا کہ کوئی زمین کھود رہا ہے۔ رحمو کچھ دیر آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر اس نے سامنے لٹکی اور دھول سے بھری گھڑی پر نظر ڈالی تو اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔

آوازیں رحمو کے کمرے کے برابر والے کمرے سے آ رہی تھی جو رحمو نے ایک ریلوے کے مزدور کو کرائے پر دے رکھا تھا جس کا نام دلیپ راؤ تھا۔ وہ دو مہینے سے رحمو کے مکان میں رہ رہا تھا۔ رحمو کچھ دیر سوچتا رہا پھر بستر سے اٹھا اور بیچ کی دیوار جو لکڑی کی بنی تھی اور اس میں سوراخ تھے۔ سوراخ میں سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دلیپ ایک طرف کی زمین کھود رہا ہے۔ رحمو بغیر آواز لگائے دیکھتا رہا۔ جب گڑھا تھوڑا گہرا ہو گیا تو دلیپ نے کوئی چیز اس میں رکھی جو رحمو نہ دیکھ سکا۔ اور اس پر مٹی ڈال دی۔ اس کے بعد دلیپ اطمینان سے اپنے بستر پر آیا اور لیٹ گیا۔ رحمو بھی وہاں سے ہٹ کر اپنے بستر پر سو گیا۔

یہ دیوار پور نام کا ایک گاؤں تھا جو پہاڑیوں کے دامن میں بسا ہوا تھا اسی گاؤں میں دو کمرے کے مکان میں بوڑھا رحمو رہتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ دنیا میں بالکل تنہا تھا۔ وہ بہت چالاک تھا۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اس نے اپنے گھر کا ایک کمرہ دلیپ کو کرائے پر دے دیا تھا اس سے اس کا گزارہ ہوتا تھا۔

دیوار پور گاؤں میں پچھلے مہینے سے بہت ہل چل مچی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہر رات کسی نہ کسی گھر میں چوری ہوتی تھی۔ گاؤں کے لوگ بہت خوفزدہ تھے وہاں کی پولیس چور کو تلاش کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ چور بہت ذہین تھا۔ لوگ اپنے قیمتی سامان کی سخت حفاظت کرنے لگے تھے۔

اس گاؤں میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا گاؤں میں سیٹھ دھرم لال کے گھر سے اس کی بیوی کے سونے کی چوڑیاں اور قیمتی ہیروں کا ہار چوری ہو چکے تھے۔ لال چند کے گھر سے نقد دو ہزار روپے چوری ہوئے تھے جو اس نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے جمع کیے تھے۔ اور بھی کئی جگہوں سے چوریاں ہوئی تھیں۔ لوگ بہت پریشان تھے۔ رحمو کی عادت تھی کہ وہ صبح سویرے کھلی ہوا میں ٹہلنے جاتا تھا۔ اس لیے اس کی صحت اچھی تھی۔

عادت کے مطابق آج بھی وہ صبح سویرے اٹھ کر ٹہلنے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کی نظر دلیپ کے دروازے پر پڑی۔ دلیپ کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ اس کے ذہن میں رات کا واقعہ گھوم گیا۔ رحمو نے کچھ دیر سوچ کر اپنے کمرے کی چابی سے دلیپ کے کمرے کا تالا کھولا۔ چونکہ دونوں کے تالے ایک جیسے تھے اس لیے تالا کھل گیا۔ رحمو آہستہ سے اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس جگہ کو کھودنے لگا۔ چونکہ دلیپ اپنی ڈیوٹی پر گیا تھا۔ اور شام کو آنے والا تھا اس لیے رحمو نے اطمینان سے زمین کھودی تو اسے حیرت ہوئی کہ اندر ایک چھوٹی سی لوہے کی پیٹی تھی۔ اس نے پیٹی کو کھولا تو اسے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ اس میں سیٹھ دھرم لال کی بیوی کے زیورات اور لال چند کے روپے اور کئی قیمتی چیزیں تھیں۔ رحمو کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دلیپ ہی چور ہے۔ تھوڑی دیر بعد رحمو نے پیٹی بند کر دی اور اس پر مٹی ڈال دی اور تالا لگا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ کیا واقعی دلیپ چور ہے؟

رات کے ٹھیک ایک بجے دلیپ اپنے کمرے سے باہر آیا۔ گلی میں سناٹا بھی تھا اور گہرا اندھیرا بھی۔ اس اندھیرے میں وہ ایک طرف کو چل دیا۔ اسی وقت رحمو اپنے کمرے سے نکلا اور دلیپ کے پیچھے چل دیا۔ دلیپ ڈاکٹر شیا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ بوڑھا رحمو اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ جب دلیپ ڈاکٹر شیراز کے گھر کے قریب پہنچ گیا تو اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اور پچھلی دیوار سے کود کر اندر داخل ہو گیا۔ رحمو باہر اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دلیپ اسی راستے سے باہر آیا۔ تو رحمو نے محسوس کیا کہ اس کی جیبیں پھولی ہوئی ہیں۔ پھر دلیپ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ رحمو بھی واپس آگیا۔ دلیپ راز، رحمو کی طرف سے بالکل بے خبر تھا۔

رحمو صبح اٹھ کر ٹہلنے کے بجائے پولیس اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اس وقت وہاں کا انچارج

انسپکٹر شیکھر تھا جو رحمو کو جانتا تھا۔ جیسے ہی رحمو پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا انسپکٹر شیکھر جو چائے پی رہا تھا۔ پوچھا۔ "کہو رحمو کیسے آنا ہوا؟" جواب میں رحمو نے شروع سے آخر تک جو واقعہ پیش آیا کہہ سنایا۔ آخر میں اس نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے دلیپ راؤ کا منصوبہ یہ ہے کہ جب اچھا خاصا روپیہ جمع ہوجائے تو گاؤں سے شہر چلا جائے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔

"دلیپ راؤ میرے گھر میں کرائے پر رہتا ہے۔" رحمو نے جواب دیا۔ "اس لیے تین دن پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتہ بعد ہمیشہ کے لیے مکان چھوڑ کر جا رہا ہے۔" یہ سنتے ہی انسپکٹر شیکھر دو سپاہیوں کو لے کر دلیپ کے گھر پہنچا۔ دلیپ پولیس کو آتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ اب اس کا کھیل ختم ہوگیا ہے۔ اس لیے اس نے اقبال جرم کر لیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ چوروں کے پکڑے جانے سے تمام لوگ مطمئن ہوگئے اور رحمو کا شکریہ ادا کیا۔ رحمو کو سرکار کی طرف سے بھاری انعام بھی ملا۔

شہزاد انور بیگ
امراوتی (مہاراشٹر)

دلچسپ خبریں

چینی مچھلی پر دلچسپ تجربات

چین میں کئی برس افزائش نسل کے تجربات کرنے کے بعد مچھلی کی ایک ایسی قسم پیدا ہوئی ہے جس پر چینی زبان کے حروف تہجی کندہ ہیں۔

کائی کا خوبصورت عمل

ہیرو کے ریگستانی ساحل پر خودرو قسم کی کائی اس طرح پھیلی کہ ان سے ایک لفظ INFIERNILL کی ترتیب بن گئی ہے یہ لفظ پچاس برس تک عیاں رہا اس کائی کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی نگہداشت نہیں کرنا پڑی کیونکہ اس پودے کی نہ تو جڑیں ہیں اور نہ پانی کی ضرورت یہ ایک ہی جگہ پیوست رہا۔

معاوضہ طلب نہیں کر سکتے

انگلستان کے وکلا کو اس بات کی ممانعت ہے کہ وہ اپنے سائل سے اس کے مقدمہ کی پیروی کرنے کا معاوضہ طلب کرنے میں کسی قانون کا سہارا لے سکیں۔ ان کا معاوضہ محض ایک اعزاز تصور کیا جاتا ہے اور اس کی طلب کے لیے وہ کسی عدالت سے قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتے

ساجد کمالوی

دنیا کا سب سے لمبا آدمی روبرٹ وڈلو تھا جس کا قد ۲۲ سال کی عمر میں ۸ فٹ ۱۱ انچ اور وزن ۴۳۹ پونڈ تھا۔

دنیا کی سب سے چھوٹے قد کی لڑکی لوسیہ زہریٹ میکسیکو کی رہنے والی تھی۔ جس کا وزن ۷،۴ پونڈ اور قد ½۲۶ انچ تھا۔

رابرٹ ایریڈ دنیا کا سب سے چھوٹا شخص تھا۔ جس کا وزن ۱۰۶۹ پونڈ تھا۔ جب وہ مرا تو اس کے کفن کا ناپ پیانو کے ڈبے کے برابر تھا

دنیا کی سب سے لمبی مونچھیں انڈیا کے رہنے والے مسوریہ دین کی ہیں، جو ۱۰۲ انچ لمبی ہیں۔

اینڈرسن، جورجیا کا باشندہ جس کا وزن ۳۴۴ پونڈ ہے وہ ۶،۲۷۵ پونڈ وزن اٹھا سکتا تھا

دنیا کی سب سے وزنی بیبی ½۹ ۵،۷ پونڈ۔

دنیا کا سب سے لمبا ناگ ۱۸ فٹ ۹ انچ ہے

بچوں کی مذہبی کتابیں

حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/-	ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۷/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل)	۴/۰
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/-
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	-/۴۰	ارکان اسلام	۲/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	عقائد اسلام	۳/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	چار یار	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا اوّل	۷/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	خلفائے اربعہ	۶/۵۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	نبیوں کے قصے	۵/
اللہ کے صفی	۲/۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
قاعدہ یسرنا القرآن	۲/۲۵	سرکار دو عالمؐ	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

بچوں کے لیے

نئی اور دلچسپ کتابیں

بچوں کے ذاکر صاحب ۶/۰۰
ٹوٹے کھلونے ۶/۵۰
اندھے کا بیٹا ۳/۵۰
پانچ جاسوس ۸/۵۰
جنگل کی ایک رات ۶/۰۰
سہانے ترانے ۴/۵۰
ہرن کا دل ۲/۰۰
اچھی کہانیاں ۲/۵۰
دریا کی رانی ۲/۰۰
گوہر شہزادی ۳/۰۰
شریر شیرا ۳/۰۰
پری رانی ۳/۰۰
خطرناک سفر ۳/۵۰
اندرا گاندھی ۴/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں ۴/۰۰
ننھا جیرو ۲/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں ۳/۰۰
پلک نہ مارو ۴/۰۰
ایک کھلا راز ۳/۰۰
بابا ناصح ۲/۰۰
بچوں کے افسر ۵/۰۰

پہاڑ کی چوٹی پر
رنگوں کی بستی ۳/۵۰
سرخ جوتے ۳/۰۰
سلام و صمصام ۴/۵۰
شرارت ۲/۰۰
صحت کے ۹۹ نکتے ۱/۵۰
صحت کی الف بے ۳/۰۰
جدید پہیلیاں ۶/۰۰
سپیرا اور اس کی بیوی ۲/۵۰
ننھا فرشتہ ۴/۵۰
نیلا ہیرا ۴/۵۰
ماں کی کھیتی ۲/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی ۲/۰۰
سرکار کا دربار ۴/۵۰
دنیا کے جانور ۲/۵۰
اڈڈرا ماکرپی ۲/۰۰
اس نے کیا کر نہ جانا ۱/۲۰
خرگوش کی چال ۲/۵۰
کھلونوں کا جہاز ۶/۰۰
جوہر قابل ۳/۰۰
خرگوش کا سپنا ۵/۰۰
موم کا محل ۴/۰۰
محمد شفیع الدین نیر ۷/۵۰

[illegible]ان پہیلیاں ۴/۰۰
پیارے رسول ۴/۵۰
چار یار ۴/۵۰
رسول پاک کے اخلاق ۳/۰۰
ہار کی تلاش ۶/۰۰
بچوں کی کہانیاں ۱/۵۰
بندر اور نائی ۲/۵۰
بی مینڈکی اور کوا ۱/۵۰
تاک دنادن تاک سے ۱/۵۰
پانچ بونے ۱/۵۰
ایک دیس ایک خون ۳/۰۰
جیت کس کی؟ ۲/۵۰
انعامی مقابلہ ۳/۲۵
جادو کا گھر ۱/۵۰
چیونٹی رانی ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی ۱/۵۰
لال مرغی ۱/۵۰
لومڑی کا گھر ۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے ۱/۵۰
ہیپو چپو ۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے ۱/۵۰
شیر خاں ۱/۵۰
لومڑی کے بچے ۱/۵۰

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی



ستمبر ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۹

بچوں سے باتیں

...ہلاؤ اور جگاؤ" تو آپ پیامِ تعلیم میں پڑھتے ...ہیں کیسی کیسی پتے کی باتیں ہوتی ہیں اس میں لیجیے اب حکیم محمد سعید صاحب قبلہ کی لکھی ہوئی اہم کتاب "دنیا کے بڑے انسان" پڑھیے جسے آپ کے مکتبہ پیامِ تعلیم نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں حکیم صاحب نے ہمارے سردار اور اللہ کے پیارے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور واقعات نہایت سادہ، سلیس اور دلچسپ انداز میں پیش کیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے یہ کتاب آپ کو بہت پسند آئے گی۔

بعض پیامیوں نے شکایت کی ہے کہ پیامِ تعلیم میں جن، دیو، اور پریوں کی کہانیاں بہت کم ہوتی ہیں جبکہ انھیں ایسی ہی کہانیاں پڑھنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ ہم بھلا کب ایسی کہانیوں کے خلاف ہیں۔ بچپن میں ہمیں بھی ایسی ہی کہانیاں پڑھنے میں لطف آتا تھا۔ لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔ وہ دیو، جن کی ایک آواز سے سارا جنگل لرز اٹھتا تھا آج انسانوں سے شکست مان کر گھنے جنگلوں میں چھپ گئے ہیں۔ وہ پریاں، جن کے پروں پر بیٹھ کر شہزادے دنیا کی سیر کیا کرتے تھے آج انکے پر انسانوں کے بنائے ہوئے بموں سے جل گئے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے آپکے سنہرے خوابوں کو بکھیر دیا ہے۔ آیئے، کچھ ان کے بارے میں بھی غور کریں۔

قیمت فی پرچہ: 3/50 سالانہ =/30

غیر ممالک سے: نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز: بارہ ڈالر
فی پرچہ: ایک ڈالر

ایڈیٹر: شاہد علی خاں

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
شاخیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

پرنٹر و پبلشر سید نسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع کیا

عنایت اللہ محمود



بہادر سپاہی

پولش ایک بہادر سپاہی تھا وہ جب بھی اپنے وطن اور قوم کے لیے دشمنوں سے لڑا تو وہ جوہر دکھاتے کہ اپنے تو اپنے دشمنوں نے بھی اس کی بہادری کو مانا۔ یہی وجہ تھی ملک کا ہر شخص پولش کو پسند کرتا تھا لیکن ایک شہزادہ تھا جو اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ پولش کا باپ بھی اپنے وقت کا مانا ہوا سالار تھا۔ اس نے بھی ایک سپاہی سے ترقی کی تھی اور سالار بنا دیا گیا تھا۔ اس کے باپ کو اپنے بیٹے سے بھی یہی امید تھی۔ اس نے پولش کو بچپن ہی سے سپہ گری کے فن سے آشنا کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ___ منہ زور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر اسے اتنا دوڑاتا کہ تھک ہار کر وہ گھوڑا سیدھا ہو جاتا۔ اس کا نشانہ ایسا تھا کہ اڑتی چڑیا کو تیر کا نشانہ بنا لیا کرتا تھا۔ اب تو تلوار چلانے میں اس کے باپ

مدیر معاون، بچوں کا باغ، لاہور



کے سوا کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ بادشاہ بھی پولش کی بہادری کے چرچے سن چکا تھا۔ اس لیے اس نے سالانہ جشن کے موقعہ پر اس کے فن کا مظاہرہ دیکھنا چاہا۔ شہزادہ سیزر جانتا تھا پولش اپنی بہادری کے جوہر دکھائے گا اور اس کا باپ ضرور اسے فوج میں کوئی افسر بنا دے گا۔ اس لیے اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر ایک منصوبہ بنایا وہ یہ کہ رات کے وقت جس وقت پولش گھوڑ سواری کے بعد گھر کو لوٹے راستے میں ان کے سپاہی چھپ کر بیٹھ جائیں جب پولش وہاں سے گزرنے لگے اس پر تیروں کی بارش کر دیں۔ اس طرح پولش ہلاک ہو جائے گا اگر وہ کسی طرح زندہ بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو اندھیرے میں وہ کسی کو پہچان نہیں سکے گا۔

ایک دن جب پولش گھوڑ سواری کے بعد گھر جانے لگا تو راستے میں اسے ایک بڑھیا ملی بڑھیا نے اس کا راستہ روک لیا اور بولی "اے نوجوان اگر شہر جا رہے ہو تو مجھے بھی اپنے گھوڑے پر پیچھے بٹھا کر لے چلو میں بہت دور سے آ رہی ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں۔ اب مزید چلا نہیں جاتا تمھاری بڑی مہربانی ہوگی۔" پولش نے کہا " اماں اس میں مہربانی کی کون سی بات ہے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں اگر آپ کو لے چلوں گا تو میرا کیا بگڑ جائے گا؟" اور پھر اس نے بڑھیا

کو اپنے پیچھے بٹھا لیا ایک بات پر وہ بڑا حیران تھا کہ پیچھے بیٹھی ہوئی بڑھیا کے کپڑوں سے نہایت عمدہ خوشبو آرہی تھی اور پھر ایک مقام پر پہنچ کر بڑھیا نے کہا پولش گھوڑے کو یہیں روک لو بہادر بھی ہو اور نیک بھی تم نے مجھ پر رحم کھایا ہے میں تو تمہیں آزما رہی تھی۔ اب گھوڑے سے نیچے اتر آؤ اور اپنی کمان سنبھال لو آگے تمہارے دشمن تمہاری تاک میں بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تم پر تیروں کی بارش کریں تم ان پر اتنے تیر برساؤ کہ ایک بھی زندہ بچ کر نہ جا پائے" پولش نے گھوڑا روک لیا اور پلٹ کر جو دیکھا تو حیران رہ گیا اس کے پیچھے بڑھیا کے بجائے ایک نہایت حسین پری بیٹھی ہوئی تھی اور پھر وہ پری کے کہنے پر نیچے اتر آیا اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپتا ہوا آگے بڑھا اور ایک مقام پر اسے پانچ چھے تیرانداز چھپے ہوئے نظر آگئے وہ لوگ سامنے دیکھ رہے تھے اور پولش ان کے پیچھے جا چکا تھا اور پھر اس نے تیر کمان پر چڑھا دیا اور تیروں کی بارش کر دی۔ شہزادے کے آدمی اس آفت ناگہانی سے اتنے خوفزدہ ہوئے کہ وہاں سے بھاگ اٹھے۔ لیکن مارے گئے صرف ایک شخص ہی جان بچا کر جا سکا لیکن اس کے جسم پر بھی ایک تیر پیوست ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی گرتا پڑتا شہزادے کے پاس پہنچ گیا اور اسے تمام واقعہ کہہ سنایا شہزادے نے پوچھا "تمہیں اس نے دیکھا تو نہیں"؟

نہیں حضور! بھلا اندھیرے میں وہ ہمیں کیا پہچان سکتا تھا ہاں اگر اس نے ہمارے آدمیوں کے قریب پہنچ کر ان کی شکلیں دیکھیں۔ تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون لوگ ہیں" اس شخص نے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں اگر اس نے ہمارے آدمیوں کو پہچان بھی لیا تو مجھے امید ہے کہ وہ ابا حضور سے شکایت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا" شہزادے نے کہا ادھر پولش واپس اس جگہ پہنچا جہاں گھوڑے اور پری کو چھوڑا تھا گھوڑا تو وہاں موجود تھا لیکن پری غائب تھی اور پھر وہ گھر آگیا لیکن آج والے واقعے کا اس نے کسی سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ گو وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ سب شہزادے ہی کی شرارت ہے اب وہ شہزادے سے اور بھی ہوشیار ہو گیا تھا اور پھر جشن کا دن آگیا مقابلہ میں شریک ہونے والے لوگ بڑی تیاریاں کر کے آئے تھے۔ بادشاہ اور ملکہ بڑی شان سے مقابلہ دیکھنے آئے ان کے ہمراہ کنیزوں اور غلاموں کا ہجوم تھا۔ وہ دونوں ایک مرصع زریں تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کے داہنے ہاتھ پر شہزادہ بیٹھا تھا اور بائیں طرف وزیر اعظم اور دوسرے لوگ رتبے کے حساب سے اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان ہو گئے تھے۔ مقابلہ شروع

ہوا پولش نے وہ جوہر دکھائے کہ لوگ عش عش کر اٹھے ملکہ نے دیکھا اس کا بیٹا سبز رنگ اداس اداس تھا۔ ملکہ نے یہ دیکھ کر پوچھا "بیٹے تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو خیریت تو ہے؟"

"اماں حضور ہمیں پولش ایک آنکھ نہیں بھاتا اس نے کئی بار ہم سے گستاخی بھی کی لیکن ہم ابا حضور کی وجہ سے خاموش رہے کیونکہ ابا حضور اسے بہت پسند کرنے لگے ہیں آپ خود دیکھ لیجیے وہ اس کی ایک ایک حرکت پر کس طرح داد دے رہے ہیں" شہزادہ کہتا چلا گیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے بیٹے تم گھبراؤ نہیں جب یہ جشن ختم ہوگا تو تم اپنے ماموں کے پاس جانا ان کے پاس ایک بہت بڑا جادوگر ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے ماموں اس جادوگر کو تمہاری مدد کے لیے آمادہ کریں گے۔ ملکہ نے کہا اور شہزادہ خوش ہو گیا۔ اس جشن میں وزیر اعظم کی بیٹی روزی بھی آئی ہوئی تھی۔ شہزادے نے جب دیکھا کہ وہ بھی پولش کے کارنامے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو رہی ہے۔ تو وہ اور بھی جل گیا۔ کیونکہ وہ روزی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دنوں بعد شہزادے کو پتا چلا کہ وزیر اعظم نے اپنی بیٹی کی کہنے پر اس کی منگنی پولش سے کر دی ہے اور پھر کچھ ہی دنوں بعد ان کی شادی ہونے والی ہے تو وہ جل کر راکھ ہو گیا اور فوراً ہی اپنے ماموں کی طرف روانہ ہو گیا اور ماموں سے مل کر اس نے تمام واقعہ کہہ سنایا اس کے ماموں نے بھونچال جادوگر کو بلایا اور بولا "دیکھو بھونچال ہم تمہاری ایک عرصے سے خدمت کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس تمہیں ہر طرح کا آرام ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم ہمارا ایک کام کرو" شہزادے کے ماموں نے کہا۔

"آپ حکم کریں مجھ سے جو کچھ ہو گا آپ کے لیے کروں گا" بھونچال جادوگر نے کہا۔

اس پر شہزادے کے ماموں نے جو کچھ شہزادے سے سنا تھا وہ جادوگر کو بتا دیا اور کہا "بھونچال میں چاہتا ہوں شہزادے میں اتنی قوت آجائے کہ پولش شہزادے سے مارکھا جائے" "میں شہزادے کو ایک منتر سکھا دیتا ہوں۔ اس کے پڑھنے سے شیش ناگ شہزادے کا غلام ہو جائے گا اور ہر وقت شہزادے کے ساتھ رہے گا۔ شہزادے کو اس سے جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی وہ انجام دے گا" اور پھر بھونچال جادوگر نے شہزادے کو وہ منتر سکھا دیا اور شہزادہ وہاں سے واپس آگیا۔ اب وہ بہت خوش تھا کیونکہ اس کے قبضے میں شیش ناگ تھا۔ سب سے پہلے وہ وزیر اعظم کے محل میں گیا اور اس نے وزیر اعظم کو پولش کے خلاف بھڑکانا چاہا اور کہا کہ وہ یہ منگنی توڑ کر روزی کی شادی اس کے ساتھ کر دے" لیکن وزیر اعظم

نے صاف انکار کر دیا اور کہا شہزادے یہ منگنی میں نے پولش کے باپ کی وجہ سے کی ہے۔ وہ میرا گہرا دوست ہے اور ویسے بھی پولش لاکھوں میں ایک ہے بھلا یہ منگنی میں کیسے توڑ سکتا ہوں۔"

"تو پھر آپ بھی یاد رکھیں کہ میں پولش کو زندہ نہیں چھوڑوں گا" شہزادے نے کہا۔

"شہزادے آپ ایسی کوئی حرکت نہ کریں شاید آپ کو معلوم نہیں عوام پولش کو کتنا پسند کرتے ہیں، کہیں یہ نہ ہو کہ لوگ بغاوت پر اتر آئیں" وزیر اعظم نے کہا۔

"میں دیکھ لوں گا" یہ کہتے ہوئے شہزادہ وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے کمرے میں شہزادی روزی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اپنی ایک کنیز کے ہاتھ پولش کو یہ پیغام بھجوایا کہ شہزادہ اس کا دشمن ہو رہا ہے۔ اس لیے اس سے بچ کر رہنا"

پولش کو پیغام ملا تو اس نے جواب میں کنیز سے کہا۔ کہ روزی سے کہنا وہ میری فکر نہ کرے شہزادہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"

اور پھر ایک دن جب پولش باغ میں سیر کر رہا تھا کہ اچانک شہزادہ اس کے سامنے آگیا۔ پولش اسے دیکھ کر ذرا نہ گھبرایا حالانکہ شہزادہ بڑے غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

'دیکھو پولش تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ تم روزی سے شادی نہ کرو"۔

'ورنہ کیا ہوگا" پولش نے کہا۔

'ورنہ تم میرے ہاتھوں بچ نہ سکو گے' شہزادے نے غضب ناک ہوتے ہوئے کہا۔

"پہلے بھی تم نے مجھ پر کئی حملے کروائے اس وقت بھی خدا نے مجھے تمہارے شر سے محفوظ رکھا اور آئندہ بھی جو تم کرو گے میں دیکھ لوں گا' پولش نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے تو پھر تیار ہو جاؤ" یہ کہتے ہوئے شہزادے نے وہی منتر پڑھا جو اسے بھونچال جادوگر نے سکھایا تھا۔ اس وقت شیش ناگ نمودار ہوا اس کا سر اتنا بڑا تھا کہ شہزادے کے سر پر چھتری کی طرح لگتا تھا۔

لیکن پولش ذرا نہ گھبرایا اور اس نے تلوار میان سے نکال لی اور مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ شیش ناگ نے پھنکار ماری تو پولش نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔ لیکن وہ سخت حیران ہوا کیونکہ تلوار شیش ناگ کے جسم سے یوں گزر گئی جیسے وہ ہوا کا بنا ہو۔ اب پولش کچھ گھبرایا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی وقت وہاں وہی پری نمودار ہوئی جس نے اس کی پہلے بھی ایک بار



جان بچائی تھی۔ اس پری کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی وہ تلوار اس نے پولش کی طرف بڑھائی اور بولی "پولش اس کی مدد سے تم شیش ناگ کو شکست دے دو گے" پولش نے اپنی تلوار پھینک دی اور وہ تلوار پکڑ لی اور آگے بڑھ کر شیش ناگ پر ایسا وار کیا کہ اس کی گردن دھڑ سے جدا ہو کر دور جا گری۔ شہزادے نے یہ دیکھا تو وہ پریشان ہو گیا لیکن پھر یہ ہوا کہ شیش ناگ کا سر اور دھڑ یکجا ہو گئے اور وہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اور شاہین بن کر آسمان کی طرف اڑنے لگا پری نے فوراً ہی پولش کو ایک تیر کمان دیا اور بولی اس سے اس مردود کو نشانہ بناؤ پولش نے جلدی سے تیر کمان پر چڑھایا اور نشانہ لے کر چھوڑا تو سیدھا شاہین کے پیٹ میں لگا وہ قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر گرا اور مر گیا یہ دیکھ کر شہزادہ وہاں سے چلا گیا اور اس نے اپنی ماں ملکہ کو تمام واقعہ کہہ سنایا وہ بولی بیٹے گھبراؤ نہیں میں روزی کو محل میں بلاتی ہوں اگر وہ اس بات پر رضامند ہو گئی کہ وہ پولش سے شادی نہیں کرے گی تو ٹھیک ورنہ کنیزوں سے کہہ کر اسے قتل کرا دوں گی۔ اور پھر فوراً ہی ایک کنیز کو بھیج کر اس نے روزی کو اپنے محل میں بلایا روزی سمجھ گئی کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک خنجر بھی چھپا کر لے گئی کہ اگر کوئی خطرہ ہوا تو وہ خود کو

ہلاک کر لے گی۔

ملکہ نے پہلے تو روزی کو بہت پیار محبت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب وہ ، مانی تو کنیزوں سے کہا کہ اسے پکڑ کر لے جائیں اور قید کر دیں۔ میں جلد ہی اس کی شادی شہزادے سے کر دوں گی اور پھر جیسے ہی کنیزیں روزی کی طرف بڑھیں اس نے خنجر نکال کر خود کو ہلاک کرنا چاہا تو اس وقت بادشاہ حضور وہاں آگئے اور انھوں نے اسے روک دیا اور پھر بادشاہ کو بھی تمام صورت حال کا پتا چلا تو اس نے ملکہ اور شہزادے کو ڈانٹا کہ وہ اس قسم کی غلط حرکتیں نہ کریں۔ اس پر ملکہ بولی۔

"حضور! آپ پولش کی اتنی طرف داری کیوں کرتے ہیں۔"

"وہ اس لیے کہ وہ بہادر ہے اور ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں" بادشاہ نے جواب دیا۔

"اگر یہ بات ہے تو آپ ایک کام کریں" ملکہ بولی۔

"وہ کیا" بادشاہ نے پوچھا۔

"آپ روزی کو تماشا گاہ میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دیں اور دو ببر شیر اس میدان میں چھوڑ دیں۔ اگر پولش دو شیروں کو ہلاک کر کے روزی کو بچالے گا تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا وہ روزی سے شادی کر لے" ملکہ نے کہا۔



"لیکن بیگم ایسا کرنا زیادتی نہ ہوگی" بادشاہ بولا۔

"اگر وہ بہادر ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ وہ دو شیروں سے مقابلہ کر سکتا ہے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے ذرا ہم تو دیکھیں وہ کتنا بہادر ہے" ملکہ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بادشاہ سلامت آپ ملکہ عالیہ کی بات مان لیں۔ میں بھی اب پولش سے اسی صورت میں شادی کروں گی جب وہ دو شیروں سے مجھے بچالے گا" وہاں کھڑی وزیر زادی روزی نے کہا۔

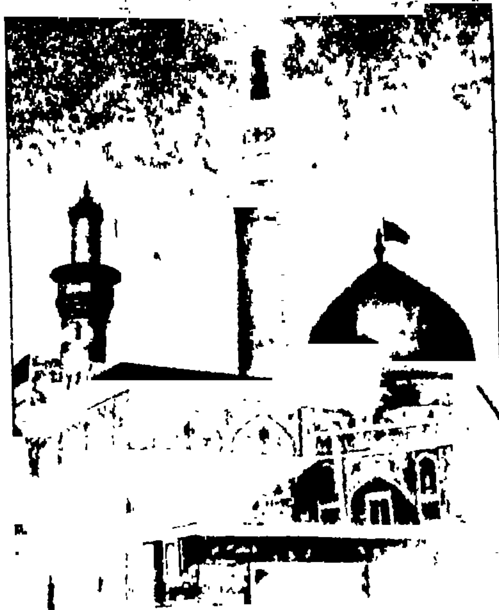
"لیکن بیٹی اس طرح تمہاری جان کو خطرہ ہے ہم وزیر اعظم کو کیا منہ دکھائیں گے" بادشاہ بولا۔

"آپ اس بات کی فکر نہ کریں" یہ کہتے ہوئے وزیر زادی، روزی واپس اپنے محل میں چلی گئی۔

اس کھیل کا اہتمام تماشہ گاہ میں کیا گیا روزی کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس روز پہلی بار پولش کچھ پریشان تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر روزی کو کسی شیر نے کچھ نقصان پہنچا دیا تو وہ خود کو ساری زندگی معاف نہیں کر سکے گا۔ آج وہ پچھتا رہا تھا کہ وہ اتنا بہادر بننے کی کوشش نہ کرتا تو آج اسے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا اور پھر وہ میدان میں اتر آیا۔ اس کے پاس ایک تلوار کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کے بعد دو بھوکے شیر گرجتے ہوئے میدان میں اتر آئے اور اس ستون کے گرد چکر لگانے لگے۔ جس کے ساتھ روزی بندھی ہوئی تھی پولش بھی ان کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا تاکہ اگر کوئی شیر روزی پر حملہ کرنا چاہے تو اس کی گردن اڑا دے اور پھر ایک شیر جیسے ہی روزی کی طرف بڑھا پولش نے پلٹ کر تلوار کا ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ شیر کی گردن تن سے جدا ہوگئی اب صرف ایک شیر اس کے مقابل تھا یہ دیکھ کر ہجوم زور زور سے نعرے لگانے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دوسرا شیر بھی فرش پر پڑا دم توڑ رہا تھا یہ دیکھ کر پولش آگے بڑھا اور روزی کی رسیاں کھولنے لگا اس وقت ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور پولش کے بازو میں پیوست ہوگیا۔ یہ تیر شہزادے سبز نے چھوڑا تھا۔ دراصل وہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اب تو ہجوم بے قابو ہوگیا اور شاہی چھتری کی طرف بڑھا سپاہیوں نے لوگوں کو بہت روکنا چاہا لیکن لوگ نہ رکے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سپاہیوں اور عوام میں جنگ شروع ہوگئی۔ لوگوں نے شاہی چھتری کو آگ لگا دی بادشاہ اور ملکہ اور شہزادہ ہلاک ہوگئے اور لوگوں نے پولش کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا گو وہ زخمی تھا لیکن بہت خوش تھا کیونکہ عوام نے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا اور پھر کچھ دنوں بعد اس کی روزی کے ساتھ بہت دھوم دھام سے شادی ہوگئی اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے ● ● ● ● ●

ڈاکٹر قنبر رضوی*

حضرت امام حسینؓ



ہر سال محرم میں حضرت امام حسینؓ کی اس قربانی کی یاد منائی جاتی ہے جو انھوں نے اسلام کے وقار کی خاطر ۶۱ھ میں کربلا میں پیش کی۔ کربلا ملک عراق میں دریائے فرات کے کنارے واقع ہے جہاں یزید کے ہزاروں لشکریوں نے امام حسینؓ، ان کے بھوکے پیاسے ساتھیوں اور عزیزوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کر ڈالا۔ ان کی تعداد کل بہتّر تھی جن میں چھے ماہ کا بچہ بھی شامل تھا۔ قتل ہونے والے حسینؓ کے ساتھیوں میں اصحاب رسولؐ بھی تھے اور حافظ قرآن بھی۔ مگر فوجِ یزید نے کسی کا کوئی پاس نہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ لاشں پر گھوڑے دوڑا کر پامال کیا گیا۔ خیمے جلائے گئے۔ عورتوں کو بے پردہ کر دیا گیا اور بیمار بیٹے کو طوق و زنجیر پہنا کر اہل حرم کے ساتھ اذیت دیتے ہوئے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام پا پیادہ لے جایا گیا۔ ساتھ ساتھ امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے سر کاٹ کر نیزے پر بلند کر کے لے جائے گئے۔

* وائس پرنسپل، اے، کے، کالج شکوہ آباد (یوپی)

حضرت امام حسینؓ نے اسلام کے بنیادی اصولوں کے لیے یزید کی ظالم حکومت کے سامنے سر نہ جھکایا۔ اسی لیے حضرت خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا۔

شاہ است حسینؓ بادشاہ است حسینؓ　　دین است حسینؓ دین پناہ است حسینؓ
سر داد نہ داد دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے لا الہٰ است حسینؓ

کیوں نہ ہو۔ حضرت امام حسینؓ کی شخصیت ہی اتنی عظیم تھی۔
آپ کا نام حسینؓ بھی تھا اور شبیر بھی۔ آپ کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ آپ رحمت اللعالمین پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چھوٹے نواسے، شیر خدا امیر المومنین حضرت علیؓ اور خاتون جنت بی بی فاطمہ زہراؓ کے چھوٹے صاحبزادے اور امام حسنؓ کے چھوٹے بھائی تھے۔
آپ کی ولادت ۳، شعبان ۴ھ کو جمعرات کے دن ہوئی۔ پیدائش کے بعد حضرت پیغمبر خدا کا مقدس لعابِ دہن آپ کی غذا بنا۔ آپ نے آغوش رسالتؐ میں تربیت پائی۔ یوں تو آنحضرت اپنے دونوں نواسوں کو بہت چاہتے تھے لیکن حسینؓ سے محبت کا کچھ انداز ہی اور تھا۔ ایک بار حسینؓ مسجد کے دروازے سے داخل ہونے لگے اور زمین پر گر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنا خطبہ قطع کر کے منبر سے نیچے اتر آئے۔ بچے کو زمین سے اٹھا کر پھر منبر پر تشریف لے گئے۔ اور مسلمانوں سے کہا، دیکھو یہ حسین ہے۔ اسے خوب پہچان لو۔ اور اس کی فضیلت کو یاد رکھو۔
حضرت حسینؓ ابھی چھ سال کے تھے کہ بے حد محبت کرنے والے نانا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تقریباً آٹھ سال کے تھے کہ ماں کی آغوش سے بھی محروم ہو گئے ۴۰ھ میں شفیق باپ امیر المومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالبؑ مسجد کوفہ میں شہید ہوئے اور ۵۰ھ میں بڑے بھائی حضرت امام حسنؓ کی بھی شہادت ہوئی۔ اب حسین پنجتن پاک کے اکیلے فرد کی حیثیت سے رہ گئے اور دس برس تک خاموشی اور گوشہ نشینی کے عالم میں عبادت اور شریعت کی تعلیم دینے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ ۶۱ھ میں ظالم حکومت نے آپ کو شہید کرا دیا۔ ●

حضرت امام حسینؓ اپنے اخلاق و اوصاف کی وجہ سے منفرد تھے۔ عصمت و طہارت، زہد و عبادت، قربانی اور سخاوت میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ خود سرکارِ دو عالم فرماتے تھے "حسین میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے" آپ کے دروازے سے کوئی سائل محروم نہیں گیا۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب 'ابو المساکین' ہو گیا تھا۔ راتوں کو روٹیوں اور کھجوروں کے بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جاتے اور غریبوں، محتاجوں، بیواؤں اور یتیموں کو بانٹتے تھے جس کی وجہ سے آپ کی پشت مبارک پر نشان پڑ گئے تھے۔ امام حسینؓ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جب کسی صاحبِ ضرورت نے تمہارے سامنے سوال کے لیے ہاتھ پھیلا دیا تو گویا اس نے اپنی عزت تمہارے ہاتھ بیچ ڈالی اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو۔ کم سے کم اپنی ہی عزتِ نفس کا خیال کرو"۔

امام حسینؓ کی انکساری اور عبادت ضرب المثل تھی۔ فوج یزید سے صلح کی کوششیں ناکام ہونے کے بعد آپ نے ایک رات کی مہلت عبادت کے لیے مانگی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ۱۰ محرم کو جنگ کے دوران تیروں کی بوچھار میں بے خوف و خطر نماز ظہر ادا کی اور حد تو یہ ہے کہ عصر کے وقت جب آپ کو شہید کیا گیا تو آپ کا سر سجدے میں تھا۔

آپ کی بلندیِ اخلاق کی ایک ہی مثال کافی ہے کہ جب یزید کی فوج آپ کا راستہ روکنے کے لیے آئی تو سب پیاس سے جاں بہ لب تھے۔ نواسۂ رسولؐ نے مشکوں کے دہانے کھلوا دیے اور اپنی اور اپنے بچوں کی پیاس کا خیال کیے بغیر فوج والوں کو سیراب کرا دیا۔ مگر افسوس انھیں فوجیوں نے امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو تین دن کا بھوکا پیاسا قتل کر دیا۔ حد تو یہ ہے کہ چھ مہینے کے پیاسے بچے علی اصغر کو پانی مانگنے پر تین پھلوں کے زہر میں بجھے تیر سے شہید کر دیا۔

خواجہ حسن نظامی (مرحوم)



یہ درگاہ ...، برس کی پرانی ہے اور بلبلی خانے میں واقع ہے اس کا ایک راستہ جامع مسجد کے جنوب سے جتلی قبر اور بھوجلہ پہاڑی ہو کر جاتا ہے۔ اور دوسرا راستہ قاضی کے حوض سے بازار سیتارام اور وہاں سے کلاں مسجد جاتے ہوئے آتا ہے۔ یہ درگاہ گنجان آبادی کے مکانوں میں گھری ہوئی ہے اور اس کو "رجی سجی" کی درگاہ کہتے ہیں اور یہ محکمہ آثار قدیم دہلی کی نگرانی میں ہے۔

ملکہ رضیہ سلطانہ غلام خاندان کے شہنشاہ سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی تھیں اور حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی مرید تھیں۔ انھوں نے بیس برس تک اپنے باپ التمش کے ساتھ تمام ہندستان پر حکومت کی تھی۔ اگرچہ التمش کے چار بیٹے بھی تھے لیکن سلطان التمش بیٹوں کی بدچلنی اور نالائقی کی وجہ سے اور بیٹی کی اعلا علمیت اور قابلیت اور عبادت اور معدلت کے سبب بیٹی پر بھروسا کرتے تھے۔ جب التمش کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے وزیروں کو جمع کر کے رضیہ کو اپنا جانشین اور ولی عہد بنانا چاہا۔ چونکہ اس سے پہلے کسی عورت کی بادشاہی نہیں ہوئی تھی۔ اس واسطے وزیروں نے مخالفت کی اور کہا کہ آپ کے چار بیٹے موجود ہیں پھر بیٹی کی بادشاہی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ سلطان نے جواب دیا۔ اس بیٹی نے بیس برس تک میرے ساتھ حکومت کی ہے۔ لڑائیوں میں شریک رہی ہے اور لڑائیوں کے وقت بڑی بہادری اور لیاقت اور شجاعت کے ساتھ لڑی ہے اور درباری حکومت میں اس کی سمجھ، اس کے انصاف اور اس کی دور اندیشی اور اس کی رحم دلی کو میں نے مردوں سے زیادہ پایا ہے۔

سلطان کا یہ حکم سن کر وزیر خاموش ہو گئے اور سلطان کی وفات کے بعد مجبوراً رضیہ کو تخت نشین کیا گیا۔ رضیہ پردہ کرتی تھیں۔ لیکن اتنے بڑے ملک کے انتظام کا بوجھ اٹھانا تھا۔ اس واسطے انھوں نے مردانہ لباس پہنا اور دربار میں بے پردہ آکر تخت نشین ہوئیں۔ اور ساڑھے تین برس تک نہایت عمدگی کے ساتھ ہندستان پر حکومت کرتی رہیں۔ چاروں بھائی مخالف تھے اور وہ بہن کے خلاف علماء کو اور مشائخ کو اور ان کے ذریعے عوام کو بھڑکاتے تھے اور امیروں اور وزیروں کو بھی لالچ دے کر ملکہ کا دشمن بناتے تھے لیکن ملکہ سلطانہ رضیہ نے گھر کی دشمنی اور باہر کی دشمنی کے باوجود نہایت عقل و دانش سے ساڑھے تین برس تک بہت اچھی بادشاہی کی اور ان کا زمانہ بہت ہی اچھا زمانہ ہندستان میں تھا۔ آخر کار بھائیوں کی سازش رنگ لائی اور ملکہ پر ایک جھوٹا الزام لگایا گیا کہ وہ یاقوت جبشی پر بہت زیادہ مہربان ہیں اور یاقوت جبشی نے ملکہ کی بغل میں ہاتھ دے کر ان کو گھوڑے پر سوار کرایا ہے۔ مخالف تاریخ نویسوں نے باوجود انتہائی مخالفانہ کوشش کے سوائے اس ایک بات کے اور کوئی برائی ملکہ کی نہیں لکھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ الزام بالکل جھوٹا اور بہتان تھا۔ اور اس کی کوئی اصلیت نہیں تھی۔ جب ملکہ نے مردانہ لباس پہن لیا تھا اور وہ بے پردہ دربار میں آکر بیٹھتی تھیں تو ہزاروں واقعات ایسے ہو سکتے تھے جن میں کسی نہ کسی مرد کا ہاتھ ملکہ کے جسم کو لگا ہوگا۔ مگر مورخوں نے صرف ایک ہی الزام لگایا ہے کہ یاقوت جبشی نے ملکہ کی بغل میں ہاتھ دے کر ان کو گھوڑے پر سوار کرایا اور اسلامی شریعت کی بموجب یہ الزام کسی سزا کے قابل نہیں تھا۔ کیوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت پر حرام کاری کا الزام لگائے اور چار گواہ ایسے پیش نہ کرے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے حرام کاری دیکھی ہو تو ایسی حالت میں اس الزام لگانے والے کے اسّی کوڑے مارنے چاہییں۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ کوئی آدمی اپنی جائز اور نکاحی بیوی سے بھی ایسی خلوت نہیں کرتا جس کو چار آدمی دیکھ سکیں۔ پھر ملکہ رضیہ سلطانہ پر جس نے یہ بہتان لگایا کہ ملکہ یاقوت جبشی سے ناجائز تعلق رکھتی ہیں تو وقت کے مولویوں اور پیروں نے مذکورہ حدیث کی بموجب اس کی شرعی تحقیقات کیوں نہیں کی؟ اور کیوں ملکہ کے خلاف بغاوت کر دی گئی؟ اور کیوں ان بے گناہ ملکہ کو شہید کر دیا گیا؟ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ چاروں بھائیوں کی سازش سے یہ جھوٹا الزام مشہور کیا گیا تھا اور دربار کے وزیر اور امیر اپنی مردانہ شان کی ہتک سمجھتے تھے

کہ ایک عورت اُن پر حکومت کر رہی ہے اس لیے بالکل بودا اور بالکل غلط الزام لگا کر ملکہ کے خلاف بغاوت کی گئی۔ ملکہ اپنی فوج کے ساتھ بھٹنڈے کی طرف گئیں اور وہاں انھوں نے ایک مسلمان امیر سے نکاح کر لیا اور اس کے بعد ان دونوں نے باغیوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن دھوکے اور فریب سے ملکہ کو اور ان کے شوہر کو شہید کر دیا گیا اور دہلی شہر اس زمانے میں قطب مینار کے پاس تھا اس لیے دونوں شہیدوں کی لاشیں دہلی شہر سے گیارہ میل کے فاصلے پر جنگل میں دفن کر دی گئیں۔ یعنی آج کل جہاں سلطانہ رضیہ کا مزار ہے وہ جگہ قطب مینار والے شہر سے گیارہ میل شمال میں تھی اور اس وقت یہاں جنگل تھا۔ ملکہ کے دفن ہونے کے بہت عرصے بعد تغلق کے زمانے میں یہاں ایک بہت بڑی مسجد بنائی گئی جو آج تک کلاں مسجد کے نام سے مشہور ہے اور یہ کلاں مسجد درگاہ شاہ ترکمان کے غرب میں اور درگاہ ملکہ سلطانہ رضیہ کے جنوب میں واقع ہے۔

سلطانہ رضیہ کی شہادت کو سات سو برس ہو چکے ہیں۔ یہ ملکہ بڑی عابدہ زاہدہ اور رحم دل تھیں اور چونکہ بے گناہ شہید ہوئی تھیں اس واسطے ان کے مزار سے بے شمار کرامتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

آس پاس رہنے والے لوگوں کا بیان ہے کہ ہم وہاں غیبی روشنیاں دیکھتے ہیں۔ خوشبو آتی ہے اور سچی سچی درگاہ میں جو دعائیں مانگی جائیں قبول ہو جاتی ہیں اور ہزاروں آدمیوں کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

چوں کہ ملکہ رضیہ سلطانہ چشتیہ خاندان میں مرید تھیں اور انھوں نے کبھی آسمان کو بے وضو نہیں دیکھا تھا اور ہمیشہ تہجد کی نماز پڑھتی تھیں۔ اس واسطے ان کا نام بائیس خواجہ کی چوکھٹ میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ دہلی میں آنے والے زائرین اور سیاحوں کا فرض ہے کہ وہ اس درگاہ میں ضرور جائیں اور یہاں اپنی مرادوں کا خیال کر کے خدا سے دعا مانگیں۔ اس سے ان کی ہر مراد پوری ہوگی۔ (بائیس خواجہ کی چوکھٹ سے)

شیخ محمد عثمان خاں

حکایاتِ سعدیؒ

وہ دوسروں کی حفاظت کیسے کرے گا

ایک کسان کا گدھا مر گیا۔ کسان نے گدھے کا سر کاٹ کر کھیت میں ایک بانس کے ساتھ باندھ دیا کہ فصل نظرِ بد سے بچی رہے۔ ایک دانا نے دیکھ کر "بے چارہ گدھا جب تک جیا، کسان کے ڈنڈے کھاتا رہا۔ اتنا نہ ہوا کہ اپنی ہی جان بچالے بھلا مرنے کے بعد کھیت کو بُری نظروں سے کیسے بچائے گا، جو خود بے بس ہے۔ وہ دوسروں کی حفاظت کیسے کرے گا؟

غیبت کرنے والا بزدل ہوتا ہے

ایک استاد اپنے شاگردوں سے کہہ رہے تھے۔ "دانا کہتے ہیں کہ غیبت ڈاکہ ڈالنے سے بھی بڑا گناہ ہے"

ایک شاگرد بولا "ڈاکہ تو بڑا جرم ہے۔ غیبت بُری ہی لیکن ڈاکے سے بڑی کیسے ہوسکتی ہے؟" تب استاد نے یہ بات سمجھائی کہ ڈاکو بہادری سے آگے آتا ہے اور للکار کر حملہ کرتا ہے۔ لیکن غیبت کرنے والا بزدل ہوتا ہے وہ پیٹھ پیچھے بُرائی کرتا ہے اور تہمتیں لگاتا ہے۔

کیا ہم اسے مایوس کردیں؟

ایک عورت نے خاوند سے شکایت کی کہ محلے کا بنیا اکثر چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔ تم دو قدم آگے بڑھ کر کیوں نہیں خریدتے کہ نقصان نہ ہو"

خاوند نے کہا "وہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر شرم آتی ہے بھلے آدمی نے اپنا محلہ چھوڑ کر ہمیں لوگوں کی امید پر یہاں دکان کھولی ہے۔ اگر ہم بھی اس کی امید پوری نہ کریں تو خدا ہماری امیدیں کیسے پوری کرے گا"

جاگو جگاؤ

باتیں کہنے کے مختلف ڈھنگ ہوتے ہیں۔ کوئی آدمی سیدھی سادی بات کرتا ہے۔ حقیقت کو صاف الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ کوئی آدمی ہر بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ اس کو مبالغہ کرنا کہتے ہیں۔ مبالغہ کرنے والوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ہر بات مبالغے سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی ہی نہیں دوسروں کی بات بھی بڑھا چڑھا کر کہتے ہیں، لیکن بعض لوگ صرف اپنے بارے میں مبالغہ کرتے ہیں، وہ اپنی ہر بات کو بہت خوب بنا کر پیش کرتے ہیں اور اپنی تعریف میں بھی انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ لوگ ان کی عادت سمجھ جاتے ہیں تو پھر ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے، اور اگر وہ سچ بھی کہہ رہے ہوں تو جھوٹ سمجھتے ہیں۔ لوگ ایسے آدمی کو شیخی خورا کہتے ہیں۔

شیخی کی عادت اچھی عادت نہیں ہے۔ شیخی بگھارنے والا آدمی کبھی مقبول نہیں ہوتا۔ وہ جس محفل میں جاتا ہے لوگ یا تو وہاں سے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں یا پھر ان کا مذاق اُڑانے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس عاجزی اور سادگی کو سب پسند کرتے ہیں۔

کیا تمھیں سادگی اور عاجزی پسند نہیں ہے؟

تمہارا دوست اور ہمدرد حکیم محمد سعید

✖ قرآن حکیم

[illegible] غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے، و[illegible] سے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ مرسلہ: جاوید عزیز

✖ حضرت علیؓ

[illegible] کے ایمان کا اندازہ اس کے کیے ہوئے وعدوں سے [illegible] سکتا ہے۔ مرسلہ: اختر علی

✖ بوعلی سینا

کم کھانے اور کم بولنے میں ہی عافیت ہے۔

مرسلہ: محمد ندیم خان

✖ ابنِ جوزی

نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو، اس طرح تمہارے افعال میں ان کے افعال کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔

مرسلہ: سید مظہر علی

✖ مولانا رومی

جس میں ادب نہیں اس میں گویا برائیاں ہی برائیاں ہیں۔

مرسلہ: غلام فاروق الغفاری

✖ خلیل جبران

غم کا زیادہ بوجھ اٹھانے کے بعد انسان خود کو پھول کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ مرسلہ: آصف اعجاز

✖ شیکسپیئر

اہلِ ہمت کے پاس بلند مقاصد ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے پاس صرف خواہشیں۔ مرسلہ: سیف اللہ سیفی

✖ سمائلز

اُمید آفتاب کی مانند ہے، جب ہم اس کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو ہماری مصیبتوں کا عکس ہم سے دُور ہٹتا جاتا ہے۔

مرسلہ: عبدالشکور

✖ سقراط

کامل انسان وہ ہے جس سے اس کے دشمن بھی بے خوف ہوں۔ وہ آدمی ہی کیا کہ جس سے اس کے دوست بھی ڈریں۔

✖ جان ایف کینیڈی

زندگی میں ایک بار موقع ملتا ہے۔ اگر تم ایک مرتبہ ثانوی مقام کے لیے تیار ہو جاؤ تو سدا کے لیے اوّل سے محروم ہو جاؤ گے۔ مرسلہ: سہیل احمد

✖ سرسید احمد خاں

دو آدمیوں کی تحقیر نہ کرو، عالم کی اور دوست کی۔ عالم کی تحقیر سے ذہن بگڑتا ہے اور دوست کی تحقیر سے محبت کم ہوتی ہے۔ مرسلہ: محمد اسلم پرویز


ابی تو یہ دونوں گاڑی کے پہیے ہیں
حافظہ ہے۔ ایک سائیکل کا پہیا ہے تو دوسرا ٹرک کا۔


بیٹے! میں پابندی سے تمھیں اسکول اس لیے بھیجتی ہوں کہ تم ایک اچھے انسان بنو۔
امی یہی بات آپ ماسٹر صاحب کو بتائیں نا۔ وہ تو روز ذرا ذرا سی بات پر مجھے مرغا بنا دیتے ہیں۔



ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آئے
کالے کالے بادل آئے
اُڑتے اُڑتے آئے ہوا پر
جلدی جلدی چھائے فضا پر
قدرت کے ہی کھیل نرالے
جمنے لگے وہ روئی کے گالے
دوڑے بھاگے ٹکڑے پھیلے
ہونے لگے پھر میلے میلے
رات کو تارے ان سے ہراساں
دن کو سورج ان سے پریشاں
کرنوں نے جب تار بکھیرے
قوسِ قزح کے بن گئے گھیرے
دُور افق پر بادل پھیلے
رنگ برنگے آنچل پھیلے
باغوں کا منہ دھو کر گزرے
ٹیلوں پر سے ہو کر گزرے
جنگل میں لہراتے آئے
بستی میں بل کھاتے آئے
وادی سے چپ چاپ نکل کر
کھاتی پہاڑوں سے جب ٹکر
گھومے گرجے، چمکے برسے
بچے بوڑھے سارے لرزے
ڈال پہ برسے پھول پہ برسے
بن کے کرم اسکول پہ برسے

ٹن ٹن ٹن ٹن بج گئی گھنٹی
ہو گئی لو اسکول کی چھٹی

طوطا آزاد ہوگیا

کنیز فاطمہ غازی

پیارے بچو! آج ہمارا دل چاہ رہا ہے کہ آپ کو ایک کہانی سُنائیں۔ ننھی مُنّی کہانی، اگر آپ کو یہ کہانی پسند آئی تو ہم آپ کو اور بھی کہانی سنائیں گے، لیکن ہر وقت نہیں۔ آپ نے بھی سُنا ہوگا کہ ہر وقت کہانیاں سُننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں، لیکن یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ آپ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ ہم تو اپنی نانی ماں کی یہ بات فوراً مان لیا کرتے تھے بلکہ فکر مند بھی ہو جاتے تھے کہ بے چارہ مسافر راستہ بھٹک گیا تو گھر کیسے پہنچے گا۔ اُس کے بچے اُس کا انتظار کرتے کرتے تھک جائیں گے لیکن ٹھیک کہا آپ نے۔ یہ بات آپ مان ہی نہیں سکتے۔ آپ تو اِس زمانے کے بچے ہیں



جب دنیا چاند سے بھی آگے پہنچ چکی ہے اور یوں بھی اب مسافر اکیلا تو سفر کرتا نہیں کہ راستہ بھٹک جائے۔ بس میں، ویگن میں، ہوائی جہاز اور ریل میں سفر کرتا ہے اور یہ سب مقررہ راستوں پر چلتے ہیں، اس لیے مسافر کے راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر چلو اب کہانی سنو۔

ایک لڑکا تھا۔ چھوٹا سا ننھا مُنا۔ وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کو چھوٹے چھوٹے بچے بہت پسند تھے۔ وہ جانوروں سے بھی پیار کرتا تھا۔ آپ کیا کہنے کو بے چین ہیں گڈو، یہی نا کہ جانوروں سے آپ کو بھی پیار ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے۔ سب ہی بچے جانوروں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس لڑکے کا کبھی راستے میں یا گلی میں مرغی، بلّی یا کتّے کا بچہ نظر آجاتا تو وہ اس کو پکڑ کر گھر لے آتا کہ پالوں گا، مگر اس کی امّی کو جانوروں کے یہ بچے پالنا بالکل پسند نہیں تھا۔ اچھا تو آپ کی امّی کو بھی پسند نہیں ہے۔ شاید ساری امّیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ جو بات بچّوں کو پسند ہوتی ہے وہ امّیوں کو پسند نہیں ہوتی اور جو بات امّیوں کو پسند ہوتی ہے وہ بچّوں کو بالکل اچھی نہیں لگتی۔ لیکن خیر ایک نہ ایک وقت زندگی میں ایسا آہی جاتا ہے جب امّی اور بچے ایک ہی طرح کی چیزیں پسند کرنے لگتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ بچّوں کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ امّی کے کسی کام سے منع کرنے میں کیا راز ہے اور جب بات سب کی سمجھ میں آجائے تو سارے اختلافات دُور ہوجاتے ہیں۔ جھگڑے ختم ہوجاتے ہیں۔

ہم آپ کو اس پیارے پیارے بچے کا نام تو بتانا ہی بھول گئے۔ اس کا نام ہے قذافی۔ قذافی جب بھی کسی بلّی کے بچے کو پکڑ کر لاتا امّی کے منع کرنے پر تھوڑی دیر کھیل کر چھوڑ دیتا، مگر قذافی کا بہت دل چاہتا کہ اس کے پاس ہرے ہرے خوب صورت پَروں والا توتا ہو۔ سرخ سرخ مڑی ہوئی چونچ کتنی پیاری لگتی ہے۔ وہ اکثر اپنے امّی ابّو سے کہتا مجھے توتا لادیں میں پالوں گا، مگر امّی ابّو کہتے بیٹا! بے زبان جانوروں کی آزادی چھین لینا اور انھیں قید کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ امّی ابّو کے آگے قذافی کی ایک نہ چلتی اور وہ خاموش ہوجاتا، مگر وہ چُپکے چُپکے دل ہی دل میں اللہ میاں سے دُعا کیا کرتا۔ اللہ میاں! مجھے ایک پیارا سا توتا دے دے، میں اُسے پالوں گا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اللہ میاں سچے دل سے دعا مانگنے والوں کی دعا کبھی رَد نہیں کرتا اور پھر اگر دعا مانگنے والا بچہ ہو تو اس کی دُعا یوں جھٹ پٹ پوری ہو جاتی ہے کہ اُسے یقین ہی نہیں آتا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔

ایک دن اچانک اللہ میاں نے قذافی کی دعا قبول کر لی اور اُس کے گھر کے سامنے والے میدان میں ایک توتے کا مُنّا سا بچہ کسی درخت کے گھونسلے سے اُڑنے کی کوشش میں ہانپتا کانپتا آن گرا۔ قذافی نے اُسے دوڑ کر رومال سے پکڑ لیا اور گھر میں لا کر پنجرے میں بند کر دیا۔ مٹھو اتنا مُنّا سا تھا کہ اُس کے اُڑنے والے مضبوط پَر بھی ابھی ٹھیک سے نہیں نکلے تھے۔ اس کی چونچ بھی گہری سرخ نہیں ہوئی تھی اور گردن کا ہار بھی واضح نہیں تھا۔ قذافی ڈر رہا تھا کہ امی ڈانٹیں گی اور مٹھو کو آزاد کرنے کے لیے کہیں گی لیکن امی نے ایسا نہیں کیا۔ قذافی سے رہا نہیں گیا۔ اُس نے امی سے پوچھا، "امی، آپ نے اِسے آزاد کرنے کے لیے کیوں نہیں کہا؟" امی نے بتایا کہ یہ بہت چھوٹا بچہ ہے۔ ابھی اُڑ نہیں سکے گا اور آسانی سے کسی بلی کا نوالہ بن جائے گا۔

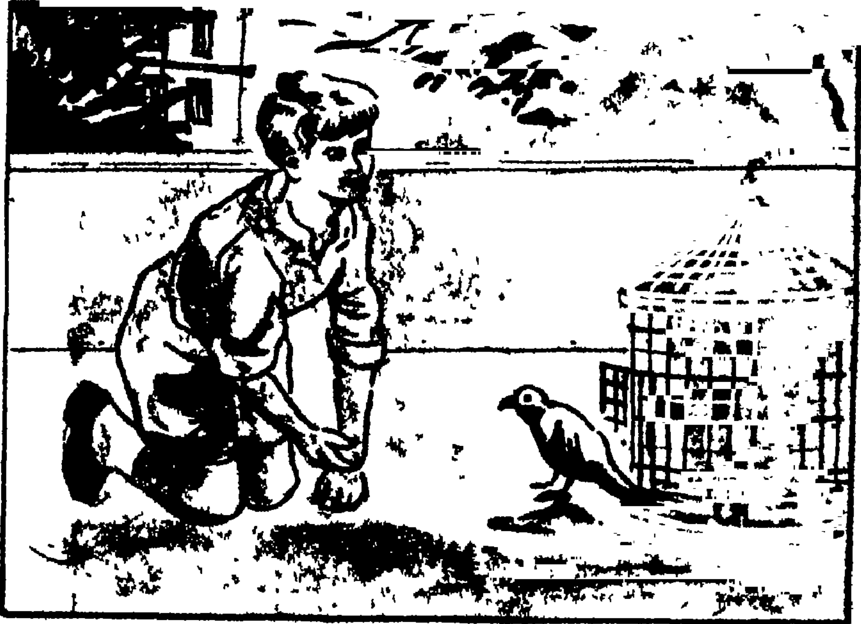
دیکھا آپ نے بچو! اللہ میاں نے قذافی کی دعا کس طرح پوری کی تھی کہ امی بھی ناراض نہیں ہوئیں اور پالنے کو پیارا پیارا مُنّا سا توتا مل گیا۔ قذافی بہت خوش تھا۔ اُس نے چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں پانی اور دانے کا انتظام کیا۔ اسکول جانے سے پہلے وہ اچھی طرح اُس کے دانے اور پانی کا بندوبست کر جاتا۔ اسکول سے آ کر اس سے کھیلتا۔ اب توتا اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ وہ قذافی اور اُس کے گھر کے لوگوں سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ قذافی کے گھر کے پچھلے صحن کی چھت پر جالی لگی ہوئی تھی اور کسی بلی کے کُودنے کا خطرہ نہیں تھا، اس لیے قذافی نے توتے کو پنجرے سے نکال کر صحن میں کھلا رکھنا شروع کر دیا۔ مٹھو بیٹا بڑا خوش تھا۔ صحن میں اِدھر اُدھر چہل قدمی کیا کرتا، کیوں کہ اس کے بازو ابھی اتنے طاقت ور نہیں ہوئے تھے کہ اُڑ سکتا۔

قذافی کو آم، آئس کریم اور کیک بہت پسند تھے۔ اُس نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ جو چیز اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کیا کرو۔ قذافی مٹھو کو بھی یہ چیزیں کھلاتا اور مٹھو بڑے شوق سے یہ سب کھاتا۔ آئس کریم مٹھو کو بھی بہت پسند تھی۔

[illegible]
کھانے کے لیے چیخ دیکھتا تو وہ آس پاس گھومنے لگتا، جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے بھی کھانا دو، مجھے کیوں بھول گئے ہو۔ پھر قذافی کے ہاتھ سے اپنے حصّے کا کھانا لے کر کھانے لگتا۔

دن گزرنے لگے۔ مٹھو کی چونچ کا رنگ گہرا سرخ ہو گیا۔ پَروں کا رنگ بھی خوب ہرا بھرا ہو گیا۔ گردن کی کنٹھی خوب واضح ہو گئی اور پروں میں اتنی طاقت آ گئی کہ مٹھو صحن میں لگی جالی کی چھت تک پرواز کرنے لگا۔ جالی کے اوپر بیٹھنے والی چڑیوں سے بھی اس کی دوستی ہو گئی تھی، کیوں کہ جب چڑیاں اوپر سے چوں چوں کرتیں تو مٹھو بھی انھی کی بولی میں جواب دیتا اور قذافی سمجھتا کہ ہمارے صحن میں کوئی چڑیا آ گئی ہے، مگر یہ تو مٹھو تھا جو چڑیوں کی آواز نکالتا۔ چڑیوں سے انھیں کی زبان میں بات کرتا۔ چڑیاں خوش ہو کر اور شور مچاتیں اور مٹھو پھر ان کی بولی میں جواب دیتا۔

روزانہ مٹھو اور چڑیوں کو باتیں کرتے دیکھ کر قذافی نے مٹھو سے ایک سبق یہ سیکھا کہ ہم کوئی بھی زبان بولتے ہوں بے شک اپنی زبان سے محبت کریں، لیکن اگر دوسرے



کی [illegible] بہت [illegible] بہت خوش [illegible] ہیں [illegible]
دوستی حاصل ہوتی ہے اور اس محبت کا کوئی بدل نہیں۔

مٹھو جب بہت خوش ہوتا تو اپنی بولی میں ٹیں ٹیں کے گیت الاپتا۔ مٹھو دن بھر صحن میں گھومتا مگر شام ہوتی تو خود بہ خود پنجرے میں بند ہونا پسند کرتا۔ اگر کبھی پنجرے کا دروازہ بند ہوتا تو وہ میز پر چڑھ کر اپنی خاموشی سے یاد دلاتا کہ میرا سونے کا وقت ہو گیا ہے اور میں اپنے چھوٹے سے گھر میں سونا چاہتا ہوں اور پھر پنجرہ قریب لاتے ہی اس میں آرام سے چلا جاتا۔ حال آنکہ دن میں لاکھ کوشش کر لو وہ پنجرے میں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

ایک دن قذافی کی چھٹی تھی اور میاں مٹھو خوب خوش تھے، خوب چہک رہے تھے۔ ٹیں ٹیں کر کے گھر سر پر اُٹھا لیا تھا۔ قذافی کو شرارت سوجھی۔ اُس نے اپنے مٹھو کی آواز ٹیپ میں بند کر لی۔ اب جب میاں مٹھو چپ ہوئے تو ٹیپ ریکارڈ چلا دیا، جس میں مٹھو کی آواز تھی۔ قذافی نے اور سب گھر والوں نے دیکھا کہ میاں مٹھو بے چینی سے آواز کو سُنتے ہیں اور اس توتے کو ڈھونڈ رہے ہیں، جس کی آواز انھیں سُنائی دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ ٹیں ٹیں کر کے جواب بھی دے رہے تھے، لیکن وہاں کوئی اور توتا تو تھا نہیں۔ یہ تو ٹیپ میں بند مٹھو کی ہی آواز تھی۔

قذافی بھی آپ لوگوں کی طرح ایک سمجھ دار بچّہ ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اب میاں مٹھو بڑے ہو گئے ہیں اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ چوں کہ اب یہ اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں اس لیے اب ان کو آزاد کر دینا چاہیے۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ قذافی نے سوچا کہ ۱۵۔ اگست میں ابھی آٹھ دس دن باقی ہیں۔ اتنے دِنوں تک مٹھو کو روزانہ پنجرے میں چھت پر لے جائیں گے تاکہ وہ کھلا آسمان دیکھ لے۔ اب میاں مٹھو کو خود اپنی حفاظت آپ کرنی ہوگی۔ اس لیے وہ اپنے اُڑنے کے راستے وغیرہ کو بھی سمجھ لیں گے اور پھر ۱۵۔ اگست کو میاں مٹھو کو آزاد کر کے ہم اپنا جشنِ آزادی منائیں گے۔ یہ سوچ کر قذافی پانچ اگست کی صبح پنجرہ لے کر چھت پر پہنچ گیا۔ سامنے گھنا آم کا درخت تھا اور پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

میاں مٹھو آنکھیں گھما گھما کر سب کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے، پھر نیچے لا کر قذافی نے میاں مٹھو کو کھولا اور ناشتا دیا، مگر یہ کیا میاں مٹھو سخت ناراض تھے۔ اپنی گردن کو پَروں میں چھپائے سارا دن بغیر کچھ کھائے پیے گزار دیا۔ رات پنجرے میں بھی بڑی مشکل سے گئے۔ دوسرے دن صبح پھر قذافی پنجرہ لے کر چھت پر پہنچا۔ میاں مٹھو آنکھیں گھُما گھُما کر دیکھتے رہے۔ نیچے آ کر وہی ناراضگی۔ بڑی مشکل سے اپنے پسندیدہ کیک کے چند ذرّے کھائے، پھر وہی ناراضگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ سب کا فیصلہ تھا کہ میاں مٹھو کو ۱۵ اگست کو آزادی دے دی جائے گی اور ابھی تو چھ اگست ہی ہوئی تھی۔ میاں مٹھو نے اگر کھانا پینا اسی طرح چھوڑے رکھا تو آٹھ دس دن میں وہ بہت کم زور ہو جائیں گے اور پھر کیا ہوگا۔ وہ کسی بلّی یا بچّے کے قبضے میں آجائیں گے۔ معاملہ بہت اہم تھا۔ میاں مٹھو کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ آخر یہ ایک زندگی کا معاملہ تھا۔ قذافی نے سُن رکھا تھا کہ بعض توتے دو سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا مٹھو بھی دو سو سال تک جی لے۔

بس پھر سارے گھر والوں نے مل کر ہنگامی اجلاس بُلایا۔ آخر بحث و مباحثے کے بعد سب کو اپنا پرانا فیصلہ بدلنا پڑا اور طے یہ ہوا کہ کل سات اگست کو قذافی کی سال گرہ ہے بس میاں مٹھو کو صبح سویرے آزاد کر کے سال گرہ منائیں گے، تاکہ مٹھو میاں جن کے دل میں آزادی کی آرزو بھڑک اُٹھی ہے بھوکے رہ کر خود کو ہلاک نہ کر ڈالیں۔ چھ اگست کا دن بھی میاں مٹھو نے اسی طرح مشکل سے چند ذرّے کھا کر گزارا۔ آزادی حاصل کرنے کی جو خواہش ان کے دل میں پیدا ہو گئی تھی تو اب اُن کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ بس پَروں میں منھ چھپائے پڑے رہے۔ دراصل جب تک انھوں نے آزادی کا اُجالا نہیں دیکھا تھا وہ صحن میں خوش تھے، لیکن اب اُن کا دل اپنی پسند کی چیزیں کھانے کو بھی نہیں چاہتا تھا بس ایک تڑپ تھی کہ کسی طرح آزاد ہو جائیں۔ ہنگامی اجلاس کے فیصلے کے مطابق سات اگست کی صبح کو سارا گھر قذافی کی قیادت میں چھت پر جمع ہوا۔ قذافی نے اپنے توتے سے کہا دیکھو کسی جانور کا نوالہ نہیں بننا اور نہ کسی بچّے کے ہاتھ آنا۔ مٹھو نے یوں دیکھا جیسے سب سمجھ رہا ہو۔ پھر قذافی نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ میاں مٹھو

ذرا سے آگے بڑھے اور پر پھیلائے۔ یوں لگنے لگا کہ ابھی وہ سامنے کے صحن میں گر جائیں گے، مگر انھوں نے ہمت کی اور ذرا اونچی پرواز کر کے آم کے درخت کی ایک شاخ پر جا بیٹھے۔
سب کافی دیر تک میاں مٹھو کو آزادی کی نعمت سے لطف اندوز ہوتے دیکھتے رہے۔ میاں مٹھو کبھی ایک شاخ سے دوسری پر جاتے اور کبھی نرم پتوں کو چونچ میں دبا لیتے، کبھی ہرے پتوں کے رنگ میں ایسے لاپتا ہو جاتے کہ ان کا ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ پھر کبھی نظر آنے لگتے۔

قذافی کو مٹھو میاں سے بڑی محبت تھی اور اس کی جدائی کا ان کو بہت رنج تھا، لیکن مٹھو آزاد ہو کر بہت خوش تھا، اس لیے قذافی بھی اس کو آزادی دے کر خوش تھے۔

گیارہ سال تک بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے والی چینی بچی

گیارہ سال تک
بے ہوش رہنے کے
بعد صحت یاب ہو گئی

پیکنگ ۲۳ ستمبر (مشرق رپورٹ) بارہ سالہ بچی زی زیاؤلی ایک سال کی عمر میں سر کے بل گر جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی گیارہ سال تک یہ بچی عوامی جمہوریہ چین کے شمالی [illegible] کے ہسپتال میں بے ہوش پڑی رہی سر کی شدید ضرب کی وجہ سے اس کے دماغ کے بعض اہم حصوں نے کام بند کر دیا تھا اور وہ زندگی اور موت کے درمیان معلق تھی ہسپتال کے ڈاکٹروں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور پوری توجہ سے اس کے علاج میں مصروف رہے۔ گیارہ سال بعد بالآخر انہیں اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل ہو گئی اور اب یہ بچی ہسپتال سے صحت یاب ہو کر اپنے گھر منتقل ہو گئی ہے

زلزلہ اور رستم

جرأت اور بہادری کا تعلق صرف جسم کی قوت سے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو رستم، زلزلے کو میدان چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیتا۔

کاشان جعفری



بات اُن دنوں کی ہے جب برِصغیر کے ٹکڑے پر ہندوستان ہندوستان ہی تھا۔ وہ سونے کی چڑیا کے نام سے دنیا میں مشہور تھا۔ انگریز تاجر بھی اس وقت تک ہندوستان میں نہیں پہنچے تھے۔

گجرات ایک صوبے دار (گورنر) کے ماتحت تھا۔ صوبے دار صوبے میں بسنے والوں کے دکھ سکھ کا بڑا خیال رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ صوبے میں ہر طرف امن و سکون تھا۔

اُس زمانے میں آج کی طرح ہوائی جہاز، ٹینک اور میزائل تو نہیں ہوتے تھے۔ جنگی ضروریات کے

پیے ہاتھی پالے جاتے تھے اور گھوڑوں سے کام لیا جاتا تھا۔ گجرات کے صوبیدار کے پاس بھی ایک ہاتھی تھا۔ بہت ہی بھاری بھرکم اور غصہ ور۔ اس کے مہاوت نے اُس کا نام "زلزلہ" رکھ دیا تھا۔ زلزلہ واقعی زلزلہ تھا۔ مہاوت کے اشارے پر دشمنوں کی صفوں میں ایسی تباہی مچاتا کہ خدا کی پناہ۔

جب کبھی مہاوت اُسے لے کر سڑک پر نکلتا تو لوگ اس کی گھنٹی کی آواز سُن کر ایک طرف ہٹ جاتے اور اُس کو گزرنے کے لیے راستہ دے دیتے۔ سارے شہر میں زلزلہ اپنے غصے کے لیے بے حد مشہور تھا۔ اس کا مہاوت بھی اپنے جھکّی مزاج کے لیے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ وہ بھی کسی بات پر اُڑ جاتا تو منوائے بغیر دم نہ لیتا۔

ایک دفعہ شہر میں ایک غریب سبزی فروش سے مہاوت کی تکرار ہو گئی۔ سبزی فروش بھی بہت تیز طرار تھا۔ اس نے مہاوت کی غلط روش پر نہ صرف اسے ٹوکا بلکہ اُسے لاجواب بھی کر دیا۔ مہاوت نے اس پر بُری طرح اپنی سُبکی محسوس کی۔ موقع کی نزاکت کا خیال کر کے وہ اُس وقت تو خاموش ہو رہا مگر سبزی فروش سے اپنی اس ہتک کا بدلہ لینے کے لیے موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

ایک شام صوبے دار نے مہاوت سے کہا "جاؤ آج زلزلے کو باہر شہر میں ٹہلا لاؤ۔"

مہاوت نے تعمیل حکم کی۔ فوراً ہاتھی پر سرخ جھول ڈالی، گھنٹی باندھی اور عماری رکھ کر خود کسی راجا کی طرح عماری میں بیٹھ گیا۔ جہاں جہاں سے وہ گزرا، لوگ گھنٹی کی آواز سن کر ایک طرف ہٹتے اور اسے راستہ دیتے گئے۔ آخر مہاوت اپنا ہاتھی لیے شہر کے اس حصے میں پہنچا جہاں سبزی فروش کی دُکان تھی۔ دُکان کے قریب پہنچ کر اس نے ہاتھی کو مخصوص اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی ہاتھی بڑے جارحانہ انداز میں غصے سے بپھرا دُکان کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سبزی فروش کی دُکان کا ستیاناس کر دیا۔ ہاتھی کو غصے میں بپھرا دیکھ کر ارد گرد موجود سبھی لوگ خوف سے چُھپ گئے۔ ان میں وہ سبزی فروش بھی تھا۔ مہاوت نے اس پر ہی بس نہ کیا۔ اب اس نے ہاتھی کو اشارہ کیا کہ وہ سبزی فروش کو بھی ہلاک کر دے۔ ہاتھی قریب ہی چُھپے سبزی فروش پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا۔ سبزی فروش اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے نکل کر سڑک کے دوسری طرف بھاگا۔ ہاتھی نے اپنے دشمن کو بھاگتے دیکھ کر پیچھا کرنے کے لیے اپنا رخ موڑا ہی تھا کہ کسی نے اس کی پچھلی ٹانگوں پر زوردار ٹکر ماری۔ ٹکر اتنی زبردست تھی کہ مہاوت بھی پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اب تو اس کی حیرت کا ٹھکانا نہ رہا کیوں کہ ہاتھی کو ٹکر مارنے والا سبزی فروش کا پالتو بَیل تھا جو دُکان کے قریب ہی کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ اپنے مالک کو خطرے میں دیکھ کر بپھر گیا تھا اور جھٹکے سے رسّی تڑا کر ہاتھی پر حملہ آور ہوا تھا۔

[illegible]

پھر وہ پیچھے ہٹا اور سر جھکائے آگے بڑھ کر اپنے نوکیلے سینگ پھر ہاتھی کے پیروں میں بھونک دیے۔

بیل کو ہاتھی پر حملہ کرتے دیکھ کر خوف سے سہمے سہمے چھوٹے بڑے حیران رہ گئے وہ اپنی جگہوں سے ہل گئے۔ سبزی فروش بھی، جو سڑک کے دوسری طرف چھپنے کے لیے بھاگا تھا، حیرت سے بیل اور ہاتھی کی لڑائی دیکھنے لگا۔ ہاتھی سونڈ لہراتا ہوا بیل کی طرف پلٹا مگر بیل فوراً ہی پھر اس کے پیچھے پہنچ گیا اور ایک اور ٹکر اپنے سینگوں سے اس کی ٹانگوں پر مار دی۔ ہاتھی ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ سونڈ لہراتا پھر بیل پر حملہ آور ہونے کے لیے پلٹا۔ ادھر مہاوت نے بھی آنکس مار کر اسے غصہ دلایا مگر جب تک ہاتھی پلٹ کر بیل کے سامنے پہنچتا، تندرست و توانا پھرتیلا بیل نہایت ہوشیاری سے پھر اُس کے پیچھے تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح کافی فاصلے کر سر جھکائے آگے بڑھا اور اپنے نوکیلے مضبوط سینگ اس کی ٹانگوں میں گھسیڑ دیے۔ اپنے بیل کی ہمت دیکھ کر سبزی فروش کو بھی جوش آ گیا اور وہ سامنے آ کر خود اپنے بیل کو بڑھاوا دینے لگا۔

"شاباش رستم، شاباش، آج زمانے کا غرور اچھی طرح توڑ دے۔"

بیل نے نتھنے پھلا کر زور سے ڈکراتے ہوئے اپنی دُم اوپر اُٹھائی جیسے اپنی فتح کا پرچم لہرا رہا ہو، پھر اُسی انداز میں سر جھکائے دوڑا اور اپنے سینگ

مکانوں سے بچے، مرد، عورتیں بھاگ بھاگ کر [illegible] ہاتھی اور بیل کی یہ لڑائی نہایت دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مہاوت نے جب ہاتھی کو شکست ہوتے دیکھا تو ہاتھی پر سے چیخ کر بولا: "اے سبزی والے! ہوش کی دوا کر۔ کیوں اپنے بیل کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے؟"

اسی دوران میں بیل ہاتھی کی ٹانگوں پر ایک اور وار کر چکا تھا۔

ہاتھی پے در پے ٹکروں سے کافی نڈھال ہو گیا تھا۔ اُسے اپنی پچھلی ٹانگوں میں بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بیل پر حملہ کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ کر جان بچانے ہی میں بھلائی سمجھی۔ چند قدم بھاگا تھا کہ مہاوت نے پھر آنکس کر اسے بیل پر حملہ کرنے کے لیے غصہ دلایا۔ ہاتھی پلٹا اور اپنی سونڈ لہراتا بیل کی طرف بڑھا۔ سارے راہ گیر اور قرب و جوار کے رہنے والے اپنی اپنی سانس روکے یہ لڑائی دیکھ رہے تھے۔ ہاتھی کے اس طرح اچانک پلٹنے اور بیل کی طرف غصیلے انداز میں بڑھنے پر وہ سمجھے کہ اب بیل کی خیر نہیں مگر بیل اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ نہایت تیزی سے کنّی کاٹ کر ہاتھی کے پیچھے پہنچ گیا اور نہایت بپھرے ہوئے انداز میں سر جھکائے ہاتھی کی ٹانگوں پر حملہ آور ہوا۔ اس بار اُس کا حملہ اس قدر بھرپور تھا کہ ہاتھی

[illegible] ہاتھی [illegible] پر حملہ کرنے کے لیے کافی اُکسایا مگر اب اس کی فضا میں بلند سونڈ بھی جھول چکی تھی۔ اس میں بیل پر حملہ کرنے کی قطعی ہمت نہیں رہی تھی۔

اب مہاوت نے دوسرا پینترا بدلا۔ آنکس مارنے کی بجائے اُس کی پیشانی پر تھیلی سے ہلکے ہلکے تھپکی دینے لگا، پھر اُسے بیل پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ ہاتھی جیسے ہی نظر بیل کی طرف اٹھا کر وہ کنّی کترا کر پیچھے ہو گیا اور اپنا داؤ آزماتے ہوئے ہاتھی کی پچھلی ٹانگوں پر ایک اور کاری ضرب لگائی۔ اس حملے سے ہاتھی بالکل ہی مہاوت کے قابو سے باہر ہو گیا۔ اس نے کافی کوشش کی کہ ہاتھی رُک جائے اور بیل پر حملہ کرے، مگر ہاتھی متواتر چوٹوں سے بے حال ہو چکا تھا۔ وہ واپس صوبے دار کی حویلی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

سبزی والا اپنے بیل کی اس فتح پر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ دیکھنے والے بھی بیل کی بہادری اور اس کے حملوں پر عش عش کر اُٹھے۔ بیل نے تھوڑی دیر تک تو ہاتھی کا پیچھا کیا، پھر اپنے مالک کے پاس واپس آ گیا۔ سبزی والا خوشی سے بیل کی گردن سے لپٹ گیا۔ مقابلہ دیکھنے والوں نے اس پر سکّوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کئی نوجوان گلاب کے ہار لے آئے اور انھیں بیل کی گردن میں ڈال دیا۔ سبزی والے کے نقصان سے کافی زیادہ اُسے مل چکا تھا۔

[illegible] سمجھا [illegible] لوگوں کے کہنے پر [illegible] سنا یا مگر جب یہی بات مہاوت نے بتائی اور اُس نے فیل خانے میں جا کر زنولہ کی حالت دیکھی تو حیران رہ گیا۔ فوراً حکم دیا کہ وہ عجیب و غریب طاقتور بیل یہاں لایا جائے اور میرے سامنے اُس بیل کو زنولہ سے لڑایا جائے تاکہ یہ حیرت انگیز مقابلہ میں اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جنگلی ہاتھی ایک معمولی بیل سے شکست کھا جائے؟

صوبے دار کی عظیم الشان حویلی کے ساتھ ہی ایک نہایت وسیع و عریض میدان تھا۔ اسی میدان کو ہاتھی اور بیل کے مقابلے کے لیے منتخب کیا گیا۔ صوبے دار خود ایک بلند چبوترے پر بچھے تخت پر مقابلہ دیکھنے کے لیے بیٹھا جب کہ چاروں طرف عام آدمیوں کے لیے شامیانے لگوا دیے گئے۔ صوبے دار کے گھر کی خواتین حویلی کی کھڑکیوں میں چلمنوں کے پیچھے سے یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے بیتاب کھڑی تھیں۔

مہاوت نے صوبے دار کے حکم کے مطابق زنولہ کو بیل سے لڑنے کے لیے میدان میں اتارا۔ اُدھر سبزی فروش اپنے پھولوں سے لدے بیل کی رسّی تھامے خاموش کھڑا تھا۔ جیسے ہی ہاتھی میدان میں داخل ہوا، بیل صوبے دار کا چیلنج سمجھ گیا۔ اس نے ہولے سے گردن کو حرکت دی، جیسے کہہ رہا ہو: مالک رسّی چھوڑ دیں اور خدا پر بھروسا رکھیں۔ انشاءاللہ میں آج

جیسی خدا کے فضل و کرم سے تزورے کے اس بہاؤ کو گھبرا
کر ہی دم اڑا لگا۔

سبزی فروش نے اس کی گردن کی رسّی کھول
دی، بیل کے تیکھے سینگ کے بیچ دُم اکڑا کر کھڑی ہو گئی۔
وہ پھرتی سے ہاتھی کے پیچھے پہنچا اور اُسے پل بھر کی
مہلت دیے بغیر اپنے سینگوں کی مدد سے پیچھے شاباش
کر زخمی کرنے لگا۔ ہاتھی ہر بار زخم کھاتا اور تلملا کر پلٹنے
کی کوشش کرتا۔ وہ بیل کو اپنی لمبی سونڈ میں
جکڑ کر دور پھینک دینا چاہتا تھا مگر بیل اس سے بھی
زیادہ تیزی اور پھرتی سے پینترا بدل کر اس کے پیچھے
آتا اور سینگوں کی ضرب لگاتا۔

ایک دفعہ ہاتھی بیل کے سامنے پہنچنے میں کامیاب
ہو ہی گیا۔ وہ بیل کو سونڈ میں لے کر دور اچھال دینا
چاہتا ہی تھا کہ بیل نے بڑی عجیب و غریب حرکت
کی۔ وہ اپنے دونوں اگلے پیروں سے دُھول اڑانے
لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے اور ہاتھی کے درمیان
دُھول کا پردہ حائل ہو گیا۔ اس پردے کی آڑ میں بیل
تیزی سے ہاتھی کے پیچھے آ گیا اور ہاتھی کی زخمی ٹانگوں
کو سینگوں کی زد پر لے لیا۔ پھر تو کئی بار ایسا ہوا کہ ہاتھی
بیل کے سامنے پہنچا، بیل نے پیروں سے دُھول کی
چادر بنائی اور اس کی آڑ میں کسی تاخیر کے بغیر پیچھے جا
کر اپنا داؤ استعمال کر لیا۔

صوبے دار کو پہلے تو ہاتھی کی اس شکست اور
درگت پر بے حد شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ بعد میں
وہ خود بھی بیل کے حملوں اور اس کے ہاتھی سے بچاؤ
کی تدبیر پر دل کھول کر تعریف کرنے لگا۔ ہاتھی زیادہ
دیر اُس کا مقابلہ نہ کر سکا اور مہاوت کے روکنے کے
باوجود میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُسے بھاگتے دیکھ
کر صوبے دار اور تمام تماشائیوں نے خوب دل کھول
کر تالیاں بجائیں۔ بیل ہاتھی کے پیچھے بھاگا تو سبزی
فروش نے اُسے آواز دے کر روک لیا۔

صوبے دار نے مہاوت کے ذریعے سبزی فروش
سے کہلایا کہ وہ اپنا بیل صوبے دار کو فروخت کر دے۔
اُس نے جواب دیا "حضور میں آپ کی رعایا ہوں، میرے
پاس جو کچھ ہے، آپ کا ہی ہے مگر بیل کیا سوچے گا کہ
میں نے چند سنہرے سکّوں کے عوض اُسے فروخت
کر دیا!"

کافی سمجھانے بجھانے پر وہ بیل کو وہاں چھوڑنے
پر راضی ہو گیا، مگر وہ بیل کی قیمت لینے پر آمادہ نہ ہوا۔
تب صوبے دار نے اُسے پیشکش کی کہ وہ اور اس کا
تمام خاندان حویلی میں رہیں تاکہ بیل کو بھی مالک کی
تبدیلی کا احساس نہ ہو۔ پھر صوبے دار کو جب اصل
واقعے کا علم ہوا تو اس نے نہ صرف مہاوت سے
سبزی فروش کے نقصان کا ہرجانہ دلوایا بلکہ اُسے
فیل خانے کی ملازمت سے بھی الگ کر دیا۔ اب
صوبے دار کی ساری توجہ کا مرکز سبزی فروش کا یہ
رستم تھا۔

ہوا سب سے پہلے ہے

ڈاکٹر سید اسلم ملہر امراض قلب

انسانی زندگی کے لیے یوں تو غذا بھی اہم ہے اور پانی بھی لیکن ان میں ہوا کی اوّلیت مسلّم ہے۔ اگر ہوا نہ ملے تو چند لمحوں میں زندگی ختم ہو سکتی ہے اور اگر ہوا کم ہو جائے تو ہر لمحے اس کی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ جس قدر عظیم تحفۂ قدرت کا ہے اسی قدر کم شعور اس کے فائدوں اور نعمت کا ہے۔

جس طرح ہماری خواہش ہوتی ہے کہ جو پانی ہم پیتے ہیں وہ صاف ہونا چاہیے، اسی طرح جس ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ بھی صاف ہونا ضروری ہے۔ اگر پانی میں غلاظت نظر آتی ہے تو ہمارا دل قبول نہیں کرتا مگر ہوا میں کثافت ہو تو جی نہیں گھبراتا۔

شہر کے لوگ جس ہوا میں سانس لینے کے عادی ہو گئے ہیں وہ صرف دھواں، سیاہی، گیس، گاڑیوں اور مشینوں سے نکلے ہوئے غلیظ ابجزات اور غلاظت کا مجموعہ ہے جس کو ہم بعض دفعہ نہ جانتے ہوئے اور بعض دفعہ بادلِ ناخواستہ اپنے اندر جذب کیے جا رہے ہیں اور اس طرح شہر میں رہنے کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم صاف پانی کا تقاضا کرتے ہیں اگر پانی میں ذرا آلودگی کا شبہ بھی ہو جائے تو سراپا احتجاج ہو جاتے ہیں لیکن ہوا میں کثافت ہو تو ہم پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اور اس کو اپنا مقدر سمجھ کر برداشت کیے جاتے ہیں۔

کچھ لوگ تو حالات کی وجہ سے مجبور ہیں کہ وہ کثیف ہوا میں سانس لیں جس طرح شہروں کی مصروف سڑکوں کے آس پاس رہنے والے لیکن زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اپنی مرضی سے ہوا اور آکسیجن کی کمی میں مبتلا ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی عمر گزر گئی اور وہ دفتروں کی کوٹھڑیوں میں بیٹھے بیٹھے اُتھلے اُتھلے سانس لے کر جان بخش آکسیجن سے محروم رہتے ہیں۔ یہ لوگ بغیر کوشش کے صرف اس قدر ہوا اندر لیتے ہیں کہ زندہ رہیں، حال آں کہ چاہیے تو یہ کہ گہرے سانس کے ذریعہ سے اس قدر ہوا اندر کھینچیں کہ پھیپھڑوں کے دُور دراز تاریک گوشوں تک میں ہوا پہنچ کر صفائی کر دے تاکہ آئندہ پھیپھڑوں کی تکلیف سے مامون اور محفوظ رہیں۔

ایک پرانی ضرب المثل ہے "ہر روز دس گہرے سانس لینے والا تپ دق سے محفوظ رہتا ہے"۔ ممکن ہے یہ کہاوت پوری طرح صحیح نہ ہو۔ لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جو شخص دن میں کئی مرتبہ اس قدر گہرے اور لمبے سانس لیتا ہے کہ پھیپھڑے پوری طرح ہوا اور آکسیجن سے بھر جاتے ہیں وہ اپنے خون کو پوری طرح آکسیجن کے ذخیروں سے مالا مال کرتا ہے اور پھیپھڑوں کے ان تاریک گوشوں کو جو جراثیم کی آماجگاہ ہیں، صاف کر لیتا ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ہم میں سے اکثر کو گہرے سانس لینے کی خواہش نہیں ہوتی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم ورزش نہیں کرتے۔ اگر سارا دن دفتر، گھر میں گزر جائے تو نہ بھوک لگے گی اور نہ گہرے سانس لینے کی خواہش ہو گی۔ اگر کوئی شخص صبح سویرے گھر سے نکل کر دوڑ لگائے تو اس کو دس بیس سانس لینے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ خود ہی سانس اس قدر پھول جائے گا کہ ہوا پھیپھڑوں میں چلی جائے گی اور کاربن باہر آجائے گی۔ اس طرح اگر تیز قدمی سے چلا جائے، یا تیراکی کی جائے، کوئی اور کھیل کھیلا جائے یا باغبانی کی جائے تو اسی طرح کا فائدہ ہوگا، مگر شرط یہ ہے کہ محنت اس قدر پُر زور ہو کہ پسینہ آجائے یا سانس پھول جائے تو پھیپھڑے اچھی طرح ہوا سے صاف ہو جائیں گے اور خون میں آکسیجن کی فراوانی ہو جائے گی (اگر عمر ۳۵ سال سے زیادہ ہے اور ورزش کی عادت نہیں ہے تو بغیر طبیب کے مشورہ کے اس قدر زوردار محنت نہ کریں)۔

جسم کے فعل کو مناسب طریقہ پر انجام دینے کے لیے جسم کے چھوٹے چھوٹے خانوں کو بھی آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ تھکن، خستگی، سستی کی وجہ یہ بھی ہے کہ جسم اور دل و دماغ کو مناسب مقدار میں آکسیجن نہیں پہنچ سکے کہ گہرے سانس لینے کی عادت نہیں ہے۔ جب بھی آپ کو تھکن معلوم ہو تو باہر نکل کر گہرے سانس لے کر اپنے جسم، دل و دماغ کو مفرح کریں کہ جس طرح روشن دانوں سے ہوا آکر فرحت کا احساس پیدا کر دیتی ہے اسی طرح گہرے سانس لے کر پورا جسم ہوا دار ہوتا ہے۔ یہ محرومیٔ قسمت ہے کہ ہوا کی نعمت جس فیاضی سے قدرت نے عطا کی ہے، اسی مناسبت سے ہم فائدہ نہیں اٹھاتے اور سُست رہتے ہیں۔

مُنہ اندھیرے کبھی اُٹھ کر دیکھو
کیا تر و تازہ ہَوا ہوتی ہے
ناصر کاظمی

ہنسو بچو ہنسو



• جج: (گواہ سے) جب یہ دونوں کرسیوں سے لڑ رہے تھے تو اُس وقت تم نے کیا کیا تھا؟

گواہ: جناب، اُس وقت وہاں تیسری کرسی نہیں تھی اس لیے میں نے چھپ جانا ہی بہتر سمجھا۔

مرسلہ: یاور نعیم

• ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا، "تم کہہ رہے تھے کہ بلی کو کہیں دُور جنگل میں چھوڑ آؤ گے مگر یہ تو یہیں نظر آ رہی ہے۔"

دوست نے جواب دیا، "ہاں، میں اسے چھوڑ تو آیا تھا، مگر میں بھٹک گیا اور گھر واپس آنے کے لیے اس کا پیچھا کرنا پڑا!"

مرسلہ: ثناء اللہ امان اللہ سومرو

• ممتاز نے اپنی ہمسائی سے ایک کتاب مانگی۔ اس نے جواب دیا، "میں اپنی کتاب کسی کے گھر نہیں بھیجتی، جس کو ضرورت ہے یہاں آ کر پڑھ لے۔"

کچھ دن بعد اس ہمسائی کو جھاڑو کی ضرورت پڑی تو ممتاز نے یہ کہلا بھیجا، "میں اپنی جھاڑو کسی کو نہیں دیتی جس کو ضرورت ہو یہاں آ کر جھاڑو دے لے۔"

• ایک شرابی نشے میں لڑکھڑاتا ہوا چڑیا گھر میں جا نکلا اور ایک ہیبت ناک گینڈے کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر عاجزی سے کہا،

"بیگم، اس طرح غصے سے نہ دیکھو، میں ابھی بتلائے دیتا ہوں کہ اتنی دیر کہاں رہا!"

مرسلہ: نسیم اختر

• ایک صاحب دفتر میں ہمیشہ سو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے افسر نے کہا، "تم دفتر میں کیوں سوتے ہو؟"

انھوں نے جواب دیا، "میرا بیٹا رات کو مجھے سونے نہیں دیتا۔"

افسر نے کہا، "کل سے اپنے بیٹے کو ساتھ لیتے آنا کہ وہ تم کو یہاں بھی سونے نہ دے۔"

مرسلہ: نا معلوم

• شوہر: (بیوی سے) ارے بیگم، ابھی تک کھانا

نہیں پکا؟

بیوی: (تنک کر) کھانا کیسے پکاؤں سارے برتن تو آپ نے ایشنا میں لگا دیے ہیں۔

مرسلہ: مرید علی

* مُلّا نصرالدین اپنی عقل مندی کی وجہ سے سارے محلے میں مشہور تھے۔ ایک روز مُلّا کے پاس کچھ آدمی آئے، تاکہ ان کی ذہانت کا امتحان لے سکیں۔ لوگوں نے مُلّا کو ایک چاقو دکھایا اور پوچھا "یہ کیا ہے؟" مُلّا نے فوراً جواب دیا "یہ آری کا بچہ ہے۔ ابھی اس کے دانت نہیں نکلے ہیں۔" مرسلہ: نسیم نصیر

* رات کے وقت ایک خان صاحب بڑی تیزی سے سائکل پر چلے جا رہے تھے کہ ایک پولیس والے نے زور سے آواز لگائی، "رُک جاؤ، تمھاری سائکل میں لائٹ کیوں نہیں ہے؟"

خان صاحب نے وہیں سے چیخ کر جواب دیا، "خوچہ امارا رستے سے ہٹ جاؤ، امارا گاڑی میں بریک بی نئی اے۔" مرسلہ: محمد عاقل غفار

* ایک مسافر: (ٹیکسی والے سے) ریلوے اسٹیشن تک کا کتنا کرایہ لوگے؟

ٹیکسی والا: ڈیڑھ رُپیہ۔

وہی شخص: اور سامان کے؟

ٹیکسی والا: سامان کا کرایہ نہیں لوں گا۔

مسافر: تم سامان لے کر جاؤ، میں پیدل آتا ہوں۔

مرسلہ: نامعلوم

* ماں: (بیٹے سے) کیا کر رہے ہو؟

بیٹا: امّی، جغرافیہ کے سوالات کر رہا تھا۔

ماں: اگر تمھیں کوئی سوال نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا۔

بیٹا: اچھا تو امّی، یہ بتائیے کہ نیل کہاں ہے؟

ماں: غسل خانے میں دیکھو لو صابن کے ساتھ رکھا ہوگا۔ مرسلہ: محمد حنیف

* ایک شخص اپنے دوست کو اپنے لُٹ جانے کی تفصیل بتا رہا تھا:

"ہاں تو میں موٹر میں جا رہا تھا کہ اچانک ڈاکوؤں نے مجھے گھیر لیا اور میرا سب کچھ چھین کر فرار ہو گئے۔ رُپیہ، پیسہ، گھڑی حتیٰ کہ گاڑی بھی۔"

"مگر تمھارے پاس تو یہ ریوالور تھا؟"

"ہاں، بس یہ ریوالور بچا ہے جو میں نے چھپا لیا تھا۔"

* ایک شوہر کو ایک خط ملا کہ اگر انھوں نے کل شام تک دس ہزار رُپیے ادا نہ کیے تو اُن کی بیوی کو غائب کر دیا جائے گا۔ آپ اس فون نمبر پر اطلاع دیں کہ رقم کب تک پہنچا دیں گے۔ ان صاحب نے فوراً فون ملایا اور کہا کہ بھائی میرے پاس اتنی رقم کیا دس رُپے بھی نہیں ہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی دھمکی ضرور پوری کریں گے۔ مرسلہ: محمد آفتاب عصمت علی پٹیل

* مشہور شاعر اور جناب جگر مراد آبادی کے اُستاد جناب اصغر گونڈوی خاصے موٹے تازے تھے۔ ایک بار

جناب فراق گورکھپوری نے جناب مجنوں گورکھپوری سے کہا کہ اصغر صاحب کے بعض شعروں میں بہت سوز و گداز ہے۔ مجنوں صاحب نے منہ بنا کر کہا کہ سوز ہو یا نہ ہو گداز ضرور ہے۔ (گداز کے معنی نرمی، سوز اور رقت کے بھی ہیں اور موٹے کے بھی ہیں)

مرسلہ: عائشہ عصمت علی

● ایک طالب علم نے اپنے والد کو خط لکھا، "جناب والد صاحب! عرصہ ڈیڑھ ماہ سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہو سکی۔ بہت پریشانی ہے۔ براہِ مہربانی میرا خرچ روانہ کر دیں تاکہ معلوم ہو کہ آپ خیریت سے ہیں۔

مرسلہ: علی محمد سلطان احمد

● ایک آدمی بہت شراب پیتا تھا۔ اس کے ایک دوست نے سختی سے اسے منع کیا۔ شرابی نے آئندہ شراب پینے سے توبہ کرنے کا وعدہ کیا، مگر چند دِنوں کے بعد پھر پی لی۔ اتفاق سے وہی دوست مل گیا۔ اس نے پوچھا، "کیا تم نے شراب پی رکھی ہے؟" شرابی نے کہا، "نہیں، اگر آپ تصدیق کرنا چاہیں تو زمین پر ایک سیدھی لکیر کھینچ دیں، میں اس پر ٹھیک چل کر دکھاؤں گا۔ یہ سن کر اس کے دوست نے انگلی سے ایک لکیر کھینچ دی اور کہا، "اس لائن پر چل کر دکھاؤ۔"

شرابی ہنس کر بولا، "کیوں مذاق کرتے ہو، تم نے تو دو لکیریں کھینچ دی ہیں۔ میں کس پر چلوں۔"

● مصور نے ایک آدمی کی تصویر بنائی اور پہلے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس دکھانے لے گیا۔ ڈاکٹر فکرمند لہجے میں بولا، "یہ بچے گا نہیں، اسے ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔

مرسلہ: محمد عارف وقار

● ایک چھوٹا بچہ گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ایک سیلزمین اس کے پاس آیا اور کہا کہ "بیٹا تمہاری امی گھر پر ہیں؟" بچہ بولا، "جی ہاں۔" سیلزمین اوپر گیا اور بہت دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ اس کے بعد دو تین آوازیں بھی دیں۔ جب دروازے پر کوئی نہ آیا تو وہ غصے میں نیچے آیا اور بچے سے بولا، "تم تو کہتے تھے کہ تمہاری امی گھر پر ہیں، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" بچہ بولا، "تو کیا میں نے غلط کہا؟ یہ درست ہے کہ میری امی گھر پر ہیں اور میرا گھر یہاں سے بہت دُور بھی نہیں ہے۔"

مرسلہ: ناظمہ ادم،

● ماں: (بیٹے سے) اگر تم کہیں بھیڑ میں جا رہے ہو اور تمہارے دھکے سے کوئی شخص گر جائے تو تم کیا کرو گے؟

بیٹا: پہلے میں اسے اُٹھاؤں گا، پھر معذرت کروں گا۔

ماں: اگر وہ شخص تم کو انعام کے طور پر ایک رُوپیہ دے تو پھر؟

بیٹا: میں اُسے دوبارہ دھکا دے دوں گا۔

مرسلہ: نامعلوم

● پہلا آدمی: "آپ اس گھر میں بالکل نہ رہیے، اس میں صرف گدھے رہ سکتے ہیں۔" دوسرا: "یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" پہلا: "میں اس میں چار سال رہ چکا ہوں۔"

مرسلہ: شازیہ معین

● ایک صاحب نہایت پابندی سے پانچ وقت کی نماز کے لیے مسجد میں حاضری دیا کرتے تھے۔ لوگ اُن کی نیکی سے بہت متاثر تھے۔ ایک آدمی نے جب انھیں نہایت انہماک سے نماز ادا کرتے دیکھا تو اپنے ساتھی سے بولا "یہ آدمی جو نماز ادا کر رہا ہے نہایت نیک اور پرہیزگار ہے۔"

اس پر وہ صاحب نماز توڑ کر بولے "اور جناب میں حاجی بھی ہوں۔"

● ایک صاحب باغ میں بیٹھے اونگھ رہے تھے کہ اچانک ایک بچے نے انھیں جگا کر ایک رُپیہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ صاحب پریشان ہو کر بولے "تم مجھے رُپیہ کیوں دے رہے ہو؟" بچے نے معصومیت سے جواب دیا "اس لیے کہ آپ اُنگلی اُٹھا کر ایک رُپے کا اشارہ کر رہے تھے۔" اس پر وہ صاحب شرمندہ ہو کر بولے "یہ تو میری عادت ہے کیوں کہ میں کرکٹ کا ایمپائر ہوں۔"

● ایک خاتون نے اپنی پڑوسن سے کہا "کون کہتا ہے کہ میں موٹی ہوں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ جب میں فوٹو اُتروانے گئی تو فوٹو گرافر نے مجھ سے گروپ فوٹو کھنچوانے کی قیمت وصول کی۔"

مرسلہ: نازیہ علیم

● ایک صاحب ایک دن اپنے بال ترشوار ہے تھے۔ انھوں نے حجام سے کہا "سفید بال چُن لینا۔"

حجام نے کہا "حضور! جو بال چُن لیے جائیں وہ اور زیادہ نکلتے ہیں۔" ان صاحب نے کہا "یہ بات ہے تو سیاہ بال چُن لینا۔"

مرسلہ: ایم اقبال خالدی

● بچہ: "انکل جو باجا آپ نے مجھے تحفے میں دیا تھا وہ بہت کار آمد نکلا۔ جب میں اُسے بجاتا ہوں تو امی مجھے پیسے دے کر باہر کھیلنے کے لیے بھیج دیتی ہیں۔"

مرسلہ: محمد احمد لقمان

● ایک آدمی اور اس کی بیوی کار میں جا رہے تھے۔ بیوی کار چلا رہی تھی۔ کار کی انتہائی تیز رفتاری پر شوہر نے کہا، اتنی تیز مت چلاؤ، اگر حادثہ ہو گیا تو اخبار والے تمھاری ٹھیک عمر چھاپ دیں گے۔

بیوی نے غصّے سے شوہر کی طرف دیکھا اور کار کے اسپیڈو میٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کار کی رفتار کم کر دی۔

● "تو یہ بتائیے مسٹر وی وے آپ دن میں کتنی بار شیو کرتے ہیں؟"

"یہی کوئی ستر اسی بار۔"

"اُف خدایا! آپ پاگل تو نہیں ہیں؟"

"نہیں تو، میں تو حجام ہوں۔"

● ایک۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ تین۔۔۔ نیلام کرنے والے نے پوری قوت سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "آخری! ان صاحب کی منظور کی جاتی ہے جن کے شوہر نے ان کے منہ پر بے اختیار ہاتھ رکھ دیا ہے۔"

مرسلہ: محمد عارف



حضرت آدم علیہ السلام

(دوسری قسط)

ہابیل اور قابیل

منورہ نوری خلیق

حضرت آدم علیہ السلام کے کتنی اولاد ہوئی کب ہوئی اور ان کے نام کیا تھے؟ یہ کسی کو بھی علم نہیں ہے نہ ہی قرآن مجید میں اس کی وضاحت ہے۔ قابیل اور اقلیم دو جڑواں بہن بھائی تھے اور ہابیل اور یہودا دو جڑواں بہن بھائی تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ان چاروں کے ساتھ ساتھ اپنے باقی بچوں کو بھی عبادت کا اصل طریقہ بتایا۔ خدا کے خالق و مالک ہونے اور اس کے تمام قوانین سے آگاہ کیا اور اپنے دونوں بیٹوں میں روزگار کمانے کے لیے کام تقسیم کر دیا۔ وہ اس طرح کہ قابیل کو تمام زمین کی کھیتی باڑی کا ذمے دار بنایا۔ اور ہابیل کو تمام مویشیوں کا نگہبان اور چرواہا بنا دیا۔

یہ دونوں بھائی دن بھر محنت کرتے اور شام کو واپس آتے تو حضرت آدم علیہ السلام اُن سے ان کی تمام دن کی مشقت کے بارے میں دریافت کرتے۔ دوسرے دن کے لیے ہدایات دیتے اور جب دن ڈھلنے لگتا، سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے کا وقت ہوتا تب وہ اپنی تمام اولاد کو جمع کرتے اور اللہ کی حمد کرتے۔ اُس کے بتائے ہوئے طریقے پر عبادت کرتے اور اُس کی عظمت اور وحدانیت کا اعلان کر کے اپنے عہد کو دُہراتے ہوئے اُن بچوں کو یاد دلاتے اور آخر کار اُن سب کو شیطانِ مردود سے بچنے کی ہدایت دیتے۔ ایک طرح سے یہی اُس وقت کے انسان کی عبادت تھی۔ یہی اُن کا مذہب تھا یعنی انسان کے آنے کے ساتھ ہی کرۂ ارض پر مذہب آ گیا اور وہ بھی مذہب اسلام۔ کیونکہ جب زمین پر آ کر دنیا کے پہلے انسان نے خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا تو سمجھ لو کہ اسلام کا اعلان کیا۔ آدم علیہ السلام ہر روز اپنی اولاد کو ایک خدا کی عبادت کرنے کا حکم دیتے تھے۔ یعنی دینِ حق کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اِس طرح بڑے پاکیزہ طریقے سے زندگی گزر رہی تھی اور شیطان مردود موقع کی تلاش میں تھا کہ وہ حضرت آدم کو نہیں تو اُن کی اولاد کو خدا کی نافرمانی پر مائل کر کے، اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لے۔ آخر وہ وقت آ گیا جب حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے ان بچوں کی شادی کا فیصلہ کیا۔ اِس کے بارے میں اُنھیں خدا کی جانب سے حکم دیا گیا۔

اے آدم: پہلے حمل کے لڑکے کو دوسرے حمل کی لڑکی سے اور دوسرے حمل کے لڑکے کو پہلے حمل کی لڑکی سے شا

ازدواج میں منسلک کر دے۔"

یہ حکم سنتے ہی انھوں نے اِس بات کا اعلان کر دیا اور بی بی حوّا اور بچّوں سے کہا: "گواہ رہنا! میں حکم خداوندی کے مطابق اپنے بیٹے بیٹیوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر رہا ہوں۔ زن و شوہر کا رشتہ ہی دنیا کا اوّلین رشتہ ہے اسی سے ہر رشتے کو جنم لینا ہے اور انسان کو عظمت حاصل کرنا ہے۔ سُنو! میں قابیل کی بہن اِقلیما کو ہابیل کے نکاح میں اور ہابیل کی بہن یہودا کو قابیل کے نکاح میں دیتا ہوں۔ اب تمھیں میاں بیوی بن کر دُور دُور کے علاقوں میں جانا ہوگا جہاں تم اپنی اولاد کو عبادت کا سچّا اور اچھا طریقہ سکھاؤ گے۔ اُنھیں خدا کی عبادت کی تعلیم دو گے۔ یہی تمھاری زندگی کا مقصد ہے جس کا حساب خدا تم سے ضرور لے گا۔"

یہ اعلان سب نے سُنا۔ یہی وقت تھا جب شیطان مردود کو موقع مل گیا۔ وہ برسوں سے حضرت آدم علیہ السلام پر تو قابو نہیں پا سکا تھا لیکن اب موقع دیکھ کر قابیل کے نزدیک آگیا اور اُس کے کان میں سرگوشی کی: "قابیل! اقلیما پر تمھارا حق زیادہ ہے۔"

یہ سرگوشی سُنتے ہی قابیل نے اپنی سگی بہن اقلیما کو دیکھا جو ہابیل سے منسوب ہو چکی تھی۔ اُسے لگا کہ اقلیما یہودا سے زیادہ حسین ہے۔ اس وقت شیطان نے بڑا عجیب ہتھیار استعمال کر کے آدم کے بیٹے پر وار کیا تھا اور نہ جانے کیا تھا کہ اقلیما کو دیکھنے کے بعد قابیل نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا جو اپنا اعلان کر کے مطمئن تھے کہ قابیل زور سے بولا: "بابا جان! آپ کا فیصلہ میرے ساتھ زیادتی ہے۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔"

اس بے ادبی بھرے الفاظ پر حضرت آدم علیہ السلام نے چونک کر دیکھا اور بولے: "قابیل! تمھارا مطلب کیا ہے؟ اور وہ کون ہے جس نے تمھیں یہ کہنے کی ہمّت دی ہے؟"

"مجھے کسی نے ہمّت نہیں دی ہے۔" قابیل نے ضد سے کہا: "بلکہ میں خود یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اِقلیما سے میری شادی ہوگی۔"

"لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وہ تمھاری سگی بہن ہے۔ اُس کی حُرمت تم پر اور تمھاری حُرمت اُس پر لازم ہے۔ تمھاری شادی ہابیل کی بہن یہودا سے اور ہابیل کی شادی تمھاری بہن اِقلیما سے کرنا ہمارا فیصلہ نہیں بلکہ خدائے بزرگ و برتر کا حکم اور فیصلہ ہے۔"

حضرت آدم علیہ السلام کی یہ بات قابیل نے غور سے سُنی اور قدرے تحمل سے بولا: "بابا جان! آپ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم عطا کی ہے۔ ارادے اور فیصلے کی قوت دی ہے۔ فہم و ادراک دیا ہے جس کے سبب انسان اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز ہے۔"

"ٹھیک" حضرت آدم نے سمجھانے کے لہجے میں کہا۔ "عقلِ سلیم اور فہم و ادراک کی بدولت وہ اشرف المخلوقات اور عظیم تر نہیں گردانا جاتا بلکہ عقل کو استعمال کرنے کے انداز سے اُسے یہ مقام ملتا ہے۔ تم اپنی صلاحیتوں کو صحیح کام کے لیے استعمال کرو گے تب عظیم تر ہو ورنہ نہیں اور یاد رکھو کہ حقیقتاً کو تمھاری ضرورت نہیں بلکہ تمھیں اُس کی ضرورت ہے

ان کی پیروڈیوں اور مزاحیوں کی دھوم مچ گئیں۔

کالج اور یونی ورسٹی میں زمانے بھر کے ادیبوں، شاعروں سے ان کی دوستی تھی۔ مشرگشتیاں اور ادبی ہلچل تھی۔ اس زمانے میں بیکٹے۔ ڈاک ٹکٹ۔ ماچس کے لیبل۔ کیکٹس ــــ نایاب اور قلمی رسالے کتابیں جمع کرنا اور ادبی دوست بنانا ان کی ہابی تھی ــــ انھوں نے بڑوں کے لیے "اندیشۂ شہر" ــــ "لذّتِ آزار" ــــ "ستم ایجاد" "چشم حیراں" "مضامین پاشا" ــــ اور ــــ "جھونپا پر چھپڑ کا دن" ــــ جیسے طنز ومزاح اور تحریف کے مجموعے پیش کیے ــــ "ادب میں مارشل لاء" ــــ "رستم امتحان کے میدان میں" ــــ "غدر سن اٹھارہ سو ستاون کے اسباب" ــــ "کپور ایک مطالعہ" "مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا" "ادب میں بیک بلیس" ــــ "یونی ورسٹی کے لڑکے" "چند حسینوں کے خطوط" جیسے مضامین اور پیروڈیاں لکھ کر مزاحیہ ادب اور پیروڈی میں ہمیشہ کے لیے ایک بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔ اسی زمانے میں بچوں کے رسائل میں بھی پابندی سے چھپتے رہے۔ "بہادر بیٹیا ــــ آسمانی یاقوت ــــ فلمی کرتب ــــ بالشتیے کی گھنٹی ــــ مارکو پولو ــــ دنیا کی لوک کہانیاں ــــ اور ــــ روسی کہانیاں" جیسی مزیدار کتابیں بچوں کے لیے لکھیں۔ اسی کے ساتھ پھلواری، غنچہ ــــ پھول۔ کھلونا ــــ ٹافی ــــ کلیاں ــــ بھائی جان ــــ ننھے منّے۔ قومی آواز اور بچوں کے دوسرے رسائل میں بے شمار کہانیاں اور مضامین بچوں کے لیے لکھے۔ مزاحیہ ادب کا انتخاب اور تنقید پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیے۔ علی گڑھ سے "اسکالر" کا پیروڈی نمبر نکالا جو اردو میں اولین نمبر ہے۔ "اودھ پنچ" نکالا۔ اس کا کنہیا لال کپور نمبر چھاپا ــــ "کتاب" کا "شوکت تھانوی نمبر" نکالا نمکدان کا "طنزیہ مزاحیہ ادب نمبر" نکالا۔

بچوں کے لیے پہلے یہ لکھتے اور کتابیں خریدتے تھے بلکہ جمع کرتے رہتے۔ حالانکہ ان کے پاس بے شمار کتابیں رسالے آتے۔ پہلے یہ روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھے اس کا مزاحیہ کالم "گلوریاں" بھی لکھتے۔ پھر یہ بہار یونی ورسٹی کے اسلامیہ کالج سیوان میں بڑے بچوں کو پڑھانے لگے۔ اخبار میں دن بھر کام کرنا پڑتا تھا کالج میں ۴۵ منٹ میں چھٹی ہو جاتی۔ وہ بھی صرف لیکچر ایک ایسے آدمی کو دینا پڑتا جسے بولنے کا بڑا شوق ہے بقیہ وقت کاٹے نہ کٹتا۔ اس لیے مجبوراً انھوں نے وقت کاٹنے کے لیے

نے خدا کے حکم سے کہا: قابیل اور ہابیل تم دونوں اپنی اپنی قربانی خدا کے حضور پیش کرو۔ اللہ تعالیٰ جس کی قربانی قبول فرمائے گا اقلیما کی شادی اُسی سے کر دی جائے گی"

"لیکن یہ علم کیسے ہوگا کہ قربانی قبول ہو گئی"؟ قابیل نے دریافت کیا۔

"جس نے قربانی کا حکم دیا ہے وہی اس کا اظہار بھی کرے گا کہ قربانی قبول ہو گئی یا نہیں وہ پوشیدہ باتوں کو ظاہر کرنے اور نیتوں کو جاننے کی قوت رکھتا ہے"

پہلی قربانی

یہ اس دنیا کا ابتدائی زمانہ تھا لہٰذا یہ قربانی کا بھی پہلا ہی موقع تھا۔ قربانی رضائے الٰہی کے لیے ہونا تھی اور اُس کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہی بتایا تھا۔ وہ اس طرح کہ اپنا نذرانہ کسی بلند جگہ رکھ دو۔ دیکھنے والے اُس کے گرد جمع ہو جائیں پھر اگر آسمان سے آگ کا ایک شعلہ نمودار ہو کر اس نذرانے کو اچک لے جائے تو جان لو کہ قربانی قبول ہو گئی اور اگر آسمان سے نمودار ہونے والا شعلہ نظر آ کر لوٹ جائے اور نذرانے کی شے بدستور پڑی رہ جائے تو یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قربانی قبول نہیں کی بلکہ رد کر دی ہے۔ اس وضاحت کے بعد اگلے دن اِس کا وقت مقرر کر کے اعلان کر دیا گیا اور دونوں بھائی میدان سے اُٹھ کر اپنی اپنی نذر کا بندوبست کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس وقت قابیل کھیتی باڑی کی بدولت غلے کے بہت بڑے ذخیرے کا مالک تھا اور ہابیل کے پاس لاتعداد مویشی تھے۔ دونوں الگ الگ اس نذرانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

قابیل نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا: "میں اپنے غلے میں سے وہاں خدا کے حضور قربان کروں گا جس کی مجھے ضرورت نہ ہو تاکہ قربانی بھی ہو جائے اور میرا نقصان بھی نہ ہو اور میں اس مال کو اونچی جگہ رکھوں گا تاکہ آسمانی شعلہ اُس تک پہنچ اور اُسے اُچک لے اور اقلیما مجھے مل جائے گی"

عین اُس وقت جب وہ دل ہی دل میں ناقص مال چھانٹنے اور قربان کرنے کی سوچ رہا تھا۔ ہابیل اپنے مویشیوں کے گلے پر نظر ڈالتے ہوئے عقیدت کے ساتھ محوِ فکر تھا۔ اُس نے خود سے کہا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنے بہت سے مویشیوں کا نگہبان اور چرواہا بنایا ہے۔ اب قربانی کا موقع فراہم کیا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ بہترین جانور خدا کی نذر کروں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ بخشنے اور عطا کرنے والا ہے۔ اُسے ہماری کسی قربانی کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی میں اپنی سب سے اچھی بھیڑ قربان کروں گا"

اِس وقت دونوں بھائیوں کی سوچ اُن کے کردار اور غرض کی آئینہ دار تھی۔ یوں دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم اگلے دن قربانی کی تیاری کرنے لگے۔ اُس دن قابیل نے روئے زمین کے تمام کھیت کھلیان اور باغات سے غلہ اور پھل اور سبزیاں جمع کیں اور غلے کا ایک ایسا پہاڑ بنا دیا جو آسمان تک اونچا نظر آتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جونہی آسمان سے بجلی گرے گی پہلے اُس کی راہ میں یہی پہاڑ آئے گا۔ اس غلے کو جمع کرتے ہوئے وہ اُسے بار بار ٹٹولتا اور اچھا مال نکالتا رہا۔ آخر میں اپنے کھیت کھلیان اور باغات کی سب سے گھٹیا چیزیں قربانی کے لیے چنیں اور مطمئن سے انداز

میں بولا: چلو اچھا ہوا کہ یہ مال قربانی کے کام آ گیا ورنہ یہ اچھے مال کو بھی خراب کر دیتا، تب مجھے کتنا نقصان برداشت کرنا پڑتا؟

اُدھر ہابیل نے تمام مویشیوں کا معائنہ کرنے کے بعد ایک سب سے خوبصورت، تیک رفتار، تندرست و توانا دُنبہ الگ کیا اور اُسے لے کر نہر پر چلا گیا جہاں اُسے نہلایا، پھر خود غسل کیا اور مقررہ وقت پر قربانی کا دُنبہ لے کر اُس میدان میں پہنچ گیا جہاں یہ فیصلہ ہونا تھا۔ قابیل وہاں پہلے سے موجود بار بار اپنے غلے کے پہاڑ کو دیکھ رہا تھا جس کی بلندی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ ہابیل کا دُنبہ اُس کے سامنے ایک ننھا سا جانور نظر آ رہا تھا۔ قابیل نے طنزیہ انداز سے دیکھا اور بولا: "ہابیل! بھلا اس وقت اِس دُنبے کو پانی سے بھگونے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بھائی!" ہابیل نے جواب دیا: "میں نے سوچا کہ خُدا پاک ہے، جمیل ہے، بے عیب ہے۔ اُس کی نذر کرنے کے لیے دُنبے کو پاک صاف کر دوں۔"

قابیل کو یہ بات عجیب سی لگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خدا غلے کا اتنا بڑا ڈھیر چھوڑ کر اس چھوٹے سے جانور کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اُسی وقت سب نے دیکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام میدان میں تشریف لا رہے تھے جن کی آمد کے بعد انسان ہی نہیں، جتنی بھی مخلوقات کرۂ ارض پر تھیں سب جمع ہونے لگی کیونکہ آج کے دن کرۂ ارض پر حق اور باطل کا پہلا فیصلہ ہونے والا تھا جو خود حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں کا مقدمہ تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام میدان میں تشریف لائے۔ دونوں بیٹوں کی نذر ملاحظہ فرمائی اور پھر ان دونوں سے کہا: "خدا کے حضور دعا کرو کہ تمہاری قربانی قبول فرمائے۔"

یہ سنتے ہی قابیل آگے بڑھا اور بولا: "اے خدا! تو ہر شے کا مالک ہے۔ تجھے ہماری عبادت اور قربانیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

پھر ہابیل آگے بڑھا اور بولا: "اے خدا! تو ہر شے کا مالک ہے۔ تجھے ہماری عبادت اور قربانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تو بے نیاز ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتے ہیں۔ اگر تو اسے قبول فرمائے گا تو تیری عنایت اور احسان ہو گا۔"

دونوں بیٹوں کی دعا کے بعد اب حضرت آدم علیہ السلام نے ان نذرانوں کے درمیان کھڑے ہو کر ہاتھ بلند کیے اور دُعا کرنے لگے: "اے خالقِ کائنات تو بہترین منصف ہے۔ دلوں کے حال جانتا ہے۔ میرے ان دونوں بیٹوں کے درمیان فیصلہ کر دے۔"

یہ دُعا مکمل ہوئی تھی کہ آسمان پر گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک شعلہ بلند ہوا اور ہابیل کے دنبے کو اُچک لے گیا اور قابیل کے غلّے کا بلند ڈھیر اُسی طرح پڑا رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر حضرت آدمؑ سجدے میں گر گئے۔ اسی وقت ہابیل نے قربانی قبول ہو جانے پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس وقت یہی دو باپ بیٹے نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے سجدہ ریز ہو گئی تھی۔ البتہ دو ہستیاں ایسی تھیں جنہوں نے جُھکنا گوارہ نہ کیا تھا۔ ایک شیطان مردود تھا جو تکبر اور

فرشتے کے ساتھ آدم کے ایک فرزند کو راہِ حق سے ہٹا کر خوش تھا اور دوسرا قابیل جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی تو وہ غصّے اور اشتعال سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دل میں احساسِ ناکامی نے کئی اور جذبے بیدار کر دیے تھے۔ حسد، نفرت، احساسِ ذلت، بغض اور انتقام۔ گویا کہ اُس دن کرۂ ارض پر پہلی بار انسان کا دل اُن جذبوں سے آشنا ہوا تھا۔ جن سب کا مِلا جُلا عکس اُس کے رُخ پر تھا اور اُن سب کا خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا جانے کیوں اُسے گراں گزر رہا تھا لہٰذا وہ غصّے سے ایک جانب روانہ ہو گیا لیکن جونہی بھائی سے اُس کی ملاقات ہوئی تو بولا: "ہابیل! آخر تیرے ایک دُنبے میں ایسی کیا خوبی تھی کہ خدا نے اُس کی قربانی قبول کر لی؟"

"بھائی!" ہابیل نے کہا: "خدا اشیاء اور مقدار کو نہیں بلکہ انسان کی نیت دیکھتا ہے۔ آپ نے غلّے میں سے قیمتی اشیاء نکال کر خام اور ناقص مال پیش کیا تھا بلاشبہ یہ گناہ کی بات تھی لہٰذا بہتر ہے آپ توبہ کیجیے۔"

"اونہہ!" قابیل نے غصّے سے کہا اور اپنے کھیتوں کی طرف بڑھ گیا لیکن اُسے لگا کوئی اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی ٹھنڈے دل سے غور کرتا تو شاید پہچان لیتا کہ یہ وہی دشمن ہے جس سے بچنے کی تلقین حضرت آدم علیہ السلام ہمیشہ کرتے تھے لیکن اُس وقت قابیل غصے اور غم سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ اُس کے ساتھ ساتھ چلنے والی ہستی اُس میں حلول کرتی جا رہی ہے اور وہ غم سے بے قابو ہوا جا رہا ہے تب اُس کے قلب پر ایک خیال اُترا، کسی نے دھیرے سے مشورہ دیا: "قابیل! تم نذر پیش کرنے میں ناکام رہے ہو۔ دُنیا کے اوّلین انسان کے عظیم فرزند! اب کامیابی حاصل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ ہابیل کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔"

اِس مشورے پر قابیل خود بھی حیران رہ گیا لیکن کچھ اور سوچنے کا وقت نہ تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام ہر شام اپنی اولاد کو ایک جگہ جمع کر کے درس دیتے تھے۔ خدا کی وحدانیت اور اسی کی عبادت کی ہدایت کرتے تھے۔ آج بھی انھوں نے یہی کیا۔ سب بیٹے بیٹیوں نے ہمیشہ کی طرح احترام سے سُنا لیکن آج قابیل کا دل جیسے کسی اور ہی آواز کی طرف متوجہ تھا۔ اُس کے قلب و ذہن پر مُہر لگ چکی تھی۔ اُس نے باپ کی نہیں بلکہ اپنے اُسی ساتھی کی آواز سُنی جو اُسے اپنے ساتھ محسوس ہوتا تھا اور اُس کی آواز اب بھی آ رہی تھی: "قابیل! اگر ناکامی سے بچنا ہے تو ہابیل کو اپنے راستے سے ہٹا دو۔"

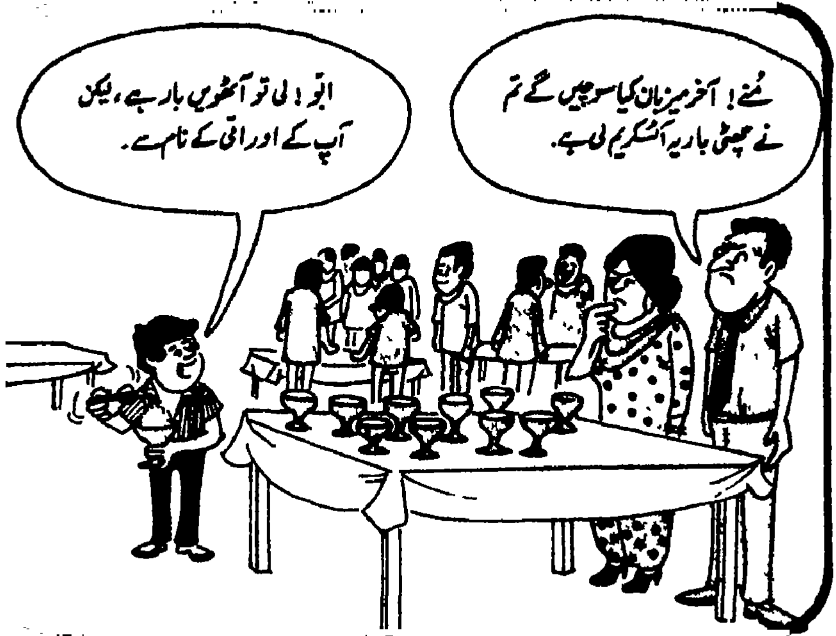
قابیل ناکامی کے شعلے سے دہکتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تقریر ختم ہو گئی۔ انھوں نے دن بھر کا حساب لیا، دوسرے دن کی ہدایت کی اور انھیں رخصت کر دیا۔ اُس وقت قابیل نے ہابیل کو پکڑ لیا اور بولا:

"ہابیل میں تجھے قتل کر دوں گا۔"

"کیوں؟" ہابیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیونکہ تو ہی میری ناکامی کا سبب ہے۔ تیری نذر قبول ہو گئی۔"

(باقی آئندہ)

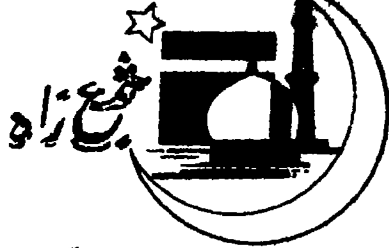

مُنے! آخر میزبان کیا سوچیں گے تم نے چھٹی بار یہ آئسکریم لی ہے۔
ابو! لی تو آٹھویں بار ہے، لیکن آپ کے اور امی کے نام سے۔


ڈاکٹر صاحب! کیا ایسا خطرناک مرض تھا کہ تین دن گزر جاتے تو اپریشن نہیں ہو سکتا تھا۔
یہ بات نہیں ہے۔ تین دن گزر جاتے تو مریض خود بخود صحت یاب ہو جاتا۔

بچوں کے لیے

نئی اور دلچسپ کتابیں

		پہاڑ کی چوٹی پر	۵/۰۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
		رنگوں کی بستی	۳/۵۰	پیارے رسول	۴/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/۰۰	سرخ جوتے	۳/۰۰	چار یار	۴/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۶/۸۰	سلامہ و صمصامہ	۴/۵۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰۰
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰	شرارت	۲/۰۰	ہار کی تلاش	۶/۰۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰	صحت کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰	بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
جنگل کی ایک رات	۴/۰۰	صحت کی الف بے	۳/۰۰	بندر اور نائی	۲/۵۰
سہانے ترانے	۴/۵۰	جدید پہیلیاں	۶/۰۰	بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
ہرن کا دل	۲/۰۰	مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰	تاک دنا دن تا کے سے	۱/۵۰
اچھی کہانیاں	۲/۵۰	ننھا فرشتہ	۴/۵۰	پانچ بونے	۱/۵۰
دریا کی رانی	۲/۰۰	نیلا ہیرا	۴/۵۰	ایک دیس ایک خون	۳/۰۰
گوہر شہزادی	۳/۰۰	ماں کی کھیتی	۲/۵۰	جیت کس کی ؟	۲/۵۰
شریر شیرا	۳/۰۰	ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰	انعامی مقابلہ	۳/۲۵
پری رانی	۳/۰۰	سرکار کا دربار	۴/۵۰	جادو کا گھر	۱/۵۰
خطرناک سفر	۳/۵۰	دنیا کے جانور	۲/۵۰	چیونٹی رانی	۱/۵۰
اندرا گاندھی	۴/۵۰	آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰	روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰	اس نے کیا کر نہ جانا	۱/۲۰	لال مرغی	۱/۵۰
ننھا جبرو	۲/۵۰	خرگوش کی چال	۲/۵۰	لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۰۰	بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰	مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
پلک نہ مارو	۳/۰۰	جوہر قابل	۳/۰۰	ہپو چپو	۵۰/
ایک کھلا راز	۳/۰۰	خرگوش کا سپنا	۵/۰۰	بھیڑیے کے بچے	۵۰/
بابا نامہ	۲/۰۰	موم کا محل	۴/۰۰	شیر خاں	۵۰/
بچوں کے افسر	۵/۰۰	محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰	لومڑی کے بچے	۵۰



یہ اس زمانے کا قصہ ہے، جب دلّی میں سلطان شہاب الدین غوری کی حکومت تھی یعنی تقریباً سات سو سال پہلے کی بات ہے۔ ایک بزرگ اجمیر سے نکلے اور دلّی کی طرف پاپیادہ چل پڑے۔ کئی سو میل کا سفر تھا۔ ظاہر ہے کوئی بہت ہی ضروری کام رہا ہوگا ورنہ معمولی کام کے لیے کون اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔

بزرگ اپنی دھن کے پورے تھے، کبھی ساری رات سفر کرتے اور دن میں کچھ دیر آرام کر لیتے اور کبھی تمام دن چلتے رہتے اور رات کو نیند پوری کر لیتے۔ بالآخر آپ دلّی پہنچ ہی گئے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح دلّی کے بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ بادشاہ ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ایک طرح سے بختیار کاکیؒ ہی دلّی کے حاکم تھے۔ ان کا ہر حکم پورا ہوتا اور شہر میں گویا انھی کا سکہ چلتا تھا۔

حضرت بختیار کاکیؒ کو جب اجمیر سے بزرگ کے آنے کی اطلاع ملی تو بہت خوش ہوئے۔ ان سے مل کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں، پھر پوچھا: "حضور کیسے آنا ہوا؟ اتنے لمبے سفر کی تکلیف کیوں مول لی؟"

انھوں نے جواب دیا: "ایک کسان بڑا ضرورت مند ہے۔ مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ دلّی آیا ہوں کہ بادشاہ سے اس کے معاملے کی سفارش کروں۔"

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ نے یہ سنا تو چونک پڑے، کہا: "اتنا ذرا سا کام تھا۔ مجھے کہلوا دیتے۔ خود چل کر آنے کی تکلیف کیوں کی؟"

آپ نے جواب دیا: "کیا حضور نبی کریمؐ کا یہ قول نہیں سنا کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی مدد کے لیے چالیس قدم چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے چالیس سال کی عبادت کا ثواب دیتا ہے۔ میں بھلا اس ثواب سے محروم کیوں رہتا؟"

تمھیں معلوم ہے اجمیر کے وہ بزرگ کون تھے؟ وہ تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح اور حضرت بختیار کاکیؒ ان کے خلیفہ تھے۔

اس واقعے سے کیا سبق ملتا ہے؟

یہی کہ اگر ہم سچے مسلمان بننا چاہیں تو ہمیں حاجت مندوں کے کام آنا چاہیے۔ اور اللہ کے بندوں کی خدمت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انسانوں کی خدمت ہی اصل عبادت ہے۔



بچوں کی مذہبی کتابیں

حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/-	ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۷/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل)	۴/۰
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/-
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	-/۴۰	ارکان اسلام	۲/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	عقائد اسلام	۳/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	چار یار	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا اوّل	۷/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	خلفائے اربعہ	۹/۵۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	نبیوں کے قصے	۵/
اللہ کے صفی	۲/۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
قاعدہ یسرنا القرآن	۲/۲۵	سرکار دو عالمؐ	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر سیفی پریمی

غالب کا ایک شعر

مشکل ہے مگر آسان بھی ہے

شعر: کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

سمجھیے: شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے گھر کی ابتری سے تنگ آکر بیاباں پہنچا لیکن وہاں بھی چین نہ پایا۔ نہ دل بہلا، نہ ویرانی کا احساس کم ہوا۔ اس لیے کہ میں نے وہاں بھی وُہی ویرانی دیکھی۔ یعنی دشت اور گھر کی ویرانی میں ذرا فرق نہ تھا۔

دھیان دیجیے: دَشت، (فارسی) مذکر (جنگل، صحرا، بیاباں، میدان، ویرانہ) اس سے دوسرے لفظ بنا لیے ہیں۔ مثلاً

(۱) دشت گری، دشت پیمائی، دشت نوردی (۲) دشت گرد، دشت پیما، دشت نَورد

کوئی (کلمۂ تنکیر) ہندی لفظ ہے۔ ردو شاعری اور نثر میں کمال دکھاتا ہے س کا استعمال کئی معنوں میں ہوتا ہے۔ یہاں اشکل اور اندازہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سی (حرفِ تشبیہ) ہندی لفظ ہے۔ مانند، مثل، کثرت۔

سا (حرفِ تشبیہ) فارسی لفظ ہے: مانند، کثرت، گویا۔

ویرانی (فارسی): اجاڑپن، بربادی، تباہی، خرابی، پریشانی، پراگندگی، اُداسی، ابتری۔

یاد آنا: خیال میں آنا، ذہن میں آنا، معلوم ہونا، پتا لگنا۔



● پاگل خانے کا ایک ڈاکٹر ایک مرتبہ معائنہ کرنے گیا اس نے دیکھا کہ ایک پاگل بیٹھا خط لکھ رہا ہے۔ اس نے پاگل سے پوچھا کس کے خط لکھ رہے ہو؟

پاگل نے جواب دیا۔

"اپنے آپ کو۔"

ڈاکٹر نے پوچھا "خط میں کیا لکھا ہے؟"

پاگل نے جواب دیا۔ "یہ تو اس وقت پتا چلے گا جب خط مجھے ملے گا۔"

وسیم احمد

● ایک افیمی اپنے ماتھے پر ٹکٹ لگا کر لیٹر بکس میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتنے میں اوپر سے ڈاکیا آگیا۔ اس نے اس افیمی کی پیٹھ پر لات ماری۔ افیمی بولا۔ یار ٹکٹ کہاں لگا ہے اور مہر کہاں لگا رہے ہو۔

● ایک لڑکا اپنے باپ کا خط پوسٹ کرنے جا رہا تھا۔ جب وہ لیٹر بکس کے قریب پہنچا تو اتفاق سے آندھی آگئی اور خط اڑ گیا۔ وہ لڑکا پہلے دیکھتا رہا۔ پھر بولا کوئی بات نہیں ہوائی ڈاک سے پہنچ جائے گا۔

پرنس ندیم

● دو بچے اپنی ماں کے ساتھ کسی دعوت میں گئے۔ وہاں دونوں جلدی جلدی چیزیں کھانے لگے۔ ماں نے گھورا لیکن وہ نہ مانے۔ گھر آکر ماں نے سمجھایا کہ کہیں جاتے ہیں تو چیزیں آرام سے کھاتے ہیں ایک بچے نے جیب سے بسکٹ نکالے اور کہنے لگا اسی لیے تو میں یہ بسکٹ گھر لے آیا تھا۔ کہ آرام سے کھاؤں گا۔

● استاد:۔ (شاگرد سے) بتاؤ احمد کان لگانا کے کیا معنی ہیں۔

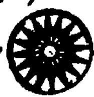
احمد:۔ معلوم نہیں سر ہمارے کان تو لگے لگائے آئے تھے۔

● دو لڑکے اسکول دیر سے پہنچے تو ماسٹر صاحب نے پوچھا موہن تم دیر سے کیوں آئے۔ موہن نے جواب دیا میرے آٹھ آنے گر گئے تھے، میں ڈھونڈ رہا تھا۔

پھر ماسٹر صاحب نے سوہن سے پوچھا تم کیوں دیر سے آئے؟

سوہن نے کہا "میں اس اٹھنی پر پیر رکھ کر کھڑا ہوا تھا۔"

اسرا عزیز۔ حیدر آباد



صغیرہ بانو شیریں

سائنس دانوں نے

کوڑے کرکٹ کو بھی کار آمد بنالیا



دن بھر میں آپ نے بے شمار بے کار چیزیں دیکھی ہوں گی۔ کچھ تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پڑی ہوں گی۔ اور باقی آپ کے گھر میں بازار میں نظر آتی ہوں گی۔ پلاسٹک کے پرانے برتن شیشے کی بوتلیں پرانے بلیڈ ٹوٹی پھوٹی لوہے کی زنگ آلود چیزیں کپڑے کے ٹکڑے ردّی کاغذ تو عام طور پر گھروں میں دکھائی دیتے ہیں سڑک کے کنارے ٹوٹی پھوٹی گاڑی کا ڈھانچہ بھی آپ دیکھتے ہوں گے۔ کبھی آپ نے یہ سوچا ان بے کار چیزوں کا مصرف کیا ہے؟

یہ سارا کاٹھ کباڑ کوڑا کرکٹ ترقی یافتہ ملکوں میں پھینکا نہیں جاتا بلکہ اُن سے پیسہ حاصل کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو کارپوریشن کے ٹرک اور ہاتھ گاڑیاں یہ کوڑا لے جاکر پھینک دیتی ہیں باہر کے ممالک میں ایک خاص کارخانے میں یہ سارا کوڑا کرکٹ لے جاکر اکٹھا کر دیتے ہیں۔ وہاں کئی طرح کی مشین ہوتی ہے پہلے تمام کوڑے کو بڑے بڑے ڈرموں میں ڈال کر انھیں مشین سے ہوا دی جاتی ہے۔ اس طرح مٹی الگ ہو جاتی ہے پھر انھیں ایسی مشین کے نیچے سے گزارتے ہیں جہاں بڑے بڑے برقی مقناطیس ہوتے ہیں یہ مقناطیس لوہے سے بنی ہوئی تمام چیزوں کو علاحدہ کر لیتے ہیں۔

ڈبے، ڈھکنے، کیلیں، بلیڈ، لوہے کے ٹوٹے پھوٹے پیچ کے ٹکڑے مشین کے ذریعہ جمع کر کے ان کو دھات پگھلانے والے کارخانے میں بھیجتے ہیں۔ جہاں دھات کو گرمی سے پگھلا کر دوبارہ قابلِ استعمال بنالیا جاتا ہے۔ اور اس دھات سے نئے ڈبے ڈھکنے وغیرہ بن جاتے ہیں۔ اب کوئی بھی نہیں کہہ سکتا یہ کوڑے میں سے نکلی ہوئی چیزوں سے بنے ہیں انسانی ذہن نے کام لے کر

پرانی چیزوں کو بالکل نیا بنا دیا ہے۔

لوہے کی چیزیں تو کارخانے میں بن جاتی ہیں۔ اب باقی کوڑے کے ڈھیر میں سے مشین کے ذریعہ پلاسٹک کی چیزیں علاحدہ کرتے ہیں۔ بالٹیاں، پلاسٹک کے کھلونے اور بوتلیں جمع کرکے ان کو بھی مشین کے ذریعہ پگھلا کر مائع پلاسٹک بنا لیا جاتا ہے اور ان سے پلاسٹک کے کھلونے، برتن، بوتلیں بن جاتی ہیں۔ اب کوڑے میں سے ردی کاغذ اور کپڑے کی کترنیں علاحدہ کرکے ان سے کاغذ بنا لیتے ہیں۔ آپ نے پھلوں کے چھلکے اور گنے کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں دیکھے ہوں گے۔ یہ بھی بےکار نہیں جاتے ان سے گتا بن جاتا ہے۔ جانوروں کی ہڈیاں کیلے کے چھلکے مچھلی کے کھپرے اکٹھے کرکے کھاد بن جاتی ہے۔ یہ کھاد فصل کے لیے بے انتہا کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ زمین زرخیز ہو جاتی ہے۔ باقی تھوڑا بہت کوڑا بچ جاتا ہے وہ بجلی گھر کی بھٹی میں جلتا ہے اور اس سے بجلی تیار ہوتی ہے۔ اس طرح سارا کوڑا انسان کے کام آجاتا ہے۔ اس کی کوئی چیز بےکار نہیں جاتی۔

بازار میں آپ نے چپ بورڈ کے ٹکڑے دیکھے ہوں گے۔ آج کل چپ بورڈ کی مدد سے الماریاں، شیلف، میزیں وغیرہ بن رہی ہیں۔ لکڑی کے مقابلے میں استعمال کر رہے ہیں لکڑی کے برادے سے چپ بورڈ بنتا ہے لکڑی کا برادہ دیکھنے میں بےکار ہے مگر اس سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح چپ بورڈ گنے کے پھوک سے بھی بن جاتا ہے۔ آپ نے گنے کا رس پیا ضرور ہوگا مگر یہ کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ گنے کا یہ کارپھوک کتنا کارآمد ہے اس سے فرنیچر بھی بن سکتا ہے گنے کا پھوک جمع کرکے ______ مشین کے ذریعہ کیمیکل میں ڈال کر بھاپ گزاری جاتی ہے۔ پھر اسے مشین سے دبا کر چپ بورڈ کی شکل دی جاتی ہے۔

آج کے دور میں انسان نے اپنی ذہانت سے کام لے کر بےکار چیزوں سے بھی کارآمد نئی چیزیں بنا لی ہیں۔ کوئی بھی چیز اب بےکار نہیں جاتی بلکہ اسے نیا روپ دے کر بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کام میں لایا جاتا ہے موٹروں کے بےکار ڈھانچے بھی مشین کے ذریعہ ہموار کر دیئے جاتے ہیں۔ جن ملکوں میں گاڑیاں تیار ہوتی ہیں وہاں جہاز کے ذریعہ یہ ڈھانچے بھیج دیئے جاتے ہیں جہاں ان سے گاڑیاں اور دوسری چیزیں تیار ہوتی ہیں بچو! آپ کسی بھی چیز کو حقیر نہ سمجھیے یہ ساری بےکار چیزیں کام میں آسکتی ہیں اور آپ کو فائدہ دے سکتی ہیں۔

دلچسپ اور عجیب

دنیا کا سب سے بڑا پھول انڈونیشیا میں کھلتا ہے جس کا وزن ساڑھے آٹھ سیر ہوتا ہے۔

دنیا میں سب سے چھوٹا پھول برازیل میں پایا جاتا ہے۔ یہ پھول آلپن کے سرے کے برابر ہوتا ہے۔

دنیا کا سب سے پہلا اخبار "پیکنگ گزٹ" جاری ہوا تھا۔

پہلا کرنسی نوٹ ہلاکو خاں کے پوتے اباقا خاں نے جاری کیا۔

بندر پانی میں نہیں تیر سکتا۔

برطانیہ کے ایک جزیرے میں بغیر دم کی بلیاں پائی جاتی ہیں۔

ایک تولہ سیکرین کی مٹھاس ۵۵۰ تولے کھانڈ کی مٹھاس کے برابر ہے۔

برطانیہ کے ایک جزیرے میں ایسی بلیاں پائی جاتی ہیں جن کی دم نہیں ہوتی اس لیے ان کو دم کی بلیاں کہا جاتا ہے۔

ہنری ششم انگلستان کا وہ واحد بادشاہ گزرا ہے جو صرف نو ماہ کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

۱۹۵۸ء میں لندن کی ایک آرٹ گیلری میں ۳ تصویریں رکھی گئی تھیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان تصویروں کے مصور صرف دو بندر تھے اور یہ تصویریں ایک لاکھ پونڈ میں فروخت ہوئی تھیں۔

● امریکہ میں ایسے بندر بھی پائے جاتے ہیں جن کے دو دماغ ہوتے ہیں۔ ایک دماغ جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور دوسرا بندر کی دم کو۔

● مشہور مسلمان حکیم عالم و موسیقار ابونصر الفارابی (۸۷۰ء۔۹۵۰ء) دنیا کی ۷۰ زبانیں جانتے تھے۔

● سب سے پہلی کشتی حضرت نوحؑ نے بنائی تھی۔

● دیوارِ چین شی ہوانگ لی نے تعمیر کی تھی۔

● نمک چینیوں کی دریافت ہے۔

● دنیا کی سب سے بڑی عبادت گاہ خانہ کعبہ ہے۔

پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں

۱۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور قتل کرنا کفر ہے

۲۔ ہمیشہ حق بات کہو اگرچہ لوگوں کو تلخ معلوم ہو۔

۳۔ ہر حالت میں بلا اور مصیبت پر صبر کرنا چاہیے۔

۴۔ میری امت میں جو چیز فتنہ بنے وہ مال ہے۔

۵۔ دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

۶۔ اپنے آپ کو مظلوم کی بد دعا سے بچاؤ۔

۷۔ اپنے کاموں کی تکمیل میں رازداری سے کام لو۔

۸۔ صرف نیک ہی نہ بنو کسی کے ساتھ نیکی بھی کرو۔



عبد السلام شیخ

پھل ہمیں کیا دیتے ہیں

پھل قدرت کا بہترین عطیہ ہیں پھلوں میں مختلف اقسام کے وٹامن پائے جاتے ہیں یہ ہمارے جسم کے نشوونما کے لیے بہت ضروری ہیں پھل نہ تو زیادہ کچے استعمال کرنے چاہئیں اور نہ ہی بہت زیادہ پکے ہوئے ذیل میں چند پھلوں کے خواص درج کیے جاتے ہیں امید ہے پیارے بہن بھائی پھلوں کی افادیت سے واقف ہو کر ان کا بہتر استعمال کر کے اپنی صحت کو اور توانا بنائیں گے۔

سیب دل و دماغ کو طاقت دیتا ہے خون پیدا کرتا ہے اس میں فولاد بھی پایا جاتا ہے بھوک بڑھاتا ہے ترش سیب جگر اور معدے کے لیے مفید ہے کھانے کے بعد سیب کا استعمال دانتوں وغیرہ کو صاف کر دیتا ہے سیب میں فاسفورس تمام پھلوں سے زیادہ پایا جاتا ہے یہ گردوں کو صاف کرتا ہے ترشی کے سبب پیاس اور قے کو دور کرتا ہے کیلا سرد تر ہوتا ہے بلغم پیدا کرتا ہے طاقت بخشتا ہے گردہ جگر کو طاقت دیتا ہے خون پیدا کرتا ہے صرف تپ دق کے مریضوں کو خوب پکے ہوئے یعنی جن کیلوں کے چھلکے سیاہ پڑ چکے ہوں کھانا چاہیے دبلے پتلے آدمی اگر تین چار کیلے روزانہ کھائیں تو کچھ عرصہ میں اپنے وزن میں کافی فرق محسوس کریں گے موٹے آدمیوں کو کیلا کم استعمال کرنا چاہیے یہ دیر بعد ہضم ہوتا ہے۔

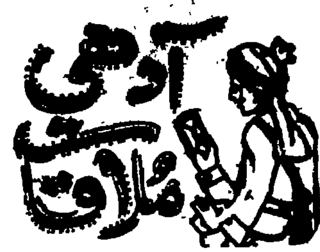
انگور گرم تر ہوتا ہے طاقت پیدا کرتا ہے بلغم نکالتا ہے خون بڑھاتا ہے اور گندے خون کو صاف کرتا ہے پھیپھڑوں کو قوت دیتا ہے دمہ میں بہت فائدہ مند ہے قبض دور کرتا ہے پیٹ کی جلن بدہضمی اور دل کی بے چینی دور کرنے کے لیے بہت فائدہ دیتا ہے جلد ہضم ہو جاتا ہے بدن کو موٹا اور دل کو طاقت بخشتا ہے۔

انار بھی فالسے کی طرح کسی حد تک قبض کرتا ہے خون زیادہ پیدا کرتا ہے اور خون کو صاف بھی کرتا ہے۔ سرد تر پھل ہے جگر کی خرابی میں فائدہ پہنچاتا ہے پیاس کی شدت کو کم کرتا ہے معدے کی خرابیوں کو دور کرتا ہے ہچکیوں اور ابکائی وغیرہ کو کم کرتا ہے دل کو تقویت دیتا ہے میٹھا انار حلق سینہ اور کھانسی کے لیے فائدہ مند ہے دست ڈیچس میں فائدہ دیتا ہے۔

خربوزہ ..... خربوزہ گرم اور مفرح ہوتا ہے پیشاب اور پسینے وغیرہ کی روکاوٹ میں مفید ہے دبلے پتلے آدمیوں کو موٹا کرتا ہے یرقان وپلیا میں اس کا استعمال مفید ہے۔

کھجوریں کافی غذائیت ہوتی ہے گردہ اور پتھری کے لیے فائدہ مند ہے قبض دور کرتی ہے خون پیدا کرتی ہے بدن کو موٹا کرتی ہے سینہ کے امراض میں بہت فائدہ مند ہے۔

ٹماٹر ..... ٹماٹر کا شمار عام طور سے پھلوں میں ہوتا ہے لیکن اسے بطور سبزی استعمال کیا جاتا ہے یہ خون بڑھاتا ہے اس میں وٹامن "ج" پایا جاتا ہے خون کو صاف کرتا ہے ہاضمے میں مدد دیتا ہے معدہ اور جگر کو طاقت دیتا ہے تلی کے امراض میں فائدہ مند ہے۔ سنگترہ ..... یہ دل ودماغ کو فرحت بخشتا ہے جلن اور پیاس مٹاتا ہے خون پیدا کرتا ہے اگر چند سنگترے یا مالٹے کھا کر آدھ ابلا انڈا کھا لیا جائے تو خون جلدی بنتا ہے بخار میں بہت فائدہ دیتا ہے کھانسی میں بھی فائدہ مند ہے یہ خیال غلط ہے کہ سنگترہ ترش کھانسی میں نقصان دہ ہے ہاضمے میں مدد دیتا ہے معدہ اور جگر کو طاقت بخشتا ہے سرد تر ہوتا ہے مسوڑھوں کے لیے بہت فائدہ مند ہے کیونکہ اس میں وٹامن "سی" کافی پایا جاتا ہے بڑوں کے علاوہ بچوں کے لیے بھی سنگترے کا رس بہت مفید ثابت ہوتا ہے آم قوت بخش پھل ہے اسے پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے گرم اور قبض کشا ہوتا ہے اعضائے رئیسہ کو طاقت بخشتا ہے جلد ہضم ہو جاتا ہے پیٹ کی جلن بدہضمی اور دل کی بے چینی دور کرنے کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔



محترم جناب اڈیٹر صاحب

آداب و خلوص

● خدا کی ذات سے امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گے۔ میں ماہنامہ "پیام تعلیم" کو کافی عرصے سے دیکھتا اور پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کو پڑھنے سے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس رسالہ کی ترقی اور بہبودی۔ ترتیب و تزئین اور معیار کو نکھارنے اور سنوارنے میں آپ لوگوں نے کافی دلچسپی دکھائی ہے۔

جمیل الدین

۱۷۴۲ پنجار گھاٹ روڈ (ناسک)

● جون ۸۸ء کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ سرورق کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ میں خوشی خوشی صفحات دیکھنے لگا آج مجھے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ ابھی پہلا صفحہ ہی کھولا تھا کہ ساری خوشی غم میں تبدیل ہو گئی۔ اپنے پیارے مدیر کی انتقال کی خبر پڑھ کر۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موصوف کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے (آمین)

ایم شعیب،

۱۴۷ بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱

● "پیام تعلیم" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ پڑھ کر دل کو خوشی ہوئی۔ اردو ادب کا بہترین پرچہ ہے۔ اردو میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ سارے مضامین دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ اس خوبصورت اور دلکش رسالے کے تمام مضامین پڑھ کر جو ایمانی روشنی ملی ہے اس سے ابھی تک دل و دماغ متاثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس علمی شمع کو ہمیشہ ہمیشہ روشن رکھے (آمین)۔

محمد صدیق اے۔ ایم۔ یو۔ جمالپور۔ علی گڑھ۔

● طویل انتظار کے بعد ہمیں "پیام تعلیم" سترہ تاریخ کو موصول ہوا۔ پرچہ کے کھولتے ہی ولی شاہجہاں پوری کی انتقال کی خبر ملی۔ پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس نصیب کرے (آمین)

ساتھ ہی ساتھ عید الفطر کی فضیلت کے ساتھ ہمارا نام چھپا دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی جو ہماری دیرینہ آرزو تھی۔ عنایت کا از حد شکریہ۔ سچ پوچھیے تو "پیام تعلیم" جیسا رسالہ ہمیں کہیں بھی نہ مل سکے گا۔ رسالہ شروع سے آخر تک بے حد دلچسپ ہے۔ تمام قلم کاروں کو دلی مبارکباد پہنچا دیجیے۔

خدا سے دعا ہے کہ "پیام تعلیم" دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے (آمین)

شگوفہ شفاعت، نیلوفر تحسین

۱۰۱۱ اے۔ کے اسٹریٹ۔ (آمبور)

بچّوں کی کوشش



کتاب بہترین ساتھی ہے

کتاب کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ کتاب تنہائی کا بہترین رفیق ہے۔

کتاب کی قدر و منزلت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ انسانی دوست کا ساتھ کبھی کبھار بور کر دینے کا باعث ہوتا ہے پر کتاب کی شکل میں ہماری یہ ساتھی نہ صرف ہمارا ساتھ دیتی ہے بلکہ ہم جب تک چاہیں اس کے قرب سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

کتاب کے بہترین ساتھی ہونے کے لیے اتنا ثبوت کافی ہے کہ ریلوے اسٹیشنوں پر آپ کو بک اسٹال ضرور نظر آئے گا۔ دوران سفر مسافروں کے ہمراہ کتاب، رسالے وغیرہ کی صورت میں ضرور مسافر کی رفیق کے روپ میں موجود نظر آئے گی۔

دنیا کی عظیم کتابوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جیل کی چہار دیواری میں وجود میں آئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبار خاطر" اور پنڈت جواہر لال نہرو کے باپ کے خط بیٹی کے نام احمد نگر کی جیل کی کوٹھری میں وجود میں آئیں اور آج کا بہترین سرمایہ ہیں۔

بلاشبہ کتاب بہترین ساتھی ہے جس کی محبت قاری کو علم و ادب سے مالا مال کرتی ہے۔ کتاب بہ حیثیت رفیق ان ساری خصوصیت کی حامل ہے جو ایک اچھے دوست کی محبت سے حاصل ہوتی ہے۔ وقت گزاری کے لیے نوجوان، خصوصاً دوستوں، فلموں اور گپ شپ کے محتاج ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان فضولیات سے انھیں سوائے نقصان کے فائدے کی رتی بھر امید نہیں ہوتی۔ اور پھر دوستوں کی محبت یا ان کے مشاغل سے وہ قرار بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر کتاب بطور ساتھی عمدہ مصاحب کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتا ہے۔ دوستوں تک پہنچنے کے لیے سفر کرنا پڑتا ہے۔ پھر ان کے ناز و نخرے بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ بسا اوقات ان کی دوستی نبھانے کے لیے ان کی جائز اور ناجائز خوشی اور شوق میں حصّہ لینے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے جبکہ کتاب کی محبت کے لیے ہمیں ان باتوں کے لیے مجبور

نہیں ہونا پڑتا۔ ہم جب تک چاہیں اس سے ملتے رہ سکتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق اپنی ملاقات کو ملتوی یا مختصر بھی کر سکتے ہیں نہ اس رفیق کے روٹھ جانے کا ڈر ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی ناز برداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ سہیل احمد نذیر احمد انصاری

محمد حاجی صابو صدیق پالی ٹیکنیک ۸۔ شیفر ڈ روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

معلوماتی دنیا

دنیا میں سب سے پہلے ریلوے انجن کی دریافت جارج اسٹیفنسن نے کی۔

سب سے لمبا دریا : برہم پتر

سب سے لمبا ریلوے پلیٹ فارم : سون پور

سب سے لمبی ریلوے لائن : کلکتہ سے ٹونڈلہ

سب سے لمبی سرنگ : جواہر سرنگ۔ (کشمیر)

سب سے اونچا پل : چمبل کا پل

سب سے اونچا دروازہ : بلند دروازہ فتح پور سیکری

سب سے اونچا مینار : قطب مینار۔ دہلی

سب سے اونچا پہاڑ : ہمالیہ

اشتیاق احمد

کیشب چندر اسین اسٹریٹ۔ کلکتہ ۹

دین کی عظمت

۱۔ دین : نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے (حضرت محمدؐ)

۲۔ دین : کی خوبی اخلاق کی خوبی ہے (حضرت محمدؐ)

۳۔ دین : خزانہ ہے اور علم اس کا راستہ (حضرت علیؓ)

۴۔ دین : کی دوستی دنیا کے نقصان کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ (حضرت علیؓ)

افتخار احمد

محلہ سکھٹاں پوسٹ ٹانڈہ۔ فیض آباد

میرا پسندیدہ شعر

کچھ اور اپنے روپ میں نکھر گئی ہے زندگی
کسی بھی امتحاں سے جب گزر گئی ہے زندگی

سیدہ نکہت پروین

نیا محلہ ساؤتھ بازار۔ انڈول



زندگی

جان جسم میں بہت قیمتی شے سمجھی جاتی ہے حالانکہ جان انسان کے وجود میں سب سے کم قیمت چیز ہے اور یہ جان اپنے خالق

ں اپنے بس کی بھی نہیں ہے۔ جو چیز اپنی
نہ ہو اور اپنے بس میں بھی نہ ہو تو اس
کی بھلا قیمت ہی کیا لیکن دنیا ہے کہ اس
جان کو اپنی جان سمجھ رہی ہے جب کہ یہ
خبر بھی نہیں کہ جان ہے کیا، کہاں ہے اور
کہاں سے آئی ہے اور جب جان جانے
لگتی ہے تو یہ جان آپ کے پاس ایک لمحے
کے لیے بھی نہیں رکتی آپ جان کو جانے
سے کبھی نہیں روک سکتے۔ حالانکہ یہ جان
آپ کی اپنی جان ہے۔

سجاد حسین۔ شو پا بھٹکل

میرا پسندیدہ شعر

آندھیاں زور دکھائیں بھی تو کیا ہوتا ہے
گل کھلانے کا ہنر باد صبا جانتی ہے

(نامعلوم)
ایم شاہنواز شمسی
دریبہ پان۔ رام پور (یوپی)

کیا آپ جانتے ہیں

۱۔ ہوا کی رفتار ناپنے والے آلہ کو
اینی مومیٹر کہتے ہیں۔
۲۔ دنیا کے سب سے بڑے بحر اعظم کا
نام بحرالکاہل ہے۔
۳۔ دنیا کی سب سے بڑی اور نمکین
(کھارا) پانی کی جھیل بحر کیسپین ہے۔
۴۔ دنیا کی سب سے بڑی میٹھے پانی
والی جھیل سوپیریر جھیل ہے۔
۵۔ ایشیا کا سب سے بڑا کیمیائی کھاد
کارخانہ سندری (بہار) میں ہے۔
۶۔ دنیا کے سرد ترین مقام کا نام
ورکھیانکس (سائبیریا۔ ایشیا) ہے۔
۷۔ دنیا کے گرم ترین مقام کا نام جیکب آباد
(پاکستان میں) ہے۔
۸۔ ہندستان کے سب سے بڑے دریائی
بندرگاہ کا نام کلکتہ بندرگاہ ہے۔
۹۔ ہندستان کے کوچین بندرگاہ کو بحیرہ
عرب کی ملکہ کہتے ہیں۔
۱۰۔ ہندستان کا سب سے بڑا شہر "کلکتہ
شہر" کو کہا جاتا ہے۔
۱۱۔ ہندستان میں کاغذ کی صنعت کا سب
سے بڑا کارخانہ ٹیٹا گڑھ (مغربی بنگال) میں
ہے۔

توحید دلکش
۵ سید صالح لین کلکتہ ۷۳

ماں

تجھ میں ممتا کا ایک سمندر ہے
گود تیری گلوں کا بستر ہے

کوئی تیرا بدل نہیں جگ میں
ماں تو دنیا میں سب سے بڑھ کر ہے

شبنم اوگانوی
عالم منزل، اوگانواں (نالندہ)

اقوال زریں



جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

جو علم حاصل کرنے سے بھاگتا ہے، وہ دنیا میں در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

انسان کی زندگی اذان اور نماز کے بیچ میں ہے۔

والدین کی خدمت کرنا جہاد کے برابر ہے۔

اگر کامیابی مقصود ہو تو ناکامی سے سبق حاصل کیجیے۔

شبیر احمد حبیب اللہ انصاری
حکیم سیٹھ کا کارخانہ نمبر ۳۹۳ انصاری روڈ
بھیونڈی ضلع تھانہ

اتنی ہی دولت کافی ہے

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک لڑکی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا تو اس کے خاندان والوں نے جواب میں لکھا کہ "ہماری لڑکی کے پاس پانچ جاگیریں ہیں، دس مکان ہے، بیس ہزار دینار ہیں اور اس کے علاوہ ڈھیر سا سونا چاندی بھی ہے۔ تمھارے پاس کیا ہے؟" اس آدمی نے جواب دیا "اگر تمھارا بیان درست ہے تو میری جائیداد کی تفصیل کی فکر نہ کرو، کیونکہ جب تک ہم دونوں زندہ رہیں گے اتنی ہی دولت کافی ہے۔"

شیخ رحیمہ بانو
مانڈا، ٹٹوالا۔ ضلع تھانہ

کشمیر کی سیر

سیر کا کشمیر کی کیا ہو بیاں
ساری دنیا اس جگہ کی میہماں
ٹولیاں ہیں ہر طرف میدان میں
زندگی ہی زندگی انسان میں
چل رہی ہے ہر طرف ٹھنڈی ہوا
باغ میں چڑیوں کے گیتوں کی فضا
یہ نظارہ اور یہ دلکش بہار
مست ہرنوں کی کلیلیں اور جنگل پر نکھار
باغ شالیمار میں حسن تمام
سچ ہے اس ٹکڑے کا ہی جنت ہے نام

جھیل ڈل میں وہ شکاروں کا سماں
اور بلندی سے کہیں چشمے رواں
ہر طرف وادی میں مخمل سی بچھی
اور کہساروں پہ چادر برف کی

نزاکت حسین شاد
علامہ اقبال اکیڈمی ریکیباں. ضلع راجوری جموں کشمیر

عید الفطر

ہلال عید جو نکلا تو عید آ پہنچی
قبول ہو گئے روزے، رسید آ پہنچی

آج انتیسواں روزہ ہے۔ افطار کا وقت ہے۔ چھتوں، چوراہوں اور میدانوں میں لوگوں کا ہجوم ہے۔ سب کو ہلال عید کا انتظار ہے۔ لطف یہ ہے کہ روزہ داروں سے زیادہ بے روزہ دار بے قرار ہیں۔ کبھی کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ آج چاند نظر نہیں آئے گا۔ اور اسی اثنا میں موذن کی آواز سنائی دیتی ہے لوگ افطار کرنے کو چل دیے۔

یہ منظر دیکھیے۔ ابر آلود مطلع سے چاند نمودار ہوا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ "عید مبارک" کی آواز گونجنے لگی۔ اِدھر مفتی صاحب نے عید کا اعلان کیا۔ اور تمام لوگ عید کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ ننھے منے بچوں کے کپڑے گھر میں جگمگانے لگے۔ رات پل بھر میں بیت گئی۔

صبح ہوتے ہی سویاں، شیر خرما اور دوسری چیزیں تیار۔ بچے اور مرد عیدگاہ پہنچ گئے۔ نماز کے بعد بچوں کو عیدی دی گئی۔ اس خوشی میں ہمیں یتیم، بیوہ اور مسکین افراد پر توجہ کرنی چاہیے۔ ان کی ضرورت کو پورا کیا جائے اور حسن سلوک سے انھیں مساوات انسانی کا نمونہ پیش کرنا چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ عید کے دن خیرات، زکات، عبادت اور عمل خیر میں زیادہ کوشش کیا کرو۔ کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ بخشتا ہے۔ دعائیں قبول فرماتا ہے۔ اور تم پر رحمت کی نظر رکھتا ہے۔

عظمیٰ عارف
کدورہ۔ جالون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

لوگ تم سے چاند کی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں

پیام تعلیم قمری کیلنڈر ۱۴۰۸ھ

عبدالمجید، آنیکل، بنگلور					محرم / جمادی الثانی	صفر / ذی قعدہ	ربیع الاول / شعبان	ربیع الثانی	جمادی الاول / شوال	رمضان	رجب / ذی الحجہ
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	جمعرات	جمعہ	اتوار	پیر	بدھ	منگل	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	جمعہ	ہفتہ	پیر	منگل	جمعرات	بدھ	اتوار
	۲۴	۱۷	۱۰	۳	ہفتہ	اتوار	منگل	بدھ	جمعہ	جمعرات	پیر
	۲۵	۱۸	۱۱	۴	اتوار	پیر	بدھ	جمعرات	ہفتہ	جمعہ	منگل
	۲۶	۱۹	۱۲	۵	پیر	منگل	جمعرات	جمعہ	اتوار	ہفتہ	بدھ
	۲۷	۲۰	۱۳	۶	منگل	بدھ	جمعہ	ہفتہ	پیر	اتوار	جمعرات
	۲۸	۲۱	۱۴	۷	بدھ	جمعرات	ہفتہ	اتوار	منگل	پیر	جمعہ

دلّی کے شہریوں سے

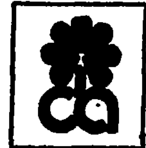
مختار نامے کے ذریعہ لین دین

دلّی میٹرو پولیٹن کونسل نے ۲۲ جولائی ۱۹۸۷ء کو ایک اہم تجویز پاس کی ہے جس کے نتیجے میں مختار نامے (پاور آف اٹارنی) کے ذریعہ کی گئی خرید و فروخت یا زمین یا جائداد میں مفادات کی منتقلی کے دیگر معاملوں کو باضابطہ بنانے میں مدد ملے گی۔

تجویز میں کہا گیا ہے کہ اس تجویز کے پاس کرنے سے پہلے جو سودے کیے گئے ہیں انھیں قانونی درجہ دیا جائے۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے اس تجویز کے بارے میں پوری تفصیل جاننے کی استدعا کی ہے۔ تجویز یہ ہے۔

یہ ہاؤس تجویز کرتا ہے کہ زمین یا جائداد کی خرید و فروخت اور زمین یا جائداد میں دیگر مفادات کی منتقلی کے معاملے جو اس تجویز کے پاس ہونے سے پہلے جنرل پاور آف اٹارنی کے ذریعہ کیے گئے ہیں انھیں مقاصد کی عمل برآری کے لیے قانونی طور پر جائز تسلیم کیا جائے۔ اس تجویز کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے قانون میں مناسب ترمیم کی جائے۔

اگر اس ضمن میں آپ کوئی تجویز دینا چاہتے ہیں تو براہ کرم ارسال فرمائیں۔



جگ پرویش چندر
چیف ایگزیکیٹو کونسلر دلّی
۱ اولڈ سیکریٹریٹ دلّی ۱۱۰۰۵۴

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلّی انتظامیہ دلّی

آزاد بھارت کے چالیس سال

آزاد [illegible] نے گذشتہ چار دہائیوں میں تمام شعبوں میں اہم پیش رفت کی ہے ہم سب متحد ہو کر ایک ہی نصب العین کے حصول کے لئے کام کرتے رہے ہیں اور وہ ہے بھارت کو ترقی کی چوٹی پر پہنچانا۔

ہماری کامیابیاں ایک نظر میں

- ہم اپنی غلّہ کی ضروریات میں خود کفیل ہو گئے ہیں اور پیداوار تین گنی ہو گئی ہے
- ستر فیصد گاؤں میں بجلی لگائی جا چکی ہے۔
- آبپاشی کی سہولیات میں شاندار اضافہ ہوا ہے
- کمزور طبقات، بالخصوص درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی حالت سدھارنے کے لئے خصوصی پروگرام زیرِ عمل لائے گئے ہیں
- صرف گذشتہ چند برسوں میں ہی لگ بھگ دس کروڑ افراد کو خط غریبی سے اوپر اٹھایا جا چکا ہے
- چیچک اور طاعون کی بیخ کنی کی جا چکی ہے صحت کی سہولیات میں وسیع پیمانے پر اضافہ ہوا ہے
- پیدائش پر متوقع اوسط عمر ۳۲ سال سے بڑھ کر ۵۵ سال ہو گئی ہے
- خواندگی کی شرح دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اور اسکولوں اور داخلوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے

- ٹرانسپورٹ اور مواصلات کی سہولیات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے
- فولاد کی پیداوار میں نو گنا سے زائد اضافہ ہوا ہے اور المونیم کی پیداوار تقریباً ستر گنی ہو گئی ہے
- خام تیل کی پیداوار ۱۲۰ گنی ہو گئی ہے
- کوئلے کی پیداوار میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے
- بھارت واحد ترقی پذیر ملک ہے جو اُن سات یا آٹھ ملکوں میں شامل ہے جنھیں نیوکلیائی ایندھن کی مکمل ٹکنالوجی میں مہارت حاصل ہے
- بھارت دنیا کا ساتواں ملک ہے جس نے اپنا مصنوعی سیارہ خود اپنے راکٹ سے چھوڑا ہے۔
- آج بھارت کا شمار دنیا کے چوٹی کے دس صنعتی ملکوں میں ہوتا ہے۔

ہم نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا ہے لیکن ابھی ہمیں مہاتما گاندھی کا خواب پورا کرنا ہے۔ ہر انسان کی آنکھ سے آنسو پونچھنا ہے درحقیقت ابھی ہمیں بہت مسافت طے کرنی ہے پھر بھی اس وقت تک ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں

ترقی جو ہمارے لئے قابلِ فخر ہے

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اکتوبر ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۱۰

قیمت فی پرچہ : 3/50 سالانہ =/30
غیر ممالک سے : نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز : بارہ ڈالر
فی پرچہ : ایک ڈالر

ایڈیٹر : شاہد علی خاں

صدر دفتر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
شاخیں : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

بچوں سے باتیں

ستمبر میں مکتبہ جامعہ کا مالی سال ختم ہوتا ہے اس لیے یہ شمارہ قدرے تاخیر سے پوسٹ ہو رہا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ آپ کو انتظار کی جو زحمت ہوئی وہ رسالہ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد دور ہو جائے گی اس لیے کہ زیرِ نظر شمارے میں آپ کی دلچسپی اور معلومات کا کافی سامان موجود ہے۔

اکتوبر کا مہینہ ہمارے لیے خوشی کا بھی ہے اور غم کا بھی۔ خوشی کا اس لیے کہ اس مہینے میں گاندھی جینتی بھی ہے اور دسہرہ بھی، دیوالی بھی ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یوم تاسیس بھی۔ غم کا اس لیے کہ تین سال قبل ۳۱ اکتوبر کو ہمارے ملک کی محبوب وزیر اعظم اندرا گاندھی کو شہید کر دیا گیا تھا۔

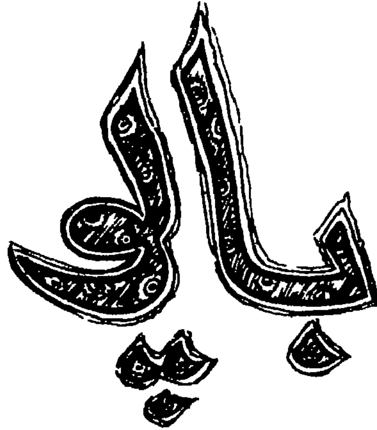
اکتوبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں ہم نے اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار فکر تونسوی کی تصویر شائع کی تھی خیال تھا کہ کسی موقع پر ان کے دلچسپ مضامین بھی آپ کو پڑھوائیں گے لیکن افسوس کہ ۱۲ ستمبر ۸۷ء کو دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال کر گئے ــــ رہے نام اللہ کا

پیامی بچوں کے بے حد اصرار پر ہم نے پیامی ادبی معمّا پھر سے شروع کر دیا ہے لیکن معمولی سی تبدیلی کے ساتھ یعنی آٹھ سوالوں میں سے چھ کے جوابات تو آپ کو کتابوں میں ہی ملیں گے باقی صرف دو کے لیے آپ کو خود غور کرنا ہوگا اس طرح آپ کو مطالعے کی عادت بھی ہوگی اور غور و فکر کی بھی۔

پرنٹر، پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا



کیف احمد صدیقی



ہندوالوں کی آن تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

مفلس و تنگ دست لوگوں پر
دیش کے غمزدہ اچھوتوں پر
کس قدر مہربان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

رات دن جور و ظلم سہتے تھے
بات جنتا کے دل کی کہتے تھے
قوم کے ترجمان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

حق و انصاف و آدمیت کے
ملک کی باہمی محبت کے
کس قدر قدر دان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

سب کے مذہب کی قدر کرتے تھے
حسنِ انسانیت پہ مرتے تھے
آدمیت کی جان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے با

ہم سبھی کو دلا کے آزادی
جان دے دی برائے یکجہتی
ایکتا کے نشان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے با

جو اہنسا پہ زور دیتے تھے
اور ہر دل کو جیت لیتے تھے
کیف کتنے مہان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے با
ہندوالوں کی آن تھے!

کلثوم بانو

شہزادہ فیروز



صدیوں پہلے کی بات ہے ایک گڈریا اپنی بیوی کے ساتھ سمندر کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہا کرتا تھا دونوں میاں بیوی آرام اور سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کی شادی کو کئی سال بیت گئے تھے لیکن ابھی تک اُن کے یہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا ایک دن گڈریے کی بیوی سمندر کے کنارے بیٹھی سمندر کا نظارہ کر رہی تھی کہ اچانک ایک پری کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اس نے گڈریے کی بیوی کو دیکھا تو نیچے اُتر آئی اور گڈریے کی بیوی سے مل کر بہت خوش ہوئی اور اس نے اُسے اپنی سہیلی بنا لیا۔ باتوں باتوں میں اُسے اس بات کا پتا چلا کہ گڈریے کی بیوی کے یہاں ابھی تک کوئی بچہ نہیں ہوا اس نے گڈریے کی بیوی سے کہا۔

"بہن یہاں سے بہت دور ایک پہاڑ پر ایک بزرگ رہتے ہیں اگر تم ان کے پاس جاؤ اور اُن سے دعا کے لیے کہو تو ہو سکتا ہے خدا سُن لے" گڈریے کی بیوی نے کہا "لیکن اتنی دور میں کیسے جا سکتی ہوں؟"

"تمھیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے خاوند سے اجازت لے لو کل اسی وقت میں اِدھر آؤں گی۔ تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ یہ کہہ کر پری وہاں سے چلی گئی۔ گڈریے کی بیوی نے اس واقعہ کا ذکر اپنے خاوند سے کیا۔ پہلے تو اس بات کا اسے یقین نہیں آیا۔ لیکن

ایڈیٹر۔ بچوں کا باغ۔ دھود

پھر بھی اس نے اسے اجازت دے دی۔ دوسرے دن گڈریے کی بیوی اس جگہ پہنچی تو پری اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ اڑنے والا قالین لائی تھی۔ پری نے قالین زمین پر بچھا دیا اور گڈریے کی بیوی اس پر سوار ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ اُس پہاڑ پر جا پہنچے۔ پری گڈریے کی بیوی کو لے کر بزرگ بابا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور دونوں نے بڑے ادب سے انھیں سلام کیا۔ بزرگ بابا نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے انھوں نے بڑی شفقت سے ان لوگوں کو سلام کا جواب دیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ گڈریے کی بیوی تو شرم سے کچھ کہہ نہ سکی لیکن پری نے آنے کی وجہ بتا دی۔ بزرگ بابا نے ہاتھ اٹھا کر گڈریے کی بیوی کے حق میں دعا کی اب دونوں بزرگ بابا کا شکریہ ادا کر کے واپس لوٹ آئیں۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ خدا نے گڈریے کے گھر ایک چاند سا بیٹا دیا جسے پا کر دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے اسی دن پری بھی ان لوگوں کو مبارک باد دینے کے لیے آئی۔ وہ اپنے ساتھ بچّے کے لیے بڑے قیمتی تحفے بھی لائی۔ مثلاً ایک جوڑا کپڑوں کا جو کہ شاید کسی شہزادے کو بھی نصیب نہ ہوا ہو خوبصورت تاج اور ایک ننھی سی تلوار۔ ان تینوں چیزوں میں یہ خاصیت تھی کہ یہ چیزیں نہ تو کبھی خراب ہو سکتی تھیں اور عمر کے ساتھ ساتھ بڑی بھی ہوتی جاتیں۔ پری نے اس بچّے کا نام بھی شہزادہ فیروز رکھا۔ پری کے جانے کے بعد گڈریے کی بیوی نے وہ کپڑے اپنے بیٹے کو پہنائے۔ واقعی ننھا مُنا بچّہ بالکل شہزادہ ہی نظر آنے لگا۔ دن گزرتے گئے۔ جس وقت فیروز کی عمر چودہ برس کی ہوئی اچانک ایک دن سمندر میں ایک زبردست طوفان آیا۔ گڈریا، اس کی بیوی اور فیروز کو بہالے گیا۔ دراصل بات یہ ہوئی کہ ایک دن سمندر کا راجا سیر کرنے کے لیے ساحل پر آیا تو اس کی نظر فیروز پر پڑ گئی وہ اسے شہزادہ سمجھا کیونکہ فیروز پری کا دیا ہوا لباس پہنے ہوئے تھا۔ راجا سمجھا گڈریے نے کسی ملک کے شہزادے کو اغوا کر کے اپنی جھونپڑی میں رکھے ہوئے ہے۔ واپس آکر اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ گڈریے کو اور اس کی بیوی کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیں اور شہزادے کو بڑی عزّت کے ساتھ ہمارے محل میں پہنچا دیا جائے۔ حکم پاتے ہی راجا کے سپاہی طوفان کی طرح وہاں سے چلے۔ سمندر میں کہرام سا بپا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے موجوں نے گڈریے کے جھونپڑے کو گھیرے میں لے لیا۔ سپاہیوں نے گڈریے اور اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا فیروز یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ سپاہیوں نے اسے بڑی عزّت کے ساتھ اپنے ہمراہ لیا اور راجا کے

دربار میں پیش کر دیا۔ راجا نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے محل میں رکھا۔ دراصل راجا کی ایک بیٹی تھی۔ راجا چاہتا تھا فیروز کے ساتھ اس کی شادی کر دے۔ فیروز کو کھانے کے لیے بڑے اچھے اچھے کھانے ملتے۔ سونے کو نرم گداز بستر، اس آرام اور عیش کو پاکر وہ اپنے ماں باپ کو بھول گیا۔ راجا کا خیال تھا کہ دونوں جوان ہو جائیں تو ان کی شادی کر دی جائے۔ دن گزرتے گئے۔ ایک دن شہزادہ ایک مچھلی کی پیٹھ پر سوار ہو کر سمندر کی سیر کر رہا تھا کہ اتفاق سے اس پری کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے فیروز کو پہچان لیا۔ اب وہ نیچے آئی اور فیروز سے اس کے ماں باپ کی خیریت پوچھی۔ اچانک شہزادے کو اپنے ماں باپ کا خیال آ گیا اس نے پری کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یہ سن کر پری کو بہت دکھ ہوا۔ وہ فیروز سے بولی۔

"فیروز! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم آرام اور سکھ پاکر اپنے ماں باپ کو بھول جاؤ گے سمندر کا راجا بہت طاقتور ہے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن یہ جو لباس تم پہنے ہوئے ہو اور تمہارے پاس جو تلوار ہے اس کے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم فوراً جاؤ اور راجا کی قید سے اپنے ماں باپ کو چھڑا لاؤ۔ میں جنگل میں ہی تمہارے لیے ایک خوبصورت محل بنوا دوں گی جس میں تم اپنے ماں باپ کے ساتھ آرام سے رہ سکو گے۔ یہ کہہ کر پری چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی فیروز واپس محل میں آیا۔ اس نے دیکھا محل کو بہت خوبصورتی سے سجایا جا رہا ہے۔ وہ بڑا حیران تھا کہ آج کیا بات ہے اور پھر اسے کچھ دیر بعد ہی پتا چل گیا کہ اس کی شادی سمندر کی بیٹی یعنی راجا کی اکلوتی بیٹی سے ہو رہی ہے تو اس نے شادی سے فوراً انکار کر دیا۔ راجا نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا جب تک اس کے ماں باپ کو قید سے رہا نہیں کیا جائے گا وہ شادی نہیں کرے گا۔ راجا نے بہت سمجھایا کہ وہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں لیکن فیروز نہ مانا۔ آخر اس کی ضد کو دیکھتے ہوئے راجا نے گڈریے اور اس کی بیوی کو رہا کر دیا راجا نے گڈریے سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو فیروز سے بیاہنا چاہتا ہے۔ گڈریے کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ رضامند ہو گیا لیکن اس کی یہ شرط تھی کہ وہ اپنے گھر سے بارات لے کر آئے گا۔ راجا مان گیا۔ گڈریا بیوی اور بیٹے کے ساتھ جیسے ہی سمندر سے باہر آیا تو اسے اس مقام پر ایک خوبصورت محل نظر آیا جہاں اس کا جھونپڑا

(باقی صفحہ ۹ پر)

پیگی ایسٹ مین

آواز شناس کمپیوٹر



کمپیوٹر کی تصویر بھجوانے کے لیے ہم رضوان اللہ صاحب اردو اوڈیڈ اسائنس میپر کے شکر گزار ہیں۔

(ادارہ)

اب ایک آواز شناس کمپیوٹر تیار ہوگیا ہے جسے میز پر رکھ کر ضروری ہدایات دی جاسکتی ہیں اس پر لگا ہوا مائیکروفون آواز کو عبارت میں تبدیل کر دیتا ہے اور اسی سے منسلک ایک پرنٹر اسے ٹائپ کر دیتا ہے۔ یہ نئی مشین انتہائی مصروف اعلا حکام کے لیے بڑی کار آمد ہے۔

پہلے اس مشین کو آواز کی شناخت کرانے کے لیے ٹھہر ٹھہر کر بولنا پڑتا ہے۔ عبارت ٹائپ ہوجانے کے بعد زبانی یا ٹائپ کرکے اس میں ترمیم و تنسیخ ممکن ہے۔ اس آواز شناس کمپیوٹر کے فائدے تو ظاہر ہی ہیں۔ خیالات فی الفور تحریری شکل میں آجاتے ہیں جس سے وقت کی بڑی بچت ہوتی ہے۔

تجارتوں میں اور دیگر پیشوں میں بھی جیسے کہ معالجہ میں جلد سے جلد رائے لینے کے لیے نیس

اتی ہے اس لیے یہ ماہرین جتنی جلدی اور تیزی سے کام کرسکیں گے اتنے ہی زیادہ لوگوں کی
مت کرسکیں گے۔

آواز شناسی کی ٹیکنالوجی میں پیش رفت کرنے والی ایک فرم ڈریگن سسٹمس کی صدر جینٹ بیکر
ے کہا کہ سوچ سمجھ کر سکریٹری کو لکھوانے والا اوسطاً ۳۰۔۴۰ لفظ فی منٹ بولتا ہے۔ اگر اسے ٹیپ ریکارڈ
یا جائے تو بھی تحریر میں لانے کے لیے سکریٹری کو کافی وقت صرف کرنا ہوگا۔ ہاتھ سے اوسطاً دس لفظ فی منٹ
ھا جائے گا۔

آواز شناس سے ماہروں کے وقت کی بچت تو ہوتی ہی ہے ایسے معذروں کے لیے اس
بڑی افادیت ہے جو ٹائپ نہیں کرسکتے۔ اس مشین میں بنیادی اہمیت اس بات کی ہے کہ اس
ں کتنے الفاظ کو سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ اس مشین کی تاجر فرمیں انھیں زیادہ سے
یادہ الفاظ کی متحمل بنانے میں مسابقت کر رہی ہیں۔ ماہرین کی رائے ہے کہ ۲۰ ہزار الفاظ تک شناخت
رنے والی مشین بہت کافی ہوگی۔

آئی بی ایم کے محققین نے ۱۹۸۶ء میں جس مشین کا تجربہ کیا تھا وہ ۵ ہزار الفاظ کے مجموعے میں سے
تخب الفاظ پر مشتمل عبارت کو ۹۵ فی صد سے زیادہ درستگی کے ساتھ منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

آواز شناسی کی ٹیکنالوجی تو ۱۹۸۴ء ہی میں تیار ہوگئی تھی لیکن اس کو کام میں لانے کے
لیے اتنا چھوٹا کمپیوٹر نہیں بنایا جاسکا تھا جسے دفتر کی میز پر آسانی سے رکھا جاسکے۔ اس کے لیے تو
تنی ساری مشینری درکار تھی جسے رکھنے کے لیے ایک پورا کمرہ بھی کم پڑتا۔

چنانچہ اب آواز شناسی کی ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز پیش رفت کے نتیجے میں جو آواز شناس
مپیوٹر تیار کیا گیا ہے اس سے تجارتوں اور گوناگوں پیشوں میں سہولتیں پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ
قت کی بھی بھاری بچت ہوگی •• بہ شکریہ، سائنس فیچر، امریکن سینٹر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ایم اکبرالدین صدیقی

استاد کا ادب

حیدرآباد آزادی سے پہلے ہندستان کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس کو مملکتِ آصفیہ کہتے تھے۔ اس کے آخری بادشاہ میر عثمان علی خاں ساتویں آصف جاہ تھے۔ ان کا شمار دنیا کے بڑے دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ ان کا بڑا دبدبہ اور بڑی شان تھی۔

ان کے ایک استاد تھے مولوی انوار اللہ فضیلت جنگ خطاب تھا۔ وہ مکہ مکرمہ میں چار سال تک لوگوں کو پڑھاتے رہے۔ حیدرآباد واپس ہوئے تو دینی مدرسہ نظامیہ میں پڑھانے لگے۔ میر عثمان علی خاں کے والد میر محبوب علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے میر عثمان علی خاں کو بھی پڑھایا اور پھر ان کے بچوں کو بھی۔ وہ حیدرآباد میں امورِ مذہبی کے صدر الصدور بھی تھے۔

مولوی انوار اللہ فضیلت جنگ کی ایک برسی کے موقع پر اعلا حضرت میر عثمان علی خاں نے بھی شرکت کی۔ ان کا مزار مدرسہ کے احاطہ میں ہے۔ جب ان کی موٹر حدودِ مدرسہ کے قریب پہنچی تو انھوں نے گاڑی روکنے کا حکم دیا اور کہا کہ میں اپنے استاد کے مزار تک پیدل جاؤں گا۔ چنانچہ وہ اپنے استاد کے مزار تک پیدل گئے۔ فاتحہ گذرانی اور واپس ہوئے۔

ایک دفعہ اعلا حضرت اپنی خصوصی ٹرین میں اورنگ آباد جا رہے تھے۔ راستہ میں جہاں جہاں ٹرین ٹھہرنے والی تھی بڑے عہدہ داروں کو حکم دیا گیا تھا کہ درباری لباس (دستار پہنے بگلوس لگائے) اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر حاضر رہیں۔ ایک مقام پر ٹرین پانی لینے کے لیے ٹھہری

چار قندیل۔ آغا پورہ (حیدرآباد)

پندرہ منٹ رکنے کا وقت تھا۔ پلیٹ فارم پر صرف ایک عہدہ دار ٹہل رہے تھے۔ سفید شیروانی دوہری پاجامہ، سفید دستار اور زرین بگلوس کرپر لگا تھا۔ اعلاحضرت نے انھیں دیکھ کر قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو سوال کیا۔

کون ہو تم؟

منصف عدالت ہوں۔

اعلاحضرت: کیا کامیاب ہو؟

منصف : بی، اے (علیگ)، بی اے آنرز (آکسن) بار ایٹ لا۔

اعلاحضرت: کس خاندان سے ہو؟

منصف : مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ سے۔

اعلاحضرت: (سینہ پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا) میرے استاد! میرے استاد۔

اور دروازہ کے ڈنڈے کو پکڑ کر نیچے فٹ بورڈ پر پیر رکھا۔ دفتر اور مقامی آبادی سے متعلق سوالات کرتے رہے۔ منصف صاحب کے جوابات سے خوشنودی کا اظہار کرتے رہے۔ بیس منٹ گزر گئے۔ ریلوے گارڈ نے پیشی میں حاضر ہو کر چلنے کی اجازت چاہی تو اعلاحضرت نے اجازت دی اور منصف صاحب سے کہا۔ اچھا، خدا حافظ اور اپنے کمپارٹمنٹ میں واپس ہوئے۔

اس قدر دولت و عزت اور شان و شوکت رکھنے کے باوجود ان کے دل میں استاد کا بہت احترام تھا۔ چونکہ منصف صاحب استاد کے خاندان کے ایک فرد تھے اس لیے انھیں بات کرنے کا شرف بخشا۔ ورنہ راستہ میں اور کسی سے ایسی تفصیل سے اور اتنی دیر تک بات نہیں کی۔

بقیہ صفحہ ۵

تھا اچانک اس کی نگاہ پری پر بھی پڑ گئی۔ اب وہ سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ پری کی بدولت ہوا ہے اور فیروز بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر سمندر کی بیٹی کو بیاہنے گیا۔ راجا نے جہیز میں اتنا کچھ دیا کہ اس کی بدولت فیروز نے اس جنگل میں ایک شہر آباد کیا اور اپنے محل میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

(خدا نظرِ بد سے بچائے)

بچہ ڈھائی سال کا مگر وزن ۳۹ کلو

مراد آباد کا یہ بچہ بھاری سے بھاری چیز اُٹھا لیتا ہے



ڈھائی سالہ محمد خرم عرف لکی جس کا وزن ۳۹ کیلو گرام اور قد ۱۰۵ سینٹی میٹر ہے

تصویر — قومی آواز — محمد ارشاد

۷ار ستمبر (نامہ نگار) قدرت کے کرشمہ کو ہر شخص حیرت کے طور پر دیکھتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب انسان خدا کے وجود کو تسلیم کر کے اُس کے دربار میں سربسجود ہوجاتا ہے۔ خدا کے اس کرشمے کو دیکھنے کے لیے آج کل تحصیل صدر کے نائب تحصیل دار پیارے مرزا کے مکان پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے جو اس تندرست و توانا بچے کو دیکھنے آرہی ہے جس کی عمر صرف تیس ماہ ہے مگر اس کا وزن ۳۹ کلو گرام ہے اور قد ایک سو پانچ سینٹی میٹر ہے ڈھائی سالہ بچہ بھاری سے بھاری چیز اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ سکتا ہے۔ تندرست بچے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ مراد آباد کے لاجپت نگر کا رہنے والا محمد خرم عرف لکی ہے اس کے والدین نے بتایا کہ خرم کے مُٹاپے کو دیکھ کر انھیں ڈر ہوا کہ کہیں اسے کوئی بیماری تو نہیں ہے مگر جب آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ڈاکٹروں نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اُسے کوئی بیماری نہیں ہے تب والدین کی فکر دور ہوئی گھر والوں کا کہنا ہے کہ خرم کی غذا اتنی ہی ہے جتنی عام طور پر اس عمر میں بچّوں کی ہوتی ہے۔

شبنم آرا

جادو کا چراغ



امیر سجانی

پیارے بچو! آپ نے اکثر ایسی کہانیاں سنی ہوں گی جن میں کسی غریب خاندان کا کوئی لڑکا کسی جادو کے چراغ کی مدد سے کسی ملک کا بادشاہ بن جاتا تھا۔ اب نہ وہ بادشاہ رہے نہ جادو کے چراغ لیکن ایک چراغ اب بھی ایسا ہے جس کی مدد سے لوگ ترقی کی سب سے اعلا منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کون سا چراغ ہے یہ بتانے کے لیے میں تمھیں تمھارے ہی جیسے ایک لڑکے کی کہانی سناتی ہوں۔

آپ نے سیوان شہر کا نام تو سنا ہوگا۔ وہی سیوان جہاں بچوں کے ایک اچھے ادیب احمد جمال پاشا رہتے ہیں۔ وہاں سے کوئی چار میل ہڑ بڑیا نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ عام بچوں کی طرح اس نے بھی ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد گاندھی میموریل اسکول میں داخلہ لیا اور ہر کلاس میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس لڑکے کے پاس پوری کتابیں بھی نہیں رہیں اور اسے اپنی بہت ساری خواہشوں کا گلا گھونٹنا پڑا۔ کیوں کہ اس کے والد ایک معمولی سرکاری ملازم تھے۔ پھر بھی اس نے پڑھائی جاری رکھی اور ۱۹۷۰ء میں ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اعلا تعلیم

حاصل کرنے کے لیے وہ پٹنہ آیا اور سائنس کالج میں آئی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا۔ یہاں اسے ایک ایسے ہاسٹل میں رہنا پڑا۔ جہاں کے لڑکے اپنی شرارتوں کے لیے شہر بھر میں مشہور تھے۔ لیکن اس نے خود کو ہر طرح کی برائیوں سے بچائے رکھا اور آئی۔ ایس۔ سی اور بی۔ اے کے امتحانات بھی فرسٹ ڈویژن سے پاس کیے۔ بی۔ اے۔ کے ریزلٹ پر اُسے نیشنل میرٹ اسکالرشپ اور گولڈ میڈل ملا۔ پھر ۱۹۸۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کے امتحان میں اس نے تقریباً ۹۰ فی صد نمبر لاکر ایک ریکارڈ قائم کیا۔ اور اسے گولڈ میڈل کے ساتھ Best Master طالب علم کا خطاب بھی ملا۔

یوں تو اسے بچپن ہی سے ایک عظیم انسان بننے کی خواہش تھی لیکن بڑے ہوکر اس شوق نے شدت اختیار کر لی۔ اسی دوران اگرچہ اسے بینک میں ملازمت بھی مل گئی لیکن اس کا اصل مقصد ملک کا سب سے اہم امتحان یعنی آئی اے۔ ایس پاس کرنا تھا۔ اس لیے اس نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ دن بھر دوستوں کے ساتھ تفریح کرتا۔ کالج میں پڑھائے گئے مضامین کو دہراتا یا کہیں ملازمت کرتا۔ لیکن جب رات کو سارے لوگ نیند میں ہوتے تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے دِل لگاکر پڑھتا رہتا۔

اس کی یہ محنت اور لگن آخرکار رنگ لائی اور ۱۹۸۹ء میں وہ نہ صرف آئی۔اے۔ایس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ بلکہ اس نے تمام کامیاب طالب علموں میں پہلا مقام حاصل کیا۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جس کی آزاد ہندستان میں مثال نہیں ملتی۔

اب تو تم اس کا نام جان ہی گئے ہوگے کیونکہ اخباروں میں اس کے بارے میں بہت کچھ چھپا ہے۔ اگر تمھیں پتا نہیں تو سن لو کہ اس کا نام امیر سبحانی ہے اس نے ایک چھوٹے سے قصبے میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ نہ تو دہلی کے بہترین اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ سکا۔ اور نہ ہی اسے کسی اور طرح کی مدد حاصل ہوئی۔ مگر اس نے اپنی ہی محنت اور لگن پر بھروسا کیا اور آخرکار کامیاب ہوا۔

اب تم اس چراغ کا نام بھی جان ہی گئے ہوگے جس نے ایک معمولی اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لڑکے کو ملک کے ایک اہم عہدے تک پہنچنے میں مدد کی۔ جادو کے اس چراغ کا نام محنت ہے۔ اگر تم بھی محنت سے کام لو تو امیر سبحانی کی طرح اپنا، اپنی قوم اور اپنے خاندان کا نام روشن کر سکتے ہو۔

آخر میں امیر سبحانی کا یہ پیغام بھی سُن لو جو تمھارے ہی لیے ہے۔ "ہمیشہ مثبت انداز سے سوچو اور پُرامید رہو تاکہ تمھاری مخلص کوششیں بارآور ثابت ہوں۔ اگر حوصلوں کی شکست نہ ہو تو جنگ میں کبھی شکست نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمیں آخری لمحے تک کامیابی کے لیے لڑنا چاہیے۔"

ڈاکٹر سیفی پریمی

میر تقی میر کا ایک شعر

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سمجھیے: اس شعر کا مطلب بیان کرنے سے پہلے ایک پتے کی بات جاننا ضروری ہے۔

انسان کو مجبورِ محض مانا جائے یا مختارِ کُل؟ اس سلسلے میں تین خیال پیش کیے جاتے رہے ہیں۔

۱۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ یعنی وہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا۔

۲۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان مختارِ کُل ہے۔ یعنی وہ اپنے ارادے سے سب کچھ کر سکتا ہے۔

"شریعت" کی نظر میں یہ دونوں گروہ حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں انسان پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ اپنے اچھے بُرے کاموں کا کسی کے سامنے جواب دِہ نہیں۔ نتیجہ یہ کہ حشر و نشر، قیامت میں سوال و جواب اور عذاب و ثواب کا کوئی نکتہ پیدا نہیں ہوتا۔

ان دونوں گروہوں کے خیالات اور پیچیدہ بحث کا مشکل نام "فلسفۂ جبر و قدر" ہے۔ (یہ کالج میں سمجھایا جائے گا) اس بحث کو شریعت کی حد میں لانے کے لیے ایک گروہ نے بیچ کا راستہ اختیار کیا۔

۳۔ یہ گروہ اس بات کا قائل ہے کہ انسان بعض باتوں میں مختار ہے۔ مثلاً وہ اپنے دماغ، حواس اور بدن کے ہر حصے سے جہاں چاہے، جب چاہے اور جیسا چاہے کام لے سکتا ہے۔ اس پر کوئی جبر نہیں۔ ہم جو چاہیں خیال کر سکتے ہیں۔ پڑھ سکتے ہیں۔ جدھر چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔ چکھ سکتے ہیں۔ سونگھ سکتے ہیں۔ سُن سکتے ہیں۔ چھو سکتے ہیں۔ محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمارے عمل پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ اختیار کی علامتیں ہیں۔ اس لیے عمل کی جواب دہی بھی ضروری ہے۔ لیکن بعض باتوں میں انسان مجبور ہے۔ "اضطراری حرکت" میں وہ بے بس ہے۔

مثلاً نبض کی رفتار اور دل کی دھڑکن خودکار ہے انسان اپنے ارادے سے اس عمل کو شروع یا بند نہیں کرسکتا۔

اب میر تقی میر کے شعر پر غور کیجیے۔
شاعر نے اس شعر میں پہلے گروہ کے خیال کی ترجمانی کی ہے۔ شاعر آپ بیتی بھی کہتا ہے اور جگ بیتی بھی۔ وہ انسان کو مجبورِ محض سمجھتا ہے۔ زندگی میں اُسے کوئی اختیار نہیں ملا۔ اور "مختاری" یعنی اختیار دیے جانے کی بات بے سبب کہی جاتی ہے۔ اس کو اپنے ارادے سے کام کرنے کی قدرت حاصل نہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں انسان کو کچھ دخل نہیں۔ اصل میں قدرت جو چاہے کرتی ہے۔ یہاں "چاہنا" سے مُراد ہے، پسند، قبول، مرضی اور مشیت۔

دھیان دیجیے :

ناحق = (حق، عربی لفظ ہے فارسیوں نے اس سے پہلے "نا" لگا کر اُسے اپنا لیا): بے انصافی، بے جا، نامناسب، بلاسبب، ناواجب، بے فائدہ

ہم = ہندی، ضمیر جمع متکلم۔ میر نے اس شعر میں انسانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔

مجبور = عربی، ناچار، تنگ، بے بس۔

تہمت = عربی، الزام، بہتان، عیب، بدنامی، قصور

مختار = عربی، با اختیار، آزاد، مجاز، ولی، سرپرست، گماشتہ، وکیل، اختیار دیا گیا، پسند کیا گیا۔

عبث = عربی، بے فائدہ، فضول، نکما، بلاوجہ، ناحق۔

چاہنا = ہندی، مانگنا، درخواست کرنا، پیار کرنا، عشق کرنا، پسند کرنا، قبول کرنا، رغبت کرنا، مائل کرنا۔

سو = ہندی، کبھی اسم اشارہ، کبھی ضمیر کبھی خبر کے واسطے آتا ہے۔ اس شعر میں میر نے "وہ" کی جگہ استعمال کیا ہے۔

آپ = ہندی، ضمیر، خود، اپنی ذات سے ذاتِ خدا، روح، آتما۔ میر نے یہاں قدرت یا ذاتِ خدا کے معنوں میں لکھا ہے

محض = عربی، صرف، فقط، نرا، خالص، بالکل، تمام، سرتاسر

راشد عمر پراچہ

کاغذ کا استعمال کب شروع ہوا؟

آج کاغذ کی جتنی قدر ہے، اتنی کسی دوسری چیز کی نہیں۔ آج اسی کاغذ کی وجہ سے ملک ملک، شہر شہر اور گاؤں گاؤں علم کے دریا بہہ رہے ہیں۔ رسالوں، اخباروں اور کتابوں کے علاوہ کاغذ دوسرے کاموں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابتدا میں لوگ کاغذ بنانا نہیں جانتے تھے۔ انسان نے تحریر کے نشان جانوروں کی کھال پر بنائے، لیکن یہ طریقہ بھدا تھا۔

چار ہزار سال پہلے مصر کے لوگ پاپیرس کے پودے پر لکھنے لگے۔ انگریزی لفظ پیپر اسی پاپیرس کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اس پودے کو سکھا کر چٹائی بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض ملکوں میں موم کی تختیاں استعمال ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ پاپیرس کی تجارت بڑھنے لگی۔ یونان کی ایک نوآبادی پرگیمن کے بادشاہ کی لائبریری میں بے شمار عمدہ مسودے تھے جب اس وقت کے فرعون کو پتا چلا تو اس نے برآمد بند کر دی، تب دوبارہ کھالوں پر لکھائی شروع ہوئی اور اس عمدہ طریقے سے کی گئی کہ کھالوں کے دونوں جانب لکھا جانے لگا۔ اس قسم کے کاغذ کو چرمی کاغذ کہتے ہیں۔ انگریزی میں پارچمنٹ اسی سے لیا گیا ہے۔

اس کے بعد چینیوں اور پھر عربوں نے کاغذ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ یہ لوگ کتان اور سوتی کپڑے کے چیتھڑوں سے کاغذ بناتے تھے۔ پھر عربوں نے ایک مشین ایجاد کی اور مراکش کے شہر فیض میں ایک کارخانہ قائم کیا گیا۔ جہاں بہت عمدہ کاغذ بننا شروع ہو گیا۔ عربوں سے یہ فن شمالی افریقہ کے مسلمان اپنے ساتھ ہسپانیہ لے گئے جہاں انھوں نے کاغذ کو بہت ترقی

دی۔ رفتہ رفتہ یہ طریق دور دور تک پھیل گیا اور یورپ اس فن سے فیض یاب ہوا۔

۱۷۹۹ء میں فرانس میں ایک مشین ایجاد ہوئی۔ جس سے کاغذ کے چوڑے اور لمبے رول نکل سکتے تھے لیکن ضروری سامان کی کمی رہی۔ ۱۸۴۵ء میں ایک جرمن نے لکڑی سے کاغذ بنانے کا مواد حاصل کیا۔ برطانیہ اور پھر امریکہ نے کاغذ بنانے کی کامیاب کوششیں کیں۔ چھاپے کی مشین کے بعد کاغذ بنانے کے کام میں بہت ترقی ہوئی، اور ہر قسم کا کاغذ ملنے لگا۔

کاغذ ایک خاص قسم کی گھاس اسپارٹو اور بانس کی لکڑی سے تیار کیا جاتا ہے۔ لکڑی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیا جاتا ہے۔ پھر بڑے بڑے حوضوں میں مختلف مسالوں کے ذریعے اس لکڑی کو حل کیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاڑھے دودھ کے تالاب بھرے ہوئے ہیں۔ اسی گاڑھے دودھ سے ایک خاص قسم اور سائز کا کاغذ بنایا جاتا ہے۔ یہ کاغذ شروع میں بہت لمبا ہوتا ہے جسے بعد میں مقررہ لمبائی کے مطابق کاٹ کر رِم بنا لیے جاتے ہیں۔

پونہ بورڈ کے ایس ایس سی کے امتحانات میں مالیگاؤں کے اول درجہ میں کامیاب ہونے والے سہیل احمد عبدالغفور، شہزاد احمد اصغر علی، خالد ظہیر حسن اپنے ہیڈ ماسٹر امان اللہ خاں صاحب کے ساتھ۔



جاگو جگاؤ

ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک مسلمان کی خیر خواہی دوسرے مسلمان پر اسی طرح فرض ہے، جس طرح ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی بھلائی چاہتا ہے۔ ایک بھائی سے دوسرے بھائی کو مدد ملتی ہے، نقصان نہیں پہنچتا۔ بھائی کو بھائی سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا، امید ہوتی ہے، اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ہم سب مسلمان چاہے کوئی زبان بولتے ہوں، کسی علاقے کے رہنے والے ہوں، کوئی لباس پہنتے ہوں، ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ہمیں بھائی کی طرح ایک دوسرے کا سہارا ہونا چاہیے۔ ایک بھائی کو کچھ ملے تو ہمیں خوش ہونا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے ایک بھائی کو تو ملا، دوسروں کو بھی مل جائے گا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کے دوسرے پر چھے حقوق بتائے ہیں۔ سرکارؐ نے فرمایا:

۱۔ اپنے مسلمان بھائی سے ملو تو اُس کو سلام کرو۔
۲۔ وہ تمھیں دعوت دے تو اُس کی دعوت قبول کرو۔
۳۔ وہ تم سے بھلائی کا طالب ہو تو تم اس کی بھلائی چاہو۔
۴۔ اُس کو چھینک آئے اور وہ "الحمدللہ" کہے تو تم اس کے جواب میں "یَرْحَمُکَ اللہ" کہو۔
۵۔ وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو۔
۶۔ وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔

ایک اور حدیث میں ہے:

"انسان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تعلق توڑے رکھے۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں سچا مسلمان اور اچھا بھائی بنائے۔

تمھارا دوست اور ہمدرد حکیم محمد سعید

بچوں کی مذہبی کتابیں

سب سے بڑے انسانؐ	۲/۵۰	ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۷/۰
حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل)	۴/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	ارکانِ اسلام	۲/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	-/۴۰	عقائدِ اسلام	۳/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	چار یار	۴/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا اوّل	۷/۵۰	خلفائے اربعہ	۶/۵۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	نبیوں کے قصے	۵/
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
اللہ کے صفی	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	سرکارِ دو عالمؐ	۳/۰

حضرت آدم علیہ السلام

منورہ نوری خلیق

(آخری قسط)



ہابیل اور قابیل

"لیکن یہ خدا کا فیصلہ ہے،" ہابیل نے نرمی سے کہا۔ "تم مجھ سے بدظن کیوں ہوتے ہو اور پھر اگر تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں تم پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا کیونکہ میں گناہ کرنا نہیں چاہتا۔"

ہابیل نے کیا کیا کہا، قابیل نے کچھ نہ سنا البتہ وہ سوچوں میں غرق اپنے کھیتوں کی طرف بڑھ گیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کسی انسان کو قتل کیسے کیا جا سکتا ہے کیونکہ کرۂ ارض پر انسان آ تو گیا تھا، پیدائش اور رہن سہن، عبادت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی تک کوئی موت نہ ہوئی تھی۔ ایسے میں قابیل کو بھی علم نہ تھا کہ موت کے گھاٹ کیسے اُتارا جاتا ہے! یہی غور کرتے ہوئے وہ چلا جا رہا تھا کہ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا وہ ساتھی جو ہر دم اُس کے ساتھ رہتا تھا، ایک دم ہی انسانی شکل میں ظاہر ہوا، پھر اُس نے جھپٹ کر ایک پرندہ پکڑ لیا۔ اُسے ایک پتھر پر رکھا اور دوسرا پتھر اُس کے سر پر دے مارا۔ اس بے چارے پرندے نے بس ایک آواز منہ سے نکالی اور ختم ہو گیا۔ اگر اُس وقت بھی قابیل غور کرتا تو وہ بہکانے والے اِس ساتھی کو پہچان سکتا تھا لیکن وہ تو قتل کے اِس عجیب و غریب طریقے کو حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ زندگی اور موت کا بس چند لمحوں کا ملاپ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ایک اہم فیصلہ کر کے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ہابیل اپنے مویشی چرانے لے جاتا تھا۔

قابیل اپنے بھائی ہابیل کو تلاش کرتا ہوا دیوانہ وار پھر رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں بس یہی بات تھی کہ اُس کا بھائی اس کا مخالف ہے۔ اُس کی رسوائی اور ذلت کا سبب ہے۔ خدا نے بھی اس کی قربانی قبول کی اور باپ بھی اُسی سے محبت کرتا ہے لہٰذا اگر کامیابی حاصل کرنا ہے تو اسے قتل کرنا ہوگا۔ یہ سوچیں تھیں اُس کی اور یہ وہ انسان تھا جس نے انسانوں میں برائی، نافرمانی، بغض و حسد، ضد اور ہٹ دھرمی کی ابتدا کی اور اب وہ ایک اور کام کرنے جا رہا تھا۔ بہت دیر تک تلاش کے بعد اُس نے دیکھا ہابیل نے اپنے تمام مویشیوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور خود شاید تھک کر ایک پتھر پر سر رکھے غافل سو رہا ہے۔ قابیل نے قدرے فاصلے پر رک کر اسے غور سے دیکھا۔ ایک بار پھر اُسے وہی سرگوشی سنائی دی "قابیل اُٹھ

پس تم اب تمہیں بس ایک پتھر کی ضرورت ہے۔ اٹھاؤ اور اس کے سر پر دے مارو۔"

اس مشورے پر وہ سحر زدہ سا آگے بڑھا، ایک بھاری پتھر اٹھایا اور ہابیل کے سر پر دے مارا۔ یوں دنیا میں پہلا قتل ہوا، پہلی موت ہوئی۔ یہ خود قابیل کے لیے بھی انوکھا تجربہ تھا۔ فساد کی ابتدا کر کے فساد پھیلانے والا خود ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس نے ایک بڑا جرم کیا تھا جس کی سنگینی سے زیادہ اُسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اب اسے کس طرح چھپایا جائے۔ اس بے جان لاشے کو کہاں رکھے؟ چھوڑ کر چلا جائے یا ساتھ لے جائے؟ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ اپنے اس دوست کو تلاش کرے جس نے اس کے سامنے پرندے کو مار کر اُسے قتل کرنے کا آسان طریقہ سکھایا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے ہابیل کی لاش کو کندھے پر ڈالا اور اس دوست کو پکارتے ہوئے چلنے لگا جس کا کام مکمل ہو چکا تھا اور وہ غائب تھا۔ اس طرح ہابیل کی لاش کندھے پر اٹھائے ہوئے چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی، پھر اس نے اچانک ایک منظر دیکھا۔ کچھ دور ایک کوا اپنی چونچ سے زمین کھود رہا تھا اور نزدیک ہی ایک مردہ کوا پڑا ہوا تھا۔ قابیل یہ منظر دیکھ کر چونک گیا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ کیا اس نے بھی دوسرے کو قتل کیا ہے؟ وہ دیکھتا رہا تھا کہ کوے نے گڑھا کھودا اور مردہ کوے کو اس میں سرکا کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ اس وقت قابیل رو دیا۔ نہ جانے اپنی کم عقلی پر یا بدنصیبی پر۔ بہرحال اس واقعے کو سب سے خوب صورت انداز میں قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ فرمایا ہے:

(اے نبی)، انھیں آدم کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کے حالات سنا دیجیے: جب ان دونوں نے خدا کے حضور کچھ نیازیں پیش کیں، تب ایک کی نیاز قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ تب وہ (قابیل)، اس (ہابیل) سے کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا، خدا پرہیزگاروں ہی کی نذر قبول فرماتا ہے، اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر ہاتھ چلائے گا تو میں تجھ پر قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں چلاؤں گا۔ مجھے رب العالمین سے ڈر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے گناہ میں اور اپنے میں بھی ماخوذ ہو، پھر اہلِ دوزخ میں ہو کیونکہ ظالموں کی یہی سزا ہے۔ پھر اس کے نفس نے بھائی کے قتل کی ترغیب دی اور اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا، پھر خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا تاکہ اُسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیونکر چھپائے۔ تب وہ کہنے لگا، ہائے مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوے کے برابر ہوتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا، پھر وہ پشیمان ہوا۔

(سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳۱)

اس طرح سے دفن کرنے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو سکھایا اور یہی زمانے میں رائج ہوا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اس بات کا بہت غم تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور شرمسار تھے اور عبادت کرتے رہتے تھے۔ قابیل کا کیا ہوا، اس کی وضاحت تاریخ میں کہیں نہیں ملتی لیکن حضرت آدم علیہ السلام کا بے پناہ غم دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے انھیں تسلّی دی اور فرمایا۔ "آدم! غم نہ کر۔ ہم تجھے وہ فرزند عطا کرنے والے ہیں جس کی نسل میں مصلحین اور انبیاء پیدا ہوں گے۔" نیز انھیں صفی اللہ فرمایا گیا یعنی اللہ کے دوست۔

یہ لقب حضرت آدمؑ کا اور یہ خوش خبری حضرت شیث علیہ السلام کے بارے میں تھی۔ جن کی ولادت کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے طویل عمر پائی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں کھیتی باڑی کرنے اور کپڑا بُننے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اپنی وفات سے قبل انھوں نے طوافِ کعبہ کیا اور وہاں سو گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے انھیں اُن کی تمام اولاد جو قیامت تک پیدا ہونا ہے، خواب میں دکھائی۔ صالحین کو دائیں طرف اور منکرین کو بائیں طرف۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ان سب کو دینِ حق کی تعلیم دی۔ آپ تقریباً نو سو تیس برس دُنیا میں رہے اور اپنی اولاد کو تعلیماتِ الٰہی سے روشناس کراتے رہے۔ بی بی حوّا کی عمر کتنی ہوئی اور ان کا انتقال کب ہوا، اس کی بھی وضاحت نہیں ہے۔ بہر حال دُنیا کی آبادی انھی دو انسانوں سے ہوئی اور بنی نوعِ انسان کے باپ اور ماں خدا کے احکامات کے مطابق زندگی گزار کر دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت تک اُن کی اولاد بہت پھیل چکی تھی، جن میں نیک و بد سبھی تھے اور اللہ تعالیٰ کو اُن کی اصلاح و ہدایت

کام جاری رکھا تھا لہٰذا اب حضرت آدم علیہ السلام کے رحلت کر جانے کے بعد تبلیغ و تلقین کی ذمہ داری ان کے فرزند حضرت شیث علیہ السلام کو سونپی گئی۔

حضرت شیث علیہ السلام

شیثؑ کے معنی عطیۂ خداوندی یا عنایت کے ہیں۔ اپنے دو بیٹوں کے عجیب و غریب انجام کے بعد حضرت آدم علیہ السلام بہت غمگین رہنے لگے۔ خدا کے سامنے شرمسار بھی تھے اور توبہ و استغفار کرتے رہتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے اُن کی تسلی کے لیے انھیں ایک فرزند کی خوشخبری سُنائی۔ اِس طرح وہ عطیۂ خداوندی ہوئے۔

پیارے بچو! یوں تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان سب کو دینِ حق کی تعلیم دی، عبادت کا صحیح طریقہ سکھایا اور خدا کے گھر کی عظمت سے آگاہ فرمایا اور جس وقت آپ دُنیا سے تشریف لے گئے، اس وقت تک خاصی تعداد میں انسان رہتے بستے تھے جن کی ہدایت کے لیے ان سے بہتر کسی انسان کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی انسان کی اِصلاح کا کام انسان ہی کر سکتا ہے کیونکہ اوّل تو وہ دوسرے سب انسانوں کے مسائل سمجھتا ہے، اس کے علاوہ جس طرح انسان اپنے ہم جنسوں سے مانوس ہو سکتے ہیں، فرشتوں اور جنوں سے نہیں ہو سکتے اسی مصلحت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور ہلاکت سے آگاہ کرنے کے لیے فرشتوں اور جنوں کو مقرر نہیں کیا بلکہ ان کی ہدایت کے لیے انسانوں ہی کو منتخب فرمایا لیکن ان کو جو عام لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے اور عمل کرتے تھے، اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کی تمام اولاد میں باعمل اور صاحبِ علم ہستی حضرت شیث علیہ السلام ہی کی تھی۔ ان میں متعدد صفات تھیں۔

- حضرت شیث علیہ السلام شکل و صورت میں حضرت آدم علیہ السلام سے مشابہ تھے۔
- حصولِ علم کا شوق سب اولادِ آدمؑ سے بڑھ کر تھا جو اُس وقت موجود تھیں۔ وہ اکثر اپنے باپ کے پاس بیٹھ جاتے اور بہشت کے حالات دریافت کرتے۔ خدا کی عظمت و بزرگی کا ذکر آتے ہی سجدہ کرتے تھے۔
- جب آدم علیہ السلام کے باقی فرزند دُنیا کی لذّتوں سے لُطف لیتے، تب وہ تنہا کسی گوشے میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔
- باپ اور ماں کے فرماں بردار تھے۔
- مشکل کے وقت صبر اور راحت پانے کے بعد شُکر کرنا اُن کی عادت تھی۔
- انتہائی ناگواری میں بھی غصّے کو پُوری طرح برداشت کرتے تھے۔
- آدمؑ کی اولاد میں سے جب جس سے ملتے، خود احوال پُرسی کرتے تھے۔

- کبھی کبھی محض خوشنودیٔ خداوندی کے لیے نذر پیش کرتے تھے۔
- جس بات اور کام کے بارے میں یقین ہو کہ یہی خیر ہے، وہی کرتے تھے۔

آیندہ چل کر یہی تمام باتیں مومن کی علامت قرار دے دی گئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ان اوصاف کا خوب اندازہ تھا اور پھر اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے اس فرزند کو منتخب فرما چکا تھا، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد وہ درس جو وہ ہر روز دیتے تھے، حضرت شیث علیہ السلام کی ذمے داری قرار پایا جسے انھوں نے بہ حسن و خوبی ادا کیا۔ جوں جوں اور جہاں جہاں انسانوں کی تعداد بڑھتی گئی، وہ وہاں ضرور جاتے۔ انھیں خدا کے احکامات اور عبادت کے صحیح طریقے سے آگاہ فرماتے۔ اُن کے بارے میں قرآن پاک یا تاریخ میں قطعاً کوئی وضاحت نہیں ہے۔ محض اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے طویل عمر پائی اور عمر بھر اصلاح و ہدایت کا فرض ادا کرتے رہے۔ ان کی عمر کے بارے میں کئی روایات ہیں، ۹۶۵۔۹۲۰۔۹۱۲۔۷۰۰ یا پھر ۱۴۴۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت عمریں طویل ہوتی تھیں۔ بہرکیف انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا۔ زیادہ تر لوگ دل سے اُن کی تعلیمات پر عمل کرتے رہے۔ کچھ لوگوں کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت شیث علیہ السلام کی حیات ہی میں قابیل کی روش اختیار کر لی تھی۔ اس طرح منکرین اور مصلحین، دونوں کا سلسلہ ساتھ شروع ہوا۔

حضرت شیث علیہ السلام نے کہاں اور کس سے شادی کی، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ اتنا کہا جاتا ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام کی وفات کے کافی عرصے بعد انھی کی نسل میں ایک خوش اطوار خوب صورت شخص نے بہت مقبولیت پائی جس کا مجسمہ بنا کر اس وقت کے لوگ پوجنے لگے۔ یہ اگرچہ ان کی محبت اور تقلید کے لیے تھا لیکن بُت پرستی کی ابتدا ہو گئی تھی جس کے لیے کسی نئے معلم اور نئے ہادی کی ضرورت تھی۔ پھر جس رفتار سے بُت پرستی بڑھتی گئی، اسی رفتار سے خدا تعالیٰ بھٹکے ہوئے انسان کی رہنمائی کے لیے اپنے خاص بندے مقرر فرماتا رہا اور جس قدر شدت کے ساتھ یہ عظیم بندے اصلاح و ہدایت کا کام کرتے گئے، بُت پرستی بھی اسی طرح پھیلتی رہی۔ یہ عقل کا اندھا انسان بار بار اپنی عظمت و شرف کو بھولتا گیا اور مالکِ حقیقی کو بھول کر کبھی شخصیت کی پرستش کرتا، کبھی خود ساختہ بُتوں کی اور خدا اپنے رحم و کرم سے انھیں پاک صاف کرنے کے لیے کسی برگزیدہ نبی کو بھیج دیتا تھا۔

اس طرح انبیاء کا سلسلہ شروع ہو گیا۔



بچوں کے لیے

نئی اور دلچسپ کتابیں

کتاب	قیمت
بچوں کے ذاکر صاحب	۴/۰۰
ٹوٹے کھلونے	۴/۰۰
اندھے کا بیٹا	۲/۵۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۴/۰۰
سہانے ترانے	۴/۵۰
ہرن کا دل	۲/۰۰
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/۰۰
گوہر شہزادی	۳/۰۰
شریر شیرا	۳/۰۰
پری رانی	۲/۰۰
خطرناک سفر	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۴/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰
ننھا جھیرو	۲/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۰۰
پلک نہ مارو	۴/۰۰
ایک کھلا راز	۳/۰۰
بابا ناصح	۳/۰۰

کتاب	قیمت
پہاڑ کی چوٹی پر	۵/۰۰
رنگوں کی بستی	۲/۵۰
سرخ جوتے	۲/۰۰
سلامہ و صمصامہ	۵/۲۵
شرارت	۲/۰۰
صحت کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰
صحت کی الف بے	۳/۰۰
جدید پہیلیاں	۶/۰۰
ہیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
ننھا فرشتہ	۴/۵۰
نیلا ہیرا	۴/۵۰
ماں کی کھیتی	۲/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰
دنیا کے جانور	۲/۵۰
آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰
اس نے کیا کر نہ جانا	۱/۲۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
بھولوں کا جہاز	۶/۰۰
جوہر قابل	۲/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰

کتاب	قیمت
مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
پیارے رسول	۴/۵۰
چار یار	۴/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۲/۰۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
تاک دنا دن تاک کے سے	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
ایک دیس ایک خون	۲/۰۰
جیت کس کی؟	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
جادو کا گھر	۱/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مدور نا پردیس چلے	۱/۵۰
ہیپو چھو	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
شیر خاں	۱/۵۰

بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ

مسعود احمد برکاتی

جب تک کوئی چیز اپنے پاس رہتی ہے اس کا خرچ کرنا بھی اپنے اختیار میں رہتا ہے۔ صحیح خرچ کریں یا غلط؟ یہ ہماری عقل پر منحصر ہے۔ اگر ہم سمجھ سے کام لیں اور اپنی چیز کو حفاظت سے رکھیں یا احتیاط سے خرچ کریں تو ہم وہ چیز ضائع نہیں کریں گے، بلکہ فائدے میں رہیں گے۔

اکثر چیزیں ایک بار ہاتھ سے نکل جائیں تو واپس نہیں آتیں، مثلاً وقت۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ صحت۔ روٹھی صحت مشکل ہی سے منتی ہے۔ اس لیے ہمیں ان چیزوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اُن کو بچانا چاہیے۔ بچت بڑی اچھی چیز ہے، قومی ضرورت ہے۔ مفید عادت ہے۔ ہم بچت کی عادت اپنا کر بہت سے نقصانات سے بھی اپنی بچت کر سکتے ہیں۔

اپنا وقت بچاؤ: وقت سے پورا کام لو۔ خوب پڑھو، خوب لکھو، خوب کھاؤ، خوب کھیلو اور ورزش کرو، خوب آرام کرو، خوب کام کرو۔

اپنا پیسہ بچاؤ: پیسے کو صحیح کاموں اور ضروری چیزوں پر خرچ کرو۔ بے کار چیزوں اور صرف نمائش کے کاموں پر صرف نہ کرو۔ پیسہ بھی ایک طاقت ہے۔ پیسہ ہوگا تو وقت پر کام آئے گا پریشانی سے بچائے گا۔ پاکستان کو اس وقت پیسے کی ضرورت ہے۔ بچا ہوا پیسہ ہمارے بھی کام آئے گا اور پاکستان کے بھی۔ ہم دوسرے ملکوں کے قرض دار ہیں۔ ہمیں یہ قرض ادا کرنا ہے، کیونکہ پاکستان قرض دار ہے تو گویا ہم میں سے ہر شخص قرض دار ہے۔ یہ پیسہ ہمارے کام آیا ہے اور ہم ہی ادا کریں گے۔ دیانت اور محنت سے کام کریں گے تو پاکستان کو دوسری قوموں کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت کم بچت کرتے ہیں۔ خرچ کرتے وقت ذرا سا رُک کر سوچیں کہ کیا اس خرچ کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ کم سے کم پچاس فیصد موقعوں پر سوچ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ وہ پیسہ بچالیں گے۔ بچا ہوا پیسہ آپ کو پریشانیوں سے بچائے گا۔

توانائی بچاؤ: بجلی گیس اور پٹرول کی ساری دنیا میں کمی ہے۔ اگر ہم ذرا سی توجہ سے کام

کریں تو توانائی بچا کر تکلیف سے بچ سکتے ہیں۔ بجلی کو بے ضرورت خرچ نہ کریں۔ بجلی روشنی گرمی اور ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ بے جا ضائع کر کے ہم ان نعمتوں سے محروم ہو سکتے ہیں اور قوم کو پریشان کر سکتے ہیں۔

پانی بچاؤ: پانی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ پانی کی بھی کمی ہے اس کو صرف ضرورت کے مطابق خرچ کیجیے۔ اگر کسی نے ایک گلاس پانی بھی بے ضرورت، بے جا ضائع کیا تو اس نے ایک گناہ یا ایک جرم کیا۔ پانی کا ضرورت سے زیادہ استعمال کر کے ہم ضرورت کے وقت پانی کو ترس سکتے ہیں۔

اتحاد کو بچاؤ: ہمارے بہت سے دشمن یا ناداں دوست ہمارے اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اتحاد میں طاقت ہے۔ یہ طاقت نہ ہو تو ہم بہت سے نقصان اٹھا سکتے ہیں۔ آپس میں مل کر اور پیار محبت سے کام کرنے میں بہت سے فائدے ہیں۔ اگر کوئی آپ کے کسی بھائی کو آپ کا دشمن بتلائے تو کیا آپ یقین کریں گے؟ تو پھر کسی ہندستانی بھائی کے لیے بھی یہ نہ مانیے کہ وہ آپ کا دوست اور ہمدرد نہیں ہے۔ اتفاق و اتحاد سے ہم سب ترقی کر سکتے ہیں، خوش رہ سکتے ہیں۔ آپس کے اتحاد کو بچائیے۔

درختوں کو بچاؤ: پیڑ پودے انسان کے دوست اور خادم ہیں۔ ان سے ہمیں زندگی بخش ہوا ملتی ہے۔ سایہ ملتا ہے۔ لکڑی ملتی ہے۔ پھل ملتے ہیں۔ یہ بارش کا سبب بنتے ہیں اور خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ پیڑ پودے، باغ اور پارک شہر کے پھیپھڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو گندی ہوا کو صاف کر کے ہمیں اوکسیجن عطا کرتے ہیں۔ درختوں کو بچائیے۔ نئے پیڑ اگائیے۔ باغوں کو سجائیے۔ اور جنگلوں کی حفاظت کیجیے۔



نقلی چہرہ

ملک عبدالرشید

ان مجرموں کا قصہ جو جعلی نوٹ چھاپتے تھے مگر ان کے پیچھے اصل چہرہ
کون سا تھا؟ جاسوسی کہانی

عمران، کامران اور عدنان امی امی، ابو کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے سیر وتفریح کی غرض سے "ایوبیہ" جانے کا پروگرام بنایا تھا جس کی انہیں ان کے ابو انسپکٹر خاور نے اجازت بھی دے دی تھی۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے تینوں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے اور تقریباً چھ گھنٹے کے سفر کے بعد یہ لوگ خوبصورت وادی ایوبیہ پہنچ گئے جہاں ہوٹل میں ان کے لیے پہلے ہی سے کمرے مخصوص تھے تینوں طویل سفر سے بری طرح تھک چکے تھے اس لیے انہوں نے سیر کا پروگرام صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔

اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر تینوں سیر کو جانے کی تیاری کرنے لگے اور ضروری چیزیں لے کر بذریعہ کار ایک گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ انسپکٹر خاور نے اپنے ایک دوست کو فون کر کے ان کے لیے اس گاڑی میں بھی انتظام کروا دیا تھا۔

یہ گاؤں ایک پر فضا مقام پر تھا۔ وہ گاڑی سے اتر گئے اور دوپہر تک وادی کے حسین مناظر دیکھتے رہے، کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا اور دوبارہ گھومنے پھرنے لگے۔ انہوں نے ایک خوبصورت مقام پر کچھ تصویریں بنائیں یہ جگہ کچھ سنسان سی تھی اور یہاں بہت کم لوگ آئے تھے ان سے کچھ دور ایک چٹان پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو کہ بڑی دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے اپنے حلیے سے بھی وہ لوگ کچھ مشکوک دکھائی دے رہے تھے انھیں دیکھ کر

عمران ان دونوں [illegible] اور ان سے ان کی گفتگو
سننے کا پروگرام بنایا۔ پھر تینوں مختلف زاویوں سے
تصویریں بناتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ عمران
نے پہلا جملہ سنا"

"باس تمہاری بے پروائی سے بہت تنگ ہے کل شام پانچ بجے میں یہیں پر مال لے کر پہنچ جاؤں گا"۔ ان کے قریب پہنچتے ہی وہ دونوں شخص خاموش ہو گئے۔

"یار جلدی کرو، ہمارے تو کھڑے کھڑے پاؤں سن ہو گئے ہیں۔" عدنان نے تھکاوٹ کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"بس ذرا ایک منٹ۔ ذرا سا ادھر ہو جاؤ۔"

پھر عمران نے کھٹ سے تصویر کھینچ لی۔

دونوں شخص اب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ دور تک دونوں ساتھ چلتے رہے، پھر مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔

عمران کا ذہن اس جملے میں الجھا ہوا تھا۔

"یار تم کس سوچ میں کھو گئے؟" کامران نے عمران کا کندھا جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں چلو، ہوٹل چل کر بتا دوں گا۔" تینوں اوس کی بجائے ہوٹل روانہ ہو گئے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد تینوں انہی دونوں مشکوک آدمیوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

"یہ بات تو طے ہے کہ وہ لوگ ضرور کوئی غیر قانونی کام کرتے ہیں۔" عمران نے کہا۔

"اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ ہم غیر قانونی کام کرنے والوں کا ناک میں دم کر دیتے ہیں۔" عدنان نے اکڑ کر کہا۔

تینوں کے درمیان یہ طے پایا کہ کل شام پانچ بجے پھر وہ پر جائیں گے۔

☆

انسپکٹر خاور ان دنوں ایک نہایت اہم کیس پر کام کر

[illegible] ہے مجھے چھوڑ دے کوئی [illegible] معلوم کرے جعلی [illegible]
کا کاروبار کر رہا تھا مگر اسی کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔
خاور اس وقت اسی کیس کی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے
فون کی گھنٹی بج پڑی۔

"ہیلو انسپکٹر خاور اسپیکنگ۔" انہوں نے ریسیور کانوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب میں شیخ اینڈ سنز موٹر شوروم کا مالک شیخ جمال بول رہا ہوں کچھ ہی دیر پہلے شوروم میں ایک شخص گاڑی کی خریداری کے لیے آیا۔ جب اس نے پیسوں کی ادائیگی کی تو اس وقت بینک کا ایک ملازم بھی وہاں موجود تھا اس نے یہ نوٹ دیکھے تو پتا چلا کہ تمام نوٹ جعلی ہیں۔ اس شخص کو پکڑ لیا گیا ہے۔ آپ فوراً شوروم پہنچ جائیے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

آپ بالکل فکر نہ کریں میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔" انسپکٹر خاور نے کہا اور ریسیور رکھ کر دفتر سے نکل گئے۔

پندرہ منٹ بعد انسپکٹر خاور شوروم پہنچ چکے تھے۔ ملزم کو گرفتار کر لیا گیا انسپکٹر خاور ضروری کاروائی پوری کرنے کے بعد پولیس اسٹیشن روانہ ہو گئے۔

تفتیش کے دوران ملزم اسلم نے بتایا کہ اسے نہیں معلوم جعلی نوٹ چھاپنے والے کون لوگ ہیں۔ تقریباً دو ماہ پہلے بس اسٹاپ پر میری ملاقات سلطان نامی ایک شخص سے ہو گئی تھی میں ان دنوں بے روزگار تھا اور نوکری کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ اس شخص نے مجھے نوکری دلوانے کا وعدہ کیا اور کل اسی جگہ دوبارہ ملنے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے دن میں حسب وعدہ بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص بھی آ گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں لے آیا۔ اس نے ایک ہزار روپے مجھے ایڈوانس دیے اور کہا کہ میری نوکری پکی ہو گئی ہے۔

وہ میرے ذریعے اپنے پیسوں سے مختلف سامان کی خریداری کرواتا تھا۔ اب تک میں اس کے لیے کئی گاڑیاں اور دوسری چیزیں خرید چکا ہوں۔

یہ تمام تفصیل سننے کے بعد انسپکٹر خاور نے سلطان تک پہنچنے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ وہ اسلم کے میک اپ میں دوسرے روز ٹھیک پانچ بجے الفیل ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد ہی سلطان کے حلیے کا ایک شخص ہوٹل میں داخل ہوا۔ انسپکٹر خاور یہ یقین کرنے کے لیے کہ سلطان ہے' ذرا انجان بن کر بیٹھے رہے وہ شخص سیدھا انسپکٹر خاور کے قریب چلا گیا۔

ہاں بھئی اسلم! کیا رپورٹ ہے؟ کیا گاڑی کی خریداری ہو گئی؟" سلطان نے پوچھا۔

انسپکٹر خاور کو جب یقین ہو گیا کہ یہ ہی شخص سلطان ہے تو انھوں نے آنکھ سے سادہ کپڑوں میں ملبوس سپاہیوں کو اشارہ کر دیا اور کئی سپاہی دوڑتے ہوئے ——

سلطان کے قریب پہنچ گئے اور اسے قابو میں کر لیا۔ سلطان یہ دیکھ کر پہلے تو دنگ رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا تھ تیزی سے جیب کی طرف بڑھا اور اس نے کوئی چیز نکال ر نگل لی۔ یہ زہر کا کیپسول تھا زہر نے فوراً ہی اپنا کام یا سلطان زمین پر بے سدھ گر پڑا اور اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکلنے لگے کچھ دیر بعد وہ ختم ہو گیا۔

دوسرے روز عمران کامران اور عدنان تینوں تیار ہو سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے لیکن آج ان کا دل سیر کرنے نکل نہیں چاہ رہا تھا۔ ان پر تو بس کل والے واقعے کے ے میں جاننے کا بھوت سوار تھا۔ دوپہر تک انھوں نے پسند کی تمام جگہیں دیکھ لیں اور پھر شام پانچ بجے کل جگہ پر پہنچ گئے جہاں انھوں نے دو مشکوک آدمیوں کو یکھا تھا وہ ضرور کوئی غیر قانونی کام کرتے تھے۔ مگر کیا تے تھے۔ یہ انھیں معلوم کرنا تھا۔

ابھی تک وہاں دونوں میں سے کوئی شخص نہیں پہنچا تھا نہ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان میں یک آتا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا اسی چٹان پر بیٹھ گیا۔ [illegible] اس کا دوسرا ساتھی بھی پہنچ گیا جس نے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک بریف کیس تھام رکھا تھا۔

عمران' کامران اور عدنان تینوں قریب ہی جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ان کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دونوں بڑی دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے —— اس دوران عمران نے کیمرے سے ان کی کئی تصویریں بھی بنا لیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں شخص اٹھ کھڑے ہوئے۔ بریف کیس والے شخص نے بریف کیس اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دونوں کچھ دور ساتھ چلتے رہے پھر الگ راستوں پر روانہ ہو گئے۔

عمران' کامران اور عدنان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عمران اس بریف کیس والے شخص کے تعاقب میں اور کامران اور عدنان اس کے دوسرے ساتھی کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ عمران یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس بریف کیس میں کیا ہے جو اس کے ساتھی نے اسے دیا ہے۔

شام کا اندھیرا بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ اب بریف کیس والے شخص نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ ایک سنسان سی جگہ پر عمران ایک لمبا چکر کاٹ کر سامنے سے ہو کر آتے ہوئے اس شخص سے ٹکرا گیا اور بریف کیس اس شخص کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ عمران نے بریف کیس اٹھانے کے لیے چھلانگ لگائی مگر فوراً اس شخص نے ٹانگ اڑا دی۔ عمران دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ وہ شخص دوبارہ بریف کیس اٹھانے کے لیے دوڑا۔ اس بار عمران نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ پھنسا دی اور پھر —— دونوں کے درمیان زور آزمائی شروع ہو گئی —— اس کشمکش میں بریف کیس کھل گیا اور چاروں طرف لال لال نوٹوں کی گڈیاں بکھر گئیں نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر عمران کا ذہن فوراً اخبار کی اس خبر کی طرف گیا کہ ایک نامعلوم گروہ جعلی نوٹ چھاپنے کا کاروبار کر رہا ہے۔ وہ شخص عمران کو دھکا دے کر بھاگ نکلا۔ عمران نے نوٹوں کی گڈیوں کو غور سے دیکھا وہ واقعی نقلی نوٹ تھے۔

عمران نے اس شخص کو کافی تلاش کیا مگر وہ تو نجانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ عمران نے نوٹوں کی گڈیاں بریف کیس میں بھریں اور ہوٹل روانہ ہو گیا۔



کامران اور عدنان مسلسل اس شخص کا تعاقب کر رہے تھے اب وہ پر فضا مقام سے نکل کر ایک پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ایک پہاڑی پر ایک پرانی عمارت نظر آئی جو باہر سے کھنڈر معلوم ہوتی تھی۔ وہ شخص پہاڑی پر چڑھ کر اس عمارت میں داخل ہو گیا۔

کامران اور عدنان ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپے ہوئے اسے عمارت میں داخل ہوتا دیکھ رہے تھے اس شخص کے اندر جانے کے بعد کامران اور عدنان بھی عمارت میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک بہت پرانی عمارت تھی دیواروں میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے۔ وہ شخص نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

کامران اور عدنان نے پوری عمارت کی تلاشی لی مگر عمارت بالکل خالی تھی۔ انھیں یہاں سے ایسی کوئی چیز نہ ملی جس سے پتا چل سکتا کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور ایک شخص بوکھلایا ہوا عمارت میں داخل ہوا۔ کامران اور عدنان نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے تعاقب میں عمران گیا تھا۔

"یار یہ اتنا بوکھلایا ہوا کیوں ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں بریف کیس بھی نہیں ہے"۔ عدنان نے کامران سے سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے' عمران نے ضرور اپنا کام دکھایا ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہ معلوم کرنا چاہیے کہ یہاں کیا ہوتا ہے کیونکہ عمران ہمارا انتظار کر رہا ہو گا"۔

اس شخص نے چھت پر لگے ہوئے ایک ہک کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ کمرے فرش کا ایک حصہ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا اور نیچے کی طرف سیڑھیاں جاتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ وہ شخص اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ جلدی میں اس نے تہ خانے کا دروازہ بھی بند نہ کیا۔ اس شخص کے بعد کامران اور عدنان بھی آہستہ آہستہ تہ خانے میں داخل ہو گئے۔ کامران اور عدنان سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے تو انھیں ایک کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا!

"نخورے! ایک معمولی سے لڑکے نے تم لوگوں سے بھرا بریف کیس کیسے چھین لیا؟"

"باس! وہ لڑکا اندھیرے میں اچانک مجھ سے ٹکرا گیا۔ بریف کیس کھل گیا اور تمام نوٹ بکھر گئے۔ میں پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ آیا"۔ ایک اور آواز سنائی دی۔

"بس بس ہم کوئی صفائی سننا نہیں چاہتے۔ ہم تمہیں اس لیے تو نہیں رکھتے کہ کوئی سرپھرا لڑکا تم سے چھین کر لے جائے" باس کی غصے بھری آواز سنائی دی۔

کامران اور عدنان یہ تمام گفتگو دروازے کے ساتھ کان لگا کر سن رہے تھے پھر وہ یہ جان کر چونک پڑے کہ یہ لوگ نوٹ چھاپنے کا کاروبار کرتے ہیں۔

کامران اور عدنان جلدی سے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے اور ایک بڑے کمرے میں داخل ہو گئے جہاں بڑی بڑی مشینیں نصب تھیں جن پر جعلی نوٹ چھاپے جاتے تھے۔

"ہمیں اب یہاں سے نکل چلنا چاہیے کیونکہ اصل مسئلہ تو ہم حل کر ہی چکے ہیں" عدنان نے کہا۔

ابھی یہ دونوں گفتگو کر ہی رہے تھے ایک پہرے دار اس طرف نکل آیا مگر اسے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس سے آواز کے انداز سے ڈنڈا گھمایا جو عدنان کے سر پر لگا اور اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا جبکہ کامران اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکلا اور بھاگا

عمارت سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا پھر اس نے ہوٹل کی طرف دوڑ لگا دی۔

*

عمران نے ہوٹل پہنچتے ہی ٹیلی فون پر اپنے والد انسپکٹر خاور کو اس واقعے کی اطلاع دے دی۔

کچھ دیر بعد، انسپکٹر خاور بھی ارجنٹ پرواز سے ہوٹل پہنچ گئے اور پولیس کے کئی دستوں کے ساتھ کامران کی رہنمائی میں اس کھنڈر نما عمارت کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔

*

پولیس نے پوری عمارت کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا، انسپکٹر خاور پولیس کے دستے کے ساتھ عمارت میں داخل ہو گئے

....

کامران نے تہ خانے کی نشاندہی کی۔ انسپکٹر خاور پولیس کے ہمراہ تہ خانے میں داخل ہو گئے مگر وہ جونہی تہ خانے میں داخل ہوئے، ان پر گولیوں کی بارش ہو گئی انسپکٹر خاور اور پولیس کے عملے نے فوراً پوزیشنیں سنبھال لیں اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔

دونوں طرف سے گولیوں کا تبادلہ کافی، دیر جاری رہا مگر پھر پولیس نے ان پر قابو پا لیا اس مقابلے میں گروہ کے کئی آدمی مارے گئے۔ باس نے جب اپنے آدمیوں کو بے بس ہوتے دیکھا تو ایک خفیہ راستے سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن انسپکٹر خاور کی نظر اس پر پڑ گئی۔

انسپکٹر خاور نے باس پر چھلانگ لگا دی دونوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی باس نے انسپکٹر خاور کا گلا دبانے کی کوشش کی انسپکٹر خاور نے ایک زوردار گھونسا باس کی کنپٹی پر مارا جس سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ انسپکٹر خاور نے اپنی ٹانگوں کی مدد سے باس کو دور اچھال دیا باس سیدھا جا کر سامنے کی دیوار سے ٹکرایا اور بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ انسپکٹر خاور نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے نقاب نوچ لی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے ان کے سامنے شیخ اینڈ سنز موٹر شوروم کے مالک سیٹھ جمال کا چہرہ تھا۔

*

دوسری شام انسپکٹر خاور چاروں طرف سے اخباری نمائندوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے اور اس کیس کی تفصیلات بتا رہے تھے۔

"دراصل اس گروہ کا سرغنہ شیخ اینڈ سنز موٹر شو روم کا مالک شیخ جمال تھا۔ اس نے اپنے آدمی سلطان کے ذریعے کئی لوگوں کو ملازم رکھا جو ان کے لیے کام کرتے تھے۔ ان میں اسلم بھی شامل تھا جب اسلم کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ جعلی نوٹ چھاپنے کا کاروبار کرتے ہیں تو اس نے کام کرنے سے انکار کر دیا مگر سلطان نے اسلم کو اس کی بیوی بچوں کے قتل کی دھمکی دی اور پھر اسلم کام کرنے پر مجبور ہو گیا شیخ جمال گروہ کے سرغنہ نے سوچا اب چونکہ اسلم کو پتا چل چکا ہے کہ یہ لوگ جعلی نوٹوں کا کاروبار کرتے ہیں تو وہ کسی بھی وقت ان کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے اس لیے انہوں نے ایک چال چلی اور اسلم کو ایک کار کی خریداری کے سلسلے میں اپنے ہی شوروم میں بھجوایا اور اسے پولیس کے ہاتھوں گرفتار بھی کروا دیا۔ اسے میں نے ہی گرفتار کیا تھا جب ہم نے اسلم کے ذریعے سلطان پر ہاتھ ڈالا تو اس نے زہریلا کیپسول کھا کر خودکشی کر لی اور یہ کہانی وہیں ختم ہو گئی، اصل مجرم قانون کی نظروں سے بچا رہا۔ مگر ہم نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اس کیس کے سلجھانے میں عمران کامران اور عدنان کا بہت بڑا ہاتھ ہے جن کے ذریعے ہمیں ان لوگوں کا سراغ ملا"۔

اس وقت ان کے درمیان عمران، کامران اور عدنان بھی موجود تھے جن کی فوٹوگرافر دھڑادھڑ تصویریں بنانے میں مصروف تھے۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے "مبارک مبارک" کے الفاظ گونجنے لگے۔



ہم کئی ناموں سے جانے جاتے ہیں

آپ کی من پسند چیزوں میں سے کچھ کے نام ہیں — ماڈرن بریڈ
ماڈرن فروٹی، رسیکا، شکر اور ڈبل روٹی! آپ کی اتنی بہت سی
من پسند چیزیں صرف ایک گھرانہ بناتا ہے۔ اس گھرانے کا نام ہے
— ماڈرن فوڈ انڈسٹریز (انڈیا) لمیٹڈ — ایک گھرانہ جو اس سچائی پر یقین
رکھتا ہے کہ اچھی صحت اور اچھا مزہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اس
بات پر حیرانی مت ہو کہ اس گھرانے کی تیار کردہ یہ تمام من پسند
چیزیں مزیدار ہی نہیں، ستھری، صحت بخش اور غذائیت سے بھرپور
بھی ہیں۔

اس گھرانے کا ایمان ہے — غذائیت کی کمی کا خاتمہ اور آپ کے
لیے مزیدار صحت بخش غذائی اشیاء کی فراہمی۔
ہم سرکار کے غذائی منصوبوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

MODERN FOOD INDUSTRIES (INDIA) LTD.
(A GOVERNMENT OF INDIA ENTERPRISE)

Regd. Office: NALIKA BHAWAN, 3RD FLOOR,
R.K. PURAM, RING ROAD, NEW DELHI-110066

Units: AHMEDABAD - BANGALORE - BOMBAY -
BHAGALPUR - CALCUTTA - CHANDIGARH - COCHIN
DELHI - FARIDABAD - HYDERABAD - INDORE -
JAIPUR - KANPUR - MADRAS - RANCHI - UJJAIN -

وہ اذان

ارشاد محمد شیخ

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی۔ حضورؐ کا جب وصال ہو گیا تو آپؓ مدینے کی گلیوں میں یہ کہتے پھرتے تھے، "لوگو! تم نے کہیں رسول اللہؐ کو دیکھا ہے؟ دیکھا ہے تو مجھے بھی دکھا دو یا مجھے آپؐ کا پتا بتا دو۔" پھر آپؓ اسی غم ہجر میں مدینے کو چھوڑ کر ملکِ شام کے شہر حلب چلے گئے۔ ایک سال بعد آپؓ نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا۔ حضورؐ نے آپ سے فرمایا:

"اے بلالؓ! تو نے ہم سے ملنا کیوں چھوڑ دیا؟ کیا تمھارا دل ہم سے ملنے کو نہیں چاہتا"۔

حضرت بلالؓ یہ خواب دیکھ کر، لَبَّیْکَ یَاسَیِّدِیْ۔ اے آقا غلام حاضر ہے"، کہتے ہوئے اُٹھے اور اسی وقت رات ہی کو اونٹنی پر سوار ہو کر مدینے کو چل پڑے۔ رات دن چل کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ حضرت بلالؓ پہلے سیدھے مسجد نبویؐ میں پہنچے اور حضورؐ کو ڈھونڈا مگر حضورؐ اُن کو نہ مل سکے۔ پھر حجروں میں تلاش کیا۔ جب وہاں بھی نہ ملے تب مزارِ انور پر حاضر ہوئے اور رو کر عرض کیا: "یارسول اللہؐ! حلب سے غلام کو یہ کہہ کر بلا لیا کہ ہم سے مل جاؤ اور جب بلال زیارت کے لیے حاضر ہوا تب حضورؐ پردے میں چھپ گئے۔" یہ کہہ کر آپ بے ہوش ہو کر وہیں گر گئے۔ بہت دیر بعد جب آپؓ کو ہوش آیا تو لوگ روضۂ اقدس سے اُٹھا کر باہر لائے۔ اس عرصے میں بلالؓ کے آنے کا سارے مدینے میں غل ہو چکا تھا۔ سب نے مل کر حضرت بلالؓ سے بڑی محبت سے درخواست کی کہ ایک بار پھر وہ اذان سُنا دیں جو رسول اللہؐ کو سناتے تھے۔ حضرت بلالؓ فرمانے لگے، "دوستو! یہ بات میری طاقت سے باہر ہے، کیوں کہ میں جب حضورؐ کی اس دُنیاوی زندگی میں اذان کہا کرتا تھا تو جس وقت "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللهِ" کہتا تھا تو رسول اللہؐ کو سامنے آنکھوں سے دیکھ لیتا تھا۔ اب بتاؤ کہ کیسے دیکھوں گا؟ مجھے اس خدمت سے معاف رکھو۔" ہر چند لوگوں نے اصرار کیا، مگر حضرت بلالؓ نے انکار ہی کیا۔ بعض صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ بلالؓ کسی کا کہنا نہیں مانیں گے۔ کسی کو بھیج کر حضرت حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کو بلایا جائے۔ اگر وہ حضرت بلالؓ سے اذان کی فرمائش کریں گے تو بلالؓ ضرور مان جائیں گے، کیوں کہ حضورؐ کے اہل بیت سے بلالؓ کو عشق ہے۔ یہ

سُن کر ایک صاحب جاکر حضرت حسنؓ و حسینؓ کو بلا لائے۔ حضرت حسنؓ و حسینؓ نے آکر بلالؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، "اے بلالؓ! آج ہمیں بھی وہی اذان سُنا دو جو ہمارے نانا جان کو سُنایا کرتے تھے۔" حضرت بلالؓ نے امام حسینؓ کو گود میں اُٹھا کر کہا، "تم میرے محبوب کے کلیجے کے ٹکڑے ہو، نبیؐ کے باغ کے پھول ہو۔ جو کچھ تم کہوگے، منظور کروں گا۔ تمھیں رنجیدہ نہ کروں گا۔" اور پھر فرمایا، "حسینؓ، مجھے لے چلو جہاں کہوگے اذان دے دوں گا۔" حضرت حسینؓ نے بلالؓ کا ہاتھ پکڑ کر آپؓ کو مسجد کی چھت پر کھڑا کر دیا۔ بلالؓ نے اذان دینی شروع کی۔ اللہ اکبر! مدینہ منورہ میں یہ وقت عجب غم و صدمے کا وقت تھا۔ حضورؐ کو وصال فرمائے ہوئے ایک زمانہ ہوا تھا۔ آج مہینوں بعد اذانِ بلالؓ کی آواز سُن کر حضورؐ کی دنیاوی حیاتِ مبارک کا سماں بندھ گیا۔ بلالؓ کی آواز سن کر مدینہ منورہ کے بازار گلی کوچوں سے لوگ مسجد میں جمع ہوگئے۔ ہر شخص گھر سے نکل آیا۔ پردے والی عورتیں پردے سے باہر آگئیں۔ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے آئیں۔ جس وقت حضرت بلالؓ نے اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ منھ سے نکالا۔ ہزارہا چیخیں ایک دم نکلیں۔ عجیب رقّت انگیز سماں تھا۔ عورتیں روتی تھیں۔ ننھے ننھے بچّے اپنی ماؤں سے پوچھتے تھے کہ رسول اللہؐ کے موذن آگئے، مگر حضورؐ مدینہ کب تشریف لائیں گے؟ حضرت بلالؓ نے جب اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰہ منھ سے نکالا اور حضورؐ کو آنکھوں سے نہ دیکھا تو حضورؐ کے غمِ ہجر میں بے ہوش ہو کر گر گئے اور بہت دیر بعد ہوش میں آکر اُٹھے اور روتے ہوئے واپس مُلکِ شام چلے گئے۔

ماں کی دُعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبری اور کلام کے لیے چنا۔ آپ جب کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے کلام کے لیے جاتے تو آپ کی سلامتی کی دعا آپ کی ماں کے مقدس لبوں پر ہوتی تھی۔

والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد جب آپ کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے جارہے تھے تو غیب سے آواز آئی: "اے موسیٰ، ذرا سنبھل کے! اب تمھارے لیے دعا کرنے والے لب خاموش ہیں۔"

مرسلہ: درخشاں خانم



گپ شپ

ایک گدھے کی طنز و مزاح سے بھرپور روداد

کیا ایسا انٹرویو آپ نے پہلے کہیں پڑھا؟

ابنِ شہباز خان



بات یہ نہیں ہے کہ ہمیں کوئی معقول انسان دستیاب نہیں ہو سکا یا ہم انسانوں کے انٹرویو کرتے کرتے بیزار ہو کر حیوان کے پاس چلے آئے۔ بات اصل میں کچھ یوں ہے کہ ہمارے خیال میں حیوانوں کے بھی کچھ جذبات 'احساسات' مشاہدات خیالات وغیرہ ہوتے ہیں اور ان خیالوں کو اپنے پیاروں... مطلب قارئین تک پہنچانا ہم نے اپنا فرض جانا اور جا پہنچے ایک شریف' معقول اور با ادب گدھے کے پاس جسے کچھ نا معقول لوگ "کھوتا" بھی کہتے ہیں۔ مگر بات یہ ہے نا' کہ گدھا تو گدھا ہی ہوتا ہے' چاہے آپ اسے کچھ بھی کہہ لیں اور لطف تو یہ ہے کہ یہ بے چارہ شریف النفس حیوان آپ کے کسی خطاب کا برا بھی نہیں مانتا۔ !

ہم جس گدھے کے پاس گئے' وہ موجو صاحب کے پاس رہتے ہیں اور ایک گدھا گاڑی کھینچتے ہیں۔ ویسے گدھا گاڑی بالکل غلط نام ہے۔ ہمارے خیال میں اس گدھے کی گاڑی ہونا چاہیے۔ خیر' یہ ان کا مسئلہ ہے کہ پاس گدھا یا گاڑی ہے۔ بہرحال' قصہ مختصر۔ ہم۔ انٹرویو شروع کرتے ہوئے قلم سنبھالا اور پہلا سوال اچھالا۔

ہم۔ سب سے پہلے تو آپ اپنا اصلی نام بتایئے۔

وہ۔ ارے صاحب! کیا عرض کروں۔ اپنا اصل نام خود میں بھی بھول گیا ہوں۔ لوگوں نے اتنے نام رکھ چھوڑے ہیں میرے کہ ان ناموں کے انبار تلے مجھے خود اپنے آپ کو ڈھونڈنا مشکل ہو گیا ہے۔ ویسے والدین۔ میرا نام راجا رکھا تھا۔ (یہ سن کر ہم نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی!)

ہم۔ آپ موجو صاحب کے ہاتھ کیسے آئے؟

وہ۔ آہ! . . یہ کیا پوچھ لیا آپ نے؟ (گدھے نے کسی ظلم زدہ لڑکے کے انداز میں کہا) یہ ایک انتہائی المناک اور دردناک داستان ہے۔ بس قصہ مختصر یوں ہے کہ میں ایک حسین اور خوبصورت گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہاں میں اپنے بہن بھائیوں اور دوست احباب کے ساتھ نہایت آرام و سکون سے رہ رہا تھا۔ جب کچھ بڑا ہوا اور کام کرنے کے قابل ہو گیا تو میرے مالک نے مجھے شہر لا کر بیچ دیا۔ ان دنوں موجو کا اپنا گدھا بیمار تھا۔ اس نے اس کی جگہ مجھے گاڑی میں باندھا۔ میں اتنا تیز رفتار اور ہوشیار گدھا ثابت ہوا کہ اس نے اپنے بیمار گدھے کو بیچ دیا اور میں اس کا "لاڈلا" بن گیا۔ آج کل میرا نام لاڈلا ہے۔

ہم۔ آپ نے کچھ تعلیم وغیرہ بھی حاصل کی ہے؟

وہ۔ جی ہاں!

ہم۔ کیا! یعنی آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ تعلیم یافتہ گدھے ہیں؟

وہ۔ کیا مطلب ہے' آپ کا۔ آپ میری توہین کر رہے ہیں' مجھے تعلیم یافتہ گدھا کہہ کر۔ یہ انسانوں کو کہا جاتا ہے۔ گدھوں کو نہیں۔ (مسٹر لاڈلا ایک دم ہی بگڑ گئے)

ہم۔ اوہ' آئی ایم سوری۔ اچھا' آپ اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ فرما رہے تھے؟

وہ۔ جی ہاں۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے گاؤں میں ایک مدرسہ تھا۔ میں اکثر اس کے قریب گھاس چرنے جاتا تھا تو وہاں مولوی صاحب بچوں کو جو پڑھاتے تھے' وہ میں یاد کر لیتا تھا۔ ماشاء اللہ میری داشت کافی اچھی ہے! (مسٹر لاڈلا اپنے منہ میاں مٹھو بننے لگے)

ہم۔ داشت نہیں مسٹر لاڈلا یادداشت! (ہم نے ان کی تصحیح کی)

وہ۔ دیکھیں صاحب! آپ یوں دخل اندازی کریں گے تو میں آپ کو انٹرویو نہیں دوں گا۔ میری مرضی ہے کہ میں داشت کہوں یا نگہداشت۔ میری جگہ اگر کوئی انسان ہوتا اور حسن اتفاق سے وہ اداکار بھی ہوتا پھر تو آپ بلا چوں وچرا اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر میری باتوں میں کیڑے نکال رہے ہیں۔

ہم۔ ارے ارے' مسٹر لاڈلا۔ آپ تو برا مان گئے۔ چلیے' اب آپ کو کچھ بات نہیں بتاؤں گا۔ ابھی آپ نے کہا کہ آپ مدرسے میں پڑھایا جانے والا سبق سنتے تھے۔ ذرا چھ کا پہاڑہ تو سنایئے؟

وہ۔ آں ڈھینچوں ڈھینچوں . . . . ڈھاں ڈھاں ڈھینچوں!

ہم۔ بس بس صاحب! بس کیجئے۔ یہ بہت ہے۔ اچھا یہ بتایئے' آپ کو غذا کیسی ملتی ہے؟ میرا مطلب خالص ہوتی ہے یا ؟

وہ۔ ارے صاحب! خالص چیزیں جب انسانوں کو نہیں ملتیں تو ہم حیوانوں کو کیوں کر ملیں گی۔ آپ انسان ہی تو چیزوں میں ملاوٹ کرتے ہیں اور ہمارا چارہ آپ لوگ ہی بناتے ہیں اس لئے وہ خالص کہاں ہو سکتا ہے۔ اس میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے۔ خدا آپ لوگوں کو نیک ہدایت دے! (مسٹر لاڈلا نے دعائیہ انداز میں کہا اور ہم شرمندہ ہو گئے)

ہم۔ کیا موجو صاحب آپ کو گھمانے یا سیر کرانے کے لئے لے جاتے ہیں؟

وہ۔ جی جناب! ایک بار وہ مجھے کلفٹن لے گیا تھا مگر وہاں شریر لڑکوں نے میرا مذاق اڑایا اور مجھ سے شرارتیں کرنا شروع کر دیں۔ آخر آپ انسان لوگ کسی کو چین سے رہنے کیوں نہیں دیتے؟

ہم۔ دیکھئے مسٹر لاڈلا! یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ کو ہماری ذاتیات پر حملہ آور ہونے کا حق نہیں ہے۔

وہ۔ اچھا اچھا' جھگڑا کرنے کا پروگرام مت بنائیں۔ میں امن پسند گدھا ہوں۔

ہم۔ یہ بتایئے آپ کو بچے کیسے لگتے ہیں؟

وہ۔ آپ انسانوں کے یا ہمارے؟

ہم۔ اپنے بچے تو آپ کو اچھے ہی لگتے ہوں گے۔ میں انسانوں کے بچوں کی بات کر رہا ہوں۔ !

دہ۔ ارے صاحب! آپ انسان کا ہو یا حیوان کا۔ مجھے تو ہر بچہ اچھا لگتا ہے۔ اور انسانوں کے بچے تو بہت پیارے ہوتے ہیں۔ وہ کیسے اچھے نہیں لگیں گے۔ آپ انسانوں کو چاہیے کہ بچوں کے ساتھ پیار' محبت اور شفقت سے پیش آئیں اور ان کے ننھے ننھے جذبات کا خیال رکھیں۔

ہم۔ واہ بھئی۔ انسان کے بچوں کے لیے تو آپ کے دل میں بڑی محبت ہے۔ اب یہ بتائیں' آپ کو کس قسم کا لباس اور کھانا پسند ہے؟

دہ۔ مجھے بڑا ارمان ہے کہ اپنے ملک کا قومی لباس پہنوں۔ مگر افسوس! میری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی۔ خیر امید پر دنیا قائم ہے۔ میں نے متعلقہ قومی ادارے میں درخواست دی ہوئی ہے کہ صرف ایک روز کے لیے ہی سہی' میری یہ خواہش پوری کر دی جائے۔ جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو مجھے گوبھی کا پھول' مولی' گاجر اور ہری ہری تازہ گھاس کھانا بہت اچھا لگتا ہے۔

ہم۔ آپ کو کبھی بہت زیادہ خوشی ملی ہے؟

دہ۔ جی ہاں۔ جب ہماری برادری پر فلم بنائی گئی تھی "انسان اور گدھا"۔ تو میں نے خوشی کے مارے آٹھ آدمیوں کو دولتیاں جھاڑیں اور گھر کے صحن میں مٹی پر خوب لوٹنیاں لگائیں۔ اس کے علاوہ میں سینما بھی گیا مگر وہاں کسی نے گھسنے نہیں دیا۔ اسی وقت ہماری برادری نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم اپنے لیے ایک الگ سینما کا مطالبہ کریں۔ کیونکہ انسان کے ساتھ فلم دیکھتے ہوئے ہمارا استحقاق مجروح ہوتا ہے۔ لیکن پھر کافی غور و خوض کے بعد ہم نے یہ مطالبہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ صرف ایک فلم کے لیے الگ سینما کا مطالبہ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اور اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت ہمارا وہ فیصلہ نہایت دانش مندانہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد سے جتنی بھی فلمیں ریلیز ہوئیں' وہ سب انسانوں کے معیار کی ہیں۔ اور ہمارے لیے قطعی ناقابلِ قبول ہیں۔

ہم۔ آپ میری یہ الجھن دور کر دیجیے کہ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے "تم تو ایسے غائب ہو گئے' جیسے گدھے کے سر سے سینگ!" [illegible] میں کتنی سچائی ہے اور اس کی تاریخ کیا ہے؟

دہ۔ جی ہاں۔ یہ بات بالکل سچ ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے لکڑدادا' پڑدادا وغیرہ کے سینگ ہوا کرتے تھے۔ مگر ہوا یوں کہ اس زمانے کے بادشاہ نے ہماری برادری سے ایک سوال پوچھا کہ جب تمہارے آباؤ اجداد میں سے ایک بزرگ کو پھول سونگھنے کو دیا گیا تو اس نے سونگھنے کی بجائے اسے کھا کیوں لیا؟... بس جناب! ہمارے بزرگ دن رات اس سوال کا جواب سوچتے رہے' سوچتے رہے۔ یہاں تک کہ فکر و غم سے ان کے سینگ جھڑ گئے۔ کیونکہ سر پر آپ لوگوں کی طرح بال تو تھے نہیں! (مسٹر لاڈلا غم زدہ ہو گئے)

ہم۔ آخر تھے نا گدھے! (ہم نے زیر لب کہا' جسے وہ نہ سن سکے۔ ہم نے اگلا سوال کیا)

اکثر جب کوئی شخص بے وقوفی کر جاتا ہے تو اسے گدھا کہتے ہیں۔ تو آپ کو اس بات سے دکھ پہنچتا ہے؟

دہ۔ جی ہاں صاحب! بہت دکھ پہنچتا ہے۔ ہم کوئی بے وقوف مخلوق تو نہیں ہیں جو کسی بے وقوف انسان کو ہم سے منسوب کر لیا جاتا ہے۔ یہ تو ہماری سراسر توہین ہے۔ کیونکہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ عقلمند ہم ہی ہیں۔ یقین نہ آئے تو مثال دیتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں میں سے ایک بزرگ پر کوئی تاجر نمک کی بوریاں لاد کر لے جاتا تھا' جس کی وجہ سے اس کا چلنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ ایک دن وہ ندی پار کرتے ہوئے پانی میں ہی بیٹھ گیا۔ جس کی وجہ سے سارا نمک پگھل کر بہہ گیا اور اسے بوجھ سے نجات مل گئی۔ کتنا عقلمند تھا' ہمارا بزرگ! (یہ کہہ کر مسٹر لاڈلا زور زور سے ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے ہنسنے لگے۔ ہمارے دل میں تو آیا کہ انہیں اس واقعے کا دوسرا حصہ بھی سنانے کو کہیں مگر مصلحتاً خاموش رہے)

ہم۔ آپ ٹی وی بھی دیکھتے ہوں گے۔ آپ کے پسندیدہ پروگرام؟

... حیران ہوں کہ یہ بہت سے انسانوں [illegible] پسند ہے۔ جبکہ میرے خیال میں یہ پروگرام صرف ہمارے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ جانوروں کی دستاویزی فلم بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ انگلش فلمیں بڑے شوق سے دیکھتا ہوں!

ہم۔ تو کیا وہ آپ کی سمجھ میں آجاتی ہیں؟ (ہم نے حیرت سے پوچھا)

وہ۔ ارے اسی لیے تو شوق سے دیکھتا ہوں کہ نہ سر سمجھ میں آتا ہے، نہ پیر۔! (مسٹر لاڈلا اپنی تھوتھنی ہمارے کان کے قریب لاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولے)

ہم۔ آپ کو کوئی شکایت ہے؟

وہ۔ کس سے؟

ہم۔ ارے بھئی ہم انسانوں سے!

وہ۔ ارے جانے دیجیے صاحب! کوئی ایک شکایت ہو تو کہوں۔ یہاں تو شکایتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ آپ لوگ جب خود ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں تو ہم تو ٹھہرے جانور۔ ہم تو کسی شمار قطار میں ہی نہیں ہیں۔

ہم۔ تو آپ اس سلسلے میں کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

وہ۔ جی ہاں ۔ خیال تو ذہن میں ہے کہ ایک "انجمن برائے حقوق کھوتاں" بنائی جائے۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ ایسی ہی بے شمار انجمنیں اور تنظیمیں تو آپ انسانوں نے بھی بنا رکھی ہیں۔ جب آپ لوگ انسان ہوتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائے تو ہم بیچارے حیوان کس طرح کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

ہم۔ اچھا یہ بتائیے۔ آپ کی کوئی خواہش ہے؟

وہ۔ ارے صاحب! ایک ہی تو خواہش ہے کہ مجھے آزادی مل جائے۔ تاکہ میں دوبارہ آزادی سے گھوم پھر سکوں۔ سبزے پر دوڑ سکوں۔ تازہ اور خالص گھاس کھا سکوں، لیکن کیا کروں بھائی !

ہم۔ دیکھیے مسٹر لاڈلا! یہ آپ کی انتہائی زیادتی ہے۔ آپ بھائی کہہ رہے ہیں (ہم نے درمیان سے ہی ان کی بات کاٹ دی)

وہ۔ ارے کیا بات کرتے ہیں آپ۔ جب آپ لوگ انسان، کو گدھا اور وقت پڑنے پر ہمیں اپنا باپ بنا سکتے ہیں تو کیا ہم آپ کو بھائی نہیں کہہ سکتے! ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ آزاد ہونے کی خواہش تو بے شک ہے، مگر وہی بات ہے کہ خواہش تو کی جا سکتی ہے، لیکن اس کا پورا ہونا ضروری نہیں۔ دیکھیں، اب میری خواہش کب پوری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی اور کبھی نہ کبھی وہ دن بھی ضرور آئے گا جب جمہوری طریقوں پر ہمیں بھی آزاد کر دیا جائے گا۔

ہم۔ تو کیا موجو صاحب آپ کو آزاد کر دیں گے؟

وہ۔ وہ کم بخت بھلا مجھے کیوں آزاد کرنے لگا۔ میرا بس چلے تو اسے اتنی دولتیاں رسید کروں کہ گدھے کو نانی اماں یاد آجائے ارے باپ رے، وہ تو یہیں آ رہا ہے۔ اچھا جناب! میں تو چلا۔ (یہ کہہ کر مسٹر لاڈلا ایک طرف لپکے)

ہم۔ ارے سنیے تو مسٹر لاڈلا! چند سوال اور ہیں۔ (ہم نے ان سے بھی زیادہ تیزی دکھاتے ہوئے ان کے گلے میں پڑا پٹہ مضبوطی سے پکڑ لیا)

وہ۔ ارے بھاڑ میں گئے، تمہارے سوال اور خود تم! میری چمڑی ادھڑوانے کا ارادہ ہے کیا؟ (یہ کہتے ہی مسٹر لاڈلا نے ہمیں دو تین زور دار دولتیاں رسید کیں اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے لگے۔ اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے ہم نے جب اٹھ کر ارد گرد نظر دوڑائی تو ان کا دور دور تک پتا نہ تھا)

"کم بخت ایسے غائب ہو گیا، جیسے گدھے کے سر سے سینگ!!" ہم بڑبڑاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔!!



مُسکراتے رہو



★ ایک دفعہ ایک صاحب تربیلا ڈیم دیکھنے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے دوسرے ساتھی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے بولے، "کیا زمانہ آگیا ہے۔ کوئی چیز خالص نہیں ملتی۔ ایک پانی خالص تھا مگر اب اس میں سے بھی بجلی نکال لی ہے۔"

★ اسلم: داداجان! بچّوں کا اخبار پڑھ کر مجھے بھی دیجیے گا۔

داداجان: بیٹا، یہ تمھارے پڑھنے کی چیز نہیں یہ تو بچّوں کا اخبار ہے۔

مرسلہ: مجیب ظفر انوار،

★ ہوٹل میں بہت گرمی تھی۔ ایک گاہک نے اپنا کوٹ ایک جگہ ٹانگ دیا اور اس پر ایک پرچہ لگا دیا کہ کوئی میرا کوٹ نہ چُرائے۔ میں باکسنگ کا عالمی چیمپئن ہوں۔" تھوڑی دیر بعد دیکھا تو کوٹ غائب تھا اور دوسرے پرچے پر تحریر تھا:

"کوئی مجھے پکڑنے کی کوشش نہ کرے میں بھی دوڑ کا عالمی چیمپئن ہوں۔"

مرسلہ: طارق وہاب

★ امتحان میں سوال آیا، "ثابت کریں کہ زمین گول ہے۔" ایک لڑکے نے جواب لکھا:

"جی زمین گول ہے۔ کھڑے ہو کر دیکھیں تو زمین گول ہے۔ بیٹھ کر دیکھیں تو زمین گول ہے۔ چھت پر سے دیکھیں تو زمین گول ہے۔ سائکل پر چڑھ کر دیکھیں تو زمین گول ہے۔ جی، اگر زمین گول ہے تو پھر یہ گول ہے۔"

ممتحن نے پرچہ دیکھتے ہوئے لکھا: "برخوردار، عینک لگا کر دیکھو یا اُتار کر دیکھو، نمبر بھی گول ہے۔"

مرسلہ: طاہرہ سلطانہ

★ ایک شخص کو ہر بات پر اعتراض کرنے کی عادت تھی۔ ایک دن وہ گھر آئے تو انھیں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہ آئی۔ بہت جھنجھلائے۔ اچانک ان کی نظر بیوی پر پڑی۔ بولے، "بیگم، بہت فضول خرچ ہوتی

چار ہی کا ہو۔"

بیگم نے پوچھا، "وہ کیسے؟"

وہ صاحب جھینپ کر بولے، "بھئی جب ایک چوٹی سے کام چل سکتا تھا تو دو چوٹیوں کی کیا ضرورت تھی۔"

مرسلہ: بابر سلیم

★ ایک فقیر نے ایک آدمی سے پیسے مانگے تو اس آدمی نے کہا، "میں اپنی داڑھی پر تین مرتبہ ہاتھ پھیرتا ہوں۔ جتنے بال میرے ہاتھ میں آئیں گے اتنے ہی روپے میں تمھیں دے دوں گا۔" اس آدمی نے تین بار اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، لیکن کوئی بھی بال ہاتھ نہ آیا تو وہ فقیر سے بولا، "تیری قسمت میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

فقیر بولا، "یوں نہیں حضور، داڑھی آپ کی اور ہاتھ میرا۔ پھر دیکھیے میری قسمت۔"

★ ایک شخص نے جیب کترے کو عین اس وقت پکڑ لیا جب وہ جیب کاٹ کر فرار ہو رہا تھا۔ اس شخص نے کہا، "تمھیں شرم نہیں آتی میری جیب کاٹتے ہوئے۔"

"شرم تو آپ کو آنی چاہیے۔ اتنا قیمتی سوٹ پہن رکھا ہے، مگر جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں۔" جیب کترا بولا۔ مرسلہ: محمد سجاد اصغر

★ ایک دن مُلّا نصر الدین سے لوگوں نے کہا، "مُلّا آپ اپنے کو ولی کہتے ہیں، کوئی ثبوت تو دیں۔" مُلّا کہنے لگے، "میں جس چیز کو بھی بُلاتا ہوں وہ میرے پاس آجاتی ہے۔"

لوگوں نے مُلّا سے کہا، "اچھا یہ جو سامنے درخت ہے، آپ اس کو اپنے پاس بُلائیں تو جانیں۔" مُلّا نے درخت کو تین دفعہ اپنے پاس آنے کا حکم دیا۔ جب درخت نہیں آیا تو خود اُٹھ کر درخت کے پاس چلے گئے۔ لوگوں نے کہا، "آپ درخت کے پاس کیوں چلے گئے؟"

مُلّا نے جواب دیا، "ولیوں میں غرور نہیں ہوتا جب درخت ہمارے پاس نہیں آیا تو ہم خود چلے گئے۔" مرسلہ: ایس نعیم الدین نجمی

★ باپ نے اپنے سست اور کاہل بیٹے سے کہا "اب میں تمھارے لیے ایسا انتظام کروں گا کہ بٹن دباتے ہی ہر چیز تمھارے سامنے حاضر ہو جائے گی، جیسے ہی بٹن دباؤ گے کھانا آجائے گا، بٹن دباتے ہی جوتے تمھارے سامنے آجائیں گے، بٹن دباتے ہی....."

"لیکن ڈیڈی،" لڑکے نے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "یہ بٹن دبائے گا کون؟"

مرسلہ: ارسلا خاں

★ گاہک: (دُکان دار سے) مجھے غالب کے خطوط درکار ہیں۔

دُکان دار: خطوط کے لیے سامنے ڈاک خانے سے رجوع کیجیے۔

مرسلہ: بُشریٰ ظفر انوار

★ ڈاکٹر: (نوکر سے) "دیکھو اکرام، باہر کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟"

اکرام: "حضور کوئی مریض ہوگا۔"

ڈاکٹر: "جاؤ معلوم کرکے آؤ مریض نیا ہے یا پرانا؟"

اکرام: "جناب، نیا ہی ہوگا، پرانا مریض تو ہمارے ہاں کبھی واپس ہی نہیں آیا۔"

مرسلہ: زوبار یہ شاہین

★ ایک کنجوس کی بیوی مرنے کے قریب تھی۔ کئی دن وہ اپنی بیوی کے سرہانے بیٹھا رہا آخر ایک دن یہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا:

"میں کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہوں، جلد آجاؤں گا، اگر میری غیر موجودگی میں خدانخواستہ موت آجائے تو مرنے سے پہلے لیمپ اور ہیٹر بجھا دینا۔"

مرسلہ: عظمیٰ کریم

★ ایک لیڈر صاحب جن کا ایک کان کسی حادثے میں کٹ گیا تھا۔ ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ دورانِ تقریر وہ سینے پر ہاتھ مار کر بڑے جوش سے بولے،

"میں قوم کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

مجمع میں سے آواز آئی:

"صاحب، کن کٹے کی قربانی جائز نہیں۔"

مرسلہ: محمد معیض الدین

★ تیز کار چلانے کے جرم میں جج نے ایک مالدار شخص کو جو سزا دی وہ پانچ سو رُپے جرمانہ یا پندرہ روز قید تھی۔ مجرم نے قید کو قبول کیا اور پانچ سو رُپے جرمانے کی ادائیگی پسند نہ کی۔ لوگوں کو پتا چلا تو وہ اسے کنجوسی کا طعنہ دینے لگے۔ مال دار شخص نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، "بھئی آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔ دراصل میری بیوی نے مجھے بتا دیا تھا کہ نیا باورچی پندرہ روز کے بعد آئے گا۔"

★ لندن میں ایک اسٹیج ڈراما مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔ ایک سال پہلے لوگوں کو اس کے ٹکٹ بُک کرانے پڑتے تھے۔ ایک صاحب تھیٹر ہال میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوئے کہ ان کے برابر کی سیٹ پر ایک خاتون بیٹھی ہیں اور اس سے اگلی سیٹ خالی ہے۔ ان صاحب نے خاتون سے خالی سیٹ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی،

"جناب، یہ سیٹ میرے خاوند کے لیے بک تھی، لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

وہ صاحب ازراہِ ہمدردی بولے، "تو پھر آپ کو یہ ٹکٹ اپنے کسی دوست یا رشتے دار کو دے دینا چاہیے تھا۔"

خاتون بولی، "مجبوری تھی جناب، کیوں کہ آج سب لوگ میرے خاوند کے کفن دفن میں مصروف ہیں۔"

مرسلہ: سید غضنفر رضا


"ہائے مر گیا میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ جگہ کم ہے۔ اتنے بڑے صندوق کو اوپر نہ رکھیے گر جائے گا، لیکن آپ نے....."
"ارے بھائی صاحب سفر میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ اتنا افسوس نہ کریں سامان میں ٹوٹنے والی کوئی چیز نہیں ہے!"


"کریمو منے کو بہت سردی لگ رہی تھی۔ بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ بستر چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟"
"صاحب! ان کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اُن کے آرام کے لیے انہیں بڑے بابو کے ساتھ لٹا دیا ہے۔ بڑے بابو کا بدن بخار سے آگ کی طرح تپ رہا ہے"



یہ پتھر کون توڑے گا

معراج

رحمت بابا ایک بہت بوڑھا اور کم زور شخص تھا۔ وہ بہت دُور کسی جگہ سے یہاں رہنے کے لیے آیا تھا۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اس نے اپنی جوانی میں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ اس کے سب دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ جسم پر جگہ جگہ داغ تھے۔ اپنی بیماری اور دُکھ درد کے باوجود وہ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔

ایک دن جاوید چپکے سے اس کے باغ میں گُھس گیا اور پھل توڑنے لگا۔ بابا رحمت نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے وہیں سے للکارا۔ جاوید نے بھاگنا چاہا، لیکن وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ بابا رحمت نے اُسے اُٹھایا اور ہاتھ سے پکڑ کر اسے باغ سے باہر چھوڑ آیا۔

جاوید شرم اور ڈر کی وجہ سے بھاگتا چلا گیا۔ وہ راستہ بُھول کر جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہ بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ آخر وہ تھکن سے چُور چُور ہو گیا۔ وہ ایک لال رنگ کے

پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پتھر بے حد گرم ہو رہا تھا۔ جاوید کھڑا ہو گیا اور غور سے پتھر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ جاوید نے پتھر کو بہت اچھی طرح سے صاف کیا اور اس پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس تحریر کے آخر میں ایک مُہر لگی ہوئی تھی۔ یہ مُہر بھی بہت عجیب تھی۔ اس میں دائرے اور بیل کی شکل بنی ہوئی تھی بہت دیر بعد تحریر کا مطلب اس کی سمجھ میں آگیا۔ پتھر پر لکھا ہُوا تھا:

"جو کوئی اس پتھر کو ٹیلے پر لے جا کر توڑ دے گا، اس کے بچپن کا زمانہ پھر لَوٹ آئے گا۔"

جاوید سوچنے لگا کہ کیا یہ بات صحیح ہے یا کسی نے مذاق کیا ہے؟ آخر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ پتھر جادو کا ہے اور اس پر لکھی ہوئی تحریر بالکل سچ ہے۔ اس نے دیکھا کہ بابا رحمت اپنے سَر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے اسے ایک قدم چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا کھانسی سے بُرا حال ہو رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

جاوید کو بابا رحمت پر بہت ترس آیا۔ اس نے سوچا کہ بابا رحمت ایک قابلِ رحم شخص ہے۔ اگر یہ اپنے بچپن کے زمانے میں پہنچ جائے تو اس کی سب بیماریاں، بڑھاپا اور کمزوری ختم ہو جائے گی۔

جاوید دوڑتا ہُوا بابا رحمت کے پاس پہنچا۔ اس نے بوڑھے کو پتھر کی تحریر کے متعلق بتایا اور کہا: "اگر تم اس پتھر کو پہاڑی کے اوپر لے جا کر توڑ دو گے تو تمھارے سب دُکھ درد دور ہو جائیں گے اور تم پھر اپنے بچپن کے زمانے میں پہنچ جاؤ گے۔"

بابا کھانس کر بولا: "اس پتھر کو اٹھانا اور ٹیلے کی چوٹی پر پہنچانا میرے بس کا روگ نہیں ہے، ہاں اگر تم اس پتھر کو ٹیلے پر پہنچا دو تو میں شام کے وقت آؤں گا اور اسے توڑ دوں گا۔"
جاوید یہ بات سُن کر بہت مایوس ہوا۔ بوڑھے بابا رحمت کا خراب حال دیکھ کر اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بولا: "یہ پتھر بہت بھاری لگتا ہے لیکن میں اسے آپ کی خاطر ٹیلے کی چوٹی پر پہنچا دوں گا۔ آج شام آپ ضرور آئیے گا۔"
جاوید اپنے گھر گیا۔ اس نے ایک بوری لی پھر وہ دوبارہ جنگل میں گیا۔ اس نے بہت مشکل

سے پتھر کو اٹھا کر بوری میں رکھا اور اسے کھینچتا ہُوا ٹیلے کی چوٹی پر لے گیا۔ اس کوشش میں وہ پسینے سے شرابور ہوگیا اور اس کے کپڑے خراب ہوگئے۔ جب وہ ٹیلے پر پہنچا تو وہ بُری طرح تھک گیا تھا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

وہاں سے ایک شخص گزر رہا تھا۔ وہ کسی اخبار میں رپورٹر تھا۔ وہ جاوید کو دیکھ کر ٹھیر گیا اور پوچھنے لگا: "کیوں بھئی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" جاوید نے اسے عجیب پتھر اور اس کی پُراسرار تحریر کے متعلق بتایا۔ اخبار کے رپورٹر نے کہا: "تم نے اس پتھر کے متعلق جو کچھ بتایا ہے، اس پر کوئی مشکل سے ہی یقین کر سکتا ہے۔" جاوید نے کہا: "میری بات کا سچ یا جھوٹ پرکھنے کے لیے اس پتھر کو ہاتھ لگا کر دیکھ لیجیے"۔

اخباری رپورٹر نے جُوں ہی پتھر کو ہاتھ لگایا وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹا۔ پتھر بے حد گرم ہو رہا تھا۔ وہ بولا: "مجھے تمھاری بات سو فی صد درست معلوم ہوتی ہے"۔

اُس نے پتھر پر لکھی ہوئی تحریر کو بلند آواز سے پڑھا: "جو کوئی اس پتھر کو توڑ دے گا اس کے بچپن کا زمانہ پھر لوٹ آئے گا۔" وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے جاوید سے پُوچھا: "کیوں میاں! تم اس پتھر کو کیوں نہیں توڑ ڈالتے؟"

جاوید اس سوال پر سٹپٹا گیا۔ اسے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا، جب اس کے والد نے اسے پہلی جماعت میں داخل کروایا تھا تو اسے سبق یاد نہ کرنے پر روزانہ مار پڑتی تھی، دوسری جماعت میں ماسٹر فضل کریم روزانہ کان کھینچتے تھے، تیسری جماعت میں پہاڑے یاد نہ کرنے پر پٹائی ہوتی تھی۔

جاوید بولا: "جی میں یہ غلطی نہیں کر سکتا۔ اگر میں اس پتھر کو توڑوں گا تو پھر مجھے پہلی جماعت میں داخل ہونا پڑے گا، سبق یاد کرنا اور پہاڑے رٹنا پڑیں گے۔ اگر پتھر توڑنے کے بعد میری عمر اچانک پندرہ یا سولہ برس ہو جاتی تب تو کوئی بات بھی تھی۔ میں پڑھے لکھے بغیر ہی دسویں جماعت پاس کر لیتا"۔

اخباری رپورٹر قہقہہ لگا کر بولا: "ٹھیک، بالکل ٹھیک"۔

اسی وقت بابا رحمت بھی کھانستا کھنکارتا ہُوا وہاں آپہنچا۔ جاوید نے کہا: "بابا، تم اپنے ساتھ نہ کوئی ہتھوڑا لائے ہو اور نہ کوئی لوہے کی سلاخ۔ آخر تم پتھر کو کیسے توڑو گے؟"

بابا رحمت بولا: "میرے بچّے! میں اس پتھر کو توڑنا نہیں چاہتا ۔ مجھے نئے سرے سے زندگی شروع کرنا منظور نہیں ہے۔"

جاوید نے پوچھا: "وہ کیوں بابا؟" بابا رحمت جاوید کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا: "بیٹا، اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دن بے کار ضائع نہیں کیے۔ میں نے انگریزوں کے خلاف مظاہروں میں حصّہ لیا۔ میں ایک جلوس کی قیادت کر رہا تھا، جب میری ٹانگ میں گولی لگی۔ میں گرفتار کر لیا گیا اور جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہاں میرے اوپر بہت سخت مظالم کیے گئے۔ میرا ایک ایک دانت اکھیڑا گیا، جسم کو گرم لوہے سے داغا گیا۔ بیٹا! آزادی حاصل کرنے کے لیے بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ آخر غلامی کا دور ختم ہوا اور ہمیں آزادی نصیب ہوئی۔"

یہ کہہ کر بوڑھا دیر تک کھانستا رہا، پھر بولا: "ارے نادان! مجھے زندگی کا سفر دوبارہ شروع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میری زندگی کا سفر تو اب ختم ہونے والا ہے"۔

جاوید مایوس ہو کر بولا: "میں نے خواہ مخواہ اتنی مشقّت کی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ پتھر وہیں پڑا رہتا"۔

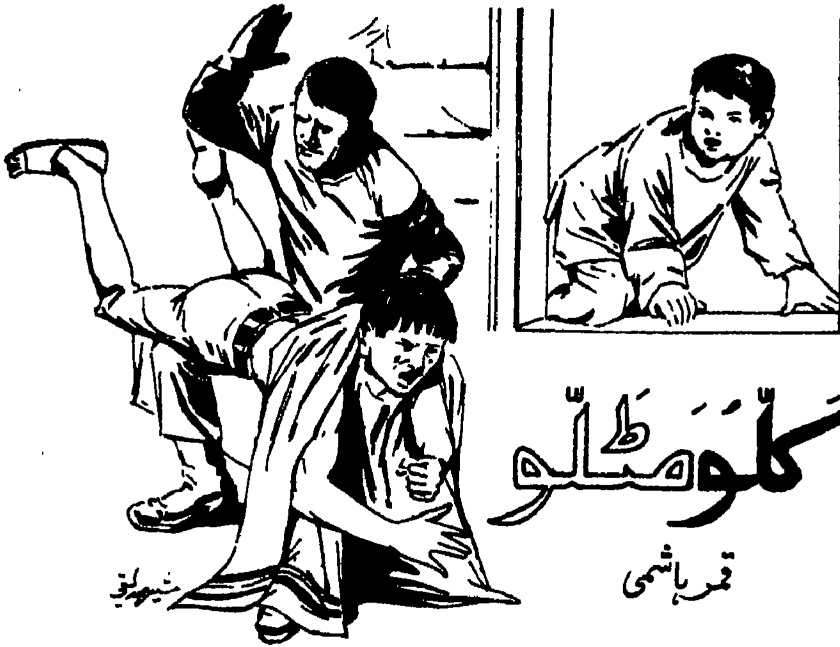
رپورٹر ہنس کر بولا: "نہیں میاں، تم نے ٹھیک ہی کیا کہ اس پتھر کو یہاں سب کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اب تم دیکھتے جاؤ کہ کیا تماشا ہوتا ہے۔"

اگلے دن اخبار میں لال پتھر کے متعلق خبر چھپی: "پہاڑی پر ایک لال رنگ کا پتھر پڑا ہوا ہے۔ کوئی شخص اسے توڑنے کی جرات نہیں کر سکتا"۔

تم نے بھی وہ خبر پڑھی ہو گی۔ میں بھی وہاں گیا تھا۔ میں بہت دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ لوگ وہاں جوق در جوق آتے رہے۔ وہ پتھر کو چھو کر دیکھتے۔ دیر تک اپنے ماضی کو کریدتے رہتے۔ آخر سر ہلاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو جاتے۔ ماضی کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ "کیا اچھے دن تھے۔ کاش! ہمارا وہی زمانہ لوٹ آئے"۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ

"دُور کے ڈھول سُہانے"۔





کلّو مٹلّو

قمر ہاشمی

ایک تھے کلّو دوجے مٹلّو
تھام کے دونوں ماں کا پلّو
قسمیں کھاتے رہتے تھے
مار کے صدمے سہتے تھے
بھائی پٹائی کرتے تھے
باپ سے کچھ کچھ ڈرتے تھے
پیار سے سمجھاتی تھی ماں
دیر سے کیوں آتے ہو میاں
عقل کے ناخن لو کلّو
تم بھی سُن لو میاں مٹلّو

پھر روز اسکول سے گھر
گھر کی لے گا کون خبر
باپ آتے ہیں شام کے وقت
تم بھی غائب کام کے وقت
دونوں عقل کے کورے تھے
دونوں گوشت کے بورے تھے
ڈٹ کر کھاتے صبح و شام
کوئی نہ کرتا گھر کے کام
گھر کے لوگ پریشاں تھے
دونوں کتنے ناداں تھے
خاک پڑی تھی عقلوں پر
چربی چڑھی تھی جسموں پر
باپ نے اِک دِن یوں دُھنکا
سارا نشّہ اُترا اُن کا
بھاگا مار سے سَر کا بھُوت
بھُول گئے وہ سب کرتوت
گھر کے اچھے بچّے بنے
کلّو مٹلّو سچّے بنے
کم کم ایسی شرارت ہو
جس میں تھوڑی آفت ہو
ہم بھی شرارت کرتے تھے
باپ سے ماں سے ڈرتے تھے
سب سے پیار محبّت تھی
سب کی دل میں عزّت تھی

سردی کے موسم میں لحاف چوری ہو جائے تو؟

پچھلے دنوں ہمارے محمد عمران جعفری نے ایک سروے کیا۔ ان کے دوستوں نے ان کے سوال کے جو جوابات دیے وہ ذیل میں ان کی تحریر میں دیے جا رہے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

محمد اشرف:۔ سب سے پہلے ہم محمد اشرف صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے سوال کیا تو جواب ملا۔ اگر ہمارا لحاف چوری ہو گا تو دوسرے دن ہمیں نمونیہ بھی ہو گا اور پھر تیسرے دن کچھ اور بھی ہو گا۔

سلمان جعفری:۔ ہم سے ایسے سوال نہ پوچھا کریں جس کا جواب دینے کے لیے دماغ کی ضرورت پڑے۔

توصیف بابر:۔ ہمارے ننھے دوست نے جواب دیا۔ پروا نہیں ہم تو ابو کے ساتھ سو جائیں گے۔

کامران جعفری:۔ باورچی خانے کے تینوں چولھے جلا دیں گے اور وہیں بستر لگا لیں گے۔

فضل اللہ:۔ ہمارے سوئم کے چنے آپ کو ضرور ملیں گے۔

محمد ارشد:۔ ہیٹر جلا دیں گے اور چادر اوڑھ کر ہیٹر کے قریب بیٹھ جائیں گے۔

حسنان جعفری:۔ رپورٹ درج کرائیں گے اور اسی وقت ایک نیا لحاف بھی لے آئیں گے۔

اسحاق محسن:۔ نہیں چوری ہو گا کیوں کہ آپ جوں ہی ہمارے گھر آتے ہیں۔ ہمارے گھر کے تمام افراد آپ پر نظر رکھتے ہیں۔

محمود مہندی:۔ کوئی بات نہیں چوری ہو جائے۔ تو ہو جائے ہمارے پاس ایک لحاف اور بھی ہے۔

اور آپ بھی اپنے دوستوں سے درجِ ذیل سوال کا جواب لکھ کر بھجوائیں۔

اگر آپ کو اسکول پہنچ کر یاد آئے، کہ آپ کھانے کا ڈبا گھر ہی بھول آئے تو؟





● جج۔ (چور سے) تم نے جوہری کی دکان سے زیور چرائے تھے۔

چور: جی ہاں۔

جج۔ مگر کیوں۔

چور۔ کیونکہ جوہری کی دکان کے شوکیس پر لکھا تھا۔ اس سنہرے موقع کا فائدہ اٹھائیے۔

(افتخار احمد۔ ٹانڈہ ضلع فیض آباد)

● چار گنجے بن بلائے مہمان بنکر ایک دعوت میں پہنچ گئے اور میزبان سے کہنے لگے "واہ کیا شاندار محفل ہے۔" میزبان نے ان کے گنجے سروں کو دیکھتے ہوئے کہا "جی ہاں۔ اور پھر آپ نے آکر تو ہماری محفل میں چار چاند لگا دیے ہیں۔"

(ذیشان حیدر، ٹیلر ہاؤس نئی دلی ۲۵)

● ایک دفعہ کسی قصائی کی دکان پر سے ایک کتا گوشت کا ٹکڑا اٹھا لے گیا قصائی ایک وکیل کے پاس پہنچا کہنے لگا کیوں حضور اگر کسی کا کتا میری دکان سے گوشت کا ٹکڑا اٹھا لے جائے تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ اس کے مالک سے دام وصول کر لو۔ قصائی نے کہا تو آپ ایک روپیہ ادا کیجئے یہ کتا آپ ہی کا تھا وکیل نے کہا ٹھیک ہے مگر پہلے تو اس مشورے کی فیس پانچ روپے دے دیجیے میں اس سے کم نہیں لیتا

(ذیشان حیدر۔ محلہ فخر بادرہ نوگاواں (یوپی))

● راہ گیر۔ بابو جی آپ کی گھڑی میں کیا بجا۔

بابو جی۔ آج اتوار ہے جناب اس لیے میری گھڑی بند ہے۔ (نوشاد بانو۔ نعمت اللہ)

● انا۔ باورچی سے۔ میں نے سنا ہے کہ تم شیخی بہت بگھارتے ہو اچھی بات نہیں ہے۔

باورچی۔ حضور میں دال اکثر بگھارتا ہوں شیخی نہیں۔

● مالک ڈرائیور سے کیوں جی کار کیوں روک دی۔ ڈرائیور۔ جی آگے گڑھا ہے۔

مالک۔ تو سوچتے کیا ہو ہارن بجا دو۔

(ریحانہ بانو۔ جامع مسجد۔ مانا ضلع اکولہ)

● ایک کنجوس کسی کی دعوت نہیں کرتا تھا ایک دفعہ اس کا نوکر بازار سے گزر رہا تھا کہ کنجوس آدمی کا دوست ملا اس نے نوکر سے پوچھا۔ "تمہارا مالک ہماری دعوت کب کرے گا" نوکر بولا جناب وہ روز محشر ہوگا جب مالک دعوت کرے گا" کنجوس کے دوست نے کنجوس کو نوکر کا کہا سنا دیا مالک نے نوکر کو

بلا کر پوچھا "تم سے دعوت کا دن مقرر کرنے کو کس نے کہا تھا؟"

شبانہ نقوی امروہوی

● مریض۔ (نرس سے) مجھے کونسی خواب آور دوا دی جائے گی۔ نرس۔ کوئی نہیں۔

مریض۔ (حیرت سے) کوئی نہیں تو مجھے نیند کیسے آئے گی۔ نرس۔ آج ٹی وی پر ڈرامہ آئے گا۔ ہم نے آپ کے بیڈ کے سامنے ایک ٹیلیویژن سیٹ آن کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ اسے دیکھیے بہت اچھی نیند آجائے گی۔

ذیشان حیدر عابدی۔ ٹبلہ ہاؤس نئی دہلی ۲۵

خاتون۔ (پڑوسن سے) یہ گلی اتنی گندی ہے کہ جب بچے کھیل کر آتے ہیں تو کیچڑ اور مٹی میں لت پت ہوتے ہیں۔

پڑوسن۔ تم اپنے بچے کو باہر جانے سے منع کیوں نہیں کرتیں۔ اس کا منہ دھلانے میں تمہیں بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہوگا۔

پڑوسن۔ اور کیا بہن! ابھی کل ہی کی بات ہے مجھے پورے بیس بچوں کے منہ دھلانے پڑے تب کہیں جاکر مجھے پتا چلا کہ ان میں سے میرا بچہ کون سا ہے۔

عباس حیدر۔ حسن پور۔ یو۔ پی

- بچہ۔ امی میں نہر میں ضرور نہاؤں گا۔ (ماں نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانا)

ماں۔ (غصہ میں) اگر ڈوب گئے تو گھر میں نہیں آنے دے گی۔

رانا حیدر۔ امروہوی

● ایک افیمی سو رہا تھا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو بیل مل گیا وہ اس کو لے کر خوشی خوشی روانہ ہوا کچھ دور ایک آدمی ملا اس نے کہا کہ بیل بیچو گے اس نے کہا ضرور تم اس کا کیا دوگے۔

خریدار نے کہا پانچ روپے افیمی نے کہا بھاگ جا کبھی پانچ روپے میں بیل ملا ہے اس کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی نہ وہاں خریدار اور نہ بیل جلدی سے آنکھیں بند کر کے چلانے لگا کہ بھائی مجھے سودا منظور ہے پانچ روپے ہی دے دو۔

رئیسہ زیدی جامعہ نگر نئی دہلی

● کسی ملک کا حکمراں انتہائی ظالم تھا عوام اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے یہ بات اسے خود بھی معلوم تھی ایک دن وہ ہیلی کاپٹر پر بیٹھا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ملک کا فضائی دورہ کر رہا تھا اچانک اسے ایک بات سوجھی کہنے لگا کیوں نہ میں سو کا نوٹ نیچے پھینکوں تاکہ جس کو ملے وہ مجھ سے خوش ہو پھر خود ہی بولا کہ نہیں پچاس کے دو نوٹ پھینکتا ہوں تاکہ دو آدمی خوش ہوں اس کی یہ باتیں سن کر اس کا ایک ساتھی بولا سر! آپ خود ہی چھلانگ لگا دیں پوری قوم خوش ہو جائے گی۔

ندیم وحید، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

پیاری بچیوں کے لیے

چانپ

اشیاء:- چانپ تلنے کے لیے قصاب سے خاص طور پر بنوائیں، آدھ سیر مسٹرڈ، چائے کی آدھی چمچی کے برابر۔ پیاز ایک عدد، ہری مرچ چھ عدد۔ ہرا دھنیا حسب ذائقہ اور گھی آدھ پاؤ۔

ترکیب: مسٹرڈ کو ذرا سے پانی میں خوب ملا لیں۔ اس میں چانپ کو ڈبو دیں۔ تیار شدہ مسٹرڈ اتنا ہونا چاہیے کہ چانپوں کے دونوں طرف اچھی طرح لگ جائے اور تھوڑا سا بہت بچ بھی جائے۔ اس میں پیاز ہری مرچ کاٹ کر ڈال دیجیے۔ اس کو اسی طرح ایک گھنٹہ تک پڑا رہنے دیجیے۔ فرائی پان میں گھی گرم کر لیجیے اور اس میں صرف چانپ ڈال کر ہلکی آنچ پر تلنے جائیں۔ جب چانپ نیم سرخ ہو جائیں تو کٹی ہوئی پیاز، ہری مرچ، ہرا دھنیا بھی ڈال دیجیے۔ تھوڑی دیر تلنے کے بعد دیکھ لیجیے۔ چانپ گل گئی ہوں تو اتار لیجیے۔ نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے ڈھانک دیجیے تاکہ دم میں گل جائیں۔

فرزانہ ادریس۔

سیخ کباب

اشیاء: قیمہ آدھ سیر (بغیر چربی والا) پپیتا دو تولہ۔ گرم مسالا پسا ہوا ایک چائے چمچی۔ ادرک، آدھی چھٹانک۔ پیاز آدھ پا۔ ہری مرچ چند، پتے پودینے کے، ہرا دھنیا، نمک، سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔ گھی، آدھ پا۔ بالائی دودھ کی، آدھ پاؤ۔

ترکیب:- قیمے کو باریک پیس لیں۔ اتنا بار کہ میدے کی طرح ہو جائے (سِل پر پیسیں) اب اس میں سب مسالے باریک پیس کر ملا دیں۔ ادرک اور پیاز بہت باریک کاٹ کر ملائیں۔ ہری مرچ اور دھنیا اور پودینہ کاٹ کر ملا دیں۔ اب اس میں ایک چھٹانک گھی اور بالائی ملا کر ایک گھنٹے تک پڑا رہنے دیں۔ اب سیخوں پر چڑھا کر کوئلوں پر آہستہ آہستہ سرخ کر لیں۔ سرخ کرتے وقت گھی میں روئی ڈبو کر اُن پر لگاتے جائیں۔ سرخ ہونے پر چٹنی اور پیاز اور ٹماٹر کے ساتھ پیش کریں ●●

راحیلہ اختر

یاد رکھیے

اگر آپ کی خریداری نمبر کے سامنے ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی

بچّوں کی کوششیں



یک غلام، جو بادشاہ بن گیا

ناصرالدین ایک بادشاہ کا غلام تھا، شکار کا شوقین تھا۔ ایک روز شکار کھیلنے گیا۔ ہرنی کا ایک بچہ نظر آیا چھوٹا سا بچہ بہت خوب صورت۔ اس نے بچے کو پکڑ لیا۔ اور اس کو گھوڑے پر بٹھا کر چل دیا۔ ہرنی نے دیکھا کہ اس کے بچے کو شکاری نے پکڑ لیا۔ اس کے دل پر بجلی سی گر گئی۔ وہ بہت گھبرائی مگر کیا کرتی۔ مجبور تھی۔ وہ گھوڑے کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ آگے آگے ناصرالدین گھوڑے پر سوار تھا۔ پیچھے پیچھے ہرنی سر جھکائے چل رہی تھی۔

ناصرالدین اُس ننھے بچے کو بار بار دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا وہ سوچ رہا تھا اس کو پیار سے پالوں گا گھر جا کر اپنے بچوں کو دوں گا۔ وہ اُس کے ساتھ ساتھ کھیلا کریں گے۔

تھوڑی دیر بعد ناصرالدین نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ہرنی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے اُداسی اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی ہے بچے کی محبت میں ایسی کھوئی ہوئی ہے کہ اپنی جان کا بھی اس کو خیال نہیں۔ گویا وہ چپکے چپکے ناصرالدین سے کہہ رہی ہے کہ میرے بچے کو پکڑا ہے تو مجھے بھی مار دو۔ بچے کے بغیر میری زندگی بے کار ہے۔

ناصرالدین کو ہرنی پر رحم آ گیا۔ اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔ ماں نے بچے کو چوما چاٹا اور اس کو ساتھ لے کر خوشی خوشی چوکڑیاں بھرتی ہوئی جنگل کی طرف چلی گئی۔

وہ بار بار مڑ کر ناصرالدین کو دیکھ رہی تھی۔ گویا اُس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔

جب ناصرالدین رات کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔

ناصرالدین۔ تمھارا نام اللہ کے یہاں بادشاہوں کی فہرست میں لکھا گیا ہے تمھیں بادشاہت ملے گی۔ مگر دیکھو بادشاہت آزمائش ہوا کرتی ہے۔ جس طرح تم نے

تم ہرن [illegible] کیا ہے اسی طرح بادشاہ
بن کر بھی خدا کی مخلوق پر رحم کرتے رہنا۔
ایسا نہ ہو کہ عیش میں پڑ کر خدا کی مخلوق
کو بھول جاؤ۔

ناصرالدین کا خواب سچا ہوا۔
ناصرالدین بادشاہ بن گیا۔ اس کا پورا نام
امیر ناصرالدین سبکتگین ہے۔

کے۔ سمیہ شگوفہ
آمبور

دنیا کے مسافر

دنیا کے اے مسافر   منزل تیری کدھر ہے
طے کر رہا ہے جو تو   دو دن کا یہ سفر ہے
دنیا کے اے مسافر

ہاتھوں سے تونے اپنے   دفنائے کتنے مُردے
انجام سے تو اپنے   کیوں اتنا بے خبر ہے
دنیا کے اے مسافر

مخمل پہ سونے والے   مٹی پہ سو رہے ہیں
دونوں ہوئے برابر   یہ موت کا اثر ہے
دنیا کے اے مسافر

اِک دن ہے تجھ کو آنا   اِک دن ہے تجھ کو جانا
رکنا نہیں ہے تجھ کو   جاری ترا سفر ہے
دنیا کے اے مسافر

یہ شان دار بنگلے   کچھ کام کے نہیں ہیں
دو گز زمین کا ٹکڑا   چھوٹا سا تیرا گھر ہے
دنیا کے اے مسافر

مرسلہ: کے۔ این شفاعت کوثر
(آمبور)

دل کے زنگ کا علاج

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ دل کو بھی زنگ لگتا ہے جیسا کہ لوہے
کو پانی سے زنگ لگتا ہے۔ پوچھا گیا کہ
دلوں کے زنگ کو دور کرنے والی کیا چیز
ہے؟ آپ نے فرمایا کہ دل کا زنگ اس
طرح دور ہوتا ہے کہ آدمی موت کو بہت
یاد کرے اور دوسرے یہ کہ قرآن کی تلاوت کرے۔

(مشکوٰۃ شریف)

شبنم اوگانوی۔ اوگانواں

اپاہج

ایک شخص جنگل کی طرف جا نکلا کیا دیکھتا
ہے کہ ایک اپاہج لومڑی پڑی ہے لیکن
وہ ہے بڑی موٹی تازی۔ وہ لومڑی کو
دیکھ کر سوچنے لگا یہ لومڑی اتنی موٹی

ہیسے ہو گئی ہے تو چل پھر بھی نہیں سکتی۔
سے رزق کیسے اور کہاں سے ملتا ہے؟
وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ لومڑی اپنے
پ کو گھسیٹ کر ایک گڑھے میں چلی گئی۔
تھوڑی دیر بعد ایک شیر شکار پکڑے ادھر
نکلا۔ لومڑی کے گڑھے کے پاس بیٹھ کر
ھانے لگا۔ اس نے شکار کا تھوڑا بہت
حصہ کھایا اور باقی وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔
شیر کے جانے کے بعد لومڑی فوراً گڑھے
سے نکلی اور بقیہ شکار کھانے لگی۔
وہ شخص یہ دیکھ کر دل ہیں کہنے لگا کہ
گر اللہ تعالیٰ اس اپاہج لومڑی کو جنگل
ہیں رزق دے سکتا ہے تو مجھ جیسے
دمی کو بھی ضرور دے گا۔ یہ سوچ کر وہ
یک جگہ بیٹھ گیا۔

وہ آدمی دو تین دن تو وہاں بھوکا
ی بیٹھا رہا۔ تیسرے دن ایک آدمی اس
رف آ نکلا۔ اس نے پوچھا یہاں کیوں
بیٹھے ہو۔

اس سے سارا حال کہا۔ اس آدمی نے
کہا "اے اللہ کے بندے تو اس اپاہج
لومڑی کی طرح نہیں ہے تو اس بہادر
شیر کی طرح کیوں نہیں بنتا ہے جو خود
شکار کر کے کھاتا ہے اور محتاجوں، بے کسوں
کو بھی کھلاتا ہے" یہ سن کر وہ اٹھا
اور جا کر اپنے کاروبار میں لگ گیا اور پھر وہ
کماتا، خود کھاتا اور دوسروں کو بھی کھلاتا
تھا۔

(مرسلہ:۔ غزالہ فردوس شمع پریدین۔ اوگانواں)

اقوالِ زرّیں

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جلتا چراغ
بجھ گیا تو آپ نے پڑھا۔ انا للہ وانا الیہ
راجعون۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ!
کیا چراغ کا بجھنا بھی کوئی مصیبت ہے
آپ نے فرمایا جی ہاں، جس بات سے
بھی مومن کو دکھ پہنچے وہ مصیبت ہے۔
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا
کہ جس مسلمان کو بھی کوئی قلبی اذیت یا
جسمانی تکلیف، بیماری، رنج، غم اور دکھ
پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی
چبھ جاتا ہے (اور وہ اس پر صبر کرتا ہے)
تو خدا اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا
ہے۔ (بخاری، مسلم)

عنبری ناز۔ اوگانواں

پانچ بیل

دریا گوداوری کے کنارے ایک بہت

بڑا جنگل تھا۔ اس جنگل میں قسم قسم کے درخت اور بے شمار پودے اور جھاڑیاں تھیں۔ جنگل میں دوسرے جانوروں کے علاوہ پانچ بیل بھی رہتے تھے۔ جو ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ یہ سب مل جل کر رہتے تھے۔ لیکن جنگل کے تمام درندوں کی ان پر نظر تھی۔ جب وہ بھی ان پر حملے کی نیت کرتے، پانچوں ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔ اور اپنے تیز نوکیلے سینگوں سے انھیں مار بھگاتے۔ جنگل میں قسم قسم کے پودے پتے اور گھاس کھانے سے پانچوں بیلوں کی صحت خوب اچھی ہو گئی تھی۔ سب ان کی چمکدار کھال، نوکیلے سینگوں اور خوب صورت جسم کو دیکھ کر اُن سے حسد کرتے لیکن ان کی طاقت اور قوت کو مانتے بھی تھے۔ اُن کے دشمنوں کی جب بھی ان پر نظر پڑتی تو اُن کے مُنہ میں پانی بھر آتا۔

آخر ایک دن ان کے دشمنوں نے ایک میٹنگ کی اور ان بیلوں کو چٹ کرنے کی تجویزیں سوچنے لگے۔ سب نے یہ بات مان لی کہ جب تک ان میں اتحاد ہے انھیں شکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میٹنگ میں لومڑی بھی شریک تھی۔ لومڑی بھی ان بیلوں کا گوشت کھانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے ان بیلوں میں پھوٹ ڈالنے کی ٹھانی۔ اگلی صبح وہ گھومتی گھامتی بیلوں کے قریب پہنچی۔ ان میں سے چار اس وقت چر رہے تھے۔ اور ایک اونچی جگہ کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ لومڑی کو آتا دیکھ کر وہ اُس کی طرف مڑا۔ اُسے دیکھ کر لومڑی زمین پر لوٹنے لگی اور بولی۔ "اے جنگل کے بہادر بیل! میں تمھاری دوست ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں اس سے پہلے کبھی تمھارے پاس نہیں آئی۔ اب تمھارے بھلے کی بات تمھیں بتانے آئی ہوں۔ اس بات پر وہ بیل نرم پڑ گیا۔ اور لومڑی کے پاس آ گیا۔

لومڑی نے کہا کہ کل پانی پیتے ہوئے میں نے سُنا کہ تمھارے چاروں بھائی تمھاری شکایت کر رہے تھے کہ تم ان کے حصّے کی گھاس کھا جاتے ہو" غرض لومڑی نے اپنی طرف سے خوب جھوٹی سچی باتیں بنائیں نادان بیل اس کی باتوں میں آ گیا۔ اور رات میں چاروں سے لڑ کر دوسری وادی میں سونے چلا گیا۔ اگلے روز اس نے اسی قسم کی بات دوسرے بیل سے کی۔ اور وہ لڑنے لگا۔ آخر اُن میں سے ایک نے کہا کہ الگ ہونے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارا ایک تھا جو ہم

سے الگ ہو گیا تھا۔ وہ کس حال میں ہے۔ اگر وہ خوش ہے تو ہم بھی الگ ہو جائیں گے۔ وہ چاروں اس کی تلاش میں نکلے تو انہیں اس کی کٹی پھٹی کھال اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ملیں۔ جنہیں لومڑی چبا رہی تھی۔ چاروں نے لومڑی کی چالاکی سمجھ لی اور اس سے پہلے کہ وہ بھاگتی چاروں نے اُسے گھیر کر مار دیا۔ وہ اپنے بھائی کی یاد میں خوب روئے۔ اور آئندہ مل جل کر رہنے کا عہد کیا۔ اس کے بعد انہیں کوئی الگ نہ کر سکا۔ سب کی نظروں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اور سب اُن سے ڈرتے تھے۔ اسی لیے ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ دوسروں کی جھوٹی سچی باتوں پر کبھی یقین نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ خود نہ سن لیں۔ اگر ہم اسی طرح آپس میں مل جل کر اتحاد سے رہیں گے تو دشمن ہمیں تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔

اسرار احمد شیخ سلیم۔ بھساول

نیکی اور احسان

احسان جس کے معنی بھلائی کرنے کے ہیں۔ احسان کی بہت سی صورتیں ہیں۔ احسان کی ایک شکل جو کہ بہت عام ہے وہ یہ کہ کسی دوسرے سے ایسا نیک سلوک کیا جائے جس پر اُس شخص کا دل خوش ہو اور اسے آرام پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔

حق تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ عوف بن مالک صحابیؓ نے آپؐ سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! میں کبھی سفر میں ہوتا ہوں اور کسی کے پاس جاتا ہوں تو وہ میری ضیافت و میزبانی نہیں کرتا کیا میں بھی اُس سے ایسا ہی سلوک کر دوں؟"

تو آپؐ نے فرمایا "نہیں جب وہ تمہارے پاس آئے اس کی مہمان داری کرو۔" (ترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چاہے کوئی بھی شخص مہمان داری نہ کرے "تو ہمیں اُس جیسا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے بلکہ اگر وہ ہمارے پاس آئے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس کی مہمان داری کریں اور اس کو تکلیف نہ دیں۔ حضورؐ کی ساری زندگی لوگوں پر احسان کرتے گزری جس طرح آپ خود بھلائی اور احسان کرتے تھے اسی طرح آپ نے اپنی اُمت کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔ آپ کی تعلیم یہی تھی کہ نیکی نہ کرنے والوں کے ساتھ بھی نیکی و احسان کرو۔

(مرسلہ خلیل جبار آفندی روڈ حیدرآباد)

انڈے کھائے کہ ڈنڈے کھائے

جناب عالی بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں انڈے بہت پسند ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہماری فیمی باجی ہمیں انڈے پکا کر نہیں دیتیں کبھی کبھی امی جان سفارش کر دیتی ہیں تو کھانے کو انڈا مل جاتا ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جمعرات کا دن تھا ہم نے اپنی باجی سے انڈے پکانے کو کہا لیکن ہماری باجی نے بالکل صاف انکار کر دیا۔ اس بات پر ہمیں بہت غصہ آیا اور اپنے بستر پر بیٹھ کر انڈے کھانے کی ترکیب سوچنے لگے۔ ایک دم ہم اپنے بستر سے ایک فٹ اوپر اچھلے اور ہمارے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ دراصل کل جمعہ کے دن ہمارے ہاں رشتہ داروں میں ایک شادی تھی اور ہم سب گھر والوں کو وہاں جانا تھا۔ ہم نے اپنی امی جان کو کہا کہ کل ہم شادی میں نہیں جائیں گے امی جان نے پوچھا کیوں بھئی ہم نے کہا ہم گھر میں بیٹھ کر پڑھائی کریں گے امی جان نے کہا ٹھیک ہے۔ اب تو ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی اور بے چینی سے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اللہ اللہ کر کے صبح ہوئی اور سب گھر والے جانے لگے۔ امی جان نے کہا کہ فریج میں کھانا پڑا ہے کھا لینا جب ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ لوگ جا چکے ہیں تو ہم نے دروازہ بند کیا اور فریج میں سے انڈے لینے کے لیے لپکے اور فرائی پان میں گھی ڈالا اور انڈا توڑنا چاہا۔ یہ کیا انڈا تو زمین پر ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ دراصل ہم نے انڈے کو چٹخانے کے لیے زور سے مارا تھا اور انڈا وہیں کا وہیں ٹوٹ گیا تھا اور خوب خوب بکھر گیا تھا۔ خیر بھاگ کر فریج میں سے ایک اور انڈا لے آئے شوق کی کوئی قیمت نہیں اور پہلے انڈے کی نسبت ذرا ہلکے سے اس پر چمچ مارا پھر یہ کیا مرچیں ہماری آنکھ میں چلی گئیں اور ہم نے فوراً اپنی آنکھ پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے انڈا فرائی پان میں ڈال دیا لیکن ہمیں ہوش ہی نہیں رہا کہ نمک کتنا ڈال رہے ہیں ہم نے غلطی سے نمک ایک چمچ ڈال دیا تھا۔ اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا خیر انڈا تلا اور خوشی خوشی پراٹھے کے ساتھ کھانے لگے لیکن جب پہلا لقمہ لیا تو ہم اپنا منہ طرح طرح کا بنانے لگے پھر ہمیں پتا چلا کہ ہم نے نمک زیادہ ڈال دیا ہے اس کے بعد ایک دم دروازے پر دستک ہوئی اور ہم نے

لپک کر دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ خیر جناب ہماری امی جان اور گھر والے اندر داخل ہوئے پتا چلا کہ امی اپنا پرس گھر پر بھول گئی تھیں وہ لینے آئی ہیں لیکن جب ہماری امی جان نے باورچی خانے کی حالت دیکھی تو وہ ہمارے شادی میں نہ جانے کی وجہ سمجھ گئیں۔ بلکہ انھوں نے اپنا بھی شادی میں جانے کا پروگرام کینسل کر دیا اور ہماری وہ پٹائی کی بلکہ دھنائی کی کہ آپ نہ پوچھیے اور ہم نے انڈے سے توبہ کر لی۔

(شکیل احمد۔ حیدر آباد)

ممالکوں کے صدر اور ان کے وزیر اعظم

ملک	صدر	وزیر اعظم
۱۔ افغانستان	ایم نجیب اللہ	سلطان علی کیشتمند
۲۔ بنگلہ دیش	جنرل ارشاد	عطاء الرحمٰن خاں
۳۔ عراق	صدام حسین	
۴۔ اُردن	شاہ حسین	زید رضائی
۵۔ پاکستان	جنرل ضیاء	محمد جونیجو
۶۔ سعودی عرب	فہد بن عبدالعزیز	ہز نس عبداللہ بن عبدالعزیز
۷۔ تنزانیہ	حاص میاں	رشید کے بابا
۸۔ مصر	حسنی مبارک	علی لوطفی

محمد شاہد علی سیفی ابن امام الدین
درجہ ۶ آہنگراں قصبہ جہانگیر آباد بلند شہر (یوپی)

ذرّے سے آفتاب



۱۔ ہندستان کا بادشاہ۔ قطب الدین ایک معمولی غلام تھا۔
۲۔ علم کا سمندر۔ ودّیا ساگر ایک غریب کا بیٹا تھا۔
۳۔ شاعر انقلاب۔ قاضی نذرالاسلام ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔
۴۔ سنسکرت کا ایک مشہور شاعر۔ کالی داس ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔
۵۔ ہندستان کا دوسرا وزیر اعظم۔ لال بہادر شاستری ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔
۶۔ امریکہ کا مشہور صدر۔ ابراہیم لنکن ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔
۷۔ امریکہ کا مشہور کروڑپتی۔ جان وان میکر معمولی ملازم تھا۔
۸۔ فرانس کا مشہور جنرل بادشاہ۔ نپولین فوج کا ایک معمولی سپاہی تھا۔

۹۔ ریل گاڑی کا موجد۔ جارج اسٹیفن ایک معمولی مزدور کا بیٹا تھا۔

۱۰۔ اسٹیم انجن کا موجد۔ جیمس واٹ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔

۱۱۔ بنگال کا پہلا گورنر۔ لارڈ کلائیو ایسٹ انڈیا کمپنی کا معمولی کلرک تھا۔

۱۲۔ سابق شاہ ایران۔ رضا شاہ پہلوی فوج کا معمولی سپاہی تھا۔

۱۳۔ دنیا کا عظیم ڈراما نویس۔ ولیم شیکسپیر ایک لکڑی فروش کا بیٹا تھا۔

۱۴۔ روسی انقلاب کا سب سے بڑا لیڈر لینن ایک مزدور کا بیٹا تھا۔

(احمد رضا۔ درجہ ہشتم، بی، سی، ایم، او ہائی اسکول کلکتہ ۱۳)

اندھا کون؟

شہر کی معروف سڑک کے بیچ کافی دیر سے پتھر پڑا تھا۔ راہ چلتے لوگ اسے دیکھ کر گزر رہے تھے مگر اسے سڑک سے اٹھا کر ایک طرف کر دینے کی کسی نے کوشش نہیں کی روز کی طرح آج بھی فقیر بابا جیسے کوئی سخی جو اس اندھے کی مدد کرے، کی صدا لگاتا چلا آ رہا تھا اچانک پتھر سے ٹھوکر لگی اور گر پڑا راہ چلتے لوگوں پر گندے پانی کی چھینٹیں پڑیں۔ اندھے ہو دیکھ کر نہیں چلتے ہر طرف سے لوگوں کے کوسنے کی آوازیں آنے لگیں۔

فقیر بابا بڑی مشکل سے اٹھا۔ چند لمحے تو چپ چاپ کھڑا لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہوا ہاں میں اندھا ہوں لیکن میں تو صرف ظاہری اندھا ہوں تم لوگ تو باطنی اندھے بھی ہو جو پتھر مجھے نظر نہ آتا تھا وہ تم دیکھ رہے تھے مگر تم میں سے کسی نے یہ نہ کیا کہ اسے اٹھا کر پرے کر دے۔ فقیر بابا تو چلا گیا لوگ ایک دوسرے سے نظریں چرا کر گزرنے لگے۔

سچ ہے وہ پتھر کوئی اٹھا دیتا تو کم از کم بھلا ہی ہوتا کوئی نقصان تو نہ ہوتا۔

(نعیم اللہ خاں)



جانور۔ آپس میں بھائی بھائی اور ہم؟؟
(بہ شکریہ اسپیکٹو لاہور ۷۸ء)

احمد رشید شیروانی

اتر پردیش میں جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۸۰ء کے نتائج پر اب تک

۷۵ اسکولوں میں ۲۵۸ شیروانی انعامات ۱۹۸۰ء

اگست کے اخیر تک ہمارے پاس اتر پردیش کے جن جونیئر ہائی اسکولوں سے بورڈ امتحان ۱۹۸۰ء کے نتائج آئے ان کے منتخب ہونہار ترین طلبا و طالبات کو الحاج بیگم تارا رشید شیروانی (چیئرمین بھارت سیوا ٹرسٹ، چیئرمین جیب انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے دلی دعاؤں کے ساتھ انعامات بھیجے گئے جونیئر ہائی اسکولوں میں شیروانی انعامات ۱۹۸۰ء جیتنے والے بچوں کی تعداد ۲۵۸ ہو گئی۔ انعامات جیتنے والے طلبا و طالبات کے نام ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

صلاح پور ربواتنو جونیئر ہائی اسکول ضلع الہ آباد

محمد طاہر سلمہٗ، جوش الحسان سلمہٗ، اشفاق محمد سلمہٗ ارشاد حسین سلمہٗ، محمد ذاکر سلمہٗ، محمد حامد سلمہٗ، قیوم احمد سلمہٗ، رشید احمد سلمہٗ۔

مسلم رحمانیہ جونیئر ہائی اسکول

راجہ کا تاج پور ضلع بجنور

محمد عارف سلمہٗ، محمد اکرم سلمہٗ، کماری خدیجہ خاتون سلمہا، وقار احمد سلمہٗ، کماری گلستاں پروین سلمہا۔

مسلم گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ مرادآباد

کماری صفیہ پروین سلمہا، کماری شمع ظفر سلمہا۔ کماری نازش فرحت سلمہا، کماری ثریا سلمہا، کماری رخسانہ بیگ سلمہا۔

نسیم بدیع الدین جونیئر ہائی اسکول

بنش پور تنوا۔ ضلع گونڈہ

گریش کمار سلمہٗ، رام کرشن سلمہٗ، محمد عفان خاں سلمہٗ، شکیل شاہ سلمہٗ۔

نشاط جونیئر ہائی اسکول

سرائے ترین سنبھل۔ ضلع مرادآباد

کماری فرزانہ بی سلمہا، کماری عظمیٰ شہناز سلمہا، کماری تندرانہ تبسم سلمہا۔

انجمن اسلامیہ گرلز جونیئر ہائی اسکول

ہلدوانی۔ ضلع نینی تال

کماری عذرا جمال سلمہا، کماری ناظرین سلمانی سلمہا، کماری عشرت جہاں سلمہا۔

اسلامیہ جونیئر ہائی اسکول

درگا گنج۔ ضلع پرتاپ گڈھ

معین الدین سلمہٗ، شو بہادر سلمہٗ، بسنت لال سلمہٗ

قاسمیہ عربیہ اسلامیہ جونیئر ہائی اسکول

ضلع بلند شہر

کنور ساجد علی سلمہٗ، محمد عرفان سلمہٗ، مشتاق احمد سلمہٗ۔

نور حق جونیئر ہائی اسکول

مبارکپور۔ ضلع فیض آباد

کماری ساجدہ خاتون سلمہا، کماری نسرین جہاں سلمہا، کماری شبنم جہاں سلمہا

زیب النساء نسواں جونیئر ہائی اسکول

بلتھرا روڈ۔ ضلع بلیا

کماری غزالہ پروین سلمہا، کماری توحید فاطمہ سلمہا، کماری شانتی سلمہا

مسلم گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ بجنور

کماری اسما خاتون سلمہا، کماری تبسم فاطمہ سلمہا، [illegible] سلمہا

محمدیہ جرنسوال جونیئر ہائی اسکول کانپور
کماری رخسانہ رضوی سلمہا کماری جمیلہ خاتون سلمہا کماری
غزالہ پروین سلمہا۔
جنت نشان جونیئر ہائی اسکول بریلی
کامران خان سلمہٗ۔ محمد شاکر سلمہٗ۔ شاہد حسین سلمہٗ۔
جامع العلوم جونیئر ہائی اسکول
کھتولی ضلع مظفرنگر
ذاکر حسین راشد سلمہٗ۔ محمد اسلم سلمہٗ محمد دلشاد سلمہٗ۔
سوئنز سلیمانیہ آدرش جونیئر ہائی اسکول
اتراسی کلاں۔ مرادآباد
شوردیر سنگھ سلمہٗ۔ مبین احمد سلمہٗ۔ واحد علی سلمہٗ۔
مرکزی درسگاہ اسلامی جونیئر ہائی اسکول رامپور
عبدالحفیظ سلمہٗ محمد اعجاز اسلم سلمہٗ۔ حفیظ احمد سلمہٗ۔
مسلم جونیئر ہائی اسکول جمبور ضلع سیتاپور
صفی الدین سلمہٗ۔ جلال الدین سلمہٗ۔ محمد سلیم سلمہٗ۔
بنات القریش گرلز جونیئر ہائی اسکول مرادآباد
کماری عظمت آرا سلمہا کماری عظمیٰ سلمہا کماری کوثر جہاں سلمہا
عاصم بہاری گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ مرادآباد
کماری ذیشان اختر سلمہا کماری شائستہ پروین سلمہا کماری جبین آرا سلمہا
جنت نشان گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ مرادآباد
کماری عائشہ بانو سلمہا کماری نصیبہ خانم سلمہا کماری شفیق النساء سلمہا
راحت مولائی گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ مرادآباد
کماری شہلا تبسم سلمہا کماری رعنا جمال سلمہا
بسینر بھیک اسکول۔ سرائے ترین سنبھل مرادآباد
افروز خاں سلمہٗ۔
مونس مسلم گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ مرادآباد
کماری روما قمر سلمہا
فلاح دارین ہائر سکنڈری اسکول۔ مرادآباد
(جونیئر سیکشن) ابرار حسین سلمہٗ۔
مسلم راجپوت جونیئر ہائی اسکول ملاپ نگر گلاوٹی ضلع بلندشہر
عادل خان سلمہٗ

امامیہ جونیئر ہائی اسکول۔ رسڑا۔ بلیا
سندیپ کمار مشرا سلمہٗ۔ نعیم احمد سلمہٗ۔ کماری پرتی اگروال
سلمہا۔ جمیل اختر سلمہٗ۔ کماری نور محمدی سلمہا کماری نصرت جہاں سلمہا
نجم الثاقب سلمہٗ۔ مارکنڈے راجبھان سلمہٗ۔ جدا تر پاٹھی سلمہٗ۔
کماری راشدہ خاتون سلمہا
غریب نواز جونیئر ہائی اسکول۔ اسلام نگر بستی۔
عبدالعزیز خاں سلمہٗ۔ ذکراللہ سلمہٗ۔ وشوناتھ سلمہٗ۔
اسلامیہ فرقانیہ جونیئر ہائی اسکول۔ بسوان سیتاپور
احمد علی سلمہٗ۔ ابرار احمد سلمہٗ۔ محمد کلیم سلمہٗ۔ شیخ اکرم انصاری
سلمہٗ۔ وکیل احمد سلمہٗ۔
مسلم فرقانیہ گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ بسوان سیتاپور
کماری عالم آرا سلمہا۔ کماری انجم بیگم سلمہا کماری زینت
انجم سلمہا کماری شاہین بانو سلمہا کماری رضوانہ پروین سلمہا
چھپیرہ جونیئر ہائی اسکول۔ غازی آباد۔
محمد یونس سلمہٗ۔ محمد سلیمان سلمہٗ۔ ایس کے بابر سلمہا
عثمان احمد سلمہٗ۔ غلام حسین سلمہٗ۔ سلیم الدین سلمہٗ۔
حضرت عاصی جونیئر ہائی اسکول۔ سکندرپور بلیا۔
پرویز اقبال انصاری سلمہٗ۔ رمضان علی سلمہٗ۔ شاہدہ بانو سلمہا
مسلم جونیئر ہائی اسکول۔ مالی میاں بستی۔
واسدیو سلمہٗ۔ کماری شکرالنساء سلمہا۔ کمال الدین سلمہٗ۔
اسلامیہ عربیہ جونیئر ہائی اسکول دھام پور بجنور
سید علی سلمہٗ۔ کماری شہناز سلمہا چاند محمد سلمہٗ۔ تنویر احمد سلمہٗ
ضیاء الاسلام بوائز جونیئر ہائی اسکول بلندشہر
ندیم احمد سلمہٗ۔ عابد ظہیر سلمہٗ۔ واجد علی خاں سلمہٗ
محمد ناصر تحسین سلمہٗ۔
ہادی جونیئر ہائی اسکول۔ رامپور۔
نوید خان سلمہٗ۔ ایم شہاب خان سلمہٗ۔ انیس میاں سلمہٗ

(باقی آئندہ)



"آئیے، ہم سب ایک دوسرے میں ایسے گھل جائیں جیسے سمندر میں پانی کی بوندیں۔
اگر سمندر کی ہر بوند جدا جدا ہو تو ان میں سے ہر ایک سوکھ کر جلد ہی اپنی ہستی سے
مٹ جائے گی۔ لیکن یہی بوندیں جب آپس میں خلط ملط ہو کر سمندر کی شکل اختیار
کر لیتی ہیں، تو اس قدر طاقتور بن جاتی ہیں کہ بڑے بڑے جہازوں کو اس کی
وسعت کے آر پار ڈھو لیتی ہیں۔ سمندر کی طرح یہ بات ہم پر بھی صادق آتی ہے،
کیونکہ آخر کار ہم بھی تو انسانوں کا ایک سمندر ہیں۔"

سمندر کی بوندوں کی طرح ایک رہیئے۔

فیس داخلہ کچھ نہیں، آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں لیکن ہر حل کے ساتھ ایک کوپن آنا ضروری ہے۔	**پیامی ادبی معمّا نمبر 33** 150 روپے کے نقد انعامات	دفتر پیامِ تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۶ر نومبر ۸۷ء

پہلا انعام: صحیح حل پر مبلغ 100 — دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر 50 روپے کی کتابیں

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جس لفظ کو آپ صحیح سمجھتے ہوں اسے ہی نمبر وار لکھیے

1۔ آپ نے اس سے بھی کہا، کیا ——— ہے، چپ چاپ بیٹھا رہ! ۔ بکتا / کہتا
2۔ ... اگر ——— مل گیا تو ایک آدھ جانور بھی شکار کرتا لاؤں گا۔ وقت / موقع
3۔ آپ قانون میں اپنے اور ——— کا کوئی فرق نہ کرتے۔ پرائے / بیگانے
4۔ کھانے کا مقصد یہ سمجھتے تھے کہ اتنا ہو جو عبادت کرنے کے لیے جسم کی ——— کو باقی رکھ سکے۔ طاقت / قوت
5۔ وہ ——— کے وقت کرسی پر بیٹھی تھیں۔ صبح / چائے
6۔ ہم سمجھے اب ——— پڑے گی۔ اور ہم بھیگی بلی بن کر بیٹھ گئے۔ ڈانٹ / مار
7۔ ... ورنہ کوئی ——— جیسے دلچسپ گھنٹے میں کسی اور طرف دھیان نہیں دے سکتا۔ تاریخ / جغرافیہ / حساب
8۔ ——— جسم میں بہت قیمتی شے سمجھی جاتی ہے۔ روح / جان

صرف آخر کے دو سوالوں کے لیے ذہن پر زور ڈالیے بقیہ چھ سوالوں کے جوابات صفحہ ۱۸ اور ۴۴ کی کہانیوں میں مل سکیں گے۔

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا کوپن آنا لازمی ہے (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی (۵) معمے سے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے

پیامی ادبی معمّا نمبر 33۔ ماہنامہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کوپن

پیامی ادبی معمّا نمبر 33

میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....



نومبر ۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۱۱

اور دیگر مستقل کالم

قیمت فی پرچہ: 3/50 سالانہ: =/30
غیر ممالک سے: نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز: بارہ ڈالر
فی پرچہ: ایک ڈالر

ایڈیٹر: شاہد علی خاں

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. جامعہ نگر. نئی دہلی ۲۵
شاخیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. اردو بازار. دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. پرنسس بلڈنگ. بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. یونیورسٹی مارکیٹ. علی گڑھ ۲

بچوں سے باتیں

آپ نے احمد جمال پاشا کی بہت سی کہانیاں "پیام تعلیم" میں پڑھی ہوں گی. بچوں کے لیے کیسی مزے مزے کی کہانیاں لکھا کرتے تھے افسوس کہ ۲۸ رستمبر ۸۷ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے پٹنہ میں انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ پیام تعلیم سے ان کو گہرا لگاؤ تھا۔ افسوس کہ پیام تعلیم نے اپنا ایک سچا ہمدرد کھو دیا۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی بیگم سرور جمال صاحبہ کو صبر کی تلقین عطا فرمائے آمین ثم آمین

نومبر خوشی کا مہینہ ہے۔ ۵ رنومبر ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت ہے۔ اتفاق سے ۵ رنومبر کو ہی گرو نانک جی کا جنم دن بھی ہے۔ ۱۴ رنومبر کو ہمارے پہلے وزیر اعظم چاچا نہرو اور ۱۹ رنومبر کو آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کا یوم پیدائش ہے۔ یہ ساری تقاریب سرکاری اور عوامی سطح پر شان سے منائی جاتی ہیں۔

پیام تعلیم سے پیامیوں کی دلچسپیاں برابر بڑھتی جا رہی ہیں یہ ہمارے اور اردو زبان کے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ پیام تعلیم کا تعارف اپنے ساتھیوں سے بھی کروائیں۔



افسوس کہ
آپ کے جانے پہچانے ادیب
احمد جمال پاشا
۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کو
اس دنیا سے رخصت ہو گئے

احمد جمال پاشا

ایک بوند شہد کی

کسی زمانے میں ایک گانو میں اس قدر امن چین تھا کہ آدمی، جانور سب مل کر ہنسی خوشی ایک ساتھ رہتے تھے۔ شیطان نے جب یہ دیکھا تو جل گیا۔

ایک دن اسی گانو سے ایک اجنبی ایک برتن شہد لے کر گزرا۔ اس کے برتن سے چھلک کر ایک بوند شہد کی زمین پر گر پڑی۔

ایک چھپکلی نے جب شہد دیکھا تو وہ اس کی جانب رینگی۔ چھپکلی کو رینگتا دیکھ کر پاس کھڑی ایک بلی، چھپکلی پر جھپٹی۔ بلی کو دیکھ کر ایک کتا بھونکتا ہوا بلی کی جانب بڑھا۔ بلی کے مالک نے جب کتے کو بلی پر بھونکتے دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔ اور وہ کتے کو ڈانٹنے لگا۔ اس پر کتے کا مالک خفا ہو گیا۔ اس لیے وہ بلی کے مالک کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا دونوں آپس میں لڑنے لگے اور دیکھتے دیکھتے گانو کا ہر آدمی اس جھگڑے میں شامل ہو گیا غرض پورا گانو میدانِ جنگ بن گیا۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی حفاظت کے لیے ایک ایک خندق کھود لی۔ بہت جلد انھیں اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے سے جیت نہیں سکتے لیکن یہ آن کے وقار کا سوال تھا۔ اس لیے انھوں نے صلح کرنا پسند نہ کی۔

انھوں نے قریب کے مواضعات سے مدد مانگنا شروع کی گانو پھر میدانِ جنگ بن گیا۔ مگر کوئی بھی جیت نہ سکا۔ ہوتے ہوتے اس کی خبر بادشاہ کو پہنچی۔ اس نے امن بحال کرنے کے لیے فوج بھیج دی۔ بہت سے گانو والے مارے گئے۔ اس کے بعد امن ہو گیا۔ اور لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ آخر وہ اتنے دنوں تک لڑتے کیوں رہے، لڑائی کی آخر وجہ کیا تھی؟ آخر انھیں بڑی مشکل سے یاد آیا کہ یہ سب ایک بوند شہد کی گرنے کے بعد شروع ہوا تھا۔۔۔

کلثوم بانو

فرمانبردار بیٹی



سیکڑوں برس پہلے کی بات ہے کسی شہر میں حسن نامی ایک سوداگر رہا کرتا تھا وہ چھ مہینے تجارت کی غرض سے دور دراز کا سفر کرتا اور خوب دولت کماتا اور پھر چھ ماہ وہ اپنی حویلی میں بیوی بچوں کے ساتھ آرام کرتا۔ شروع شروع میں وہ اتنا امیر نہیں تھا۔ اس کی ایک معمولی سی دکان تھی اور ایک معمولی سا گھر۔ سوداگر اتنا دولت مند ہونے کے باوجود اپنے غریبی کے دن بھولا نہیں تھا۔ اس کی حویلی بہت بڑی تھی۔ اس حویلی کے ساتھ ہی اس کا پرانا گھر بھی تھا جسے اس نے جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ تاکہ بُرے وقت کو وہ ہمیشہ یاد رکھ سکے۔ سوداگر کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا دونوں بچے بڑے لاڈ و پیار میں پل کر جوان ہوتے تھے ایک بار سوداگر جب تجارت کی غرض سے اپنا مال لے کر جانے لگا تو وہ بہت اداس تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی بیمار رہنے لگی تھی۔ اس نے بیوی کا بہت علاج کروایا لیکن افاقہ نہ ہوا یہی وجہ تھی اب وہ

ر کا سفر کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی اسے آخر جانا ہی پڑا اس بار
ایک خطرناک راستے سے گزر رہا تھا۔ اس راستے سے سفر آدھا رہ جاتا تھا۔ چونکہ
سوداگر حسن اپنا مال بیچ کر جلد از جلد واپس آنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اس خطرناک
راستے پر چل پڑا تھا۔ ایک رات جب کہ اس نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ اس کے
کچھ ملازم جاگ کر مال کی حفاظت کر رہے تھے حسن اپنے شامیانے میں پڑا سو رہا تھا
کہ باہر اسے کچھ شور سنائی دیا وہ جلدی سے اٹھا اور باہر آگیا۔ اس نے دیکھا بہت سے
ڈاکو پڑاؤ پر حملہ آور ہو گئے تھے اور سوداگر حسن کے ملازم بے جگری سے ان کا مقابلہ
کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکو تعداد میں زیادہ تھے اس لیے اس نے سوداگر حسن کے ملازموں
پر جلد ہی قابو پالیا اور پھر سوداگر کا جتنا مال تھا لوٹ کر چلتے بنے۔ سوداگر حسن یہ
سب کچھ کھڑا دیکھتا رہا۔ لیکن اسے اس بات کی ذرا بھی پروا نہ ہوئی اس نے سوچا چلو
قدرت کو یہی منظور تھا اب واپس چلتے ہیں اگلے سال پھر مال لے کر کسی ملک کا سفر
کریں گے اور پھر اس نے ملازموں کو واپس چلنے کا حکم دیا اس کے بہت سے وفادار
ملازم شہید ہو چکے تھے جو بچے تھے وہ اپنے آقا کا حکم سن کر فوراً ہی تیار ہو گئے اور پھر
یہ کاروان رات ہی رات واپس چل پڑا ابھی یہ لوگ کچھ دور پہنچے تھے کہ اچانک آندھی
چلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک زبردست طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔ طوفان کی
شدت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تمام لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ
گئے۔ کئی لوگ ہلاک بھی ہو گئے۔ سوداگر حسن بھی گرتا پڑتا ایک صحرا میں جا پہنچا۔ صبح
ہو چکی تھی اور طوفان بھی تھم گیا تھا سوداگر حسن نے چاروں طرف نظر دوڑائی وہ اس
وسیع ریگستان میں تن تنہا کھڑا تھا۔ اس کے تمام ساتھی اس سے بچھڑ چکے تھے۔ اب وہ
راستہ بھی بھول گیا تھا۔ کیونکہ یہ ایسا مقام تھا جہاں سے وہ پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔ پریشان
حال خدا کا نام لے کر وہ ایک سمت چل پڑا کچھ دیر بعد سورج نمودار ہوا اور پھر وقت
گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بلند ہوتا گیا۔ سورج کی تپش سے ریت نہایت گرم ہو چکی
تھی اور سوداگر کے لیے اتنی گرمی میں چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ پیاس کے مارے اس کے
حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ زبان خشک ہو چکی تھی۔ لیکن وہ صبر سے کام لے کر آگے بڑھتا
رہا اور پھر دور اسے ایک پہاڑی نظر آئی جسے دیکھ کر وہ اس طرف چل دیا کیونکہ پہاڑی

سرسبز تھی اور اس پر ہرے بھرے درخت لہلہا رہے تھے۔ سوداگر اپنے تجربے سے جان گیا کہ وہاں ضرور پانی موجود ہوگا۔ اور پھر وہ تیز تیز چلتا ہوا اس پہاڑی پر جا پہنچا جہاں اسے ایک چشمہ نظر آیا۔ وہ دوڑ کر چشمے کے قریب پہنچا اور پھر اس نے خوب پیٹ بھر کر پانی پیا۔ اب اس کی جان میں جان آئی اور اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو درخت پھلوں سے لدے نظر آئے وہ خوشی کے مارے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک درخت کی طرف بڑھا اور پھر اس نے جھکی ہوئی ٹہنیوں سے پھل توڑ توڑ کر کھائے پیٹ بھرتے ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر وہ ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد ہی خواب خرگوش کے مزے لینے لگا اسے سوتے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک خوفناک آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہے ایک خوفناک اژدہا پہاڑ سے اتر کر اس کی طرف بڑھے چلا آرہا ہے۔ یہ اژدہا اتنا خوفناک تھا کہ سوداگر حسن خوف کے مارے کانپنے لگا اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا وہ اژدہا ایک بوڑھے جادوگر کا روپ دھار گیا۔ اب تو سوداگر حسن کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"تم نے میری اس جنت میں پانی پیا پھل کھائے اور ٹھنڈی چھاؤں میں کچھ دیر آرام بھی کیا۔ کیا اس کے بدلے میں تم میرا ایک کام کرو گے"؟ بوڑھے جادوگر نے کہا۔

"ہاں اگر مجھ سے ہو سکا تو تمھارا کام ضرور انجام دوں گا۔ کیونکہ اگر مجھے یہاں پناہ نہ ملتی تو اس صحرا میں بھوکا پیاسا مر جاتا" سوداگر حسن نے جواب دیا۔

"شاباش تم ایک نیک انسان ہو۔ تمھارے اس جواب سے میں بہت خوش ہوا میں جانتا ہوں تجارت کی غرض سے جو مال تم لے کر نکلے تھے وہ سب ڈاکو لوٹ کر لے گئے تمھیں بہت نقصان ہوا اگر میرا تم یہ کام کر دو گے تو تمھیں اتنی دولت ہاتھ آئے گی کہ تمھاری سات نسلیں آرام سے بیٹھ کر کھائیں گی" بوڑھے جادوگر نے کہا۔

"مجھے کرنا کیا ہوگا؟" سوداگر حسن نے پوچھا۔

"یہاں سے شمال کی طرف بہت سی پہاڑیاں ہیں۔ ان پہاڑیوں میں ایک پہاڑی ایسی ہے جس کی چوٹی کی شکل شیر کے منہ کی سی ہے اسی پہاڑی پر ایک غار ہے جو نہایت تاریک ہے اس غار میں سامری کا خزانہ ہے اسی خزانے میں سرخ رنگ کی ایک ڈبیا میں سلیمانی

...ہے اگر تم وہ انگوٹھی مجھے لادو تو وہاں موجود سارا خزانہ تمہارا ہوگا لیکن وہاں سے خزانہ اور انگوٹھی حاصل کرنا آسان کام نہیں کیونکہ اس خزانے کی حفاظت سانپوں کا راجا کر رہا ہے اس غار میں اتنا اندھیرا اور تاریکی ہے کہ بغیر روشنی کے آگے بڑھنا ناممکن ہے اگر کوئی مشعل جلا کر اس غار میں داخل ہو تو اس ناگ کی ایک پھنکار سے مشعل بجھ جاتی ہے اور پھر ناگ آگے بڑھ کر اس شخص کو ڈس لیتا ہے اب یہ تمہارا کام ہے جس طرح بھی ہو سکے اس خزانے اور انگوٹھی کو حاصل کر لو۔ بوڑھا جادوگر کہتا چلا گیا۔

"اچھی بات ہے میں چلتا ہوں اگر قسمت نے ساتھ دیا اور خدا کو منظور ہوا تو میں ضرور کامیاب لوٹوں گا" یہ کہہ کر سوداگر حسن اس سمت روانہ ہوا چلتے چلتے رات ہو گئی وہ رکا نہیں چلتا رہا۔ وہ جلد سے جلد اس کام سے فارغ ہو کر گھر واپس جانا چاہتا تھا۔ اپنے گھر والوں کی طرف سے وہ سخت پریشان تھا اور پھر صبح ہو گئی اسے ایک جگہ پانی کا ایک چشمہ نظر آیا آگے بڑھ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور پانی پیا اچانک پانی میں اسے شیر کے منہ کا عکس نظر آیا اس نے سامنے دیکھا تو کچھ فاصلے پر ہی وہ پہاڑی موجود تھی جس کی چوٹی شیر کے منہ سے ملتی جلتی تھی سوداگر حسن خوش ہو گیا وہ تیزی سے اس پہاڑی کی طرف بڑھا اور جب وہ وہاں پہنچا تو پہاڑی غار پر اسے ایک راجا نظر آیا جس کے سر پر تاج تھا اور اس تاج میں جڑے ہیرے سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ راجا نے آگے بڑھ کر سوداگر کا استقبال کیا اور بولا" اے شخص میں جانتا ہوں تم اس غار سے خزانہ اور سلیمانی انگوٹھی حاصل کرنے آئے ہو لیکن غار میں نہایت تاریکی ہے اگر تم اس میں مشعل جلا کر بھی لے جاؤ گے تو سانپوں کا راجا اپنی پھنکار سے اسے بجھا دے گا اور تمہیں ڈس لے گا۔ ہاں اگر تم میرا تاج اپنے سر پر پہن لو تو اس کی روشنی سے غار میں داخل ہو سکو گے اور پھر سانپ سے مقابلہ کرنا تم جیسے بہادر شخص کے لیے مشکل نہ ہوگا۔ لیکن میری ایک شرط ہے وہ خزانہ تو تم لے لو گے اور سلیمانی انگوٹھی مجھے دے دو گے کہو میری یہ شرط منظور ہے"۔

سوداگر حسن نے سوچا اس بوڑھے جادوگر سے وعدہ کیا تھا کہ سلیمانی انگوٹھی وہ اسے دے گا۔ لہٰذا وعدہ خلافی نہیں کرنی چاہیے چاہے اس کے لیے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

"اے راجا وہ انگوٹھی میں تمھیں نہیں دے سکوں گا چاہے تم اپنا یہ تاج مجھے دے یا نہ دو میں نے کسی اور سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ اگر اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو وہ انگوٹھی اسے دوں گا۔

"دیکھو ضد نہ کرو اس طرح تم اپنی جان گنوا بیٹھو گے" راجا بولا

"مجھے پروا نہیں" یہ کہہ کر سوداگر حسن غار کی طرف بڑھا اور پھر اس نے غار میں جھانک کر دیکھا غار کے اندر سے زبردست پھنکار سنائی دی کہ سوداگر گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"دیکھو میں پھر کہتا ہوں میرا تاج پہن لو اور اس کے بدلے میں جب کامیاب ہو تو سلیمانی انگوٹھی مجھے دے دینا" راجا نے کہا۔

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا" یہ کہتے ہوئے سوداگر حسن غار میں داخل ہو گیا۔

"رک جاؤ" اسے پیچھے سے راجا کی آواز سنائی دی وہ واپس غار سے نکل آیا۔

"کہیے کیا کہنا ہے" وہ راجا سے مخاطب ہوا۔

راجا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ بوڑھے جادوگر کے روپ میں آگیا۔

"شاباش اے شخص واقعی تم بہت اچھے انسان ہو میں صرف تمھارا امتحان لے رہا تھا لو یہ تاج پہن لو غار میں جاؤ خدا تمھیں کامیاب کرے گا" بوڑھے جادوگر نے وہ تاج سوداگر حسن کو دیتے ہوئے کہا۔

سوداگر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تاج پہن کر غار میں داخل ہو گیا۔ اب اسے غار میں دور دور کی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھتا گیا اچانک ایک جگہ شیش ناگ پھنکارتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ سوداگر حسن ذرا نہ گھبرایا اس نے میان سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر ناگ کی گردن اڑا دی اب وہ بے خطر آگے بڑھا اور پھر اسے ایک جگہ سات مرتبان جواہرات سے بھرے نظر آئے ان کے قریب ہی سرخ ڈبیا جس میں سلیمانی انگوٹھی تھی۔ سوداگر حسن نے بڑی مشکل سے ایک مرتبان اور وہ ڈبیا اٹھائی اور غار سے باہر آگیا۔ اب وہ کیا دیکھتا ہے بوڑھے جادوگر کے پاس تین اونٹ بھی کھڑے تھے۔ سوداگر نے سلیمانی انگوٹھی والی ڈبیا بوڑھے جادوگر

کے حوالے کی۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں اے جوان مجھے اس انگوٹھی کے لیے برسوں انتظار کرنا پڑا تھا جو آج تمہاری وجہ سے حاصل کر سکا۔ جاؤ اور جا کر دوسرے مرتبان بھی اٹھا لاؤ اور اونٹوں پر لاد کر اپنے وطن روانہ ہو جاؤ مجھے امید ہے اب تمہیں کسی کام کی ضرورت نہیں رہے گی؟" یہ کہتے ہوئے جادوگر غائب ہو گیا۔ سوداگر حسن نے دوسرے مرتبان بھی غار سے نکالے اور اونٹوں پر لاد کر وطن کی طرف چل پڑا اب وہ راستے سے بھٹکا نہیں تھا اور جلد ہی اپنے وطن پہنچ گیا۔ لیکن جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے پتا چلا کہ اس کی بیوی فوت ہو گئی ہے۔ یہ جان کر وہ پہلے اپنے پرانے گھر میں گیا جہاں زمین کھود کر اس نے ساتوں مرتبان چھپائے اور پھر اپنی حویلی میں گیا جہاں اس کی بیوی کی لاش پڑی تھی۔ وہ بہت رویا اور پھر بیوی کو قبرستان لے جا کر دفنا دیا اب وہ خود بھی بیمار پڑ گیا تھا۔ اسی دوران اس نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد بیٹے نے باپ کے کمرے میں جھانک کر بھی نہ دیکھا۔ سوداگر کی بیٹی شہناز رات دن باپ کی خدمت کرتی رہتی اور دوسرے کمرے میں جہاں اس کے باپ کی تصویر تھی اکثر جا کر تصویر کے سامنے روتی رہتی۔ سوداگر بھی جانتا تھا کہ اس کی بیٹی کو اس کا بہت غم ہے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ نہیں بچے گا۔ سوداگر کسی زمانے میں قاضی بھی رہ چکا تھا جس کی وجہ سے وہ عدالتی زبان جانتا تھا۔ ایک دن وہ اس کمرے میں گیا اور اس نے تصویر کے پیچھے کچھ باتیں لکھیں اور پھر تصویر کو اسی جگہ لگا دیا اور واپس اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا اور پھر دن گزرتے گئے اس کی بیٹی شہناز پوری طرح دن رات باپ کی خدمت کرتی اس کے باپ کو اس کی شادی کی فکر تھی اور چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دے لیکن قدرت نے اسے مہلت نہ دی اور وہ مر گیا اس کے مرتے ہی اس کے بیٹے نے تمام دولت پر قبضہ کر لیا اور بہن سے کہنے لگا کہ تم بابا کے پرانے مکان پر چلی جاؤ" شہناز نے بھائی کے یہ تیور دیکھے تو باپ کی تصویر کے پاس جا کر خوب روئی اور پھر اس نے وہ تصویر وہاں سے اٹھائی اور باپ کے پرانے گھر میں چلی آئی اس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے کہ کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی سوداگر کا ایک پرانا دوست تھا جو اب قاضی کے عہدے پر تھا اسے جب اپنے دوست کے انتقال کی خبر ملی تو وہ سوداگر کے

بوں سے ملنے آیا۔ سوداگر کے بیٹے نے اس کا استقبال کیا اور قاضی کی خوب خاطر مدارات ں۔ قاضی نے جب شہناز کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا "چچا جان! اسے ابا مرحوم سے بہت بت تھی اسی لیے وہ ان کے پرانے گھر میں چلی گئی ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ یہاں جو کچھ ہے ہم دونوں کا ہے لیکن اس نے کچھ بھی نہیں لیا۔ اور چلی گئی" قاضی سب کچھ سمجھ گیا اسے اس لڑکے پر بہت غصہ آیا لیکن وہ خاموش رہا اب وہ شہناز سے ملنے پرانے گھر گیا اس نے دیکھا کہ شہناز باپ کی تصویر کے سامنے بیٹھی رو رہی ہے بھوکے رہنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ قاضی نے اسے تسلی دی اور پھر اپنے دوست کی تصویر کو اٹھا کر دیکھنے لگا اچانک پچھلی طرف اسے ایک تحریر نظر آئی اس نے جب اسے پڑھا تو بولا بیٹی شہناز تمھارا باپ تو تمھارے لیے اتنی دولت چھوڑ گیا ہے کہ کسی بادشاہ کے پاس کیا ہوگی وہ دراصل تمھارے بھائی کی فطرت سے واقف تھا اس لیے اس نے تمھارے لیے اس مکان میں ایک بڑا خزانہ چھپا چھوڑا ہے" یہ کہہ کر قاضی نے کچھ مزدور بلائے اور اپنی نگرانی میں ساتوں مرتبان نکالے اور پھر چند جواہرات بیچ کر پرانے مکان کی جگہ ایک شاندار محل تعمیر کروایا اور باقی خزانہ اس محل میں محفوظ کر دیا

سوداگر کے بیٹے نے جب یہ دیکھا تو بہت پچھتایا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس محل کے سامنے اس کی حویلی کچھ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہاں کے بادشاہ کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے اپنے بیٹے مراد کی شادی شہناز سے کر دی۔ اس طرح شہناز باپ کی خدمت کی وجہ سے شہزادی بن گئی اور اس کا بھائی جس نے باپ کی تمام جایداد فضول اڑا دی تھی در در کی ٹھوکریں کھانے لگا۔

بہ شکریہ "بچوں کا باغ"

پیامی مدثر پرویز کو مبارک باد



مدثر پرویز حکومت مہاراشٹر کے مڈل اسکول اسکالرشپ امتحان برائے ۱۹۸۶ء میں منگرول پیر تحصیل (ضلع اکولہ) سے کامیاب ہونے والے اردو میڈیم کے واحد طالب علم ہیں۔

خالد لطیف

اور روشنی ہو گئی!

خدا نے کہا روشنی ہو جائے اور روشنی ہو گئی۔ یہ ۲۰ راپریل ۵۷۱ عیسوی کا دن تھا جب عبداللہ کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا عبداللہ عرب کے شہر مکہ میں رہتے تھے۔ عرب بہت پرانا ملک ہے اور ریگستانوں کھجوروں اور اونٹوں کی وجہ سے مشہور ہے یہاں کے باشندوں کو بھی عرب ہی کہتے ہیں ان دنوں عرب اچھے اور نیک لوگ نہ تھے کئی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور اکثر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے وہ جوا بھی کھیلتے تھے ان میں کئی اتنے ظالم تھے کہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے۔ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کئی بت بنا کر کعبہ میں رکھے ہوئے تھے کعبہ اللہ کا گھر تھا اور اسے خدا کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا عرب بتوں کے سامنے ناچتے اور مختلف چیزوں سے چڑھاوے چڑھاتے عبداللہ بھی عربوں میں سے تھے لیکن کوئی برا کام نہیں کرتے تھے وہ ایک باعزت قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کا نام بنو ہاشم تھا۔

عبداللہ شادی کے چند ماہ بعد ہی وفات پا گئے اور اپنے بیٹے کو نہ دیکھ سکے۔ بچے کا نام دادا نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھا عربوں میں یہ ایک نیا نام تھا لوگوں نے اس انوکھے نام کی وجہ پوچھی تو معمّر سردار جناب عبدالمطلب نے فخر سے جواب دیا میں چاہتا ہوں دنیا میرے پوتے کی تعریف کرے اور وہ نہایت بلند مقام حاصل کرے۔

ماں بی بی آمنہ کو اپنے یتیم بچے سے بہت محبت تھی۔ بچہ بڑا پیارا اور صحت مند تھا جو کوئی دیکھنے کے لیے آتا حیران ہو کر کہتا۔ "یہ بچہ چند روز کا نہیں کئی ماہ کا لگتا ہے" محمد پیدا ہوئے تو اپنے ساتھ رحمتیں اور برکتیں بھی لائے ان دنوں عرب میں سخت قحط پڑا ہوا تھا لیکن ان کی ولادت کے بعد زور کی بارش ہوئی اور قحط کا نام تک نہ رہا جانور جو بھوک اور پیاس سے مر رہے تھے ان کو وافر مقدار میں پانی اور چارا ملنے لگا۔

حلیمہ سعدیہ

عربوں میں رواج تھا کہ اپنے بچوں کو شہر سے باہر دیہی علاقوں میں بھیج دیتے جہاں ان کی پرورش گاؤں کی جفاکش اور صحت مند عورتوں کے دودھ پر ہوتی۔ اس خدمت کا انھیں معاوضہ دیا جاتا زیادہ معاوضے کے خیال سے یہ عورتیں عموماً امیر والدین کے بچے حاصل کرنے کی کوشش کرتیں محمدؐ کے والد فوت ہو چکے تھے کوئی عورت انھیں قبول کرنے پر تیار نہ ہوئی لیکن ایک عورت حلیمہ جو سب سے آخر میں مکہ میں آئیں محمدؐ کو اپنے ساتھ لے جانے پر خوشی سے رضامند ہوگئیں وہ محمدؐ سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتیں اور بڑی توجہ سے ان کی پرورش کرتیں۔ حلیمہ کا قبیلہ اپنے اچھے طور طریقوں کی وجہ سے مشہور تھا محمدؐ یہاں بہت خوش تھے اور حلیمہ سے بہت محبت کرتے تھے۔

حیرت انگیز واقعہ

محمدؐ چار سال کے ہوئے تو حلیمہ کے بچوں کے ساتھ باہر جاتے اور بھیڑ بکریوں کی دیکھ بھال کرتے ایک دن جب وہ جنگل میں گئے ہوئے تھے۔ دو فرشتے انسانی شکل میں سفید لباس پہنے ہوئے آئے محمد کا سینہ چاک کیا اور اسے نور سے بھر دیا۔ دوسرے بچے ڈر گئے اور بھاگے بھاگے گھر گئے تاکہ والدہ کو اس خوفناک واقعے سے آگاہ کریں۔

حلیمہ روتی ہوئی جنگل کی طرف دوڑیں مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ محمدؐ بالکل ٹھیک ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے بتایا وہ سفید لباس میں دو آدمی تھے انھوں نے میرا سینہ چاک کیا اور ایسی چیز سے بھر دیا جو میں نہیں جانتا لیکن مجھے تکلیف نہیں ہوئی۔

بچپن میں محمدؐ جنگل کی طرف جاتے تو کسی کو کہتے ہوئے سنتے اے خدا کے پیغمبر آپ پر رحمت ہو۔ وہ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھتے مگر پہاڑ کے دامن میں بکھرے ہوئے پتھروں کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی۔

حلیمہ کے شوہر نے فرشتوں کا حال سنا تو پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا بچے کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آؤ حلیمہ محمدؐ کو واپس مکہ لے گئیں اور جو واقعہ گزرا تھا کہہ سنایا۔ ان کی والدہ نے تسلی دی اور یقین دلایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اس پر حلیمہ انھیں واپس لے آئیں اور محمدؐ پھر پہلے کی طرح رہنے لگے۔

پیارے بچو! محمدؐ ہمارے پیارے نبی کا نام ہے۔ یہ نام جب لکھا جاتا ہے تو اس پر ؐ کا نشان لگایا جاتا ہے۔ یہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مخفف ہے اس کا مطلب ہے ان پر اور ان کی آل پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو۔ یہ نام جب پڑھا یا بولا جائے تو صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پورا کہنا چاہیے

سورج توانائی کا ایسا ذریعہ ہے جو اربوں سال تک زمین کی تمام ضرورتیں پوری کرسکتا ہے

تاج الامین



آیندہ برسوں میں توانائی کی تمام ضرورتیں سورج سے پوری ہوں گی

کسی کام کو کرنے کے لیے جو قوت درکار ہوتی ہے اسے توانائی کہتے ہیں اگر ہم بے کار بیٹھے ہوں تو توانائی خرچ نہیں ہوتی اگر ہم کوئی عام سا کام کرتے ہیں۔ جس میں قوت صرف ہوتی ہے تو اس قوت کو توانائی سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے وہ چیزیں جو ہم کو اس قابل بنادیتی ہیں کہ ہم ایک خاص کام کریں تو اس کو توانائی خرچ ہونا کہتے ہیں کوئلہ ہمیں اس قابل بنادیتا ہے کہ ہم ایک بھاپ کے انجن کو چلائیں اس لیے کوئلے میں توانائی موجود ہے پٹرول ایک موٹر کار کو چلاتا ہے پٹرول بھی توانائی کا ایک ذریعہ ہے کوئلہ، پٹرول، بجلی اور ایٹم تمام توانائی کے ذرائع ہیں۔

ہم کوئلہ پٹرول اور ایٹم اتنے زیادہ پیمانے پر استعمال کرتے ہیں کہ دنیا میں اس کی کمی واقع ہو چکی ہے چونکہ دنیا میں توانائی ضرورت سے بہت کم ہے اس لیے بنی نوع انسان اور دنیا کے نامور سائنس داں توانائی کے متبادل ذرائع کی تلاش میں ہیں جو کہ ارزاں ہو آسانی سے دستیاب ہو اور دیرپا ہو یہ امکانات سورج کی توانائی میں پائے جاتے ہیں جس کو شمسی توانائی کہتے ہیں ایک طرح سے ہم شمسی توانائی اپنی روزمرہ زندگی میں بھی استعمال کرتے ہیں ہم سورج کی دھوپ کی مدد سے اپنے دھلے ہوئے کپڑے خشک کرتے ہیں ہم اپنے ایندھن کا

ہی بھی دھوپ میں خشک ہونے کے لیے رکھ دیتے ہیں اُپلے بنائے جاتے ہیں اور اس کو
ل کرنے کے لیے سورج کی دھوپ میں رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح پیاز بینگن بند گوبھی پھول
بی اور دیگر سبزیاں کاٹی جاتی ہیں تو خشک کرنے کے لیے سورج کی دھوپ میں رکھا جاتا
، اسی طرح پھل بھی بعد میں استعمال ہونے کے لیے اسی طریقے سے خشک کیے جاتے ہیں۔

سورج میں ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس کثیر مقدار میں موجود ہیں سورج کے ایٹم مسلسل ٹوٹتے
ہیں اور فوراً ہیلیم گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس تبدیلی سے زبردست حرارت پیدا ہوتی
ہے جو دھوپ کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے۔

دھوپ کا فائدہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہمارے جسم کو گرم رکھتی ہے اور دیگر جانداروں کی
ت اور پرورش پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں قوت اور حرارت کی بڑھتی
ئی ضرورت کے پیش نظر کچھ عرصہ سے سائنس داں اس کوشش میں مصروف ہیں کہ سورج کی
شنی اور دھوپ کو بھی اسی طرح لیا جاتے جیسے گیس پٹرول کوئلہ بجلی ایٹم اور دیگر چیزوں سے
جاتا ہے۔ برسوں کی محنت اور تجربات کے بعد سائنس داں دھوپ کے مفید استعمال میں بڑی
تک کامیاب ہو چکے ہیں اور مزید تجربات جاری ہیں۔

سائنس دانوں نے سورج کی حرارت کو پانی پر مرکوز کرکے پانی سے بھاپ اور بھاپ سے
پیدا کرنے کے کامیاب تجربات کیے ہیں۔ انجن تیار کیے ہیں جن کو شمسی انجن کا نام دیا گیا
ہے اسی قسم کا سب سے کامیاب انجن ۱۹۰۴ء میں تیار کیا گیا جس کو امریکہ کے ایک صحرا میں سورج
تمازت جمع کرکے استعمال کیا گیا ہے اسی طرح ایک اور ماہر انجینیئر نے ایسا شمسی انجن تیار کیا جس
مدد سے مصر میں بارہ سو میٹر کے رقبے میں سورج کی کرنوں کو یکجا کرکے ۵۵ ہارس پاور قوت
م کی گئی۔

سائنس دانوں کی انتھک کوششوں سے ایسی دھوپ فیکٹریاں ایجاد کی گئی ہیں جن میں
س کی مدد سے بھاپ پیدا کی جا سکتی ہے امریکہ افریقہ اور یورپ میں ایسی ٹنکیاں ایجاد کی
ں جن میں دھوپ کی مدد سے بھاپ پیدا کی جا سکتی ہے اسی طرح فرانس اور کئی دیگر ممالک
ماتوں پر تحقیقات کرکے دھوپ بھٹیاں استعمال کی جاتی ہیں ان دھوپ بھٹیوں میں
کے موٹے عدسے استعمال ہوتے ہیں جو سورج کی شعاعوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور
سے حاصل کی گئی حرارت کو مشینی قوت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے حال ہی میں

ایک ایسا سیل بھی ایجاد کیا گیا ہے جو دھوپ کی مدد سے برقی قوت پیدا کرتا ہے اس سیل کی مدد سے ایسے ریڈیو چلائے جاتے ہیں جن میں معمولی ٹیوب کی بجائے ٹرانسسٹر لگے ہوتے ہیں جو ایک قسم کی دھوپ بیٹری کا کام دیتے ہیں یہ سیل دھوپ کو براہ راست بجلی میں تبدیل کرتے ہیں اور دن کے علاوہ رات کو بھی کام کرتے ہیں روس میں تقریباً سارا سال دھوپ پڑتی ہے اس لیے اس سے زیادہ سے زیادہ برقی قوت پیدا کرکے فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے استعمال کیا جا رہا ہے ایسی سادہ دھوپ مشینیں ایجاد کی گئی ہیں جو روزمرہ کے کام کاج میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

کارخانوں اور گھروں کے علاوہ زراعت میں بھی دھوپ مشینیں استعمال ہونے لگی ہیں اور کوشش جاری ہے کہ خشک علاقوں میں پانی کی فراہمی بھی دھوپ ہی سے کی جائے روسی سائنس دانوں نے ایسے ریفریجریٹر ایجاد کیے ہیں جو ساڑھے تین سو ۳۵۰ کلوگرام برف روزانہ تیار کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بے شمار ایسے چولھے بھی استعمال میں ہیں جن پر دھوپ کی مدد سے کھانا تیار کیا جاتا ہے اسی قسم کے پریشر کوکر بھی بنائے جا چکے ہیں اوسط قسم کا دھوپ چولھا اتنی ہی حرارت پیدا کرتا ہے جتنی چھ سو واٹ بجلی کے ہیٹر سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض ایسے دھوپ کے چولھے بھی ہیں جو سیر و سفر کے لیے استعمال ہوتے ہیں یہ موڑ توڑ کر مختصر کر کے اپنے ساتھ لیے جا سکتے ہیں ان دھوپ چولھوں میں تیل اور بتی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حال ہی میں ہمارے ملک کے سائنس دانوں نے بھی تجربات کے بعد شمسی چولھے تیار کر لیے ہیں جو بہت مقبول ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا میں حال ہی میں ایک ایسی موٹر کار تیار کی گئی ہے جو شمسی توانائی سے چلتی ہے کئی گھروں میں روشنی اور دھوپ پہنچانے کے لیے لگے شیشوں کو ایک موٹر کی مدد سے اسی طرح حرکت دی جاتی ہے کہ ان کا رخ ہمیشہ سورج کی طرف رہتا ہے اور غروب آفتاب کے وقت تک اس کی کرنیں عمارت کے اندر داخل ہوتی رہتی ہیں جن سے بلب روشن ہو جاتے ہیں اور کمرے گرم رہتے ہیں۔

خلائی پروازوں اور خلائی اڑانوں میں بھی شمسی توانائی استعمال ہوتی ہے اس وقت دنیا کے گرد جتنے بھی سیارے گردش کرتے ہیں ان میں ایسی ہی بیٹریاں نصب ہیں جو دھوپ کی مدد سے چلتی ہیں امید کی جا سکتی ہے کہ اگر ہمارے سائنس دانوں نے محنت

کچھ مفید اور دلچسپ باتیں

دین کی باتیں

بیشک خدا اُس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنے آپ کو نہیں بدلتی۔ (قرآن)

وہ شخص جنّت میں کبھی داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پر بُری افسری کرتا ہے (حدیث)

اگر تم سچے ایمان والے ہو تو موت کی تمنا کرو (قرآن)

جو تم سے حسنِ سلوک کرے اُس کا شکریہ ادا کرو اور جو تمہارا شکریہ ادا کرے اس سے حسنِ سلوک کرو (حدیث)

خدا اُس شخص کا بھلا کرے جو میری برائیاں میرے پاس تحفے کے طور پر بھیجتا ہے (حضرت عمرؓ)

شکایت کی پٹّی

ایک دفعہ ایک شخص ماتھے پر پٹّی باندھے حضرت رابعہ بصریؒ کے سامنے سے گزرا۔ آپؒ نے اس سے دریافت کیا۔ "کیوں بھئی کیا بات ہے؟ سر پر پٹّی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

حضرت رابعہؒ نے پوچھا۔ "تمہاری عمر کیا ہے؟"

اُس نے کہا۔ "تیس برس۔"

آپ نے دریافت کیا۔ "تم اس مدت بیمار رہے یا تندرست؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں کبھی بیمار نہیں ہوا ہمیشہ تندرست رہا ہوں۔"

حضرت رابعہؒ نے فرمایا۔ "تیس برس صحت کی دولت سے مالا مال رہنے کے باوجود کبھی اپنے سر پر شکر کی پٹّی نہیں باندھی۔ آج تیرے سر میں درد ہو گیا تو مخلوقِ خدا کے سامنے شکایت کی پٹّی سر پر باندھے پھرتا ہے۔"

ایک دفعہ حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں خربوزہ پیش کیا گیا۔ آپؒ نے خربوزہ کھانے سے انکار کر دیا۔ فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوزہ کس طرح کھایا ہے کہیں میں ترکِ سنّت کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔

آدابِ عرض

س۔ دنیا کی سب سے خطرناک پولیس کون سی ہے؟

ج۔ بینڈ باجے والی پولیس کیوں کہ اُن کا قید کیا ہوا عمر بھر رہا نہیں ہو پاتا۔

س۔ وقت کی قیمت کا اندازہ کب ہوتا ہے؟

ج۔ عموماً آخری وقت آنے پر۔

س۔ جھوٹ کیا ہے؟

ج۔ اگر پکڑا جائے تو مذاق ورنہ آرٹ ●

کام کی باتیں

(۱) لکھتے وقت روشنائی کپڑے پر گر جائے تو اس پر جاذب کا ٹکڑا رکھ کر جذب کر دو۔ پھر فوراً تھوڑے سے دودھ میں دھبے کی جگہ بھگو دو۔ اور آہستہ آہستہ ہاتھ سے ملو۔ داغ بالکل مدھم رہ جائے تو صابن اور پانی سے دھو دو۔ دودھ نہ ملے تو لیموں کاٹ کر نچوڑ دو۔ اور سوکھنے پر دھو ڈالو یا آم کی کھٹائی کچل کر مل دو۔

(۲) کسی کپڑے پر چکنائی کا دھبا لگ جائے تو اس کے نیچے اور اوپر بالکل صاف جاذب رکھ کر گرم استری سے دبا دو۔ چکنائی جاذب میں آجائے گی اور کپڑا صاف ہو جائے گا۔

(۳) کوئی کپڑے کی چیز میلی ہو گئی ہو اور دھل نہ سکے تو ایک سفید کپڑے کے ٹکڑے کو پٹرول میں تر کر کے آہستہ آہستہ ملو۔ صاف ہو جائے گا۔

(۴) اگر آیوڈین لگاتے وقت کپڑے پر گر جائے تو فوراً دودھ میں بھگو دو۔ ورنہ داغ نہ چھٹے گا۔

(۵) پنسل سے کام کرتے وقت ربر نہ ملے تو ڈبل روٹی کا ملائم گودا نکال کر گولی بنا لو ربر کا کام دے گا۔

(۶) میدے کی لئی بناتے وقت ایک چمچہ شکر ملا دو اور پتلی رکھو۔ زیادہ اچھی طرح چپکے گی۔

(۷) کسی پھل کا عرق کپڑے پر گر جائے تو فوراً پسا ہوا نمک مل دو۔ اور دھو ڈالو۔ اگر ہاتھ میں لگا ہو تو لیموں کاٹ کر ہاتھ پر خوب ملو اور پھر نمک سے ہاتھ دھو ڈالو۔

ہاجرہ بیگم۔

گھوڑی کی ۳۵ فٹ کی چھلانگ

عام طور پر کوئی گھوڑا اس طرح کی چھلانگ نہیں لگا سکتا لیکن یہ گھوڑی جسے اس قسم کے کرتبوں کی تربیت دی گئی ہے فلوریڈا میں کاریں فروخت کرنے والی ایک کمپنی کی طرف سے منعقدہ نمائش میں ۳۵ فٹ اونچے پلیٹ فارم سے ایک تالاب میں چھلانگ لگا رہی ہے اور اسے ہر روز اس کرتب کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

جاگو جگاؤ

انسان دنیا میں رہتا ہے تو اس کو ہر قسم کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ سونے جاگنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے سے لے کر پڑھنے لکھنے تک ہر کام ضروری ہے۔ یہ سب کام زندہ رہنے کے لیے ہیں۔ ہر انسان زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اسلام نے بھی ہمیں ان کاموں سے نہیں روکا ہے، بلکہ ان کاموں کو صحیح طریقے سے کرنے کی ہدایت کی ہے۔ بعض لوگ دنیا کی محبت کو بُرا کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام نے دنیا سے نفرت کرنے کی تعلیم دی ہے، لیکن ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اسلام فطری مذہب ہے۔ وہ کسی ایسے کام کو منع نہیں کرتا جو فطرت کے مطابق ہو اور جس کو کرنے سے دوسرے انسانوں کو یعنی اللہ کی مخلوق کو تکلیف نہیں پہنچتی ہو۔ مثال کے طور پر ہر آدمی کو زندہ رہنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا پیسہ کمانا بُرا یا ناجائز نہیں ہے، لیکن یہ کمائی محنت اور دیانت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ محنت کے بغیر اور دھوکا دے کر یا جھوٹ بول کر جو پیسہ کمایا جائے وہ اچھا نہیں ہے اور اسلام نے اس کو حلال قرار نہیں دیا ہے۔ ایسے پیسے میں برکت بھی نہیں ہوتی۔

اسی طرح علم حاصل کرنا بھی بڑی اچھی بات ہے، چاہے وہ علم دین کا ہو یا سائنس کا، لیکن علم حاصل کرنے میں بھی کوئی غلط طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ علم تو حاصل ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ زندگی گزارنے کا صحیح راستہ معلوم ہو۔ صحیح راستہ یہی ہے کہ انسان دنیا میں رہے، لیکن دین کو نہ بھولے۔ ہر کام کرے، لیکن نیت اچھی رکھے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو یاد رکھے۔ دنیا کی محبت کو اعلا اصولوں پر، سچائی، ایمان داری، شرافت اور انسانیت پر غالب نہ آنے دے۔ ہر کام کرتے وقت جہاں اپنا، اپنی بھلائی کا خیال رکھتا ہے وہاں ملک اور ملت کا بھی خیال رکھے۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

بچوں کی مذہبی کتابیں

سب سے بڑے انسانؐ	۲/۵۰	ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۷/۰
حضرت محبوب الٰہیؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل)	۴/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت فریدالدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۲/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	ارکان اسلام	۲/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	۰/۴۰	عقائد اسلام	۳/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	چار یار	۴/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا اوّل	۷/۵۰	خلفائے اربعہ	۶/۵۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	نبیوں کے قصے	۵/
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
اللہ کے صفی	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	سرکار دو عالمؐ	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سچّائی کی قیمت

سید اوصاف علی دہلوی

دوپہر کا وقت ہے۔ عرب کا گرم ریگستان۔ گرمی اللہ کی پناہ! آگ برس رہی ہے۔ اس حالت میں ایک عرب نوجوان اونٹ پر سوار چلا جاتا ہے، مگر تیز دھوپ سے بہت پریشان ہے اور نخلستان (وہ جگہ جہاں بہت سے کھجوروں کے درخت اُگے ہوئے ہوں) کی تلاش میں ہے تاکہ کچھ دیر آرام کرے۔ یکایک دُور سے کھجوروں کے درخت نظر آتے ہیں اور وہ پُرخوش نما نخلستان میں پہنچ جاتا ہے۔ سائے دار درختوں میں پہنچ کر اُونٹ سے اُترتا ہے۔ اونٹ کو بٹھا کر گھٹنا باندھتا ہے۔ چشمے پر ہاتھ منھ دھو کر پانی پیتا ہے۔ روح میں تازگی محسوس ہوتی ہے جسم و جان اور قلب و جگر کو سکون سا ملتا ہے اور طبیعت آرام پر آمادہ ہوتی ہے۔ اور اس کیفیت میں نیند آجاتی ہے۔ عرب نوجوان عالم بیداری سے عالم خواب کی حسین دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ اونٹ گھٹنے کی رسّی توڑ کر آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ درختوں کے پتے چٹ کرنے لگا۔ نخلستان کے بوڑھے مالک نے جب یہ تماشا دیکھا تو نوجوان کو آوازیں دیں، مگر وہ تو میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اب بوڑھے نے مجبوراً اونٹ کے پتھر مارا، مگر اتفاق کی بات کہ اونٹ کے پتھر کچھ ایسا لگا کہ وہ زمین پر گر کر ڈھیر ہو گیا۔ اب درختوں کے پتے تو محفوظ تھے، لیکن اونٹ مُردہ حالت میں فرشِ خاک پر پڑا تھا۔ بوڑھا پریشان ہو گیا۔

جب عرب نوجوان بیدار ہوا۔ تو کیا دیکھتا ہے اونٹ مَرا پڑا ہے۔ سامنے دیکھا بوڑھا چلا آتا ہے۔ نوجوان نے پوچھا، "کیا تم کو خبر ہے اونٹ کو کس نے مارا ہے؟" بوڑھا بے اختیار بولا، بدقسمتی سے میرے ہاتھوں مَرا ہے۔" یہ جواب سُن کر نوجوان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور غضب ناک ہو کر بوڑھے کا کام تمام کر دیا۔ بوڑھا مَر چکا تھا اور نوجوان حیرت زدہ تھا۔ بوڑھے کو دیکھتا

تھا اور پچھتاتا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے آکر اچانک دو آدمیوں نے نوجوان کو گرفتار کر لیا۔
اب وہ نوجوان سراپا غم بنا کھڑا تھا اور اُس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔
یہ حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ حکم رانی تھا۔ جب کہ ہر طرف عدل و انصاف کا بول بالا تھا اور واقعی "قانون کی حکم رانی" تھی۔ قانون کی نظر میں ہر امیر اور غریب برابر تھا۔ مدینہ اس مقام سے بہت دُور نہ تھا۔ وہ دونوں آدمی بوڑھے کے بیٹے تھے۔ نوجوان کو دربارِ خلافت میں لے گئے اور صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ نوجوان نے بوڑھے باپ کو کس بے دردی کے ساتھ قتل کیا ہے۔
یہ دَور مکر و فریب کا نہیں تھا۔ نوجوان نے نہ صرف اظہارِ افسوس کیا بلکہ اقبالِ جرم بھی کر لیا۔
چناں چہ عدالتِ عالیہ نے قتل کے جرم میں سزائے موت کا حکم سُنا دیا۔
فیصلہ ہو چکا تھا جو اسلامی قانون کے عین مطابق تھا۔ حسبِ دستور امیر المومنین نے آخری خواہش پوچھی تو نوجوان بولا: "اے امیر المومنین! رسولِ پاکؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ اپنے اوپر قرض لے کر کبھی مت مرنا اور بدقسمتی سے میں ایک یہودی کا مقروض ہوں۔ بس اتنی اجازت اور مہلت عنایت کیجیے کہ میں قرض اُتار آؤں، پھر اپنے کیے کی سزا بھگت لوں گا۔" حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: "بے شک! اس اعتبار سے تم کو عارضی طور پر رہا کیا جا سکتا ہے، بشرطے کہ تمھاری کوئی ضمانت دے۔" لیکن نوجوان کا تو کوئی واقف کار نہ تھا۔ مجبور و بے بس۔ حیران و پریشان کھڑا تھا کہ مشہور صحابی حضرت ابُوذر غفاریؓ کھڑے ہوئے اور کہا:
اِس نوجوان کی مَیں ضمانت دیتا ہوں۔ ان الفاظ نے بھرے مجمع کو حیرانی میں ڈال دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:
"اے ابُوذر غفاریؓ! آپ صحابیِ رسولؐ ہیں۔ خوب سمجھ لیجیے کہ ضمانت دینے کا کیا مطلب ہے؟ اگر نوجوان نے دھوکا دیا تو پھر آپ کو قتل کیا جائے گا۔ کیا آپ کو یہ شرط منظور ہے؟" جواب میں کہا:
"میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ نوجوان خود کو دوسروں سے بیگانہ اور بے سہارا سمجھے۔ اسلامی رشتے کی روشنی میں یہ میرا بھائی ہے، اس لیے مجھے اس پر اعتماد ہے۔ میں اپنی خوشی و خواہش سے ضمانت دے رہا ہوں۔"
نوجوان ضمانت پر عارضی طور پر رہا کر دیا گیا اور واپسی کے لیے ایک مدّت مقرر کر دی گئی۔

نوجوان بہت دور دراز علاقے کا باشندہ تھا، اس لیے تیزی کے ساتھ گھر پہنچا اور اہلِ خاندان کو تمام دکمال ماجرا سنایا۔ گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ سب نے مشورہ دیا، "جان ہے تو جہان ہے۔ اب مدینے مت جاؤ۔ تم کو کون پکڑنے آتا ہے۔ جو کچھ ہونا تھا، اُس پر خاک ڈال دو۔" بے شک نوجوان راہِ فرار اختیار کر سکتا تھا، مگر یہ تو اُس کے ایمان کی پرکھ کا وقت تھا اور وہ دنیا سے اپنے ایمان کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ایک سچے مسلمان کی باعزت موت مرنا چاہتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ آخرت میں نجات کا اصل ذریعہ نیک اعمال ہوں گے۔ اِس عارضی دُنیا کی اُس مستقل دُنیا (عاقبت) کے مقابلے میں کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ چند روزہ بہار پر اُخروی انعام کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ نوجوان کا جواب تھا:

"وعدہ خلافی کرنا مسلمان کی شان نہیں ہے۔ میں ضرور جاؤں گا۔"

یہ کلمات ادا کیے اور یہودی کا قرض اُتارنے چل دیا۔ اس کے بعد پھر فوراً تیز رفتار سانڈنی لے کر مدینہ منورہ کی طرف بڑھتا چلا گیا، لیکن راستے میں کچھ رُکاوٹ آنے کی وجہ سے دیر ہو گئی۔

آج نوجوان کی مُدت کا آخری دن تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی خیر نہیں۔ نوجوان کے بدلے زندگی قربان کرنا ہو گی۔ دوسری طرف حضرت عمرؓ بھی بہت فکر مند تھے۔ ان کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ گومنت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اِدھر عوام کی نگاہیں منتظر تھیں، مگر اُدھر آنے والے کا تو نام و نشان تک نہ تھا۔ وقت تیزی کے ساتھ نکلا جاتا تھا۔ عجب سماں تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ میدان میں کھڑے تھے اور جلاد حکم کا منتظر تھا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا چراغِ حیات گُل ہونے ہی والا تھا کہ یکایک شور مچا۔ آواز بلند ہوئی، "رک جاؤ۔ اُدھر دیکھو۔ دُھول میں کوئی گھوڑا ہے۔" چشم زدن میں نوجوان پورے وقار اور ایمان کے ساتھ ہشاش بشاش سامنے کھڑا تھا۔ لوگ بے اختیار پکار اُٹھے، "واقعی نوجوان سچا نکلا۔ آفرین ہے اس کے عزم و عمل اور قوتِ ایمانی پر۔" نوجوان نے معذرت کی اور بتایا کہ راستے میں زین ٹوٹ جانے کی وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ تاہم یہ بات باعثِ مسرت اور اطمینان بخش ہے کہ میرے عظیم محسن کی زندگی محفوظ رہی۔ بہرحال اب میں سزا پانے کے لیے حاضر ہوں اور نیک تمناؤں کے ساتھ خدا حافظ کہتا ہوں۔

عرب نوجوان کی سچائی، بلند کرداری اور پابندیٔ عہد نے سب ہی کو حد سے زیادہ متاثر کیا اور لوگ دل ہی دل میں دعا کرنے لگے "الٰہی! اس نوجوان کو سلامت رکھ۔ یہ ایک روشن چراغ ہے۔" اتنے میں یکایک بوڑھے مقتول کے دونوں بیٹے عوام کے درمیان سے نکل کر حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے آئے اور باادب کھڑے ہو کر التجا کرنے لگے:

"امیر المومنین! ہم دونوں اپنے باپ کا خون معاف کرتے ہیں، کیوں کہ یہ نوجوان ایک بہترین مسلمان ہے، اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے لیے قتل کیا جائے۔"

یہ سُن کر عمر فاروقؓ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن یہ آنسو خوشی کے تھے۔ آپ نے بے اختیار فرمایا کہ "اللہ تم کو خوش رکھے۔ تم نے بالکل میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری بھی یہی آرزو تھی کہ کسی طرح اللہ اس نوجوان کو بچا لے۔ بہرحال اس احسان اور ایثار کے لیے میں تمھارا ممنون ہوں اور نوجوان کو آزاد کرتا ہوں۔" یہ روح پرور منظر دیکھ کر سب کے دل اللہ کے شکر گزار اور سچی مسرتوں سے ہم کنار ہو گئے۔




سیٹھ: کھانے کا بل ادا نہ کرنے پر میں اس کی پٹائی کر رہا ہوں لیکن تمہیں مارنے کی کیا ضرورت ہے؟
بیرا: آپ اسے مار کر کھانے کا بل وصول کر رہے ہیں تو میں اپنی ٹپ وصول کر رہا ہوں۔


ناراض نہ ہوں۔ آپ کے دوست کو میں نے صرف یہ کہلا بھیجا کہ منے کے ابو کنجوس ہیں آپ کی دعوت تو قیامت کے دن ہی ہوگی۔
بیگم! تمہیں اس مہنگائی کے دور میں دعوت کا دن مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

نئی اور دلچسپ کتابیں

بچوں کے ذاکر صاحب	۴/۰۰
ٹوٹے کھلونے	۴/۰
اندھے کا بیٹا	۴/۵۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۴/۰۰
سہانے ترانے	۴/۵۰
ہرن کا دل	۲/۰۰
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/۰۰
گوہر شہزادی	۳/۰۰
شریر شیرا	۳/۰۰
پری رانی	۳/۰۰
خطرناک سفر	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۴/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۰۰
ننھا جیرو	۲/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۰۰
پلک نہ مارو	۴/۰۰
ایک کھلا راز	۳/۰۰
بابا نامہ	۲/۰۰
بچوں کے افسر	۵/۰۰

پہاڑ کی چوٹی پر	۵/۰۰
رنگوں کی بستی	۲/۵۰
سرخ جوتے	۳/۰۰
سلامر و صمصام	۴/۵۰
شرارت	۲/۰۰
صحت کے ۹۹ نکتے	۱/۵۰
صحت کی الف بے	۳/۰۰
جدید پہیلیاں	۶/۰۰
مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
ننھا فرشتہ	۴/۵۰
نیلا ہیرا	۴/۵۰
ماں کی کھیتی	۲/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰
سرکار کا دربا	۴/۵۰
دنیا کے جانور	۲/۵۰
آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰
اس نے کیا کر نہ جانا	۱/۲۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
جوہر قابل	۲/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰
محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰

مسلمان بیبیاں	۴/۰۰
پیارے رسول	۴/۵۰
چار یار	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۳/۰۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
تاک دنا دن تاک کے مے	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
ایک دیس ایک خون	۳/۰۰
جیت کس کی؟	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
جادو کا گھر	۱/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
ہپو چپو	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
شیر خاں	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵۰

سمندر

دوسری دنیا کی تلاش میں نکلنے والے ملک کے سائنس دانوں
کی داستان جنھیں ایک امن پرست قوم سے واسطہ پڑا تھا
سائنس فکشن پر تلخ انجام کی ایک خوب صورت کہانی

سلمیٰ کنول قاسمی





"ٹرن ... ٹرن ... ٹرن ..." ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل چیخ رہی تھی مگر پروفیسر شیر خان مسلسل کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تو پروفیسر نے جھلا کر ریسیور کان سے لگا لیا۔ "یس! شیر خان اسپیکنگ۔"

"ہیلو شیر خان! میں جیلانی بول رہا ہوں۔"

"اوہ جیلانی! سناؤ کیسے ہو؟"

"اب تک تو میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم میرے پاس فوراً ہی نہ آئے تو ہو سکتا ہے

کہ میں بالکل ہی نئی دریافت کھو بیٹھوں گا۔ پروفیسر جیلانی کا مزاح رفتہ رفتہ سنجیدگی میں بدل گیا۔

" لیکن یہ تو بتاؤ میں ابھی ہی کیوں آؤں؟"

" ٹیلی فون پر بحث مت کرو۔ بس موقع ملتے ہی چلے آؤ۔ کام بہت ضروری ہے۔"

" اچھا تم انتظار کرو میں آرہا ہوں۔" یہ کہہ کر دونوں کے درمیان رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

پروفیسر شیر خان ملک کے مایہ ناز کیمیا دان تھے۔ انھوں نے سائنس کی پل پل بدلتی دنیا میں ایک نئی دریافت سے ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ تمام ممالک میں ہلچل مچ گئی تھی۔ پروفیسر شیر خان نے ایٹم بم کی تیاری میں استعمال ہونے والی یورینیم کی جگہ ایک نیا جوہری مادہ ایکس پلوٹونیم دریافت کیا تھا۔

اس وقت وہ اپنے دفتر میں ضروری کام کر رہے تھے کہ ان کے پرانے دوست پروفیسر جیلانی کا فون آگیا۔ دونوں ہی کو زمانۂ طالب علمی سے نئی نئی دریافتوں کا شوق تھا۔ سائنس کے متعلق آنے والی ہر نئی کتاب ان کی توجہ اور دلچسپی کا باعث بنتی تھی۔ پروفیسر شیر خان کیمسٹری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جبھی ایم ایس سی کیمسٹری میں انھوں نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور جوہری مادے پر تحقیقی کام کر کے نیا جوہری مادہ ایکس پلوٹونیم دریافت کیا۔ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل وہ اسی دریافت میں سنجیدگی کے ساتھ کام میں مصروف تھے۔

پروفیسر جیلانی طبعیات کے رسیا تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی سے طبعیات کے مضمون پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آج کل وہ یونیورسٹی میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ کسی پراجیکٹ پر کام بھی کر رہے تھے۔

جس وقت پروفیسر شیر خان، جیلانی کی لیبارٹری میں داخل ہوئے، پروفیسر جیلانی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ "آہا! پروفیسر خان۔" پروفیسر جیلانی نے آگے بڑھ کر پروفیسر سے ہاتھ ملایا۔

"آؤ خان میں تمہارا تعارف ان سب سے کراتا ہوں۔" پروفیسر جیلانی یہ کہہ کر گھومے اور ایک لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے۔ "ہاں تو خان یہ آمنہ ہیں۔ انھیں علی کہتے ہیں اور وہ سامنے یاسمین ہے۔ سمیرا گل بھی ہمارے گروپ میں شامل ہیں مگر آج وہ چھٹی پر ہیں۔ ہم سب ایک تھیوری پر کام کر رہے ہیں۔"

پروفیسر نے مسکرا کر سب کو سلام کیا

جواب دیا تو پروفیسر جیلانی دوبارہ کہنے لگے۔
"اب میں بتاؤں کہ اس جگہ تمھیں کیوں زحمت دی گئی ہے؟"

"یقیناً تم اپنی تازہ غزل ہمیں زبردستی سناؤ گے۔" پروفیسر خان نے مُسکرا کر کہا تو پروفیسر جیلانی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور پھر سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "سنو! میں نے دوسری دنیا دریافت کر لی ہے۔"

"کیا... ؟... کیا تم نے اینٹی ورلڈ دریافت کر لیا۔ تم یقیناً پاگل ہو چکے ہو۔" پروفیسر خان نے غیر یقینی کے عالم میں کہا۔

"تم یقین جانو خان! میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ تمھیں یاد ہوگا میں نے تمھیں ایک دُوربین کے متعلق بتایا تھا۔ یہ ہے وہ کونکویکسو دُوربین جس کی مدد سے ہم لامحدود فاصلے تک دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے دوسری دنیا کو اسی دوربین کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ تمھیں یہ بھی پتا ہوگا کہ میں کئی مہینوں سے اسی پر تحقیق کر رہا تھا۔"

"اوہ... ہرگز نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔" پروفیسر خان کا لہجہ اب بھی ویسا ہی تھا۔

"یہ ممکن ہے پروفیسر خان! تم غور سے دیکھو، اس میں زمین ہی کی طرح کے اثرات نظر آتے ہیں۔" پروفیسر جیلانی نے اپنی

بارش کے موسم میں پانی یا تو زمین کی مٹی جذب کر لیتا ہے اور اکثر یہ جذب شدہ پانی چشموں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے یا پھر زمین کی سطح پر ہی بہتا رہتا ہے اور دریاؤں اور ندیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چٹانوں اور مٹی میں بھی اس کی کچھ مقدار شامل ہوتی ہے۔ دریا جب سمندر میں گرتا ہے تو یہ نمک بھی اس کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔ اس طرح بہت سے دریاؤں کا پانی اکٹھا ہو کر سمندر میں چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا پانی نمکین ہو جاتا ہے۔

ایجاد کردہ دُوربین میں چاند کی طرح روشن اور گول سیارے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ ہماری زمین سے کتنے فاصلے پر ہے؟" پروفیسر خان کا اشتیاق اب بڑھ گیا تھا۔

"یہ اینٹی ورلڈ ہمارے نظامِ شمسی سے بہت دُور ہے۔ تم جانتے ہو اس آسمان تلے اس قسم کے ہزاروں نظامِ شمسی ہیں۔ ان میں سے ایک نظامِ شمسی میں ہم بھی رہتے ہیں۔"

"گویا تمھارا دریافت کردہ اینٹی ورلڈ بھی اسی قسم کے ایک نظامِ شمسی میں موجود ہے؟" پروفیسر خان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" پروفیسر جیلانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جیلانی! میں اگر مان بھی لوں کہ یہ سیارہ تمھارا دریافت کردہ ہے تو"

آبادی بھی ہو گی؟"

"یقیناً نہیں۔ وہاں آبادی یقیناً ہو گی کیونکہ یہ دوسری دنیا ہے" پروفیسر جیلانی نے یقین سے کہا۔

"ممکن ہے وہ اسی نظامِ شمسی کا کوئی دوسرا ستارہ ہو" آمنہ کی بات پر پروفیسر جیلانی بولے۔

"نہیں۔ یہ ہمارے نظامِ شمسی میں نہیں ہے"

"اچھا جیلانی! تم مجھے اس اینٹی ورلڈ کی تھیوری بتاؤ" پروفیسر خان شاید اب بھی مطمئن نہ تھے۔ پروفیسر جیلانی نے سگار سلگایا اور آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگے "پروفیسر! ہر مادے کا مخالف مادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری دنیا کی ایک مخالف دنیا بھی موجود ہو گی جس میں ہماری دنیا کی طرح انسان رہتے ہوں گے"

"یہ ضروری تو نہیں" پروفیسر خان نے بیچ میں جرح کی۔

"دیکھو خان! سائنس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جب مثبت اور منفی آپس میں ملتے ہیں تو توانائی پیدا ہوتی ہے"

"اچھا بالفرض میں تمہاری بات مان لوں تو..." پروفیسر خان نے ہارتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تمہیں میری مدد کرنا ہو گی"

"اس کے لیے بندہ حاضر ہے" پروفیسر خان نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو پروفیسر! میں نے ایسا راکٹ ڈیزائن کر لیا ہے جو اس حیرت انگیز دنیا تک جا سکے مگر مسئلہ ایندھن کا ہے۔ فاصلہ اتنا طویل ہے کہ ہمیں بڑی مقدار میں ایندھن کی ضرورت ہو گی۔ کیا تم کوئی ایسا ایندھن ایجاد نہیں کر سکتے جو کم جگہ گھیرے اور اس کی توانائی بھی بھرپور ہو؟" پروفیسر جیلانی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں آج ہی سے اس پراجیکٹ پر کام شروع کر دوں گا۔ جب تک آپ سب اینٹی ورلڈ پر دوبارہ کام کریں میں کسی ایندھن کا سراغ لگاتا ہوں" یہ کہہ کر پروفیسر خان اٹھے اور سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

پانچ سال یوں گزرے کہ خبر ہی نہ ہوئی۔ اس دوران پروفیسر جیلانی اور ان کے ساتھی اینٹی ورلڈ سے مواصلاتی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر کامیابی نہ ہوئی کیونکہ اس رابطہ کے لیے مصنوعی سیارے کا اینٹی ورلڈ کے خلا میں ہونا ضروری تھا۔ تاہم تجربات سے انھیں یقین ہو چلا تھا کہ دریافت کردہ سیارے میں آبادی ہے۔

پہیلیاں

① اُس کے بازو ہیں نہ ٹانگیں
پھر بھی مارے خوب چھلانگیں
اُچھلا، کودا، دوڑ کے آیا
سب نے مار کے پرے بھگایا

② بیٹھا ہے وہ دانت نکالے
ہر شے اپنے مُنہ میں ڈالے
کھالے سب کچھ بنا چبائے
ہر اک اُس کا اُگلا کھائے

جوابات:۔ ۱۔ فٹ بال ۲۔ کدوکش

مرسلہ:۔ ریحان مرتضیٰ

اُس روز سمیرا تجربہ گاہ میں تحقیقات میں مصروف تھی کہ پروفیسر خان تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ "خیریت تو ہے پروفیسر صاحب؟" سمیرا تیزی سے اُٹھ کر اُن کے پاس آگئی۔

"پروفیسر جیلانی کہاں ہیں؟" انھوں نے بغیر کچھ بتائے کہا۔

"پروفیسر جیلانی تو گھر گئے ہوئے ہیں البتہ آمنہ اور یاسمین برابر والے کمرے میں موجود ہیں، کہیں تو انھیں بُلا دوں۔" لیکن سمیرا کے کہنے سے پہلے ہی علی اور آمنہ اندر داخل ہوئے۔ "کیا بات ہے سر؟ کچھ ہمیں بھی تو خبر ہو۔" آمنہ نے جلدی سے پوچھا۔

"بس تم جلدی سے پروفیسر جیلانی کو فون کر دو کہ وہ یہاں پہنچیں۔" پروفیسر شیر خان نے بدستور اسی بے چینی سے کہا تو علی، پروفیسر جیلانی کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

آدھے گھنٹے تک آمنہ اور علی کو عجیب سی بے چینی رہی۔ پروفیسر خان نے ان کو سسپنس میں مبتلا کر دیا تھا۔ سمیرا کی حالت بھی اُن سے مختلف نہ تھی۔ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد پروفیسر جیلانی تجربہ گاہ میں موجود تھے۔

"آخر کیا معاملہ ہے خان؟"

"سننا چاہتے ہو؟" پروفیسر خان نے سب کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔ ایک ایک پل مشکل سے کٹ رہا تھا۔ آمنہ سمیت سارے اُن کے پھڑکتے ہونٹوں کو دیکھ رہے تھے۔

"ہم عنقریب اینٹی ورلڈ جا رہے ہیں۔"

"کیا؟" چار چیخیں ایک ساتھ تجربہ گاہ میں حیرت سے گونجیں۔

"تو گویا آپ اینڈمن ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔" سمیرا نے خوشی سے مُکا فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" پروفیسر خان نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"مگر سر یہ ایجاد کب ہوئی؟" علی نے

ہے تابانہ پروفیسر کو مخاطب کیا۔
"آج سے ڈیڑھ سال قبل۔"
"مگر پروفیسر یہ تو زیادتی ہے کہ تم نے اس راز کو اپنے اس بڈھے سینے میں دفن کیسے رکھا" پروفیسر نے مصنوعی غصے سے کہا۔
"دراصل میں آخر تک تسلی اور اطمینان کا منتظر تھا اور بالآخر تحقیق و تجربوں کے بعد آج یہ حقیقت تم لوگوں پر آشکار کر رہا ہوں"
پروفیسر خان کا لہجہ اطمینان میں ڈوب چکا تھا۔
"مگر ایسا کون سا ایندھن ہے جو ہمیں اینٹی ورلڈ تک پہنچا سکے گا؟"
پروفیسر جیلانی دوبارہ گویا ہوئے۔
"خشک بیٹری سیل"
"کیا؟ خشک بیٹری سیل؟ ناممکن"
علی نے جرح کی تو پروفیسر خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "آپ سب کو یاد ہو گا کہ میں نے یورینیم کی متبادل ایک ایسی نایاب دھات دریافت کی ہے جو ایکس پلوٹونیم کہلاتی ہے۔ میں نے اس دھات میں یورینیم اور ایکس پلوٹونیم کو ایک تین کے تناسب سے ملایا تو ایک طاقت ور ایندھن وجود میں آگیا۔ ایکس پلوٹونیم اور یورینیم کے ملنے سے اس کی طاقت سوا لاکھ میگا واٹ کے برابر ہو گئی جب کہ ایک عام خشک بیٹری میں کروڑوں ذرات ہوتے ہیں۔ گویا یہ ہوا سیل اس کی نسبت کئی گنا زیادہ طاقتور ہو گیا۔"
"اوہ" علی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔
"اس بیٹری کا نام آپ نے کیا رکھا ہے" آمنہ نے سوال کیا۔
"میں نے اس کا نام یو۔ بیٹری رکھا"
"بہت خوب۔ نام اچھا بھی ہے اور سائنٹیفک بھی" پروفیسر جیلانی نے تعریف کی۔
"ہم نے جو راکٹ بنایا ہے اس میں یہ بیٹری سیل ایک ہزار کی تعداد میں آ سکتے ہیں" سمیرا نے پروفیسر خان کو بتایا۔
"ہاں میں جانتا ہوں۔ پروفیسر خان نے آہستہ سے کہا اور کچھ دیر خاموش رہ کر دوبارہ گویا ہوئے "اب اس کا طریقۂ کار سنو کہ راکٹ کس طرح ہمارے نظامِ شمسی کے باہر حرکت کرے گا۔"
"کس طرح؟"
سمیرا کی جلد بازی پر پروفیسر خان مسکرا کر دوبارہ بولے "نیوٹن کے قانونِ حرکت کے مطابق ایک جسم اس وقت تک ایک ہی سمت حرکت کرتا رہے گا جب تک کہ

اس پر کوئی بیرونی قوت اثر انداز نہ ہو۔ اِسی لیے جب ہم راکٹ کو چھوڑتے ہیں تو وہ مستقل رفتار سے حرکت کرتا ہے کیوں کہ ہماری دنیا کے باہر کشش ثقل نہیں ہے مگر چوں کہ ہم اپنے نظامِ شمسی سے باہر جائیں گے، اس لیے وہاں ہمیں کسی نہ کسی کشش کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس راکٹ کے ذریعے جب ہم نظامِ شمسی سے باہر نکلیں گے تو بیٹری سے چلنے والا انجن کام شروع کر دے گا۔ راکٹ کو ہم خود کنٹرول کریں گے۔"

"تو گویا ہم جانے کی تیاری کریں؟" پروفیسر جیلانی کے پوچھنے پر خان نے گردن اقرار میں ہلا دی۔

اینٹی ورلڈ جانے کے لیے بنائے جانے والے "سپر راکٹ" کے ذریعے پروفیسر جیلانی اور اُن کے ساتھی کئی بار زمین کے نظامِ شمسی سے باہر کامیاب چکر لگا چکے تھے۔ یہ ایک جدید راکٹ تھا مگر اس کی ساخت ایک عام راکٹ جیسی تھی۔

چند دنوں کے بعد ہی انھیں حکومت کی طرف سے اس نئے حیرت انگیز تجربے پر جانے کی اجازت مل گئی۔

دنیا بھر کے سائنس دان ملک کی اس دریافت اور "سپر راکٹ" کی ایجاد پر شدید

ڈاکٹر بنوں گا

محمد وسیم بن اشرف

اک فیصلہ کیا ہے
پورا اسے کروں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

روشن ستارہ بن کے
آگے قدم رکھوں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

گر پھنس گیا سفینہ
پار اس کو میں کروں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

کوئی بھی دُکھ ملا تو
ہنس کر اسے سہوں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

خدمت کی راہ جو ہو
اسی پر ہی میں چلوں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

[illegible]

...ی گئی ہے۔

...نے ... اور ان کے ساتھیوں کو ... قوم نے پُرجوش مبارک باد دی تھی ... نکم نے اپنی ورلڈ جانے کی تیاری ... سب نے اپنے ساتھ آکسیجن کے ... مقدار میں رکھ لیے تھے۔ مگر یہ ممکن ... ضروری نہیں کہ دوسری دنیا کے ... کے ذریعے سانس لیتے ہوں۔ ... ہے قدرت نے وہاں جاندار اجسام ... کے لیے کسی اور نظام کا ... ہو۔

... کے بعد سپر راکٹ اپنے ... پروفیسر جلالی اور ان کے ساتھیوں ... خلا میں نئی منزل کی سمت پرواز ... طویل سفر کے بعد راکٹ زمین کے نظام ... سے دور نکل چکا تھا۔ سورج کی ... کی رفتار 3×10^8 کی نسبت راکٹ کی رفتار اس سے ایک ... زیادہ تھی۔

... راکٹ کے سفر کو ایک عرصہ ... گیا تھا

[illegible] ... گیا۔

"وہ دیکھو، سامنے ... ورلڈ کی بالکل ... نظر آرہی ہے۔"

"اسے ... " ... چلائی۔

"اب ہمارا سفر ... ایک ... ہو گیا ہے" پروفیسر جلالی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

چند ہی دنوں کے بعد ... سے کچھ فاصلے پر تھا۔ ... دنیا ایک اور سورج کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ ... ورلڈ کا سورج زمین کے سورج کے مقابلے میں چھوٹا تھا اور اس نظام شمسی میں صرف ایک ستارہ تھا جب کہ ہمارے ... نظام شمسی میں نو سیارے تھے۔

"پروفیسر خان! اب ہم نئی دنیا میں داخل ہونے والے ہیں" پروفیسر جلالی نے ... کا نظام خود سنبھالتے ہوئے کہا۔ ... تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ شاید ... معلوم نہیں ... تھا کہ ...

[illegible]

سے کہا مگر اگلے ہی لمحے وہ چونک کر رہ گئے۔ ان کے راکٹ کو کئی دوسرے جدید راکٹوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا جن کے اگلے حصوں سے نیلی رنگ کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ پروفیسر جیلانی کو ایک دھچکا لگا کیوں کہ ان کا راکٹ شعاعوں کی قید میں آکر آگے بڑھنے کی قوت کھو چکا تھا۔ اب سپر راکٹ اینٹی ورلڈ میں جا نہیں رہا تھا بلکہ زبردستی لے جایا جا رہا تھا۔ پروفیسر جیلانی نے بہت کوشش کی کہ اُن کا راکٹ ان عجیب و غریب شعاعوں کی قید سے آزاد ہو جائے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

"ہمیں قیدی بنا لیا گیا ہے" پروفیسر جیلانی کی خوف میں ڈوبی آواز گونجی۔

"پریشانی کی بات نہیں۔ یہ ہمیں تھوڑی ہی دیر میں چھوڑ دیں گے" پروفیسر خان نے اپنے دل کو بہلاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ خود دوسرے بھی جان چکے تھے کہ ان کے سارے لفظ کھوکھلے ہیں۔ سپر راکٹ جیسے ہی اینٹی ورلڈ میں رُکا، چند لوگ سرمئی رنگ کی گیندیں اٹھائے ہوئے ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے اُن کے دونوں ہاتھ گیندوں کی گرفت میں آ چکے تھے۔

"جدید ہتھکڑیاں" علی نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے" سمیرا نے اس کی تائید کی اور انہی لوگوں کے اشارے پر سامنے کی سمت چل پڑی۔ پروفیسر جیلانی اور اس کے باقی ساتھیوں نے بھی اُسی کی تقلید کی۔

یہ زمین سے ملتی جلتی دنیا تھی۔ یہاں درخت تھے۔ مکان تھے اور لوگ بھی اُن سے مختلف نہ تھے۔

"تم لوگ اپنے آکسیجن سلنڈر اتار لو" اچانک ایک آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ آواز و لب و لہجہ بالکل انہی جیسا تھا۔

"لیکن ہم اس گیند کی قید میں ہیں" پروفیسر جیلانی نے حکم دینے والے کو مخاطب کر کے تقریباً غصے سے کہا۔

"اوہ اچھا" اس نے دوبارہ کہا اور اُن کے کندھے سے آکسیجن سلنڈر اُتار لیے۔

"تم ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہو؟"

"جیل" اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" سمیرا چیخی۔

"غیر قانونی طور پر کسی کے نظامِ شمسی میں چلے آنا کیا جُرم نہیں؟" اینٹی ورلڈ کے آدمی کا لہجہ تیکھا تھا۔

"مگر ہم تو...؟" سمیرا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے لب دوبارہ ہلے "کیا تم خاموش

نہیں ہو سکتیں۔"
اسی دن پروفیسر جیلانی کو اُن کے ساتھیوں سمیت جیل میں قید کر دیا گیا تھا۔
"پروفیسر جیلانی! یہ کیا ہو رہا ہے؟" پروفیسر خان نے پریشانی سے کہا۔
"ہاں پروفیسر! کچھ خلافِ توقع ہو رہا ہے، مگر اب کوئی تدبیر سوچو یہ لوگ تو ہماری بات سننے ہی کو تیار نہیں" پروفیسر جیلانی کے لہجے میں بھی برہمی تھی۔
"لگتا ہے سر یہ لوگ سائنسی ترقی میں ہم سے کہیں زیادہ آگے ہیں" علی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔
"یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟" آمنہ نے ریاقت کیا۔
"دراصل جب ہم اس دنیا میں داخل ہوئے تھے تو ہمارا راکٹ نیلی شعاعوں کی قید کردہ گیا تھا۔"
"لیکن حیران کن بات تو یہ ہے کہ ہماری ا طرح کے لوگ اس ستارے میں رہتے ہیں" پروفیسر جیلانی نے آہستہ سے کہا۔
"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ کچھ پر کرو تاکہ رہائی نصیب ہو" پروفیسر خان قدرے برہمی سے کہا۔
"ممکن ہے ان لوگوں کا کوئی سربراہ ہو۔ ہمیں اس سے رہائی کی درخواست کرنی چاہیے" علی نے تجویز پیش کی۔ پروفیسر جیلانی کو یہ تجویز پسند آئی اور انھوں نے جیب سے پین نکال کر ایک ڈائری کے ورق پر لکھنا شروع کر دیا۔

جناب سربراہ صاحب!
"ہم آپ کے ستارے میں دوستانہ فضا کو پروان چڑھانے آئے ہیں۔ ہمارا تعلق ایک الگ نظامِ شمسی میں موجود ستارے ارتھ (زمین) سے ہے۔ ہم کسی مجرمانہ نیت سے آپ کے ستارے میں نہیں آئے۔ امید ہے آپ ہمیں صفائی کا موقع دیں گے۔
آپ کے دوست۔
پروفیسر جیلانی اور ساتھی۔

پروفیسر جیلانی نے درخواست مکمل کی اور ایک آنے والے شخص کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس کام کے بعد انھیں اپنے عمل کے ردِ عمل کا شدت سے انتظار تھا۔ دوسرے ہی دن اُن کی رہائی کا پروانہ آگیا اور انھیں ایک بلند و بالا بلڈنگ میں رہائش کے لیے بھیج دیا گیا۔ اتنی جلدی رہائی مل جائے گی اس کی کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔
"حالات کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں" سمیرا نے پردہ ہٹا کر باہر گھورتے ہوئے کہا۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مسلسل باہر دیکھتی رہی۔ سامنے ایک پارک تھا جہاں گول مٹول بچے کھیل رہے تھے۔ اس سے آگے ایک سڑک تھی۔ جہاں ٹریفک رواں دواں تھا۔ جس وقت سمیرا پلٹ کر آئی تو سب لوگ سو چکے تھے۔

شام کو جب وہ بیدار ہوئے تو اسی وقت ایک شخص وزیراعظم کا پیغام لے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے حکم پر وہ سارے عمارت سے باہر آ گئے۔ سامنے ہی چمکتی ہوئی بڑی سی کار کھڑی تھی۔ باری باری وہ تمام گاڑی میں بیٹھتے گئے۔ اچانک سمیرا چونک اٹھی گاڑی کا ڈرائیور موجود نہیں تھا مگر گاڑی خودبخود ایک سمت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کوئی ان دیکھی قوت اسے دھکیلے جا رہی ہو۔ پرائم منسٹر ہاؤس کے سامنے کار رک گئی اور تینوں اطراف کے دروازے خودبخود کھل گئے۔ پروفیسر جیلانی سر جھکا کر گاڑی سے نکلے تو دوسری طرف سے باقی ساتھی گاڑی سے باہر آ گئے۔ ایک شخص ان کی راہنمائی کرتا ہوا سب کو ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں لے آیا جہاں بڑی سی میز کے گرد کئی کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ سب ان سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ اسی وقت قدموں کی دھمک گونجی۔ وزیراعظم

مجسمۂ آزادی دنیا کے بڑے بڑے مجسموں میں سے ایک ہے یہ پاؤں سے لے کر مشعل کی چوٹی تک ۱۵۱ فٹ بلند ہے۔ یہ مجسمہ آزادی میں کنکریٹ اور گرینائٹ کے چبوترے پر ایستادہ ہے۔ سطح زمین سے مشعل کی چوٹی ۳۰۵ فٹ بلند ہے یہ مجسمہ تانبے کی چادر کا بنا ہوا ہے اور اس کے اوپر لوہا لگا ہوا ہے جس کا وزن ۴۵۰،۰۰۰ پونڈ ہے۔ اسے فرانسیسی عوام نے امریکی عوام کو ان کی آزادی کی یادگار کے طور پر تحفے میں دیا تھا۔

چلتے ہوئے اسی سمت آ رہے تھے وہ سب احترام میں کھڑے ہو گئے۔

"تشریف رکھیے" وزیراعظم نے شائستگی سے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ سر! کہ آپ نے ہماری رہائی کا حکم جاری کیا" پروفیسر جیلانی نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"دیکھیے میں آپ لوگوں کا شکریہ اس لیے قبول نہیں کر سکتا کہ ابھی آپ لوگ مکمل طور پر رہا نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی آپ پر مقدمہ چلے گا۔ فی الحال میں آپ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں"

"مگر کس جرم کے تحت ہم پر مقدمہ چلے گا" پروفیسر جیلانی الجھن کا شکار ہو گئے۔

"آپ "زمین" سے غیر قانونی طور پر ہماری دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ یہاں کیوں

آسکے ہیں" وزیراعظم کے الٹے سوال پر پروفیسر جیلانی نے اپنی تحقیق کی پوری کہانی سنا ڈالی۔

وزیراعظم نے صوفے سے ٹیک لگا کر کہا۔

"تو آپ ہماری دنیا کو اینٹی ورلڈ سمجھ کر دیکھنے آئے ہیں"

"جی ہاں! آپ درست سمجھے" پروفیسر خان نے کہا۔

"کیا آپ اپنے سیارے کے بارے میں کچھ بتائیں گے" پروفیسر جیلانی نے سوال کیا۔

"جی ہاں کیوں نہیں" وزیراعظم نے مسکراتے ہوئے کہا: "میں اپنے سیارے کے بارے میں بتانے سے پہلے آپ کو یہ بتانا پسند کروں گا کہ ہم وہ دوربین آج سے ایک لاکھ سال پہلے ایجاد کر چکے ہیں جو آپ نے اب ایجاد کی ہے۔ ہمارے سیارے کا نام "کیوبنس" ہے۔ ہم نے آپ کی دنیا کو اینٹی کیونیس کا نام دیا ہے ...ور کئی مرتبہ ہم آپ کی دنیا میں جا چکے ہیں"

"کیا؟" سارے حیرت سے چیخ اٹھے۔

"ہاں آپ کے اخبارات میں اکثر جو ...ن طشتریوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ...ے سیارے کی ہوتی ہیں۔ چند لمحوں تک ...وفیسر جیلانی اور ان کے ساتھی حیران رہے اور ...ر پروفیسر جیلانی بولے "تو گویا آپ کا اور ...ارا جرم برابر ہے۔ آپ زمین والوں سے رابطہ بھی تو قائم کر سکتے تھے"

"آپ کی بات درست ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ آپ کے سیارے کے لوگ شر پسند ہیں۔ دوستی کے پردے میں صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہیں۔ آپ زمین والے اس قابل نہیں کہ آپ سے کسی بھی قسم کا رابطہ رکھا جائے۔ ہاں آپ لوگوں کو میں درندوں کی جدید اقسام کہوں تو غلط نہ ہوگا"

"تو اس وقت کی آپ کی گفتگو کیا معنی رکھتی ہے؟" پروفیسر جیلانی نے غصے سے کہا۔

"یہ ایک مجبوری ہے ورنہ ہم آپ کی نگرانی تو اس وقت سے کر رہے تھے جب سے آپ لوگ اپنی آزمائشی پروازیں کر رہے تھے۔ آخر انسان نما جانوروں کو سزا بھی تو دینی چاہیے" وزیراعظم نے پھر طنز کیا۔ پروفیسر جیلانی اُن کی معلومات پر دنگ رہ گئے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان سب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل چکے تھے۔

"ہماری گرفتاری بلا جواز ہے ہم یہاں پُرامن طور پر آئے ہیں۔ دوستی کا پیغام لے کر..."

پروفیسر کا جملہ مکمل نہ ہوا وزیراعظم کا قہقہہ بلند ہوا "دوستی ... امن ... ہا ہا ہا۔ آپ زمین والے کیا جانیں کہ دوستی اور امن کیا ہے؟"

وزیراعظم کچھ دیر رُک کر بولے: "بہرحال ہمارے ستیارے کے دانشوروں نے آپ پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اُن سب کے خیال میں زمینی دنیا کے لوگ آستین کے سانپ ہیں۔"

"نہیں یہ غلط ہے" علی پوری قوت سے چیخا۔

"میری سفارش پر آپ لوگوں کو رہائش کی یہ جگہ دی گئی ہے ورنہ آپ لوگ واقعی قید خانے کے ہی قابل تھے۔ اب آپ لوگ واپس جایئے کل مقدمہ چلایا جائے گا۔ اگر آپ اپنی صفائی پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ٹھیک، ورنہ عدالت آپ کو سزا سنائے گی۔" وزیراعظم یہ کہہ کر واپس چلے گئے۔

دوسرے دن پروفیسر جیلانی اور اُن کے تمام ساتھی کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔ کمرۂ عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سات افراد پر مشتمل ججوں کا پینل سامنے بلند کرسیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرۂ عدالت میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پروفیسر جیلانی اور ان کے ساتھیوں کے دل بُری طرح دھڑک رہے تھے۔ لیڈر جج نے گلا کھنکار کر کہنا شروع کیا۔

"حاضرینِ عدالت! آج کا مقدمہ اِن چھ افراد پر چلے گا جو اینٹی کینو نیس سے غیر قانونی طور پر آئے ہیں۔ میں زمین کے ان اشخاص کو

کیا آپ جانتے ہیں کہ پانی شیشے کے برتن کی نسبت مٹی کے برتن میں جلد ٹھنڈا کیوں ہوجاتا ہے۔ شیشے کے برتن میں مسام بالکل نہیں ہوتے جس کی وجہ سے پانی جلد ٹھنڈا نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس مٹی کے برتن میں مسام ہوتے ہیں جس سے پانی مٹی کے برتن کی بیرونی دیواروں تک پہنچ جاتا ہے اور اس عمل سے پانی کی حرارت کم ہوتی رہتی ہے۔

بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں طریقۂ مقدمہ آپ کی زمین سے علاحدہ ہے۔ ہمارے ہاں ملزم اور جج کے درمیان براہ راست سوال و جواب ہوتے ہیں۔ اب آپ پر باقاعدہ فردِ جرم عائد کی جاتی ہے۔ آپ ہمارے ستیارے میں غیر قانونی طور پر آئے اور آپ سب کی آمد کا مقصد ہمارے پُرامن ستیارے میں فساد پھیلانا ہے۔ مسٹر جیلانی! چوں کہ اس ٹیم کے لیڈر آپ ہیں لہٰذا اس کٹہرے میں تشریف لائیں اور ان الزامات کی روشنی میں اپنی صفائی پیش کریں۔"

پروفیسر جیلانی چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتے ہوئے کٹہرے کی جانب آئے اور کہنا شروع کیا: "جج صاحب! پہلے تو میں اس الزام کی تردید کروں گا کہ ہم سب غیر قانونی طور پر آپ کے ستیارے میں داخل ہوئے ہیں کیوں کہ یہ بات ہمارے علم میں نہیں تھی کہ یہاں آبادی بھی ہوگی۔ دوسری بات اگر

آپ ہمارے اس طرح سیارے میں داخل ہونے کو جرم تصور کرتے ہیں تو پھر اسی جرم کے تو آپ بھی مرتکب ہوئے ہیں۔ کیا آپ کی اڑن طشتریاں ہماری زمین کے سیارے میں اکثر دکھائی نہیں دیتیں؟"

"اگر ہم اس بات کو مان لیں کہ آپ لوگ غیر قانونی طور پر ہمارے سیارے میں داخل نہیں ہوئے مگر کیا یہ الزام درست نہیں کہ آپ لوگ اس سیارے میں صرف فساد کی نیت سے آئے ہیں؟"

"میں اپنی بات پھر دہراؤں گا کہ ہم لاعلم تھے کہ اس سیارے پر آبادی ہوگی تو پھر فساد کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

"ہم یہ بات کیسے مان لیں۔"

"آپ ہمارے راکٹ کی تلاشی لے لیں۔"

"لیکن فساد کے لیے اسلحہ ضروری نہیں ہوتا۔ صرف ایک شاطر دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں اس بات سے انکار کروں گا۔"

"کیوں نہ تم سب کو سزائے موت دے دی جائے؟"

"لیکن کیوں۔۔؟" پروفیسر جیلانی چلائے۔

"اس لیے کہ تم زمین والے شر پسند ہو۔ تم لوگوں کا خاتمہ ہوگا تو کائنات سے درندہ صفت انسانوں کے خاتمے کا سلسلہ شروع ہوگا۔"

"ہم شر پسند نہیں ہیں۔ امن کے خواہاں ہیں۔"

"یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آپ اس وقت صرف پروفیسر جیلانی نہیں بلکہ اپنے سیارے کے نمائندہ بن کر آئے ہیں اور جب آپ لفظ "ہم" استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد آپ کے سیارے کے تمام لوگ ہوتے ہیں۔"

"میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں، ہم امن پسند ہیں۔" پروفیسر جیلانی نے سختی سے کہا۔

"امن پسند!" جج نے قہقہہ لگایا اور دوبارہ کہا: "آج کی صدی میں تم اپنے سیارے کا جائزہ لو۔ کیا کوئی مطمئن ہے؟ کیا کوئی خوش ہے؟ ہاں تم لوگ خوب صورت درندوں میں ضرور شمار کیے جا سکتے ہو۔"

"یہ غلط ہے۔"

"یہ درست ہے۔ کیا تم بھول جاتے ہو کہ تمہارا ستارہ ہر وقت جنگ کے خوف سے سہما رہتا ہے۔ بڑی طاقتیں تمہیں آپس میں لڑا کر اپنے ہتھیار فروخت کرتی ہیں۔ کیا تم لوگ اب بھی امن پسند ہو؟" جج کے سوال پر پروفیسر جیلانی کا سر شرم سے جھک گیا۔ جج

نے کچھ نہیں کہا تھا۔ پروفیسر کچھ دیر تک خاموش رہے اور دوبارہ بولے۔

"ہم مسلمان ہیں اور امن کے خواہاں ہیں۔"

"یہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے پروفیسر! تمہاری تاریخ جرأت کی حیرت انگیز مثالوں سے بھری پڑی ہے اور اسی قوم کی طرف دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ذاتی اختلافات میں جان کی بازی لڑا دینے والی قوم اپنے قبلۂ اول کو آج تک آزاد نہ کرا سکی۔ شاید موت کے خوف سے یا۔۔۔" جج بات ادھوری کر کے خاموش ہو گیا۔ پروفیسر جیلانی کو ایک دھچکا اور لگا۔

"ہماری طرف دیکھو! ہم سائنس کی ترقی میں تم سے کہیں زیادہ آگے ہیں مگر یہاں کے لوگ جنگ کے نام سے نابلد ہیں۔ سب امن و سکون سے رہ رہے ہیں۔" پروفیسر جیلانی بغیر کچھ کہے، سنے جا رہے تھے۔

پروفیسر جیلانی اور ان کے ساتھیوں پر تین ہفتے مقدمہ چلا۔ پروفیسر اور ان کے ساتھیوں پر جرح مکمل کر لی گئی تو اگلے دن مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے جج نے کہا: "جرح کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ زمین کے لوگ انتہائی سفاک اور ظالم ہیں۔ یہ لوگ انسانیت کے نام پر ایک بدنما داغ ہیں۔ عدالت زمین والوں کو انسانیت کے زمرے سے خارج کرتی ہے۔ عدالت ان کو سزائے موت اس لیے نہیں دے رہی تاکہ یہ لوگ زمین پر جا کر بتا سکیں کہ ایک سیارہ ایسا بھی ہے جہاں محبت کے پھول کھلے ہیں، امن کے گیت گائے جاتے ہیں۔ عدالت حکم دیتی ہے کہ ان تمام لوگوں کو اس سیارے کے بین الاقوامی چڑیا گھر میں رکھا جائے اور جس پنجرے میں انھیں رکھا جائے وہاں یہ عبارت جلی حروف میں درج کی جائے۔

"انسان نما بندر، درآمد شدہ سیارۂ زمین۔"

"عدالت حکم دیتی ہے کہ ان کو ایک سال کے بعد رہا کیا جائے۔ نیز ان کے پنجرے کو دیکھنے کے لیے تماشائیوں پر کوئی ٹکٹ نہ رکھا جائے۔"

پروفیسر جیلانی نے اس فیصلے کے خلاف وہاں کی سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی مگر اپیل مسترد کر دی گئی۔ پروفیسر جیلانی اور ان کے ساتھیوں کو نیشنل چڑیا گھر میں بند کر دیا گیا۔ ان کو ایک سال تک قید میں رکھا گیا۔ طرح طرح کے لوگ آتے اور ان کی ہنسی اڑاتے۔ پروفیسر جیلانی اور ان کے ساتھی بے بس تھے، شرمندہ تھے۔ زمین والوں کی

خود پسندی نے انہیں زندہ درگور کر دیا تھا۔

ایک سال کے بعد ان کو رہا کر دیا گیا۔ پروفیسر جیلانی اور ان کے ساتھیوں کو دوبارہ راکٹ فراہم کیا گیا۔ جس وقت وہ اپنے راکٹ میں سوار ہوئے۔ ان میں ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی بھی تاب نہیں تھی۔

علی نے راکٹ میں بیٹھ کر راکٹ کے تمام آلات چیک کیے۔ سب درست کام کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد سپر راکٹ زمین کی طرف پرواز کر رہا تھا مگر اس میں سوار تمام لوگ غم زدہ تھے۔ راکٹ میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور سب کی نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ راکٹ تیزی سے زمین کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ فاصلہ گھٹ رہا تھا۔ مسافتیں کم ہوتی جا رہی تھیں۔

آخر وہ اپنے نظام شمسی کے قریب پہنچ گئے۔ جیسے ہی علی نے سورج سے پرے ایک لمبا چکر کاٹ کر نظام شمسی میں داخل ہونا چاہا، اچانک سپر پاک راکٹ نے کام کرنا بند کر دیا۔ شاید سورج میں ہونے والے دھماکوں سے ایسا ہوا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سورج نے اپنی کشش راکٹ پر ڈالنا شروع کر دی تھی اور سپر راکٹ کشش کے تحت سورج سے قریب ہونے لگا۔ پروفیسر جیلانی سمیت تمام ساتھیوں کی چیخیں راکٹ کے پُرسکون ماحول میں ہلچل مچا گئیں۔ موت ان کے سامنے تھی۔ ان سب نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ راکٹ سورج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فاصلہ لمحہ لمحہ گھٹتا جا رہا تھا اور پھر۔ اور پھر اُن کا راکٹ موم کی طرح پگھلنے لگا۔ چیخیں ایک بار پھر اُبھریں اور خاموش ہو گئیں۔ آخری چیخ پروفیسر کی تھی جس کے بعد ہر طرف موت کی خاموشی چھا گئی۔

سپر راکٹ میں تمام لوگ زندہ جل کر مر گئے تھے۔ کیسی درد ناک موت تھی اور ان کی موت کے ساتھ ہی ایک ایسا راز کھلنے سے پہلے ہی دفن ہو گیا جو شاید دنیا والوں کے لیے عبرت کا باعث بنتا۔

زمین کی دنیا انگارہ بن چکی ہے۔ رات بھر فضاؤں میں قہقہے گونجتے ہیں۔ آسمانوں میں رہنے والی قوم اپنے سیارے سے ہر اندھیری رات میں تمسخر اُڑاتی ہے۔ اڑتی ہوئی اُڑن طشتریاں کھلکھلاتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ کیا ایسا ہوتا رہے گا؟ کیا بلندیوں میں بسنے والی قوم کا پیغام امن یوں ہی سربستہ راز بنا رہے گا؟ یا پھر کسی سپر راکٹ کی روانگی تک زمین والوں کو اس آگ کے سمندر میں جاگنا ہو گا؟





ایک راہ گیر، سائیکل سوار کی ٹکر سے گر پڑا۔ سائیکل سوار نے اُسے اٹھاتے ہوئے کہا "تم بہت خوش نصیب ہو۔"

راہ گیر غصّے سے بولا "ایک تو ٹکر مار کر میری پسلیاں توڑ دیں اور مذاق بھی اُڑاتے ہو؟"

سائیکل سوار نے سنجیدگی سے کہا "مذاق نہیں، میں دراصل ٹرک ڈرائیور ہوں۔ تم اس لیے خوش نصیب ہو کہ آج میں سائیکل پر سوار تھا۔ اسلم رشید

ایک صاحب گھر پر تھے کہ ایک خاتون اُن کی بیوی سے ملنے تشریف لائیں۔ اُنھوں نے پوچھا "کیا آپ کی بیگم گھر پر ہیں؟"

"جی نہیں۔" اُنھوں نے کہا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ کر انتظار کر سکتی ہوں؟"

"ضرور، تشریف رکھیے۔"

"وہ گئی کہاں ہیں؟" خاتون نے پوچھا۔

"قبرستان!"

"کب تک آئیں گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا خاتون! اُنھیں گئے ہوئے دو برس ہو چکے ہیں۔"

طاہرہ حسن



ایک شخص انتہائی زبردست حافظے کا مالک تھا اور کوئی شخص اُسے مات نہیں دے سکتا تھا۔ ایک دن شیطان نے اُس کا امتحان لینا چاہا۔ وہ اُس شخص کے پاس آیا اور پوچھا۔

"جناب! آپ انڈا کھاتے ہیں؟"

اُس شخص نے جواب دیا۔ "ہاں!"

یہ سُن کر شیطان غائب ہو گیا اور پھر چالیس سال بعد دوبارہ اُس شخص کے پاس واپس آ کر پوچھا "کیسا؟"

اس شخص نے فوراً جواب دیا "اُلّو ہوا"۔

عظمت جمال

ایک صاحب چلتے چلتے ایک خشک کنوئیں میں گر گئے۔ باہر نکلنے کے بہت سے راستے ڈھونڈنا چاہیے تھی۔ وہ چیخنے چلانے لگے۔ اتفاق سے ادھر سے ایک صاحب کا گزر ہوا۔ انھوں نے کنوئیں میں جھانک کر حیرت سے پوچھا "کیا تم اس کنوئیں میں کود گئے ہو؟"

وہ صاحب جھنجلا کر بولے "جی نہیں محترم! میں یہاں کھڑا تھا کہ لوگوں نے میرے ارد گرد دیوار کھڑی کر دی۔" محمد افضل سراج

عورت: آپ نے میرے ببلو کو کیوں مارا؟

ماسٹر: اس نے حساب میں ۱۵ پیسے کم جوڑے تھے

عورت: لیجیے ۱۵ پیسے آئندہ میرے بیٹے کو نہ ماریے گا۔ غلام مقصود۔ ارگاؤں (مہاراشٹر)

پچھلے دنوں دہلی میں فسادات کے کئی دن بعد لوگ ایک دکان کے آگے قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا آدمی ان لوگوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ وہ جب بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا لوگ اسے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیتے۔ آخر تنگ آکر اس نے کہا "اگر مجھے آگے نہیں جانے دو گے تو دکان کھولے گا کون؟" فائز مکان

جج (ملزم سے): کل صبح تمہیں پھانسی ہونے والی ہے، کیا کھانا چاہو گے؟

ملزم: روزانہ کی طرح ہی صبح سویرے۔ اس نے

کیا جواب دیا؟ ظفر محمود

ایک آدمی گھبرایا ہوا ڈاکٹر کے پاس آیا اور بولا "ڈاکٹر صاحب اگر آپ کے پاس ہچکی کی کوئی دوا ہو تو فوراً دے دیجیے۔"

ڈاکٹر نے کچھ کہے بغیر اس زور سے ایک تھپڑ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ شخص بے ہوش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو غصے سے پوچھنے لگا "یہ کیا حرکت تھی؟"

"شکر کرو تمہاری ہچکیاں تو بند ہو گئیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"مگر ہچکیاں تو میری بیوی کو آ رہی تھیں جو باہر کار میں بیٹھی ہے۔" حسن سلیم





اس نے بچپن میں بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھے تھے مگر پھر...؟
وہ کہانی جو ہمارے اطراف ہر وقت منڈلاتی رہتی ہے

بڑا آدمی

صالحہ صدیقی

*

وہ ٹافیوں کی تھال اٹھائے اسکول کے سامنے بیٹھا تھا۔ سورج بالکل اسکول کی منڈیر پر جھکا ہوا آگ برسا رہا تھا لیکن وہ اس سے بے نیاز تھا۔ ہاں جب پسینے کے قطرے اس کے چہرے پر لڑھکنے لگتے تو وہ انگلیوں کے پوروں سے جھٹک کر چہرہ صاف کر لیتا۔

جب وہ چھوٹا تھا تو اس نے بھی کئی خواب دیکھے تھے پڑھنے کے، بڑا آدمی بننے کے، مگر وہ ان خوابوں کی تعبیر نہ پا سکا۔ بس وہ روزانہ چھوٹا سا بن کر اسکول کے سامنے بیٹھ جاتا اور آتے جاتے اُن لڑکوں کو دیکھتا جو بیگ اٹھائے، کھکھلاتے ہوئے ہر فکر سے آزاد اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے

"نہ معلوم سارے دُکھ غریبوں کے حصّے میں ہی کیوں آتے ہیں؟" وہ اکثر تھک کر سوچتا اور دنیا و سے اسکول کے شور میں کھو جاتا۔

جب وہ تھال اٹھائے واپس پلٹ رہا تھا تو اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے خلافِ معمول آج وہ زیادہ تھک گیا ہو۔ ایک ایک قدم اُسے بھاری لگ رہا تھا۔ وہ اسکول کے پیچھے والی سنسان گلی سے گزر رہا تھا۔ یہ راستہ روڈ کے مقابلے میں کم تھا اور وہ جلد ہی سڑک پر نکل آتا تھا۔

"سنو!" ایک آواز سُن کر وہ ٹھہر گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک لڑکا کھڑا تھا۔

"جی" وہ قریب جاکر بولا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"رزّاق" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"کیا اِن ٹافیوں سے تمہارا گزارا ہو جاتا ہے؟" لڑکے کے عجیب و غریب سوال پر رزّاق گڑبڑا گیا۔

"نہیں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ لڑکا کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا "کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے۔"

"اور کوئی کام ملتا ہی نہیں" رزّاق نے رُ کہا۔

"میرے ساتھ کام کرو گے؟" لڑکے کی پیشکش پر رزّاق اس کے مزید قریب آ گیا۔

"جی ہاں جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے میں کل تمہارا اسی جگہ پر انتظار کروں گا" لڑکے نے کہا اور ایک سمت چل دیا رزّاق تمام راستے سوچتا رہا کہ اُسے فرشتہ مل گیا کل وہ اس تھال کو چھوڑ کر کوئی نیا کام کرے گا اور اب تو اُسے بڑا آدمی بننے کا خواب بھی پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ٹانگیں جو تھکن کے مارے ایک قدم بھی چلنے سے عاجز تھیں۔ اب تیز تیز چلتی ہوئی گھر کی سمت رواں دواں تھیں۔ شاید ساری تکلیفیں غموں سے پیدا ہوتی ہیں۔ آدمی مطمئن ہو تو ہر درد ختم ہو جاتا ہے" وہ یہی کچھ سوچتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ پھر اُسے پتا ہی نہ چلا اور گھر کا طویل راستہ ختم ہو گیا۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا اس کی ماں نیم کے پیڑ تلے جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی نماز سے فارغ ہوئی رزّاق فوراً اُٹھ کر ماں کے پاس گیا۔

"ماں! مجھے نوکری مل گئی ہے۔"

"کیا سچ؟" رزّاق کی ماں نے حیرت سے کہا

"ہاں ماں، اب ہمارے سارے دلدّر دُور ہو جائیں گے۔ نجمہ کے کپڑے بھی آ جائیں گے اور کاشف کے جوتے بھی، اور ہاں وہ نکڑ والے دکان والے سے کہہ دینا کہ روز روز گھر پر نہ آیا کرے جلد اس کو سارے پیسے مل جائیں گے۔"

"مگر بیٹا تجھے کہاں نوکری ملی ہے؟ کچھ پتا بھی تو چلے" رزاق کی ماں نے بے تابی سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی پتا نہیں لیکن بس کل سے مجھے نوکری مل جائے گی" اس نے اطمینان سے جواب دیا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔

اگلے دن وہ بالکل اسی وقت پر وہاں پہنچا جس وقت کل اُسے وہ لڑکا ملا تھا۔ اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ لڑکا اُسی کے انتظار میں کھڑا گرم جوشی سے ملا۔

"وقت کے پابند ہو بہت کامیاب رہو گے" یہ کہہ کر دونوں ایک سمت چل پڑے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ ایک گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ لڑکے نے دروازے کو ہاتھ کے زور سے دھکیلا اور رزاق کو اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ طویل راہداری سے گزرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے صوفے کے دبیز گدّے میں ایک شخص دھنسا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ عینک تھی اور ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ جسے وہ بار بار اپنے ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔

"سر! یہ لڑکا حاضر ہے جس کا میں نے کل تذکرہ کیا تھا"

"ٹھیک ہے تم اسے کام سمجھا دو" صوفے پر بیٹھے شخص نے بے اعتنائی سے کہا۔ دونوں واپس جانے کے لیے مڑے تو ایک آواز اُن کی سماعتوں

سے ٹکرائی۔

"جاوید! اسے کچھ ایڈوانس دے دینا"

"اچھا سر!" جاوید نے پلٹ کر جواب دیا اور دونوں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے دوبارہ باہر نکل گئے۔

رزاق کو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اسے ایک ہزار روپے کس بات کے دیے گئے ہیں!

اس سے اگلے روز صرف اس نے یہ کیا کہ ایک بریف کیس ایئر پورٹ پر کھڑے شخص سے وصول کیا اور ایک بریف کیس اس کے حوالے کیا۔ اس کام کے وقت جاوید دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ رزاق جونہی اس کے پاس آیا جاوید نے خوشی سے کہا: "واہ رزاق! تم نے بڑی صفائی سے کام کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہ کون سا مشکل کام تھا صرف ایک بریف کیس لینا تھا اور ایک دینا تھا" رزاق نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"سمجھ جاؤ گے۔ بہت جلد سمجھ جاؤ گے سب کچھ" جاوید نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور وہ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے ایئر پورٹ سے باہر آ گئے۔ جہاں ایک گاڑی انہی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جاوید نے بریف کیس رزاق کے ہاتھ سے لیا اور دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ رزاق بھی اس کے ساتھ ہی گاڑی میں گھس گیا۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی ایک سمت بھاگی چلی جا رہی تھی۔

جس وقت وہ لوگ اپنے اڈے پر پہنچے دن کے تین بج رہے تھے۔ جاوید اور رزاق دائیں جانب والے کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جب کہ برابر والے کمرے میں مال لینے کے لیے کوئی پارٹی آئی ہوئی تھی۔ ان کی دھیمی گفتگو لمحہ بہ لمحہ طویل قہقہوں میں بدلتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا سودا طے ہو گیا ہے۔

"جاوید! اس بریف کیس میں کیا تھا؟" رزاق نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے کچھ نہیں یار" جاوید نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہاں۔ جاتے ہوئے اپنی تنخواہ لے جانا۔"

"تنخواہ! مگر ابھی تو میرا مہینا بھی پورا نہیں ہوا۔" رزاق نے حیرانی سے کہا۔

"ارے چھوڑو! ابھی تو مزے ہیں اس کام میں ہر ہفتے ہی تنخواہ مل جاتی ہے" جاوید نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر واقعی جب رزاق جانے لگا تو جاوید نے ایک لفافہ رزاق کی جانب بڑھا دیا۔

"اس میں تین ہزار روپے ہیں احتیاط سے لے جانا۔"

"کیا... تین ہزار!" رزاق کا حیرت کے مارے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں... ہاں اب دیر نہ کرو۔ کل اسی وقت یاد سے آ جانا۔"

رزّاق وہاں سے حیران سا اٹھا اور لفافہ لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ تمام راستے وہ بار بار جیب میں پڑے لفافے کو ہاتھ پھیر کر دیکھتا اور اطمینان کرنے کے بعد تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب قدم بڑھانے لگتا۔

پہلی تنخواہ پر تو اس کے سارے گھر والے ہی دنگ رہ گئے تھے۔ خود رزّاق بھی حیران تھا مگر اس نے اپنی حیرت کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔

دوسرے دن وہ خلافِ معمول کچھ پہلے پہنچ گیا مگر جاوید پہلے ہی سے موجود تھا۔ ایک نیا بریف کیس کھولے وہ اندر پڑی چیزوں کو ترتیب دے رہا تھا۔ اسی وقت اندر سے چوکیدار اس کو بلانے آگیا۔ جوں ہی جاوید اٹھ کر باہر نکلا۔ رزّاق نے ڈرتے ڈرتے بریف کیس کھولا۔ اچانک اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اندر ہیروئن کی بہت سی پڑیاں تہ در تہ جمی ہوئی تھیں۔ ایک چھناکا سا اس کے دل میں ہوا ”ہیروئن“ وہ بریف کیس بند کر کے بیٹھ گیا۔ آج وہ پہلی بار اپنے کام سے واقف ہوا تھا اور اُسے پہلی ہی بار اپنے آپ سے شدید نفرت بھی ہوئی تھی۔ اس کا باپ ہیروئن کے نشے کا عادی ہو کر اُسے یتیم چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد رزّاق پر پے در پے مصائب کے پہاڑ گرتے رہے اور آج وہ اسی ہیروئن کو نامعلوم کن ہاتھوں میں بانٹ کر زندہ انسانوں کو موت کی خندق میں دھکیل رہا تھا۔ اس کے اندر کوئی پکار پکار کر اُسے ملامت کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں رہا اور پھر خیر و شر کی کشمکش میں شر خیر سے شکست کھا گیا۔

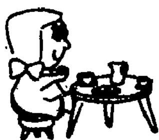
”میں کسی کو یتیم نہیں ہونے دوں گا“ اس نے پُرجوش لہجے میں کہا اور بریف کیس پر بھرپور لات رسید کی۔ ہیروئن کی پڑیاں فرش پر پھیل گئیں اور وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

اس رات سارے ہی گھر والے حیران تھے کہ رزّاق کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔

صبح جب وہ اٹھا تو اس نے اپنا پرانا تھال مانجھ کر صاف کیا اور رنگ برنگی ٹافیاں اس پر سجا دیں۔

”ارے رزّاق“ اس کی بہن نجمہ نے حیرانی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا ”تم تو بڑے آدمی بن رہے تھے اور دوبارہ یہ تھال...“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی رزّاق بول پڑا۔

”مجھے بڑا آدمی نہیں بننا“ یہ کہتے ہوئے وہ تھال اُٹھا کر پھر سے ایک نئے اسکول کی طرف چل پڑا۔



فرسٹ ایڈ

ڈوبتے ہوئے آدمی کو کیسے بچایا جائے

جویریہ

بچو! آپ اکثر دریا پر جاتے ہوں گے۔ وہاں کھیلتے ہوں گے، نہاتے بھی ہوں گے۔ کبھی خدانخواستہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے سامنے کوئی شخص سمندر یا دریا میں ڈوب جائے۔ ایسی ہنگامی حالت میں آپ کو اُسے بچانے کی کیا تدبیر کرنا چاہیے؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

ایسے موقع پر پھرتی دکھایئے اور اگر پانی کی سطح کم ہے تو ڈوبے ہوئے شخص کو وہیں ہوش میں لانے کی کوشش کیجیے ورنہ فوراً اُسے خشکی پر نکال لایئے۔ اُسے چت لٹا دیجیے۔ اُس کے کندھوں کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ جایئے۔ اُس کے سینے کی حرکت سے اس کی سانس محسوس کرنے کی کوشش کیجیے ورنہ اپنے گال کو اُس کی ناک کے قریب لے جا کر دیکھیے کہ اُسے سانس آ رہا ہے یا نہیں۔ اُس کا چہرہ ایک جانب موڑ دیجیے اور زبان باہر کی طرف کھینچ لیجیے تاکہ سانس کی نالی میں کوئی رکاوٹ نہ رہے اور اُسے قے کرنے میں آسانی ہو۔ اُس کے منہ میں اگر چیونگم یا ٹافی ہے تو اُسے نکال دیجیے۔

اُس کا سر تھوڑا سا اوپر کی طرف بلند کیجیے۔ ایک ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ٹھوڑی بلند کیجیے۔ اُس کی ناک بند کر کے اپنے پھیپھڑوں میں بہت سی ہوا بھر کر اُس کے منہ سے منہ ملا کر چار بار ٹھہر رُک کے اُس کے منہ میں زور سے پھونک ماریے۔

ڈوبے ہوئے آدمی یا بچے کا سینہ اگر سانس خارج کرنے کی وجہ سے پچکے تو فوراً لمبا سانس لے کر فی منٹ سولہ سانسوں کے حساب سے اسی طرح منہ سے منہ ملا کر پھونکیں۔

اگر آپ دیکھیں کہ سانس کا عمل فطری انداز سے شروع ہو گیا ہے تو اُس کا سر صحیح پوزیشن میں لے آئیں۔

اس کے بعد اُس کا ایک بازو اور اسی جانب والی ٹانگ کو اتنا اوپر لے جائیں جتنا ممکن ہو۔ اس طرح کرنے سے اُسے قے ہو گی اور پیٹ میں جمع شدہ پانی نکل جائے گا۔

ایک بار جب آپ اُسے مصنوعی طریقے سے سانس دلا دیں تو کوشش کریں کہ اُس کی غنودگی ختم ہو اور وہ مر نہ جائے۔ اُس کے بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر جسم کو کمبل میں لپیٹ دیجیے۔ کھانے پینے کو کچھ نہ دیجیے اور فوراً ماہرانہ طبی امداد حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔



ن حمیدی

جنگلی بھالو اور چالاک چوہا

ہمالہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے اس کی اونچی اونچی چوٹیوں پر ہمیشہ برفیلی ہوائیں
تی ہیں۔ برف کی وجہ سے اس کی چوٹیاں سفید سفید نظر آتی ہیں اور سورج کی تیز کرنوں میں
لتی ہوئی چاندی کی طرح نظر آتی ہیں۔ اسی پہاڑ کے میدانی علاقوں میں گھنا جنگل ہے۔
سی زمانے میں اسی جنگل میں ایک بھالو رہتا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایسی جگہ بنائی تھی
برف باری سے محفوظ رہتی تھی۔ اس کے غار کا سوراخ اوپر سے نیچے کی طرف تھا اسی لیے
علتے ہوئے برف کا پانی اس کے غار کے اندر نہیں جاتا تھا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ ہر طرف برف جمی ہوئی تھی۔ اسی لیے یہ بھالو اپنے غار کے اندر
ھا۔ وہ حد سے زیادہ بھوکا تھا۔ وہ اپنے پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لیے بچے کو
حقے کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔ بچے کو حقے کی طرح گڑگڑاتے ہوئے وہ موسم بہار کا خواب دیکھ
رہا تھا۔ موسم بہار میں اسے بھرپیٹ کھانا ملتا تھا۔ وہ خوشی خوشی چاروں طرف گھومتا تھا
اور اپنی پسند کا شکار کرتا تھا۔

بھالو کے غار کے قریب ہی ایک چھوٹا چوہا رہتا تھا۔ اس نے بھی اپنے رہنے کے لیے
چھوٹا سا سوراخ بنا لیا تھا۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔ وہ کھانے کے لیے سوراخ
سے نکلا۔ لیکن واپسی میں وہ اپنی رہائش گاہ والی راہ بھول گیا اور غلطی سے بھالو کے کان
کو سوراخ سمجھ کر گھس گیا۔

بھالو کے کان میں چوہے کے گھسنے کی وجہ سے حقے کی گڑگڑاہٹ بند ہوگئی۔ بھالو چونک

دبستان۔ گومو۔ دھنباد (بہار)

پڑا۔ اس نے فوراً چوہے سے اپنے کان کو بند کر لیا اور چوہے کو اپنے پنجے میں دبا لیا
پوچھا،
"تم میرے کان کو اپنا سوراخ سمجھ رہے ہو ــــــ؟ اب میں تمہیں اس طرح سبق سکھاؤں گا ــــــ!"
"نہیں میرے حضور" چوہا گڑگڑانے لگا۔ "مجھ پر رحم کیجیے، مجھ سے غلطی ہو گئی میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کیجیے، کبھی بھی آپ کے کام آسکتا ہوں ــــــ!"
جنگلی بھالو چوہے کی بات سن کر ہنس پڑا۔ اس نے سوچا، یہ چھوٹا سا چوہا میری کیا مدد کر سکتا ہے۔ میں جنگل کا طاقتور اور مضبوط جانور ہوں۔ وہ چوہے کی بات پر بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا لیکن چوہے کی آنکھ سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر مہربان ہو گیا۔ اسے چوہے پر رحم آگیا۔ بھالو نے چوہے کو چھوڑ دیا۔ وقت گزرتا گیا۔
موسم بہار کی ایک رات جنگل کے پیڑ پودے تاریکی میں ڈوب چکے تھے۔ بھالو تنہا باہر نکلا۔ اچانک شکاری کے جال میں پھنس گیا۔ اس نے جال سے آزاد ہونے کی بڑی کوشش کی۔ لگاتار کئی گھنٹوں تک زور آزمائی کرتا رہا لیکن اسے جال سے چھٹکارا نہیں ملا۔ اب اسے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا ایسا لگا کہ اب وہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔
بھالو کی چیخ و پکار اور گرج سن کر چوہا باہر آیا۔ چوہے نے دیکھا کہ اس کا طاقتور پڑوسی بے بسی سے پڑا ہوا ہے۔ چوہا دوڑتا ہوا گیا اور تیزی سے جال کی رسیاں کاٹنے لگا۔ چوہے کے دانت بہت مضبوط تھے لیکن جال کی رسی ریشم کی تھی اس لیے اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔
چند منٹ میں چوہے نے بھالو کو جال سے آزاد کرا دیا۔ اس کے بعد بھالو نے محسوس کیا کہ کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بھالو ہمیشہ چوہے کو اپنے غار میں بلانے لگا اور جاڑے کے موسم میں چوہے کو اپنے کان میں رہنے کی اجازت دے دی تاکہ چوہا ٹھنڈ سے محفوظ رہ سکے۔ اس طرح دونوں میل و محبت اور خوشی خوشی رہنے لگے۔

بقیہ صفحہ ۱۴
کام لیا تو وہ وقت دور نہیں جب ہمارے ملک میں بھی شمسی انجن اور شمسی مشینیں دستیاب ہو سکیں گی جس کی مدد سے اس ترقی یافتہ دور میں برقی قوت کی بڑھتی ہوئی ضروریات شمسی توانائی سے پوری ہوں گی۔



● ایک بادشاہ اپنی سالگرہ پر قیدیوں کو رہا کر رہا تھا۔ جب ایک بہت ہی ضعیف قیدی لایا گیا تو بادشاہ نے پوچھا تم کب سے قید ہو؟

قیدی نے جواب دیا :- میں آپ کے باپ دادا کے زمانے سے قید ہوں۔

بادشاہ نے کہا :- اسے پھر قید میں ڈال دو کیونکہ یہ ہمارے باپ دادا کی نشانی ہے۔

ضیا پروین۔ رام پور یو۔ پی

● ایک شخص کے تین نوکر تھے۔ ایک کا نام "کھارا" اور دوسرے کا نام "باسی" اور تیسرے کا نام "مہنگا" تھا۔ ایک دن ان کے گھر مہمان آگئے۔ تو گھر کے مالک نے مہمان سے پوچھا "آپ پانی پئیں گے؟"

مہمان :- "جی ہاں"

مالک :- (نوکر سے) "کھارا پانی لاؤ"

مہمان :- "نہیں نہیں شکریہ"

مالک :- "تو کھانا کھائیں گے"

مہمان :- "ٹھیک ہے"

مالک :- (نوکر سے) "باسی کھانا لاؤ"

مہمان :- "نہیں نہیں اب ہم جائیں گے"

مالک :- (نوکر سے) "اچھا مہنگا رکشہ لاؤ"

اشفاق احمد۔ بابو پروا کانپور۔ یو پی

● ایک مقدمے کے دوران دو وکیلوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ ایک بولا "اس دنیا میں تم جیسا بے وقوف اور کوئی نہیں ہوگا" دوسرے نے طیش میں آکر جواب دیا "تم سے زیادہ بدتمیز اور گھٹیا انسان بھی کوئی اور نہیں ہوگا" جج نے فوراً کہا۔ آرڈر.. آرڈر.. آپ لوگوں کو یہ احساس نہیں کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔

● ایک شخص ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے جیب سے ایک سونے کا کپ نکال کر الماری میں رکھ دیا۔ اس کی بیوی نے حیرت سے پوچھا "یہ کہاں سے لائے ہو؟"

شوہر نے کہا "تیز دوڑ میں اول آیا ہوں"

بیوی نے خوشی سے پوچھا "اچھا دوسرے اور تیسرے نمبر پر کون آیا؟"

شوہر نے کہا "دوسرے نمبر پر پولیس اور تیسرے نمبر پر دکان کا مالک"

● استاد : کل میں نے کتے پر مضمون دیا تھا رؤف تم نے اسلم کے مضمون سے کیوں نقل کیا ہے؟

رؤف :- سر! ہم دونوں کا کتا ایک ہی ہے۔

عائشہ بانو۔ کسان ٹولہ سندیلہ۔ یو پی

محمد حسین ہیلی
انگلو اردو بوائز ہائی اسکول۔ آکرٹ کا ریڈیو پروگرام

علم بہتر ہے یا دولت

مقابلہ

علم :۔ اے۔ یم۔ ملاں X B
دولت :۔ عبدالرشید شرہٹی X A

علم :۔ ساری چہل پہل اور رونق علم ہی کی بدولت ہے۔ اگر علم نہ ہوتا تو دنیا کبھی اتنی ترقی نہ کرتی۔ جس شخص کے پاس علم ہے، وہ سماج میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

دولت :۔ جہاں گڑ ہوتا ہے، وہاں مکھیاں ضرور ہوتی ہیں۔ جو شخص دولت مند ہے، سماج میں اس کی بہت ہی عزت ہوتی ہے۔ اور سماج میں وہ شخص اپنی دھاک بٹھا سکتا ہے۔

علم :۔ علم سے آراستہ ہو کر ہی انسان بڑے بڑے عہدے پا سکتا ہے۔

دولت :۔ آج کل کے اخبارات گواہ ہیں کہ ہر طرف بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ اچھے تعلیم یافتہ لوگ کس مپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں بہت سے حساس اور خود دار لوگوں کے لیے زندگی وبالِ جان بن گئی ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ علم کام آتا ہے یا دولت؟ یاد رکھو کہ دولت کے بغیر آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

علم :۔ پہلے ہر آدمی ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچنے کے لیے سالوں سال درکار ہوتے تھے۔ لیکن آج کل تیز رفتار موٹر گاڑیاں، ہوائی جہاز اور بحری جہاز ہیں۔ جو

سالوں کا سفر دنوں میں اور دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے ہیں۔ یہ کس کا طفیل ہے؟

دولت :- کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ روس اور امریکہ بغیر دولت کے چاند کی سطح پر پہنچ سکتے تھے؟؟

علم :- یہ صرف علم ہی کا طفیل ہے کہ امریکہ اور روس چاند سے پوشیدہ رازوں کو جاننے کی کوشش کی۔ آخر کار نیل آرم سٹرانگ اور اس کے ساتھیوں نے ۱۲ر جولائی ۱۹۶۹ء کو چاند پر اپنے قدم رکھے۔

دولت :- اچھی طرح اپنے دماغ میں ذہن نشین کر لو کہ تیز رفتار موٹروں، ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز کے لیے دولت کا رہنا ضروری ہے۔ یہ کہنا بجا نہیں کہ دنیا صرف علم سے ہی ترقی کر سکتی ہے۔

علم :- رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے۔ "علم تو نورِ خدا ہے جو گناہ گاروں اور بد بختوں کو نہیں مل سکتا۔ دنیا میں سب سے بڑی بد بختی جہالت اور علم سے محرومی ہے" حضرت علیؓ نے حضورؐ سے معلوم کیا "علم بہتر چیز ہے یا دولت؟" آپؐ نے فرمایا۔ علم دولت سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ دولت قارون اور فرعون کو ملتی ہے۔ اور علم پیغمبروں کو ملتا ہے" حضرت سلیمانؑ کو اللہ نے علم اور حکومت دونوں دیے کہ ان میں ایک چن لو۔ سلیمان نے علم کو اپنا دوست بنایا۔ مگر اللہ نے حکومت بھی عطا کر دی۔

دولت :- دولت مند آدمی اپنی لڑکی کے لیے اچھا بر حاصل کر سکتا ہے۔ اور منہ مانگا چیز مہیا کر سکتا ہے۔ دولت مند شخص اپنی بیوی اور بچوں کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہے۔

علم :- جو شخص علم سے نوازا جاتا ہے۔ اس کی زندگی بہت ہی خوش حالی میں گزرتی ہے۔ وہ آنے والی مصیبتوں کا خیال رکھ کر اپنی زندگی گزارتا ہے۔ اس کو دولت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ دولت خرچ کرنے سے گھٹتی ہے۔ لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔

ان مدلل بیانات کی روشنی میں آپ اس بات پر متفق ہو جائیں گے کہ علم دولت سے بہتر ہے۔

دولت :- دولت مند شخص اپنے گھر کو محل میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ہر طرح کے نوکر چاکر اپنی خدمت کے لیے رکھ سکتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ علم بہتر ہے یا دولت؟

رائے استاد:۔ اے قوم کے نونہالو! یہ خوب یاد رکھو کہ ایک سکّہ کے دو رخ ہوتے ہیں۔ جس طرح گاڑی ایک پہیہ سے چل نہیں سکتی۔ اسی طرح زندگی صرف علم سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کامیاب اور خوش حال زندگی کے لیے دولت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بقراط نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ "تم دولت سے کتابیں خرید سکتے ہو۔ لیکن علم نہیں۔" تاریخ گواہ ہے کہ سکندرِ اعظم پوری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ارسطو سکندرِ اعظم کا استاد تھا۔ سکندرِ اعظم اپنے استاد کی عزت دل و جان سے کرتا تھا۔ چھترپتی شیواجی مہاراج داداجی کونڈ دیو کی تعظیم کرتا تھا۔ اور اپنے گرو سے رہبری حاصل کرتا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ یہ کس کا کرشمہ ہے؟ شاہ جہاں اپنی پیاری بیگم ممتاز محل کی یاد میں ایک بے مثال عمارت بنوائی جس کو تاج محل کہتے ہیں۔ یہ کس طرح بنا؟ اس کی بناوٹ میں علم اور دولت دونوں کا حصّہ ہے۔ حکومت کو پنج سالہ منصوبہ عمل میں لانے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ علم اور دولت دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خدا نے دولت سے نوازا ہے۔ اور جنھوں نے اپنی دولت کا کثیر حصّہ نمایاں طور پر علم حاصل کرنے والوں کی ہمت افزائی کے لیے وقف کیا ہے۔ مثلاً الفرڈ نوبل NOBEL PRIZE کو قائم کیا۔ یہ انعام اسی کے نام سے موسوم ہے۔ اس شخص کا تعلق یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک شمالی سویڈن سے تھا۔ اس شخص کی فیاضی کی شہرت ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس نے تقریباً ۴½ کروڑ روپے ۱۸۹۶ء میں انعامات کے لیے وقف کر دیے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو ۱۹۱۳ء میں اپنی مشہور تصنیف "گیتا نجلی" اس انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ بات ہندستان کے لیے باعثِ فخر ہے۔

اس بات کو بھی ذہن نشین کر لو کہ جو شخص علم رکھتا ہے اور عمل نہیں کرتا۔ وہ اس بیمار کے مانند ہے جس کے پاس دوا ہے مگر استعمال نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو خدا نے دولت سے نوازا ہے، انھیں چاہیے کہ اپنی دولت کا کثیر حصّہ قوم کی فلاح و بہبودی کے لیے خرچ کریں۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کو کم کرنا ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ خوش نصیب اور قابلِ مبارکباد وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے علم اور دولت سے نوازا ہے۔

("بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دھارواڑ")

مدیر ہشین شیروانی

اتر پردیش میں جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۸۷ء کے نتائج پر اب تک

۵۱۷ اسکولوں میں ۲۵۸ شیروانی انعامات ۱۹۸۷ء (آخری قسط)

جونیئر ہائی اسکول ۔ رام پور۔
ماری گل افشا سلمہا. کماری سرتیا سریوا ستوا سلمہا
ہادی سلمہٗ ۔ کماری مرشی پروین سلمہا کماری راکھی سریواستوا
ن سلیمہ سلمہٗ کماری نزہت بی سلمہا کامران خان سلمہٗ
ی سلما بی سلمہا۔

لامیہ کرشی ودیالیہ ۔ شیو تی نگر ۔ بستی ۔
فی احمد سلمہٗ ۔ محمد عمر سلمہٗ ۔ افضل حسین سلمہٗ حامد علی سلمہٗ

دگرلز جونیئر ہائی اسکول سنبھل ۔ مراد آباد
ذفرخ دینا سلمہا کماری شہناز بیگم سلمہا کماری رفیعہ بیگم سلمہا

ممیوریل گرلز جونیئر ہائی اسکول ۔ بریلی ۔
ماری شبانہ پروین سلمہا بنت نیاز احمد صاحب ۔ کماری
بانہ پروین سلمہا بنت زاہد خان صاحب ۔ کماری فرحانہ سلمہا

اللہ شاہ جونیئر ہائی اسکول شاہجہانپور ۔
ند ماجد خان سلمہٗ ۔ ایم شاہد سرور خان سلمہٗ محمد ایوب سلمہٗ

سی گرلز جونیئر ہائی اسکول ۔ رام پور ۔
بی شائستہ انجم سلمہا کماری تنویر جہاں سلمہا کماری رابعہ بی سلمہا

حسینی جونیئر ہائی اسکول ۔ بریلی ۔
وند کمار سلمہٗ حسرت علی سلمہٗ کماری سنیتا رانی سلمہا

مانیہ جونیئر ہائی اسکول ۔ شاہجہانپور ۔
ذوالفقار علی سلمہٗ ۔ محمد رئیس سلمہٗ ۔ وسیم خاں سلمہٗ ۔

عام گرلز جونیئر ہائی اسکول ۔ چندوسی ۔ مراد آباد
بی تنویر سلطانہ سلمہا کماری عشرت جہاں سلمہا ۔

ضیاء الاسلام گرلز جونیئر ہائی اسکول ۔ بانہ شہر
کماری امیر جہاں سلمہا

امپیریل نیشنل جونیئر ہائی اسکول ۔ رامپور
۔ ا ۔ عزیز سلمہٗ ۔ فرید الرحمان خاں سلمہٗ ۔

مدرسہ انصار جونیئر ہائی اسکول کانپور
محمد عرفان سلمہٗ

مولانا آزاد اسلامیہ جونیئر ہائی اسکول بریلی
راج پال سلمہٗ ۔

اصلاح قوم جونیئر ہائی اسکول ۔ رام پور ۔
سید تنویر میاں سلمہٗ ۔

مراد جونیئر ہائی اسکول رام پور ۔
سید نوید اقبال سلمہٗ

مومن انصار جونیئر ہائی اسکول سہسوان
کماری عائشہ انجم سلمہا راجو بیر سنگھ سلمہٗ ۔ انیتا رانی سلمہا
مظفر حسین سلمہٗ ۔

آزاد جونیئر ہائی اسکول ۔ گلڑیا ۔ ضلع بدایوں
ذاکر علی خاں سلمہٗ ۔ احمد یار موریہ سلمہٗ ۔ محمد زبیر سلمہٗ ۔
رؤف احمد خاں سلمہٗ ۔ عمران رضا خاں سلمہٗ ۔ شاہنواز
خاں سلمہٗ ۔ مظفر علی سلمہٗ ۔ اکرام علی خاں سلمہٗ

قاضی شہاب الدین جونیئر ہائی اسکول سکھانو
کیف الحسن سلمہٗ ۔ اوم پرتاپ سلمہٗ ۔ غلام رضا سلمہٗ ۔

جعفری بیگم میموریل جونیئر ہائی اسکول سنگرامپور
اخلاق احمد سلمہٗ ۔ بشیر الدین سلمہٗ ۔ مکیش کمار سلمہٗ

رحمانیہ گرلز جونیئر ہائی اسکول ۔ بدایوں ۔
کماری شہناز بیگم سلمہا کماری شبانہ پروین سلمہا کماری
عروج فاطمہ سلمہا

ایم ے منور علی گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ بدایوں
کماری ریحانہ بیگم سلمہا
مسلم مشترا اردو میڈیم جونیئر ہائی اسکول۔ بدایوں۔
کماری شرمیلا سلمہا
مسلم نیشنل جونیئر ہائی اسکول دہرہ دون۔
فاروق بیگ سلمہٗ۔
ایک آنہ فنڈ جونیئر ہائی اسکول۔ لکھنؤ۔
کماری خدیجہ پروین سلمہا۔ کماری رانا پروین سلمہا۔ کماری
ریحانہ پروین سلمہا کماری ریتا دیوی سلمہا
حمیدیہ گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ میرٹھ۔
یاسمین پروین سلمہا۔ نازنین پروین سلمہا شبانہ
کوثر سلمہا۔ اسما بانو سلمہا
الاصلاح اسلامیہ جونیئر ہائی اسکول کمال پور۔ بلند شہر
عمرو عالم سلمہٗ۔ ضمیر عالم سلمہٗ۔ امجد سلمہٗ۔ پرویز عالم
سلمہٗ۔ کماری عاصرہ بیگم سلمہا
اکرام حسین گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ جونپور
کماری گوری دیوی سلمہا۔ کماری حسین جعفری سلمہا کماری
پونم جیسوال سلمہا۔
۶۰ (۱۲) محمد علی جوہر اسمارک جونیئر ہائی اسکول
شیو پتی نگر۔ ضلع بستی
عتیق احمد خاں سلمہٗ۔ بدر عالم سلمہٗ۔ رضوان احمد سلمہٗ۔
علی خاں اردو میموریل جونیئر ہائی اسکول
بابوپور۔ ضلع غازی آباد
شکر الدین سلمہٗ۔ بابو خاں سلمہٗ۔ ندیم احمد سلمہٗ۔
نیشنل جونیئر ہائی اسکول دو صیڑو۔ ضلع مظفر نگر
محمد عابد سلمہٗ۔ ریاض علی سلمہٗ۔ منظر عالم سلمہٗ۔ راجیندر سنگھ
سلمہٗ۔ کماری سنگیتا دیوی سلمہا۔
جے جنتا جونیئر ہائی اسکول پورقاضی ضلع مظفر نگر
کماری سرتیا رانی چوہان سلمہا وپن کمار سلمہٗ۔ اجے کمار سلمہٗ۔
شمیم احمد سلمہٗ۔

تارا رشید شیروانی گرلز جونیئر ہائی اسکول
صلاح پور۔ ضلع الہ آباد
کماری قدسیہ خاتون سلمہا کماری خدیجہ بی بی سلمہا کماری
شیبہ جعفری سلمہا۔ کماری انجم بانو سلمہا کماری میمونہ خاتون
سلمہا کماری صبیحہ لطیف خان سلمہا کماری فوزیہ صدیقی
سلمہا کماری ساترہ خاتون سلمہا کماری مینا علی کماری کلثوم
کماری بشریٰ بی سلمہا کماری سیمانہ اختر سلمہا کماری شہ ورہا
فیض القرآن جونیئر ہائی اسکول
ملک مقیم پور، ضلع بجنور
عبدالجبار سلمہٗ۔ محمد عارف سلمہٗ۔ ندیم احمد سلمہٗ۔
ظفر میموریل جونیئر ہائی اسکول۔ سیتاپور
کماری ریحانہ پروین سلمہا افتخار عالم سلمہٗ۔ انوار الحسن سلمہٗ
کماری شاہ نیلا سلمہا کماری نصرت جہاں سلمہا
بایزید مادھیمک ودیالیہ۔ چھتر محمد پور، ضلع فیض آباد
شیو کمار سلمہٗ۔ رضوان احمد سلمہٗ۔ دیپک سنگھ سلمہٗ
صابو میموریل جونیئر ہائی اسکول۔ دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی
کماری عذرا یاسمین سلمہا محمود احمد سلمہٗ۔ رابعہ خاتون سلمہا
رسول باغ جونیئر ہائی اسکول مغل سرائے ضلع
غلام رسول سلمہٗ۔ افتخار احمد سلمہٗ۔ راکیش کمار سنگھ سلمہٗ۔ کماری
شبانہ روبی سلمہا
پبلک نرسری جونیئر ہائی اسکول۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور
کماری شبینہ مہناز سلمہا کماری سیما پروین سلمہا۔
ذاکر میموریل جونیئر ہائی اسکول۔ کیرانہ۔ ضلع مظفر نگر۔
محمد اکرم سلمہٗ۔ محمد ہارون سلمہٗ۔ محمد عاکف صدیقی سلمہٗ۔ محمد
اسمٰعیل سلمہٗ۔ شاہنواز عالم سلمہٗ۔
مسلم نسواں جونیئر ہائی اسکول۔ ٹانڈہ۔ ضلع فیض آباد
کماری انجم آرا سلمہا۔ کماری رضیہ بانو سلمہا کماری نوشابہ انجم
سلمہا کماری عائشہ خاتون سلمہا





اخبار

آج ہماری زندگی میں اخبار کی کیا اہمیت ہے اسے بھلا کون نہیں جانتا۔ ہر گھر میں صبح صبح جس چیز کا انتظار ہوتا ہے وہ اخبار ہے۔ اخبار کی اہمیت کئی وجہ سے زیادہ ہے ایک تو اس میں خبریں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے زیادہ اور آسان زبان میں ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی قیمت بھی بہت کم ہوتی ہے۔ آج کی اس تیز رفتار زندگی میں صرف ریڈیو کی خبریں سن کر ہی مطمئن نہیں ہوا جاسکتا ہے۔ اس لیے اخبار کی اہمیت زیادہ ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اخبار کا مطلب کیا ہوتا ہے اور یہ کب شروع ہوا؟ اخبار کو انگریزی زبان میں نیوز پیپر کہتے ہیں۔ اس میں نو حرف شامل ہیں جو الگ الگ لفظ بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے NEWS آتا ہے اس سے لفظ بنتے ہیں نارتھ ایسٹ، ویسٹ، ساؤتھ، اور پھر دوسرا لفظ آتا ہے PAPER اس سے بنتا ہے۔ پاسٹ، اینڈ، پرزنٹ، ایوینٹ، رپورٹ کل ملا کر ہوا (NORTH, EAST, WEST, SOUTH PAST| AND PERSENT EVENT REPORT) اردو میں اس کا ترجمہ ہوا کہ ایک ایسی رپورٹ جس میں مشرق مغرب شمال جنوب کی ماضی (گزری ہوئی) اور موجودہ خبروں کا خلاصہ ہو۔

آج سے لگ بھگ ۵۰۰ سال قبل اخبار کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ۱۴۴۵ء میں جرمن میں گٹ این برگ نام کے آدمی نے اپنا چھاپا خانہ قائم کیا اور جب سے اخبار کو زندگی ملی۔ تھامس الوا ایڈیسن نے اخباروں کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے دنیا میں اخبار چھپنے لگے اور آج ہمارے ہندستان میں چھوٹے بڑے

ملا گر لنگ بھگ ۲۰ ہزار اخبار مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔

محمد اصغر
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ایسے قبائل آباد ہیں جن کے آدمی برقع پہنتے ہیں اور عورتیں برقع نہیں پہنتیں۔

شہزادہ انوبیگ
امراوتی (مہاراشٹر)

پسندیدہ شعر

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
(غالب)

نیلوفر شاہی (آمبور)

کیا آپ جانتے ہیں

- بے بردس جو کیلی فورنیا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں دو سو پچاس شیر ہلاک کیے تھے۔
- آسٹریلیا کے بکرے درختوں پر چڑھتے ہیں اور مچھلیاں کھاتے ہیں۔
- دنیا میں سب سے بڑی گاجر کیلی فورنیا میں پیدا ہوئی تھی جس کی لمبائی ساڑھے تین فٹ تھی۔
- ناروے کے بادشاہ ایلسن نے اپنے پالتو کتے کو وزیر اعلا مقرر کیا تھا۔
- مغل بادشاہ اکبر نے اپنے مقبرہ کا ڈیزائن خود بنایا تھا۔
- جنوبی امریکہ کے ملکوں کے جنگلوں میں

کیا آپ جانتے ہیں؟

(۱) دنیا میں سب سے زیادہ ہیرے جنوبی افریقہ میں نکلتے ہیں۔
(۲) دنیا کا سب سے اونچا پیڑ امریکہ میں ہے جس کی اونچائی ۷۶۳ فٹ ہے۔
(۳) دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ روس میں ہے جس کا وزن ۱۹۳ ٹن ہے۔
(۴) سورج زمین سے ۹ کروڑ ۲۸ لاکھ میل دور ہے۔
(۵) دنیا میں سب سے بڑی لائبریری ہارورڈ یونی ورسٹی میں ہے۔
(۶) ایک گرام سونے سے ۲ میٹر لمبا تار بنایا جاتا ہے۔

شیخ عرفان احمد نثار احمد (بمبئی)

عمل سے زندگی بنتی ہے

شہر سورت کے قریب ایک گانوٴ میں
غریب کسان رہتا تھا۔ وہ بہت ایماندار
رشریف تھا۔ گانوٴ والے اس کی شرافت
تسمیں کھاتے تھے وہ دن بھر کھیت میں
م کرتا اور شام کو جب تھکا ماندہ گھر
تا تو اپنے بیوی اور بچوّں کی صورت
یکھ کر اپنی دن بھر کی تھکن بھول جاتا۔

اس کے دو لڑکے تھے ایک کا نام ساجد
ھا اور دوسرے کا نام واجد۔ ساجد بالکل
پ کی طرح نیک اور ایماندار تھا اور
اجد بہت شرارتی کبھی کسی بڈھے آدمی کو
تاتا تو کبھی فقیر کی جھولی میں مٹی ڈال
یتا، ماں اس کی اس حرکت پر بار بار
سے سمجھاتی "بیٹا شرارت نہیں کرتے،
رارت کرنا بہت بری بات ہے" لیکن
ہ نہیں مانتا تھا۔

ایک دفعہ ایک بڑھیا نے اس کے
مکان کے دروازے پر سوال کیا، "لنگڑی
پہ دیا کرو بابا، اللہ تم کو اچھا رکھے۔" واجد
آواز سن کر باہر آیا۔ بڑھیا نے دوبارہ وہی
سوال دہرانے کی کوشش کی لیکن واجد نے
زمین سے مٹی اٹھائی اور بڑھیا کے چہرے
پہ پھینک دی۔ بڑھیا کی آنکھوں میں
مٹی جانے کی وجہ سے اُسے کچھ دکھائی نہیں
دیا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ واجد کے دوست
یہ دیکھ کر بہت زور زور سے ہنس رہے
تھے لیکن کسی نے اُس کی مدد نہیں کی۔ ہنسی
کی آواز سن کر ساجد باہر نکلا۔ دیکھا تو
بڑھیا زمین پر تڑپ رہی تھی اور ساجد کے
دوست زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ساجد
نے بڑھیا کو اُٹھایا اور اپنے گھر میں لاکر
اس کا منہ صاف کیا آنکھوں سے مٹی نکالی
اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلایا۔
بڑھیا نے جب آنکھ کھول کر دیکھا تو سامنے
ساجد کھڑا دکھائی دیا۔ بڑھیا نے پیار بھری
نظروں سے ساجد کو دیکھا اور بے اختیار
اس کی زبان سے نکلا "جیتے رہو بیٹا اللہ تم
کو سدا خوشیوں کے دامن میں رکھے۔ بیٹا
اچھے لوگ دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ وہ کون ہے
جس نے میرے چہرے پہ مٹی پھینکی خدا اس
کی زندگی پہ مٹی پھیر دے" ساجد نے شرماتے
ہوئے کہا ماں جی وہ میرا بڑا بھائی ہے

اُسے معاف کر دینا۔ بیٹا تم میں اور تمہارے
بھائی میں بہت فرق ہے۔ تم آگے چل کر
بہت بڑے آدمی بنوگے۔ بڑھیا نے ساجد
کو بہت دعائیں دیں اور چلی گئی۔

ساجد ایک دن اپنے باپ کے ساتھ
کھیت میں جا رہا تھا۔ اتفاق سے اُسے
روپیوں سے بھرا تھیلا ملا۔ ساجد نے
تھیلا اپنے باپ کو دے دیا اور کہا شاید
یہ کسی امیر آدمی کا ہے لائیے میں اُسی
آدمی کو ڈھونڈتا ہوں اور اگر مل گیا تو
دے آؤں گا۔ باپ کی آنکھوں سے خوشی
کے آنسو نکل پڑے اور وہ کہنے لگا: اے
خدا تو سب کو نیک توفیق عطا فرما (آمین)

ساجد تھیلا لے کر گانوٗ میں آیا اور
تھیلا کھول کر ایڈریس دیکھا۔ وہ تھیلا
سیٹھ دھرم داس سنگھ کا تھا۔ اس آدمی
کو گانوٗ میں سب ہی جانتے تھے رئیس
جو ٹھہرا۔ ساجد نے تھیلا سیٹھ دھرم داس
کو دے دیا۔ سیٹھ دھرم داس ساجد کو
دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اور کہنے لگا۔ بیٹا
تمہارے باپ کا نام کیا ہے۔ ساجد نے
کہا محمد جلیل" وہ بڈھا کسان تمہارا
باپ ہے۔ ہاں وہ میرے ابا ہیں۔ بیٹا تم
بالکل اپنے باپ کی طرح ایماندار اور
نیک ہو۔ تم ہمارے یہاں نوکری کروگے

تنخواہ ۷۰۰، سو روپے جس سے تم
گھر کا کاروبار اچھی طرح سے چل سکتا
ساجد نے باپ کی اجازت سے
کرلی اور محنت و ایمانداری سے کام کر
بہت بڑا عزت دار آدمی بن گیا۔ لوگ
سیٹھ کہنے لگے۔ اُدھر واجد زمانے کی ٹھو
کھاتا ہوا گلیوں گلیوں بھٹکتا رہا۔ لیکن
وہ کسی کے کام نہ آسکا۔ اور لوگ اسے دھ
لگے۔ ساتھیو! اچھے کام کا انجام اچھا
ہے اور بُرے کام کا انجام بُرا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاک اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

رؤف شیخ۔ امراوا
رہبار اشلا

علامہ اقبال ـ بچوں کے شاعر

علامہ اقبال بڑوں کے شاعر بھی تھے
اور بچوں کے بھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو بچوں
ذہنی تربیت و اصلاح کے لیے انھوں
بہت عمدہ عمدہ نظمیں لکھیں۔ اُن کی
خوبصورت نظمیں آج بھی ہر بچے کو زبانی یا
ہیں مثلاً:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
اسکول کے بچے صبح سویرے اُن کی نظم
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

ں پڑھتے ہیں۔ اس نظم میں کتنے اچھے
بات اور پاکیزہ خیالات ہیں۔ ملاحظہ
مائیں۔

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

یہ شعر ایک طرح کی دعا بھی ہے اور درسِ اخلاق بھی ہے۔ بچے جب اسکو بار بار پڑھتے ہیں تو اس کے صالح اور حیات بخش نقوش اُن کے دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظم "ہمدردی" بھی پند و نصائح کا ایک گلدستہ ہے علامہ اقبال فرماتے ہیں: ؎

ہیں وہی لوگ جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

کتنی عمدہ تعلیم ہے۔ سچ ہے ایک دوسرے کے کام آنا انسانیت کا اعلا وصف ہے مولانا حالی نے بھی کہا ہے ؎

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ دنیا میں کام آئے انساں کے انساں

بچوں کے لیے لکھی ہوئی علامہ اقبال کی تمام نظمیں بڑی خوبصورت اور معنی خیز مثلاً ترانۂ ملی، ترانۂ ہندی، پرندے کی فریاد ہندستانی بچوں کا گیت، ایک پہاڑ اور گلہری ں کا خواب اور جگنو وغیرہ بڑی معروف اور کارآمد نظمیں ہیں۔ ان تمام نظموں کا

خالق کیا کبھی مر سکتا ہے؟

امتیاز علی
عثمان نگر، بھٹکل (کرناٹک)

معاف کر دو

بادشاہ ہارون رشید کے لڑکوں میں سے ایک لڑکا غصہ میں پریشان لال پیلا ہو کر اپنے باپ کے پاس گیا اور اُن سے شکایت کی کہ فلاں افسر کے بیٹے نے میری ماں کے بارے میں نازیبا باتیں کہی ہیں۔ بادشاہ نے اپنے وزیروں کو بلا کر پوچھا کہ ایسے قصور کی کیا سزا ہونی چاہیے۔ ایک وزیر نے کہا "جہاں پناہ اسے جان سے مروا دیجیے" دوسرے وزیر نے کہا "عالم پناہ اس کی زبان کٹوا دیجیے" تیسرے وزیر نے کہا "حضور والا اس پر جرمانہ کرنا چاہیے یا جلاوطن کر دیجیے"

بادشاہ ہارون نے کہا "اس نادان نے اپنے تیر سے بھرپور وار کیا ہے مگر ہم اس کا یہ اوچھا وار اپنی ڈھال پر لیں گے، ناراض ہو کر ہم ایسی کوئی بات کو ہوا دینا نہیں چاہتے۔ جس کو عوام بُرا سمجھیں۔ بعد میں لڑکے سے کہا "میرے پیارے بیٹے اسے معاف کر دو! اگر تم اسے معاف کرنا نہیں چاہتے تو تم بھی اس کے بدلے میں گالی دے لو

مگر یاد رکھو گے کہ تم جوے کی حدود سے تجاوز
کر جاؤ گے تو ہم ہی لٹے گنہگار بنیں گے اور
ہماری ساری اچھائیوں پر پانی پھر جائے
گا، غصہ کو قبضہ میں رکھو اور اسے تھوک
دو۔ وہ تمہیں عزت اور وقار نہیں بخشتا!
گالی یا نازیبا باتیں یہ غیر معقول اور نفرت
کی نگاہ سے دیکھی جانے والی باتیں ہیں!

عبدالامانی قریشی
ہینگن گھاٹ، وردھا مہاراشٹر

جواہر پارے

(۱) سونے کو آگ پرکھتی ہے اور انسان کو
مصائب زمانہ

(۲) سچائی میں اگرچہ خوف ہے مگر انسان
کی نجات بھی ہے۔

(۳) وقت ضائع کرنے سے پہلے سوچو کہ
وقت تمھیں ضائع کر رہا ہے۔

(۴) اگر انسان کسی چیز کو اپنائے تو وہ
صرف اصول اور ان اصولوں کے سہارے
ہی انسان عظیم بنتا ہے۔

(۵) علم دولت سے بڑھ کر ہے کیونکہ دولت
کی تمھیں حفاظت کرنا پڑتی ہے جبکہ
علم خود تمھاری حفاظت کرتا ہے۔

(۶) جو لوگ بزرگوں کا کہنا نہیں مانتے
وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

(۷) جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے ان کے پا
سوچنے کے لیے بہت کم باتیں ہوتی
اور بولنے کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

سجیلہ ریاض شو
سجاد منزل دھنکل

"ہم فیل ہو گئے"

بس فیل ہو گئے ہم اب اور کیا رکھا
محنت سے بھاگنے کا انجام یہ ہوا
پہلی یہی ہے سیڑھی ناکامیابیوں
ثابت قدم رہا جو منزل کو پا گیا
پڑھیں گے سال بھر ہم پرتازہ ذہن
پاکر رہیں گے آخر جو آج کھو دیا
ہوں گے نہ پست ہمت رکھیں گے حو
دونی کریں گے محنت اب عزم کر لیا

"ہم پاس ہو گئے"

ایک سخت مرحلہ تھا یہ امتحاں ہم
ہم پاس ہو گئے ہیں دل شادماں ہم
پڑھتے تھے رات دن ہم راتوں کو جاگتے
بے کار مشغلوں سے ہم دور بھاگتے
رہتی تھی فکر ہم کو ناکام ہو نہ جائ
ڈر تھا کہ اس طرح ہم بدنام ہو جائ
محنت کا اپنی آخر بدلہ ملا ہے ہم
ہم پاس ہو گئے تو تحفہ ملا ہے ہم

ہر شخص سے کوئی محبت اگر کرے گا
ایک روز اس کا دامن خوشیوں سے بھی بھرے گا

ایم تنویر عالم اوگانوی
اوگانواں (نالندہ)

لالچ کا پھل

ایک لالچی کتا ایک دن ایک روٹی کا ٹکڑا لیے جا رہا تھا وہ ایک پل سے گزرا تب اس کی نظر پل کے پانی پر پڑی تو اسے ایک کتا روٹی کا ٹکڑا لیے نظر آیا جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ کوئی دوسرا نہیں اس کا سایہ ہی تھا جو پانی میں پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ بے وقوف یہ بات نہ سمجھ سکا۔

اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر اس نے وہ روٹی حاصل کر لی تو اس کے پاس زیادہ روٹی ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر کتے نے پانی میں چھلانگ لگائی تو اس کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا بھی چھوٹ گیا اور وہ خود پانی میں ڈوب کر مر گیا۔

اگر کتا لالچ نہ کرتا تو وہ اپنی جان نہ گنواتا۔

یہ ہوتا ہے لالچ کا انجام

واحد خاں ولد جمیل خاں
امراوتی (مہاراشٹرا)

پسندیدہ اشعار

آپ کی شان ہے کیا شان رسول عربیؐ
آپ پر جان سے قربان رسول عربیؐ

(گمنام)

اے مومنو! سنو یہ کرامت نماز کی
جنت میں لے کے جائے گی عادات نماز کی

تبسم بشیر احمد
بمبئی ۹۵



دفتر پیام تعلیم
میں
حل وصول ہونے
کی آخری تاریخ
۱۲ ردسمبر ۸۷ء

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 34

150 روپے کے نقد انعامات

آپ جتنے حل چاہیں
بھیج سکتے ہیں لیکن
ہر حل کے ساتھ ایک
کوپن آنا ضروری ہے

پہلا انعام: صحیح حل پر نقد 100 — دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر 50 روپے کی کتابیں

[illegible] نہیں، جس لفظ کو آپ صحیح سمجھتے ہوں اُسے ہی نمبر وار لکھیے

1۔ رسول اللہؐ کی ——— صرف انسانوں کے حال پر نہ تھی .... شفقت / محبت / عنایت
2۔ ان کے ——— دنیا اور اس کی دولت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ خیال میں / نزدیک
3۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے انتقال سے بہت ——— اور صدمہ پہنچا۔ دکھ / رنج
4۔ یہ سوچ کر آپ نے جنگ کی تیاری شروع کی مگر ——— پر ظاہر نہیں کیا۔ لوگوں / کسی
5۔ میں سمجھ گیا کہ چور اندر ——— میں مصروف ہے — چوری / صفائی
6۔ اس نے ——— کی کوشش کی مگر اس کے پاؤں جم نہ سکے — سنبھلنے / رکنے / ٹھہرنے
7۔ جب ——— کا سامان آگیا تو سب بچے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ کھانے / کھیلنے
8۔ وہ ——— میں رسی باندھ کر کنویں سے پانی لے آیا۔ کمر / گھڑے

صرف آخر کے دو سوالوں کے لیے ذہن پر زور ڈالیے بقیہ چھ سوالوں کے جوابات صفحہ ۱۸ اور ۲۴ کی کہانیوں میں ملیں گے۔

شرائطِ پیامی اَدبی مُعمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معما کا کوپن آنا لازمی ہے (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی (۵) معمے سے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

کوپن
پیامی ادبی معما نمبر 34
میں اڈیٹر پیام تعلیم کے
فیصلے سے متفق ہوں۔
نام ....
پتا ....

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے
پیامی ادبی معما نمبر 34 ماہنامہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بچوں سے باتیں

۱۹۸۷ء کا یہ آخری شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہنے کو یہ پلک جھپکتے گزر گیا لیکن ایسے ایسے داغ دے گیا جو برسہا برس ہمیں اپنی یاد دلاتے رہیں گے۔

اسی سال آپ کے پیام تعلیم کے اڈیٹر رہ چکے شاد عارفی شاہجہاں پوری، ممتاز طنز و مزاح نگار فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا، ممتاز صحافی اور ناول نگار خواجہ احمد عباس اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہی نہیں ان کے علاوہ بھی کئی اہم ادیب و شاعر اس دنیا سے رخصت ہو گئے جن کے ناموں سے ابھی آپ واقف نہیں۔ اس طرح ہماری یہ ادبی دنیا ان ممتاز ادیبوں کے چلے جانے سے خالی خالی محسوس ہو رہی ہے۔ اور اب تو بہ ظاہر یہ خلا پُر ہوتی بھی نظر نہیں آتی۔ غموں کا یہ سیلاب یہیں پر نہیں تھما، ملک کے فرقہ وارانہ فسادات نے اس میں اور اضافہ کیا۔ سیکڑوں جانیں گئیں، ہزاروں یتیم اور بے گھر ہوئے۔ عید کی خوشی غم میں بدل گئی۔ اسی کے ساتھ ملک کے کسی حصے میں بارش کے ہونے سے تباہی مچی اور کسی حصے میں بارش کے نہ ہونے سے۔ کتنا دکھ دیا اس سال نے!

آیندہ سال کے لیے ہم سب کو مل کر دعا کرنا چاہیے کہ خدا کرے ۱۹۸۸ء ہمارے ملک کے لیے امن اور ہمارے لیے خوشیوں کا سال ثابت ہو۔ آمین۔

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

دسمبر ۱۹۸۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۱۲

قیمت فی پرچہ: 2/50 سالانہ: 30/=

غیر ممالک سے: نو ڈالر بذریعہ ہوائی جہاز: بارہ ڈالر

فی پرچہ ایک ڈالر

اڈیٹر: شاہد علی خاں

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ٦

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلشر سید کریم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

خالد لطیف

پیارے نبی کی پیاری کہانی

سوچ بچار

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اپنی قوم کے بارے میں سوچتے رہتے تھے وہ جانتے تھے کہ عرب ایرانیوں اور رومیوں جیسے مہذب نہیں رومی اور ایرانی بڑے بڑے شہروں میں رہتے تھے دولت کی فراوانی تھی۔ بڑی بڑی فوجیں تھیں جو وقت کے بہترین اسلحہ سے لیس تھیں۔ ان کے مقابلے میں عرب چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور جہالت کے باعث آپس میں لڑتے رہتے تھے اور اپنے ہی بنائے ہوئے بتوں کو پوجتے اور ان سے مرادیں مانگتے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستی سے نفرت تھی وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور بتوں کی پوجا پاٹ ابراہیم علیہ السلام کا مذہب نہ تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سوال پر سوچتے اور اکثر اپنے دوستوں سے بات چیت کرتے ان میں سے کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم خیال بھی بن گئے پھر ابراہیم کا مذہب کیا تھا؟ وہ جاننا چاہتے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر شہر سے باہر ایک غار میں چلے جاتے اور گھرے غور و فکر میں کھوئے رہتے۔

ایک خواب

ایک بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عجیب خواب دیکھا دیکھا کہ ایک کتاب آسمان سے اتر رہی ہے۔ کتاب کے ساتھ روشنی تھی جو سورج کی طرح چمک رہی تھی۔ انھوں نے سنا کوئی شخص کہہ رہا تھا کہ ابراہیم کا مذہب اس کتاب میں درج ہے۔

وعدے کی پابندی

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وعدے کا بڑا خیال رہتا تھا جب بھی کسی سے کوئی وعدہ کرتے ہمیشہ اس کے پابند رہتے تھے۔ ایک بار آپ کسی کاروباری حصہ دار کے ساتھ جا رہے تھے اس نے کہا میرے آنے تک یہیں ٹھہریے مگر وہ شخص نہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تین دن اور تین رات اسی جگہ انتظار کرتے رہے چوتھے دن اس آدمی کا ادھر سے گزر ہوا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور اپنی کوتاہی کی معافی مانگی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سکون اور اطمینان

سے جواب دیا میں نے ٹھہرنے کا وعدہ کیا تھا اس لیے ٹھہرا رہا تمھاری کوئی غلطی نہیں ہے تم نے جلد آنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے حقیقی انسان وہی ہے جو اپنا وعدہ پورا کرے۔"

پرندوں پر رحم

محمد صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے پرندوں کا شکار ظلم سمجھتے تھے ایک دن انھوں نے اپنے دوست ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا! ایک بڑے جانور کو ذبح کیا جائے تو اس سے کئی آدمیوں کی بھوک مٹ سکتی ہے چھوٹے پرندے ایک درجن ہوں تو بھی ایک شخص کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔

پڑوسی کی امداد

ایک دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا دو آدمی مل کر ایک شخص کو مار رہے تھے آپ فوراً اس کی مدد کو پہنچے مارنے والے غصے سے دیوانے ہو رہے تھے کہنے لگے اس معاملے میں دخل نہ دیجیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا میں اس آدمی کی ضرور مدد کروں گا یہ میرا پڑوسی ہے۔

غیبی آواز

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جوانی کے بہترین برسوں میں تھے ان کی عمر ۴۰ سال تھی ایک دن غار میں بیٹھے ہوئے سنا کوئی کہہ رہا تھا محمد! محمد! محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بکریاں اکیلی ہیں ان کا رکھوالا عالم بالا سے آئے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارد گرد دیکھا مگر کسی کو نہ پا کر بہت حیران ہوئے۔

اسی سال پھر کسی غیبی آواز کو کہتے سنا اللہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے وہ ان سے بھی پیار کرتا ہے جو اس کے بندوں سے محبت رکھتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم غار سے باہر آئے بولنے والے کو ادھر ادھر تلاش کیا مگر کوئی نظر نہ آیا۔

کچھ دنوں بعد عجب واقعہ پیش آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ننھی بیٹی نے کہا ابو جان! چاند آپ کی پگڑی پر چمک رہا ہے وہ مجھے دے دیجیے۔

میری پگڑی پر تو کوئی چاند نہیں انھوں نے محبت سے جواب دیا مگر ننھی بچی یہی کہتی رہی ابّی جان آپ کی پگڑی پر بہت بڑا چاند چمک رہا ہے۔ بہت بڑا!!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ ہر روز کعبہ میں جایا کرتے تھے وہ بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے بلکہ اس مقدس پتھر کو چومتے جو کعبہ کی دیوار میں نصب تھا یہ پتھر ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے یہیں تھا اس کا بڑا احترام کیا جاتا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بت پرستوں کے آنے سے بہت قبل کعبہ میں جاتے اور حجر اسود کو بوسہ دینے کے بعد واپس چلے آتے۔

آکسیجن

ابوالحسن جابر

کرۂ ارض پر سب سے زیادہ مقدار اسی عنصر کی ہے

ایک گیس ہوا کا ایک جزو کائنات کا ایک اہم عنصر جو جلنے اور سانس میں مدد دیتا ہے۔ یہ کرۂ ارض پر گیس کی صورت میں خالص پایا جاتا ہے قشر ارض کے ہر مربع میل پر آکسیجن کا وزن ساٹھ لاکھ ٹن ہوتا ہے۔ ہوا میں اس کی مقدار تقریباً بائیس فی صد ہوتی ہے۔ پانی میں اس کی مقدار ۸۸ء۸۱ فی صد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ معدنیات اور چٹانوں میں آکسائیڈ کی صورت میں پائی جاتی ہے چاک میں نصف اور ریت میں نصف سے زیادہ حصہ آکسیجن پر مشتمل ہے۔

دریافت

آکسیجن کی دریافت کا سہرا دو سائنس دانوں جوزف پریسٹلے اور لوازیے کے سر بندھتا ہے۔ ۱۶۶۹ء میں جان بیچر نے کہا تھا کہ ہر ایک آتش پذیر میں ایک آتشی عنصر "فلوجسٹن" ہوتا ہے جو جلتے ہوئے خارج ہوتا رہتا ہے فلوجسٹن کا وزن منفی ہوتا ہے اس لیے جب کوئی شے جلتی ہے تو منفی فلوجسٹن کے نکل جانے کے بعد باقی ماندہ شے کا وزن زیادہ ہو جاتا ہے۔

یکم اگست ۱۷۷۴ء کو جوزف پریسٹلے ایک محدب عدسے کی مدد سے جابر بن حیان کے "کلیس سیماب" پر سورج کی روشنی مرکوز کر رہا تھا کلیس سیماب پارے کا سرخ آکسائڈ ہوتا ہے۔ پریسٹلے نے دیکھا کہ اس سرخ سفوف میں سے ایک گیس بڑی تیزی سے نکل رہی ہے اس نے جلتی ہوئی موم بتی اس کے سامنے کی تو اس کی لو اور تیز ہو گئی۔ لوہے کا گرم سرخ تار اور روشن ہو گیا اور منور ہو گیا۔ پریسٹلے نے سوچا کہ یہ گیس غیر فلوجسٹن ہے تب اس نے خیال کیا کہ کہیں اس نے نہ معلوم گیس تو دریافت نہ کر لی جو اس سے ایک دو سال قبل ایک اور سائنس داں کارل شیلی نے مرکیورک آکسائڈ



آکسیجن کے مالیکیول

میگانیز آکسائڈ اور پوٹاشیم نائٹریٹ گرم کرکے حاصل کی تھی۔ پریسٹلے فرانس گیا تو اس نے پیرس میں اپنے دوست لورین لوازیے سے اس کا ذکر کیا لوازیے پہلے ہی آگ جلنے یعنی عمل احتراق پر بہت سے تجربات کر چکا تھا اس کا خیال تھا کہ کہیں سے کوئی شے آکر جلنے والی چیز کے ساتھ ملتی ہے تبھی تو جلی ہوئی چیز کا وزن زیادہ ہو جاتا ہے اس نے سوچا کہ کہیں یہ پریسٹلے کی غیر فلوجسٹن ہوا تو نہیں ہے۔ لوازیے نے اپنے تجربات جاری رکھے اور بالآخر

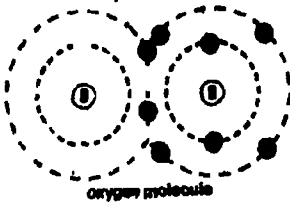
۱۷۷۱ء میں اس نے فلوجسٹن نظریے سے انکار کر دیا اور کہا کہ عمل احتراق اس وقت ہوتا ہے جب ہوا میں اس کی دریافت کردہ گیس موجود ہو۔ اس گیس کا نام آکسیجن رکھا گیا لیکن رابرٹ لوائل کے اس شبہے کو تقویت مل گئی کہ ہو سکتا ہے کہ کرۂ ہوائی میں کوئی ایسی عجیب شے ہو جو شعلے کے لیے ناگزیر ہو لوازے نے یہ بھی ثابت کیا کہ سانس لینے کے لیے بھی آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے اور گیس زندگی کو برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

جوہری بناوٹ

آکسیجن کو کیمیا کی زبان میں انگریزی حرف سے ظاہر کیا جاتا ہے اس کی قوت گرفت ۲ اور ایٹمی نمبر ۸ ہے اس کا ایٹم فضا میں تنہا نہیں رہ سکتا۔ عموماً دو ایٹم مل کر ایک سالمہ بناتے ہیں ایٹم کے مرکزے میں آٹھ مثبت ذرے (پروٹون) اور آٹھ تعدیلی ذرّے (نیوٹرون) ہوتے ہیں۔ چونکہ ان میں سے ہر ذرّے کا وزن ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کے برابر ہوتا ہے۔ اس لیے آکسیجن کا ایٹم ہائیڈروجن سے سولہ گنا بڑا اور بھاری ہوتا ہے۔ مرکزے کے گرد آٹھ منفی ذرے "الیکٹرون" تیزی سے گردش کرتے ہیں الیکٹرون مختلف مداروں یا حلقوں میں گردش کرتے ہیں پہلے حلقے میں جو مرکزے کے نزدیک تر ہوتا ہے دو الیکٹرون گردش کرتے ہیں اور اس کے بعد حلقے میں آٹھ الیکٹرون ہونا لازم ہیں اس لیے آکسیجن کے ایٹم میں آخری حلقے میں دو الیکٹرون کی جگہ خالی رہتی ہے اور یہ حلقہ ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے کہ اس کو کس طرح دو الیکٹرون مل جائیں اور یہی اس کی قوت گرفت ہوتی ہے۔

جب کسی اور عنصر سے آکسیجن کے نوزائیدہ ایٹم کا ملاپ نہیں ہوتا تو اپنے ہی ایک ساتھی ایٹم کے بیرونی الیکٹرون پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا ہے چونکہ عام طبعی یا کیمیائی حالت میں الیکٹرون

فضا میں پائے جانے والے
آکسیجن مالیکیول



اپنے مرکزے کو چھوڑ کر ایٹم سے الگ نہیں ہو سکتے اس لیے دو الیکٹرون دو ایٹموں میں مشترک ہو جاتے ہیں اور یہ دو ایٹم مل کر ایک سالمہ بناتے ہیں جب آکسیجن کے تین ایٹم آپس میں مل جائیں تو ایک اور گیس "اوزان" بناتے ہیں اس کی تیاری کے لیے آکسیجن میں سے بجلی گذاری جاتی ہے

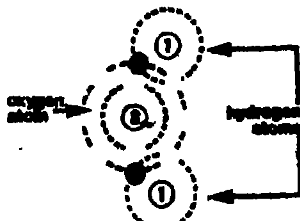
آکسیجن میں آئسوٹوپ بھی پائے جاتے ہیں ان کا وزن عام آکسیجن سے کم یا زیادہ ہوتا ہے یعنی ان میں تبدیلی ذرات عام طور پر (آٹھ) سے کم یا زیادہ ہوتے ہیں عام حالات میں سترہ کا وزن رکھنے والے دو فی صد آئسوٹوپ ہوتے ہیں۔ دیگر آئسوٹوپ چودہ پندرہ اور انیس کا وزن رکھنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن یہ ناپائدار ہوتے ہیں اور زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتے۔

تیاری

تجربہ گاہ میں آکسیجن پوٹاشیم کلوریٹ کو گرم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پوٹاشیم کلوریٹ کے ساتھ ایک چوتھائی حصہ مینگانیز ڈائی آکسائیڈ ڈالتے ہیں جو عمل انگیز ثابت ہوتی ہے تقریباً ۶۰۰ درجے سینٹی گریڈ پر پوٹاشیم کلوریٹ پوٹاشیم کلورائڈ اور آکسیجن میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن مینگانیز ڈائی آکسائیڈ کے ملنے کے بعد یہ عمل ۲۷۰ درجے سینٹی گریڈ ہی پر شروع ہو جاتا ہے اور بھی کئی اقسام کے آکسائیڈ مثلاً سوڈیم آکسائڈ مرکیورک آکسائیڈ اور پوٹاشیم پرمنگنیٹ گرم کرنے پر آکسیجن فراہم کرتے ہیں وسیع پیمانے پر آکسیجن حاصل کرنے کے لیے ہوا میں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ نکال کر نائیٹروجن اور آکسیجن کے آمیزے کو مائع بنایا جاتا ہے اور پھر اس خاص مائع کو ایک خاص منفی درجہ حرارت (۸۲ س) تک گرم کیا جاتا ہے۔ نائٹروجن اور دیگر گیس بخارات بن کر اڑ جاتی ہیں لیکن آکسیجن نیچے رہ جاتی ہے۔ یہ گیس ۹۹ فی صد تک خالص ہوتی ہے اس کو فولادی سلنڈروں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ پانی کی برق پاشیدگی سے بھی آکسیجن حاصل کی جاتی ہے یا پانی کو بجلی کے ذریعے اس کے دونوں اجزا یعنی ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ آکسیجن مثبت برقیرے پر جمع ہو جاتی ہے۔

طبعی خواص

آکسیجن ایک بے رنگ بے بو اور بے مزا گیس ہے یہ پانی میں تقریباً ۲۰ درجے سینٹی گریڈ پر ۳.۰۲ فی صد تک حل ہو جاتی ہے۔ منفی ۱۸۲ درجے سینٹی گریڈ پر ہلکے نیلے رنگ کا مائع بن جاتی ہے اور منفی ۲۱۸.۴ درجے سینٹی گریڈ پر ٹھوس قلمی شکل اختیار کر لیتی ہے۔



ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم مل کر مرکب بناتے ہیں جسے پانی کہا جاتا ہے

آکسیجن ہماری زندگی کے لیے کھانے پینے سے زیادہ اہم ہے یہ ہوا کے ساتھ پھیپھڑوں میں جاتی ہے اور وہاں سے خون میں شامل ہوتی ہے۔ خون میں موجود زہریلے اثرات آکسائیڈ بنا لیتے ہیں اور یہ انسان کی موت کو کاربن ڈائی

آکسائڈ کی شکل میں باہر لے آتی ہے کم درجہ
حرارت پر یہ گیس نسبتاً عامل نہیں ہے مگر زیادہ
درجہ حرارت پر تقریباً تمام دھاتوں سے مل
کر ان کا آکسائڈ بنا دیتی ہے صرف ہیلوجین اور
نوبل گیسوں کے ساتھ نہیں ملتی اور چاندی
سونا اور پلاٹینیم کے ساتھ عمل نہیں کرتی غیر
دھاتوں کے ساتھ بہت جلد مل جاتی ہے مثلاً
ہائیڈروجن کے ساتھ مل کر پانی بناتی ہے
گندھک کاربن اور فاسفورس کے ساتھ مل کر
آکسائڈ بناتی ہے بہت سی دھاتوں کے ساتھ مل کر
یہ ان کے آکسائیڈ بناتی ہے مثلاً لوہا زنگ میں
تبدیل ہو جاتا ہے۔ سوڈیم کے ساتھ مل کر پھر
آکسائیڈ بناتی ہے اس عمل کو آکسیڈ کہتے ہیں
عمل پذیری کے لیے حرارت روشنی بجلی یا اس
قسم کی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اکثر اوقات
یہ عمل بذاتِ خود توانائی خارج کرتا ہے جو
حرارت روشنی آگ وغیرہ کی صورت میں ظاہر
ہوتی ہے۔ نمک کا تیزاب آکسیجن کے ساتھ مل کر
پانی اور کلورین میں تبدیل ہو جاتا ہے●

عبدالشکور شکور

دعا

اے دو جہاں کے والی ہم کو دے وہ ہدایت
تیرا ہی نام لیں ہم، آئے کوئی بھی آفت
ہادی ہے تو ہدایت دینا ہے کام تیرا
قادر ہے تو، تجھی کو ہر چیز پر ہے قدرت
یارب ہمیں تو اپنا پاسِ ادب عطا کر
ماں باپ اور بڑوں کی دل سے کریں ہم عزت
ہر لمحہ نام تیرا ہونٹوں پہ ہو ہمارے
ہر وقت ہم پہ برسے بارانِ ابرِ رحمت
پڑھ لکھ کے نام ایسا ہم بھی کریں جہاں میں
ہر کوئی ہم کو دل سے کرنے لگے محبت
ڈوبے ہوئے ہیں یارب اک بحرِ بے حسی میں
ہم پر کرم! کہ تیرے محبوب کی ہیں امت
مثلِ گلاب ہم بھی باغِ جہاں میں مہکیں
افسردہ دل کو بخشیں تسکین اور فرحت
یارب ہمارے بگڑے حالات کو بدل دے
ہم مومنوں کو پھر سے حاصل ہو دربِ الفت
تجھ سے شکور کی ہے بس یہ دعا الٰہی
دنیا سے جب وہ جائے ایمان رہے سلامت

پتا: کرشنانند پور کٹک (اڑیسہ)

ڈاکٹر سیفی پریمی

مرزا غالب کا ایک شعر

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

سمجھیے : اصل میں یہ شعر تلمیح طلب ہے۔ غالب نے اس شعر میں اپنی بندگی کو نمرود کی خدائی بتایا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ نمرود نے اپنی خدائی سے کوئی فیض نہ پایا۔ چنانچہ شاعر کو بھی اپنی بندگی سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ یعنی بندگی سے اس کا کچھ بھلا نہ ہوا۔ گویا غالب کی بندگی اور نمرود کی خدائی کا نتیجہ، صفر ہی نکلا۔

اس شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ غالب نے بندگی کا مرتبہ بلند کر کے خدائی تک پہنچا دیا ہے۔

دھیان دیجیے : تلمیح ؛ عربی، مؤنث (یہ علم بیان کی اصطلاح ہے)۔ شعر میں کسی واقعہ، معروف شخصیت، قصہ یا حکایت وغیرہ کا اشارہ کیا جائے تو اسے تلمیح کہتے ہیں۔

نمرود ؛ فارسی، مذکر (عراق میں ایک بادشاہ ہوا ہے جس کا اصل نام کیکاؤس تھا) زمانۂ قدیم میں عراق کے بادشاہوں کا لقب "نمرود" ہوتا تھا۔ کیکاؤس نے خدائی کا دعوا کیا۔ اس حکایت میں اصل نام غائب ہو گیا۔ "نمرود" کی شہرت ہو گئی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا دور بھی یہی ہے۔ انھوں نے نمرود کو بہت سمجھایا مگر وہ اپنے دعوے پر اٹل رہا۔ آخر دربارِ شاہی میں مناظرہ ہوا۔ پیغمبر نے نمرود کو ہرا دیا۔ بھرے دربار میں بادشاہ کی توہین ہوئی۔ اس کو جلال آیا اور سزا کا حکم دے دیا۔ الاؤ تیار کیا گیا۔ ہزاروں من لکڑی تین دن تک جلائی گئی۔ اسی کو "آتشِ نمرود" کہا جاتا

نگارستان۔ ذاکر نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ہے۔
گوپھن میں رکھ کر حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈلوا دیا۔ مگر خدا کے حکم سے وہ آگ سرد ہوکر گلزار ہوگئی۔ پیغمبر پر آنچ تک نہ آئی۔ چنانچہ شاعری میں اس کے کئی نام ہیں۔ ۱۔ گلزارِ ابراہیم ۲۔ گلزارِ خلیل ۳۔ گلشنِ خلیل ۴۔ گلستانِ ابراہیم (یہ سب ملیمات میں داخل ہیں)۔

اسی سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ نمرود نے تین لاکھ فوج جمع کرکے پیغمبر کو چیلنج دیا تھا کہ میرے مقابلے میں اپنے خدا کی فوج منگائے۔ پیغمبر نے دعا کی اور مچھروں کی بے پناہ فوج ٹوٹ پڑی۔ یہاں تک کہ دن میں رات کا سا اندھیرا چھا گیا۔ مچھروں نے نمرود کے ہر سپاہی کا خون پی لیا۔ فوج برباد ہوگئی تو نمرود اپنی جان بچانے کو محل میں جاکر چھپ گیا۔ مگر ایک کمزور لنگڑا مچھر وہاں بھی پہنچ گیا۔ اور نمرود کے دماغ میں گھس گیا۔ چالیس دن تک نمرود نہایت اذیت میں مبتلا رہ کر مرگیا۔ "نمرود" کا استعمال بازاً کسی ظالم اور سخت دل کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔

خدائی : فارسی، مونث ۔ صاحبی، خدا ہونا، دُنیا۔
نمرود کی خدائی : باطل اور عارضی خدائی ۔ اندھیر نگری چوپٹ راج والی خدائی۔
خدائی سے دوسرے لفظ بنائے گئے ہیں ۔ مثلاً خدائی خوار ۔ آوارہ، خانہ خراب، ذلیل و رسوا۔
خدائی کا جھوٹا : فریبی، دغاباز، زمانے کا جھوٹا۔
خدائی رات : رَت جگا۔
خدائی خوار گدھے سوار : خراب وخستہ، آوارہ۔
بندگی : فارسی مونث ۔ عبادت، پرستش، آداب، تسلیم، عجز، انکسار، خدمت، فرماں برداری، سلام، خدا حافظ۔
بھلا : ہندی ۔ عمدہ، خوب، اچھا، مناسب، بہتر، نیک، سہانا، دلکش، سلوک، مبارک۔

پیامیوں کے لیے خوشخبری
اب ہر ماہ "بچوں کی کوششیں" کے صفحات میں مضمون نگار کا فوٹو بھی شائع ہوگا۔ اپنے مضمون کے ساتھ اپنا پاسپورٹ سائز فوٹو بھی بھیجیے۔

صادقہ ذکی





۲۵ دسمبر حضرت عیسیٰؑ کا یوم ولادت ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بارے میں کئی مذہبی کہانیاں اور روایتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی والدہ حضرت مریمؑ کے یہاں خدا کے حکم سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کو روح اللہ بھی کہتے ہیں اور ابن مریم بھی۔ قرآن شریف میں حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کا ذکر آیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت مریمؑ جوزف نامی شخص کی بیوی تھیں۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے یہاں ایک بچّہ پیدا ہوگا جو دنیا کی بڑی شخصیت بنے گا۔ انھوں نے یہ خواب مریمؑ کو سنایا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایک مرتبہ دشمنوں سے پریشان ہو کر جب یہ لوگ یروشلم پہنچے تو یہاں بیتھلم BETHLEHAM کے مقام پر حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ کچھ وقت کے بعد تین نجومی حضرت عیسیٰؑ کو تلاش کرتے ہوئے حضرت مریم کے پاس آئے اور کہا کہ ہم نے مشرق کی طرف ایک تیز چمکدار ستارا دیکھا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخصیت پیدا ہو چکی ہے۔ جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ وہ لوگ چمکتے ہوئے تارے کے سہارے اس خاص مقام تک پہنچے تھے جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔

حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوتے ہی بولنے لگے۔ چاروں طرف ان کی شہرت پھیل گئی۔ انھوں نے پریشان لوگوں کو خدا کی رحمت کا سہارا دیا۔ ان کی ذات مظلوموں اور بیماروں کے لیے زندگی کا پیام تھی۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ آدمی سب سے بڑا ہوتا ہے

جو اپنے آپ کو چھوٹا سمجھے اور سچ مچ وہی بادشاہ بھی ہے جو اپنے آپ کو سب کا خادم مانتا ہو۔ پہلے ان کے خیالات غریبوں اور ظلم سے پسے ہوئے لوگوں میں پھیلے۔ پھر یہ شہرت دنیا کے دولت مندوں تک بھی پہنچ گئی۔ "انجیل" وہ آسمانی کتاب ہے جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ اس میں مسیحی مذہب کی تعلیمات ہیں۔ اور ان تعلیمات کو ماننے والے عیسائی کہلائے۔ حضرت عیسیٰؑ کو معجزہ بھی ملا تھا۔ وہ اندھوں اور بیماروں کو اچھا کر دیتے تھے۔ قُم بِاِذنِ اللّٰہ کہہ کر مُردے کو زندہ کر سکتے تھے۔ ان کی تعلیم کا خاص جزو انسانی ہمدردی اہنسا اور رحم دلی تھا۔

ہر برس حضرت عیسیٰؑ کے یوم پیدائش کو منایا جاتا ہے۔ اسی کا نام "عید مسیح" اور عیسائیوں کا "بڑا دن" ہے۔ اس دن گرجاؤں میں خاص عبادت کی جاتی ہے۔ تحفوں کا لین دین ہوتا ہے۔ یہ تیوہار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اس دن طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کیے جاتے ہیں۔ بھنی ہوئی بطخ (روسٹیڈ ٹرکی) اس تہوار کا خاص کھانا ہے۔ اس کے ساتھ کیک پیسٹری اور عید پوڈنگ جیسے مزیدار کھانے شامل ہوتے ہیں۔ رنگا رنگ خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ جگہ جگہ رنگین کلچرل پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ بند کمرے میں کرسمس ٹری (شجر عید) کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ موم بتیاں جلائی جاتی ہیں۔ پھول پتے لگائے جاتے ہیں اور تحفے لٹکائے جاتے ہیں۔ سانتا کروز SANTA CLAUSE جنھیں "کرسمس بابا" کہا جاتا ہے اس تہوار کا خاص مرکز ہیں۔ اصل میں سینٹ نکولس ایک فرضی کردار ہے۔ "کرسمس بابا" کو اسی روپ میں ہر برس دکھایا جاتا ہے۔ اور بچوں میں یہ خیال یا عقیدہ پھیلایا جاتا ہے کہ "کرسمس بابا" آدھی رات کے بعد آتے ہیں اور بچوں کے موزوں SOCKS میں بڑے دن کے تحفے بھر جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ کرسمس بابا بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان بنے رہتے ہیں۔ بچے انھیں اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جو بچے شوق سے پڑھتے لکھتے ہیں اور بڑوں کا احترام کرتے ہیں انھیں انعام ضرور ملتا ہے۔ کرسمس بابا بھی حضرت مسیح کی پیدائش کے دن بچوں کو انعام تقسیم کرتے ہیں۔ "نیکی" ایک تناور درخت کی طرح ہوتی ہے جس کی شاخوں سے بچوں کو میٹھا پھل ضرور ملتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے نیکی اور ہمدردی کی تعلیم دی۔ ان کی یادگار دنیا میں ہر برس منائی جاتی ہے۔ دور دور لوگوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کو "کرسمس کارڈ" بھیجے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۰ء سے شروع ہوا ہے۔ اس میں بچے بڑے سب دلچسپی لیتے ہیں۔

مترجم: غلام رزاق شیخ مصنّف: دھوم کیتو

نام کا بھوت

زیرِ نظر کہانی کے مصنّف دھوم کیتو (پیدائش ۱۸۹۲ء وفات ۱۹۶۵ء) کا اصلی نام گوری شنکر گووردھن رام جوشی تھا۔ اُن کی پیدائش سوراشٹر (گجرات) میں واقع ویرپور (جلارام) نامی گانو میں ہوئی تھی۔ گجراتی کے بہترین افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں دنیا کی مختلف زبانوں میں منتقل ہو کر قبولِ عام کا درجہ پا چکی ہیں۔ (مترجم)

"بھکشو پاپک" اپنا نام سن کر ہمیشہ سوچ میں پڑ جاتا کہ اس کی پھوپھی نے ایسا نام کیا سوچ کر رکھا ہوگا؟ کتنا خراب نام ہے پاپک! یہ بھی کوئی نام ہے؟ دوسروں کے نام کتنے خوبصورت ہوتے ہیں، اشوک، آنند، نند، چندن کیا خوب نام ہیں! اور یہ پاپک! کتنا بھدا نام ہے؟ اس نام سے اگر کوئی اسے پکارتا بھی تو بھکشو اکثر خاموش رہتا، جواب نہ دیتا اور سنی ان سنی کر جاتا۔ لیکن اس کا نام لے کر پکارنے والے اس کی دماغی الجھن کو کیسے سمجھتے؟ وہ تو جب کبھی بلاتے تو اسی نام سے بلاتے، پاپک! اور اسی طرح پاپک اندر ہی اندر سلگتا رہتا۔



۱۰/A سر آدم جی معصوم کالونی [illegible] آباد

لیکن جب بھکشک سنگھ کے بھکشوؤں کو پتا چلا کہ پاپک' نام سے پکارنے پر پاپک کو برا لگتا
ہے تب تو جان بوجھ کر 'پاپک' نام سے پکارنے والوں کی تعداد اور بڑھ گئی۔ کام نہ ہوتا تب
می لوگ اسے پکارتے "پاپک! اے پاپک!" چلتے پھرتے خواہ مخواہ ہر کوئی پاپک کو پکارتا
پاپک بھکشو تو اپنا نام سن کر تنگ آگیا۔ پاپک، پاپک، پاپک سے تو اس کے کان پک گئے
س نے سوچا کہ نام تبدیل کیے بنا اس پریشانی سے نجات ممکن نہیں۔ لہٰذا ایک روز وہ
گوان بدھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے التجا کی "بھگوان! مجھے
نا نام بدلنا ہے۔ سب مجھے پاپک، پاپک کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور یہ مجھے قطعی پسند نہیں۔
مجھے بار بار اس بات
پا کیسے بنا ہی
حساس ہوتا ہے
جیسے میں بہت
پاپی ہوں۔



بھگوان بدھ
نے کہا۔ بھکشو! نام
کیا دھرا ہے
نام تو خواہ کچھ بھی
ہمیت تو کام
کی ہے۔ تو بے کار
یشان ہوتا
ہے۔"
پاپک نے
عرض کیا۔" آپ
ات درست ہے بھگوان، پھر بھی آپ مجھے کوئی اچھا سا نام دے ہی دیجیے تاکہ اس پریشانی
نجات ملے۔"
بھگوان بدھ نے نہایت نرمی سے کہا، "تو خود ہی کوئی اچھا سا نام ڈھونڈ کر لے آ،
نام لائے گا وہی تجھے دے دیا جائے گا لیکن کوشش یہ کرنا کہ تجھے ایسا نام ملے
صف ہو۔ یعنی نام اور نام والے کے اوصاف دونوں میں یکسانیت ہو۔
پاپک تو بھگوان بدھ کا سمجھاؤ سن کر پھولے نہ سمایا اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اب
نیا پیارا نام ڈھونڈھ نکالنا چاہیے جو خوب صورت بھی ہو اور با وصف بھی اُسے نام کی
لگن لگی کہ بس اسی کی تلاش میں دیوانہ وار گھومنے لگا۔ جو کوئی ملتا اس سے اس کا
در پوچھتا۔
بھکشو پاپک کا بس چلتا تو وہ ناموں کی ایک نئی دنیا کی تخلیق کر ڈالتا اس کی شدید

خواہش تھی کہ نام اور وصف جمع ہو جائیں۔ اسے کوئی ایسا شخص مل جائے جو اسم با مسمّٰی ہو۔ پھر تو انسان نسرین ونسترن سے کبھی مخاطب ہو تو بھینی بھینی مہک کا ایک جھونکا سا آ جائے اگر کسی کا نام چندن ہو تو صندل کی خوشبو کا احساس ہو۔ باوصف نام کے متلاشی پاپک کے دل و دماغ پر نام کا کچھ ایسا ہی جنون سوار ہو چکا تھا کہ وہ ہر دم اسم با مسمّٰی کے بارے میں سوچا کرتا۔

اس طرح پاپک تو ہاتھ دھو کر نام کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک بار اس نے کسی کا نام رتھ پال سنا تو وہ اسے دیکھنے کے لیے دوڑا دوڑا گیا تو کیا دیکھتا ہے رتھ پال (رتھ چلانے والا) برہنہ پا چلا جا رہا ہے۔ نام رتھ پال اور پیر میں پہننے کو چپل تک نصیب نہیں۔

دوسری بار اسے دھن پال مل گیا۔ لیکن دیکھا تو دھن پال کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے وہ بھی در بدر بھٹک بھٹک کر بھیک مانگتا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ایک عرصے تک اسے کوئی ایسا نہ ملا جو اسم با مسمّٰی ہو۔

تاہم پاپک نے ہمّت نہ ہاری وہ گانو گانو شہر شہر جہاں جہاں جاتا بس نام اکٹھا کرتا۔ اسی طرح نام اکٹھا کرتے کرتے وہ ایک گانو پہنچا' جہاں اسے ایک بے حد پیارا نام ملا'' جیوک (ذی روح)، اس نے سوچا بس مجھے میری منزل مل گئی لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے پتا چلا کہ جیوک اسی روز مر گیا۔ نام جیوک لیکن وہ بھی نرجیو (غیر ذی روح) ہو گیا۔ پاپک نے سوال کیا۔'' اس کا نام جیوک تھا' وہ کیسے مر سکتا ہے۔

یہ سن کر لوگ ہنس پڑے،'' ارے بھائی نام سے کیا ہوتا ہے؟ نام تو محض ایک کی دوسرے سے علاحدہ شناخت کی علامت ہے۔ ایک گانو میں جتنے بچے پیدا ہوں ان سب کا نام اگر کلیان رکھ دیا جائے تو ایک کلیان کی دوسرے کلیان سے علاحدہ شناخت کیسے ممکن ہوگی؟ اس لیے نام تو محض تعارف کا ذریعہ ہے۔ جیوک نام رکھ لینے سے انسان امر (غیر فانی) تھوڑے ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہونے لگے تو سبھی مائیں اپنے بیٹوں کا نام جیوک اور بیٹیوں کے نام جیوتی رکھنے لگیں گی۔ نام تو صرف اس لیے ہوتا ہے کہ فلاں کو کسی خاص نام سے مخاطب کیا جائے۔

پاپک تو گھوم پھر کر تھک گیا۔ لیکن اسے کوئی شخص ایسا نہ ملا جو اسم با مسمّٰی ہو۔

اب اس کی آنکھیں کھلیں۔ اب اسے احساس ہوا کہ واقعی نام کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

اس کے بعد وہ پھر بھگوان بدھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بھگوان نے اُسے دیکھ کر فوراً دریافت کیا "کیوں بھکشو! کوئی اچھا یا وصف نام تجھے ملا یا نہیں۔"

پاپک نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "بھگوان میں نے رتھ پال کو برہنہ پا دیکھا۔ جو ننگے پیر گھوم رہا تھا۔ دھن پال بھیک مانگے اور جیوک کو بھی موت آئے تو پھر میرا نام پاپک کیا برا ہے۔ میرا نام اگر کچھ اور بھی ہو تو کیا فرق پڑے گا اور اگر میرا کوئی نام نہ ہوگا تو بھی کیا ہوگا۔ اب مجھے اپنا نام نہیں بدلنا۔ محض نام کے چار حرف تبدیل کر دینے سے تقدیر تھوڑے ہی بدلی جا سکتی ہے۔ نام کی حقیقت ہی کیا ہے۔ حقیقی اہمیت تو کام کی ہے۔"

بھگوان بدھ نے کہا، "بے شک، تو نے بالکل صحیح کہا بھکشو۔ اب تیری عقل میں یہ بات آئی کہ نام کی صحیح کامیابی تو کام سے ہے۔ دھن پال بھیک مانگے۔ دریا پنی کالے حروف پر کلہاڑی چلائے تو بھکشو کا پاپک نام کیا غلط ہے۔"

اس طرح پاپک کے سر سے نام کا بھوت اُتر گیا۔

(دھوم کیتو کی گجراتی کہانی "نام لو موہ چھوٹیو" کا اردو ترجمہ)

پیامی ادبی معمہ ۳۳ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل :- بجا حضرت شیخ فرید الدینؒ صفحہ ۱۴ (۲) موقع جنگل کی ایک رات صفحہ ۲۹ (۳) بے گنے سب سے بڑے انسان صفحہ ۱۵ (۴) قطب الدین بختیار کاکی صفحہ ۱۲ (۵) چاہے۔ پانچ جاسوس صفحہ ۴۹۔ (۶) ڈانٹ۔ بچوں کے ذاکر صاحب صفحہ ۴۲ (۷) "تاریخ۔ بچوں کا رسالہ صفحہ ۸۰ فروری ۸۵ء (۸) جان۔ پیام تعلیم صفحہ ۵۸ ستمبر ۸۷ء۔

بالکل صحیح حل پر پہلا انعام پانے والے ۳ خوش نصیب
فی کس ۲۵/- روپے تقسیم کیے گئے

خلیق احمد شاستری بھون نئی دہلی ۱۔ (۲) محمد عمران راجیشور پرساد پوسٹ گارڈن ریچ کلکتہ ۲۴۔ (۳) انیس الرحمٰن اوکھلا۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ (۴) ابرار احمد صدیقی۔ مدینہ نگر۔ ناندیڑ (مہاراشٹر)

ایک غلطی پر دوسرا انعام پانے والے ۱۰ خوش نصیب
فی کس ۵/- روپے کی کتابیں تقسیم کی گئیں۔

(۱) الیس خلیل احمد۔ ڈی سا ۵۔ نیڈا پر یا بابا کھڑک سنگھ مارگ۔ نئی دہلی ۱۔ (۲) شائستہ خلیل بیا مذکور ملا (۳) عطوفت عدنان شنکر پور۔ کٹک۔ (۴) محمود خالد التق۔ اسلام پیچھ۔ ویشا کھا پٹنم (۵) محمد شفیق الرحمٰن۔ سرفراز گنج لکھنؤ ۳۔ (۶) الیس الیف رحمٰن نادر۔ نسرو ودر بھانڈ شہر نیز البیت محل (۷) سید جمیل پاشا آفس سیکشن۔ بنگلور (۸) مظفر ابراہیم السو لکر ٹیم پالے۔ رائے گڑھ (۹) انعام الرحمٰن خالص پور۔ اعظم گڑھ۔ (۱۰) صہبا المسیب ریوڑی تالاب بنارس۔

پیاری بچیوں کے لیے

بکری کے پائے

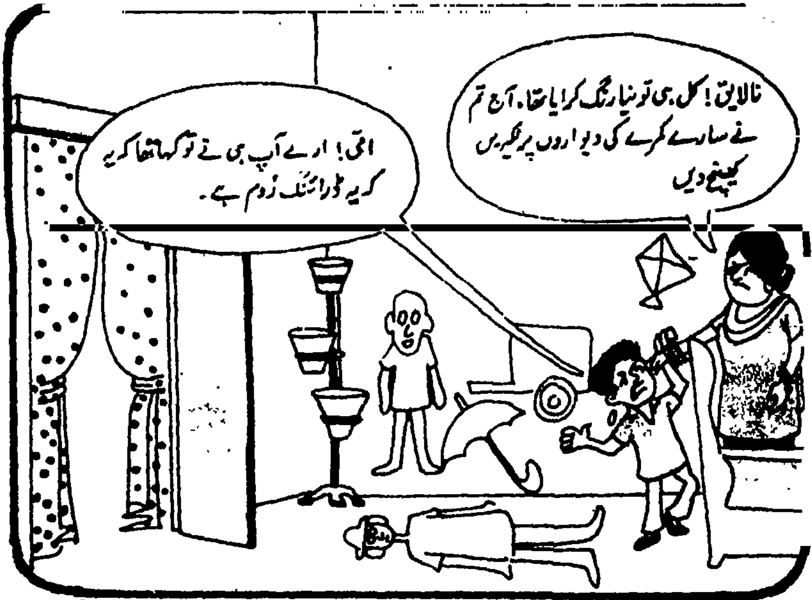
اشیا: بکری کے پائے بارہ عدد (درمیانہ سائز کے زیادہ چھوٹے نہ ہوں) لہسن ایک چھٹانک پیاز ایک پاؤ۔ سفید زیرہ ایک چائے کی چمچی سوکھا دھنیا چائے کی آدھی چمچی۔ لونگ آٹھ عدد، دارچینی دو ٹکڑے، ادرک آدھی چھٹانک دہی ایک چھٹانک، گرم مسالا پیسا ہوا ایک چمچی۔ ہرا دھنیا تھوڑا سا۔

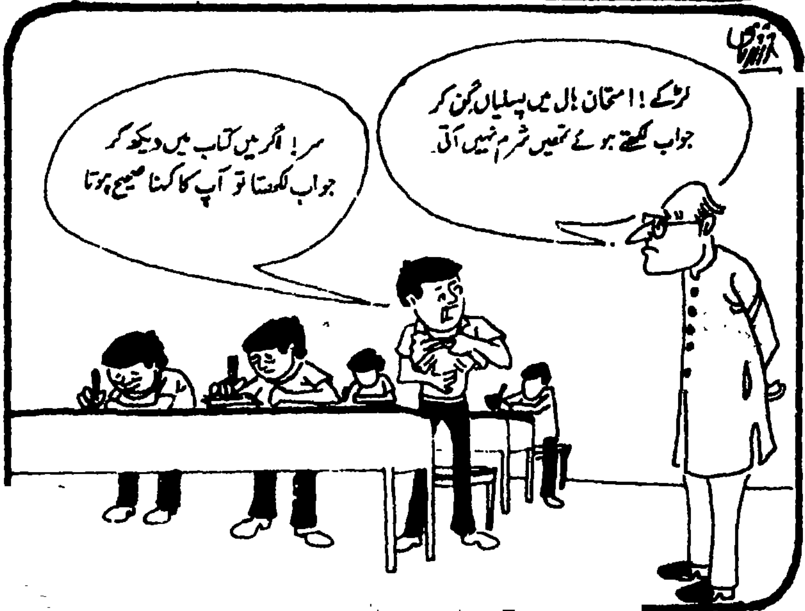
ترکیب: پائے اچھی طرح بیسن مل کر دھو لیں پھر ان میں بہت سارا پانی ڈال کر لونگ دارچینی ثابت ڈال کر پکنے کو رکھ دیں۔ اوپر سے دیگچی کا منہ بند کر دیں ان کو کم از کم چار گھنٹے پکنے دیں پھر دیگچی کا منہ کھولیں اور دیکھیں اگر پائے گل گئے ہوں تو اتار لیں ورنہ ایک آدھ گھنٹے اور پکنے دیں۔ سب مسالا ملا کر باریک پیس لیں۔ تھوڑا لہسن اور ادرک بھی پیس لیں اور تھوڑی پیاز بھی علاحدہ پیس لیں۔ اب ایک کھلے منہ کی دیگچی میں گھی کڑکڑائیں اور اس میں باقی پیاز باریک لچھے دار کاٹ کر تل لیں پیاز بادامی ہونے پر اس میں پسی ہوئی پیاز ملا دیں اور خوب بھونیں جب پیاز خوب بھن جائے تو اس میں لہسن ادرک پسی ہوئی اور سب پسے ہوئے مسالے ملا کر ڈال دیں اور بھونیں اب اس میں سرخ مرچ اور ہلدی پسی ہوئی ڈال دیں اور تھوڑا پانی ڈال کر بھونیں ساتھ پائے کی یخنی ایک ایک چمچہ ڈالتے جائیں اب اس میں دہی پھینٹ کر ڈال دیں اور ساتھ ہی پائے یخنی میں سے نکال کر ڈال دیں اور تھوڑا سا بھونیں اب اس میں باقی یخنی ڈال دیں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر چند منٹ پکا کر اتار لیں۔ اتارنے کے بعد اس میں پسا ہوا گرم مسالہ اور ہرا دھنیا ڈال دیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔ (منیر شگفتہ)

ثابت ران

اشیا:۔ چھوٹے بکرے کی ران ایک عدد (جس کا وزن ایک سیر سے زیادہ نہ ہو یا دستی کا ایک سیر کا ٹکڑا ہو جسے صاف کرا لیں) سرکہ چائے کی ایک پیالی۔ کالی مرچ چوتھائی چھٹانک، ادرک آدھی چھٹانک گھی آدھ پاؤ نمک حسب ذائقہ۔

ترکیب: گوشت کے ٹکڑے یا ران کو اچھی طرح سے گود لیں۔ اب ادرک کو باریک پیس لیں، اس میں کالی مرچ اور نمک پیس کر ملا دیں۔ یہ سب پسا ہوا مسالہ سرکہ میں ملا دیں۔ یہ سرکہ ران کے اوپر اچھی طرح مل دیں جو بچے اس پر ڈال دیں اور ایک دو گھنٹے تک ایسا ہی پڑا رہنے دیں۔ پھر ایک دیگچی میں گھی ڈال کر اس پر ران یا گوشت کا ٹکڑا ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر سرخ ہونے دیں جب سرخ ہو جائے تو اس میں پانی ڈال دیں اتنا کہ وہ ٹکڑا گل جائے۔ گلنے کے بعد دوبارہ سرخ کریں اور نکال کر ثابت ڈش میں پیش کریں۔ (ماہ جبین [illegible])


نالائق! کل ہی تو نیا رنگ کرایا تھا۔ آج تم نے سارے کمرے کی دیواروں پر لکیریں کھینچ دیں
امی! ارے آپ ہی نے تو کہا تھا کہ یہ کریہ ڈرائنگ روم ہے۔


لڑکے! امتحان ہال میں پسلیاں گن کر جواب لکھتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔
سر! اگر میں کتاب میں دیکھ کر جواب لکھتا تو آپ کا کہنا صحیح ہوتا





بہت پرانی بات ہے۔ ہندستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ولی داد نامی ایک شخص رہا کرتا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ نہ بیوی نہ بچے اور نہ کوئی اور رشتہ دار، بس ایک دوست تھا جو بہت مال دار تاجر تھا۔ اس کے پاس بھی وہ کبھی کبھی جایا کرتا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتا تھا، جو خود اس کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ ولی داد روز صبح سویرے اٹھ کر جنگل جاتا، وہاں گھاس کاٹ کر پیٹھ پر لاد کر گھر لے آتا۔ بعد میں اس گھاس کو خشک کر کے وہ بیچ دیا کرتا تھا۔ وہ بہت ہی کفایت شعار، نیک دل اور صابر و شاکر قسم کا انسان تھا۔ اس کی ضرورتیں محدود تھیں۔ وہ ان ضرورتوں کو پورا کر کے اپنے رب کا شکر بجا لاتا اور بہت خوش رہتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ ہر روز آدھا آنہ بچا کر ایک مٹی کی مٹکی میں ڈال دیا کرتا تھا۔ یہ مٹکی اس نے اپنی جھونپڑی کے فرش میں گاڑ رکھی تھی۔

ایک دن کھانا کھاتے ہوئے ولی داد نے سوچا کہ آج مٹکی نکال کر پیسے گنے جائیں۔ اس نے مٹکی کو نکال کر جب فرش پر اُلٹا تو حیران رہ گیا۔ ڈھیر سارے چمکتے سکے اس کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ان سکوں کو دیکھ کر پہلے تو وہ خوش ہوا مگر بعد میں پریشان ہو گیا۔ وہ ایک کفایت شعار انسان تھا۔ اتنی رقم سامنے دیکھ کر وہ بوکھلا گیا کہ اس رقم کا وہ کیا کرے گا؟ اس نے سوچا کہ اپنی ضرورت کے مطابق تو میں روز ہی کما رہا ہوں اور اس سے بچا لیتا ہوں، مگر اب اس کا کیا کروں؟ اس نے سارے سکوں کو ایک تھیلی میں بند کر کے اپنے بستر کے نیچے ڈال دیا اور آرام سے سو گیا۔ اگلے روز جب وہ سو کر اٹھا تو اس تھیلی کو لے کر قریبی گاؤں میں واقع ایک سنار کی دکان پر پہنچا اور اس سے ایک سونے کا کنگن خرید لیا اور اس کو بڑی احتیاط سے اپنے کمر بند میں باندھا اور اپنے مال دار تاجر دوست کے پاس پہنچا۔ یہ دوست دور دراز علاقوں کے سفر کیا کرتا تھا اور ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں گھوما تھا۔ وہ اونٹوں کے ایک قافلے کا مالک تھا۔ تاجر دوست سے مل کر ولی داد نے پوچھا "تم بے شمار



مقامات تک جا چکے ہو۔ کیا کبھی تمھاری ملاقات کسی خوبصورت اور اچھے کردار والی خاتون سے ہوئی ہے؟" تاجر دوست نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "ہاں ہاں خیستان کی شہزادی اپنی خوب صورتی، ذہانت اور نیک دلی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

"ہوں تو ٹھیک ہے۔ اب کی بار جب تم شہزادی کے پاس جاؤ تو یہ سونے کا کنگن اس کو بطور تحفہ دے دینا اور اس سے کہنا کہ یہ تحفہ ایک بوڑھے آدمی کی طرف سے آپ کے لیے ہے، جس کے نزدیک دنیا کی ساری قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی چیز مہربانی اور رحم دلی ہے۔" یہ کہہ کر دلی داد نے اپنے کمر بند سے سونے کا کنگن کھول کر اس کو دے دیا۔ سوداگر دوست پہلے تو حیران ہوا پھر اس نے خاموشی سے کنگن لے لیا۔

کچھ عرصے کے بعد اس کا خیستان جانا ہوا۔ اس نے وہ کنگن شہزادی کی خدمت میں پیش کر دیا اور دلی داد کا پیغام بھی پہنچا دیا۔ شہزادی تحفہ پا کر خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔ بہر حال جواب میں اس نے قیمتی ریشمی کپڑے سے لدا ہوا ایک اونٹ اور کچھ جواہرات دلی داد کو بھیجے۔ تاجر دوست جب دلی

داد کے گھر پہنچا تو وہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر قیمتی کپڑے سے لدا ہوا اونٹ دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ "میں اس بیش قیمت سامان کا کیا کروں؟" وہ بڑبڑایا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ تاجر دوست سے مخاطب ہوا: "کیا تم کسی ایسے نوجوان اور شریف شہزادے کو جانتے ہو جو اس قیمتی سامان کا اہل ہو؟"

تاجر نے جواب دیا، "بے شک! بغداد سے دہلی تک نیک آباد کے شہزادے جیسا شریف اور نوجوان لڑکا کہیں نہیں ہے۔" ولی داد نے خوشی سے کہا، "تو ٹھیک ہے تم یہ قیمتی کپڑا اس کے پاس لے جاؤ ساتھ ایک بوڑھے شخص کی دعائیں بھی۔" ولی داد اس خزانے سے چھٹکارا پاکر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اپنے اگلے سفر میں تاجر نیک آباد گیا اور اپنے کاموں سے فارغ ہو کر شہزادے کے ہاں پہنچا۔ اس نے قیمتی کپڑوں کے تھان شہزادے کے قدموں میں ڈال دیے اور کہا، "صاحب عالم! ایک بوڑھے شخص کی طرف سے یہ بیش قیمت تحفہ قبول کیجیے، جو آپ کی رحم دلی اور شرافت کو دنیا کی سب سے اچھی چیز سمجھتا ہے۔" شہزادہ ان تحفوں سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے اپنے ملک کے اچھی نسل کے بہترین گھوڑوں میں سے بارہ گھوڑے ولی داد کو تحفے کے طور پر بھیجے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تاجر کو بھی اس خدمت کے عوض انعام دیا۔

تاجر واپسی میں سیدھا ولی داد کے گھر پہنچا۔ ولی داد نے دور سے گھوڑے آتے دیکھ لیے تھے۔ وہ خود سے بولا، "واہ! کیا اچھی قسمت ہے میری۔ اتنے سارے گھوڑے۔ اب میں اپنی تمام گھاس اس کے مالک کے ہاتھ بیچ دوں گا۔ مجھے شہر نہیں جانا پڑے گا۔" وہ بھاگا بھاگا جنگل میں پہنچا اور بڑی تیزی کے ساتھ گھاس کاٹنی شروع کر دی، تاکہ گھوڑوں کے لیے چارے کا انتظام ہو سکے۔ اپنی طاقت سے زیادہ گھاس کا گٹھر اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے وہ جب جھونپڑی کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ گھوڑے اس کے اپنے تھے۔ ولی داد حیران پریشان سا کھڑا تھا۔ اس کی عقل میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے تاجر دوست سے کہا، "ان میں سے دو گھوڑے تم لے لو اور باقی دس گھوڑے خیستان کی شہزادی کو پہنچا دو، کیوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے عمدہ جانوروں کا استعمال اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔" تاجر نے مسکراتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ شہزادی نے گھوڑوں کا تحفہ قبول تو کر لیا، لیکن وہ یہ جاننا چاہتی تھی اس قسم کی

قیمتی چیزیں اور تحفے بھیجنے والا شخص آخر ہے کون؟ تاجر دوست نے کبھی بھی شہزادی کو یہ نہیں بتایا کہ یہ قیمتی تحفے بھیجنے والا شخص ایک غریب انسان ہے، جس کے جسم پر چیتھڑے لٹکتے رہتے ہیں، جو اپنی روزانہ کی محنت سے تھوڑے سے پیسے کماتا ہے اور جو اپنا پیٹ بمشکل تمام بھر پاتا ہے۔ اس نے تو شہزادی کو یہ بتایا کہ میرا دوست آپ کی شرافت اور رحم دلی سے بہت متاثر ہے۔ اسی لیے وہ اپنی بہترین چیزیں آپ کو تحفے میں پیش کرتا ہے۔

شہزادی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان قیمتی تحفوں کے بدلے میں اب اس شخص کو کیا بھیجے جو اس کی شایان شان ہو۔ اس نے اپنے والد سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اسے بتایا، "تم اس کے قیمتی تحفے اس کو واپس نہیں کر سکتیں۔ البتہ اس کو اتنے زبردست قیمتی تحفے بھیجو جن کے جواب میں وہ کوئی مقابلے کا تحفہ بھیج ہی نہ سکے۔ تب وہ شرمندہ ہو کر یہ سلسلہ بند کر دے گا۔"

یہ فیصلہ کرنے کے بعد بادشاہ نے اپنے نوکروں کو چاندی سے لدے ہوئے بیس خچر تیار کرنے کا حکم دیا اور یہ ولی داد کے لیے تحفے کے طور پر بھجوا دیے۔ تاجر دوست اس مرتبہ کچھ پریشان ہوا، کیوں کہ اس بار چاندی سے لدے ہوئے خچروں کا پورا قافلہ تھا۔ ان کی حفاظت کے لیے اس نے مسلح پہرے دار بھی ساتھ لیے تاکہ چوری یا ڈکیتی سے بچا جا سکے۔

ولی داد اپنی جھونپڑی کے دروازے پر اس عظیم الشان خزانے کو دیکھ کر چلایا، "بہت خوب! اب میں شہزادے کے بارہ گھوڑوں کے شان دار تحفے کا جواب بھیج سکوں گا۔" اس نے تاجر دوست سے کہا، "تم نے میرے لیے بہت محنت کی ہے۔ ان میں سے چھ خچر مع ساز و سامان کے تم لے لو اور باقی کو نیک آباد پہنچا دو۔ میں تمھارا بہت بہت شکر گزار رہوں گا۔" تاجر دوست کو اس کی محنت کا بہت اچھا معاوضہ مل رہا تھا اس لیے اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے نیک آباد جانے کی ہامی بھر لی۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ تحفوں کے اس تبادلے کا آخر انجام کیا ہوگا۔

نیک آباد کا شہزادہ ان تحفوں کو دیکھ کر ایک بار پھر حیران رہ گیا۔ اس نے تاجر سے پوچھا، "یہ ولی داد کون ہے؟ اتنی قیمتی تحفے کیوں اور کس طرح بھیج رہا ہے؟" جواب میں تاجر نے یہی کہا کہ وہ ایک اچھا انسان ہے اور آپ کی شرافت اور رحم دلی سے بہت متاثر ہے۔ اس کی اصل کہانی تاجر گول کر گیا۔ نیک آباد کے شہزادے نے بھی وہی فیصلہ کیا جو خیبستان کا بادشاہ کر چکا تھا۔ اس نے ولی داد کو اتنے قیمتی تحفے بھیجنے کا فیصلہ کیا جن کے جواب وہ کچھ نہ بھیج سکے۔ اس نے اعلا نسل کے بیس عربی گھوڑے تیار کرائے جن

سے پٹے سونے کے تاروں سے کڑھے ہوئے تھے۔ ان کے گلے میں چاندی کی گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ بیس بہترین اونٹ جو بغیر رکے اور بغیر تھکے سالوں چل سکتے تھے۔ بیس ہاتھی جن کے ہودے چاندی کے تھے۔ ان پر چاندی کی جھالریں پڑی ہوئی تھیں۔ ان جانوروں کے عظیم الشان جلوس کے ساتھ فوجیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ کتنا شاندار منظر تھا جب یہ جلوس نیک آباد کی گلیوں سے گزر کر ولی داد کے گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ولی داد اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے دور دھول مٹی کا ایک بادل سا اٹھتا دیکھا۔ جب منظر صاف ہوا تو اس نے اس جلوس کو دیکھا۔ اونٹوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کی قطاریں دیکھتے ہی وہ ایک بار پھر جنگل کی طرف دوڑا تاکہ زیادہ سے زیادہ گھاس کاٹ کر زیادہ سے زیادہ فروخت کر سکے۔ لیکن واپسی پر جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا اس کے بعد اس میں ہمت نہیں رہی۔ لوگ اس کو خوش قسمت قرار دے کر اس کو مبارک باد دے رہے تھے۔ وہ دکھ سے بولا "خوش قسمتی؟ جس شخص کے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہوں وہ ایسی خوش قسمتی لے کر کیا کرے گا"۔ بعد میں اس نے فیصلہ سنا دیا، "میرے دوست! دو اونٹ، دو گھوڑے اور دو ہاتھی مع ساز و سامان کے تم لے لو باقی سب کچھ خیستان کی شہزادی کی نذر کر دو"۔ اس بار تاجر نے اسے سمجھایا کہ اب میں جھوٹ بولتے بولتے تنگ آگیا ہوں۔ لوگ تمہارے بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں اب ان کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ لیکن ولی داد کے بار بار اصرار پر وہ مجبور ہو گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے بعد آئندہ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔

چند روز بعد ہی قافلہ خیستان روانہ ہوا۔ بادشاہ نے جب اپنے محل کے صحن میں جگ مگ کرتے ہوئے جانوروں کی بھیڑ دیکھی تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے معلوم کیا کہ یہ سب کیا ہے؟ جواب ملا، "ولی داد کا تحفہ"۔ بادشاہ نے شہزادی کو طلب کیا اور اس سے کہا، "مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص ولی داد تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک بار ہم اس سے ملیں۔ وہ ضرور بہت دولت مند انسان ہے۔ آخر وہ تم کو اتنے قیمتی تحفے بھیج رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم اس سے شادی نہ کرو"۔ شہزادی نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

فوراً ہی احکامات جاری کر دیے گئے۔ ہاتھی، اونٹ اور گھوڑے تیار کیے گئے۔ ریشمی خیمے، پر[illegible] کے لیے پھولداریاں، مردوں کے لیے گھوڑے تیار ہوئے۔ بادشاہ اپنی بیٹی کے ساتھ بڑی شان سے جلوس کی شکل میں اپنے ملک سے روانہ ہوا۔ اس کی رعایا نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ تاجر

جلوس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا، اس نے کئی بار بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن ولی داد کے قاصد کی حیثیت سے اس کی اتنی عزت اور حفاظت کی جاتی تھی کہ اسے ایک پل بھی تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ وہ ہر طرف سے گھر چکا تھا۔



اس نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور وہ شرمندگی سے بچ جائے۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب ولی داد کے گھر سے ایک دن کا سفر باقی رہ گیا تو بادشاہ نے تاجر کو حکم دیا کہ آگے جا کر ولی داد کو ہماری آمد کی اطلاع دو۔ ولی داد اپنی جھونپڑی میں پیاز اور سوکھی روٹی سے کھانا کھا رہا تھا کہ تاجر وہاں پہنچا اور اس کو سارے حالات بتائے۔

ولی داد اتنا پریشان ہوا کہ اس نے رونا شروع کر دیا وہ بار بار اپنے سر کے بال نوچتا تھا۔ اس نے تاجر سے درخواست کی کہ کسی بھی طرح جلوس کو ایک دن کے لیے روک دے۔ تاجر کے جانے کے بعد ولی داد نے سوچا کہ یہ صرف میری سادگی تھی جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے اور یہی آج میری جان بھی لے گی۔

آدھی رات کو وہ خاموشی سے اپنی جھونپڑی سے نکلا اور ایک پہاڑی پر پہنچا، جس کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اس وقت دریا میں زبردست طغیانی آئی ہوئی تھی۔ اس کی موجیں اُچھل اُچھل کر پہاڑی پر چڑھتی تھیں۔ دریا زبردست جھاگ اُڑا رہا تھا۔ ولی داد نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اچانک ہی دوڑ لگادی تاکہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکے، لیکن وہ دریا میں نہ کود سکا۔ ہوا کی سیٹیوں اور موجوں کے شور نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ ایک ٹھنڈی اور میٹھی روشنی اس کے اوپر پھیل گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید صبح ہوگئی ہے، لیکن نہیں وہاں تو دودھیا سی روشنی پھیلی ہوئی تھی، جس نے اس کو اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دو فرشتے وہاں کھڑے ہوئے ہیں۔

"تم کیوں رو رہے ہو۔ اے بوڑھے آدمی!" انھوں نے پوچھا۔ ان کی آواز بڑی نرم اور میٹھی تھی۔ اس نے کہا کہ میں شرم سے رو رہا ہوں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" دوسرے فرشتے نے پوچھا، "میں یہاں خودکشی کرنے آیا ہوں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا اور پوری کہانی سنادی۔ پہلے فرشتے نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ اچانک اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں کی جگہ قیمتی اور شان دار لباس آگیا۔ اس کے ننگے پیروں میں عمدہ قسم کے جوتے تھے۔ اس کے سر پر بہت اچھی پگڑی بندھی ہوئی تھی، جس میں قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ گلے میں قیمتی جواہرات کا ہار تھا۔ کمر کے ساتھ قیمتی تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ ابھی وہ اس حیرت سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرے فرشتے نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کی جھونپڑی کی طرف لے گیا، لیکن یہ کیا؟ وہاں تو کوئی جھونپڑی نہ تھی، ایک عظیم الشان اور خوب صورت محل تھا۔ اس میں بے شمار فانوس روشن تھے۔ تمام راہداریوں میں خادموں کی فوج ادھر سے ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ محل میں داخل ہوا، دربانوں نے اس کو سلامی دی۔ ایک فرشتے نے اس سے کہا، "ڈرو نہیں اندر جاؤ۔ اللہ سادہ اور محبت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور انھیں انعام دیتا ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی دونوں فرشتے غائب ہوگئے اور ولی داد گم سم کھڑا رہ گیا۔ ولی داد خواب کی سی حالت

میں چلتا ہوا ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا اور وہاں سو گیا۔ صبح بیدار ہونے پر اسے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے کوئی خواب نہیں تھا۔ زیادہ لطف جب آیا جب تاجر اس کو تلاش کرتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ تمھارا مکان تلاش کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ سارا جنگل اور سارے میدان خوب صورت باغوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ تمھارے چند نوکروں نے مجھے یہاں پہنچایا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ خیستان کے بادشاہ اور اس کی بیٹی کی آمد کا اعلان ہوا۔ ولی داد نے ان کا شایانِ شان استقبال کیا۔ تین دن اور تین رات ان کے اعزاز میں جشن منایا گیا۔ چوتھے روز خیستان کے بادشاہ نے ولی داد سے پوچھا کہ کیا تم شہزادی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ ولی داد نے جواب دیا، "میں نے ایسا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہے۔ میں تو بوڑھا اور بدصورت انسان ہوں۔ ایسی خوب صورت شہزادی سے شادی کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔" اس نے بادشاہ سے کہا کہ آپ تھوڑا انتظار کریں، کیوں کہ نیک آباد، میرا دوست شہزادہ آنے والا ہے۔

اگلے روز تاجر نیک آباد روانہ ہوا اور شہزادے کو بلا لایا۔ شہزادے نے جیسے ہی شہزادی کو دیکھا وہ اس پر فریفتہ ہو گیا اور فوراً ان کی شادی انجام پا گئی۔ شادی کے سلسلے میں بڑی زبردست دعوتوں اور جشن کا انتظام کیا گیا تھا۔ شادی کے بعد نیک آباد کا شہزادہ اپنی دلھن کو لے کر روانہ ہو گیا اور خیستان کا بادشاہ اپنے ملک چلا گیا۔ ولی داد ہمیشہ غریبوں اور ضرورت مندوں سے اچھا سلوک کرتا، ان کی مدد کرتا اور ان سے محبت سے پیش آتا تھا۔ اس کا دل ہمیشہ ویسا ہی سادہ اور پُرمحبت رہا جیسا کہ وہ ایک غریب گھسیارے کی حیثیت سے تھا۔ (ترجمہ)

دانش ور کا جواب

ایک دانش ور کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ تقریب کے آخر میں انھیں بتایا گیا کہ لوگ ان سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کاغذ پر سوالات لکھ کر بھیجیں، میں ہر ایک پر جواب دیتا ہوں۔ کئی سوالوں کے بعد ایک پرچی ان کے ہاتھ آئی جس پر صرف ایک لفظ لکھا ہوا تھا، "گدھا"۔ دانش ور تھوڑی دیر کے لیے حیران رہ گئے۔ پھر سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ بولے، "اب میرے پاس ایسا کاغذ ہے، جس میں کسی صاحب نے نام تو لکھ دیا ہے مگر سوال لکھنا بھول گئے ہیں۔"

مرسلہ: حامد علی شاہد، لاڑہ



علی ناصر زیدی

س: سمندر میں لہریں کیوں اور کیسے بنتی ہیں؟ آنسہ شگفتہ پروین

ج: سمندر دور دور تک کھلے ہوتے ہیں۔ ان پر چلنے والی تیز ہواؤں کو روکنے کے لیے کوئی دیوار یا رکاوٹ نہیں ہوتی۔ سمندروں پر تیز ہوائیں نہایت آزادی سے چلتی ہیں اور سمندروں کی بالائی سطح میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں۔ یہ ہلچل لہروں کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہے۔ گہرے سمندروں میں سطح پر تو لہریں نظر آتی ہیں، لیکن ان کے اندر مکمل خاموشی رہتی ہے۔

س: ایکس ریز، الٹرا ریز، لیزر یہ سب کیا ہیں؟ ایس ایم جمشید یوسف فاروقی

ج: ہمیں عام روشنی کی کرنیں نظر آتی ہیں لیکن بعض شعاعیں ایسی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں۔ ساتھ ساتھ وہ طاقت ور بھی ہیں۔ ایکس ریز، الٹرا ریز، لیزر وغیرہ ایسی ہی شعاعیں ہیں۔ وہ ہمیں نظر نہیں آتیں، لیکن اپنی قوت کے اعتبار سے وہ مختلف کاموں میں استعمال کی جاتی ہیں مثلاً ایکس ریز ہمارے جسم میں گھس کر اندر کی تصویر پیش کر دیتی ہیں۔ لیزر سے طرح طرح کے کام لیے جا رہے ہیں۔

س: ایک برقی مقناطیس کی مقناطیسیت کس طرح سے گھٹائی یا بڑھائی جا سکتی ہے؟

داد محمد بہادر

ج: برقی قوت کم زیادہ کر کے، لیکن دونوں صورتوں میں ایک حد ہوگی کہ اس کی قوت اس سے کم نہیں کی جا سکتی اور دوسری حد سے بڑھائی نہیں جا سکتی۔ دوسری صورت ان تاروں یا لچھے کے حلقوں سے تعلق رکھتی ہے جو برقی مقناطیس پر لپٹے ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد کم زیادہ کر کے بھی برقی مقناطیسیت کم زیادہ کی جا سکتی ہے۔

س: بلی کی آنکھوں میں ایسی کون سی چیز ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں اور وہ آسانی سے سب کچھ دیکھ لیتی ہے؟ محمد [illegible] نعیم

ج: ہم جب کوئی چیز دیکھتے ہیں تو یہ عمل پورا ہوتا ہے کہ روشنی کی شعاعیں اس [illegible]

ہیں اور وہاں سے پلٹ کر ہماری آنکھوں میں داخل ہوتی ہیں اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم فلاں چیز دیکھ رہے ہیں۔ ہم انسان اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ ہماری آنکھوں کی بناوٹ ایسی ہے۔ لیکن جس چیز کو ہم اندھیرا کہتے ہیں وہ مکمل اندھیرا نہیں ہوتا۔ تھوڑی بہت روشنی اس میں موجود ہوتی ہے جو ہمیں تو نظر نہیں آتی لیکن بلی اور بعض دوسرے جانور اس کم روشنی میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ اُن کی پتلی پھیل جاتی ہے اور انھیں وہ چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔

س: اگر پانی کو بہت ٹھنڈا کیا جائے تو وہ ٹھوس شکل (برف) اختیار کر لیتا ہے اور جب اس برف کو گرم کیا جائے تو وہ پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس انڈے کو ہم اُبالتے ہیں تو وہ ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے جبکہ پانی کو ٹھنڈا کیا جائے تو وہ برف بن جاتا ہے۔

طارق لطیف خاں،

ج: دنیا میں مادّے کی بے شمار قسمیں اور چیزیں پائی جاتی ہیں ان سب کے خواص اور استعمال مختلف ہیں۔ ضروری نہیں کہ جو قاعدے قوانین ایک چیز پر لگیں وہ دوسری پر بھی صحیح بیٹھیں۔ پانی دو گیسوں ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے۔ اس میں یہ صفت ہے کہ وہ درجۂ حرارت کم ہو جانے کے ساتھ ساتھ جمتا ہے، یہاں تک کہ صفر ڈگری سینٹی گریڈ پر ٹھوس برف بن جاتا ہے۔ برف کو گرمی پہنچائی جاتی ہے تو برعکس عمل ہوتا ہے اور اس سے پھر پانی بن جاتا ہے۔ انڈا پانی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ وہ گرمی پا کر جم جاتا ہے۔ آپ پانی کے قوانین کا اطلاق انڈے پر نہیں کر سکتے، کیوں کہ دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔

س: سائنس کس طرح وجود میں آئی؟ عمران حسن پاروانی

ج: ایک زمانہ تھا کہ انسان جانوروں جیسی زندگی گزارتا تھا، لیکن چوں کہ اللہ نے اسے اشرف بنایا ہے اس لیے اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھ کر ترقی کرنی شروع کی۔ رہنے سہنے، کھانے پینے اور زندگی بسر کرنے کے دوسرے طریقے بدلنے لگے۔ پہیا ایجاد ہوا تو گویا ٹیکنالوجی کی ابتدا ہوئی۔ اُس نے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی اشیا کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ تھی سائنس کی ابتدا، جو بڑھتے بڑھتے موجودہ منزل تک آگئی ہے۔

س: بجلی (روشنی) تو خطِ مستقیم میں حرکت کرتی ہے لیکن آسمانی بجلی (روشنی) ہمیں ٹیڑھے

راستوں پر چلتی نظر آتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ قیصر فہیم،

ج: آپ اپنے گھروں میں جو بجلی استعمال کرتے ہیں وہ برقِ رواں ہے اور اس کی پیدا کی ہوئی روشنی خطِ مستقیم پر چلتی ہے لیکن آسمانی بجلی برقِ رواں نہیں ہے بلکہ زبردست چارج ہے جس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ مثبت اور منفی۔ جب یہ برقی چارج ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں یعنی مثبت چارج والا اور منفی چارج والا بادل جب ایک دوسرے کے اوپر یا قریب آجاتے ہیں تو منفی چارج لپک کر مثبت چارج سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہوا اس عمل میں مزاحمت کرتی ہے۔ اس لیے یہ چارج کم مزاحمت والے راستوں سے گزرتا ہے اور ہمیں زمین سے ٹیڑھا میڑھا نظر آتا ہے۔ ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے ہی کڑک بھی سنائی دیتی ہے۔

س: برقی موٹر کیا ہے؟ منیب الرحمان زاہد

ج: موٹر انگریزی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "حرکت کرنے والا"۔ برقی موٹر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے بجلی سے چلتا ہے۔ اس میں ایک مقناطیس ہوتا ہے جس کے شمالی اور جنوبی قطبین کے درمیان تار کا لچھا ہوتا ہے جسے آرمیچر کہتے ہیں۔ مقناطیس کا اپنا ایک مقناطیسی فیلڈ ہوتا ہے اور جب کرنٹ آرمیچر میں سے گزرتا ہے تو اس کا اپنا ایک مقناطیسی فیلڈ حرکت میں آجاتا ہے۔ ان دونوں فیلڈوں کے باہمی عمل سے موٹر کا دھرا گھومنے لگتا ہے۔ اگر اس سے کوئی مشین، پمپ یا کوئی بھی چیز جوڑ دی جائے تو اس میں بھی حرکت پیدا ہو جائے گی۔ موٹر چیزوں کو گھمانے یا چلانے کے کام آتا ہے۔

س: لوہے کو جب زنگ لگ جاتا ہے تو وہ پہلے کی نسبت بھاری کیوں ہو جاتا ہے؟

محمد ارشد آزاد

ج: زنگ ایک طرح کا کیمیائی مادّہ ہے، جو لوہے کے کھلی ہوا اور آکسیجن میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس پر چڑھ جاتا ہے۔ اس اضافی مادّے کی وجہ سے لوہے کے ٹکڑے کا وزن کچھ زیادہ ہو جاتا ہے، یعنی زنگ لگنے سے لوہے کے وزن میں بہت معمولی اضافہ ہوتا ہے۔

خط کے جواب میں

ناہید پروین

نازش کے ہاتھ میں ایک پرانی تصویر تھی، جو اس کی چوتھی سال گرہ کی تھی۔ تصویر میں وہ اور اس کا بڑا بھائی آفاق اور اس کے امی ابو ساتھ تھے اور وہ بڑی خوشی خوشی کیک کاٹ رہی تھی۔ نازش اپنے ماضی کی حسین یادوں میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اُسے اپنے آس پاس اور وقت کا کچھ ہوش نہ تھا۔

آفاق اپنی بہن نازش کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا جب نازش کے کمرے میں پہنچا تو اسے احساس تک نہ ہوا اور جب آفاق نے اُسے پکارا تو وہ ایسے چونکی جیسے اس کا پیارا سا سپنا ٹوٹ گیا ہو۔ "ہم آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور کتنی ہی آوازیں دیں، مگر آپ تو بہری ہو



گئی ہیں۔ اب جلد از جلد ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا کہ ہماری پیاری بہن کے کانوں کے پردوں میں خلل واقع ہو گیا ہے۔"

نازش خوش ہو کر بولی:

"اچھا تقریر ختم، یہ بتایئے ہمارے بھیا کو اتنی بے تابی سے کیوں ہماری یاد آئی؟"

"واہ! ہم کیوں یاد کرتے۔ اب تو تم ہمیں یاد کرو گی۔" آفاق نے جھٹ جواب دے دیا۔ "بات دراصل یہ ہے گڑیا بہن کہ ابّو کا خط آیا ہے۔ میں نے سوچا تمھیں اطلاع دے دوں۔"

"ارے سچ! ابّو کا خط آیا ہے۔ پلیز جلدی سے دے دیں۔ مجھے تنگ نہ کریں۔"

آفاق کا جب موڈ ہوتا وہ اسی طرح نازش کو تنگ کر کے محظوظ ہوتا۔ ابّو کا خط چوں کہ بہت دنوں میں آیا تھا اس لیے اکثر وہ ابّو کی طرف سے خط لکھ کر خود ڈاک میں ڈال دیتا تھا کیوں کہ آفاق سے اپنی بہن کی اُداسی نہیں دیکھی جاتی تھی۔

لیکن آج چوں کہ واقعی ابّو کا خط آیا تھا اس لیے وہ بھی بہت خوش تھا۔ ابّو کی ایک خواہش وہ تو قبول کر لیتا مگر نازش کا راضی ہونا بہت مشکل تھا۔

نازش نے جب ابّو کا خط پڑھا تو وہ اداس ہو گئی، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بھیا، کیا آپ یہاں رہ کر اعلا تعلیم حاصل نہیں کر سکتے؟"

آفاق نے اس سال ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان دیا تھا اور نازش نے جماعت نہم کا دیا تھا اور اس کے پاس بھی سائنس تھی۔ آفاق کو پوری امید تھی کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آئے گی، کیوں کہ اس نے بہت محنت کی تھی اور ابّو کی خواہش تھی کہ وہ اعلا تعلیم امریکا میں حاصل کرے۔ آفاق نازش سے تین سال بڑا تھا۔ جب اس کے ابّو امریکا گئے تھے تو آفاق سات سال کا تھا اور نازش چار سال کی تھی۔ جب ابّو ڈھیروں کھلونے بھیجتے تو وہ دونوں بہت خوش ہوتے اور نت نئی فرمائشیں لکھ کر بھیجتے، لیکن آہستہ آہستہ انھیں اپنے ابّو شدت سے یاد آنے لگے، مگر ابّو نے انھیں کھلونوں سے بہلانا چاہا، جو ممکن نہ ہوا۔ ان کی امّی نے ان دونوں کی تربیت اتنے اچھے ماحول میں کی تھی کہ ان میں غرور اور تکبّر نام کو نہ تھا۔ وہ اپنے ہر دوست سے خواہ غریب ہو یا امیر اور اپنے رشتے داروں سے بڑے خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔

آفاق نے اپنی بہن کو بہت سی دلیلیں دے کر سمجھانا چاہا کہ میں اعلا تعلیم حاصل کر کے ملک و

قوم کی خدمت کروں گا، لیکن نازش نے بھی ڈھیروں دلیلیں دے کر اُسے قائل کر لیا اور کہا، بھیا، ہم اتنی دُور کی کیوں سوچیں۔ بھلا ابّو کو یہاں کس بات کی کمی تھی جو ہم سے اتنی دُور چلے گئے۔ اولاد کو والدین کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے ابّو کی جدائی میں یہ بیس سال سے دن کس مشکل سے گزارے ہیں!

آخر آفاق کو اپنی چھوٹی بہن کے آگے جھکنا ہی پڑا، کیوں کہ محبت میں بڑی طاقت ہے۔

شام کو نازش آفاق بھیا کے کمرے میں گئی تو میز پر ایک لفافہ پڑا تھا۔ اس نے کھول کر دیکھا تو بھیا نے ابّو کو جواب لکھا تھا۔ وہ جلدی جلدی پڑھنے لگی تحریر تھا:

پیارے ابّو جان! السلام علیکم

نازش، میں اور ممی آپ کی دعاؤں سے بالکل خیریت سے ہیں۔ آپ کا خط ملا پڑھ کر خوشی ہوئی مگر ابّو آپ کو یہ پڑھ کر افسوس ہوگا میں اپنا ملک نہیں چھوڑ سکتا۔ میری قوم نے میری بنیادی تعلیم پر اتنی محنت کی ہے۔ میرا فیصلہ ہے کہ میں اعلا تعلیم بھی اپنے پیاروں کے قریب رہ کر حاصل کروں۔ ابّو، ہماری قوم کو ہماری ضرورت ہے۔ مجھے اپنے وطن سے بہت محبت ہے۔ اگر امریکا میں تعلیم حاصل کروں تو کیا خبر میرے قدم ڈگمگا جائیں اور وہاں کی رنگینیاں دیکھ کر میرا جذبۂ حُبِ وطن ماند پڑ جائے۔ ابّو، ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی یہاں مستقل آجائیں۔ ہمیں قدم قدم پر آپ کی ضرورت پڑتی ہے اور پڑتی رہے گی۔ ہمیں دولت کی نہیں صرف آپ کی محبت کی ضرورت ہے۔ امید ہے مجھے اور نازش کو مایوس نہیں کریں گے۔ جواب جلد دیجیے گا انتظار رہے گا۔

خدا حافظ

آپ کا بیٹا آفاق احمد

خط پڑھ کر نازش کو اپنے بھائی پر ڈھیروں پیار آیا۔ اس کے بھائی نے اس کی محبت کی لاج رکھ لی تھی۔

تھوڑے دنوں بعد آفاق کا رزلٹ آیا۔ اس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ پاس ہونے کی خوشی میں آج آفاق نے اپنے دوستوں کو پارٹی دی تھی۔ آفاق اور اس کی ممی اور نازش بہت خوش تھے۔ کاش ابّو ہوتے تو کتنا مزا آتا۔ آفاق اپنے ابّو کو یاد کر رہا تھا کہ گھنٹی کی آواز پر چونک گیا اور نازش بھاگ کر دروازے پر پہنچی۔ آفاق بھی پیچھے پیچھے آگیا تھا۔ دروازے پر اچانک اپنے ابّو

کو دیکھ کر دونوں کے دل خوشی سے جھوم اٹھے۔ شاید انھیں امید نہیں تھی کہ ان کی یہ خواہش اچانک اتنی جلدی پوری ہو جائے گی اور وہ دونوں بے یقینی کی کیفیت میں ابو سے لپٹ گئے۔

نازش بولی "ابو! آپ نے تو ہمیں کوئی خبر بھی نہیں دی اور اچانک آگئے!"

"ہاں بیٹی، تمھارا خط پڑھ کر میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ بس اب اپنے ہندوستان ہی میں رہیں گے اور اچانک تمھیں آ کر زیادہ خوشی ہوتی ہے اور میں تمھارے چہرے پر یہ خوشی دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کتنا بدنصیب باپ ہوں کہ اپنی پیاری معصوم بچیوں کو چھوڑ کر دولت کی محبت میں خوار ہوا۔ بچو! مجھے معاف کر دو کہ میں نے اپنے اوپر اور تم لوگوں پر بہت ظلم کیا۔ ہم ایک دوسرے کی محبت کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب ہم سب محنت کر کے اپنے گھر اور اپنے وطن میں اُجالا کریں گے۔"

نازش اور آفاق اپنے ابو کا فیصلہ سن کر اتنے خوش ہوئے کہ خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔ آج ان کی دعائیں پوری ہو گئی تھیں اور نازش سوچ رہی تھی کہ خدا جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور آج تو ان کو بھی خوشیاں مل گئی تھیں جن پر وہ جتنا بھی ناز کرے کم تھا

چھوٹے فرق بڑی غلطیاں

رؤف پاریکھ

معاشرہ زندگی میں جب ہم بولتے ہیں یا لکھتے ہیں تو زیر، زبر اور پیش جیسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال نہیں رکھتے، حالانکہ زبان بہت نازک چیز ہے۔ اس میں ذرا سے فرق سے مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اکثر لوگ خودکُشی کو خودکَشی بولتے ہیں یا پڑھتے ہیں۔ لفظ "کُشی" فارسی کے لفظ "کُشتن" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے "مارنا یا قتل کرنا"۔ اس طرح خودکُشی کا مطلب ہوا "خود کو مارنا یا خود کو قتل کرنا"۔ بعض دوسرے الفاظ مثلاً جراثیم کُش (یعنی جراثیم کو مارنے والا) اور گاؤکُشی میں بھی یہی کُشتن والا کُش ہے۔ جب کہ کَشی فارسی کے لفظ کَشیدن سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے "کھینچنا"۔ محنت کَش، تصویر کَشی، جفاکَش اور دل کَش جیسے الفاظ اسی سے بنے ہیں۔ لہٰذا "خودکَشی" کا لفظی مطلب تو ہوگا "خود کو کھینچنا" اور اس کا کچھ مطلب نہیں ہوا۔ یاد رکھیے صحیح تلفظ ہے "خودکُشی"۔

اسی طرح لفظ "تنقید" کا مطلب "نکتہ چینی کرنا" یا "عیب بیان کرنا" لیا جاتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ تنقید کا لفظ عربی کے لفظ "نَقد" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے "کھرا کھوٹا پہچاننا، پرکھنا یا شعر و ادب کو جانچنا"۔ چناں چہ تنقید کا مطلب برائی بیان کرنا یا نکتہ چینی کرنا نہیں ہے۔ اسے ان معنوں میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

ایک دل چسپ غلطی جو اردو میں اکثر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ "شعب ابی طالب" کو "شعب ابی طالب کی گھاٹی" لکھا جاتا ہے۔ شعب عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گھاٹی۔ گویا شعبِ ابی طالب کا مطلب ہوا ابی طالب کی گھاٹی۔ لیکن بعض لوگ "شعبِ ابی طالب کی گھاٹی" لکھتے ہیں جس کا مطلب ہو جاتا ہے "ابی طالب کی گھاٹی کی گھاٹی"۔ ایسی ہی ایک اور دل چسپ غلطی "آبِ زم زم" بولتے وقت کی جاتی ہے۔ بعض لوگ اسے "آبِ زم زم کا پانی" کہتے ہیں۔ حالانکہ آب کا مطلب پانی ہی ہے۔ لہٰذا "آبِ زم زم کا پانی" کا مطلب ہوا "زم زم کے پانی کا پانی"۔ صرف "آبِ زم زم یا صرف "زم زم کا پانی" کہنا کافی ہے۔ ہو بہو یہی غلطی لفظ سنگِ مرمر بولتے وقت ہو جاتی ہے۔ سنگ کا مطلب ہے پتھر۔ اسے "سنگِ مرمر کا پتھر" کہنا غلط ہے۔

سنگ مرمر یا صرف مرمر کا پتھر کہنا چاہیے۔

بظاہر تو یہ غلطیاں بہت چھوٹی نظر آتی ہیں، لیکن ان سے مطلب میں بڑا فرق پڑتا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی زبان بولتے وقت یا لکھتے وقت یہ کہہ کر بے پروائی نہیں برتنی چاہیے اور نہیں سوچنا چاہیے کہ "کیا فرق پڑتا ہے؟ کیوں کہ ان غلطیوں سے فرق تو بہرحال پڑتا۔

آواز کیسے پیدا ہوتی ہے

جب کبھی کسی ٹھوس، مائع یا گیس میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے، یعنی ان میں کپکپاہٹ پیدا ہو جاتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہتھوڑے سے اسکول کی گھنٹی بجائی جاتی ہے تو اس میں سے آواز نکلتی ہے۔ ہتھوڑے سے بجانے پر گھنٹی میں لرزش ارتعاش پیدا ہوتا۔ اور یہی آواز ارتعاش کا سبب بن جاتا ہے۔

اس طرح پیدا ہونے والی آواز لہروں کی صورت میں ہوا میں سفر کرتی ہے۔ اگر آواز سفر نہ کرے تو سنائی بھی نہ دے۔ آواز کی لہریں ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی لہریں پرسکون تالاب میں کنکر پھینکنے سے پانی کی سطح پر پیدا ہوتی ہیں۔

خرگوش تو تم نے دیکھا ہی ہوگا کتنا خوب صورت اور بھولا بھولا جانور ہے اس کے کان کتنے لمبے ہوتے ہیں۔ کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ آخر قدرت نے خرگوش کو کان اتنے لمبے کیوں عطا کیے ہیں۔ خرگوش کو اپنی آنکھوں سے اچھی طرح نظر نہیں آتا، لیکن اُس کے سننے کی قوت بہت تیز ہوتی ہے جسے قوتِ سامعہ بھی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے خرگوش خطرے کی ہلکی سے ہلکی آواز بھی سُن لیتا ہے چوں کہ خرگوش زمین پر رہتا ہے اس لیے وہ زمین سے ابھرنے والا ہر ارتعاش سُن لیتا ہے اور یہی آوازیں سن کر خرگوش اپنے بچاؤ کی کوشش کرتا ہے۔

شہد کا چھتہ

آدھا کلو گرام وزنی شہد کا چھتہ بنانے کے لیے شہد کی مکھیوں کو تقریباً دو ملین یا دس لاکھ پھولوں کا رس حاصل کرنا پڑتا ہے۔



علامہ دانش کے سفرنامے

چمکنے والے پھول

معراج

علامہ دانش سے بہت دنوں تک ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم ان سے ملنے اور کوئی نیا معرکہ سر انجام دینے کے لیے بے تاب تھے۔ علامہ کے پاس نت نئی خبروں کا ذخیرہ رہتا تھا، لیکن وہ کسی مہم پر جانے سے پہلے اس خبر کے متعلق پوری تحقیق کر کے معلومات ضرور حاصل کیا کرتے۔ آخر ایک دن علامہ ہمارے دفتر میں پہنچے۔ ہم نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ علامہ نے اپنا بیگ کھول کر ایک اخبار کا تراشا نکالا اور بولے :

"برما کے شمالی حصے میں جنگل کے اندر ایک جھیل ہے، جس کے درمیان ایک ٹاپُو (جزیرہ) ہے۔ اس جزیرے میں کنول کے ایسے پھول کھلتے ہیں، جن کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ

پھول رات کے وقت چمکتے ہیں اور ان سے اچھی خاصی روشنی خارج ہوتی ہے۔"

کپتان مرشد نے مسکرا کر کہا، "آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ پھولوں سے روشنی نکلتی ہو۔"

علامہ سنجیدگی سے بولے، "شروع میں تو مجھے بھی اس بات پر یقین نہیں آیا۔ میں نے حکومت برما سے خط و کتابت کی۔ انھوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔" علامہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اور کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر بولے، "رات کے وقت جگنو کو چمکتے ہوئے آپ نے دیکھا ہے۔ کچھ مچھلیاں بھی چمکنے کی خاصیت رکھتی ہیں۔ بعض پودے ایسی گیسیں خارج کرتے ہیں جو ہوا میں ملنے سے چمک پیدا کرتی ہیں۔ بعض سبزیوں میں فاسفورس کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے، چناں چہ جب وہ سبزیاں گلتی سڑتی ہیں تو ایسی گیسیں خارج کرتی ہیں جن میں فاسفورس کی کچھ مقدار ہوتی ہے۔ یہ فاسفورس ہوا میں جلتی ہے تو روشنی پیدا ہوتی ہے۔"

میں نے کہا، "کیا اس قسم کی روشنی کے لیے فاسفورس کی موجودگی ضروری ہے؟"

علامہ سر ہلا کر بولے، "بالکل صحیح، در اصل فاسفورس کے معنی ہیں 'میں چمکتا ہوں'۔ ایسی روشنی کے لیے فاسفورس کی موجودگی یقینی بات ہے۔ میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ پودے فاسفورس کی گیس خارج کرتے ہیں یا پھر ان کے پھولوں میں فاسفورس کی مقدار موجود ہے۔"

آزونا قہوہ لے آیا، ہم سب قہوہ پینے میں مصروف ہو گئے۔

اگلے ہفتے ہم برما پہنچے۔ برما کے جنگلوں میں بہت سی جھیلیں ہیں۔ ان میں صحیح جھیل کا تلاش کرنا بے حد دشوار ثابت ہوا۔ وہاں کے لوگ بے حد وہمی اور ڈرپوک نکلے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ جب ہم جھیل کے نزدیک پہنچتے تو لوگوں کی زبان گنگ ہو جاتی۔ وہ ہمیں کچھ بتانے سے بچتے اور ڈرے سہمے ہوتے رہتے۔ جب ہم جھیل سے بہت دور نکل جاتے تو ہمیں جھیل کے بارے میں سنی سنائی باتیں بتاتے۔ ہم بہت دقت اور دشواری کے بعد اس جھیل تک پہنچنے میں کام یاب ہو گئے۔ جھیل کے آس پاس دور دور تک کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں مکانات تو موجود تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں لوگ آباد تھے لیکن جب پھولوں سے روشنی نکلنے لگی تو وہ اسے روحوں کا کارنامہ سمجھ کر خوف زدہ ہو گئے اور وہاں سے بھاگ گئے۔

جھیل کے درمیان میں ایک ٹاپو تھا۔ اس میں ایک ٹوٹا پھوٹا مندر تھا۔ شاید یہاں بھی خوب

جھیل پہلی رہتی ہوگی لیکن اب دریائی کا دور دورہ تھا۔
ہم نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر جہاز کو جھیل میں اتارا۔ میں جھیل کی خوب صورتی کیسے بیان کروں
نیلگوں پانی میں ابھرا ہوا جزیرہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑا ہوا نظر آتا تھا۔ جزیرے میں سبزہ بہت
تھا۔ طرح طرح کے پھول دار پودے تھے۔ ناریل کے درخت جھرمٹ کی شکل میں جگہ جگہ تھے۔ شاید آپ
اس منظر کو بہت خوب صورت اور دل کش سمجھتے ہوں گے۔ ذرا مجھ سے پوچھ کر دیکھیے تو میں بتاؤں کہ
اس خوب صورتی کے ساتھ مچھروں کی کثرت، خون چوسنے والی جونکیں، زہریلی مکڑیاں اور خوف ناک
سانپوں کے علاوہ بے شمار کیڑے مکوڑے بھی تھے۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا، لیکن
ہم تحقیق کے شوق میں نکلے تھے۔ ہمیں اپنی جان کی کوئی فکر اور پروا نہیں۔

مرشد نے کہا، "مجھے تو یہاں وہ پھول نظر نہیں آ رہے۔"

علامہ بولے، "یہ پھول رات کو چمکتے ہیں، اس لیے دن میں نظر نہیں آتے۔"

میں نے اکتا کر کہا، "میں بہت تھک گیا ہوں، میں جہاز پر واپس جا کر کچھ دیر آرام کرنا
چاہتا ہوں۔"

آزونا اور مرشد نے بھی میری تائید کی۔ ہم سب جہاز پر واپس پہنچے۔ ہم نے چائے پی۔ کچھ
دیر آرام کیا پھر رات کا اندھیرا چھانے لگا۔ آزونا کھانا لے آیا۔ ہم سب کھا پی کر فارغ ہوئے۔
علامہ اپنی کوئی داستان دہرانے لگے۔ اس دل چسپ گفتگو میں خاصی رات بیت گئی۔

علامہ دانش بولے، "پھولوں کی روشنی دیکھنے کے لیے یہ وقت بہت اچھا ہے۔"

کپتان مرشد نے کہا، "معاف کیجیے گا، شاید آپ بھول گئے ہیں کہ یہ جنگل جہاں دن کے وقت
خاموشی طاری رہتی ہے، رات کے وقت کچھ قسم کے جانور، سانپ، چھپکلیاں اور دوسرے حشرات
(کیڑے مکوڑے) کھانے پینے کی تلاش میں باہر نکلتے ہیں۔ مجھے رات کی تاریکی میں جنگل کی سیر
کرنے کا شوق نہیں۔"

میں نے بھی کپتان مرشد کی تائید کی اور کہا، "ممکن ہے کوئی اس اندھیرے میں سانپ یا بچھو
پر پاؤں رکھ دے یا کہیں سے کوئی تیندوا نکل آئے۔ ان دریاؤں میں مگرمچھ بھی پائے جاتے ہیں۔"

علامہ فکر مند ہو کر بولے، "پھر کیا کیا جائے؟ تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ۔"

کپتان مرشد نے کہا، "اس وقت تو سب لوگ سو جائیں۔ دن نکلنے سے ایک گھنٹے پہلے ہم جزیرے

پر چلیں گے۔ ایک گھنٹے میں ہم کافی گھوم پھر لیں گے۔ اس کے بعد سورج نکل آئے گا تو ہم اپنا کام ختم کر کے واپس لوٹیں گے:

سب نے اس بات کو پسند کیا۔ ہم سب سو گئے۔ صبح ہونے سے ٹھیک ایک گھنٹہ پہلے الارم بجنے لگا۔ ہم سب اس مہم پر چل دیے۔ سب سے آگے کپتان مرشد تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس کے پیچھے ہم سب تھے۔ ہر ایک کے پاس ضروری سامان تھا۔ راستے میں کوئی خاص بات پیش نہیں آئی۔ چوہے اور دوسرے جنگلی جانور ہمارے قدموں کی چاپ سن کر جھاڑیوں میں گھس جاتے۔ آخر ہم اس ویران مندر تک جا پہنچے۔ اچانک کپتان مرشد ٹھیر گیا اور غور سے مندر کی طرف دیکھنے لگا۔ کوئی بات ضرور تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے بھی مندر کی طرف دیکھا۔ وہاں عجیب ہی منظر تھا۔ مندر عجیب سی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ یہ پُراسرار روشنی کنول کے ان پھولوں سے نکل رہی تھی جو مندر کے آس پاس لگے ہوئے تھے۔

یہ پھول بھی انوکھے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ پھول شفاف کاغذ کے بنے ہوئے ہوں اور ان کے اندر دور کہیں بلب روشن ہو۔ جن سے نیلی پیلی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔ ان پھولوں کی ہر ایک پتی سے روشنی خارج ہو رہی تھی۔ ان کی ٹہنیاں اور ڈنٹھل نظر نہیں آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ پھول ہوا میں تیر رہے ہوں۔

علامہ دانش نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کے منہ سے خوشی کی آواز نکلی۔ وہ دوڑتے ہوئے پھولوں کے پاس پہنچے۔ انھوں نے پھولوں کو پکڑا اور انھیں غور سے دیکھنے لگے۔ پھر انھوں نے پھولوں کو سونگھا۔ اچانک وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹے۔ پھولوں سے عجیب طرح کی بدبو نکل رہی تھی۔ یہ سڑے ہوئے انڈوں کی طرح تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ بُری۔ اس بدبو سے مجھے متلی ہونے لگی۔ ایسی بدبو مردم خور (انسانوں کو کھانے والے) پودوں اور صراحی دار پودوں سے آتی ہے۔

جوں ہی علامہ دانش کی طبیعت ٹھیک ہوئی وہ پھر ان پھولوں کے پاس پہنچے اور ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ میں، آرزو نا اور مرشد تو دور دور سے ہی ان پھولوں کا نظارا کرتے رہے۔ ہم پھولوں کے پاس جا کر کیا کرتے؟ ...دیر کے بعد اس روشنی کو دیکھ دیکھ کر طبیعت اکتا گئی۔ بدبو کی وجہ سے مجھے متلی سی ہونے لگی، لیکن علامہ کے ...ق و شوق کا وہی عالم تھا۔ وہ اس اہم دریافت پر کوئی تقریر فرما رہے تھے۔ انھوں نے ایک پھول توڑا۔ اس ... روشنی اچانک جاتی رہی۔ انھوں نے ٹارچ کی روشنی میں پھول کا معائنہ کیا۔ اس کی پتیاں گندے اور

ردی کاغذ جیسی تھیں۔ علامہ نے نفرت سے کہا، "اس پودے کے چپچپے عرق سے میرے ہاتھ خراب ہو گئے ہیں۔ آزونا ذرا پانی لاؤ تاکہ میں اپنے ہاتھ دھو سکوں۔"

ہم نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ علامہ کے ہاتھوں پر گاڑھا، سرخ اور چپچپا عرق لگا ہوا تھا۔ میں تو یہ سمجھا کہ علامہ کا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ علامہ بھی یہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ انھوں نے جلدی جلدی گھاس اور پتوں سے یہ عرق پونچھا اور ہاتھوں کو صاف کیا۔

کپتان مرشد نے تجویز پیش کی کہ ہمیں جو کچھ دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا، اب ہمیں واپس جہاز پر جانا چاہیے۔ سورج نکلنے کے بعد ہم دوبارہ یہاں آجائیں گے۔

علامہ دانش بولے، "میں خالی ہاتھ واپس جانا پسند نہیں کرتا۔ میں کچھ پودے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ پھولوں کے چمکنے کا راز پودے کی جڑوں میں پوشیدہ ہے۔"

علامہ دانش کی بات ہمیں ٹھیک معلوم دی۔ ہم نے چاقو سے زمین کھودنی شروع کی، لیکن پودے کی جڑیں تو بہت گہری تھیں۔

اب اچھا خاصا اُجالا ہو گیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ پھولوں کی چمک بھی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ علامہ دانش بہت غور سے اس تبدیلی کو دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی سورج نکلا، پھول مرجھا گئے۔ کچھ پھول تو جھڑ کر گر پڑے۔

آزونا جہاز سے بیلچہ اور کدال لے آیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹا اور زمین کھودنے لگا۔ وہ بہت دیر تک کھدائی کرتا رہا لیکن ان پودوں کی جڑیں بہت گہرائی تک چلی گئی تھیں۔

ہم اس صورتِ حال سے تنگ آچکے تھے۔ آزونا نے پوری قوت سے زمین میں بیلچہ مارا اور مٹی کی کافی مقدار نکال کر باہر پھینکی۔ یہ ٹھیک ہمارے قدموں کے پاس گری۔ جوں ہی یہ مٹی زمین پر گری، اس میں حرکت ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے مٹی میں جان پڑ گئی ہو۔ ہم نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بے شمار کیڑے ہیں، سرخی مائل بھورے رنگ کے۔ نہ جانے ان میں کس غضب کی طاقت تھی۔ یہ اپنے بدن کو سکیڑ کر ہوا میں چھلانگ لگاتے اور پانچ چھے فیٹ بلندی تک اُچھلتے۔ ایک کیڑے نے کپتان مرشد کو کاٹ لیا۔ ایک قدر شناس کیڑا علامہ کی ناک سے چپک گیا وہ چیخ مار کر دوڑے لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ علامہ اسی کیڑے کو ہاتھ میں پکڑے اس کا معائنہ فرما رہے تھے۔ ادھر آزونا نے ایک زوردار چیخ ماری۔ میں نے اسے کھینچ کر گڑھے سے باہر نکالا۔ اس کے پیچھے پیچھے سیکڑوں،

ہزاروں کیڑوں کا ایک چشمہ سا بہتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ ہم پوری تیز رفتاری سے دوڑے۔ علامہ ابھی تک کیڑوں کے اس سیلاب کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ کپتان مرشد نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا "دوڑیئے اپنی جان کو بچانے کے لیے دوڑیئے ورنہ یہ کیڑے ہمیں چٹ کر جائیں گے"

علامہ اور مرشد بھی ہمارے پیچھے پیچھے تیز رفتاری سے دوڑنے لگے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کیڑوں کی فوج بھی اسی تیز رفتاری سے ہمارے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم پھر سر پٹ بھاگنے لگے۔ ذرا غور تو فرمائیے۔ ہم کس چیز سے ڈر کر بھاگ رہے تھے۔ وہ نہ خون خوار جانور تھا نہ دشمن کی فوج۔ یہ تو حقیر اور بے حقیقت کیڑے تھے۔

جب ہم پانی کے پاس پہنچے تو ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جلدی سے جہاز پر سوار ہو گئے۔ کپتان مرشد نے جہاز کا انجن چلایا اور اسے کنارے سے کافی دور لے گیا۔ ہم نے دیکھا کہ کیڑوں کی فوج پانی کے پاس جا کر ٹھیر گئی۔ کچھ دیر بعد دُور دُور تک کیڑے ہی کیڑے نظر آنے لگے۔

کپتان مرشد نے کہا "علامہ صاحب، اب آپ ان پودوں کی جڑیں حاصل نہ کر سکیں گے"

علامہ افسوس سے بولے، "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ ان لاتعداد کیڑوں سے نپٹنا ہمارے لیے مشکل بلکہ ناممکن ہے۔"

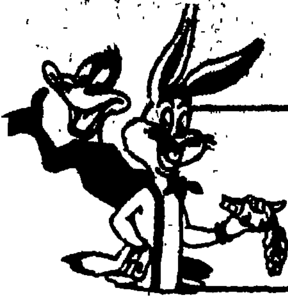
ہم برما کے دارالحکومت رنگون گئے۔ وہاں ایک سرکاری افسر نے ہمیں بتایا کہ بہت عرصے پہلے یہ جزیرہ آباد تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے بہت سے مگرمچھ ادھر آ گئے اور جزیرے کے لوگوں کو ہڑپ کرنے لگے۔ ایک پجاری نے مگرمچھوں کو پکڑنے کے لیے ایک گہرا گڑھا کھدوا اور اس میں ایک بیل باندھ دیا۔ مگرمچھ اس گڑھے میں اترنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ گڑھا ان مکروہ صورت جانوروں سے بھر گیا۔ پجاری نے باہر نکلنے کا راستہ بند کر دیا۔ وہ مگرمچھ گڑھے میں پھنس کر رہ گئے اور کچھ دن بعد وہیں مر کھپ گئے۔ ان کے مردہ جسموں سے سڑاند پھوٹنے لگی۔ لوگ اس بدبو سے گھبرا گئے اور جزیرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے کچھ عرصے بعد لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ جزیرے میں روحیں رہتی ہیں۔

ہم اس مہم سے ناکام واپس لوٹے۔ راستے میں علامہ دانش نے بتایا "ان مگرمچھوں کے جسم گل سڑ کر کھاد بن گئے۔ اس میں فاسفورس کی بہت مقدار شامل تھی۔ یہی فاسفورس پھولوں میں چمکتا تھا۔ گلنے سڑنے کے عمل سے یہ لاتعداد کیڑے بھی پیدا ہو گئے۔"

میں نے کہا "مُردہ مگرمچھوں، ان کیڑوں اور پھولوں میں کیا تعلق تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں

تو آئی نہیں اور وہ کنول کے پھول ٹوٹتے ہی کیوں مرجھا جاتے تھے؟"

علامہ مسکرا کر بولے "یہ معمّا تو ابھی تک میں بھی حل نہیں کر سکا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور سائنس داں اس راز کو حل کرلے۔"



مُسکراتے رہو

● گاہک: میں نے ایک درجن مالٹوں کا آرڈر دیا تھا لیکن وہ تو صرف دس نکلے ہیں۔

دکان دار: جناب ہم خراب مال گاہک کو دینا پسند نہیں کرتے۔ دو مالٹے خراب تھے اس لیے وہ آپ کی طرف سے پھینک دیے ہیں۔

مرسلہ: فیصل احمد عباسی

● ایک صاحب پُل پر چل رہے تھے۔ پیر جو پھسلا تو دھڑام سے ندی میں گر پڑے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے انھیں ندی سے نکالا۔ فرمانے لگے "یہ تمام میرے حافظے کا قصور ہے۔ گرنے کے بعد مجھے یاد ہی نہ رہا کہ مجھے تیرنا بھی آتا ہے۔"

● چند لڑکے ایک راہ گیر کو چھیڑ رہے تھے۔ راہگیر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے راہ گیر سے کہا، "تمھارے بال لیے معلوم ہو رہے ہیں جیسے گھاس کا گٹھڑ ہو۔

راہ گیر نے پلٹ کر جواب دیا، "اب میں سمجھا کہ گدھے میرے پیچھے پیچھے کیوں آ رہے ہیں۔"

مرسلہ: فہمینہ کوثر

● شوکت کو کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔ جب امتحان میں اُردو کا پرچہ آیا تو اسے ایک شعر بھی تحریر کرنا تھا۔ اس نے لکھا:

شکم کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری غذا کیا ہے

● تین قیدی یہ ثابت کرنا چاہ رہے تھے کہ وہ سب سے پہلے جیل میں داخل ہوئے تھے۔ پہلا بولا، "میں تو تب سے اس جیل سے وابستہ ہوں جب ریل گاڑی ایجاد ہوئی تھی۔" دوسرے نے کہا، "میں تو تب سے یہاں ہوں جب اللہ نے گھوڑوں کو بنایا تھا۔" تیسرا کہنے لگا، "یہ گھوڑے کیا ہوتے ہیں؟" (نام نہیں لکھا)

● ایک عورت اپنے بچے کو لے کر ماہر نفسیات کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ ہر ڈرائنگ میں صرف سرخ رنگ ہی بھرتا ہے۔ ڈاکٹر نے بچے پر ہپناٹزم کا عمل کر کے پوچھا، "بیٹا آپ ہر ڈرائنگ میں ایک ہی رنگ کیوں بھرتے ہیں؟"

"کیوں کہ میرے پاس اور رنگ ختم ہو گئے ہیں۔"

مرسلہ: نام نہیں لکھا

● استاد: تم نے آج ہوم ورک کیوں نہیں کیا؟

شاگرد: کیا تو تھا مگر میں نے اس کا ہوائی جہاز بنا لیا۔

استاد: (حیرانی سے) تو پھر کیا ہوا؟

شاگرد: وائی جیکر اُسے اغوا کر کے لے گئے۔ مرسلہ: شا علیم

● باپ: بیٹا اگر جھوٹ بولنے والے کالے اور سچ بولنے والے گورے ہو جائیں تو تم کیا بننا پسند کرو گے؟

بیٹا: دھاری دار۔

مرسلہ: حمیرا اصغر

● ایک دوست: (دوسرے دوست سے) میں بےحد پریشان ہوں مجھے ڈاکٹر صاحب نے کرکٹ کھیلنے سے منع کر دیا ہے۔

دوسرا دوست: ڈاکٹر صاحب سمجھ ہوں گے کہ تم کرکٹ کھیلتے ہو۔

مرسلہ: شاہد محمود آصف

● بچی: امی جان آپ نے کہا تھا کہ آپ ہماری استانی کو ایک مرغی تحفے میں دیں گی؟

ماں: بیٹا اب وہ ٹھیک ہو گئی ہے اور دانہ کھانے لگی ہے۔

مرسلہ: قاضی تنزیر عبدالعزیز

● ایک صاحب کا انتقال ہو گیا۔ رشتہ داروں نے سوچا کہ جاتے ہوئے مرحوم کا بطور یادگار ایک فوٹو ہو جائے چناں چہ فوٹو گرافر کو بلایا گیا۔ اس نے اپنا کیمرا فٹ کیا۔ میت کے چہرے سے کپڑا اٹھایا اور حسبِ عادت میت سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، "مسکرائیے!"

مرسلہ: مجیب الرحمٰن،

● استانی جمع سکھاتے ہوئے بولیں، نوری! تمھارے پسندیدہ اعداد کون سے ہیں؟

نوری: ۲۷۰م . ۳۴۰ اور ۴۴۰

بس، شاباش، اب ان سب کو جمع کر کے بتاؤ کہ کتنے ہوئے۔

نوری: اگر یہ بات ہے تو میرے پسندیدہ اعداد ایک اور دو ہیں۔

مرسلہ: ریاست خان

● ٹکٹ چیکر: (لڑکے سے) تمھاری عمر کیا ہے؟

لڑکا: گاڑی میں تین سال، اسکول میں چار سال اور گھر میں پانچ سال۔

● ایک صاحب پینٹنگ کی نمائش میں گئے۔ ایک تصویر کو دیکھ کر وہ کہنے لگے، "کتنی خوب صورت تصویر ہے۔ میرے تو منھ میں پانی آ رہا ہے۔" ایک صاحب جو ان کے برابر میں کھڑے تھے کہنے لگے کہ تصویر کو دیکھ کر آپ کے منھ میں پانی کیوں آ رہا ہے؟ یہ تو ایک خوب صورت منظر کی تصویر ہے۔ وہ صاحب بولے، "میں تو سمجھا تھا کہ یہ انڈے کی زردی ہے۔"

مرسلہ: فوزیہ عباس

● ایک آدمی خودکشی کے ارادے سے ریل کی پٹڑی پر لیٹا تھا۔ پاس سے گزرنے والے ایک شخص نے کہا کہ جب تجھے مرنا ہی منظور ہے تو اپنے پاس یہ روٹیاں کس لیے رکھی ہیں؟ اس آدمی نے جواب دیا کہ اگر گاڑی لیٹ ہو گئی تو کیا بھوکا ہی رہوں گا؟

مرسلہ: عارف چغتائی

● بوٹ پالش والا: جوتوں پر پالش کرا لیجیے صاحب۔

نوجوان: نہیں مجھے پالش نہیں کرانی ہے۔

بوٹ پالش والا: آپ پالش کروا کے تو دیکھیں۔ میں

آپ کے جوتے ایسے چمکاؤں گا کہ اس میں چہرہ صاف نظر آنے لگے گا۔

نوجوان: کہہ تو دیا مجھے نہیں کروانا پالش۔

پالش والا: ڈرپوک کہیں کا۔

مرسلہ: شازیہ صابر

● گاہک: تمھاری بیکری کی ڈبل روٹی خراب ہوتی ہے۔

بیکری والا: میں اس وقت سے ڈبل روٹی تیار کر رہا ہوں جس وقت آپ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

گاہک: ٹھیک ہے، مگر بھلے آدمی اس وقت کی ڈبل روٹی اب کیوں بیچ رہے ہو۔

● دکان دار: (ایک لڑکے سے) تم روز کتابیں دیکھتے ہو مگر کوئی کتاب لے کر نہیں جاتے؟

لڑکا: میں روز ایک کتاب لے کر جاتا ہوں اگر آپ نہیں دیکھتے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

مرسلہ: عائشہ عباس

● ایک شخص دوڑا دوڑا ڈاکٹر کے پاس آیا اور بولا، "تین دن سے میرے گلے میں اٹھنی کا سکہ پھنسا ہے جلدی سے نکال دیں۔" ڈاکٹر غصے سے: تین دن سے پھنسا ہے اور تمھیں اب یاد آیا ہے۔ اس شخص نے جواب دیا "جناب! مجھے اس کی ضرورت ہی اب پڑی ہے۔"

مرسلہ: آشر منیر جلال

● ایک خاتون نے اپنی پڑوسن سے کہا، "کون کہتا ہے کہ میں موٹی ہوں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ جب میں فوٹو اُتروانے گئی تو فوٹوگرافر نے مجھ سے گروپ فوٹو کھنچوانے کی قیمت وصول کی۔"

مرسلہ: عائشہ چوہدری، عظیم چوہدری

● فقیر: اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔

راہگیر: کیا تمھارے پاس دس روپے کا کھلا ہے۔

فقیر: ہاں ہے۔

راہ گیر: تو پہلے اس کو خرچ کرو، بعد میں مانگنا۔

مرسلہ: تبسم سلیمان

● ایک کنجوس آدمی ہوٹل میں داخل ہوا تو بیرے نے پوچھا، "جناب، آپ کو کیا چاہیے؟"

کنجوس آدمی: صبح میں جو کھانا چھوڑ گیا تھا وہ چاہیے۔

مرسلہ: محمد آصف ریاض

● آدمی: (ریڈیو مکینک سے) کل ہی آپ سے ریڈیو ٹھیک کرایا تھا، لیکن آج پھر یہ شور کر رہا ہے۔

ریڈیو مکینک: دراصل آج موسم خراب ہے۔

آدمی: (غصے سے) جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس کی تمام چیزیں ٹھیک کر دیں تو پھر آپ نے موسم کیوں ٹھیک نہیں کیا۔

مرسلہ: خرم ظفر

ایک مرتبہ ایک ملحد بے دین خلیفہ ہارون کے دربار میں آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے سب سے بڑے عالم حضرت امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ انھیں بلائیں کہ وہ میرے ساتھ مناظرہ کریں اور ثابت کریں کہ اللہ موجود ہے۔ خلیفہ نے اسی وقت ایک ایلچی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ انھیں بلا لائے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ایک ملحد سے مناظرہ کرنا ہے۔ وہ ایلچی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تلاش میں دریا کے کنارے ان کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اس نے خلیفہ کا پیغام حضرت امام ابوحنیفہؒ کو پہنچایا۔ آپؒ نے خلیفہ کا پیغام سننے کے بعد ایلچی سے کہا کہ وہ چلے، آپ تھوڑی دیر بعد پہنچ جائیں گے۔

ایلچی نے دربار میں پہنچ کر حضرت امام ابوحنیفہؒ کا پیغام خلیفہ تک پہنچایا۔ بہت انتظار کرنے کے بعد بھی حضرت امام ابوحنیفہؒ دربار میں نہ پہنچے تو اس ملحد نے بڑے طمطراق سے کہا، "دیکھیے خلیفہ محترم! آپ کا بڑے سے بڑا عالم بھی میرا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ حق پر نہیں ہے۔"

خلیفہ نے پھر ایلچی کو بھیجا کہ آپ فوراً دربار پہنچیں۔ آپؒ نے پھر وہی بیان فرمایا۔ انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ خلیفہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوا ہی چاہتا تھا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ دربار میں پہنچ گئے۔

خلیفہ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے اتنی تاخیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا، "امیرالمومنین! میں دریا کے کنارے کشتی کا انتظار کر رہا تھا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ ادھر کوئی کشتی نہ آئی۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک درخت اکھڑ کر پانی میں گرا۔ اس کے گرتے ہی اس درخت کے کئی تختے بنے اور پھر وہ تختے آپس میں جڑ گئے اور اس کے بعد ایک کشتی تیار ہو گئی اور میں اسی کشتی میں بیٹھ کر دریا کے پار آیا اور پھر یہاں پہنچ گیا۔"

ملحد جو ساری گفت گو سن رہا تھا فوراً بولا، "خلیفہ محترم! آپ کا یہ عالم غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک درخت پانی میں گرے اور اس کے تختے بھی بن جائیں اور خود بخود جڑ کر ایک کشتی کا روپ اختیار کر لیں۔" حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اس پر فرمایا:

"اگر ایک چھوٹی سی کشتی بغیر کسی کاریگر کے نہیں بن سکتی تو اتنی بڑی کائنات کس طرح بغیر کسی بنانے والے کے بن سکتی ہے؟" ملحد اپنا سا منھ لے کر خاموش ہو گیا۔

زمین پر کیا گزری ؟

بہت سے بچے ہماری زمین کے متعلق مختلف سوالات پوچھتے ہیں کہ جب وہ اربوں سال پہلے سورج سے پیدا ہوئی تو پھر اُس پر کیا گزری۔ وہ کن مرحلوں سے گزر کر موجودہ حالت پر آئی؟ شروع میں ہماری زمین آتشیں گیس کا ایک دہکتا ہوا گولا تھی۔ اُس پر کسی قسم کی آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمین ٹھنڈی ہوئی لیکن سکڑنے کے ساتھ اس میں جُنبش پیدا ہوتی رہی۔ اندر کا لاوا باہر نکلا اور یوں زمین پر آتش فشاں پہاڑ وجود میں آئے۔ یہ لاوا اب بھی زمین کی اندرونی تہوں میں اسی طرح بھرا ہُوا ہے۔ کبھی کبھی اور کہیں کہیں آتش فشاں پہاڑ اُبلے باہر پھینکتے ہیں۔ زمین کی اسی اندرونی حرکت، جنبش اور تلاطم سے زلزلے آتے ہیں۔

شروع میں زمین گیسی حالت میں تھی اور اپنے محور پر بڑی تیزی سے گھوم رہی تھی۔ اُس کے دن رات اب کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے۔ وہ بالکل گول نہیں تھی بلکہ گول بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کی شکل ناشپاتی جیسی ہو گئی۔ پھر یکایک اس عظیم ناشپاتی کی ٹوپی اُس سے کٹ کر الگ ہو گئی اور دور چلی گئی۔ یہ تھی ہمارے چاند کی ابتدا۔

چاند کی پیدائش کے بعد بھی زمین میں ٹھنڈا ہونے اور سکڑنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس کی بیرونی سطح کچھ ٹھنڈی ہوئی۔ اُس کے اندر سے گرم گرم گیسیں نکلیں، اُوپر اُٹھیں، ٹھنڈی ہوئیں اور پھر زمین پر اتنا پانی برسا کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ اس وقت ہمارے موجودہ سمندر وجود میں آئے۔

چٹانوں کی مٹی اور سمندروں کے پانی اور نمک کی مدد سے ہی سائنس دانوں نے زمین کی عمر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ کیسے معلوم کرتے۔ اس وقت انسان تو کوئی موجود تھا نہیں انسان کی شکل تو ابھی کچھ ہزار سال پہلے ظاہر ہوئی ہے۔

زمین کے پُرانے زمانے کی باتیں بتانے والا کوئی نہیں سوائے اُن چٹانوں اور سمندروں کے جو اُس وقت موجود تھے۔ ہم کسی بھی سیارے کی عمر کا اندازہ اس کی مٹی سے ہی لگاتے ہیں اور یوں ہماری زمین کی عمر تین چار ارب سال بنتی ہے۔



ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

خان بابا

خان بابا نے دیکھا نامو چلا آرہا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک توتا دبکا بیٹھا ہے جسے وہ بار بار دیکھتا جاتا ہے اس کی آنکھوں سے خوشی ٹپکی پڑتی ہے۔ جیسے ہی وہ قریب آیا خان بابا نے اسے مخاطب کیا "بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو نامو کیا بات ہے؟"

"میری خوشی کا سبب میرے ہاتھوں میں ہے"۔ نامو بولا "یہ توتا کون سا ہے۔ اس نسل کے توتے بڑے باتونی ہوتے ہیں۔ اسی لیے شوقین ان کی اچھی قیمت دیتے ہیں۔ آج ہی آم کے پیڑ سے پکڑا ہے اب میں اس توتے کو شہر جاکر بیچوں گا، بیس تیس روپے مل ہی جائیں گے"

خان بابا نے سوچا نامو کو سمجھائیں کہ انسان کو جانوروں سے ہمدردی کا سلوک کرنا چاہیے آزاد پرندوں کو قید کرنا یا بیچنا ان پر ظلم کرنے کے برابر ہے۔ لیکن دوسرے ہی پل انھیں احساس ہوگیا کہ نامو پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا کیونکہ اس کے سر تو بیس تیس روپے کمانے کا سودا سمایا ہے۔ لہٰذا انھوں نے نامو سے کہا "کیا یہ توتا تم پندرہ روپے میں مجھے دے سکتے ہو میرے پاس اتنی ہی رقم ہے ورنہ میں تمھیں کم از کم بیس روپے ضرور دیتا۔"

"آپ یہ توتا لے کر کیا کریں گے؟" نامو نے کہا "آپ کا گھر ہے نہ در آپ کی تو کھیت پر ہی گزر بسر ہوتی ہے اسے آپ کہاں رکھیں گے؟"

"تمھیں اس سے کیا۔ تم توتا بیچنا چاہتے ہو اور میں خریدنا چاہتا ہوں۔ اگر تمھیں بیچنا ... بولو ورنہ"

"تو نکالیے پندرہ روپے" نامو نے جھٹ سے جواب دیا۔
خان بابا نے نامو کو پندرہ روپے دے کر توتا لے لیا۔ سہما سہما توتا خان بابا کے
ہاتھوں میں کسمسانے لگا۔ انھوں نے ایک بار اُسے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ توتے کے
بائیں بازو کے پر ٹوٹے ہوئے ہیں ایسا لگتا تھا کہ کسی بلی نے اُسے نوچ لیا ہو۔ دوسرے
ہی لمحے اسے ہوا میں اُچھال دیا۔ توتا جیسے اسی انتظار میں تھا۔ اُڑتا ہوا یہ جا وہ جا۔
نامو نے حیرت سے کہا "یہ کیا کیا آپ نے!! پندرہ روپے دے کر توتا خریدا اور آزاد
کر دیا؟" اس کی بات سن کر بابا کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے
کہا "تم یہ بات سمجھ نہیں سکتے نامو؟" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے نامو نے بھی اپنی راہ لی۔
خان بابا، نامو کے گانو میں ایک زمیندار کے ہاں ملازم تھے۔ اس کی زمین کی
ساری ذمے داری اُن کے سپرد تھی۔ ان کا مالک سال بھر کچھ نہ کچھ بوتا اور کاٹتا رہتا اس
لیے برس کے بارہ مہینے کام چلتا رہتا۔ دن میں جانوروں اور رات میں فصل کی حفاظت
اور دوسرے کام، خان بابا کے دن رات کھیت میں بسر ہوتے۔ گانو کے لوگ اپنے
کھیت میں کام کرنے والے ملازم کی حیثیت سے جانتے تھے ان کے ماضی کے بارے
میں کسی کو علم نہیں تھا۔ دراصل وہ ایک گانو کے نامی گرامی زمیندار تھے۔ روپے پیسے
زمین جائداد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ عیش و آرام میں زندگی بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن حالات
نے کروٹ بدلی اور دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ہوا یہ کہ گانو میں طاعون
پھیل گیا جس نے ان کی بیوی اور اکلوتے بیٹے کی بلی لے لی۔ خان بابا ایسے دل برداشتہ
ہوئے کہ اپنا سب کچھ مسجد کے نام لکھ دیا اور دور کے ایک گانو میں جا بسے۔ اور
کھیت میں کام کرنے والے ملازم کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے۔ خاص بات یہ تھی
کہ زندگی کے اتنے اُتار چڑھاو دیکھنے کے بعد بھی اُن کے اندر کا آدمی پُرسکون تھا۔ اُن
کا ایمان تھا کہ ہر لمحہ اللہ کی گرفت میں ہے۔ اچھا بُرا جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اللہ کی مرضی
شامل ہے۔ اب بس ایک لٹھ ہی اُن کی ملکیت تھی جسے وہ ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ نماز روزے
کے پابند تھے۔ ہر کوئی انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا۔ یہی عزت ان کے جینے کا سہارا بن
گئی تھی۔
کھیتوں کو موسم برسات کے لیے تیار کیا جانے لگا تھا۔ خان بابا کی مصروفیـ...

گئی تھی۔ ایک دوپہر جب وہ تھک کر چور ہو گئے تو آم کے پیڑ کے نیچے جا لیٹے۔ تھکن کے مارے لیٹتے ہی ان کی آنکھ لگ گئی۔ انھیں سوئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک جھاڑی سے کالا ناگ نکلا اور سرسراتا ہوا آن کی طرف بڑھنے لگا۔ پیڑ پر بیٹھے ہوئے توتے نے جب یہ دیکھا تو چیخنے چلّانے اور پھڑپھڑانے لگا کہ اس کی آواز سن کر خان بابا جاگ جائیں۔ لیکن اس کی کوشش بے سود واقع ہوئی۔ خان بابا نیند سے بیدار نہیں ہوئے ناگ بڑھا چلا آرہا تھا۔ توتے کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک توتے کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اس نے بڑی پھرتی سے ایک آم اپنی چونچ سے توڑا اور اُسے خان بابا پر ٹپکا دیا۔ جیسے ہی آم خان بابا کی ناک پر لگا ان کی آنکھ کھل گئی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ پھر جیسے ہی ان کی نظر آگے بڑھتے ہوئے ناگ پر پڑی انھوں نے بجلی کی سرعت سے اپنے پاس رکھی لاٹھی اُٹھائی اور ناگ پر حملہ کر دیا۔ لٹھ کے پے در پے حملوں کی تاب نہ لا کر ناگ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ناگ کی موت پر توتا پھولا نہیں سمایا زور زور چیخنے چلّانے اور پھڑپھڑانے لگا۔ خان بابا کی نظر جیسے ہی توتے اور اس کے بائیں بازو پر پڑی تو وہ سمجھ گئے کہ اس توتے کی بدولت ان کی جان بچی ہے اور یہی وہ توتا ہے جسے انھوں نے ناموسے خرید کر آزاد کیا تھا۔ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنی راہ لی۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ جانور بھی اپنے محسن کو نہیں بھولتے اور وقت آنے پر کام آتے ہیں ——— انسانوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔



سُہا ثنوی
۲۳ مومن اپارٹمینٹ بھیونڈی

یارب تو مرے دل کو وہ جرأت وہمّت دے
اس دور کی ہر خامی ہو دور مرے دم سے
تہذیب و تمدّن میں ممتاز نظر آؤں
ہر کام سلیقہ سے کر جاؤں زمانے میں
اچھوں ہی کی صحبت میں ہر لمحہ مرا گذرے
آلام و مصائب میں گھر کر جو نہ گھبرائے

ہر حال میں شاکر ہو ایسی مجھے فطرت دے
وہ عزم مکمل دے وہ جوشِ اخوت دے
اخلاق وہ دے مجھ کو وہ بوئے شرافت دے
بن جاؤں مثال اپنی وہ سیرت و خصلت دے
اچھوں ہی میں رہنے کی تو مجھ کو سعادت دے
مظلوم سُہا کو بھی یارب وہ طبیعت دے



● جج (مجرم سے) تم نے چوری کیوں کی ؟
مجرم :- ہمارے گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بیوی بچے بھوکے رہتے۔
جج :- تم نے اس سے مانگا کیوں نہیں ؟
مجرم :- مجھے مانگنے میں شرم آتی ہے۔

● استاد (احمد سے) احمد بتاؤ اٹلس میں امریکہ کہاں پر ہے ؟
احمد :- سر یہاں پر۔
استاد :- (اصغر سے)۔ امریکہ کا پتہ کس نے لگایا!
اصغر (احمد نے)

سید شمشاد حیدر معافی۔ ضلع (نالندہ)

● بیوی شوہر سے :- دیکھو جی تمہارا دوست جس لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا ہے وہ لڑکی اچھی نہیں ہے، منع کر دو اس کو۔
شوہر :- میں کیوں منع کروں، اس نے مجھ کو منع کیا تھا۔

عنبری خاتون، شبنم (اوگانواں)

● دو دوست سفر کر رہے تھے۔ ایک نے اپنا ٹکٹ ماتھے پر لگایا ہوا تھا۔ کنڈکٹر اُن کے پاس آیا اور بولا آپ کا ٹکٹ کہاں ہے۔ وہ بولا ماتھے پہ کنڈکٹر نے دوسرے دوست سے پوچھا آپ کا ٹکٹ کہاں ہے تو وہ بولا میں بیرنگ جا رہا ہوں۔

دکلیم الدین احمد، کشن گنج، پورنیہ (بہار)

● اخبار فروش (اخبار بیچتے ہوئے) تازہ خبر ایک المناک حیرت انگیز واقعہ صرف ایک روپے میں تمام تفصیلات۔
راہ گیر :- (گھبرا کر) کیا ہوا بھائی ؟
اخبار فروش :- چار پہیے گاڑی کے پیچھے آ گئے

محمد فیض۔ محلہ چاہ خزانخاں رامپور (یوپی)

● ایک شخص نے قسطوں پر ریڈیو خرید لیا مگر کئی ماہ تک قسط ادا نہ کی۔ اس پر کمپنی والوں کی طرف سے اُسے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ اگر آپ سے ریڈیو واپس لے لیا جائے تو یہ آپ کی بڑی بے عزتی ہوگی۔ ذرا سوچیے آپ کے ہمسائے آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔
چند دنوں بعد اس شخص نے کمپنی والوں کو جواب دیا :- "ہم نے ہمسایوں سے پوچھ لیا ہے وہ اُنھیں کا سانس لیں گے!!"

نوید انجم، رام نگر ضلع نینی تال (یوپی)

کچھ مفید اور دلچسپ باتیں

افسانچہ

اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا کہ تم اتنے ضدی، ہٹ دھرم اور موقع پرست نکلو گے تو قسم سے میں کبھی تمھارا انتخاب نہ کرتی۔ وہ تو مجھے پتا نہیں کیوں تمھاری پیاری سی صورت اور رنگ وروپ اتنا بھا گیا کہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، تمھاری ضمانت قبول کر لی۔

مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمھیں ہو کیا گیا ہے تم عین وقت پر میرا ساتھ چھوڑ دو گے میں نے تمھیں بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ کہ بقول شاعر ؎

تیری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحدِ عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

اور آج آخر کار مجھ پر یہ تلخ حقیقت بڑے واضح طور پر افشاء ہوئی ہے کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی تو اے میرے ’پارکر پین‘ تیری چمک دمک سے میں بھی فریفتہ ہو گئی اور آج عین پرچے کے دوران تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

شازیہ گل

دکھ درد

بیوی: ”جب ہماری شادی ہو گی تو میں تمھاری تمام پریشانیوں اور دکھ درد میں برابر کی شریک ہوں گی۔

شوہر: ”مگر! مجھے نہ کوئی پریشانی ہے نہ تکلیف“

بیوی: ” شادی کے بعد پریشانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ تم فکر نہ کرو۔“

(حسینہ تجمل حیدری)

اُلجھن

دو سہیلیاں کئی برس بعد ملیں اور جلد ہی اپنے اپنے شوہر کے عیب گنانے لگیں ایک نے کہا ” ہماری شادی کو پندرہ برس ہو گئے ہیں لیکن شوہر صاحب کھانے کے بعد کھانے میں نقص ضرور نکالتے ہیں۔

دوسری بولی ” ہائے غضب! اس سے تو تمھیں بڑی الجھن ہوتی ہو گی؟“

سہیلی نے جواب دیا۔ ” مجھے الجھن کیوں ہو؟ اگر وہ اپنا پکایا ہوا کھانا ناپسند نہیں کرتے تو اس میں میری کیا خطا ہے؟“

(شازیہ ادریس)





دنیا کے کچھ شہروں کا وقت جب دہلی میں بارہ بجتے ہیں



شہر کا نام	ملک کا نام	وقت
(۱) راولپنڈی	پاکستان	۳۰ر۱۱ بجے صبح
(۲) ماسکو	روس	۳۰ر۹ بجے صبح
(۳) قاہرہ	مصر	۳۰ر۸ ، ،
(۴) لندن	انگلینڈ	۳۰ر۶ ، ،
(۵) ہویشن برگ	گرین لینڈ	۳۰ر۳ رات
(۶) نیویارک	امریکہ	۳۰ر۱ رات
(۷) شکاگو	امریکہ	۳۰ر۱۲ رات
(۸) ٹوکیو	جاپان	۳۰ر۳ شام
(۹) سڈنی	آسٹریلیا	۳۰ر۴ شام
(۱۰) ولنگٹن	نیوزی لینڈ	۳۰ر۶ شام

مرسلہ: محمد شعیب
۴/۱۷، بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

گلدستہ معلومات

(سوالات و جوابات)

سوال: دنیا کا سب سے پہلا انسان کون تھا؟
جواب: حضرت آدمؑ دنیا کے سب سے پہلے انسان تھے۔

سوال: اولین پیغمبر کا نام بتائیے۔
جواب: حضرت آدمؑ

سوال: کس پیغمبر نے قیدخانہ میں توحید کی دعوت دی تھی؟
جواب: حضرت یوسفؑ نے قیدخانے میں توحید کی دعوت دی۔

سوال: کن پیغمبروں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی؟
جواب: حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی۔

سوال: مچھلی کے پیٹ سے کون سے پیغمبر صحیح وسالم نکل آئے؟
جواب: حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے صحیح و سالم نکل آئے۔

سوال: کون سے پیغمبر صبر و شکر کرنے میں سب سے زیادہ مشہور رہیں؟

جواب: صبر ایوبؑ آج تک سب سے زیادہ مشہور ہے۔

سوال: معجزہ یدِ بیضا کس پیغمبر کو عطا ہوا تھا؟

جواب: حضرت موسیٰؑ کو یدِ بیضا کا معجزہ عطا ہوا تھا۔

سوال: سب سے آخری نبی کون تھے؟

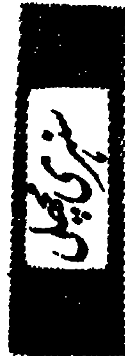
جواب: حضرت محمدؐ سب سے آخری نبی تھے۔

سوال: حضرت محمدؐ پر کون سی کتاب نازل ہوئی؟

جواب: قرآن مجید

محمد نعیم اکرمی
مکان نمبر ۳۴، جامع مسجد، بھٹکل





ایک گانو میں ایک غریب ماہی گیر رہتا تھا۔ اس کا نام سلیمان تھا۔ وہ کھاتا تو روکھی سوکھی تھا لیکن وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا اور سب کے ساتھ اچھا برتاو کرتا تھا اس لیے سب اس کی عزت کرتے تھے وہ بہت دلیر اور بہادر تھا۔

ایک دن جب اس نے اپنا جال پانی میں ڈالا اور نکالا تو اس نے دیکھا کہ ایک لکڑی کی چھوٹی سنہری مچھلی اس کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ مچھلی اسے بہت اچھی لگی۔ اتفاق سے اس کی ٹوپی اس مچھلی پر گری۔ ٹوپی کا گرنا تھا کہ مچھلی میں ہل چل پیدا ہوئی اور اس نے اپنا منہ کھولا اور اس کے منہ سے سفید رنگ کا دھواں نکلنے لگا۔ سلیمان ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ دھواں اونچا اٹھنے لگا اور اور ایک بھیانک دو سینگ والے جن میں تبدیل ہو گیا۔ جن نے اپنی خوفناک آواز میں سلیمان سے کہا "کیا کام ہے میرے آقا! آپ نے مجھے کیوں یاد کیا"

یہ سن کر سلیمان پہلے تو گھبرایا پھر ہمت کر کے بولا "تم کون ہو؟"

"میں چراغ کے جن کا دادا ہوں اور اس مچھلی کا غلام ہوں۔ یہ مچھلی جس کے پاس ہوگی میں اس کا غلام ہوں گا"۔ جن نے اپنی خوفناک آواز میں کہا۔

"لیکن تم میری ٹوپی گرنے سے ہی کیوں آئے ہو؟" سلیمان نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"جب اس مچھلی پر کوئی کپڑا گرتا ہے تو میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ اگر کبھی مجھے بلانا ہو تو

کوئی کپڑا اس مچھلی پر ڈالنا میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا" جن نے جواب دیا۔

سلیمان نے اُسے واپس جانے کو کہا اور مچھلی ساتھ لے کر گھر کی طرف چل دیا۔

آج اُس نے کوئی مچھلی بھی نہیں پکڑی تھی۔ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر جن کو بلوا کر کھانا منگوایا جائے تو اچھا رہے گا۔ اس نے ایک کپڑا مچھلی پر ڈالا تو جن فوراً حاضر ہوا اس نے کھانا لانے کو کہا۔ جن فوراً لذیذ کھانا لے کر آیا اور اس کے سامنے پیش کر دیا۔ سلیمان نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اب وہ بہت امیر بن گیا اور بہت شہرت حاصل کر لی۔ لیکن وہ غریبوں کو نہیں بھولا۔ اُنھیں کھانا کھلاتا اور ان کی ہمیشہ مدد کرتا رہا۔ سب اُسے دعائیں دیتے مچھلی کا راز سب کو معلوم تھا۔

یہ خبر ایک لالچی آدمی سلیم تک پہنچی اس نے سوچا کہ اگر وہ مچھلی اس کے پاس آگئی تو وہ بہت امیر بن سکتا ہے اس لیے اس نے اسے حاصل کرنے کا عہد کر لیا اور وہ سلیمان کے پاس آ کر مچھلی دھوکے سے لے گیا سلیمان کو جب پتا چلا وہ مچھلی ایک بُرے آدمی کے ہاتھ لگ گئی ہے اور وہ اس سے کچھ بھی کر سکتا ہے اس نے اسے ڈھونڈنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چلتا رہا۔ آخر کار ایک گھنے جنگل میں اسے ایک جھونپڑی نظر آئی وہ اس جھونپڑی میں داخل ہوا۔ وہاں ایک بزرگ نظر آئے۔ اس نے انھیں سلام کیا اور اپنے آنے کا سبب بتایا۔ بزرگ جانتے تھے کہ وہ بہت نیک دل آدمی ہے۔ اُنھوں نے اُسے ایک تلوار دیتے ہوئے کہا کہ یہ تلوار ایک جادوئی تلوار ہے تم اس تلوار کی مدد سے اُس نالائق کو ختم کروگے۔ وہ مغرب کی طرف والی پہاڑی میں ایک غار میں رہتا ہے

سلیمان ان کا شکریہ ادا کرکے اس پہاڑی کی طرف چل دیا۔ وہ جلد ہی اس پہاڑی پر پہنچ گیا اور وہ غار ڈھونڈ کر اس میں داخل ہو گیا۔ سلیم نے اسے دیکھ کر اپنی تلوار نکالی لیکن سلیمان نے اپنی جادوئی تلوار سے اسے ختم کر دیا اور وہ مچھلی لے کر چل دیا اور اپنے گاؤں میں ہنسی خوشی رہنے لگا۔

شہزاد انور بیگ ولد افضل بیگ
امراوتی (مہاراشٹر)

...ازی کے لیے...

(۱) جنھوں نے نماز کو ضائع کیا وہ مغضوب

جہنم کے ایک خاص طبقے میں ڈالے جائیں گے۔ (القرآن)

(۲) بے نمازی کی عمر میں برکت نہ ہوگی۔ (الحدیث)

(۳) بے نمازی کی دعا قبول نہ ہوگی (الحدیث)

(۴) بے نمازی کی قبر تنگ کر دی جائے گی اور آخرت میں سختی سے حساب لیا جائے گا۔ (الحدیث)

(۵) ترکِ نماز کفر ہے (امام احمد بن حنبلؒ)

محمد قمر عالم (درجہ حفظ)

مدرسہ اسلامیہ، اماموری، کمار بازید پور، ویشالی (بہار)

میرے خوابوں کی دنیا

میں نے ایسی دنیا کا خواب دیکھا ہے جہاں محبت کے پھولوں کا گلستاں ہو جہاں لوگوں میں صرف محبت ہو نفرت نام کی کوئی چیز نہ ہو جہاں بڑے اور چھوٹوں میں تمیز ہو۔

کوئی ظالم ہو نہ مظلوم! ہر طرف امن، انصاف اور شادمانی ہو۔

جہاں کوئی فرقے کی جنگ ہو نہ مذہب کی!

نہ ذات پات کے بھید ہوں نہ کالے گوروں کی جھڑپ!

میرے خوابوں کی دنیا میں غلامی کی زنجیریں نہ ہوں۔

ہر انسان ہر کسی کی مدد کرتا ہو، میرے خوابوں کی دنیا میں محنت کش لوگوں کو ان کی محنت کا اچھا پھل ملے۔

میں نے ایسی دنیا کا خواب دیکھا ہے۔ جہاں کوئی جاہل نہ ہو اور تعلیم مفت اور عام ہو۔

پیداوار اور دولت کی مناسب تقسیم ہو۔ ہر ایک کے دل میں سچی محبت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو۔ ہر کوئی محنت کش ہو۔ یعنی جو کمائے گا وہ کھائے گا۔

اب آپ بھی میرے خوابوں کی دنیا میں بسنے کی تمنا کیجیے اور اپنی نئی دنیا کا عروج دیکھیے۔

مظفر ابراہیم السلوکر

ٹیم پال مانگاؤں رائے گڑھ (مہاراشٹر)



محسن ایک اچھا لڑکا تھا وہ وقت کی قدر کرتا تھا۔ ہمیشہ ٹھیک وقت پر سوتا اور ٹھیک وقت پر جاگتا تھا روزانہ ٹہلنے کو

جاتا تھا۔ جس طرف وہ ٹہلنے جاتا تھا اُدھر راستے میں جیل خانہ پڑتا تھا صبح کو گزرتے ہوئے وہ قیدیوں کو اپنے کاموں میں مشغول دیکھتا ہوا نکل جاتا تھا قیدیوں کے بارے میں وہ یہ سوچتا تھا کہ انھوں نے جرائم کیے ہوں گے اس لیے یہ سزا بھگت رہے ہیں۔ ان قیدیوں کے ساتھ پہریدار سپاہی بھی ہوتے تھے جنھیں محسن مسکرا کر سلام بھی کر لیا کرتا تھا کبھی کبھی کوئی سپاہی اس سے بات چیت بھی کر لیتا تھا ایک روز محسن ادھر سے گزر رہا تھا تو ایک قیدی نے جو سڑک کے قریب کھیت کی مینڈ پر بیٹھا ہوا صفائی کر رہا تھا اس کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس سے کہا آپ روزانہ ہی ادھر سے گزرتے ہیں میرا آپ سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ جیل خانہ کے باہر بھی میرا کوئی نہیں ہے میں سخت پریشانی میں ہوں میرے پاس بیڑی کے لیے پیسے نہیں۔ مجھے کچھ پیسے دے دیجیے۔ اس نے اپنی جیب سے ایک روپیا نکال کر اس قیدی کو دے دیا۔ قیدی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ محسن چل دیا۔ آج پہلی بار اس کے دل میں کسی مجرم کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی۔ وہ سوچنے لگا سب ہی لوگ مجرم نہیں ہوتے اور کچھ ناحق بھی مجرم بنا دیے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس جس قیدی نے مجھ سے مدد مانگی ہے وہ مجرم نہ ہو پھر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس قیدی کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہیے۔ کئی دن تک اس کی ملاقات قیدی سے نہیں ہوئی مگر وہ جب بھی ادھر سے گزرتا اس کے دل میں قیدی کا خیال ضرور آجاتا۔ ایک دن محسن کی قیدی سے پھر ملاقات ہو گئی۔ محسن نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ کہو بھائی کیا حال ہے کچھ پیسوں کی ضرورت تو نہیں۔ قیدی فوراً بول پڑا ضرورت تو ہے یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور محسن نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر دیدیے اور ہمت کر کے اس سے معلوم کر ہی لیا۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہ سزا آپ کو کیوں ہوئی ہے۔ اس پر قیدی نے کہا یہ مت پوچھو۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ میں یہ سب بتا سکوں میں بہت بُرا آدمی ہوں مگر آپ کا احسان مند ہوں۔ میں شاہجہاں پور کا رہنے والا ہوں اور جلد ہی چھوٹنے والا ہوں۔ اگر آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ کے احسان کا بدلہ اُتار دوں گا۔ محسن ان سب باتوں کو کوئی اہمیت نہ دے کر چلتا بنا اس کے بعد محسن کی اس قیدی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک رات محسن اپنے کمرے میں

سو رہا تھا اتنے میں لوگوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ محسن گھبرا کر اُٹھا کمرے سے باہر جانا چاہا تو باہر سے کمرہ بند تھا۔ اس نے کواڑوں کو جھنجوڑ ڈالا۔ ایک فائر کی آواز سنائی دی اور پھر چیخنے چلانے کی آوازیں کم ہو گئیں۔ محسن سمجھ گیا کہ گھر میں ڈاکہ پڑ گیا ہے وہ نڈھال ہو کر اپنے بستر پر گر گیا تھوڑی دیر میں اس کا کمرہ باہر سے کسی نے کھولا۔ ایک ڈاکو پستول لیے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔ محسن نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکو نے اُس کا ہاتھ جھٹکے سے کھینچا اور پھر ایسا ہوا جیسے ڈاکو کو کرنٹ نے چھو لیا ہو پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا یا اس نے پھینک دیا اور وہ محسن کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔ اور فوراً کمرے سے باہر گیا اور اپنے ساتھی ڈاکوؤں سے بھاگ جانے کو کہا۔ ساتھ ہی یہ بھی سنائی دیا کہ یہاں سے کوئی چیز مت لے جانا۔ محسن سوچنے لگا اے خدا یہ تیری کیا حکمت ہے یہ سب کیا ہو رہا ہے پھر وہی ڈاکو جو ڈھاٹا باندھے تھا اندر آیا اور ڈھاٹا اُتار کر بولا۔ مجھے پہچانتے ہو محسن! اپنا نام سُنا تو میں چونک پڑا اے خدا کیا ماجرا ہے؟ وہ محسن کو اپنے ساتھ گھر میں لے گیا۔ سب لوگوں کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ اب محسن پہچان گیا کہ یہ وہی قیدی ہے جس کی اس نے مدد کی تھی اور اس نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ چھوٹنے کے بعد احسان کا بدلہ اُتار دوں گا۔

محسن نے اس ڈاکو سے پوچھا آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ ڈاکو کہنے لگا آپ میرے محسن ہیں نا! آپ نے میری قید کی زندگی میں احسان کیا تھا میں آپ کو محسن کہہ کر یاد کرنے لگا آج میں نے آپ کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہم بُرے لوگوں میں بھی احسان کا بڑا درجہ ہے۔ گھر کے سبھی لوگ بہت خوش اور حیرت زدہ تھے اُنھیں کیا معلوم کہ اُن کے لائق ہونہار بیٹے کے احسان کے بدلے میں جان، مال محفوظ رہا۔ ڈاکو نے عہد کیا کہ وہ اب آئندہ بُرے کام کو کبھی نہیں کرے گا۔ وہ تیزی سے غائب ہو گیا۔ میرے پیارے بھائیو اور بہنو! ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کرو کہ کسی کا احسان ہو تو اس کا بدلہ احسان سے ادا کرو اور احسان کرنے میں پہل کرو۔

ایم شاہنواز شمسی
دریبہ پان۔ رام پور (یوپی)

زبانِ حضورؐ

(۱) حیا کے دس حصے ہیں جن میں سے نو حصے

عورتوں میں اور ایک حصہ مردوں میں ہونا چاہیے۔

(۲) عورت سراپا پردہ ہے۔ جب وہ بے پردہ ہوجاتی ہے تو شیطان اس کو تاکنے لگتا ہے۔

(۳) اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی نیکی ہے۔

(۴) قیامت کے دن ترازو میں خوش خلقی سے بڑھ کر کوئی چیز بھاری نہیں ہوگی۔

(۵) تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

(۶) جس کے دل میں ذرا برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

(۷) جھوٹ چہرے کو بے رونق دیتا ہے

(۸) وہ مومن کادل نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

شکیل احمد فطرت
بھٹکل (کرناٹک)

دلچسپ معلومات

(۱) کرنل بیونارڈ واسٹون جب اپنی فوج کو کوئی حکم دیتا تھا۔ تو اس کی آواز تین میل تک آسانی سے سنی جاسکتی تھی۔

(۲) والٹر لوٹنگ دنیا کا سب سے چھوٹا انسان تھا اس کی لمبائی بیس اِنچ تھی وہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔

(۳) جنرل سر آرتھر سلوگٹ کے دل کے بیچوں بیچ گولی لگی تھی۔ گولی لگنے کے بعد بھی جنرل ۳۱ سال تک زندہ رہے۔

(۴) جاپان میں ایک ایسا درخت ہے جس میں سے سورج غروب ہوتے ہی دھواں نکلنا شروع ہوجاتا ہے۔

(۵) سلودہ ایک ایسا جانور ہے جو گھنٹوں درخت کی شاخ سے لٹکا رہتا ہے

(یہ پیامی اپنا نام لکھنا بھول گئے)

صحت افزا باتیں

(۱) صحت مند رہنے کے لیے ہمیشہ خوش رہنا ضروری ہے۔

(۲) امید بھرا دل قوت کا خزانہ ہوتا ہے۔

(۳) صبح کی سیر صحت کے لیے تریاق ہے۔

(۴) رات کو جلد سونا اور صبح سویرے اٹھنا تندرستی اور خوش نصیبی کی دلیل ہے۔

(۵) پرہیز کرنا علاج سے بہتر ہے۔

(۶) بہت سے امراض قبض اور ورم کی پیداوار ہوتے ہیں۔

(۷) کھانے پینے کا ایک وقت مقرر ہونا چاہیے

(۸) تازہ پھلوں اور میووں کا استعمال صحت و توانائی کا ضامن ہے۔

(۹) ہنسنا اور مسکرانا صحت و توانائی کی کنجی ہے۔

(۱۰) خوشی سے بڑھ کر کوئی ٹانک نہیں۔

محمد انصار بن محمد اشرف، (ڈاٹار بھٹکلی)

مسلمان کیسا ہے

— جو —

(اس کو پڑھ کر خود دیکھیے)

(۱) اللہ کو جانتا ہے مگر اس کی بندگی نہیں کرتا۔

(۲) رسول اللہ کی اُمّت میں سے ہے مگر اس کی پیروی نہیں کرتا۔

(۳) جنّت کی خبر رکھتا ہے مگر اس کی خواہش نہیں کرتا۔

(۴) جہنّم کی آگ سے باخبر ہے مگر اس سے نہیں ڈرتا۔

(۵) خدا کا دیا رزق کھاتا ہے مگر اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔

(۶) موت کو جانتا ہے مگر اس کی تیّاری نہیں کرتا۔

(۷) دوسروں کے عیب ظاہر کرتا ہے مگر اپنے عیب نہیں دیکھتا۔

(۸) قبرستان جاتا ہے مگر عبرت حاصل نہیں کرتا۔

(۹) خود کھاتا ہے مگر بھوکے پڑوسی کو نہیں کھلاتا۔

(۱۰) والدین کے حقوق جانتا ہے مگر ادا نہیں کرتا

(۱۱) قرآن کی تلاوت کرتا ہے مگر عمل نہیں کرتا۔

علی جوّاد زاہد

پھا یا نگرا امراوتی

کار آمد باتیں

(۱) ظلم غرور اور بے وفائی تینوں سے نفرت کرو۔

(۲) چوری، جھوٹ اور چغلی یہ تینوں چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں۔

(۳) بدطینت، ضدّی اور نمائشی آدمی سے پرہیز کرو۔

(۴) شفقت، خوش دلی اور خوش خلقی تینوں کو پسند کرو۔

(۵) شرافت، شجاعت اور مروّت تینوں سے محبّت کرو۔

(۶) ملک اور دوست کے تحفّظ کے لیے لڑو۔

(۷) غصّہ اور زبان پر قابو رکھو۔

دلشاد احمد سعید

سپر الیکٹرک ورکس، جامع مسجد، دیوبند

اگر آپ کو اسکول پہنچ کر یاد آئے کہ آپ کھانے کا ڈبّا گھر ہی بھول آئے تو؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اپنے دوستوں کے پاس گیا۔ انھوں نے جو جواب دیے وہ ذیل میں درج ہے۔

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 35

150 روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں، آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں لیکن ہر حل کے ساتھ ایک کوپن آنا ضروری ہے۔

دفتر پیامِ تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۰ جنوری ۸۸ء

پہلا انعام: صحیح حل پر مبلغ 100 — دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر 50 روپے کی کتابیں

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جس لفظ کو آپ صحیح سمجھتے ہوں اسے ہی نمبر وار لکھیے

---

1. مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ایک ــــ آدمی بادشاہ مقرر کیا گیا ہے۔ امیر / غریب / غلط
2. انھیں اپنی قوت کا ــــ ہو گیا۔ تکبر / گھمنڈ / غرور
3. حضرت ابوبکر صدیقؓ کافروں کے ــــ کرنے سے پریشان ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ غفرا
4. خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی مہربانی اور ــــ کے ساتھ پیش آئے۔ محبت / شفقت
5. کسی آدمی کو ایک ــــ روٹی کھلانے میں تکلف نہیں کرتا۔ لقمہ / نوالہ
6. ایک ــــ کچھ لوگ اس کے پاس ایک سفید رنگ کا نہایت خوبصورت اور صحت مند گھوڑا لے کر آئے۔ روز / دن / مرتبہ
7. آپ نے ــــ فرمایا کہ "اللہ تم کو خوش رکھے"۔ بے ساختہ / بے اختیار
8. حضرت شیث علیہ السلام شکل و صورت میں ــــ سے مشابہ تھے۔ حضرت آدمؑ / حضرت یوسفؑ

صرف آخر کے دو سوالوں کے لیے ذہن پر زور دیجیے بقیہ چھ سوالوں کے جوابات صفحہ ۱۸ اور ۴۰ کی کتابوں میں ملیں گے۔

شرائط پیامی اَدبی مُعمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا کوپن آنا لازمی ہے (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی (۵) معمّے سے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

کوپن
پیامی ادبی مُعمّا نمبر 35
میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔
نام ....
پتا ....

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے
پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 35 ماہنامہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

nce No. U(SE)-21 to post without pre-payment of postag

Regd. No. D(SE)-043 December, 1987

PAYAM-I-TALEEM *Monthly*

Jamia Nagar, NEW DELHI-110025

Regd. with R.N.I. at No.10537/64